بسم اللہ الرحمن الرحیم

علمی و فقہی افادات

مؤلف مفتی محمد رضوان

ادارہ غفران
راولپنڈی پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علمی وفقہی افادات

متفرق علمی وفقہی افادات کا مجموعہ

دینی مکاتب ومدارس، جامعات، افتاء

اورمدارس وجامعات کے نصاب ونظام اورطلبہ کی تعلیم وتربیت سے متعلق

موجودہ حالات کے تناظر میں مفید رہنمائی پر مشتمل افادات وافاضات

مؤلف

مفتی محمد رضوان خان

ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان

www.idaraghufran.org

Idara Ghufran

(جملہ حقوق بحق ادارہ غفران محفوظ ہیں)

نام کتاب: علمی وفقہی افادات

مؤلف: مفتی محمد رضوان خان

طباعتِ اول: ربیع الاول 1446ھ - ستمبر 2024ء

صفحات: 748

ملنے کے پتے

Idara Ghufran

فہرست

صفحہ نمبر	مضامین	
28	تمہید (از مؤلف)	
30	(1) کون سے علماء، انبیاء کے وارث ہیں؟	
32	(2) علماء واہلِ مدارس کی کوتاہیوں کے نقصانات	
37	(3) نااہل لوگوں کو مدرسہ کا عہدہ سپرد کرنا	
39	(4) طلبۂ کرام کی اصلاح اور تربیت سے غفلت	
42	(5) مدارس کی مروّجہ سندِ فراغت اور دستارِ فضیلت	
47	(6) رسمی جلسوں کے مقاصد ومفاسد	
53	(7) طلبہ کو اصول وقواعد کا پابند بنانے میں غفلت	

www.idaraghufran.org

55	(8) مدارس میں طلبہ کی بے جا مار پٹائی کے مفاسد	
66	(9) طلبۂ کرام پر شفقت اور غصہ میں اعتدال	
70	(10) مدارس کے مروَّجہ کمیشن پر چندہ کا طریقہ	
72	(11) علماء کو جہلاء کے ماتحت ہونے کا مفسدہ	
76	(12) علماء کا، حکمرانوں کے ساتھ رویہ	
80	(13) تخصُّص اور اِفتاء میں فرق	
83	(14) علم کے ساتھ تزکیہ وصحبتِ اہلُ اللہ کی ضرورت	
88	(15) کونسا علم فرضِ عین ہے؟	
93	(16) غیر عربی دان بھی ''فرض علم'' حاصل کرسکتا ہے	

(17) سیاست وتحریکات میں طلبہ کی شرکت کا نقصان	101
(18) عالم کے لئے مروَّجہ سیاست دانی کا درجہ	108
(19) علماء کی مروَّجہ سیاست میں عملی شرکت	112
(20) طلباء کو نرمی کے ساتھ مانوس کرنے کی ضرورت	118
(21) طلبہ پر بے جا سختی اور تشدُّد کے نقصانات	121
(22) ختمِ بخاری کے عنوان سے ہونے والی بے اعتدالیاں	129
(23) دینی نصاب، عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے	137
(24) اہلِ علم کو استغناء کی ضرورت	142
(25) مولوی کے بعد مولانا اور اب ڈاکٹر کی باری ہے	145

(26) ادارہ کے نصاب کی بنیاد، کن خطوط پر ہونی چاہیے	149
(27) مدرسین و معلمین کے لئے چند مفید باتیں	154
(28) طالبِ علم اور طالبِ دنیا کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا	162
(29) مقتدَر و مقتداء علماء کو سنجیدہ طرزِ عمل کی ضرورت	167
(30) مدرسہ سے مقصود، رضائے الٰہی ہونا چاہیے	170
(31) طلبۂ کرام کو فضولیات سے بچنے، بچانے کی ضرورت	173
(32) علماء اور ہاتھ سے تغییرِ منکر کا منصب	177
(33) عالمِ دین، شرعی احکام سے بری نہیں	189
(34) علماء، عوام کے مقتداء، یا مقتدی؟	194

Idara Ghufran

(35) خطاب، مخاطب کو ہونا چاہیے	197
(36) جوش وجذبہ میں اعتدال، اور جامعہ حفصہ کا قضیہ	201
(37) طلبہ کے لئے یکسوئی اور تحریکات وغیرہ سے اجتناب	229
(38) بعض سیاسی علماء کا غیر معتدل طرزِ عمل	237
(39) صحیح اور غلط روایات میں امتیاز کی ضرورت	241
(40) اپنے کسی موقف سے رجوع اہلِ حق کا شعار ہے	245
(41) اکابر کی موجودگی میں اصاغر کے علمی کام کی حیثیت	248
(42) اہتمام میں وراثت جاری نہیں ہوتی	253
(43) موجودہ اسلامی بینکاری سے متعلق اظہارِ خیال	258

Idara Ghufran

(44) علماء وطلبہ کے لئے تحریر وکتابت کی ضرورت واہمیت	261
(45) مناظرہ جائز ہونے کی شرائط	264
(46) علماء کے وارثِ انبیاء ہونے کا تقاضا	265
(47) اختلافِ رائے کے ساتھ احترامِ رائے کی ضرورت	267
(48) اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کا 171 واں اجلاس	268
(49) کیا ٹیلی ویژن کا استعمال جائز ہو گیا؟	273
(50) اسلامی بینکاری کا سفر	275
(51) فتویٰ دہندہ کے لیے چند اہم ہدایات	281
(52) بڑھتے ہوئے خودکش حملے اور اہلِ علم کی ذمہ داری	285

Idara Ghufran

(53) دینی موضوع، عملی زندگی سے متعلق ہونا چاہئے	287
(54) علماء کے ہوا کے رُخ پر چلنے کا نقصان	291
(55) تراویح کے بعد خلاصۂ قرآن	292
(56) قرآن فہمی کے متعلق چند غلط فہمیاں	294
(57) ہر کام، علماء کے ذمہ نہیں	298
(58) طاقت کا غلط اور بے جا استعمال	301
(59) علماء کو وقت کے ضیاع اور فضول اختلاط سے بچنے کا حکم	306
(60) سجدۂ تلاوت سے متعلق ایک مسئلہ کی وضاحت	308
(61) مجتہد ومختلف فیہ مسائل پر ایک تحریر کا جواب	313

www.idaraghufran.org

318	(62) بندہ کی کتب ومضامین سے متعلق اہم انتباہ	
319	(63) فروعی مسائل میں تشدد ونکیر سے اجتناب کی ضرورت	
320	(64) فروعی واجتہادی اختلاف کی حکمت	
322	(65) علماء کو موجودہ سائنس سے استفادہ کی ضرورت	
323	(66) بڑے شہروں میں سفر وقصر کا آغاز کب ہوگا	
324	(67) علماء کو قرآن وسنت کی طرف رجوع کی ضرورت	
325	(68) اہلِ علم کو آئینِ پاکستان کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت	
326	(69) مفتی کو فقہ اور حالاتِ حاضرہ کے علم کی ضرورت	
327	(70) تحقیق واجتہاد کے لئے اجتماعیت	

Idara Ghufran

(71) ایک معترض کے اعتراض پر تبصرہ	328
(72) بحث ومباحثہ سے پرہیز کی افادیت	329
(73) اہلِ علم کے لئے مختلف اُردو فتاویٰ کا ایک نقصان	330
(74) فتاویٰ کے سلسلہ میں ایک تجربہ کی بات	331
(75) عوامی مسائل میں عدمِ تشدد کی ضرورت	333
(76) دینی مدارس وجامعات میں اصلاح وتربیت	//
(77) دینی نصاب کی موجودہ تقاضوں کے مطابق ضرورت	334
(78) خدماتِ فقہاء کی قدر وقیمت	//
(79) تحقیقی کام کے لئے یکسوئی کی ضرورت	335

(80) دماغی کام کرنے والوں کو مقویات اور چہل قدمی کی ضرورت	336
(81) مقررین اور واعظین کے لئے اہم ہدایت	337
(82) موجودہ دور میں ضعیف احادیث کی نشاندہی کی ضرورت	338
(83) تشدد وانتہاء پسندی کی ایک مثال	339
(84) دورِ صدیقی، یا فاروقی	//
(85) بزرگوں اور بڑوں کے حقیقی ادب واحترام کا فقدان	340
(86) اکابر سے فقہی اختلاف، عظمت کے منافی نہیں	342
(87) علماء وطلبہ کو علم میں تفقہ وتعمق اور اعتدال کی ضرورت	344
(88) نبی کے لیے ’’حضور‘‘ کے لقب کی حیثیت	358

www.idaraghufran.org

	(89) صبح کاذب کا صادق کے بعد نظر آنا	359
	(90) ''اللہ'' کے لیے ''خدا'' کے لفظ کا استعمال	360
	(91) موجودہ انگریزی اعداد و شمار کے ہندسوں کا حکم	362
	(92) مشورہ اور اعتراض	363
	(93) قرآن مجید کے ترجمہ کے لیے اہم چیز	364
	(94) اثباتِ حرام کے لیے تکلف و تعمق کا نقصان	366
	(95) مذہبی انتہاء پسندی اور اس کے نتائج	368
	(96) علمائے سوء کی بہتات و کثرت	370
	(97) حدیث کی سند کے قواعد، بزرگیت سے جدا ہیں	371

(98) ہر صدی میں مجدّد ہونے کی توضیح	376
(99) قیامِ پاکستان سے متعلق افراط وتفریط	381
(100) علماء میں معاشرت کا فقدان اور رسمیات کی کثرت	386
(101) مسائلِ جدیدہ میں علماء کا اختلاف اجتہادی ہے	389
(102) زقّوم اوراسٹابری(Strawberry)	394
(103) حدود کے مطابق کام کو جائز قرار دینے پرسختی کی مذمت	396
(104) قبلہ کی طرف رُخ کر کے سونا، یا قضائے حاجت کرنا	399
(105) قرآن اور اصلاحِ اخلاق	400
(106) بندہ کے نام کے ساتھ ’’خان‘‘ کی نسبت	404

Idara Ghufran

(107) فقہی تفرد، یا تفردات کے الزام کی حقیقت	406
(108) بعض صوفیاء ومشائخ کے ہاں ’’التزام مالا یلزم‘‘	410
(109) معاملات میں مشکلات کا حل اور مذہبِ غیر پر فتویٰ	417
(110) حدیث اور فتوے کا رنگ غالب ہونے والے کا فتویٰ	419
(111) انتظامی معاملات میں مروّجہ عیسوی تاریخوں کا استعمال	421
(112) اکابر کے ادب وتعلق کا ایک غلط مطلب	422
(113) علامہ عبدالحیٔ لکھنوی کا علمی کمال	424
(114) اپنے دشمن کے صحیح قول کو قبول کرنا حق پرستی ہے	425
(115) اہلِ علم میں پیٹھ پیچھے برائی کا مرض	426

Idara Ghufran

(116) میز کرسی پر کھانے کا حکم	427
(117) علماء کو غلطی کے اعتراف میں عار نہیں کرنی چاہیے	428
(118) لالچی، غریب ومتکبر لوگوں کے عالم بننے کا نقصان	432
(119) بعض مشائخ خود اصلاح طلب ہیں	433
(120) محرم کے بغیر سفر پر علامہ انور شاہ کشمیری کا موقف	434
(121) احادیث کی اسنادی تحقیق کی ضرورت	439
(122) ''فیضُ الباری'' شرح بخاری کا مقام	441
(123) علمِ دین کے عنوان سے غیبت اور عیب جوئی	444
(124) اختلافِ مسلک ومشرب کے باوجود باہمی محبت	445

	(125) تحزب اور گروہ بندی کا مرض	446
	(126) نجدیوں کے مقلد، یا غیر مقلد ہونے کا حکم	448
	(127) تقلید اور غیر مقلدین	449
	(128) سائنسی بنیاد پر رؤیتِ ہلال کے فیصلے کا حکم	452
	(129) آج کل کے رسمی جلسوں کی حالت	455
	(130) فقیہ کے لیے محدث ہونے کی ضرورت	457
	(131) ہم عصری کمالات پر پردہ ڈال دیتی ہے	458
	(132) سلف مجتہدین کا اختلاف اور موجودہ گروہ بندی	459
	(133) مال کی حرص اور پارٹی بندی کا نقصان	461

Idara Ghufran

(134) فقہی مسائل میں مشاورت	462
(135) علماء ومشائخ کا غیبت میں مبتلا ہونا	464
(136) واقعات کی روایت میں علماء کا غیر محتاط طرزِ عمل	466
(137) قبر پر پھول ڈالنے میں عدمِ تشدد	469
(138) علماء کے چندہ کرنے کا نقصان	473
(139) ''خصیتین'' کا مکروہ تحریمی، یا تنزیہی ہونا	476
(140) عوام کی سستی کی وجہ سے فقہی مسائل میں رعایت	480
(141) علمی اختلاف میں ایک بے اعتدالی	482
(142) علماء کے انبیاء کا وارث ہونے کی بنیاد	483

Idara Ghufran

(143) اکابر پرستی، اور اس میں غلو	486
(144) ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا	488
(145) مسئلہ حیات وممات	489
(146) نمازی کے سامنے کتنے فاصلہ سے گزرنا جائز ہے؟	491
(147) سماعِ موتٰی	492
(148) ’’فتحُ الباری‘‘ شرح بخاری کی اہمیت	494
(149) جذباتی علماء کا عوام میں غم، غصہ ومایوسی پیدا کرنا	497
(150) فروع میں مخالف امام کی اقتداء کا حکم	498
(151) جلسوں کے متعلق سنتِ نبوی	499

(152) عید کے دن قبرستان جانا	501
(153) محقق علماء، امام وخطیب اور مدرس اہلِ علم	503
(154) ضعفِ حدیث کو بیان کرنے کی ضرورت وافادیت	504
(155) موزوں وجرابوں پر مسح	507
(156) تقلید اور تحقیق	510
(157) بلا دلیل ’’تفرد‘‘ کا الزام	512
(158) اکابر ومشائخ کی اصطلاح کی حیثیت	513
(159) بلا دلیل کا الزام	515
(160) استنجاء واستبراء میں تشدّد وسختی کی ممانعت	517

Idara Ghufran

(161) تشدد پسندی کی انتہاء کا ایک واقعہ	520
(162) صرف ونحو کی کمزوری کا الزام	522
(163) حنفی کا غیر حنفی کی اقتداء میں نماز پڑھنا	527
(164) بزرگی کا معیار قبر سے خوشبو وغیرہ کا آنا نہیں	531
(165) علاقوں اور زمانوں کے حالات مختلف ہو سکتے ہیں	534
(166) تفقه فی الدین، اللہ کی طرف سے خیر کی دلیل ہے	541
(167) موجودہ دور کے مروَّجہ بحث ومباحثوں سے بچنے کا حکم	545
(168) ''معتقد و منتقد'' کی نظر اور طرزِ عمل میں فرق	548
(169) علماء کا غیر ضروری مسائل کے درپے ہونا	552

(170) علماء کی اصلاح وتنبیہ، ان کی خیر خواہی پر مبنی ہے	553
(171) محمد بن عبدالوہاب کے متعلق حضرت مدنی کا رجوع	556
(172) ذمہ داریوں اور اعمال میں فرقِ مراتب کی ضرورت	558
(173) یزید کو جانشین بنانے کی وجہ	559
(174) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کی حیثیت	563
(175) خواتین کے مساجد میں آنے میں عدمِ تشدد	565
(176) داؤد ظاہری وغیرہ کا اختلاف، اجتہادی ہے	571
(177) تکرارِ طلاق کی متعدد صورتیں اجتہادی ہیں	576
(178) پندرہ شعبان کا روزہ	582

www.idaraghufran.org

	(179) یک طرفہ جذباتی فیصلوں کا نقصان	584
	(180) تکفیرِ شیعہ کے متعلق معتدل اصولی موقف	586
	(181) اجتہادی واختلافی باتوں میں افراط وتفریط	591
	(182) حق کو قبول نہ کرنا	594
	(183) جوش وجذبہ سے متعلق حضرت شیخ الہند کا ایک اہم ارشاد	596
	(184) قربِ قیامت میں علمائے حق کا اٹھ جانا	598
	(185) مساجد اور اسلامک سنٹر	602
	(186) علم کے رنگ میں جہالت وزبان درازی	608
	(187) اجتہادی وفقہی امور میں ''یُسر وتوسع'' کی اہمیت	611

(188) جذباتیت اور سطحیت سے اجتناب	620
(189) انفرادی واقعات پر اجتماعی صلاحیتوں کی قربانی	622
(190) ایک صاحبِ علم و مصلح کے تبصرہ پر کلام	623
(191) متنازع روایتی اختلافات میں غلو سے اجتناب	626
(192) ”مکتبہ شاملہ لائبریری“ کے استعمال پر شبہات کا ازالہ	628
(193) اجتماعی قربانی کا عمل	633
(194) عادات اور عبادات میں ”رسم و بدعت“ کا فرق	639
(195) تحقیق و تقلید میں اختلاط و التباس	641
(196) عمر رسیدہ بزرگوں کو مقتداء و متبوع بنانے میں غلو	646

(197) سٹیج اور فیس بُکی فتووں کی حیثیت	651
(198) غیر اختیاری عمل پر اللہ کی طرف سے مؤاخذہ نہیں	652
(199) امام رازی اور سائنس وفلکیات کی اہمیت	659
(200) حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے متعلق معتدل موقف	669
(201) یزید بن معاویہ کے متعلق افراط وتفریط اور اعتدال	678
(202) بنوامیہ اور اہلِ شام سے بغض	684
(203) علامہ ابنِ تیمیہ کے متعلق بدگمانی وغلط فہمی کا ازالہ	689
(204) مولانا اسماعیل شہید کے چند علمی جوابات	696

Idara Ghufran

698	(205) متشدد مذہبی طبقہ کا مذموم رویہ
699	(206) اپنے اسلاف ومشائخ کا بدنام کنندہ طبقہ
701	(207) نمازِ عید، یا خطبہ کے بعد دعاء
702	(208) بدگمانی وبدزبانی
706	(209) تکفیر بازی، اور متعصبین ومتشددین کے الزامات
713	(210) معتدل اہل فکر سے، غیر معتدل اہلِ فکر کی شکایت
722	(211) ٹوپی اور وتر سے متعلق دو احادیث کی سندی توضیح
724	(212) یزید پر لعنت

725	(213) نفل نماز با جماعت	
726	(214) احمد رضا خان صاحب کی تکفیر	
727	(215) ہم عصریت کی وجہ سے اصحابِ کمال سے محرومی	
731	(216) شیخ الہند کا زندگی کے آخری حصہ میں سیکھا ہوا سبق	
737	(217) ''سادگی و بے تکلفی'' ایمان کی علامت	
741	(218) تقلیدِ مطلق ومقید میں فرق	

Idara Ghufran

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

(ازمولف)

تقریباً بیس سال قبل 1425ھ-2004ء میں جب ادارہ غفران، راولپنڈی سے ماہنامہ ''التبلیغ'' کی اشاعت کا آغاز کیا گیا، تو اس میں بندہ کی طرف سے متفرق موضوعات پر علمی وفقہی افادات، عمومی افادات وملفوظات، اور مختلف مکتوبات ومضامین کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوا، جن کو بہت سے احباب کی طرف سے پسندیدگی وافادیت کی نظر سے دیکھا گیا۔

مذکورہ افادات وملفوظات میں ایک بڑی تعداد ''علمی وفقہی'' نوعیت کی بھی تھی، جن کا تعلق مدارس واہلِ مدارس ''علماء وطلبہ'' سے ہے، اور یہ بات ظاہر ہے کہ دینی ادارے ''مدارس وجامعات'' دین کی حفاظت کے قلعے ہیں اور علماء وطلبہ ان قلعوں کے ستون ہیں، ان اداروں سے دین کے محافظ، اور احقاقِ حق وابطالِ باطل کی تبلیغ کرنے والے علمائے حق تیار ہوتے ہیں، اور یہاں سے قوم کے نظریاتی وعملی فساد وبگاڑ کی اصلاح کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

لیکن قربِ قیامت اور فتنوں کے دور میں جہاں دوسرے شعبہائے زندگی میں بگاڑ وانحطاط پیدا ہورہا ہے، وہاں دینی مدارس وجامعات میں بھی اس کے اثرات پہنچ رہے ہیں، اور یہاں سے تیار ہونے والے طلبہ وعلماء بھی ان اثرات سے دوچار ہورہے ہیں۔

اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس شعبہ کی خصوصی اصلاح وفلاح پر کام کیا جائے اور پیداشدہ فساد وبگاڑ سے حفاظت کا اہتمام کیا جائے۔

دوسری طرف موجودہ دور کے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ بھی ہے کہ موجودہ زمانہ کے عام طلبہ وعلماء اپنی اصلاح سے متعلق مضامین کو پسند نہیں کرتے، بلکہ بعض تو یہاں تک بھی کہہ دیتے ہیں کہ اس قسم کے مضامین سے علماء وطلبہ کی تنقیص لازم آتی ہے، جبکہ اس طرح کی سوچ درست نہیں، خوداحتسابی اور اپنی اصلاح کی ہر شخص اور ہر فرد کو اپنی جگہ ضرورت ہے، خواہ وہ

کسی بھی شعبہ سے وابستہ ہو، بلکہ علماء وطلبہ کے لئے اس چیز کی زیادہ ضرورت ہے، ورنہ اس کے اثرات سے پورے معاشرہ میں فساد پیدا ہوگا۔

اس سلسلہ میں ماہنامہ ''التبلیغ'' میں مختلف مواقع پر بندہ کے متفرق مضامین شائع ہوئے، ماہنامہ کے صفحات محدود ومختص ہونے کی وجہ سے بعض مضامین کچھ حذف واختصار کے ساتھ شائع ہوئے، اور پیچھے اصل مسودہ والی فائلوں میں، وہ مضامین مکمل طور پر محفوظ رکھے گئے۔

الحمدللہ تعالیٰ یہ مضامین غیر روایتی نوعیت کے ہیں، جن میں سے بیشتر مضامین اکابر سلف کے افادات سے ماخوذ ہیں، اور علماء وطلبہ کے لئے نہایت مفید ہیں، بشرطیکہ ان کو یکسوئی اور توجہ سے ملاحظہ کیا جائے، کیونکہ اس دور میں یکسوئی اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کا شوق بھی بہت کمزور پڑ گیا ہے۔

بہر حال اب جبکہ علمی وفقہی نوعیت کے وہ متفرق افادات معتد بہ مقدار میں جمع ہوگئے، تو ان کو بعض احباب کی خواہش پر نظرِ ثانی واصلاح کے بعد ''علمی وفقہی افادات'' کے عنوان سے طبع کیا جارہا ہے۔

ہر مضمون کے آخر میں متعلقہ ماہنامہ کا حوالہ بھی درج کردیا گیا ہے۔

جبکہ عام افادات وملفوظات، اور دیگر متفرق مکاتیب ومضامین کو علیٰحدہ علیٰحدہ جلدوں میں شائع کرنے کا نظم ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول ومنظور فرمائے، اور صلاح وفلاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

محمد رضوان خان

09/محرم الحرام/1446ھ 16/جولائی/2024 بروز بدھ

ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(1)

کون سے علماء، انبیاء کے وارث ہیں؟

اہلِ حق علمائے کرام دراصل انبیاء علیہم السلام کے سچے جانشین ووارثین شمار ہوتے ہیں۔

سنن ابی داؤد میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ:

''عالم کی، عابد پر فضیلت ایسی ہے، جیسا کہ چودھویں رات کے چاند کی دوسرے ستاروں پر فضیلت ہے۔

اور بے شک علماء، انبیاء کے وارث ہیں، اور انبیاء دینار اور درہم (روپیہ، پیسہ) کی وراثت چھوڑ کر نہیں جاتے، بلکہ علم کی وراثت چھوڑ کر جاتے ہیں، پس جس نے اس (انبیاء کی علم والی وراثت) کو لے لیا، تو اس نے بہت عظیم حصہ کو پالیا''[1]

اس لئے وارثانِ انبیاء پر خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دین کو صحیح صحیح طریقہ پر حاصل کریں اور پھر حکمت ومصلحت کے تقاضوں کے مطابق اس کو دوسروں تک پہنچانے کی خدمت بھی بحسن وخوبی انجام دیں۔

پھر یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ جب علمائے کرام، انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ٹھہرے، تو یہ سوچنا چاہئے کہ وراثت تو ہر چیز میں جاری ہوا کرتی ہے، مثلاً اگر کوئی فوت ہو جائے اور وہ مکان، جائیداد، زیورات، نقدی، گھریلو اشیاء، نئی وپرانی استعمالی وغیر استعمالی چیزیں، اپنی

---

[1] وإن فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر على سائر الكواكب، وإن العلماء ورثة الأنبياء، وإن الأنبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما، ورثوا العلم، فمن أخذه أخذ بحظ وافر (سنن ابی داود، رقم الحديث ٣٦٤١، كتاب العلم، باب الحث على طلب العلم)

قال شعيب الارنؤوط: حسن بشواهده (حاشية سنن ابی داود)

www.idaraghufran.org

ملکیت میں چھوڑے، تو ان سب نئی پرانی اور چھوٹی بڑی چیزوں میں وراثت جاری ہوگی۔

اب علمائے کرام بالخصوص اُن خطباء، مقررین، اور واعظین حضرات کو غور کرنے کی ضرورت ہے، جنھوں نے اپنی زندگی کا مشن ہی کسی خاص موضوع اور خاص فرقہ کو بنا رکھا ہے اور ان کی رات دن کی صلاحیتیں پورے دین کے بجائے، دین کے کسی خاص گوشہ پر ہی خرچ ہو رہی ہیں کہ کیا دین کے دوسرے شعبوں اور دوسرے موضوعات کی میراث ان کو حاصل نہیں؟

اسی سے اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اور ناقص وارثوں میں سے ہونے کا فرق خوب اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ علمائے حق ایک ایک کر کے اٹھتے جارہے ہیں، اور ان کی جگہ جہلاء مسلط ہوتے جارہے ہیں، جس کی بہت پہلے حدیث میں پیش گوئی کردی گئی تھی۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلٰكِنْ يَّقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، حَتّٰى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اِتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا (صحیح البخاری، رقم الحدیث ۱۰۰، کتاب العلم، باب: کیف یقبض العلم)

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ، علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ بندوں (کے سینوں سے) نکال لے، بلکہ علماء کو موت دے کر علم کو اٹھائے گا، یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہے گا، تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے اور ان سے (دین کے بارے میں) سوال کیا جائے گا اور وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، جس کی وجہ سے وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے (بخاری)

آج مذکورہ اور اس جیسی احادیث میں بیان کیا ہوا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

بڑے بڑے دین کے مراکز وجامعات، اور مدارس ومکاتیب پر اہلِ حق بزرگوں کے ایسے ایسے نسبی وارث قابض وبراجمان ہوتے جارہے ہیں، جو وراثتِ انبیاء کی نعمت سے یکسر محروم ہیں، نہ ان کے پاس ،قرآن وسنت کا صحیح علم ہے، نہ ان کا عمل وکردار اور رفتار وگفتار، سے علمِ دین، اور نبیوں کی جھلک نظر آتی، البتہ ان کی عیاشیوں اور شاہ خرچیوں سے دراہم ودنانیر کے وارث ہونے کا خوب پتہ چلتا ہے، جو زیادہ تر ''**العیاذ باللّٰہ**'' لوگوں کے چندہ کے مال سے ناجائز طریقہ پر ماخوذ ہوتا ہے۔

اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ علماء کو اپنی اس کم علمی وبدعملی کی روش کو ترک کر کے انبیائے کرام علیہم السلام کی ہمہ جہتی وراثت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا، اور پورا کرنا چاہیے۔

اور ہر سلسلہ کے بڑے اکابرومشائخ پر بھی خصوصیت کے ساتھ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے یہاں سے فارغ التحصیل، یا ماتحتی میں کام کرنے والے حضرات کی ایسی تعلیم وتربیت کا انتظام کریں، جس سے مذکورہ اوران جیسی دوسری بے اعتدالیوں سے بچا جاسکے۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 1 شمارہ 5، ربیع الثانی 1425ھ- جون 2004ء)

---

(2)

علماء واہلِ مدارس کی کوتاہیوں کے نقصانات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''مدارس میں متعدد امور (کئی معاملات) ایسے بھی پائے جاتے ہیں، جن کی اصلاح بہت ضروری ہے، اور اصلاح نہ ہونے سے اہلِ علم کی جماعت معترضین کا ہدفِ ملامت (لعن وطعن کا نشانہ) بھی بنتی ہے اور خود مدارس کی روح، یعنی عمل بالدّین وہ بھی ضعیف ہوجاتی ہے، اور نیز ان امور کو دیکھ کر دوسروں پر یہ اثر ہوتا

ہے کہ وہ لوگ علومِ دینیہ سے متوحّش اور نفور ہو جاتے ہیں، اور اس کا سبب اہلِ علم کی جماعت ہوتی ہے، تو گویا درجہ تسبب میں **یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ** (اللہ کے راستہ یعنی دین سے روکنے) کے مصداق میں داخل ہوتے ہیں'' (العلم والعلماء، ص ۱۲۴، بحوالہ حقوق العلم، باب: ۵، فصل نمبر ا، بعنوان ''مدارس کی اصلاح بہت ضروری ہے'' ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتورا باندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت باردوم: ۱۴۱۲ھ)

نیز ایک مقام پر حضرت موصوف فرماتے ہیں کہ:

''علماء کی جماعت میں اگر ایک شخص بھی لااُبالی (غافل اور لاپرواہ) ہوتا ہے، تو اس کا اثر سب پر پہنچتا ہے، اور یہ اثر دو طرح ہوتا ہے، ایک یہ کہ اس کو دیکھ کر دوسرے عوام بدعملی پر جرأت کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ سب علماء سے بدگمان ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے علماء پر اعتراض کی نوبت آتی ہے اور پھر اعتراض سے بدزبانی تک نوبت آ جاتی ہے، اس میں اگرچہ اکثر عوام غلط ہیں، کیونکہ'' **لَاتَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی** (قیامت کے دن ہر ایک کو اپنے اپنے کئے کی سزا بھگتنی ہوگی) لیکن زیادہ تر اس کا سبب ہم ہیں، اور وہ اعتراضات مخالفین کے نہیں ہوتے کہ ان کو حسد، یا بُغض پر محمول کر لیا جائے، یا یہ کہا جائے کہ اعتراضات تو انبیاء پر بھی ہوئے ہیں، پھر ہم کو اعتراضات کی کیا پرواہ۔

کیونکہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام پر اعتراضات کفار کی طرف سے ہوئے تھے اور علماء پر ان کے موافقین جو ان کا دم بھرتے ہیں، اعتراض کرتے ہیں، یہ بہت بڑا عیب ہے کہ اپنے لوگ بھی اعتراض کرنے پر مجبور ہوں، ہماری حالت، بے حد محلِ تأسف (اور قابلِ افسوس) ہے، اس سے عوام الناس پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے، یعنی ان کو یہ کہنے کی گنجائش ملتی ہے کہ علماء ایسے ہوتے ہیں، اگر خلوصِ تقویٰ نہ اختیار کیا جائے، تو اسی مصلحت سے اختیار کر لیا جائے کہ اس سے عوام بگڑیں گے،

www.idaraghufran.org

ورنہ ایسے لوگ ''یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ'' کے مصداق کہے جاسکتے ہیں، کیونکہ (دین سے) روکنا جس طرح مباشرتاً (وعملاً) ہوتا ہے کہ ہاتھ سے روکے تو اسی طرح تسبب (سبب بننا) بھی ایک قسم کا روکنا ہے، اس کو بھی ''صَدٌ عَنْ سَبِیْلِ اللہ'' کہا جائے گا، کیونکہ سببِ معصیت بھی معصیت ہوتا ہے (یعنی گناہ کا سبب اور ذریعہ بننا بھی گناہ ہوتا ہے) اور اسی معصیت (گناہ) کے ساتھ اس (سبب) کا بھی شمار ہوتا ہے'' (العلم والعلماء ص ۱۵۰، بحوالہ دعواتِ عبدیت، باب نمبر۶: اصلاح العلماء والطلباء، فصل نمبر۲، بعنوان ''بے عمل عالم پوری جماعت کی بدنامی کا سبب بنتا ہے'' ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتورا باندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت بارِ دوم: ۱۴۱۲ھ)

فائدہ: حکیم الامت رحمہ اللہ کے مذکورہ ارشادات سے درج ذیل امور معلوم ہوئے:

(1)...... دینی مدارس اور علماء میں کئی چیزیں قابلِ اصلاح ہیں، جن کی اصلاح کا اہتمام بہت ضروری ہے۔

(2)...... دینی مدارس اور علماء کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے کئی مفاسد اور نقصانات پیدا ہوتے ہیں، مثلاً:

(الف)...... دینی مدارس کی جو روح ہے، یعنی دین پر عمل کرنا، یہ ضعیف اور کمزور ہو جاتی ہے اور روح کے ضعیف ہونے سے خیر و برکت اُڑ جاتی ہے اور یہ سب سے بڑا نقصان ہے، جس پر آخرت میں اور اللہ رب العزت کے حضور بھی گناہ مؤاخذہ اور پکڑ کا خطرہ ہے۔

(ب)...... اس کی وجہ سے اہلِ علم حضرات پر اعتراضات وملامت کا راستہ کھلتا ہے، جو بے حد قابلِ افسوس ہے۔

(ج)...... علماء سے لوگ بدگمان ہو جاتے ہیں، جو بہت بڑے نقصان کی بات ہے۔

(د)...... جب علماء سے بدگمانی ہوتی ہے، تو اس کے بعد بدزبانی کی نوبت آتی ہے۔

(ھـــ)......دینی علم، مدارسِ دینیہ اور علمائے دین سے لوگوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور پھر لوگوں میں اس کی وجہ سے دینی علم سے محرومی اور دوری پیدا ہوتی ہے۔

(و)...... جب لوگ علماء کو کسی گناہ اور کوتاہی میں مبتلاء دیکھتے ہیں، تو ان کو بھی ان گناہوں پر جرأت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے ان کے دلوں سے اس گناہ کی بُرائی نکلتی جاتی ہے کہ جب علم والے بھی یہ کام کرر ہے ہیں، تو ہمارے کرنے میں کیا حرج ہے اور اگر ان کی بچت ہوسکتی ہے، تو ہماری بھی ہوسکتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

(ز)......اہلِ مدارس اور علماء کی غلطیوں کی وجہ سے لوگوں کے دین سے متنفر ہونے اور علم سے دور ہونے کا سبب، خود ان اہلِ مدارس اور علماء کی غلطی وکوتاہی ہوتی ہے اور کسی گناہ اور خرابی کا سبب بننا بھی گناہ ہے، لہٰذا اس اعتبار سے یہ علماء واہلِ مدارس خود بھی گناہ گار رہوتے ہیں اور دوسروں کو دین اور علم سے روکنے کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔

(ح)......علما اور اہل مدارس کی غلطیوں کی وجہ سے اپنے بھی بیگانے اور مخالف ہوجاتے ہیں۔

(ط)...... بدعملی اور کوتاہی کی وجہ سے علماء ومدارس پر جو اعتراضات ہوتے ہیں انہیں انبیائے کرام کی سنت قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اس کا سبب اپنی کوتاہی اور غفلت کو قرار دیا جاوے گا۔

(ی)......علماء اور اہل مدارس کی غلطیوں کو دیکھ کر عوام کو تمام علماء، دینی مدارس اور دینی علم سے متنفر نہیں ہونا چاہئے، بلکہ علماء، مدارس اور دینی علم کی اہمیت دل میں رہنی چاہئے۔

اب مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں مختلف قسم کی بداعمالیوں کا ارتکاب کرنے والے علماء کو غور کرنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ عوام الناس، دراصل ان کی ان غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے علماء ومدارس سے متنفر ہورہے ہیں اور کئی قسم کے اعتراضات کئے جارہے ہیں۔

ہم ایک عرصہ سے دیکھ رہے ہیں کہ علماء وطلبہ کی جن کوتاہیوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے عوام ان سے متنفر اور متوحش ہوتے ہیں، علماء اس کا الزام بھی عوام پر تھوپتے ہیں، اور ان سے شکایت کرتے ہیں کہ آج عوام کے دلوں میں علماء کا احترام اور قدر نہیں، بلکہ بعض اوقات تو عوام کے سامنے ہی ان چیزوں پر ان کو لعنت وملامت بھی کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب تک علماء، اپنی کوتاہیوں کا ازالہ نہیں کریں گے، اس وقت تک نہ عوام کے دلوں میں حقیقی قدر ومنزلت کو پیدا کیا جاسکتا، نہ ہی اعتراضات کا ازالہ کیا جاسکتا، اور نہ ہی علماء سے نفرت کو ختم کیا جاسکتا، بلکہ ایسی صورت میں تو یہ سلسلہ مزید ترقی کرتا جائے گا، اور پھر یہ بدعمل علماء، عوام سے اپنی عزت کی بھیک مانگتے پھریں گے، لیکن ان کو عزت دینے والا بھی میسر نہ ہوگا، یہ حالت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اور افسوس یہ ہے کہ اس طرح کے علماء کھلے عام بداعمالیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، اور بہت سے رنگے ہاتھوں پکڑے بھی جاتے ہیں، لیکن نہ تو ان کو خود سے اپنے اس منصب کی ذمہ داری کا احساس ہوتا، نہ ہی ان کے بڑوں اور بزرگوں کی اس طرف توجہ ہوتی کہ ان سے بھی اس بارے میں سوال ومواخذہ ہوگا، کیونکہ یہ نیچے کی سطح کے علماء، اپنے بڑوں کا نام لے کر ہی عوام میں اپنی شہرت کرتے ہیں، اوران بڑوں کی طرف سے ان کو سندیں فراہم کی جاتی ہیں۔

اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ بعض اوقات بڑوں کی طرف سے مختلف تاویلات، اور ہمہ جہتی چشم پوشی کا مظاہرہ کر کے بدعملی کے مرتکب علماء کو سہارا وحوصلہ بھی فراہم کیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج سلف علمائے حق کے نام سے قائم سلسلوں میں علمائے سوء کی کثرت وبہتات ہوتی جارہی ہے، جن کے عمل کا معاملہ تو اپنی جگہ ناگفتہ بہ ہے ہی، ان کے علم کا حال بھی بہت ناگفتہ بہ ہے، جس کی وجہ سے ان کو ''علماء'' کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔

اللہ حفاظت فرمائے۔آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 1 شمارہ 5، ربیع الثانی 1425ھ- جون 2004ء)

(3)

نااہل لوگوں کو مدرسہ کا عہدہ سپرد کرنا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جب اہلِ دیوبند (یعنی دیوبند کے بعض مقامی لوگ مدرسہ دارالعلوم کی) مجلس شوریٰ میں شریک ہونا چاہتے تھے اور حضرت گنگوہی نے منع فرمایا تھا، تو اس پر بہت شور تھا اور فتنہ کا اندیشہ تھا، تو میں نے حضرت مولانا گنگوہی کو لکھا کہ حضرت دفعِ شورش کے لئے کیا حرج ہے، اگر ایک دو کو مجلسِ شوریٰ میں لے لیا جائے، آخر تعداد تو ہمارے حضرات ہی کی زیادہ رہے گی اور کثرتِ رائے پر (عموماً) فیصلہ ہوتا ہے، تو جواباً مولانا گنگوہی نے تحریر فرمایا کہ نااہل کا ممبر بنانا معصیت (یعنی گناہ) ہے، جو سبب ہے، ناراضیِ خدا اور رسول کا، اس لئے ہم نااہل کو مدرسہ کا ممبر نہ بنائیں گے، چاہے مدرسہ رہے، یا نہ رہے، ہمیں رضائے الٰہی مقصود ہے، مدرسہ مقصود نہیں (العلم والعلماء ص ۸۲، بحوالہ: ملحوظاتِ جدید ملفوظات ص ۴۹، باب نمبر ۲: مدارس کا بیان، فصل نمبر ۵، بعنوان "نااہل کو ممبر بنانا" ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتورا باندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت بارِ دوم: ۱۴۱۲ھ)

معلوم ہوا کہ مدرسہ چلانے سے مقصود اللہ کی رضا ہونا چاہیۓ، اگر مدرسہ چلا کر اللہ اور رسول کی ناراضگی کا کوئی کام کیا جائے، تو مدرسہ چلانے سے بہتر اس کو بند کر دینا ہے اور نااہل، یا فاسق وفاجر کو مدرسہ کا کوئی عہدہ ومنصب سپرد کرنا گناہ ہے، جو اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی کا سبب ہے، اور مدرسہ کے مقصود کے بالکل خلاف ہے۔

آج ہم بہت جگہ دیکھتے ہیں کہ ایک مدرسہ کھول کر سینکڑوں اللہ کے احکام توڑے جاتے ہیں، مدرسہ چلانے کو مقصود سمجھ لیا گیا ہے اور اللہ کی رضا کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

بہت سے حضرات مالی فوائد حاصل کرنے کے لئے دنیاداروں، نااہلوں اور فاسقوں، فاجروں کو دینی مدارس کا سرپرست، یا ممبر وغیرہ بناتے ہیں۔

بعض دینی مدارس کے جلسوں میں، نااہل بلکہ فاسق وفاجر لوگوں کوبطور مہمانِ خصوصی کے مدعو کیا جاتا ہے، اور اِن کی سرپرستی میں دینی اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں، عموماً کسی سیاسی شخصیت کو دینی جلسہ میں مدعو کر کے اور اس کی تعظیم وتکریم میں مبالغہ کر کے جلسوں کو زینت بخشی جاتی ہے، جو لوگ رات ودن علماء اور دینی مدارس کے خلاف سرگرم نظر آتے ہیں، ان کو اپنے سر اور آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے، بھلا اِن نااہل لوگوں کو جنہیں صحیح معنیٰ میں وضو، غسل اور نماز کا طریقہ بھی نہیں آتا، منبرِ رسول اور وراثتِ رسول کے منصب پر بٹھلانا، بلکہ علماء پر فوقیت دینا، کون سی دین کی مصلحت اور دین کا اعزاز ہے۔

اور بعض اوقات یہ نااہل لوگ دینی مدارس میں آ کر ایسے انداز سے بات کر کے چلے جاتے ہیں جس سے عوام کے سامنے علماء اور دینی مدارس کی توہین وتذلیل ہوتی ہے، اور خود علماء اور اہلِ مدارس کے ان نااہل لوگوں کی تعظیم وتکریم کرنے سے یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ علماء اور اہلِ مدارس بھی ان شخصیات کے محتاج اور دستِ نگر ہیں، جو سراسر استغناء اور توکل کی شان کے خلاف ہے۔

اہلِ مدارس کو سوچنا چاہیے کہ کبھی ان نااہلوں کو بھی اپنے جلسوں اور تقریبات میں علماء اور اہلِ مدارس کو بطورِ مہمان خصوصی مدعو کرنے کی توفیق ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

علماء اور اہلِ مدارس سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ سے ان لوگوں کے دلوں میں دینی مدارس اور علماء کی وقعت پیدا ہوتی ہے۔

حالانکہ معاملہ برعکس ہے، ان لوگوں کے دلوں میں اس طریقہ سے علماء ومدارس کی ہرگز بھی وقعت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ رہی سہی عظمت بھی دل سے جاتی رہتی ہے، کیونکہ یہ لوگ علماء کے اس طرزِ عمل سے علماء واہلِ مدارس کو اپنا ماتحت، زیرِ اثر اور اپنے سے مرعوب سمجھنے لگتے ہیں۔

اس قسم کے لوگوں کو دینی اجتماعات میں منبرِ رسول پر لا کر لوگوں کے سامنے اعزاز واکرام کے ساتھ، پیش کرنے کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ لوگوں کے ذہنوں سے ان لوگوں کی طرف سے اجنبیت ختم ہوجاتی ہے اور آگے چل کر اگر یہی نااہل لوگ، علماء کے مقابلہ پر مساجد

ومدارس پر قابض ہوگئے، تو پہلے سے ان سے مانوس ہونے کی وجہ سے عوام الناس کا ان کو قبول کرنا آسان ہوگا۔

علماء اور اہلِ مدارس کو چاہیئے کہ اپنی دال روٹی پر شکر کریں اور ہرگز بھی اِن نااہل اور دین سے دور لوگوں پر بھروسہ نہ کریں، اور ان کو دینی جلسوں اور اجتماعات میں ہرگز بھی لوگوں کے سامنے عزت نہ بخشیں، دنیا کا اگر کوئی فائدہ ان کو مدعو کرنے سے حاصل ہو بھی گیا، تو اس فائدہ کے مقابلہ میں نقصانات کی حیثیت زیادہ ہے اور خود گناہ ہونا ہی اتنا بڑا نقصان ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی ساری دولت بھی نصیب ہوجائے، تو بے کار ہے۔

فوائد تو کچھ نہ کچھ ہر بری سے بری چیز میں کسی نہ کسی حیثیت سے نظر آ ہی جایا کرتے ہیں، شراب اور جوے جیسی ملعون چیزوں میں بھی کچھ دنیاوی فوائد کے ہوتے ہوئے، ان کے گناہ ہونے کے نقصان کو ہی ترجیح دی گئی ہے:

قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ، وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا (سورة البقرة رقم الآية ۲۱۹)

ترجمہ: کہہ دیجئے آپ! کہ ان دونوں (یعنی شراب اور جُوے) میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ نفع بھی ہے، مگر ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے (سورہ بقرہ)

یاد رکھیے کہ بے دینوں اور دنیا داروں، اور ان کے مال ودولت سے متاثر ہونا، دین کے کمزور اور دنیا کی اہمیت دل میں ہونے کی علامت ہے، علماء کو اس سے بچنا چاہیے۔

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 1 شمارہ 6، جمادی الاولیٰ 1425ھ - جولائی 2004ء)

---

(4)

طلبۂ کرام کی اصلاح اور تربیت سے غفلت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

www.idaraghufran.org

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ تعلیم کو تو سب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، مگر تربیت کو ضروری نہیں سمجھتے، حالانکہ تربیت کی ضرورت تعلیم سے بھی اہم ہے، تعلیمِ درسی سے تو من کل الوجوہ (ہر اعتبار سے) اور مطلق تعلیم سے مِن وجہٍ (بعض اعتبار سے) تعلیمِ درسی سے، تو اس لئے کہ وہ فرضِ عین نہیں، بہت سے صحابہ علومِ درسیہ سے خالی تھے، مگر ان پر کبھی اس (درسی علم) کو لازم نہیں کیا گیا، اور تربیت، یعنی تہذیبِ نفس، ہر شخص پر فرض عین ہے اور مطلق تعلیم سے (تربیت) اس (لئے اہم ہے) کہ مقصود تعلیم سے تربیت ہی ہوتی ہے، کیونکہ تعلیم (کا مطلب) علم دینا ہے، اور تربیت (کا مطلب) عمل کرانا، اور (یہ بات ظاہر ہے کہ) علم سے مقصود عمل ہی ہے، اور مقصود کا (غیر مقصود سے) اہم ہونا (بالکل) ظاہر ہے (اصلاحِ انقلابِ امت، حصہ دوم، ص ۱۹۶، باب النفقات الروحانیۃ "نفقاتِ روحانیہ کا مفہوم" بعنوان "تربیت کی ضرورت، تعلیم سے بھی زیادہ اہم ہے" ناشر: ادارۃ المعارف، کراچی)

آج ہم نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ عام طور پر دینی مدارس میں طلبۂ کرام کی تربیت واصلاح میں بہت کمزوری پائی جاتی ہے۔

دینی مدارس کا مقصود بہت سے حضرات نے تو صرف تعلیم کو ہی بنا لیا ہے، مدرسہ کے اچھا، یا غیر اچھا ہونے کا معیار تعلیم کو ہی سمجھا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں مدرسہ میں تعلیم بہت اچھی اور بہت اعلیٰ ہے، اور کسی مدرسہ کے بارے میں سوال کرنے والا بھی عام طور پر یہی سوال کرتا ہے کہ فلاں مدرسہ کی تعلیم کیسی ہے؟ طلبہ کی کتنی تعداد ہے؟ بس تعلیم پر ہی سارا زور لگایا جاتا ہے، اور عام طور پر مہتمم صاحب سے لے کر مدرسین تک کسی کو جب بھی کبھی مدرسہ کی بہتری اور ترقی کی سوجھتی ہے، اور اس بارے میں مشورہ ہوتا ہے، تو تعلیم کی بہترائی اور کتابوں کی تکمیل وغیرہ پر ہی مشورہ کیا جاتا ہے، اور اسی کے لئے کوششیں کی جاتی ہیں۔

اور بعض حضرات نے تو تعلیم سے بھی زیادہ تعمیر اور طلبہ کی تکثیر کو اہم سمجھ لیا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ بہت عالی شان مدرسہ ہے، دو منزلہ، تین منزلہ اور وسیع ترین عمارت ہے، طلبہ کی تعداد

اتنی ہے، اور لوگوں کو تعاون، اور چندہ کی طرف راغب کرنے کے لئے بھی بڑھ چڑھ کر عمارتوں کے حسن وجمال اور طلبہ کی تعداد ہی کو پیش کیا جاتا ہے، ان کی تصاویر اور تعداد وغیرہ شائع کی جاتی ہیں، گویا کہ ان حضرات نے مدرسہ کی تعمیر اور طلبہ کی تکثیر وتعداد کو سب سے پہلا درجہ اور تعلیم کو دوسرا درجہ دے دیا، اور تعمیل وتربیت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔

حالانکہ اصل چیز تعمیل وتربیت تھی، پھر تعلیم اور اس کے بعد طلبہ کی تکثیر کا درجہ تھا اور آخری درجہ میں تعمیر تھی، گویا کہ صرف ظاہری شکل وصورت اور تعداد وکمیت، اور کام کے عام اور وسیع ہونے کو مقصود سمجھ لیا گیا ہے، اور حقیقی روح اور کیفیت، اور کام کے تام اور مکمل ہونے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور اسی اُلٹی رِیت کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ عوام کے سامنے بھکاریوں کے انداز میں چندہ مانگنے، اور اس مقصد کے لئے در بدر امیروں کے دروازوں پر جانے کی خاطر، اپنی عزت کو داؤ پر لگایا جاتا ہے۔

بھلا اس سے بڑھ کر علمائے دین کی کم نصیبی، بے وقعتی اور کیا ہوسکتی ہے۔

بعض مدارس کے طلبہ کا تو حلیہ اور وضع قطع بھی دینی طلبہ کے مطابق نہیں ہوتی، نمازوں میں بھی کوتاہی سامنے آتی ہے، طلبہ باہر گلیوں اور بازاروں میں آوارہ پھرتے ہیں، چھوٹے، بڑے طلبہ کا باہم غیر ضروری اختلاط اور میل جول ہوتا ہے، آپس میں غلط تعلقات اور دوستیاں قائم ہوتی ہیں، سینما ہالوں میں جا کر فلمیں دیکھتے ہیں، گلی محلوں میں جا کر ٹی وی وغیرہ پر کھیل اور میچ وغیرہ دیکھتے ہیں، ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں، ایک دوسرے کی چیزیں چوری کرتے ہیں اور اس طرح کی سینکڑوں خرابیاں موجود ہوتی ہیں (یہ اس دور کی بات ہے، جب ہر ایک کے پاس موبائل فون، اور اس پر آنے والے پروگرام اور مناظر کا سلسلہ نہیں تھا، اب تو مدارس وجامعات میں رہتے ہوئے ہی موبائل کے ذریعہ بہت سی خرافات شروع ہوگئی ہیں)

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل ایک طبقہ علماء کے روپ میں ایسا آ گیا ہے، جس کا مقصد مدرسہ کی شکل میں ایک قسم کی دوکان کھولنا، اور لوگوں سے مال حاصل کر کے اپنی عیاشی کرنا ہے

،نہ اسے طلبہ کی تربیت کی فکر ہے، اور نہ ان کی آخرت درست کرنے کا احساس ہے، بھلا مدارس کے جن ذمہ داروں اور اہلِ حل وعقد کی اپنی تربیت نہیں ہوئی، اور جو خود غیر تربیت یافتہ ہیں، اور وہ خود ہی تربیت کے ماحول سے نہیں گزرے، ان سے دوسروں کی تربیت کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟

ایسے نااہل اور دینی احکام سے نابلد لوگ، دو چار حروف پڑھ کر اور اپنی ظاہری شکل وصورت مولویوں اور عالموں والی بنا کر، مدرسہ کے مہتمم اور ذمہ دار بن بیٹھے ہیں، جنہیں نہ تو زکاۃ وصدقات کے مصارف کا علم ہوتا، اور نہ ہی ذرہ برابر مدرسہ کی ذمہ داریوں، اور خاص کر مالیات کے معاملات اور نزاکت کا احساس ہوتا، اس بناء پر ان کی طرف سے مالِ مفت دلِ بے رحم کی مثالیں سامنے آتی ہیں، مدرسہ کے اجتماعی فنڈ کو اپنا ذاتی مال، اور اس کی جائیداد کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھ کر، بے دردی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔

دوسری جانب ان کے سرپرست اور بڑے علماء کی طرف سے مداہنت، اور ان کی بے جا مدافعت اور مسامحت وچشم پوشی، بلکہ مزید براں ایسے نااہلوں کی سرپرستی، اور ان کی چاپلوسی وتملق سے مزید خرابیاں پیدا ہورہی ہیں۔

ان حالات میں اللہ رب العزت کی طرف سے کسی بڑے وبال، اور عذاب کا نازل ہوجانا، اور عیاشیوں کے نتیجہ میں، اللہ کی زمین کے تنگ ہوجانے کے سیاہ بادلوں کا سروں پر منڈلانا کوئی بعید نہیں۔ اللہ حفاظت فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 1 شمارہ 7، جمادی الاخریٰ 1425ھ - اگست 2004ء)

---

(5)

مدارس کی مروّجہ سندِ فراغت اور دستارِ فضیلت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

بعض مدارس میں ایسے لوگوں کو سندِ فراغت دے دی جاتی ہے، یا دستار بندی کر دی جاتی ہے، جو باعتبار صلاح وعمل کے اس کے اہل نہیں ہوتے، جب ان لوگوں کی علمی وعملی کوتاہیاں دوسروں پر ظاہر ہوتی ہیں، تو سارے علماء کو ان پر قیاس کر کے سب سے بدظنی ہو جاتی ہے، تو دین کے معاملات میں، پھر کس سے رجوع کریں گے، کس کے قول پر عمل کریں گے، پھر دین کا کیا حشر ہوگا، تو ان مفاسد کا سبب وہ بے احتیاط لوگ ہوئے، جو نااہلوں کو قوم کے سامنے سند دے کر اہل ظاہر کرتے ہیں (تحفۃ العلماء، ج۱، استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے ص ۱۱۵، بحوالہ تجدید تعلیم وتبلیغ ص ۴۷، بعنوان: ''سند دینے میں اہلِ مدارس کی ذمہ داری'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

اور حضرت موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں:

ہر شخص مقتدا بننے کے لائق نہیں ہوتا، بعضے نالائق بھی ہوتے ہیں، ایسوں کو فارغ التحصیل بتا کر مقتداء بنا دینا ''خیانت'' ہے (تحفۃ العلماء، ج۱، استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے ص ۱۱۵، بحوالہ: التبلیغ ج ۲ ص ۳۱۲، بعنوان: ''نااہل کو سند دینا خیانت ہے'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

نیز حضرت موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں:

بعض مدارس کی رسم ہے کہ جب طالبِ علم نے کتابیں پڑھ لیں، خواہ اس کی استعداد ہو، یا نہ ہو، اس کو فضیلت کی سند دے دیتے ہیں اور دستار بندی کر دیتے ہیں۔

غور کرنا چاہئے کہ دستار بندی کی رسم واقع میں اساتذہ مشائخ کی طرف سے عوام کے روبرو اس امر کا اظہار اور شہادت ہے کہ یہ شخص ہمارے نزدیک اس قابل ہے کہ دین میں اس کی طرف رجوع کیا جائے، اور اس سے مسائل پوچھ کر عمل کیا جائے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ شخص آج سے مقتدائے دین ہے، جب اس کی حقیقت

یہ ہے، تو جو شرائط شہادت کی ہیں، وہ اس میں بھی ہونا واجب ہے، اور شہادت کی بڑی شرط یہ ہے کہ شاہد (گواہی دہندہ) کو اس امر کا پورا علم اور یقین ہو، جس کی شہادت دے رہا ہے کہ وہ صحیح ہے، تاکہ اس کو جھوٹ کا گناہ اور دوسروں کو دھوکا دینے کا گناہ نہ ہو اور کسی کو اس سے ضرر نہ پہنچے۔

اسی طرح یہاں بھی اس شخص کی نسبت پوری تحقیق ہونا چاہئے کہ (یہ شخص جس کو سند دی جارہی ہے) **مقتدافی الدین** بننے کے قابل ہے، یا نہیں؟

اگر علمائے حاضرین کو اس پر پورا اطمینان ہو، اور اس کی علمی و عملی حالت قابلِ قناعت ہو، تو دستار بندی بہت خوب (اچھی) رسم ہے کہ اس میں ناواقفوں کے روبرو اظہار ہو جاتا ہے، بشرطیکہ تکلفاتِ زائد جس میں کہ ریاء واسراف لازم آئے، نہ کئے جائیں اور بدون اہلیت کے ہرگز ہرگز دستار بندی نہ کی جائے، نہ سند دی جائے کہ بجز اضلالِ خلق (مخلوق کو گمراہ کرنے کے) اس کا اور کیا ثمرہ ہے

(تحفۃ العلماء، ج ۱، استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے ص ۱۱۶، بحوالہ اصلاح الرسوم ص ۱۵۵، بعنوان: ''سند اور دستار بندی کی شرعی وفقہی حیثیت'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

ایک طرف تو سندِ فراغت اور دستارِ فضیلت کی مذکورہ حیثیت کو دیکھئے، اور دوسری طرف آج کل کے عام فارغ التحصیل اور دستارِ فضیلت حاصل کرنے والے طلبہ کی حالت کا جائزہ لیجئے تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ آج کل اکثر و بیشتر اس سلسلہ میں شرعی قواعد وضوابط کی پابندی میں بہت کمی پائی جاتی ہے۔

ہر سال بڑے بڑے جلسے منعقد کر کے تھوک کے حساب سے سندِ فراغت اور دستارِ فضیلت کا اجراء ہوتا ہے، اس کی حقیقت اور مقصد کو تو شاید سوچنے اور سمجھنے کی نوبت بھی نہ آتی ہو، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اکثر مقامات پر یہ ایک طرح کی رسمِ محض بن کر رہ گئی ہے۔

طالبِ علموں کی علمی وعملی حالت سے قطعِ نظر اور صرفِ نظر کر کے صرف مخصوص مدت کا نصاب الٹا سیدھا پڑھ لینے اور کورس پورا کر لینے کو کافی سمجھ لیا گیا ہے، اور صرف اسی بنیاد پر سندِ فراغت اور دستارِ فضیلت فراہم کر دی جاتی اور نااہل طلبہ کو عوام کے سامنے رہبر اور پیشوا بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے، اور پھر اس پر خوشی اور اطمینان کا اظہار بھی کیا جاتا ہے کہ صاحب اس مرتبہ ہمارے یہاں اتنی اور اتنی تعداد میں طلبہ کو سندات فراہم کی گئیں اور اتنے طلبۂ کرام کو دستارِ فضیلت دی گئی، اور دورہ حدیث شریف سے اتنی تعداد طلبہ کی فارغ ہوئی۔

بعض اوقات طلبہ کی تعداد کم ہونے کی صورت میں مصنوعی حضرات کو عوام کے سامنے فاضل وفارغ بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کل سندِ فراغت اور دستارِ فضیلت ایسے حضرات کے ہاتھوں سے دلوائی جاتی ہے، جن کو متعلقہ طلبہ کی علمی وعملی حالت کا پوری طرح علم نہیں ہوتا، کیونکہ عموماً دوسری جگہ سے کسی بڑے بزرگ اور مشہور شخصیت کو بلا کر ان کے ذریعہ سے یہ خدمت انجام دلوائی جاتی ہے، اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ جناب بزرگوں کے ہاتھوں سے یہ کام انجام دلانے میں برکت ہوگی۔

بلاشبہ بزرگوں کے ہاتھوں میں برکت ہوتی ہے، اس کا انکار نہیں، لیکن یہ بھی تو غور کرنا چاہئے کہ شرعاً یہ شہادت اور گواہی کا حکم رکھتی ہے، اور اجنبی شخص کو گواہی دینا ممکن نہیں، اور آج کل کے حالات میں متعلقہ مدارس کے مہتممین پر اعتماد بھی کافی نہیں۔

بے شمار حضرات نے تو جلسۂ دستار بندی اور دستارِ فضیلت کو تشہیر کا ایک ذریعہ بنالیا ہے، اسی لئے دورہ کے طلبہ کی مختلف طریقوں سے وظیفوں وغیرہ کے ذریعہ سے راغب کر کے اپنی طرف ٹانگیں کھینچی جاتی ہیں، جس کے سہارے کارگزاری میں مبالغہ اور غلط بیانی کا بھی مشاہدہ ہے، بس کسی نہ کسی طرح لوگوں سے چندہ حاصل کرنا اور ان پر اثر ڈالنا ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے اشتہارات میں سندِ فضیلت حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔

ختمِ بخاری کے مواقع پر عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ تکلفات سے کام

لیا جاتا ہے، مدارس اور دارالاقامہ کے کمروں کی زیب وزینت میں بے انتہا غلو کیا جاتا ہے، شادی بیاہ کی طرح رسمیں ہوتی ہیں، کارڈ شائع کیئے جاتے ہیں، سندِ فراغت ملنے والوں کو دولہا بنایا جاتا ہے، گلے میں پھولوں اور نوٹوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں، سجی ہوئی گاڑیوں میں بٹھا کر لایا جاتا ہے، رشتہ دار اور کنبہ وبرادری کے بے شمار لوگوں کے جمع کرنے ،اور ان کے کھانے پینے اور قیام کے انتظام کو اتنا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ ان اخراجات کو پورا کرنے کا اگر اپنے پاس انتظام نہیں ہوتا، تو کسی سے قرض لے کر ان تکلفات کو پورا کیا جاتا ہے، کئی مقامات پر تصاویر سازی واشتہار بازی کے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں (اور اب جب سے موبائل کا سلسلہ عام ہوا ہے، اس وقت سے تو ہر ایک کی طرف سے منظر کشی کر کے تشہیر کا ایک تماشہ بن گیا ہے، بعض جگہ تو مدارس کی طرف سے منظّم انداز میں سارے پروگرام کی منظر کشی کی جاتی ہے، پھر اس کی تشہیر کر کے چندہ حاصل کیا جاتا ہے)

ان علمائے کرام اور مہتممین حضرات سے گزارش ہے کہ کیا قرآن وحدیث اور درسِ نظامی کی کسی کتاب میں ،یا مستند اسلاف کی طرف سے بھی ان رسموں اور تکلفات کی تعلیم دی گئی ہے، جن کو اس موقع پر انجام دیا جاتا ہے؟

اور کیا ان کے اپنے ان اکابر ومشائخ کا یہی طریقہ اور طرزِ عمل تھا، جن کی طرف یہ خود اپنی نسبت کرتے ہیں؟ اور یہ لوگ کس طرح ،اور کس منہ سے ان اکابر ومشائخ اور بزرگانِ دین کی طرف اپنی نسبت کرنے کا حق رکھتے ہیں؟

اور ان کے کونسے طرزِ عمل سے بزرگانِ دین کی اتباع ظاہر ہو رہی ہے؟ کیا جن بزرگوں کی طرف یہ لوگ آج اپنی نسبت کر کے اپنے آپ کو عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں، ان کی یہی تعلیم ہے؟

اور کیا ان بزرگوں کی طرف سے قیامت کے دن اپنے گریبانوں کو پکڑے جانے کا خوف دل میں نہیں ہے؟

آخر کونسی چیز ان رسموں اور تکلفات میں پڑنے کی دعوت دیتی ہے؟

اگر نیک نیتی کے ساتھ غور کیا جائے گا، تو سب کچا چٹھا کھل کر مستحضر ہو جائے گا، اور کل قیامت کا دن آنے سے پہلے اپنی اصلاح کی توفیق ہو جائے گی (جیسا کہ اگلے مضمون میں آتا ہے) اللہ کے واسطے کچھ خوف کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے ڈرنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ سمجھ اور فہم کی سلامتی عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 1 شمارہ 8، رجب ۱۴۲۵ھ - ستمبر 2004ء)

---

(6)

رسمی جلسوں کے مقاصد ومفاسد

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’جہاں تک غور کر کے اور تجربہ کی شہادت سے دیکھا جاتا ہے، بڑی غرض ان (مدسوں کے مروجہ) جلسوں کے انعقاد کی دو امر معلوم ہوتے ہیں۔

فراہمیِ چندہ، اور اپنی کارگزاری کی شہرت، یا یوں کہئے کہ مدرسہ کی وقعت ورفعت، جس کا حاصل حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ نکلتا ہے، جس سے نصوصِ کثیرہ میں نہی فرمائی گئی ہے، ہر چند کہ مال وجاہ اگر دین کے لئے مقصود ہوں، تو مذموم (بُرے) نہیں، مگر کلام اس میں ہے کہ ایسے مواقع پر یہ امور دین کے لئے مقصود ہیں، یا دنیا کے لئے، سو گو نفس تاویل کر کے دین ہی کے لئے بتلاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ہر قصد کے لئے ایک خاص معیار بنایا ہے، جس سے صحت، یا فسادِ قصد معلوم ہو جاتا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر دین مقصود ہوتا، تو اس کے اسباب وطرق میں بھی کوئی امر، خلافِ رضائے حق تعالیٰ اختیار نہ کیا جاتا۔

اور جب ایسے امور اختیار کیئے جاتے ہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مقصود ہے، اوران امور میں سے بعضے بطور نمونہ درج ہیں۔

(1)...... چندہ کے حاصل کرنے میں قواعدِ شرعیہ کی رعایت نہیں کی جاتی، کیونکہ حکمِ شرعی ہے "لَایَحِلُّ مَالُ امْرِیٍٔ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسِہٖ" (کسی انسان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حاصل کرنا حلال نہیں) چندہ میں سوچ سوچ کر وہ طریق اختیار کیئے جاتے ہیں، جس سے مخاطب کے قلب پر اثر پڑے، گو وہ اثر دباؤ، یا شرم ولحاظ سے کیوں نہ ہو، ایسے لوگوں کو (چندہ حاصل کرنے کے لئے) واسطہ بنایا جاتا ہے، مجمع میں ان کے روبرو فہرست بھی پیش کی جاتی ہے، شرکتِ جلسہ میں اصرار کیا جاتا ہے، اور یقیناً معلوم ہے کہ بڑے آدمیوں کو خالی ہاتھ آنے میں سبکی وکم وقعتی کا اندیشہ ہوتا ہے (ان کے مقابلہ میں) بقایا کو مشتہر (دیگر لوگوں کی تشہیر) کرتے ہیں، جس سے ان کو اپنی بدنامی کا خوف ہوتا ہے۔

(2)...... حکمِ شرعی ہے کہ ریا (ودکھلاوا) حرام ہے، اور اکثر ایسے مواقع پر دینے والوں کے دل میں ریا ہوتی ہے، اور ریا کا سبب بن جانا بھی معصیت (وگناہ) ہے۔

(3)...... اکثر اوقات علماء کا امراء (ومالداروں) کے دروازوں پر جانا، اور اُن سے تملُّق (چاپلوسی) کی باتیں کرنا۔

(4)...... جن اموال کو (خود علماء بھی) حلال نہیں کہتے، اگر وہ بھی حاصل ہوں، ہرگز انکار نہیں کیا جاتا، ممکن ہے، یا واقع ہے کہ کسی غالب سود، یا رشوت والے نے کچھ دیا ہو، اور اس کو جلوت میں، یا خلوت میں واپس کر دیا ہو۔

(5)...... اپنے مدرسہ کو اصلی حالت سے اکثر زیادہ ظاہر کیا جاتا ہے، تصریحاً، یا ایہاماً (یعنی صاف، یا اشارہ وکنایہ، اور گول مول انداز میں) جس کا حاصل کذب وخداع (جھوٹ اور دھوکہ) ہے۔

(6)...... اگر کوئی شخص مدرسہ پر کسی قسم کا اعتراض کرے، اور وہ حق بھی ہو، تو ہرگز اس کو قبول نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کے درپے ہو کر رد کرنے کی کوشش ہوتی ہے، گو دل میں اس کو حق سمجھتے ہیں، جس کا حاصل ''بطرِ حق'' (حق بات کا انکار) ہے۔

(7)...... اگر اور کوئی مدرسہ مقابلہ میں ہو جائے اور گو اس کی حالت واقع میں اچھی ہو، مگر ہمیشہ وہ مثلِ خار (کانٹے کی طرح) نظر آتا ہے، اور دل سے اس کے انہدام وانعدام (نیست ونابود کرنے) کے متمنی رہتے ہیں، ورنہ خوش ہونے کی بات تھی کہ دین کا کام کئی جگہ ہو رہا ہے، لیکن محض اس وجہ سے کہ اس کی شہرت نہ ہو جائے، اُس (دوسرے مدرسہ) میں چندہ کی بیشی (زیادتی) اور اِس (اپنے مدرسہ) میں کمی نہ ہو جائے، ناگواری ہوتی ہے۔

(8)...... کارروائی میں کارگزاری کا اظہار، اپنی مدح، اپنے مدرسہ کی ترجیح، اپنے کام کی خوبی وکثرت دکھلانا، اور اس کی وجہ سے تعلیم کی کمیت (یعنی مقدار) کا کیفیت (ومعیار) سے زیادہ اہتمام کرنا، اور کتابیں بلا استعداد گھسیٹنا کہ کارروائی دکھلا سکیں، خواہ طالب علموں کو آئے، یا نہ آئے۔

ان علامات میں سے اول چار حُبِ مال لغیر الدین (غیر دین کے لئے مال کی محبت) کی علامتیں ہیں اور مؤخر کی چار حُبِّ جاہ لغیر الدین (غیر دین کے لئے جاہ کی محبت) کی علامات ہیں۔

اور فسادِ منشاء کی وجہ سے آثار بھی ایسے ہی مرتب ہوتے ہیں۔

(9)...... اکثر ایسے جلسوں میں اسراف (مال کا ضیاع) ہوتا ہے، جن لوگوں کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں، ان کے اور ان کے رفقاء وخدام کے کرایہ میں بہت سے روپے جاتے ہیں، بعض اوقات طعام وغیرہ کا بھی مدرسہ سے اہتمام ہوتا ہے، جس میں تکلفات ہوتے ہیں اور ساتھ میں غیر اضیاف (غیر مہمان) بھی

کھاتے ہیں اور غالبًا، بلکہ یقینًا روپے والوں سے اذن نہیں لیا جاتا، اور دلالتِ اذن کا بھی دعویٰ مشکل ہے، کیونکہ اہلِ عطاء (دینے والے) خود ایسے مصارف کی مذمت (وبرائی) کرتے ہیں۔

(10)......بعض جگہ مسجد میں ایسے جلسے ہوتے ہیں، اور مسجد کے ساتھ بیٹھک کا سا برتاؤ ہوتا ہے، شور وشغب، دنیا کی باتیں، اشعارِ مذمومہ، اور بہت سے منکرات، جو مشاہدہ سے متعلق ہیں، جب مسجد میں وہ امورِ مباحہ بھی ناجائز ہیں، جن کے لئے مسجد موضوع نہیں (تو ناجائز امور کی گنجائش کہاں ہوسکتی ہے) تا بہ منکرات چہ رسد۔

(11)...... ایسی کارروائیوں سے بجائے وقعت وعزتِ مقصودہ کے اہلِ علم کی ذلت وحقارت، اہلِ دنیا کی نظر میں ہوتی ہے، کیونکہ اصل عزت استغناء ہے، اور اس تحقیر کا ثمرہ (ونتیجہ) یہ ہوتا ہے کہ اپنی اولاد کے لئے علمِ دین کو پسند نہیں کرتے کہ یہی انجام ان کا ہوگا، گویا یہ حالت "مَنَّاعٌ لِلْخَیْرِ" (خیر سے روکنے) کا ایک شعبہ ہے۔

(12)......تکثیرِ سوادِ طلبہ ومحصلین (یعنی طلبہ اور جن کے لئے چندہ کیا جاتا ہے، ان کی تعداد کی کثرت) کے دکھلانے کو نااہلوں کو، اہل دکھلایا جاتا ہے، "وَقِسْ عَلٰی هٰـــذا" (اور انہی پر دوسری خرابیوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے) (امداد الفتاویٰ ج۴ ص ۶۵ تا ۶۷، کتاب الحظر والاباحۃ، تعلیم وتعلم اور کتب ومدارس کے احکام، بعنوان "تحقیق متعلق جلسہائے متعارفہ مدارس" ناشر: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی ۲۰۱۰ء)

مدارس کے مروجہ جلسوں میں ایک ایک کرکے ان خرابیوں کا جائزہ لیجئے، تو صاف نظر آئے گا کہ ان خرابیوں سے شاید ہی کچھ جلسے خالی ہوتے ہوں، چنانچہ عام طور پر ان جلسوں کی مندرجہ ذیل دو بڑی غرضیں معلوم ہوتی ہیں۔

(1)......لوگوں کو جمع کرکے ان کے سامنے اپنی کارگزاری کو حقیقت سے بڑھ کر ظاہر کرنا۔

www.idaraghufran.org

(2)......لوگوں کو جمع کر کے ان کو چندہ کے لئے آمادہ کرنا، اوران سے چندہ وصول کرنا۔

اوران دونوں غرضوں کا منشاء، مال اور جاہ کی محبت ہے اور یہی دونوں چیزیں، یعنی حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال تمام بیماریوں اور مفاسد کی جڑ ہیں، اور شاید آج کل کے نام نہاد اہلِ علم حضرات کو تو ان دونوں بیماریوں کی پوری حقیقت بھی معلوم نہ ہو، اور جب بیماری اور مرض کا ہی علم نہ ہوگا، تو اس کے علاج کی فکر کیسے ہوگی؟

اسی وجہ سے ان جلسوں میں تقریر اور بیان کرنے کے لئے، ایسے حضرات کا انتخاب کیا جاتا ہے جو خوب گھی اور مکھن لگا کر اور چکنی چوپڑی باتیں کر کے مدرسہ کی شان وشوکت اور کارگزاری بیان کرنے، اور مدرسہ کے ذمہ داران کی تعریف وتوصیف میں مبالغہ کرنے، اور لوگوں سے چندہ حاصل کرنے، اور ان کو چندہ پر آمادہ کرنے کا خوب رنگ ڈھنگ جانتے ہوں، نیز ان کے لچھے دار بیان پر مجمع اکٹھا ہوتا ہو، اور خوب واہ واہ کرتا ہو۔

اس کے بعد حضرت تھانوی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

''وجوبِ ترک کے لئے صرف قبیح بالذات (بذاتِ خود بُرا ہونا) شرط نہیں، بلکہ قبیح بالغیر (کسی واسطہ سے بُرا ہونا) کافی ہے، سو یہ امر تو مسلَّم (تسلیم) ہو چکا ہے کہ بہت سے بلکہ کُل جلسے مفاسدِ معروضہ سابقہ (ماقبل میں پیش کئے گئے مفاسد) سے خالی نہیں ہوتے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسداد (روک، تھام) حتی الامکان ضروری ہے، اور ان کی ترویج مباشرۃً، یا تسبباً منہی عنہ (بذاتِ خود، یا سبب بن کر ان کو رواج دینا ممنوع ہے) ایسی حالت میں اگر کوئی مہتممِ مدرسہ نہایت احتیاط کے ساتھ جلسہ کرے، تو مباشرِ مفاسد (بذاتِ خود مفاسد کا مرتکب) تو نہ ہوگا، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسرے غیر احتیاطی جلسوں کی ترویج کا سبب تو بنے گا، فقہاء نے بہت مواقع میں بعض مباحات کو محض سدًّا لِلذرائع وحسماً لمادّۃ الفساد (ناجائز کاموں کے اسباب اور فساد کی بنیاد کو ختم کرنے کے لئے) تاکید

سے روکا ہے، چنانچہ علمائے محققین اِس زمانہ میں رسومِ مروجہ، مولود و فاتحہ و اعراس کو ''گو بانی اعتقاداً و عملاً محتاط ہی کیوں نہ ہو'' اسی بناء پر روکتے ہیں کہ دوسرے بے احتیاطوں کے لئے سند ہوگی، اور بے احتیاطوں کے لئے سبب ترویج کا ہوگا۔

اس حکم میں مجالسِ مدعیہ (میلاد وغیرہ) و مجالسِ مدرسیہ (مدرسہ کے مروجہ جلسے) متماثل و متساوی (برابر) ہیں، چنانچہ مشاہدہ کے بعد تأمل کرنا کافی ہے۔

اور (بعض نیک ومخلص اور محتاط حضرات کی طرف سے) جو مصلحتیں ان جلسوں (کو منعقد کرنے) میں ارشاد ہوئی ہیں (مثلاً یہ کہ جو لوگ شریکِ چندہ ہیں، ان کو واقعی کیفیت بلا زیادتی اور کمی کے سنائی جائے اور انعام تقسیم کر کے جو طلبہ قابل ہیں، ان کو خوش کرنا مقصود ہوتا ہے، تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو، اور نیز چند علماء جمع ہو کر وعظ و نصیحت کریں، تاکہ لوگوں کو ہدایت ہو اور مخلوق کو فائدہ پہنچے وغیرہ) ان کے مصلحت ہونے میں کلام نہیں، مگر مصالح اور مفاسد میں جب تعارض ہوتا ہے، مفاسد کے اثر کو ترجیح ہوتی ہے، جبکہ مصالح، حدِ ضرورتِ شرعی تک نہ پہنچے ہوں، اور مانحن فیہ (ہماری زیرِ بحث صورت) میں ظاہر ہے کہ ضرورتِ شرعی نہیں ہے (پس مواقعِ ضرورت بشرطِ رعایتِ احتیاط مستثنیٰ ہوں گے، اور گو یہ قلیل ہوں، مگر معدوم نہیں) بلکہ مصلحت بھی اسی صورت میں منحصر نہیں ہے، معینین (معاونین) کو بذریعہ روئدادِ تحریری حالت مدرسہ کی معلوم ہو سکتی ہے اور طلبہ کا ویسے بھی انعام پا کر دل خوش ہو سکتا ہے، اور وعظ و ہدایت، اول تو ایسے مواقع پر شرکاءِ جلسہ کو صاف صاف کرنا مشکل ہے، ان کے تکدُّر کا خیال ہوتا ہے، پھر اس مقصود کا اہتمام، مستقل طور پر (مروجہ جلسے منعقد کئے بغیر دوسرے مواقع پر) بھی ہو سکتا ہے'' (امداد الفتاویٰ ج ۴ص ۶۹ تا ۷۰، کتاب الحظر والاباحۃ، تعلیم و تعلم اور کتب و مدارس کے احکام، بعنوان ''تحقیق متعلق جلسہائے متعارفہ مدارس'' ناشر: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی ۲۰۱۰ء)

www.idaraghufran.org

عام مدارس کے مروّجہ جلسوں کے مفاسد ومنکرات تفصیل کے ساتھ پہلے بیان کیے جاچکے، لہٰذا ضروری ہوا کہ اس طرح کے مروجہ مفاسد ومنکرات پر مشتمل جلسوں کو ترک کیا جائے، اور اگر کوئی ان مفاسد ومنکرات سے پرہیز کر کے مروجہ جلسے منعقد کرے، تب بھی ان جلسوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جلسے دوسرے لوگوں کے لئے اس عنوان سے مفاسد ومنکرات پر مشتمل جلسوں کا ذریعہ بنیں گے، اور عوام الناس کی باریکیوں پر نظر نہیں ہوتی، لہٰذا وہ صرف عنوان کو دیکھ کر سند پکڑیں گے، اور ان جلسوں کا حوالہ دے کر سب کو ایک ہی درجہ میں رکھیں گے، اور شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ بذاتِ خود اس میں تو کوئی بُرائی نہ ہو، لیکن بُرائی کا ذریعہ بن رہی ہو، تب بھی اس چیز کو ترک کرنے کا حکم ہو جاتا ہے، ہاں اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ اس کو اختیار کرنا شرعاً ضروری ہو، تو اس وقت حکم یہ ہوتا ہے کہ اس چیز میں پیدا شدہ خرابیوں کو دور کیا جاتا ہے اور ضروری حکم پر عمل کیا جاتا ہے، مگر مروجہ عام جلسوں کو منعقد کرنا، شرعاً ضروری نہیں، اور جو مصلحتیں اور فائدے ان مروجہ جلسوں کو منعقد کرنے کے سلسلہ میں پیش کیے جاتے ہیں، ان کا دوسرے طریقوں سے حاصل کرنا بھی ممکن ہے، لہٰذا مروجہ جلسوں کو منکرات سے بچتے ہوئے بھی منعقد کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

البتہ اگر کبھی واقعی کوئی ضرورت (جس کا شریعت اعتبار کرتی ہو) کسی جلسہ کو منعقد کرنے کی پیش آئے، تو مروجہ منکرات ومفاسد سے بچتے ہوئے، اور دوسرے لوگوں کے لئے سند بننے سے بچنے کا سامان کرتے ہوئے، صرف ضرورت کی حد تک اجازت ہوگی۔

(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد اشارہ 9، 10، شعبان 1425ھ - اکتوبر 2004ء - رمضان 1425ھ - نومبر 2004ء)

---

(7)

طلبہ کو اصول وقواعد کا پابند بنانے میں غفلت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

’’اکثر عربی مدرسوں میں طلبہ کی خواہش و مذاق، اور کثرتِ تعداد کے مقابلہ میں اصول وقواعد کی پرواہ کم کی جاتی ہے، اس سے بھی مفاسد پرورش پاتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ طلبہ کو قواعد کا پابند بنایا جائے، خواہ اِن کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہوجائے، کام کے دو چار، ناکارہ سو دو سو سے افضل ہیں‘‘ (العلم والعلماء، ص۱۲۷، بحوالہ تجدید تعلیم ص ۱۲۸، باب: ۵، فصل نمبر ۱، بعنوان ’’طلبہ کو قواعد کا پابند بنایا جائے‘‘ ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتورا باندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت بارِ دوم: ۱۴۱۲ھ)

ملاحظہ فرمایئے! کہ اکثر عربی مدرسوں میں طلبہ کی خواہش اور ان کے مذاق اور تعداد کی زیادتی کو اصول وقواعد کی پابندی کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں بہت سے مفاسد جنم لیتے ہیں۔

چنانچہ جن مدارس میں طلبہ کی تعداد کی کثرت پر نظر ہوتی ہے، وہاں طلبہ میں آزادی زیادہ نظر آتی ہے، وہ اپنی من مانی اور من چاہی زندگی گزارتے ہیں، ذمہ دار اور بڑے حضرات کو یہ شکایت رہتی ہے کہ اتنی بڑی تعداد کو قابو کرنا، ہمارے بس کی بات نہیں، کس کس کو کن کن خرابیوں سے روکا جائے، اور کہاں تک نگرانی کی جائے، بعض ذمہ دار اور نگران حضرات چند دن نگرانی اور باز پرس کرتے ہیں، مگر بالآخر تنگ آ کر وہ بھی اس ذمہ داری سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ بات کبھی بھی اہلِ مدرسہ کو فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ آخرت کی کامیابی اور نجات کا دارومدار طلبہ کی تعداد کی کثرت پر نہیں، بلکہ ان کی اصلاح اور تربیت پر ہے، اور جب طلبہ کی اصلاح وتربیت ہی نہ ہوگی، تو پھر تعداد کے زیادہ ہونے سے کیا حاصل ہوگا؟

بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ اس طرح طلبہ کی کثرت آخرت میں پکڑ اور مؤاخذہ کا سبب نہ بن جائے۔

جب طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، تو پھر ان سب کی خواہشات، اور مزاج ومزاق کی رعایت ملحوظ رہنے کی سوجھتی ہے، کیونکہ اس کی خلاف ورزی کی صورت میں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں طلبہ کی

www.idaraghufran.org

تعداد کم نہ ہو جائے، اور طلبہ بھاگ نہ جائیں، یا پھر یہ طلبہ آپس میں مل کر مہتمم، یا شوریٰ کے خلاف ہڑتال وسٹرائک نہ کر دیں۔

اور تجربہ ومشاہدہ ہے کہ طلبہ کو اصول وقواعد کا پابند بنائے بغیر، طلبہ کی اصلاح وتربیت ہونا مشکل ہے۔

لہٰذا طلبہ کی اصلاح وتربیت ''جس پر کہ آخرت کی نجات وکامیابی موقوف ہے'' کے لئے اصول وقواعد کا تقرر ضروری ہوا، پھر اصول وقواعد کی پابندی کے نتیجہ میں طلبہ کی تعداد کم ہو، یا زیادہ، اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے، کیونکہ دو چار کام کے طلبہ کا وجود، سینکڑوں ناکام طلبہ کی تعداد سے افضل ہے۔

افسوس! کہ اکثر اہلِ مدارس نے آج اس مقدس اصول کو چھوڑ دیا، جس کے نتیجہ میں طلبہ وعلماء کا تشخص اور ان کے قول وفعل کا تقدس بھی پامال ہو گیا، اور وہ عوام کی نظروں میں ذلیل وخوار ہو کر رہ گئے۔

خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اصلاح وتربیت اور اصول وقواعد کی پابندی کے مقابلہ میں طلبہ کی تعداد پر نظر رکھنا، اخلاص کے خلاف ہے، اور اخلاص کے بغیر کوئی عمل بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول نہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ اپنے اندر اخلاص کا جذبہ پیدا کیا جائے، اور اس کی طلبہ کو بطورِ خاص تعلیم دی جائے، اور مذکورہ امور کی نشاندہی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 1 شمارہ 11، شوال ۱۴۲۵ھ۔ دسمبر 2004ء)

---

(8)

مدارس میں طلبہ کی بے جا مار پٹائی کے مفاسد

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

ایک طبقہ ہے میاں جیوں (استادوں) کا، یہ بچوں کے ساتھ بہت زیادہ ظلم کرتے ہیں، ان کو جب کسی بچہ پر غصہ آتا ہے، تو قہرِ عام کی طرح سب پر برستا ہے کہ ایک طرف سے سب کی خبر لیتے چلے جاتے ہیں، اس سے میاں جی بہت کم بچے ہوتے ہیں (تحفۃ العلماء، ج۱، رسالہ ''استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے'' ص۱۳۰، بحوالہ التبلیغ، ج۱۴ص۸۴، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

''میاں جی صاحب کوتو کچھ پوچھئے ہی نہیں، انہوں نے یہ مثل یاد کر لی ہے کہ ''ہڈی ماں باپ کی اور چمڑی استاد کی'' نہ معلوم یہ کوئی قرآن کی آیت ہے، یا حدیث، یا فقہ میں کہیں لکھا ہے، اور لطف یہ ہے کہ بیوی پر (یا جس کسی دوسرے پر غصہ آیا ہے، اس پر) تو بس نہیں چلا، وہ غصہ باہر بچوں پر اترتا ہے، یہ تو عیسائیوں کا کفارہ ہوگیا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی، میاں جی صاحبان یادرکھیں کہ قیامت کے دن اس کا بدلہ دینا ہوگا، یہاں بچوں کی چمڑی آپ کی ہے، وہاں آپ کی چمڑی بچوں کی ہوگی، کیا تماشہ ہوگا کہ وہ بچے جو اِن (استادوں) کے محکوم (تابع اور ماتحت) تھے، ساری مخلوق کے سامنے ان کو پیٹ رہے ہوں گے'' (تحفۃ العلماء، ج۱، رسالہ ''استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے'' ص۱۳۰، ۱۳۱، بحوالہ التبلیغ اوج قنوج، ج۵ص۴۶، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

میاں جی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لڑکے ہماری ملک ہیں، اس لئے مارنے میں دریغ نہیں کرتے، اگر یوں کہو کہ خطاء پر پیٹتے (اور مارتے) ہیں، تو یہ غلط ہے، غصہ پر مارتے ہو، جب تک غصہ ختم نہ ہو، اس وقت تک مار ختم نہیں ہوتی، خطاء پر مار یہ ہے کہ اس کے انداز سے سزا دو (تحفۃ العلماء، ج۱، رسالہ ''استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم و تربیت کے طریقے'' ص۱۳۱، بحوالہ: دعواتِ عبدیت ج۱۹ص۱۱۹، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

اب تو جبریہ تعلیم کا قاعدہ نکل آیا ہے، دینی مکاتیب سے بُعد (دوری) ہورہا ہے، اس

سختی سے تو بچے اور اُچاٹ ہوں گے، اور دینی تعلیم کو چھوڑ دیں گے، ایسے وقت تو نہایت شفقت سے کام لینا چاہئے (تحفۃ العلماء، ج۱، رسالہ ”استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم و تربیت کے طریقے“ ص۱۳۲، بحوالہ: ملفوظات ص۴۵ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

قطع نظر اس سے ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ زیادہ مارنا، تعلیم کے لئے بھی مفید نہیں ہوتا، بلکہ مضر ہوتا ہے:

(1)...... ایک تو یہ کہ بچے کے قویٰ (یعنی اعضاء) کمزور ہو جاتے ہیں۔

(2)...... دوسرے یہ کہ ڈر کے مارے سارا پڑھا لکھا، بھول جاتا ہے۔

(3)...... تیسرے جب بچہ پٹتے پٹتے عادی ہو جاتا ہے، تو بے حیا بن جاتا ہے، پھر پٹنے سے اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا، اُس وقت یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے اور ساری عمر کے لئے ایک خُلقِ ذمیم (بری عادت) یعنی بے حیائی اس کی طبیعت میں داخل ہو جاتی ہے، بعض طلبہ کا فہم (وحافظہ) قدرتاً کم ہوتا ہے، لہٰذا ان کو مارنا پیٹنا زیادتی ہے، مؤاخذہ ہوگا، اعتدال سے مارنا پیٹنا چاہئے (تحفۃ العلماء، ج۱، رسالہ ”استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم و تربیت کے طریقے“ ص۱۳۳، بحوالہ: التبلیغ اوج قنوج، ج۵ ص۴۶، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

میں نے اپنے مدرسہ کے معلموں کو بچوں کو مارنے کے لئے منع کر دیا ہے، کیونکہ یہ لوگ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں، اور شفاءِ غیظ (یعنی غصہ کی بھڑاس نکالنے) کے لئے مارتے ہیں، ایسا زدوکوب (اور ایسی مار پیٹ) کی اگر ولی اجازت بھی دے دے، تو بھی درست نہیں (تحفۃ العلماء، ج۱، رسالہ ”استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم و تربیت کے طریقے“ ص۱۳۳، بحوالہ: کلمۃ الحق ص۱۲۳، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

معلوم ہوا کہ جو استاد بچوں کو بے دریغ اور حد سے زیادہ مارتے ہیں، وہ سخت گناہ گار ہیں، بعض لوگ تو اس بارے میں یہاں تک کہتے سنے گئے ہیں کہ ”بدن کے جس حصے پر استاد کی

طرف سے مار پڑ جائے، وہ بدن کا حصہ، جہنم پر حرام ہو جاتا ہے'' گویا کہ جنت میں جانے کے قابل ہو جاتا ہے، اس لئے جنتی بنانے کے لئے مارتے پیٹتے ہیں، یہ بالکل بے سروپا اور بے سند بات ہے۔

زیادہ مارنا، اپنی جگہ گناہ تو ہے ہی، اس کے ساتھ ہی اس کی معافی بھی آسان نہیں، کیونکہ یہ حقوق العباد میں سے ہے۔

اگر بچہ نابالغ ہے، تو معاف کرنے کا بھی اہل نہیں، اور بالغ ہونے کے بعد معافی مشکل ہے، پڑھ کر چلے جانے کے بعد نامعلوم وہ کہاں ہے اور کہاں نہیں؟ پھر کس کس سے معافی مانگی جائے گی؟ جبکہ یہ گناہ بے شمار بچوں کے ساتھ زیادتی کر کے کیا ہو، تو ان سب کا پتہ چلا کر معافی تلافی بہت مشکل ہے۔

پھر آج کل اتنی ایمانی قوت بھی نہیں کہ اپنے چھوٹوں اور خاص کر شاگردوں سے معافی طلب کی جائے اور پھر معافی طلب کرنے کے بعد وہ خوشدلی سے معاف بھی کر دیں۔

اس بے جا مارنے پیٹنے کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام دینی علم اور دینی مدارس سے متنفر ہو رہے ہیں اور اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے روک رہے ہیں، اس حیثیت سے بے جا مارنے پیٹنے والے حضرات لوگوں کو دینی علم سے روکنے کا بھی سبب بنتے ہیں۔

اس لئے ضرورت اس چیز کی ہے کہ جو استاد بچوں کو بے دریغ مارتے پیٹتے ہیں، وہ اپنی اصلاح کا سامان کر کے دنیا وآخرت کے وبال وعذاب سے بچیں اور مہتمم و ذمہ دار حضرات کو چاہئے کہ استادوں کو اس حرکت سے باز رکھنے کا انتظام کریں، اور خلاف ورزی پر مناسب باز پرس کریں، اور باز نہ آنے پر ایسے استاد کو اپنے منصب سے سبکدوش کر کے مناسب متبادل بندوبست کریں، ورنہ قیامت کے روز اس وبال میں استادوں کے ساتھ یہ مہتمم اور ذمہ دار حضرات بھی شریک ہوں گے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

سزا اور تادیب کی ضرورت پڑتی ہے اس کی اجازت ہے اور ’’الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ ‘‘ کے قاعدے سے اتنی ہی تادیب (سزا) دینے کی اجازت ہوسکتی ہے جو پرورش اور تربیت (وتعلیم) میں معین ہو، نہ اتنی جو درجہ ایلام (سخت تکلیف اور مصیبت) تک پہنچ جائے ،ایسی زیادتی قطع نظر گناہ ہونے کے انسانیت اور فطرت کے بھی خلاف ہے۔

ضربِ فاحش (سخت مارنے) سے فقہاء نے صراحتاً منع فرمایا ہے اور جس ضرب (مار) سے جلد پر نشان پڑجائے ،اس کو بھی (فقہاء نے) ضربِ فاحش میں داخل کیا ہے، اور جس سے ہڈی ٹوٹ جائے ،یا کھال پھٹ جائے ،وہ بدرجہ اولیٰ ہے، بلکہ ضربِ فاحش سے خود استاد کو تعزیر دی جائے گی (تحفۃ العلماء، ج۱، رسالہ ’’استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے‘‘ ص۱۳۴، فصل نمبر۳، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت:۱۴۱۵ھ)

(1)...... بچوں کی بہتر سزا یہ ہے کہ چھٹی بند کردی جائے، اس کا ان (بچوں) پر کافی اثر ہوتا ہے۔

(2)...... میں نے دو سزائیں مقرر کر رکھی ہیں، ایک کان پکڑوانا، جس کو مراد آباد والے بطخ بنوانا، اور ہمارے علاقہ میں مرغ بنوانا کہتے ہیں۔

(3)...... دوسرے اٹھنا بیٹھنا، اس میں دونوں اصلاحیں ہوجاتی ہیں، جسمانی بھی کہ ورزش ہے اور نفسانی ،یعنی اخلاقی بھی کہ اس سے زجر (وتوبیخ اور تنبیہ) ہوجاتی ہے۔

(4)......سزا میں دو چپت بھی کافی ہیں (تحفۃ العلماء، ج۱، رسالہ ’’استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے‘‘ ص۱۳۶، فصل نمبر۳، بحوالہ: حسن العزیز ج۳ ص۸۹ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت:۱۴۱۵ھ)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''آج کل کے مدرسین (گویا) ظالم اور قصائی ہیں، جن میں شفقت نام کو نہیں، میں نے ایک بچہ کو دیکھا، اس کی عمر چار برس سے زیادہ نہ ہوگی اور لڑکے اس کو ڈنڈا ڈولی کیئے (زبردستی اٹھائے لا رہے ہیں، افسوس ہے کہ اکثر بچے انہیں ذابحین (یعنی ذبح کرنے والوں) کے قبضہ میں آتے ہیں، اور پھر وہ تباہ وبرباد ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کے اس برتاؤ سے یا تو (بچوں کی) طبیعت کُند ہو جاتی ہے (اور پڑھنے کی قابلیت جاتی رہتی ہے) یا (وہ) پڑھنا چھوڑ بیٹھتے ہیں اور یہ پرانا مقولہ ہے کہ ''حافظ جی! ہڈی ہماری، چمڑا تمہارا''

صاحبو! استاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مربی (تربیت کرنے والا) ہو اور اگر وہ ایسا نہ کرسکے، تو وہ استاد بننے کے قابل نہیں، ایک طرف تو تربیت ہو، ایک طرف تعلیم، پھر دیکھئے یہ (علم حاصل کرنے والا) شخص کس شان کا (بن کر) نکلتا ہے

(تحفۃ العلماء، ج۱، رسالہ ''استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے'' ص۱۱۲، بحوالہ: تجدید تعلیم وتبلیغ ص۷۷، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

معلوم ہوا کہ عام حالات میں تو بچوں کو مارنے کی اجازت ہی نہیں، اور ضرورت پڑنے پر بھی اس کے لئے شرائط مقرر ہیں، کئی دوسرے مشائخ نے بھی اس بات کی صراحت فرمائی ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

بقدر ضرورت ایک، دو، تین چپت تحمل کے موافق گردن اور کمر پر مارنے کی گنجائش ہے، لکڑی، یا کوڑے، یا جوتے وغیرہ سے اجازت نہیں، حق سے زائد مارنے پر یہ بچے قیامت میں قصاص لیں گے (فتاویٰ محمودیہ، ج ۱۴ ص ۱۲۸، کتاب الحدود والقصاص والشہادۃ، باب التعزیر، بعنوان ''بچوں کو سزا دینے کی حد'' ناشر: دارالافتاء: جامعہ فاروقیہ، کراچی)

اور مفتی صاحب موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''اصلاحِ احوال اور چیز ہے، جذبۂ انتقام اور چیز ہے، ہمارے یہاں جو اساتذہ

اُن بچوں کو پیٹتے ہیں، جن کے سبق یاد نہیں ہوتا، بچے کہنا نہیں مانتے، اللہ معاف کرے یہ، جذبہ تو بہت کم ہوتا ہے کہ بچوں کی خیر خواہی مقصود ہو، استاد صاحب کی بات نہیں مانی، استاد کہتا ہے کہ پانچ دفعہ کہہ دیا تجھے، دس دفعہ کہہ دیا، تو یاد نہیں کرتا ہے، خالی بیٹھا رہتا ہے، تو زیادہ غصہ اس بات پر ہے کہ تو نے ہماری بات مانی کیوں نہیں، ورنہ تو یوں کہتے کہ دیکھو خالی بیٹھنے سے سبق یاد نہیں ہوتا، یہ نہیں کہتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ تجھے دس دفعہ کہہ دیا، پھر بھی سبق یاد نہیں کرتا، زیادہ غصہ اس بات پر ہے، اسی غصہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے یاد نہیں کرتے، بڑے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمہ اللہ کے ایک مرید ہیں، ایک گاؤں ہے، دودھ گڑھ، وہاں ایک قاری صاحب تھے، وہیں بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، بڑے حضرت کو معلوم ہوا کہ قاری صاحب بچوں کو پیٹتے ہیں، تو حضرت نے کہلا کر بھیجا کہ قاری صاحب سے کہو کہ جب غصہ آیا کرے، تو اپنا سر دیوار پر مار لیا کریں، بچوں کو نہ مارا کریں۔

اور مارنے کی بھی حد ہے، فقہاء نے لکھا ہے، شامی میں موجود ہے، اس لئے اس سے زیادہ جو ماریں گے، تو قیامت کو یہ بچے انتقام لیں گے، مولانا تھانوی نے تصریح کی ہے کہ بچے کو ایک دفعہ میں تین چپت سے زیادہ مارنے کی اجازت نہیں ہے، اور وہ بھی چہرہ اور سر پر نہیں، وہ بھی زیادہ زور سے نہیں، قمچی سے، لکڑی سے، چمڑے سے ان میں سے کسی سے مارنے کی اجازت نہیں ہے۔......

حضرت مولانا (خلیل احمد) سہارنپوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جو استاد بچوں کو مارتا اور مار کر پڑھاتا ہے، اس کو پڑھانا نہیں آتا، زیادہ پٹائی سے بچے بے حیاء ہو جاتے ہیں، آگے کو کام نہیں کرتے ہیں۔

اورنگزیب عالمگیر رحمہ اللہ کے دربار میں تین آدمی پیش کئے گئے، تینوں کے تینوں

ایک جرم میں، انہوں نے کیا سزا دی ؟ ایک کو تو گھور کر دیکھا، دوسرے کو کچھ ڈانٹا دھمکایا، تیسرے کو کوڑے لگوائے، وزیروں نے کہا کتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے، جرم ایک ہے، سزائیں سب کی الگ الگ ہیں، اورنگزیب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ افسوس جو کچھ میں دیکھتا ہوں، تم نہیں دیکھتے، جاؤ تینوں کے حالات کی تحقیق کرو، پہلا شخص جس کو گھور کر دیکھا تھا، اس کے مکان پر پہنچے، تو وہاں تو کفن دفن کا انتظام ہو رہا ہے، اس کا انتقال ہوگیا، غیرت کی وجہ سے کہ بادشاہ نے گھور کر دیکھ لیا۔

دوسرے شخص کے مکان پر گئے، تو معلوم ہوا کہ حکیم جی کو بلایا جا رہا ہے، بے ہوش پڑے ہوئے ہیں۔

تیسرے کو دیکھا کہ بازار میں کھڑا ہے، ڈنڈا لئے ہوئے کہ اتنے جوتے لگ گئے، اتنے کوڑے لگ گئے، اور لگ جاویں گے (کیا فرق پڑتا ہے)

تو مزاج الگ الگ ہے، سب کا، یہ نہیں کہ سزا ایک ہو، وہ بہت گہرے آدمی تھے عالمگیر رحمہ اللہ خوب دیکھتے بھالتے تھے (خطبات محمود، ج۱ص ۲۱۴ تا ۲۱۶، وعظ: جذبۂ انتقام اور معافی، ناشر: مکتبہ محمودیہ، میرٹھ، یوپی، انڈیا، سنِ اشاعت: ۱۴۳۶ھ، ۲۰۱۵ء)

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب اور حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب نے بھی حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی ہدایات کی تشریح کی ہے، فرماتے ہیں:

غصہ کی حالت میں مارتے وقت عقل ٹھکانے نہ ہونے سے بعض وقت اس قدر زیادہ مار دیا کہ استاد کی پٹائی کے لئے، اس کے ورثاء پہنچ گئے، اور بڑی مشکل سے استاد کی عزت بچائی گئی، نیز زیادہ مارنے سے بچوں کو دینی تعلیم ہی سے وحشت ہو جاتی ہے، اور فی زمانہ جبکہ انگریزی تعلیم کی طرف عوام کا رجحان زیادہ ہے، اور بہت کم لوگ اپنے بچوں کو دینی تعلیم میں لگاتے ہیں۔

نیز انگریزی سکولوں میں بچوں پر مار پیٹ سخت ممنوع ہے، اور نہایت شفقت کا

Idara Ghufran

اظہار کیا جاتا ہے، بلکہ اب تو بچوں کو بعض سکولوں میں چائے اور ٹافیاں بھی کھلائی پلائی جاتی ہیں، حالانکہ شفقت اور محبت طلباء پر کرنا، یہ دینی حضرات کا حصہ تھا، غصہ میں مغلوب ہو کر جب تادیب ہوتی ہے، تو خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کی جانب سے تھانہ بھون میں اساتذہ کو سخت ہدایت تھی کہ بچوں کو مارنے میں نہایت احتیاط سے کام لیں، ایک استاد تھے، وہ بہت مارتے تھے اور بار بار ہدایت سے بھی باز نہ آئے، پھر حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ نے ان تمام طلباء کے سامنے مُرغا بنوا دیا، حالانکہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ اساتذہ کا بڑا اکرام فرماتے تھے، اس عمل سے انتہائی آپ کا قلبی اَلَم اور صدمہ اس فعل سے ظاہر ہوتا ہے۔

اگر استاد کی مار پیٹ کی بے اعتدالی سے امتِ مسلمہ کا ایک بچہ بھی متوحّش اور ہراساں اور خوفزدہ ہو کر علمِ دین کا تارک ہوا، تو اُس کی اِس محرومی کا وبال استاد پر اور منتظمین پر بھی ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ جس طرح اپنی اولاد پر شفقت ہوتی ہے، اسی طرح ہر طالب علم پر ہونی چاہئے، حضرت اقدس ہردوئی کا ارشاد ہے ''وزیر کا بچہ، پیر کا بچہ اور فقیر کا بچہ استاد کی نظر میں، توجہ، مہربانی اور شفقت کے لحاظ سے برابر ہوں''

بچوں کے مارنے سے جہاں تک ہو سکے احتیاط کریں، البتہ سخت ضرورت پر حدود اور بچے کے تحمل کا لحاظ رکھتے ہوئے معمولی تادیب کر دیں، چنانچہ حضرت اقدس ہردوئی نے فرمایا کہ بعض بچے جو نئے داخل ہوئے، بعض وقت استاد کو بُری بُری گالیاں تک دیدیں، اس وقت استاد کو تحمل اور صبر کی تلقین کی جاتی ہے اور ان کی صرف یہ سزا ہوتی ہے کہ استاد کا جوتا الٹی طرف سے (یعنی تلا والا نہیں) ان کے سر پر رکھا جاتا ہے، دماغ کو سینک دینا، اس کا نام ہے، کسی کے سر پر ایک گھنٹہ رکھا

جاتا ہے، جب تک وہ معافی نہیں مانگ لیتے، یہ سینک جاری رکھا جاتا ہے، یہ بھی سرسام ہے، اس کو سینکنا مفید ہے (امت کی پریشانی اور انحطاط کا سبب اور اس کا علاج، مشمولہ :مجالس ابرار، ص ۲۰۰، ۲۰۱، پانچواں باب، ناشر: خانقاہ امدادیہ اشرفیہ، کراچی، تاریخِ اشاعت: رمضان ۱۴۳۷ھ، جون ۲۰۱۶ء)

آج کے پرفتن دور میں، جبکہ ہر طرف نفسا نفسی اور خود غرضی کا عالم ہے، دین سے دُوری اور دنیا سے محبت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

ایک مسلمان گھرانے کے بچے کا دینی تعلیم کے لئے کسی دینی مدرسہ اور مکتب میں آنا بڑا قابلِ قدر کام ہے، جس پر اہلِ مدارس و مکاتب اور خدامِ دین کو دل سے شکر ادا کرنا چاہئے، اور ہر ایسے عمل سے باز رہنا چاہیے، جو دینی تعلیم سے بچہ کی نفرت و وحشت کا سبب ہو، معلم کو مربی بھی ہونا چاہئے، جس کا تقاضا شفقت اور ہمدردی ہے۔

لیکن اس کے برعکس دیکھنے میں آرہا ہے کہ بعض مدارس و مکاتب میں بچوں کے ساتھ تادیبی کاروائی کا جو ناروا سلوک برتا جاتا ہے، وہ بہت ہی ناگفتہ بہ ہے، اور وہ صرف بچوں کی دینی تعلیم سے نفرت و وحشت ہی کا سبب نہیں، بلکہ شرعاً بھی جائز نہیں، اور اس کی تلافی کی آسان صورت بھی میسر نہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

’’اگر کوئی (استاد طالبعلم کی مارپٹائی کی غلطی کر بیٹھے اور پھر) اپنی زیادتی کی تلافی کرنا چاہے، تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ سزا کے بعد بچوں کے ساتھ شفقت کرو، اور جس پر زیادتی کی ہے، اس کے ساتھ احسان کرو، یہاں تک کہ وہ خوش ہو جائے، جیسے (ہندوستان کے شہر) میرٹھ کے ایک رئیس نے ایک نوکر کے طمانچہ مار دیا تھا، پھر اس کو اپنی غلطی پر تنبہ (اور احساس) ہوا، تو اس کو ایک روپیہ دیا، پھر دوسرے نوکر سے کہا ’’اس سے پوچھنا اب کیا حال ہے‘‘ کہنے لگا کہ میں تو دعاء

کررہا ہوں کہ ایک طمانچہ روز لگ جایا کرے، بس یہ طریقہ تلافی کا بہت اچھا ہے، اس سے بچوں کے اخلاق پر بھی (بُرا) اثر نہ ہوگا، اور ظلم کا بھی دفعیہ ہو جائے گا، اور جب میاں جی (یعنی استاد صاحب) کا ایک دو دفعہ (ایسا) کرنے میں خرچ ہوگا، تو آئندہ کو خود بھی ذرا سنبھل کر مارا کریں گے، نیز سزا کے بعد بچوں کو خوش کرنے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ ان کے دل میں معلم کی طرف سے بغض وعداوت نہ پیدا ہو جائے، جو علم کی محرومی کا سبب ہے" (تحفۃ العلماء، ج۱، رسالہ "استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے" ص ۱۳۷، ۱۳۸، بحوالہ: التبلیغ ج ۱۴ ص ۸۶، بعنوان "تلافی کی سب سے بہتر اور آسان صورت" ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے یہاں اس بات سے آگاہ فرمادیا کہ اگر اللہ نہ کرے، استاد کی طرف سے طلبہ کے ساتھ تعزیر وتنبیہ میں زیادتی ہو جائے، تو اس کی تلافی کرنی چاہیے، جس کی اصولی صورت تو یہ ہے کہ دوسرے وقت ان طلبہ پر کسی انداز میں احسان کردے، اور شفقت کا برتاؤ کرے، جس کی ایک شکل یہ ہے کہ ان طلبہ کو کچھ مالی انعام دے دے۔

مگر آج کل عام طور پر زیادتی ہو جانے کے بعد اس کی تلافی کا اہتمام نہیں کیا جاتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے، وہ اپنے استاد کو ظالم سمجھنے لگتے ہیں، اور اپنے استاد سے بغض وعداوت پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر اس کے سبب سے علم سے محرومی پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض استادوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بچوں پر بے جا سختی پر سختی کئے چلے جاتے ہیں، اور طلبہ کے ساتھ خوش اخلاقی، شفقت اور نرمی کے ساتھ پیش آنے کو استاد کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ طلبہ کے ساتھ خوش اخلاقی اور نرمی سے پیش آیا جائے، تو وہ بے خوف اور نڈر ہو جاتے ہیں، اور ان کے دلوں سے استادوں کا احترام اور ادب نکل جاتا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ بے جا سختی اور خشک رویہ کی وجہ سے استاد سے بغض وعداوت پیدا ہو رہی ہے، اور اگر طلبہ کو اپنی اولاد کا درجہ دے کر ان کے ساتھ اپنی اولاد والا سلوک کیا جائے، تو ظاہر

www.idaraghufran.org

ہے کہ اولاد پر اگر ایک وقت میں سختی ہوتی ہے، تو دوسرے اوقات میں شفقت اور نرمی بھی ہوا کرتی ہے، یہی معاملہ شاگردوں کے ساتھ بھی ہونا چاہئے۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 1 شمارہ 12، ذیقعدہ 1425ھ- جنوری 2005ء۔شمارہ 13- ذی الحجہ 1425ھ فروری 2005ء۔ جلد 2 شمارہ 1 محرم 1426ھ - مارچ 2005ء۔شمارہ 2، صفر 1426ھ اپریل 2005ء۔شمارہ 3، ربیع الاول 1426ھ مئی 2005ء)

---

(9)

طلبۂ کرام پر شفقت اور غصہ میں اعتدال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

جب تک شفقت نہ ہو، پرورش (اور تربیت) کا خیال نہ ہو، کوئی اور طریقہ اور کوئی تدبیر، رعایا کے مطیع (وفرمانبردار) بنانے کی نہیں (انفاسِ عیسیٰ، حصہ دوم، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۲ص ۲۴۸، بعنوان ''رعایا کے مطیع بنانے کی تدبیر'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، اشاعتِ اول: محرم۱۴۲۲ھ)

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں:

تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ غصہ کا روکنا ہمیشہ اچھا ہوا ہے، اور جب اس کو جاری کیا گیا ہے، تو ہمیشہ اس کا انجام برا ہوا ہے، اور دل کو قلق (افسوس) بھی ہوا ہے۔

غصہ جب آئے، تو یہ گُر یاد رکھے کہ کسی قول، یا فعل میں ہرگز تعجیل (جلدی) نہ کرے، تھوڑے دنوں میں اس طرح کرنے سے تعدیل ہو جائے گی۔

غصہ کے وقت طبیعت بھڑک اٹھتی ہے اور اس کے قبائح (بُرے پہلو) پیشِ نظر نہیں رہ جاتے (انفاسِ عیسیٰ، حصہ اول، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۱ص ۱۶۸، بعنوان ''غصہ کے متعلق ایک مفید تجربہ- غصہ کے قبائح کے پیشِ نظر رہنے کا آسان طریقہ'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، اشاعتِ اول: محرم۱۴۲۲ھ)

www.idaraghufran.org

اورایک مقام پرحضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

غصہ کو جہاں تک ہوسکے روکو (تعلیم الدین، ص۱۰۷، حقوق وخدمتِ خلق، ادب نمبر۱۸۶، ناشر: دارالاشاعت، کراچی)

اورایک مقام پرحضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حدیث میں ہے کہ ''لا یقضین قاض بین اثنین وھو غضبان ''یعنی حاکم کوچاہیے کہ غصہ کی حالت میں کبھی فیصلہ نہ کرے، بلکہ اس وقت مقدمہ کوملتوی کردے، تاریخ بڑھادے، یہاں حاکم سے مراد ہروہ شخص ہے، جس کی دوآدمیوں پرحکومت ہو، اس میں معلم، استاد، گھر کا مالک بھی داخل ہے (ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۳ص۱۲۵، بعنوان ''غصہ کی حالت میں فیصلہ کی ممانعت'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ذیقعدہ۱۴۲۷ھ)

نیزحضرت موصوف ایک مقام پرفرماتے ہیں:

افراط فی الشفقت (شفقت کی زیادتی) مضرہے، کیونکہ جتنی شفقت ہوگی، اتنی ہی اس کی بے تمیزیوں (کا اضافہ ہوگا اوراس) سے زیادہ ایذاء ہوگی (ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۳ص۸۵، بعنوان ''ایذائے شیخ بلاقصد بھی مضرہے'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ذیقعدہ۱۴۲۷ھ)

طلبۂ کرام کومطیع وفرمانبردار بنانے کی اصل تدبیراوراصل طریقہ یہ ہے کہ ان پرشفقت ہو، اور ان کی پرورش وتربیت کا لحاظ ہو، یہ تدبیر چھوڑ کر لاکھ تدبیریں کر لی جائیں، طلبہ میں فرمانبرداری پیدا ہونا مشکل ہے، ظاہری دباؤ، یا ظاہری خوف کا نام فرمانبرداری نہیں، بلکہ فرمانبرداری اور اطاعت اس کا نام ہے کہ ظاہر سے بھی مطیع وفرمانبردار ہواوراندر سے بھی، سامنے بھی مطیع ہواور پیٹھ پیچھے بھی، احادیث سے بھی یہی بات معلوم ومفہوم ہوتی ہے۔

احادیث میں چھوٹوں پرشفقت اور بڑوں کا اکرام نہ کرنے والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طریقہ سے ہٹاہوافرمایاہے۔

www.idaraghufran.org

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيْرِنَا، فَلَيْسَ مِنَّا (سنن أبی داود، رقم الحديث ۴۹۴۳، كتاب الأدب، باب فی الرحمة)[1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا حق نہ پہچانے، تو وہ ہم میں سے نہیں (سنن ابی داؤد)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے، اور اس حدیث پر ''رحمتِ صبیان'' کا باب قائم فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ بچوں پر رحمت وشفقت شریعت کا ایک مستقل باب ہے۔

مذکورہ حدیث میں چھوٹوں پر شفقت کو بڑوں کے حقِ احترام پر مقدم کر کے بیان کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتداء بڑوں کی طرف سے چھوٹوں پر شفقت کے ساتھ ہونی چاہیے، نہ کہ چھوٹوں کی طرف سے بڑوں کا احترام کرنے سے، جس کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بڑوں کی طرف سے چھوٹوں پر شفقت کرنے کے نتیجہ میں چھوٹوں کی طرف سے بڑوں کا احترام پیدا ہوتا ہے، اور چھوٹوں پر شفقت بڑوں کے احترام کا سبب بنتی ہے۔

اساتذۂ کرام (عمر، یا علم کے لحاظ سے) بڑے اور طلبۂ کرام (عمر، یا علم کے لحاظ سے) چھوٹے ہیں، جب اساتذۂ کرام کی طرف سے طلبۂ کرام پر شفقت کا ظہور ہوگا، تو اس کی وجہ سے طلبۂ کرام کے دلوں میں اساتذۂ کرام کا احترام ہوگا اور پھر اس احترام کا اثر اطاعت وفرمانبرداری کی شکل میں ظاہر ہوگا، کیونکہ احترام کی وجہ سے اطاعت وفرمانبرداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن شفقت کے بارے میں یہ بھی اصول ملحوظ رکھنا چاہیے کہ وہ حد سے زیادہ نہ بڑھنے

---

[1] قال شعیب الارنؤوط: إسناده صحيح (حاشية سنن ابی داود)

www.idaraghufran.org

پائے، بلکہ اعتدال پر رہے، شفقت اگر حد سے تجاوز کر جائے اور اس میں زیادتی ہو جائے، تو پھر یہی چیز طلبہ کے بگاڑ وفساد اور ان کی سرکشی کا سبب بن جائے گی، جو کہ اطاعت وفرمانبرداری کی بالکل ضد ہے، شفقت، اعتدال اور اپنی حد پر ہو، تو اطاعت وفرمانبرداری کا سبب ہے اور اعتدال سے آگے بڑھ جائے، تو سرکشی اور نافرمانی کا سبب، اور پھر یہ سرکشی ونافرمانی بڑوں کی ایذاء اور رنج کا سبب ہے۔

اور جب ایذاء ورنج پہنچتا ہے، تو غصہ پیدا ہوتا ہے اور غصہ کے نتیجے میں شفقت بھی جاتی رہتی ہے۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جو اساتذہ اور بڑے، چھوٹوں اور طلبہ پر پہلے حد سے زیادہ شفقت کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں چھوٹوں میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، جس سے بڑوں کو تکلیف ورنج ہوتا ہے اور پھر غصہ کی طرف انتقال ہوتا ہے۔

اس لئے طلبہ پر شفقت، اعتدال کے ساتھ ہونی چاہیے، تاکہ سرکشی اور بے تمیزی کی نوبت نہ آئے اور فرمانبرداری کا جذبہ برقرار رہے۔

آخر میں ایک اہم ہدایت یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں سزا نافذ نہ کی جائے، جب غصہ آئے، تو ضبط سے کام لیا جائے، غصہ کے ردِعمل میں جلد بازی سے کام نہ لے۔

چند دن ایسا کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ طبیعت میں اعتدال اور ٹھہراؤ پیدا ہو جائے گا، اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے غصہ کے نقصانات سے بھی حفاظت رہے گی، اور شفقت کی زیادتی کے نقصانات سے بھی، اور اس طرح سارے کام ٹھیک چلتے رہیں گے۔

ایک طرف طلبہ کی اچھی تعلیم وتربیت ہوگی اور دوسری طرف اساتذہ کے لئے رنج وایذاء سے حفاظت ہو کر راحت وسکون کا انتظام ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 2 شمارہ 4، ربیع الثانی 1426ھ- جون 2005ء)

---

www.idaraghufran.org

(10)

مدارس کے مروّجہ کمیشن پر چندہ کا طریقہ

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ملفوظات میں ہے:

ایک مولوی صاحب نے (حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ سے) عرض کیا کہ حضرت اگر مدارس کی طرف سے کمیشن (یعنی چندہ کی ہوئی رقم ہی میں سے کوئی تناسب مقرر و متعین اور طے کرکے) سفیر رکھے جائیں، یہ جائز ہے؟

(اس کے جواب میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے) فرمایا کہ شرطِ فاسد ہے، مگر بکثرت مدارس والے اس بلا میں مبتلاء ہیں، جائز وناجائز کو کوئی نہیں دیکھتا، اسی لئے ثمرات وبرکات بھی ویسے ہی پیدا ہو رہے ہیں، نہ اساتذہ کو طلبہ پر شفقت اور محبت ہے، نہ طلبہ کو اساتذہ کا ادب واحترام ہے، نہ ظاہراً اُن پر علم کی شان معلوم ہوتی ہے، نہ باطناً اُن میں اس کا اثر ہے، یہ سب غیر مشروع آمدنی کے پھل پھول لگ رہے ہیں، اسی طرح چندوں میں قطعاً احتیاط نہیں کہ وصول کرنے والے کیسی رقم وصول کرکے لائے، نہ تحقیق، نہ تفتیش، وہ وصول کرکے لے آئے، مدرسہ والوں نے داخل کرلیا، کوئی پوچھتا ہی نہیں، مگر بعض بندے اللہ کے محتاط (احتیاط کرنے والے) بھی ہیں، میں تو ہر طرح پر اور ہر صورت سے اہلِ مدارس کو آگاہ کرچکا، مگر کون سنتا ہے (الافاضات الیومیہ، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۷ص۸۶، ۸۷، ملفوظ نمبر ۹۷، بعنوان ''مدارس میں کمیشن پر سفیر'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: محرم ۱۴۲۴ھ)

یہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے دور کی حالت بیان فرمائی ہے، جبکہ اس دور میں اتنے مفاسد اور فتنے پیدا نہیں ہوئے تھے، اور آج کل کا دور تو اس کے مقابلہ میں زیادہ

www.idaraghufran.org

فتنوں کا ہے، اب کیا حالت ہوگی؟

مروجہ کمیشن پر چندے کے ناجائز ہونے کی تصریح موجودہ دور کے محققین نے بھی فرمائی ہے، چنانچہ مجمع الفقہ الاسلامی (الہند) کے پانچویں سیمینار منعقدہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، میں کمیشن پر زکاۃ کی وصولی کا موضوع زیرِ بحث آیا، اس میں جو فیصلہ کیا گیا، وہ درج ذیل ہے:

''مقالات اور شرکاء کے مباحثات کی روشنی میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ کمیشن پر زکاۃ کی وصولیابی کا مروجہ طریقہ جائز نہیں ہے (اہم فقہی فیصلے، ص ۵۵، پانچواں فقہی سیمینار، منعقدہ ۳۰، ۳۱ اکتوبر، یکم ودوم نومبر ۱۹۹۲ء، بمقام جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ، ناشر: ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، طبع اول: دسمبر ۱۹۹۷ء)

اس لئے اہلِ مدارس پر لازم ہے کہ وہ کمیشن کے مروجہ طریقہ کو چھوڑ کر محقق اہلِ فتویٰ حضرات سے دریافت کر کے متبادل جائز طریقہ اختیار کریں، کیونکہ چندے میں بے احتیاطی اور مالیات کے معاملات خراب ہونے کا اُخروی نقصان تو اپنی جگہ ہے، دنیوی اعتبار سے بھی اس کے نتائج انتہائی خطرناک ہیں، جن میں اساتذہ کی طرف سے طلبہ کی شفقت ومحبت اور طلبہ کی طرف سے اساتذہ کا ادب واحترام ختم ہوجانا، طلبہ پر ظاہراً وباطناً علم کی شان اور اس کا اثر نہ ہونا، بھی شامل وداخل ہے۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے ایک عمدہ تجویز اہلِ مدارس کو دی ہے، جس پر عمل کرنے سے اس قسم کے فتنوں کا سدِ باب آسان ہوجاتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''میں تو سب اہلِ مدارس سے کہتا ہوں کہ مدرسین، ملازمین، طلباء، کے متعلق جتنے معاملات اور حالات پیش آتے ہیں، اہلِ فتویٰ علماء سے استفتاء کر کے ان سب کے احکام جمع کر لیے جاویں، وہی مدارسِ اسلامیہ کا قانون ہوجاوے، اس میں سب سے بڑی مصلحت تو اتباعِ شریعت کی ہے، اور اہلِ انتظام کے لئے بھی یہ سہولت ہے کہ جس شخص کی منشاء کے خلاف ان کو کچھ کرنا پڑے گا، وہ شرعی قانون

www.idaraghufran.org

پیش کرکے اپنا عذر بتاسکیں گے، اور دوسروں کے لئے بھی حجت ہوگا'' (مجالسِ حکیم الامت ص ۱۳۹، ۱۴۰، مجالسِ رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ، بعنوان ''مدارسِ اسلامیہ کے لیے ایک مفید مشورہ'' تحریر وترتیب: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ، ناشر: دارالاشاعت، کراچی، تاریخِ اشاعت: ذوالقعدۃ ۱۳۹۶ھ)

لیکن افسوس کہ آج کے دور میں مدارس ومکاتب کے بہت سے مہتمم اور ذمہ دار، ایسے لوگ بن بیٹھے ہیں، جن کو نہ تو مدارس کے لئے حاصل ہونے والی امداد وتعاون کے جائز وناجائز ہونے کی پرواہ رہی، نہ ہی اس کو صحیح مصرف میں خرچ کرنے کی فکر رہی، ہم نے خود بکثرت ایسے ایسے واقعات ملاحظہ کئے، جن کو سناتے اور بیان کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور اسی لئے اس قسم کے پیشہ ور اور نام نہاد مولویوں سے الگ تھلگ ہوکر رہنے میں ہی عافیت محسوس ہوئی، جن کو کچھ کہا جائے، تو وہ سننا بھی گوارا نہیں کرتے، وہ اس کو اپنے مقصد میں روڑے اٹکانا سمجھتے ہیں، اور اسی لئے وہ ہم جیسے لوگوں سے متوحش ہوتے ہیں، اور طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اصلاح وحفاظت فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 2 شمارہ 5، جمادی الاولیٰ 1426ھ- جولائی 2005ء)

---

(11)

علماء کو جہلاء کے ماتحت ہونے کا مفسدہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

علماء کو عوام اور جہلاء کے تابع بن کر نہیں رہنا چاہئے، اس سے دین کی عظمت واحترام ان (عوام اور جاہل) لوگوں کے قلوب (دلوں) سے نکل جانے کا اندیشہ ہے، آج جو عوام کی ہمت اور جرأت بڑھ گئی ہے کہ وہ اہلِ علم کو حقیر سمجھتے ہیں، اس کا سبب یہ اہلِ علم ہی ہوتے ہیں، یہ سب علماء کے ڈھیلے پن (اور عوام کے تابع)

ہونے کی بدولت ہے (العلم والعلماء، ص ۲۶۵، بحوالہ: القول الجلیل ص ۲۶۵، باب ۸، فصل نمبر ۲، بعنوان ”عوام کے تابع بن کر نہ رہنا چاہیے“ ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتورا باندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت بارِ دوم: ۱۴۱۲ھ)

معلوم ہوا کہ علماء کو عوام اور دینی علم سے بے بہرہ لوگوں کے ماتحت اور تابع نہیں بننا چاہئے، کیونکہ اس طرزِ عمل کی وجہ سے عوام کے دلوں میں علماء کی عظمت واحترام باقی نہیں رہتا، اور آج کے دور میں علماء کے خلاف جو عوام کی جرأت وہمت بڑھ گئی ہے کہ وہ علماء کو حقیر سمجھتے ہیں، اس کا الزام ان علماء پر ہی عائد ہوتا ہے، جو عوام کے تابع اور ماتحت بن کر رہتے ہیں۔

آج اگر ہم اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں، تو علماء کی طرف سے عوام اور جہلاء کے تابع اور ماتحت ہونے کی بے شمار مثالیں نظر آتی ہیں، چنانچہ عام طور پر مساجد کے امام وخطیب حضرات کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ جاہل عوام کے ماتحت ہو کر امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے ہیں، مسجد کی انتظامیہ کی طرف سے (جس میں عموماً غیر اہلِ علم بلکہ کھڑ پینچ قسم کے لوگ ہوتے ہیں) بہت سی پابندیاں تو عہدہ ملنے سے پہلے ہی لگ جاتی ہیں، جس کے نتیجہ میں حق بات کہنے اور باطل کے خلاف بولنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی، اور کچھ پابندیاں صرف ان کا نفس لگوا دیتا ہے، کیونکہ ڈر ہوتا ہے کہ اگر ہم نے فلاں کام، یا فلاں بات کی (جس کا شریعت کی طرف سے حکم ہے) تو انتظامیہ اور اہلِ محلّہ کو ناگوار گذرے گا، اور امامت وخطابت کا عہدہ ہاتھ سے چلا جائے گا، معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ اپنے عہدہ اور منصب کو برقرار رکھنے کے لئے ہوتا ہے، اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے علماء، یا تو حقیقی معنیٰ میں عالم ہی نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں، تو امامت وخطابت کو پیشہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں، ان کے پیشِ نظر دین کی خدمت نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ جب کسی مسجد میں امام وخطیب کی ضرورت ہوتی ہے، تو علماء وقراء حضرات پے در پے آ کر جاہلوں کو اپنا ممتحن بنا کر ان کے سامنے امتحان وانٹرویو دیتے ہیں، ان کے سامنے منت وسماجت کرتے ہیں، ان کے پیچھے پیچھے پھرتے

ہیں، اوران کی رضاوخوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوئی لمحہ فروگزاشت نہیں کرتے، اوراگر کسی مسجد سے بغیر شرعی وجہ کے، بلکہ شریعت ہی کی مخالفت کرتے ہوئے کسی امام وخطیب کو فارغ کردیا جائے، تو فوراً وہاں دوسرے اہلِ علم حضرات اپنی تقرری کے لئے پہنچ جاتے ہیں، اوران کی پہلی اس حرکت کو بھی نہیں دیکھتے، جو اہلِ علم، یا دینی علم، یا شریعت کی تحقیر وگستاخی تک پہنچ چکی ہوتی ہے، انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ایک عالم، عوامُ الناس کی تابعداری اوران کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ساری زندگی کے لئے اپنی زبان پر حق بات سے خاموشی کا تالہ لگالیتا ہے، جبکہ قدرت ہوتے ہوئے حق بات سے خاموش رہنے والا ایک طرح سے گونگے شیطان کے مشابہ ہوتا ہے۔

ایک امام صاحب کے بارے میں نہایت ہی معتبر ذرائع وقرائن سے یہاں تک بھی معلوم ہوا جو کہ ہمارے قریبی علاقہ میں امامت کے عہدہ پر مدت دراز سے قائم ہیں کہ اگران سے کوئی مسئلہ معلوم کیا جاتا ہے، تو وہ جواب دینے سے پہلے مسجد انتظامیہ کے صدر صاحب کی طرف دیکھتے ہیں، اگر صدر صاحب سر کے اشارہ سے مثبت جواب دے دیتے ہیں، تو وہ مسئلہ کا جواب جائز ہونے کے ساتھ دیتے ہیں اوراگر صدر صاحب سر کے اشارہ سے منفی جواب دے دیتے ہیں، تو یہ امام صاحب اس مسئلہ کا جواب ناجائز ہونے کے ساتھ دیتے ہیں ''**لاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم**'' اس سے بڑھ کر مداہنت، تملق اور چاپلوسی کی اور کیا مثال ہوگی؟

اس واقعہ کے متعلق کسی کو جھوٹ، یا غلط بیانی کا شبہ نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ اگر گہرائی کے ساتھ موجودہ حالات کا جائزہ لیا جائے، تو اس قسم کی بے شمار مثالیں ملیں گی، ہم نے خود اس طرح کے واقعات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔

اسی طرح دینی مدارس کے بعض مہتمم حضرات کا معاملہ ہے کہ وہ مالیات وغیرہ کے معاملہ سے متاثر ہوکر عوام الناس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے، ان کے ماتحت ہوجاتے ہیں، اور مختلف طریقوں سے تملق، چاپلوسی اور مداہنت کا ارتکاب کرتے ہیں، کہیں مال ودولت

والے جاہلوں کو صدر مقرر کر لیتے ہیں، کہیں ان کی صدارت، وزارت میں دینی جلسے وجلوس منعقد کرتے ہیں، اور کہیں ان کو بڑے بڑے القابات واکرامات سے نوازتے ہیں، کہیں چندے کے حصول کے لئے مالداروں کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان جہلاء کے دماغ آسمان سے باتیں کرنے لگتے ہیں، اور یہ علماء کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''پس اول تو یہ چاہئے کہ علماء، چندہ کا کام ہی نہ کریں اور اگر ایسا نہ کر سکیں، تو کم ازکم چندہ میں استغناء ہی کا طریقہ اختیار کریں، کسی کی خوشامد اور للّو پپو نہ کیا کریں'' (العلم والعلماء، ص۳۲۷، بحوالہ: انفاسِ عیسیٰ ج۱ ص۲۸۸، باب:۱۱، فصل نمبر۲، بعنوان ''علماء کے چندہ کرنے کا طریقہ'' ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتورا باندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت بارِ دوم: ۱۴۱۲ھ)

اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ تمام علماء ان خرابیوں میں مبتلا ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے علماء کا بھی اس دور میں وجود کم نہیں، اور ہمارا خطاب بھی ایسے ہی علماء سے ہے، ورنہ اہلِ حق علماء کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی، اسی کی بدولت حق کا وجود اور بول بالا رہے گا۔

لہٰذا مندرجہ بالا طرزِ عمل اور حرکات کے مرتکب خطباء، ائمہ، مہتممین ومدرسین اور دیگر علماء حضرات سے درخواست ہے کہ اللہ کے واسطے اپنے طرزِ عمل کو تبدیل کیجئے، توکل، خوفِ الٰہی اور فکرِ آخرت پیدا کیجئے، اور دنیا کے عہدوں اور مال ودولت کی خاطر اپنے اصل منصب کو فروخت مت کیجئے، روکھی سوکھی کھا پی کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے اور حق کا دامن ہرگز نہ چھوڑیئے، پھر دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کیسی نعمت سے نوازتا ہے، جس کے سامنے کسی دنیوی مالدار کی مالداری اور دنیوی عہدہ والے کا عہدہ کوئی حیثیت نہیں رکھے گا۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد2 شمارہ6، جمادی الاخریٰ1426ھ- اگست2005ء)

(12)

علماء کا، حکمرانوں کے ساتھ رویہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

’’میں از طرفِ خود تو حکام سے میل جول بڑھانے کا مخالف ہوں، خصوصاً علماء کے لئے کہ یہ ان کی وضع کے بالکل خلاف ہے، علماء کو تو گوشہ نشین ہونا چاہئے، لیکن اگر ملنا ہو، یا کوئی کام پڑ جائے، تو ادب کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اور بے ادبی اور منہ زوری کو شرارتِ نفس سمجھتا ہوں، ترکِ ادب، کوئی کام کی بات نہیں، بلکہ اس میں شرارتِ نفس، یعنی شیخی ہے کہ ہم حاکم سے بھی نہیں دبتے۔

نہ دبنا کیا، یعنی جب اس کو اللہ تعالیٰ نے حاکم بنایا ہے، یوں نہ دبو گے، تو دبائے جاؤ گے‘‘ (العلم والعلماء، ص۲۷۰، بحوالہ: حسن العزیز ج۴ ص۲۹۱، باب: ۷، فصل نمبر۲، بعنوان ’’امراء وحکام سے بوقتِ ملاقات ان کا ادب ضروری ہے‘‘ ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتوراباندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت بارِ دوم: ۱۴۱۲ھ)

معلوم ہوا کہ حُکّامِ زمانہ کے عہدے اور ان کے منصب کو ملحوظ رکھ کر، ان کی شان اور ان کے بارے میں بات کرنی چاہئے، اور کوئی ایسا انداز اختیار نہیں کرنا چاہئے، جس سے ان کی بلاوجہ تحقیر لازم آئے، اور پھر اس کے نتیجہ میں دشمنی اور عداوت پیدا ہو، اور بالآخر ایسے مرحلہ تک نوبت پہنچے کہ جس کا برداشت کرنا طاقت سے باہر ہو جائے۔

بلاشبہ حدیث کی رُو سے ’’افضل جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے‘‘ مگر حق بات کہنے کے لئے نیت، طریقہ اور موقع محل بھی تو درست ہونا چاہئے، اگر نیت میں اخلاص نہ ہو، بلکہ اپنی شیخی اور بڑائی ظاہر کرنا مقصود ہو، یا انداز اور طریقہ نامناسب ہو، یا موقع محل سے ہٹ کر بات کی جائے، تو اس کا وبال دنیا میں تو جو کچھ ہوتا ہے، اس کے بتلانے کی ضرورت نہیں،

آخرت میں بھی اس پر گرفت ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی لکھتے ہیں:

’’اگر کوئی حاکم شریعت کے خلاف کام کررہا ہے، تو اسے راہِ راست پر لانے کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کی شرائط کے ساتھ انجام دینا بھی ضروری ہے اور ضرورت کے وقت اس کے سامنے اظہارِ حق بھی، جسے حدیث میں ’’افضل الجہاد‘‘ قرار دیا گیا ہے، یہ تمام کام شریعت کے عین مطابق ہیں، بشرطیکہ شرعی حدود میں ہوں اور پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور دینِ حق کی تبلیغ ونصرت ہو، محض اپنی بہادری جتانا، لوگوں سے داد حاصل کرنا، یا خود طلبِ اقتدار پیشِ نظر نہ ہو‘‘

(حکیم الامت کے سیاسی افکار، ص ۶۰، بعنوان ’’حکومت کے ساتھ طرزِ عمل‘‘ ناشر: ادارۃ المعارف، کراچی، طبع جدید: ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ، مارچ ۲۰۰۰ء)

آج حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ھارون علیہ السلام کے منصب اور عہدے کے حامل کسی اللہ والی بزرگ ہستی کا اس دنیا میں وجود نہیں، اور ان کے مقابلہ میں فرعون سے بڑے ظالم بادشاہ کا بھی دنیا میں وجود نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وھارون علیہما السلام کو فرعون کو تبلیغ کرنے کے لئے اس بات کا پابند فرمادیا کہ:

’’فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّناً‘‘ ’’تم دونوں اس (فرعون) سے نرمی سے بات کرنا‘‘

تو اب کس کو مجال ہوسکتی ہے کہ وہ نبیوں کے طریقہ کو چھوڑ کر غلط طریقہ اختیار کرے۔

اس کے علاوہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کے عیب بیان کرنا، خواہ وہ ظالم حاکم ہی کیوں نہ ہو جب تک شریعت کی اجازت نہ ہو ’’غیبت‘‘ میں داخل ہے (ملاحظہ ہو: معارف القرآن، ج ۸ ص ۱۲۳، سورۃ الحجرات، ناشر: مکتبہ معارف القرآن، کراچی، طبع جدید: ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ، اپریل ۲۰۰۸ء)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی لکھتے ہیں:

’’عوام میں بھی حکام کو وقت بے وقت بُرا بھلا کہنے، اور انہیں گالیاں تک دینے کا

رواج عام ہو چکا ہے، جلوسوں میں سربراہانِ حکومت کو ''کُتّا'' اور ''سور'' تک بنا کران کی خلاف ہائے ہائے کے نعرے لگائے جاتے ہیں، مجلسوں میں ایک مشغلے کے طور پر حکام کا ذکر کر کے، ان کی بُرائیاں کی جاتی ہیں، جو کسی معقول وجہ کے بغیر ہونے کی وجہ سے غیبت میں تو داخل ہیں ہی، بعض اوقات افتراء اور بُہتان کی حدود میں بھی داخل ہوجاتی ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ فاسق وفاجر حکمرانوں کو بُرا کہنا غیبت میں داخل نہیں، حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اس طرزِ عمل پر بھی تنقید فرمائی ہے، حضرت فرماتے ہیں:

''حجاج بن یوسف اس امت کا سب سے بڑا ظالم مشہور ہے، مگر کسی بزرگ کی مجلس میں ایک شخص نے اس پر کوئی الزام لگایا، اور غیبت کی، تو انہوں نے فرمایا کہ وہ اگرچہ ظالم وفاسق ہے، مگر حق تعالیٰ کو اس سے کوئی دشمنی نہیں، وہ جس طرح دوسرے مظلوموں کا انتقام حجاج سے لے گا، اسی طرح اگر کوئی حجاج پر ظلم کرے گا، تو اس سے بھی انتقام لیا جائے گا'' (مجالسِ حکیم الامت، ص۹۲، ملفوظاتِ رمضان ۱۳۴۸ھ)

اس کے علاوہ حضرت نے کئی مقامات پر یہ بات واضح فرمائی ہے کہ کسی ضرورت کے بغیر حُکام کی علی الاعلان اہانت، شرعاً پسندیدہ بھی نہیں ہے، فرماتے ہیں:

''سلاطینِ اسلام کی علی الاعلان اہانت میں ضرر ہے، جمہور کا، ہیبت نکلنے سے فتن پھیلتے ہیں، اس لئے سلاطینِ اسلام کا احترام کرنا چاہیے'' (انفاسِ عیسیٰ ص۳۶۹ ج۱، باب ۴) (حکیم الامت کے سیاسی افکار، ص۶۱، ۶۲، بعنوان ''حکومت کے ساتھ طرزِ عمل'' ناشر: ادارۃ المعارف، کراچی، طبع جدید: ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ، مارچ ۲۰۰۰ء)

ایک وعظ میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بعض لوگ بعض مصائب سے تنگ ہو کر حُکّامِ وقت کو بُرا بھلا کہتے ہیں، یہ بھی علامت ہے، بے صبری کی، اور پسندیدہ تدبیر نہیں، اور حدیث شریف میں اس کی

Idara Ghufran

ممانعت بھی آئی ہے، فرماتے ہیں ''لاتسبوا الملوک ''یعنی بادشاہوں کو بُرا مت کہو، ان کے قلوب میرے قبضے میں ہیں، میری اطاعت کرو، میں ان کے دلوں کو تم پر نرم کردوں گا'' (خطباتِ حکیم الامت، ج۹ص ۲۵، بعنوان ''فضائل صبر وشکر'' وعظ ''الصبر'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: رجب ۱۴۳۰ھ)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی لکھتے ہیں:

''بہر صورت حُکّام کو بلا ضرورت بُرا کہنے کو مشغلہ بنالینا، شرعاً پسندیدہ نہیں ہے، اگر وہ اتنے بُرے ہوں کہ ان کے خلاف خروج (بغاوت) جائز ہو، تو پھر شرعی احکام کے مطابق خروج کیا جائے (جس کی کچھ تفصیل ان شاء اللہ آگے آرہی ہے) لیکن بدگوئی کو شیوہ بنانے سے منع کیا گیا ہے، غیبت کے نقصان کے علاوہ حضرت حکیم الامت نے اس بدگوئی کے ایک اور نقصان کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ حکومت کی فی الجملہ ہیبت امن وامان کے قیام کے لئے ضروری ہے اور جب یہ ہیبت دلوں سے اُٹھ جائے، تو اس کا لازمی نتیجہ مجرموں کی بے باکی کی صورت میں نکلتا ہے، ملک میں بدامنی پھیلتی ہے، اور اس کا نقصان پوری قوم کو بُھگتنا پڑتا ہے'' (حکیم الامت کے سیاسی افکار، ص۶۴، ۶۵، بعنوان ''حکومت کے ساتھ طرزِ عمل'' ناشر: ادارۃ المعارف، کراچی، طبع جدید: ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ، مارچ ۲۰۰۰ء)

اس کے علاوہ حکمرانوں کی عوام کے سامنے خواہ مخواہ عیب جوئی وعیب گوئی کرنے سے حکمرانوں کی طرف سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے، جس کے نتائج انتہائی خطرناک نکلتے ہیں۔

چنانچہ حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عیب گوئی اور عیب جوئی کی ایک خرابی اور مضرت یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ جس شخص کی برائی کی جارہی ہے، اس کو خبر نہ ہو، اور خبر ہونے کے بعد بہت دشوار ہے کہ وہ تم کو برا نہ کہے اور پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کے کہنے کی تم کو خبر نہ ہو، اور اس

تمام الٹ پھیر کا نتیجہ یہ ہے کہ آپس میں عداوتیں بڑھیں، اور دشمنیاں قائم ہوں، اور پھر یہ عداوتیں بعض اوقات ایک زمانہ تک چلتی ہیں، اوران کی بناء محض ذراسی بات کہ اس نے ہم کو یوں کہہ دیا تھا، حالانکہ اگر کہہ بھی دیا ہو، تو کیا عزت میں فرق آ گیا (العلم والعلماء، ص۲۴۱، ۲۴۲، بحوالہ: دعواتِ عبدیت ج۲ص۹۵، باب :۷، فصل نمبر۲، بعنوان ''فضول گوئی، عیب گوئی، عیب جوئی کی مضرت'' ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتورا باندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت بارِدوم: ۱۴۱۲ھ)

تقریباً ہر نبی کو دشمنوں اور ظالم وجابر حکمرانوں سے واسطہ پڑا ہے، مگر دیکھ لیجئے کہ انہوں نے اپنے اپنے دور کے ظالم وجابر حکمرانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور کس طرح پیش آئے۔

علمائے حق، انبیائے کرام کے وارث ہیں، انہیں اس وراثت وامانت کو صحیح صحیح طرح نبھانا ،اور پورا کرنا چاہئے ،جو علماء ہمیشہ اپنا موضوعِ سخن حکمرانوں کی عیب جوئی اور عیب گوئی کو بنائے رکھتے ہیں، اور زبان کو بے لگام طریقہ پر استعمال کرتے ہیں، انہیں اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرنی چاہئے۔

بعض علماء کے چھچھورے انداز اور غیر مہذب رویہ کے نتائج وعواقب کا بسااوقات دنیا میں دوسرے علماء کو بھی سامنا کرنا پڑتا ہے ،اور علماءِ حق کے سارے طبقہ پر اس کے اثراتِ بد پڑتے ہیں، جس کے نتیجے میں دین کا کام سکون واطمینان کے ساتھ کرنے کی فضاء متأثر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد2 شمارہ7، رجب1426ھ- ستمبر2005ء)

---

(13)

تخصُّص اور اِفتاء میں فرق

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

میں کہا کرتا ہوں کہ مصلح اور مفتی میں سب چیزیں ہونا چاہئے، قرآن بھی، حدیث بھی، فقہ بھی، تصوف بھی، پھران شاء اللہ تعالیٰ ایسا شخص حدود پر رہ سکتا ہے، جامع نہ ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہو ہی جاتی ہے، محقق اور جامع، موقع اور محل کو دیکھتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ وہ فقیہ بھی ہو، مفسر بھی ہو (آدابِ افتاء واستفتاء، الباب الثانی: آداب المفتی، بحوالہ: الافاضات ص ۳۰۷، مشمولہ: تحفۃ العلماء، ج ۲ ص ۲۴۷، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

مفتی سے لوگ سب ہی قسم کے مسائل معلوم کرتے ہیں، عقائد کے بھی، عبادات کے بھی، معاملات کے بھی، سیاست ومعاشرت کے بھی اور اخلاق کے بھی، اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے ایک، دوسالہ تخصص کا نصاب کافی نہیں، جس میں زیادہ تر فقہ، اصولِ فقہ، یا زیادہ سے زیادہ قواعدِ فقہ کی چند کتب پڑھائی جاتی ہیں، دینی مدارس میں جو تخصص کا نصاب پڑھایا جاتا ہے، وہ دراصل فقہ کا تخصص ہوتا ہے، اسی لئے اس کو ''**تخصص فی الفقہ الاسلامی**'' کہا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہ صرف فقہ کے تخصص کے درجہ میں ہے۔

گویا کہ اس نصاب سے فقہ سے ایک درجہ کی مناسبت ہو جاتی ہے، اس نصاب کے پڑھ لینے کے بعد یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ شخص مفتی ہوگیا، کیونکہ مفتی کے لئے اور بھی بہت سی چیزیں ضروری ہیں، جن کا اجمالی طور پر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے حوالہ سے ذکر گزرا۔

اس اعتبار سے تخصص اور افتاء دو الگ الگ چیزیں ہوئیں، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مروجہ تخصص اور افتاء میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے، تخصص، افتاء کا ایک حصہ بلکہ تمہید ہے۔

اور خود مدارس میں مروجہ تخصص کے نصاب پر اگر ایک نظر ڈالی جائے، تو دورہ حدیث کی دوڑ کے بعد اب ہر مدرسہ اور جامعہ میں تخصص کی دوڑ بھی شروع ہوگئی ہے، اور ہر سال مدارس سے تخصص شُدہ ایک بہت بڑی کھیپ تیار ہو کر نکلتی ہے، جس کی وجہ سے اب اس کو تخصص کہنا بھی غلط سا معلوم ہوتا ہے، اب اس کو تخصص کے بجائے تعمم کہنا چاہئے۔

پھر جو شخص بھی تخصص کا ایک دوسالہ نصاب پڑھ کر نکلتا ہے، وہ اپنے آپ کو اپنے تئیں مفتی سمجھنے لگتا ہے، اور غیر تربیت یافتہ ہونے کے باوجود ہر قسم کے فتوے جاری کرنے میں ذرا احتیاط نہیں برتتا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی شہر اور ایک ہی مقام کے مختلف دارالافتاؤں سے مختلف قسم کے فتوے جاری ہوتے ہیں، اور اختلاف کی بناء، اکثر و بیشتر کم علمی اور تربیت نہ ہونا ہوتی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم اسی ضمن میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے فتویٰ کے معاملے میں خصوصی مذاق کی چند باتیں بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت والد صاحب رحمہ اللہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ محض فقہی کتابوں کے جزئیات یاد کر لینے سے انسان فقیہ، یا مفتی نہیں بنتا، میں نے ایسے بہت سے حضرات دیکھے ہیں، جنہیں فقہی جزئیات ہی نہیں، ان کی عبارتیں بھی اَز بَر تھیں، لیکن ان میں فتویٰ کی مناسبت نظر نہیں آئی، وجہ یہ ہے کہ در حقیقت ''فقہ'' کے معنیٰ ''سمجھ'' کے ہیں اور فقیہ وہ شخص ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطاء فرمادی ہو اور یہ سمجھ محض وسعتِ مطالعہ، یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لئے کسی ماہر فقیہ کی صحبت اور اس سے تربیت لینے کی ضرورت ہے، یہ بات احقر نے حضرت والد صاحب رحمہ اللہ سے بارہا سنی اور ایک آدھ مرتبہ اس کی تشریح و تفصیل بھی سمجھنی چاہی کہ وہ کیا باتیں ہیں، جو محض مطالعے، فقہی جزئیات یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں، لیکن حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے اس سوال کا جو جواب دیا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر وہ باتیں بیان میں آسکتیں، تو پھر انہیں سیکھنے کے لئے کسی سے تربیت لینے کی ضرورت نہ ہوتی، اب ان کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ انہیں منضبط شکل میں مدوّن نہیں کیا جا سکتا اور نہ متعین الفاظ

میں ان کی تعبیر وتشریح ممکن ہے، گویا ع

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ان باتوں کے حصول کا طریقہ ہی یہ ہے کہ کسی ماہر فقیہ کے ساتھ رہ کر اس کے اندازِ فکر ونظر کا مشاہدہ کیا جائے، اس طرح مدت کے تجربے اور مشاہدے سے وہ اندازِ فکر خود بخود زیرِ تربیت شخص کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، بشرطیکہ کہ جانبین میں مناسبت ہو اور سیکھنے والا شخص باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی سیکھنا چاہتا ہو'' (میرے والد میرے شیخ اور ان کا مزاج ومذاق، ص ۶۵، بعنوان ''فتویٰ کے معاملے میں خصوصی مذاق کی چند باتیں'' ناشر: ادارۃ المعارف، کراچی، طبع جدید: محرم ۱۴۱۵ھ، جولائی ۱۹۹۴ء)

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 2 شمارہ 8، شعبان 1426ھ - اکتوبر 2005ء)

---

(14)

علم کے ساتھ تزکیہ وصحبتِ اہلُ اللہ کی ضرورت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یاد رکھو کہ صحبت بدون علمِ متعارف کے مفید ہو سکتی ہے، مگر علمِ متعارف بدون صحبت کے بہت کم مفید ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کل بہت سے علماء نظر آتے ہیں، مگر ان میں کام کے دو چار ہی ہیں، جن کو کسی کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔ دیکھئے گلاب کے پاس رہنے سے مٹی میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح اہلِ محبت کے پاس رہنے سے اللہ کی محبت اور دین کے ساتھ مناسبت حاصل ہو جاتی ہے۔

حضراتِ صحابۂ کرام کو فضیلت، صحبت ہی کی وجہ سے ہوئی کہ آج کوئی امام اور فقیہ اور کوئی بڑے سے بڑا ولی ادنیٰ صحابی کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، حالانکہ وہ زیادہ لکھے پڑھے نہ تھے، بلکہ بہت سے علوم تو صحابہ کے بعد پیدا ہوئے، ان کے زمانہ میں

www.idaraghufran.org

ان علوم کا پتہ بھی نہیں تھا، جو آج کل کثرت سے موجود ہیں، ان کا یہی کمال تھا کہ وہ ان علوم میں مشغول نہ ہوئے تھے، بس صحابہ کا بڑا کمال یہ تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ان کو نصیب تھی‘‘

(العلم والعلماء، ص۱۹۰، بحوالہ: التبلیغ ج۲۱ص۱۷۴، باب :۶، فصل نمبر۷، بعنوان’’علماء کو صحبتِ صالح کی ضرورت‘‘ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتورا باندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت بارِدوم:۱۴۱۲ھ)

معلوم ہوا کہ اللہ والوں کی صحبت تو مروجہ درسِ نظامی وغیرہ جیسے علوم حاصل کئے بغیر مفید ہوسکتی ہے، لیکن مروجہ درسِ نظامی وغیرہ کا علم اللہ والوں کی صحبت کے بغیر بہت کم مفید ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج سینکڑوں اور ہزاروں علماء ہر سال درسِ نظامی وغیرہ سے فارغ ہوکر نکلتے ہیں، مگر ان میں کام کے چند ایک ہی نظر آتے ہیں، جن کو کسی اللہ والے کامل کی صحبت نصیب ہوئی ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو جو فضیلت حاصل ہوئی، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ہی کی برکت سے حاصل ہوئی، کسی مروجہ علمی نصاب کے ذریعہ سے نہیں اور اسی صحبت کی وجہ سے ان کا نام صحابہ رکھا گیا۔

آج کوئی بڑے سے بڑا فقیہ، محدث اور مفسر وامام چھوٹے سے چھوٹے صحابی کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اصل چیز اللہ والوں کی صحبت ہے، اللہ والوں کی صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ سے محبت اور دین کے ساتھ مناسبت پیدا ہوتی ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ مدارس میں دینی علم حاصل کرنے اور علم میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے پر تو اپنی جدوجہد اور صلاحیتوں کو خرچ کیا جاتا ہے، مگر اللہ والوں کی صحبت اور ان سے اپنی تربیت کرانے کا اہتمام نہیں کیا جاتا، بلکہ اِدھر طالبِ علم درسِ نظامی سے فارغ ہوکر نکلتا ہے، تو اُدھر سے لوگوں کا مقتدا ہونے کی سند اور دستارِ فضیلت حاصل ہوجاتی ہے، اب کیا پوچھنا؟

بس طالبِ علم اپنے آپ کو اصلاح سے بالکل مستغنی اور بے نیاز سمجھنے لگتا ہے، اور پھر اس کے نتیجہ میں ساری عمر طرح طرح کے فتنوں میں مبتلا رہتا ہے۔

طلباء وعلماء میں ایسی آزادی پہلے نہیں تھی، جیسی اس دور میں پیدا ہوگئی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''مدارس کے نصاب ونظام کا جائزہ لیتے وقت ہمارے نزدیک سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ اس کی روح کے احیاء کی فکر کی جائے، اس روح کی احیاء کا تعلق اصل میں تو اہلِ مدارس کی قلبی لگن سے ہے، لیکن اس سلسلہ میں چند عملی تجاویز درج ذیل ہیں:

(1)......تمام مدارس میں تصوف واحسان کو باضابطہ نصاب کا جزء بنایا جائے۔

(2)......اساتذہ وطلبہ پر لازم کیا جائے کہ وہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمع ہوکر بزرگانِ دین اور بالخصوص اکابر علمائے دیوبند کے حالات وملفوظات کا اجتماعی طور پر مطالعہ کریں، اس میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی۔ارواحِ ثلاثہ۔تذکرۃ الرشید۔حیاتِ قاسمی۔تذکرۃ الخلیل۔حیاتِ شیخ الہند۔اشرف السوانح اور حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہٗ کی آپ بیتی کا اجتماعی مطالعہ خاص طور پر مفید ہوگا۔

(3)...... ہر مدرسہ کے اساتذہ اور مہتممین کے لئے کسی شیخِ طریقت سے باقاعدہ اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کرنا ضروری سمجھا جائے، اور اساتذہ کے تقرر اور ترقی وغیرہ میں اس کے اس پہلو کو بطورِ خاص نظر میں رکھا جائے۔

(4)......جس مدرسہ سے قریب کوئی صاحبِ ارشاد بزرگ موجود ہوں، وہاں کے اساتذہ اور طلبہ ان کی صحبت وخدمت کو غنیمتِ کبریٰ سمجھ کر اختیار کریں، اور کبھی کبھی مدرسہ میں ان کے اجتماعی وعظ ونصیحت کا اہتمام کیا جائے۔

امید ہے کہ ان شاء اللہ اس قسم کے اقدامات سے مدارس کی فضا بہتر ہوگی، اور ہم

www.idaraghufran.org

اپنے جس مرکز سے رفتہ رفتہ ہٹتے جارہے ہیں، اس کی طرف لوٹنے میں مدد ملے گی‘‘ (ہمارا تعلیمی نظام ص۹۴و۹۵، بعنوان’’دینی مدارس کا نصاب ونظام‘‘ ناشر: زمزم بک ڈپو، دیوبند، انڈیا، سن،طباعت: مارچ ۱۹۹۵ء)

علماء وطلبہ کے لئے تصوف وتزکیہ، نیز کسی بزرگ سے باقاعدہ اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کرنے، اور صاحبِ طریقت بزرگ کی صحبت وخدمت کو مدارس کی روح کے احیاء میں بڑا دخل ہے، اور مدارس اسی چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے روحانی زوال کا روز بروز شکار ہیں۔

مزید لکھتے ہیں:

’’ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم اور بنیادی طور پر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور اپنے شب وروز کی جدوجہد میں ہم اس مقصد سے کس حد تک قریب ہو رہے ہیں؟

اہلِ علم کے سامنے اس حقیقت کو بیان کرنے کے لئے تفصیل کی ضرورت نہیں کہ دینی مدارس کا اصل مقصد ایک ایسا نظام صلاح واصلاح قائم کرنا ہے، جس میں تمام لوگ پہلے اپنی اور پھر دوسروں کی اصلاح کے طریقے سیکھیں، پھر اپنے عمل کو علمِ صحیح کے مطابق بنائیں اور اس طرح ایک ایسا مثالی اسلامی ماحول تیار ہو، جو عام دنیا کے لئے ایک نمونہ بن سکے، اساتذہ اپنے شاگردوں کو علم کا محض ایک ظاہری خول نہ دیں، بلکہ ان میں ذوقِ عمل پیدا کرنے کی کوشش کر کے انہیں صحیح معنیٰ میں مسلمان بنانے کی فکر کریں۔

دارالعلوم دیوبند کی بنیادی خصوصیت، جس کی بناء پر وہ برصغیر کی دوسری درس گاہوں سے ممتاز ہوا، یہ تھی کہ وہ علم برائے علم کا ادارہ نہ تھا، بلکہ انسانوں کی ایسی تربیت گاہ تھی، جس سے صحیح العقیدہ، سچے اور پکے مسلمان تیار ہوتے تھے، اپنی گفتار سے زیادہ کردار سے اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔

اس وقت ہمیں سب سے پہلے اپنے ماحول میں دینی مدارس کی اسی روح کو ازسرِ نوتازہ کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس کے بغیر ہماری درس گاہیں، اگر بہت کامیاب ہوئیں، تب بھی محض علم برائے علم کے مراکز بن کررہ جائیں گی، مدرسے قائم کرنا اوران میں چند لگے بندھے علوم کا درس دینا، بذاتِ خود ایک مقصد بن جائے گا، جس میں بہت سے مستشرقینِ یورپ بھی سرگرمِ عمل ہیں اور رفتہ رفتہ ہم سے سارے اوصاف گم ہوجائیں گے، جوان علوم کی درس وتدریس کے لئے لازمی شرط کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دینی مدارس میں یہ اصل روح جو مرورِایام سے دھیمی پڑتی جارہی ہے، ازسرِنوتازہ کرنے کے لئے سب سے اہم ذمہ داری ان درس گاہوں کے اساتذہ اور منتظمین پر عائد ہوتی ہے، ان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ پہلے اپنے ذاتی اعمال واخلاق کا جائزہ لے کر یہ دیکھیں کہ اسلامی علوم نے ان میں اپنا کوئی رنگ پیدا کیا ہے، یانہیں؟ خوفِ الٰہی اور فکرِ آخرت میں کتنا اضافہ ہوا؟ اللہ کے ساتھ تعلق کتنا بڑھا؟ عبادت کے ذوق میں کتنی زیادتی ہوئی؟ جن فضائلِ اعمال کی دوسروں کو شب وروز تلقین کی جاتی ہے، ان پر خود کتنا عمل پیرا ہوئے؟ جس انفاق فی سبیل اللہ کی دوسروں کو بڑھ چڑھ کرتا کید کی جاتی ہے، اس میں ہم خود کس قدر حصہ دار بنے؟ دین کی خاطر جان ومال کی قربانی دینے کے جذبے نے کتنی ترقی کی؟ معاشرے کے بگاڑ سے کرب واضطراب کی کیفیت اوراس اصلاح کی فکر کس حد تک دل ودماغ پر طاری ہوئی؟

یہ ساری باتیں ہمارے اپنے سوچنے کی ہیں اوراگر ہم حقیقت پسندی کے ساتھ ان سوالات کا جواب اپنے عمل میں تلاش کریں، تو ندامت وحسرت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

ضرورت اسی ندامت وحسرت سے کام لینے کی ہے، لیکن اس سے صحیح کام اسی وقت لیا جاسکتا ہے، جب یہ ندامت وحسرت محض ایک وقتی اُبال نہ ہو، بلکہ اس

کا بار بار استحضار ہوتا رہے، یہاں تک کہ یہ مستقبل کے لئے نشانِ راہ بن جائے۔

اس غرض کے لئے یہ طریقہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام دینی مدارس کے اساتذہ اور منتظمین ہفتہ میں کم از کم ایک بار مل کر بیٹھیں، اور اس دن مجلس کا موضوع یہی باتیں ہوں، بہتر ہوگا کہ اس مجلس میں بزرگانِ دین کی کتابیں اجتماعی طور پر پڑھی جائیں، جو اصلاحِ اعمال واخلاق کے لئے اکسیر ثابت ہو چکی ہیں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے مواعظ وملفوظات اس سلسلے میں ان شاء اللہ بے نظیر ثابت ہوں گے۔

دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دور میں تقریباً تمام علماء کسی اللہ والے بزرگ سے استرشاد کا تعلق قائم کر کے اپنی اصلاح وتربیت کا اہتمام فرماتے تھے، یہ سلسلہ بھی عرصے سے دینی مدارس کے ماحول میں متروک سا ہو رہا ہے، اسے از سرِ نو زندہ کرنے کی ضرورت ہے اور ان شاء اللہ اس کے دُور رَس فوائد وثمرات نکلیں گے"

(ہمارا تعلیمی نظام ص۹۴ و ۹۵، بعنوان "اصحابِ مدارس کی خدمت میں" ناشر: زمزم بک ڈپو، دیوبند، انڈیا، سن، طباعت: مارچ ۱۹۹۵ء)

اب دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب اہلِ مدارس کو اس چیز کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے اکابر ومشائخ کے طرزِ عمل سے کس قدر قریب ہیں؟

(ماہنامہ "التبلیغ" جلد2 شمارہ9، 10، نومبر/ دسمبر 2005ء- رمضان/شوال 1426ھ)

---

(15)

کونسا علم فرضِ عین ہے؟

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"علمِ دین کی دو مقداریں ہیں، ایک یہ کہ ضروری عقائد کی تصحیح (اصلاح) کی

www.idaraghufran.org

جائے، فرض عبادتوں کے ضروری ارکان وشرائط واحکام معلوم ہوں، معاملات ومعاشرات (لین دین اور رہن سہن کے مسائل) جن سے اکثر سابقہ (واسطہ) پڑتا ہے، ان کے ضروری احکام معلوم ہوں، مثلاً نماز کن چیزوں سے فاسد ہوجاتی ہے، کن کن صورتوں میں سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے، اگر سفر پیش آجائے، تو کتنے سفر میں (نماز) قصر ہے، اگر امام کے ساتھ پوری نماز نہ ملے، تو بقیہ نماز کس صورت میں کس طرح پوری کرے، قضا کے کیا احکام ہیں، زکاۃ کن احوال (حالات) میں واجب ہے، اور اس کی ادائیگی کی کیا کیا شرائط ہیں، اسی طرح حج وصوم (روزہ) کے احکام اور یہ کہ نکاح کن کن عورتوں سے حرام ہے، کن الفاظ سے نکاح جاتا رہتا ہے، ولایتِ نکاح اور عورت کے کیا احکام ہیں، رضاعت (کسی عورت کا بچپن میں دودھ پینے) کے اثر سے کون کون سے رشتے حرام ہو جاتے ہیں، مبادلۂ اموال (معاملات) میں کیا کیا رعایت واجب ہے، اجرت ٹھیرانے میں کون کون سی صورتیں جائز ہیں، اور کون سی ناجائز ہیں، نوکریاں کونسی جائز، اور کونسی ناجائز ہیں، اگرچہ بدقسمتی سے ناجائز میں مبتلا ہو، مگر ناجائز کو ناجائز تو سمجھے گا، اور دو جرموں کا مرتکب نہ ہوگا، ایک تو ناجائز کا ارتکاب، دوسرے اس کو جائز سمجھنا، اگر کوئی صاحبِ حکومت ہو، تو اس کو فیصلہ مقدمات کے شرعی قوانین کا بھی علم ہونا چاہئے، گو (اگرچہ) ان کے نافذ کرنے پر قادر نہ ہو، مگر جاننا اس لئے واجب ہے کہ شرعی فیصلوں کے ناحق اور غیر شرعی کے حق ہونے کا اعتقاد نہ کر بیٹھے، ماکولات ومشروبات (کھانے پینے کی چیزوں میں) کیا جائز اور کیا ناجائز ہے، اسبابِ تفریح میں کس کا استعمال درست ہے اور کس کا نادرست۔

باطنی اخلاق میں محمود ومذموم (اچھے اور برے) کا امتیاز ہو، اس کے علاج کا طریقہ معلوم ہو، مثلاً ریا (دکھلاوا) کبر (تکبر) غضب (غصہ) حرص طمع (لالچ)

ظلم، وغیرہ کی حقیقت جانتا ہو، تاکہ اپنے اندر ان کا ہونا، نہ ہونا معلوم ہو اور ہونے کی صورت میں ان کے ازالہ کی تدبیر کر سکے اور کوتاہی پر استغفار کرے۔

علمِ دین کی یہ مقدار عام طور پر ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر اکثر اوقات حق تعالیٰ کی ناراضگی اور معصیت (گناہ) میں مبتلا ہوگا۔

جن لوگوں نے بعض علوم کو فرضِ عین فرمایا ہے، اس بعض سے یہی مقدار مراد ہے اور فرضِ عین کا یہی مطلب ہے کہ یہ سب کے لئے عام طور پر ضروری ہے (تحفۃ العلماء، جلد اول، رسالہ علوم وفنون اور نصابِ تعلیم، ص۲۴۳و۲۴۴، بحوالہ: حقوق العلم ص۹۹۸، تجدید تعلیم ص۱۷، بعنوان "علمِ دین کی دو قسمیں، فرضِ عین، فرضِ کفایہ" ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

مذکورہ مضمون سے فرضِ عین علم کی تفصیل اور ساتھ ہی یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دین کا علم حاصل کرنا فائدہ مند ہے، اگرچہ عمل نہ بھی کیا جائے۔

ایک موقع پر حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں:

"کامل اسلام یہ ہے کہ عقائد بھی درست اور کتاب وسنت کے موافق ہوں، اور اعمال بھی، یعنی دینیات (عبادات) معاملات، گواہی، وکالت، تجارت، زراعت (کھیتی) وغیرہ اور معاشرت، کھانا پینا، اٹھنا، بیٹھنا اور اخلاقِ باطنہ، صبر، شکر، اخلاص سب کے سب شریعت کے موافق ہوں، یہ پانچ چیزیں ہیں (یعنی عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، باطنی اخلاق) جن کے مجموعے کا نام اسلام کامل ہے، اگر ان میں سے ایک جزء (حصہ) بھی کم ہو، تو وہ اسلام ایسا ہے، جیسے کوئی شخص حسین (خوبصورت) تو ہو، لیکن اس کی ناک نہ ہو" (تحفۃ العلماء، جلد اول، رسالہ علوم وفنون اور نصابِ تعلیم، ص۱۴۱، بحوالہ: دعواتِ عبدیت ج۸ ص۱۳۹، تکمیل الاسلام، بعنوان "عوام کو دینیات کے نصاب میں کن کونسے علوم پڑھانا چاہیئے" ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

ایک اور مقام پر حضرت موصوف فرماتے ہیں:

اگر کوئی مولوی نہ بنے تو بقدرِ ضرورت علمِ دین حاصل کر لینا چاہئے، اور ضروریات یہ ہیں، عقائد، دینیات (عبادات) معاملات، معاشرت، اخلاق، اس کے بعد چاہے، انگریزی پڑھو، یا صنعت سیکھو، جو چاہو کرو (لیکن پہلے دین کا علم حاصل کرلو) نیز اگر کوئی ذی استعداد (باصلاحیت) ہو، تو اس کو اجزاءِ مذکورہ کے علاوہ، وہ کتابیں پڑھادی جائیں، جن میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ملحدین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے (تحفۃ العلماء، جلد اول، رسالہ علوم وفنون اور نصابِ تعلیم، ص ۴۱، بحوالہ: دعواتِ عبدیت ج ۸ ص ۱۴۳، بعنوان ”عوام کو دینیات کے نصاب میں کن کونسے علوم پڑھانا چاہیے“ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

نیز ایک اور جگہ حضرت موصوف فرماتے ہیں:

”بقدرِ ضرورت دین کا علم حاصل کرنا، فرضِ عین ہے، اس لئے اگر فرضِ کفایہ کی ہمت نہ ہو، تو فرضِ عین کی مقدار ضرور حاصل کر لینا چاہئے، آج کل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ بس ہو تو پورا عالم ہو، ورنہ جاہل ہی رہے، یہ بڑی غلطی ہے، جن لوگوں کو عالم بننے کی فرصت نہ ہو، وہ بیچ کے راستہ پر رہیں کہ نہ عالم ہوں نہ جاہل، بلکہ ضرویاتِ دین کو حاصل کر کے اپنے دنیوی کاروبار میں لگیں، اور اس کے لئے ایک سال کی ضرورت ہے، زیادہ کی نہیں، ایک سال میں قرآن کا ایک دو سپارہ پڑھ کر اردو میں مسائل کا علم، بقدرِ ضرورت حاصل ہو سکتا ہے، اور اتنی فرصت تو دیہات والوں کو بھی مل سکتی ہے، اس لئے کم از کم ایک سال تو اپنے بچوں کو دینی تعلیم ضرور دینی چاہئے، اور یہ مدت میں نے ان لوگوں کے لئے بیان کی ہے، جنہیں پورا قرآن پڑھوانے کی فرصت نہیں، ورنہ ایک درجہ میں پورے قرآن کی بھی ضرورت ہے“ (تحفۃ العلماء، جلد اول، رسالہ علوم وفنون اور نصابِ تعلیم، ص ۳۹، ۴۰، بحوالہ التبلیغ الہدیٰ والمغفرۃ ج ۱۰ ص ۳۱۳، بعنوان ”عوام کے لیے ایک سالہ نصاب کافی ہے“ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

معلوم ہوا کہ عام مسلمانوں کو بقدرِ ضرورت علمِ دین حاصل کرنا فرض ہے، پھر اگر فرصت ہو، تو پورے قرآن مجید کی تعلیم کا درجہ ہے۔

مگر ہمارے یہاں معاملہ برعکس ہے، اوّلاً تو کسی کو خود، یا اپنی اولاد کے لئے دینی علم کی ضرورت کی طرف توجہ ہوتی ہی نہیں، اور اگر ہوتی بھی ہے، تو ناظرہ قرآن مجید پڑھ لینے کو کافی سمجھا جاتا ہے اور اس سے زیادہ آگے بڑھا جاتا ہے، تو قرآن مجید حفظ کر لینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مگر فرضِ عین علم جس کا درجہ ناظرہ، یا حفظ قرآن مجید پڑھنے سے زیادہ ہے، اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔

حالانکہ اگر کسی نے بقدرِ ضرورت دین کا علم حاصل کر کے اس پر عمل کیا، مگر پورا قرآن مجید ناظرہ یا حفظ نہ کیا، تو آخرت میں مؤاخذہ اور پکڑ کا خدشہ نہیں، اور اگر پورا قرآن مجید ناظرہ، یا حفظ کر لیا، مگر بقدرِ ضرورت دین کا علم حاصل نہ کیا، تو آخرت میں مؤاخذہ اور پکڑ یقینی ہے۔ [1]

اب آپ دیکھ لیجئے کہ ہمارے زمانے میں مدارس و مکاتب اور مساجد میں جو عام بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے، وہ فرضِ عین درجہ کی ہوتی ہے، یا اس سے کم درجہ کی، ظاہر ہے کہ فرضِ عین درجہ کی نہیں ہوتی، بلکہ ناظرہ، یا حفظِ قرآن مجید پر سارا زور خرچ کیا جاتا ہے اور ناظرہ، یا حفظ قرآن مجید پڑھ کر ساری زندگی کے لئے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ دینی علم حاصل ہو گیا اور ساری زندگی دینی علم سے نابلد رہ کر اپنی لاعلمی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

اس لئے اہلِ علم کو چاہئے کہ بقدرِ ضرورت علمِ دین حاصل کرنے کی ضروت و اہمیت کی طرف خود بھی متوجہ ہوں اور لوگوں کو بھی متوجہ کریں اور جب تک اس کے لئے کوئی مستقل نظم ونسق

---

[1] (وحفظ جميع القرآن فرض كفاية)(الدر المختار مع شرحه رد المحتار، ج ۱ ص ۵۳۸، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة،فصل فی القراء ة)

تعلم بعض القرآن ووجد فراغا فالأفضل الاشتغال بالفقه، لأن حفظ القرآن فرض كفاية، وتعلم ما لا بد منه من الفقه فرض عين(ردالمحتار ج۶ ص۴۰۸، كتاب الحظر والاباحة)

حفظ القرآن على الأمة اهـ أى فرض كفاية وصلاة التطوع مندوبة (ردالمحتار ج۶ ص ۴۳۱، كتاب الحظر والاباحة)

www.idaraghufran.org

قائم نہ ہو سکے، اس وقت تک حفظ و ناظرہ کے شعبوں میں بقدرِ ضرورت دین کے علم کو بھی ضمناً ساتھ رکھیں اور اس کی بھی تعلیم دیں۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ دین کا یہ مذکورہ علم تو حفظ و ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم کے بعد بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، جب درسِ نظامی میں مشغول ہوں گے اور عالمِ دین بنیں گے، تو اُس وقت یہ علم خود بخود ہی حاصل ہو جائے گا۔

تو یاد رکھئے کہ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے، کیونکہ اوّلاً تو ہر ایک پر عالمِ دین بننا، فرضِ عین نہیں، جس طرح ناظرہ و حفظ قرآن مجید پڑھنا فرضِ عین نہیں اور بقدرِ ضرورت دین کا علم حاصل کرنا فرضِ عین ہے، اور فرضِ عین علم کی ضرورت ان مذکورہ دوسرے علوم سے مقدم ہے، لہٰذا اگر کوئی پورا عالمِ دین نہیں بنا، اور اس نے ناظرہ، یا حفظ قرآن مجید پڑھ کر چھوڑ دیا، جیسا کہ آج کل ایسے بچوں اور طلبہ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے، پھر آپ کیا کریں گے؟

دوسری بات یہ ہے کہ آج کل مروّجہ عالمِ دین کے نصاب کے پڑھنے پڑھانے کا جو عام طرز چلا ہوا ہے، اس میں بھی زیادہ صلاحیتیں فرضِ کفایہ، بلکہ مستحب علم پر خرچ ہوتی ہیں، فرضِ عین کی ضرورت کی طرف اس دوران اتنی توجہ نہیں ہوتی۔

اگر پہلے ہی بقدرِ ضرورت دین کا علم حاصل کر لیا جائے، پھر خواہ کوئی پورا قرآن مجید ناظرہ یا حفظ پڑھے، یا نہ پڑھے، اور عالمِ دین بن سکے، یا نہ بن سکے، ہر صورت میں مفید ہی ہے، مضر نہیں۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 2 شمارہ 11، جنوری 2006ء۔ ذیقعدہ/ذی الحجہ 1426ھ)

---

(16)

غیر عربی دان بھی ''فرضِ علم'' حاصل کر سکتا ہے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

www.idaraghufran.org

’’مسلمانوں کو علمِ نافع (نفع بخش علم) حاصل کرنا چاہئے، اور اس کی طرف پوری توجہ کرنا چاہئے۔

یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو نماز، روزہ کی طرف تو توجہ ہے، مگر علمِ نافع کی طرف توجہ نہیں، اگر کوئی نماز نہ پڑھے، روزہ نہ رکھے، زکاۃ نہ دے، حج نہ کرے، تو سب لوگ اس کو بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں اور اگر کوئی شخص علمِ دین بالکل حاصل نہ کرے، تو اس کو بُرا کوئی نہیں کہتا، حالانکہ بقدرِ ضرورت علم حاصل کرنا، ہر شخص کے ذمہ ویسا ہی فرضِ عین ہے، جیسا کہ نماز، روزہ وغیرہ۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ مولوی بن جاویں اور میرا یہ مطلب کیونکر ہوسکتا ہے، میں تو ابھی اہلِ مدارس کو مشورہ دے چکا ہوں کہ وہ سب طلبہ کو مولوی نہ بنایا کریں، تو جب میں سب طلبہ کا مولوی ہونا پسند نہیں کرتا، تو عوام کا مولوی ہونا میں کیوں چاہوں گا، پس آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ آپ کو مولوی بننا پڑے گا، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ مسائل واحکامِ شرعیہ کا علم بقدرِ ضرورت اُردو زبان ہی میں حاصل کرلیا جائے، اور بچوں کو مکتب میں قرآن اور دینی رسائل پڑھنے کے لئے بھیجا جائے، جب وہ بقدرِ ضرورت مسائل سے واقف ہوجائیں، پھر تمہیں اختیار ہے، جس کام میں چاہو لگاؤ، اور جو رؤساء (مالداروں) کے بچے ہیں، جن کو اللہ نے مالی وُسعت عطاء فرمائی ہے، اُن کو چاہیے کہ علمِ دین کی پوری تعلیم دی جائے، کیونکہ ان کو معاش (کمائی) کی فکر سے اللہ نے بچایا ہے، تو اس کا شکر اس طرح اداء کرنا چاہئے کہ یہ لوگ دین کی خدمت کریں، اور اگر پوری تعلیم نہ دی جائے، تو کم از کم قرآن اور اردو کے ضروری دینی رسائل تو ان کو ضرور پڑھا دیئے جائیں، تاکہ وہ اپنے مذہب سے تو کسی قدر واقف ہوجائیں، اور جو لوگ اردو بھی نہ پڑھ سکیں، جیسے گاؤں کے کاشت کار وغیرہ ان کو چاہیے کہ علماء سے ملتے رہیں اور مسئلے

پوچھتے رہیں، اگر وہ روزانہ ایک مسئلہ بھی یاد کرلیا کریں، تو سال بھر میں تین سو ساٹھ مسئلے یاد ہو سکتے ہیں۔

رہ گئیں عورتیں ان کو مرد تعلیم دیا کریں، اور جو مرد پڑھے لکھے نہ ہوں، وہ عورتوں سے کہہ دیا کریں کہ تم کو جو مسئلہ پوچھنا ہو، ہم سے کہہ دیا کرو، ہم علماء سے پوچھ کر تم کو بتلادیں گے۔

لیجئے اس ترکیب سے ساری اُمّت بقدرِ ضرورت علم سے فیض یاب ہو سکتی ہے، اور جو لوگ اردو پڑھ بھی سکتے ہیں، ان کو علماء سے ملنے ملانے اور سوال کرنے کا عادی رہنا چاہئے، کیونکہ بعضی بات کتاب سے حل نہیں ہوتی، علماء سے زبانی دریافت کر کے اس کی حقیقت حل ہو جاتی ہے، اور دین کے ساتھ تعلق ومناسبت تو بدون (بغیر اللہ والوں کی) صحبت کے حاصل ہوتا ہی نہیں۔

صاحبو! آج کل علم کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ اول تو مخالفینِ اسلام، جاہل مسلمانوں کو طرح طرح سے بہکاتے پھرتے ہیں، پھر خود مسلمانوں میں بعضے فرقے ایسے موجود ہیں، جو ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مگر واقع میں وہ اسلام سے دُور ہیں، اور بعضے گو (اگرچہ) مسلمان ہیں، مگر گُمراہ ہیں، تو بعضے جاہل مسلمان ان گمراہ لوگوں کی باتوں کو اسلام کی باتیں سمجھنے لگتے ہیں، اور دھوکے میں پڑ جاتے ہیں، پھر جو جماعت اہلِ حق کی کہلاتی ہے، ان میں بھی بعضے ایسے ہیں جنہوں نے دنیوی اغراض کو قبلہ وکعبہ بنا رکھا ہے کہ جس کام کے ساتھ ان کی دنیوی غرض متعلق ہوئی، اس کو انہوں نے دین کا لباس پہنا کر عوام کے سامنے ظاہر کر دیا، اور جس چیز کی ممانعت سے ان کی اغراض میں خلل پڑتا ہو، اس کی حُرمت کو ظاہر نہیں کرتے، اسی لیے وہ بہت سی باتوں کو جن کو پہلے جائز کہتے تھے، آج حرام کہنے لگے، اور جن باتوں کو ہمیشہ سے حرام وناجائز کہتے تھے، آج ان کی

حرمت کو ظاہر نہیں کرتے۔

صاحبو! یہ غرض وہ چیز ہے، جس میں انسان دین سے اندھا بن جاتا ہے، مولانا (روم رحمہ اللہ) فرماتے ہیں:

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صدحجاب ازدل بسوئے دیدہ شد

چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار کے شناسد ظالم از مظلوم زار

(یعنی جب غرض آجاتی ہے، تو ہنر پوشیدہ ہوجاتا ہے اوردل کی جانب سے سینکڑوں پردے آنکھوں پر پڑجاتے ہیں۔جب قاضی رشوت لینے کی دل میں ٹھان لیتا ہے،تو ظالم اور مظلوم میں امتیاز نہیں کرسکتا)''

(وعظ ''تعظیم العلم''مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت، ج۲۷،ص۶۸ تا ۷۰، بعنوان ''فضائلِ علم''ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر۱۴۳۱ھ)

اورحضرت تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''عوام کی غلطی یہ ہے کہ وہ علمِ نافع کو بھی حاصل نہیں کرتے، وہ اگر معقول (عقلی علم) سے بچے ہوئے ہیں، تو دینیات سے بھی بے خبر ہیں، اور یہ غلطی جو عوام کرتے ہیں، وہ بھی درحقیقت علماء ہی کی ذاتِ مقدس سے نکلی ہے، کیونکہ ہر فتنہ ہمارے ہی سے نکلتا ہے، عوام کا فساد اکثر کسی عالم کے فساد سے پیدا ہوتا ہے، چنانچہ دنیا میں جس قدر بدعات ومنکرات پھیلی ہیں، کسی عالم کا ہاتھ اُن میں پہلے شریک ہوا ہے۔

بِناء (بنیاد) اس غلطی کی یہ ہے کہ عوام نے علمِ دین کو عربی ہی کے ساتھ مخصوص سمجھ لیا ہے، اور عربی پڑھنے کی ہر ایک کو فرصت نہ تھی، تو اب انہوں نے اردو میں بھی مسائل نہ سیکھے، کیونکہ اردو میں مسائل پڑھ لینے کو وہ علم ہی نہیں سمجھتے، انہوں نے یہ خیال کیا کہ جب اردو میں پڑھ لینے کے بعد بھی ہم جاہل ہی رہیں گے، تو اس کی بھی کیا ضرورت ہے، اور یہ غلطی ہماری پیدا کی ہوئی، اس لیے ہے کہ آج کل واعظین جب علم کی فضیلت بیان کرتے ہیں اور جتنی حدیثیں پڑھتے ہیں، ان کے

www.idaraghufran.org

ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ عربی پڑھنی چاہئے اور جتنے عربی مدارس ہیں، ان کی امداد کرنی چاہیے۔

پس اگرچہ یہ لوگ صاف صاف یہ نہیں کہتے کہ علمِ دین عربی کے ساتھ مخصوص ہے، مگر ان سب فضائل پر عربی کی تعلیم کو متفرع کرنا، اور مدارسِ عربیہ کی امداد پر توجہ دلانا، لازمی طور پر عوام کے دلوں میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ بس جتنے فضائل علم کے بیان کیے گئے ہیں، یہ سب عربی ہی کے ساتھ خاص ہیں، بدون (بغیر) عربی میں علم حاصل کیے، یہ فضائل حاصل نہ ہوں گے، واعظوں کا مقصود تو محض مدارس کی امداد پر توجہ دلانا تھا، مگر عوام اس سے یہ سمجھ گئے کہ یہ فضائل جب ہی حاصل ہوں گے، جب کہ عربی میں اس علم کو حاصل کیا جائے۔

شاید یوں سمجھے ہوں کہ عربی اللہ تعالیٰ کی بولی ہے، اور اُردو ہماری بولی، تو علمِ دین تو اللہ تعالیٰ ہی کی بولی میں ہونا چاہیے، اور یہ مذاق صرف عوام ہی کا نہیں بگڑا، بلکہ بعض طالبِ علم بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں'' (وعظ ''تعمیم التعلیم''، مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت ج۲ص۱۶۳، بعنوان ''علم وعمل'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: رمضان ۱۴۲۷ھ)

اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''اس غلطی کا منشاء زیادہ تر علماء کی کوتاہی ہے کہ انہوں نے کبھی صاف صاف یہ نہیں کہا کہ اردو میں علمِ دین پڑھ لینے سے بھی وہ فضائل حاصل ہو سکتے ہیں، جو احادیث وقرآن میں علم کے لئے وارد ہیں، حالانکہ حدیث وقرآن میں کہیں عربی کی تخصیص نہیں۔

چنانچہ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علمِ مضر (نقصان دہ علم) وہ ہے، جو آخرت میں کام نہ آوے اور نافع (فائدہ مند علم) وہ ہے، جو آخرت میں کام آوے، اس میں کہیں یہ قید نہیں کہ وہ عربی میں ہونا چاہیے، مگر شاید علماء نے یہ

بات صاف صاف اس لیے نہیں کہی کہ ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم یہ کہہ دیں گے کہ اردو میں مسائل جان لینے سے بھی علم کی یہ فضیلتیں حاصل ہو سکتی ہیں، تو پھر ہماری قدر نہ ہوگی، پھر تو سارے ہی عالم ہو جاویں گے، مگر میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں بھی علماء کو نقصان ہوا، بلکہ دو نقصان ہوئے ایک عوام کو ایک علماء کو۔

عوام کو تو یہ نقصان ہوا کہ انہوں نے جب علم کو عربی کے ساتھ مخصوص سمجھا، اور عربی پڑھنے کی سب کو فرصت، یا ہمت نہ ہوئی، اور اردو میں پڑھنے کو وہ علم ہی نہ سمجھے، تو مسائلِ شریعت سے بالکل بے خبر رہ گئے، اور علم ہی سے محروم ہو گئے۔

علماء کا یہ ضرر (نقصان) ہوا کہ جب عوام علم سے بالکل محروم ہو گئے، تو وہ علماء کی قدر و منزلت سے بھی اندھے ہو گئے، کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کی قدر وہی کر سکتا ہے، جس کو کچھ تو اس سے مناسبت ہو'' (وعظ ''تعمیم التعلیم'' مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت ج۲ص ۱۶۶، ۱۶۷، بعنوان ''علم و عمل'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: رمضان ۱۴۲۷ھ)

اس سلسلہ میں حضرت موصوف مزید فرماتے ہیں:

''شریعت میں جتنے فضائل علم کے مذکور ہیں، اُن سے مراد وہ علم ہے، جو آخرت میں مفید ہو، یعنی علمِ شرائع واحکام، انگریزی تعلیم اس سے مراد نہیں۔

ہاں اگر انگریزی میں دینی مسائل کا ترجمہ ہو جائے، تو پھر ان انگریزی کتابوں کا پڑھنا بھی ویسا ہی ہے، جیسا کہ اردو میں دینی رسائل کا پڑھنا۔

مگر شرط یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والا محض انگریزی دان نہ ہو، بلکہ محقق عالم ہو، یا کسی انگریزی دان محقق عالم نے اس کی اصلاح اور تصدیق کر دی ہو'' (وعظ ''تعمیم التعلیم'' مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت ج۲ص ۱۹۴، ۱۹۵، بعنوان ''علم و عمل'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: رمضان ۱۴۲۷ھ)

Idara Ghufran

اسی سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

''اگر انگریزی میں کسی محقق نے دینی مسائل لکھ دیے ہوں، تو پھر ان انگریزی کتابوں کا پڑھنا بھی ثواب میں داخل ہے، باقی عام لوگوں کی انگریزی کتابیں ، خواہ وہ دین ہی کی طرف منسوب ہوں، قابلِ اعتبار نہیں، اور جن میں دین کا نام بھی نہ ہو، وہ تو محض دنیا ہے، ایسی تعلیم و تعلّم پر علمی فضیلت کی احادیث و آیات کو منطبق کرنا، تو نِری جہالت ہے'' (وعظ ''تعمیم التعلیم'' مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت ج۲ ص۱۹۷، بعنوان ''علم وعمل'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: رمضان ۱۴۲۷ھ)

''خلاصہ یہ ہوا کہ تعلیمِ علمِ دین کو وسیع کرنا چاہیے، علمِ دین کو عربی ہی کے ساتھ مخصوص نہ کرنا چاہیے'' (وعظ ''تعمیم التعلیم''، مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت ج۲ ص۱۹۷، بعنوان ''علم وعمل'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: رمضان ۱۴۲۷ھ)

اور ایک مقام پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صاحبو! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ''طالبُ الکتاب ''نہیں فرمایا، بلکہ ''طالبُ العلم ''فرمایا ہے تو احکام سے واقفیت پیدا کرو، خواہ پوچھ کر، یا پڑھ کر، عربی زبان میں، یا اُردو زبان میں ، زبان کوئی خاص مقصود نہیں ہے'' (وعظ'' طلب العلم''، مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت، ج۲۷ ص۹۷، بعنوان: '' فضائلِ علم'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر ۱۴۳۱ھ)

مزید فرماتے ہیں کہ:

''طالبِ علم کے یہ معنیٰ نہیں کہ وہ عربی پڑھیں، یہ تو ان کے لئے ہے، جو فارغ ہوں، ورنہ یہی معمول رہا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی اور تابعین رحمہم اللہ کا بھی کہ ضرورت کے موافق پوچھتے، اور اس پر عمل کرتے تھے، تو عربی نہ پڑھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم کو طلبِ دین کی فضیلت حاصل نہیں، حدیث میں ہے:

www.idaraghufran.org

”اِنَّ الْمَلائِکَۃَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتِھَارِضاً لِطَالِبِ الْعِلْمِ“ ؎

یعنی ملائکہ ان کے لئے جھک جاتے ہیں ”تَضَعُ“ کے یہی معنیٰ ہیں، اور یہ کہیں نظر سے نہیں گذرا کہ طالبِ علم کے پیر کے نیچے پر بچھا دیتے ہیں، اگر انہی لفظوں سے یہ سمجھا ہے، تو محلِ کلام ہے، اور اگر کوئی اور روایت ہے، جو ہم تک نہیں پہنچی، تو بسر و چشم قبول ہے، ان روایتوں کو سن کر اکثر لوگ دل شکستہ ہوتے ہیں کہ ہم کو یہ فضیلت حاصل نہیں، مگر میں مطلع کرتا ہوں کہ کوئی دل شکستہ نہ ہو، ہر شخص یہ فضیلت حاصل کرسکتا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ معاملات وعقائد وغیرہ کا اہتمام کرے اور غور کرتا رہے، اور جو نہ معلوم ہو، پوچھتا رہے، بس یہ طالبِ علم ہوگیا اور اس کے لئے وہی تعظیم ہوگئی، ہاں جو مقتدا (پورا عالمِ دین) بن جائے، وہ اس فضیلت کے ساتھ نائبِ رسول بھی ہوگا، ورنہ طلبِ علم کی فضیلت ہر شخص کو حاصل ہوسکتی ہے، تو یہ کیا کچھ کم دولت ہے“ (وعظ ”طلب العلم“ مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت، ج ۲۷ ص ۹۹، بعنوان: ”فضائلِ علم“ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر ۱۴۳۱ھ)

(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد 3 شمارہ 1، فروری 2006ء - محرم 1427ھ)

؎ عن كثير بن قيس، قال: كنت جالسا مع أبي الدرداء في مسجد دمشق، فجائه رجل، فقال: يا أبا الدرداء، إني جئتك من مدينة الرسول صلى الله عليه وسلم لحديث بلغني أنك تحدثه، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، ما جئت لحاجة .قال: فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: " من سلك طريقا يطلب فيه علما سلك الله عز وجل به طريقا من طرق الجنة، وإن الملائكة لتضع أجنحتها رضا لطالب العلم، وإن العالم ليستغفر له من في السماوات ومن في الأرض والحيتان في جوف الماء، وإن فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر على سائر الكواكب، وإن العلماء ورثة الأنبياء، وإن الأنبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما، ورثوا العلم، فمن أخذه أخذ بحظ وافر "(سنن ابی داود، رقم الحديث ۳۶۴۱، كتاب العلم، باب الحث على طلب العلم)

قال شعيب الارنؤوط: حسن بشواهده (حاشية سنن ابی داود)

(17)

سیاست وتحریکات میں طلبہ کی شرکت کا نقصان

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دو شانیں تھیں، ایک شانِ سلطنت اور دوسری شانِ نبوت ومحبوبیتِ حق...... حضور میں غالب شانِ نبوت تھی اور وہی آپ کی بعثت سے مقصود تھی، شانِ سلطنت مقصود نہ تھی، بلکہ شانِ نبوت کے تابع تھی، تاکہ اجرائے احکام میں سہولت ہو‘‘ (وعظ’’ارضاء الحق‘‘مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت، جلد ۱۵ صفحہ ۳۰، ملخصاً، بعنوان: ’’تسلیم ورضا‘‘ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ)

ایک اور مقام پر حضرت فرماتے ہیں:

’’اب تو یہ حالت ہے اور اسی کی فکر ہے کہ میدان میں آنا چاہئے، میدان میں آنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حجرہ بھی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے، اور میدان بھی ہاتھ نہیں آتا۔

پھر ان لوگوں کے نزدیک میدان میں آنے کی نہ کچھ شرائط ہیں، نہ حدود ہیں، دیوانوں کی سی ایک بڑ ہے کہ میدان میں نکلنا چاہئے، آنا چاہئے، یہاں تک نوبت آگئی کہ زبانوں پر یہ آتا ہے کہ مسائل کا وقت نہیں، کام کا وقت ہے، کام کرنا چاہئے، جو لوگ ایسے ہیں، وہ خود تو کسی کام کے رہے ہی نہیں، اس پر غضب یہ ہے کہ خود تو مبتلا ہوئے ہی تھے، بے چارے طالب علموں کو جو پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے، ان کو بھی اس بلا میں مبتلا کر دیا، اور میدان میں لا کھڑا کیا، یہ ایسا چٹیل میدان ہے کہ دانہ ہے، نہ پانی، نہ دنیا ہے، نہ دین، اس بدنظمی اور بے ڈھنگے پن کی کوئی حد ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ کسی تحریک میں بھی طالب علموں کو شرکت کی اجازت نہ ہونی

چاہئے، اس میں سخت مضرت (نقصان) ہے، آئندہ کے لئے، جو کہ اس وقت محسوس نہیں ہوتی۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ پڑھنے پڑھانے میں جب کوئی مشغول نہ رہے گا، تو پھر یہ جماعت علماء کی آئندہ (خالص دین کا) کام کرنے والی کہاں سے پیدا ہوگی، تم تو سب کچھ ہو، علماء ہو، مقتداء ہو، پیشوا ہو، تم ہی کرو، جو کرنا ہے، مگر طلباء کو تو اپنے کام میں لگا رہنے دو، تاکہ آئندہ دین کے احکام بتلانے والی جماعت کا سلسلہ جاری رہے، کیا یہ خیال ہے کہ آئندہ دین کی ضرورت ہی نہیں رہے گی، جیسا کہ کہتے ہیں کہ اب مسائل کا وقت نہیں، کام کا وقت ہے، کوئی ان حضرات سے پوچھے کہ جو آپ مقتداء اور پیشوا کہلائے، یا بنے، وہ لکھنے پڑھنے ہی کی بدولت تو بنے، اور اب (طالب علموں کو میدان میں لاکر اور سیاست میں مبتلا کر کے) اسی (لکھنے پڑھنے) کی جڑ کاٹ رہے ہو (''ملفوظات الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۱ص ۲۷، ملفوظ نمبر ۵، بعنوان ''میدان میں آنا چاہیے'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ)

معلوم ہوا کہ طلبۂ کرام کو سیاست اور تحریکاتِ حاضرہ میں شریک نہیں کرنا چاہئے، اور انہیں یکسوئی اور پوری توجہ کے ساتھ دینی علم کے حاصل کرنے میں مشغول رہنا چاہئے، طالب علموں کے سیاست اور تحریکاتِ حاضرہ میں شرکت سے ان کی تعلیم وتعلم کا سلسلہ متأثر ہوگا، اور ایسے طالبِ علموں میں فارغ ہو کر دینی احکام بتلانے کی قابلیت پیدا نہ ہوگی۔

واقعتاً حضرت موصوف نے بالکل سچ اور حق فرمایا کہ کسی تحریک میں بھی طالب علموں کو شرکت کی اجازت نہ ہونی چاہیے، کیونکہ اس میں آئندہ کے لیے طالبِ علموں کے لیے سخت نقصان ہے، جو اس وقت محسوس نہیں ہو رہا۔

اور آج حضرت موصوف کی پیش گوئی کے مطابق وہ نقصان ہمارے سامنے ہے کہ طالبِ

علموں کا تحریکی مزاج بن جانے کی وجہ سے آج ہزاروں لاکھوں طلباء فارغ التحصیل ہوتے ہیں، مگر دینی احکام بتلانے کی ان میں صلاحیت ولیاقت موجود نہیں ہوتی، اور فرضِ کفایہ علم تو بعد کی چیز ہے، وہ تو دین کے ضروری اور فرضِ عین احکام سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون۔**

اگر اب بھی اہلِ مدارس اس بات کو نہیں سمجھے، تو پھر کون سا وقت ہوگا؟

ایک مقام پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ’’ہمارے اکابر کا طریق تھا کہ تعلیم کے زمانہ میں کسی دوسری طرف توجہ کو سخت مضر (نقصان دہ) خیال فرماتے تھے، اور ظاہر ہے کہ معلمین (اساتذۂ کرام) کے طرزِ عمل کا طلبہ پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے، لہٰذا مدرسہ کے مدرسین کو بالخصوص طلبہ کی مصلحت (طلبہ کی مصلحت کی خاطر) سے سیاسیات سے علیٰحدہ رکھنا ضروری ہے، اور مدرسین کے دوسری طرف متوجہ ہونے سے تعلیم کا حرج بھی مشاہد (دیکھنے میں آیا) ہے، ایک ایسی جماعت کی بھی سخت ضرورت ہے، جو محض (اور خالصتاً) علمِ دین کی خدمت کرے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:
>
> **اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** (سورۃ الحج آیت ۴۱)
>
> ترجمہ: وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطاء کریں، تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ اداء کریں، اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں، اور سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔
>
> اس سے واضح ہے کہ دیانات مقصود بالذات (یعنی بذاتِ خود مقصود) ہیں، اور سیاسیات وجہاد مقصودِ اصلی نہیں، بلکہ اقامتِ دیانت (جو کہ مقصودِ اصلی ہے، اس) کا وسیلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکامِ دیانت (جو کہ مقصودِ اصلی ہیں،

وہ) تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے، اور سیاسیات و جہاد سب کو نہیں دیا گیا، بلکہ جہاں ضرورت و مصلحت سمجھی گئی، دی گئی، ورنہ نہیں، وسائل کی یہی شان (اور یہی حالت) ہوتی ہے کہ وہ بضرورت ہی لئے جاتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیات میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے، جس سے دیانت کا (مقصودِ اصلی کے بجائے) وسیلہ ہونا، اور تمکین فی الارض اور سیاست کا مقصود ہونا، سمجھ میں آ رہا ہے، اور وہ یہ ہے:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمۡ دِیۡنَھُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَھُمۡ (سورۃ النور آیت ۵۵)

ترجمہ: تم میں جو لوگ ایمان لاویں، اور نیک عمل کریں، ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطاء فرمائے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے، اس کو ان کے لئے قوت دے گا۔

یہاں ایمان و عملِ صالح کو شرط قرار دیا جا رہا ہے، تمکین فی الارض کی، جس سے تمکین و سیاست کا مقصودِ اصلی ہونا لازم آتا ہے، سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عملِ صالح پر تمکین و شوکت کا وعدہ کیا گیا ہے، اور بطورِ خاصیت کے شوکت کا دین پر ترتب ہونا، ذکر فرمایا گیا ہے (تمکین و قوت اور شوکت کا مقصودِ اصلی ہونا بیان نہیں فرمایا گیا) پس دین پر سیاست و قوت موعود ہوئی، لیکن موعود کا مقصود ہونا (یعنی جس چیز کا کسی عمل کے نتیجہ میں وعدہ کیا گیا ہو، اس کا مقصودِ اصلی ہونا) ضروری نہیں، ورنہ آیت کریمہ: (جو یہ ہے)

وَلَوۡ اَنَّھُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرَاۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ وَمَا اُنۡزِلَ اِلَیۡھِمۡ مِنۡ رَّبِّھِمۡ لَاَکَلُوۡا مِنۡ فَوۡقِھِمۡ وَمِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِھِمۡ (سورۃ المائدۃ آیت ۶۶)

(ترجمہ) اور اگر یہ لوگ تورات کی اور انجیل کی، اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے، تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے۔

(اس آیت) میں جس میں اقامتِ توراۃ وانجیل وقرآن، یعنی عمل بالقرآن پر وسعتِ رزق کا وعدہ کیا گیا ہے (یعنی اس آیت میں اللہ کی کتاب تورات، انجیل اور قرآن مجید پر عمل کرنے کے نتیجہ میں رزق کی وسعت کا وعدہ فرمایا گیا ہے) کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دین (یعنی اللہ کی کتاب پر عمل کرنے) سے یہ (یعنی رزق کا وسیع ہونا) مقصود ہے، بلکہ (یہی کہا جائے گا کہ رزق کا وسیع ہونا) دین پر موعود ہے (مقصود نہیں) کہ دیندار بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا، پس موعود کا (مقصود) ہونا، ضروری نہیں (یعنی جس چیز کا کسی عمل کے نتیجہ میں وعدہ کیا گیا ہو، اس کا مقصودِ اصلی ہونا ضروری نہیں)

یہاں بھی (بعینہٖ اسی طرح) ایمان وعملِ صالح پر شوکت وقوت اور سیاست وغیرہ موعود ہیں، جو بطورِ خاصیت اُس پر مرتب ہوں گی، نہ کہ مقصود، جو اس کی غایت (غرض وانجام) کہلائے۔

بہر حال واضح ہوا کہ سیاست ودیانت میں سیاست وسیلہ ہے، اور دیانت مقصودِ اصلی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجہ میں بھی مطلوب نہیں، بلکہ اس کا درجہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصودِ اصلی نہیں، اور دیانت خود مقصودِ اصلی ہے، اسی بناء پر میرا خیال یہ ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی رہنی چاہئے، جو خالص حفاظتِ دیانت اور تعلیمِ دین میں مشغول ہو، اور وہ جماعت اہلِ مدارس ہی کی ہوسکتی ہے (دین کی حفاظت اور تعلیمِ دین میں مشغول ہونے کا کام کوئی اور جماعت اہلِ مدارس کے

علاوہ انجام نہیں دے سکتی، اوراس کے برخلاف سیاست، جہادوغیرہ جیسے وسائل کا کام دوسری جماعتیں، اوردوسرے لوگ بھی انجام دے سکتے ہیں) اسی لئے میری پختہ رائے یہ ہے کہ طلبہ کوسیاسیات میں مبتلا نہ کیا جاوے۔

طلبہ اگران قصوں میں پڑ گئے، تو وہ تعلیم سے بھی جاتے رہیں گے، اور تربیت بھی اُن کی نہ ہوگی۔

چنانچہ جب سے طلبہ کو اس (سیاست کے) سلسلہ میں ڈال دیا گیا ہے، ان میں آزادی پیدا ہوگئی، اور اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ ہی لوگ (یعنی علماء ومدرسین) ہر وقت ان کی طرف سے متفکر اور خائف رہتے ہیں۔

میں نے اس سے پہلے بھی کئی باریہ کہا، اوراب پھر کہہ رہا ہوں، لیکن میں اس کے قبول کے آثار نہیں دیکھتا'' (تتمہ: اشرف السوانح، ج۴ ص۳۸ الیٰ ۴۰، بعنوان''حضرت کا آخری خط''ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول ۱۴۲۷ھ)

اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پرفرماتے ہیں کہ:

جیل خانہ چلے گئے، دوچار مہینے رہ کرآئے، آخراس کا نتیجہ ہی کیا، جب چیز پرقدرت ہی نہیں، تو کیوں آدمی اپنے کو پریشانی میں ڈالے، ہاں ایک نتیجہ تو جیل خانہ میں جانے سے ضرور نکل آتا ہے کہ شہرت ہوجاتی ہے، فلاں صاحب ایسے ہیں، ویسے ہیں، مگر یہ کوئی دینی مقصد نہیں، اس کا تعلق صرف جاہ (نام اونچا کرنے) سے ہے، جوخود ایک مستقل (روحانی ودینی) مرض ہے، جو قابلِ اصلاح ہے، ان اہلِ جاہ (نام اورشہرت کے طلب گاروں) میں خلوص کا نام نہیں، بس اس پر مرتے ہیں کہ نام ہو، پھر کام کہاں؟ اسی لیے تو میں مولویوں کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ ان کو چاہئے کہ ان فضولیات کو چھوڑیں اوران کاموں میں لگیں کہ (مسلمانوں کی فلاح صلاح اور ترقی کے لئے) اللہ تعالیٰ سے دعاء کریں (لوگوں کو پیش آمدہ

www.idaraghufran.org

مسائل میں) فتوے دیں، تبلیغ کریں، پڑھیں پڑھاویں، جاہلوں کے ساتھ ہوکر تضییعِ اوقات نہ کریں (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولۃ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۷ ص ۵۲، ملفوظ نمبر ۴۳، بعنوان ''آج کل کے لوگوں کا مذاق'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: محرم ۱۴۲۴ھ)

اس وقت ہمارے ملک کے عام علماء ومدارس میں جو سیاسی فضا پھیلی ہوئی ہے، اس کی وجہ سے اب اکثر طلبہ سیاسی میدان اور تحریکاتِ حاضرہ سے محفوظ نہیں رہے، یہاں تک نوبت آ گئی ہے کہ مروجہ درسِ نظامی کے اسباق کی عین تدریس کے دوران کسی نہ کسی طرح گھما پھرا کر بات کو مروجہ سیاسیات میں لے جایا جاتا ہے، بہت سے اہلِ علم حضرات کی عوامی تقریرات اور بیانات کا موضوعِ بحث ہی سیاست بن کر رہ گیا ہے، اسی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا۔

دینی مدارس میں سیاسی تحریکات کے عنوان پر طلبہ کی ممبر سازی کی جاتی ہے اور طلبہ کو تحریکات کے عہدے سپرد کیے جاتے ہیں، جو طلبہ اسباق، تکرار اور مطالعہ وغیرہ کی پابندی نہیں کرتے اور اس سلسلہ میں اپنی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتے، وہ سیاسی تحریکات کے میدان میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبۂ کرام کا جو اصلی وظیفہ تھا، یعنی ٹھوس اور ٹھیٹھ دینی علم، اس میں روز بروز تنزلی پیدا ہوتی جارہی ہے، اور آنے والی نسل میں رجالِ کار اور فقیہ پیدا ہونے کا فقدان ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں دین کی حفاظت کا عمل بھی یقینی طور پر متأثر ہوتا نظر آ رہا ہے۔

علماء کو چاہئے تو یہ تھا کہ سیاست کو دینی بنانے کی کوشش کرتے، اس کے بجائے انہوں نے دین کو سیاسی بنا دیا ہے۔

(لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ)

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 3 شمارہ 2، مارچ 2006ء- صفر 1427ھ)

(18)

عالم کے لئے مروّجہ سیاست دانی کا درجہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

’’سیاست کے دو حصے ہیں ایک سیاست کے احکامِ شرعیہ، یہ بے شک شریعت کا جزو ہے اور کوئی عالم اس سے ناواقف نہیں، چنانچہ ابوابِ فقہیہ میں سے کتاب السیر ایک مستقل اور مبسوط (مفصل) جزو ہے، جس کی درس وتدریس پر (دینی مدارس میں) دوام والتزام (ہمیشگی اور پابندی) ہے اور دوسرا حصہ سیاست کا، اس کی تدابیرِ تجربیہ (تجربے کی تدبیریں، یعنی عملی کام) ہیں، جو ہر زمانے میں حالات وواقعات اور آلات وغیرہ کے تغیر وتبدل سے بدلتی رہتی ہیں، اور یہ حصہ شریعت کا جزو نہیں اور علماء کا اس میں ماہر ہونا ضروری نہیں، اگر اس میں کوئی عالم ماہر ہو، اس کی مہارت کے دوسرے ذرائع ہیں، جن کا حاصل تجربہ ومناسبتِ خاصہ ہے، لیکن اوپر جو عرض کیا گیا کہ سیاست کا یہ حصہ، یعنی تدابیرِ تجربیہ شریعت کا جزو نہیں، اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ وہ حصہ شریعت سے مستغنی ہے، اور اس کے استعمال کرنے والوں کو علماءِ شریعت کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہیں، اگر کسی کا ایسا خیال ہے، تو محض غلط ہے، کوئی واقعہ اور کوئی عمل اور کوئی تجویز اور کوئی رائے دنیا میں ایسی نہیں، جس کے جواز وعدمِ جواز (یعنی اس کے جائز وناجائز ہونے) میں شریعت سے تحقیق کرنے کی ضرورت نہ ہو، گو (اگرچہ) وہ شریعت کا جزو نہ ہو، تو جزو نہ ہونے سے، تابع نہ ہونا لازم نہیں آتا‘‘ (البدائع، ص۲۳، بدیعہ نمبر۱۰، ناشر: مکتبہ تالیفاتِ اشرفیہ، تھانہ بھون، مظفر نگر، انڈیا)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے یہاں ایک بہت بڑا شریعت کا قاعدہ بیان فرمادیا، جس کے

ذریعہ بہت سے مسائل کا حل نکالا جاسکتا ہے، ساتھ ہی کئی شکوک وشبہات کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ سیاست اور اسی طرح دوسرے شعبوں، مثلاً تجارت، ملازمت، زراعت، طب وحکمت کے دو حصے ہیں، ایک حصہ احکامِ شرعیہ کا ہے اور دوسرا حصہ تدابیرِ تجربیہ کا ہے، پہلے حصہ کا تعلق براہِ راست شریعت سے ہے، اور اس حصہ سے اہلِ علم اچھی طرح واقف ہوتے ہیں، چنانچہ درسِ نظامی میں سیاست کے شرعی احکام، تجارت وملازمت کے شرعی احکام، اور زراعت کے شرعی احکام، اور اسی طرح طب وحکمت کے شرعی احکام کی تعلیم دی جاتی ہے، ان شعبوں کے حلال وحرام جائز وناجائز ہونے کے بنیادی احکام کا علم سکھایا جاتا ہے، رہا دوسرا حصہ، یعنی جو طریقے تجربہ اور مہارت سے یا زمانے اور حالات وواقعات کے بدلنے، یا جدید آلات پیدا ہونے سے وجود میں آتے ہیں، یہ شریعت کا جز نہیں، اس لئے یہ بذاتِ خود شرعی احکام نہیں، لہٰذا ان چیزوں میں علماء کا ماہر ہونا ضروری نہیں، لیکن باوجودیکہ یہ حصہ شریعت کا جز نہیں ،مگر پھر بھی اس حصہ کا شریعت کے تابع ہونا ضروری ہے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر شعبہ والے اس حصہ کو علماء کے سامنے رکھ کر معلوم کریں کہ یہ شریعت کے خلاف تو نہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک جگہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ’’سیاست دانی مولویت کے لئے شرط (ولازم) نہیں، اگر کسی مولوی کو اس سے مناسبت (لگاؤ اور تعلق) نہ ہو، تو اس سے اس کی مولویت میں کچھ فرق نہیں آتا، یہ مناسبت الگ چیز ہے، حتیٰ کہ نبوت تک کے لئے بھی (سیاست دانی) لازم نہیں‘‘

(’’ملفوظات الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ‘‘ مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۱۰ص ۲۱۷، ملفوظ نمبر ۱۳۱، بعنوان ’’سیاست دانی مولویت کے لیے شرط نہیں‘‘ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

معلوم ہوا کہ عالمِ دین کے لئے سیاست میں عملی طور پر حصہ لینا اور سیاست کے تجربہ سے متعلق امور کا علم ہونا، ضروری نہیں، اگر کسی عالمِ دین کو سیاست کے معاملات سے مناسبت نہ ہو، تو اس کی وجہ سے اس کے عالمِ دین ہونے کے منصب میں خلل نہیں آتا، اور وجہ اس کی یہ

ہے کہ علماء، دراصل انبیاء کے وارث ہیں، اور جب نبوت کے لئے بھی سیاست لازم نہیں، تو نبی کے وارث کے لئے کیسے ضروری ہوسکتی ہے۔

ایک اور جگہ حضرت موصوف فرماتے ہیں:

''نبوت اور اسی طرح مولویت کے لئے سیاست کو لازمی قرار دینا، جیسے نقلاً باطل ہے، اسی طرح عقلاً مذموم (بُرا) ہے اور علماء پر یہ اعتراض کہ وہ سیاسیات میں کیوں شرکت نہیں کرتے ،شرعی اور تمدنی دونوں حیثیت سے لغو ہے ،اور افسوس ہے کہ علماء کے لئے سیاسیات میں شرکت تو ضروری قرار دی جاتی ہے، مگر جو کام کہ علماء کے فرائضِ منصبی میں داخل ہے، وہ کام علماء سے لیا نہیں جاتا، اور وہ کام یہ ہے کہ قانونِ شریعت میں حق تعالیٰ کے اوامر ونواہی (کرنے اور چھوڑنے کے احکام) کا تعلق، جیسے عبادات سے ہے، اسی طرح سیاسیات سے بھی ہے اور جیسے عبادات کے اندر بعض اُمور جائز ہیں اور بعض ناجائز، مثلاً نماز فرض ہے، مگر بلا وضو سجدہ کرنا حرام ہے، اسی طرح سیاسیات کے اندر بعض اُمور (بعض چیزیں) جائز ہیں، بعض ناجائز، تو جو لوگ سیاسیات میں مشغول ہیں، اُن پر یہ ضروری ہے کہ جب وہ (سیاست سے متعلق) کوئی نیا کام کریں (مثلاً کوئی قانون سازی کریں) تو اوّل علماء سے استفتاء لے لیا (فتویٰ طلب کرلیا) کریں کہ یہ کام مذہب کے تو خلاف نہیں۔ پھر جب کہ علماء سے ایسا استفتاء (فتویٰ طلب) کیا جائے ،تو اب علماء کا کام یہ ہے کہ مذہبی کتابوں میں غور وفکر کر کے ان جزئیات کا حکم معلوم کریں اور ان استفتاؤں (اور مسئلوں) کا جواب دیں، تا کہ جو تدابیر سیاسی جائز ہوں، ان پر عمل کیا جاسکے ،اور جو تدابیر سیاسی ،اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہوں، ان سے بچا جاسکے'' (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۹ ص ۷۱، ملفوظ نمبر ۱۰۰، بعنوان ''ہر عالم کا سیاست میں ماہر ہونا ضروری نہیں'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخ اشاعت: صفر: ۱۴۲۵ھ)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے بہت مؤثر انداز میں اس شبہ کا جواب دے دیا ہے کہ عالمِ دین کے لئے سیاست کو ضروری سمجھنا نقل اور عقل دونوں کے رو سے غلط ہے، علماء کا اصل منصب تو یہ ہے کہ اُن سے ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے حلال وحرام، اور جائز وناجائز کے مسائل معلوم کریں، یہاں تک کہ سیاست کے شعبہ والے بھی اپنے سیاسی کاموں سے متعلق، پہلے علماء سے ان کا شرعی حکم معلوم کرلیا کریں، یہ ایسا طریقہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے علماء کا اصل منصب اور ذمہ داری بھی متأثر نہیں ہوگی، اور سیاست ودیگر شعبوں میں بھی دین پہنچ جائے گا، اور اس طرح علمائے کرام بھی سیاست سمیت دوسرے شعبوں میں خدمات انجام دینے والے بن جائیں گے، تو علمائے کرام کے سیاست اور دوسرے شعبوں میں شریک ہونے اور حصہ لینے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہ سیاست دانوں کو شرعی احکام اور اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات سے آگاہ کرتے رہیں، اور سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے اور شامل ہونے کو علماء کے لئے ضروری سمجھنا، تو ایسا ہے، جیسا کہ علمائے کرام سے تجارت وملازمت اور زراعت کے مسائل معلوم کرنے کے بجائے، خود علماء کو ہی تجارت، ملازمت اور زراعت وغیرہ کے شعبوں میں عملی طور پر شریک کرلیا جائے، ظاہر ہے کہ علمائے کرام کے ان شعبوں میں شریک ہونے سے دین کا نقصان ہوگا، اور علماء اپنا اصل کام انجام نہیں دے سکیں گے، اسی طرح مروجہ سیاست میں عملی طور پر شریک ہونے کے بعد علمائے کرام کے اپنے اصل کام، یعنی خالص علمِ دین کی خدمت انجام دینے میں خلل آئے گا۔

ایک موقع پر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”آج کل بعض علماء، جو سیاسیات میں بہت کودتے پھاندتے ہیں اور چند واقعات وجزئیات معلوم کرکے، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے سیاست دان ہیں، وہ دوسرے اپنے ہم عصر علماء پر جو یکسوئی کے ساتھ قوم کی خالص مذہبی دینی خدمات میں

مشغول ہیں، اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ سیاسیات میں کیوں مشغول نہیں ہوتے، اور ایسے سیاسی لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ہر مولوی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سیاسیات میں دخل دے، اور اس کے اندر مہارت حاصل کرے، اور اس کے اندر مشغول ہو، حالانکہ ان لوگوں کے پاس ان کے اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ قرآن پاک کے اندر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ ہر مولوی کو سیاسیات کے اندر مشغول ہونا ضروری ہے، غلط ہے" ("الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۹ ص ۶۵، ملفوظ نمبر ۱۰۰ بعنوان "ہر عالم کا سیاست میں ماہر ہونا ضروری نہیں" ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر: ۱۴۲۵ھ)

علمائے کرام کا اصل منصب تو یہی تھا کہ وہ قوم کی خالص مذہبی، دینی وعلمی خدمات میں مشغول ہوں، اور اس کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر متوجہ نہ ہوں، اب جو علما اپنے اصل منصب میں مشغول ہیں، ان پر وہ علماء جو اپنے اصل منصب سے ہٹ کر، عملاً پوری طرح سیاست میں مشغول ہیں، اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ سیاست میں کیوں مشغول نہیں ہوتے، حالانکہ اصل اعتراض ان علماء پر کرنے کے بجائے، جو خالص مذہبی، دینی وعلمی خدمت میں مصروف ومشغول ہیں، ان پر ہونا چاہئے تھا، جو اپنے اصل منصب کو چھوڑ کر پوری طرح نہ صرف عملی طور پر سیاست میں مشغول ہیں، بلکہ مروجہ سیاست میں لگ کر حلال اور حرام اور جائز وناجائز کی تمیز بھی نہیں کرتے۔

(ماہنامہ "التبلیغ" جلد 3 شمارہ 3، اپریل 2006ء۔ ربیع الاول 1427ھ)

---

(19)

علماء کی مروّجہ سیاست میں عملی شرکت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اگر کسی وقت کوئی جماعت اہلِ سیاست کی ایسی نہ ہو کہ علماء سے احکام پوچھ

کر عمل کیا کریں، جیسا اس وقت غالب ہے، تو اس وقت علماء ایسی جماعت کے پیدا ہونے کے منتظر نہ رہیں، ورنہ محبانِ دنیا (دنیا کے طلبگار اور پجاری) دینی مقاصد کو تباہ کر دیں گے، بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بنا دیں، جو علماً وعملاً (یعنی علمی وعملی اعتبار سے) سیاست وشریعت کے جامع ہوں، مگر یہ حکم کچھ سیاستِ مدینہ (ملکی سیاست) کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ سیاستِ بدنیہ یعنی طب (ڈاکٹری) بلکہ اسبابِ معاش (یعنی روزی کمانے اور حاصل کرنے کے ذرائع) میں سے جتنے فرضِ کفایہ ہیں، مثل تجارت وزراعت سب کا یہی حکم ہوگا، البتہ جس چیز کا ضرر (اور نقصان) دین میں زیادہ قریب ہو، اس میں دخلِ اصلاحی کا وجوب، ایسی چیز دخل اصلاحی کے وجوب سے اقویٰ وآکد ہوگا، جس کا ضرر دین میں قریب نہ ہو (مطلب یہ ہے کہ جس چیز کا نقصان دین کے قریب ہوگا، اس چیز میں علماء کو اصلاح کی غرض سے دخل دینے کا حکم ایسی چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ قوی اور تاکیدی ہوگا، جن چیزوں کا نقصان دین کے زیادہ قریب نہ ہو)

اور ان سب مقاصد کی اصلاح کے لئے خصوص حفاظتِ دین کے لئے جماعت کا انتظام کرنا، ہر حال میں مشروط ہوگا، استطاعت (قدرت) کے ساتھ۔

یہ تو ایک تحقیقِ کلی ہے، اس سے آگے جزئیات ہیں، جن میں کلام کچھ متفق علیہ (اتفاقی) کچھ مختلف فیہ (اختلافی) اپنے محل میں مبسوط (مفصّل) ومضبوط ہے، ان میں ایک مسئلہ استطاعت (قدرت ہونے، نہ ہونے) کا بھی ہے“

(البدائع، ص۲۴،۲۵، بدیعہ نمبر۱۰، ناشر: مکتبہ تالیفاتِ اشرفیہ، تھانہ بھون، مظفرنگر، انڈیا)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی وقت ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ سیاسی جماعتیں علماء سے احکام معلوم کرنے میں کوتاہی کریں، جیسا کہ اس وقت صورتِ حال یہی ہے، تو علماء کو چاہئے

کہ وہ اپنے اندر سے ایک ایسی جماعت تیار کریں، جو علمی وعملی اعتبار سے سیاست وشریعت دونوں کی جامع ہو، یعنی اس جماعت کو شریعت وسیاست دونوں کا علم بھی ہو، اور عمل بھی اس کے مطابق ہو، نہ تو ایسا ہو کہ تمام علماء سیاست میں لگ جائیں، بلکہ صرف ایک جماعت بقدرِ ضرورت اس میں مشغول ہو، اور نہ ہی ایسا ہو کہ سیاسی جماعت تو علماء کی تیار ہو کر میدان میں آجائے، لیکن وہ صرف شریعت کا علم رکھتی ہو، سیاست کا علم نہ رکھتی ہو، یا صرف سیاست کا علم رکھتی ہو، شریعت کا علم نہ رکھتی ہو، یا علم تو رکھتی ہو، مگر شریعت وسیاست کسی ایک پر عمل نہ کرتی ہو، بلکہ وہ شریعت وسیاست میں علم وعمل دونوں کی جامع ہونی چاہئے۔

مگر اس مرحلہ پر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ علماء کی ایک جماعت کا تیار کرنا صرف سیاست کے شعبہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ جتنے شعبے بھی فرضِ کفایہ ہیں، خواہ وہ طب وحکمت کا شعبہ ہو، یا زراعت وتجارت کا شعبہ ہو، ہر شعبہ کے متعلق یہی حکم ہوگا۔

یعنی اگر مثلاً اہلِ طب اپنے شعبہ سے متعلق شرعی احکام معلوم کرنے کے عادی نہ رہیں، یا اہلِ زراعت علماء سے اپنے شعبہ سے متعلق شرعی احکام معلوم کر کے عمل کرنے کے عادی نہ رہیں، یا کسی اور فرضِ کفایہ شعبہ کے افراد اہلِ علم سے اپنے شعبہ کے متعلق شرعی احکام معلوم کر کے عمل کرنے کے عادی نہ رہیں، ان سب شعبوں کے بارے میں یہی حکم ہوگا کہ اس شعبہ کے لئے علماء اپنے اندر سے ایک جماعت ایسی تیار کریں، جو اس شعبہ سے متعلق شرعی احکام کے علم وعمل دونوں کی جامع ہو، تاکہ یہ اپنے علم کی روشنی میں اس شعبہ میں عملی خدمات سرانجام دے اور دوسروں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ بنے۔

البتہ ایسے حالات پیدا ہونے کے بعد **الاھم فالاھم** کے قاعدہ کے تحت ضروری ہوگا کہ جس شعبہ کے فساد وبگاڑ کا تعلق دین سے زیادہ قریبی ہوگا، اس شعبہ سے متعلق جماعت تیار کرنے کی ضرورت کی زیادہ تاکید اور تقدیم ہوگی۔

البتہ اس چیز میں اختلاف ممکن ہوگا کہ کس وقت کونسے شعبے کے بگاڑ وفساد کا تعلق دین کے

زیادہ قریب ہے، ممکن ہے کہ ایک شخص کے اجتہاد کی رُو سے سیاست کے بگاڑ وفساد کا تعلق دین سے زیادہ قریب ہو، اور دوسرے کے اجتہاد کی رو سے کسی اور شعبہ کے بگاڑ وفساد کا تعلق دین سے زیادہ قریب ہو، اور اسی طرح اس چیز میں بھی اختلاف کا امکان ہوگا کہ ایک شخص کے اجتہاد میں جماعت کے انتظام کی قدرت واستطاعت موجود ہو، اور دوسرے کے اجتہاد میں موجود نہ ہو۔

لیکن بایں ہمہ علماء کی عظمت اور وقار کا تحفظ ضروری ہوگا، اور علماء کی اس جماعت سازی اور اس جماعت کے عملاً سیاست میں شریک ہونے کے بعد ایسی چیزوں سے بچنے کا اہتمام نہایت ضروری ہوگا، جو چیزیں عوام کے دلوں سے علماء کی عظمت اور وقعت ختم کرنے کا باعث ہوں، اور اگر بالفرض کسی وقت علماء کی جماعت کے سیاست میں عملاً شریک ہونے سے علماء کی عظمت اور وقعت، عوام کے دلوں سے نکلتی ہو، تو علماء کو سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے، دوسرے طریقوں سے تبلیغ پر اکتفاء کرنا ضروری ہو جائے گا۔

چنانچہ اسی نکتہ پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو بعض حالات میں علماء کو سیاست میں حصہ لینے کا مشورہ دیا گیا ہے، اس سے مراد وہ صورت نہ سمجھی جاوے، جو اس وقت بعض علماء نے اختیار کی ہے، اس سے دین کو کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اصولِ شرعیہ و تجربہ سے، اس کا بھی ایک خاص طریق ہے'' (البدائع، ص ۲۷، بدیعہ نمبر ۱۰، ناشر: مکتبہ تالیفاتِ اشرفیہ، تھانہ بھون، مظفر نگر، انڈیا)

اور ایک مقام پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تجربہ اس پر بھی شاہد ہے کہ عام سیاسی لیڈر مصالحِ ملکی (یعنی ملکی مصلحتوں) کو دین پر مقدم رکھتے ہیں، اور جب مصلحت ومذہب میں تعارض (اور ٹکراؤ) ہوتا ہے، تو مذہب میں بعید سے بعید (یعنی دور دراز کی) تاویل کرنے میں دریغ نہیں کرتے، چنانچہ علماءِ مذکورین بھی اس میں مبتلا ہو رہے ہیں، اور ان کی تاویل چونکہ

برنگِ دین ہوتی ہے، اس لئے وہ عام مسلمانوں کو زیادہ غلطی میں، مبتلا کرتی ہے، لہٰذا اس وقت طریقِ کار یہ مفید ہوسکتا ہے کہ سیاسی جماعت علیٰحدہ ہو اور مذہبی علیٰحدہ، اور مذہبی جماعت اپنا اصلی کام تبلیغ کا اس طرح انجام دے کہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت کی نگرانی کرے کہ یہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے حقوق کا گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف عمل نہ کر بیٹھے، اور چونکہ موجودہ زمانہ میں سیاسی جماعت مذہبی جماعت سے پوچھ کر عمل کرنے کی عادی نہیں رہی، اس لئے علماء کے ذمہ تھا کہ خود اس جماعت کے پاس پہنچتے اور احسن طریقہ سے تبلیغ کرتے۔......

اگر علماء اپنا اصلی کام تبلیغ ہی رکھتے اور اصل سیاست (علماء کے حق میں) یہی تھی کہ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دیا جاوے، تو آج (اپنے) جس وقار اور عظمت کے کھونے کی علماء شکایت فرماتے ہیں، اس سے عظمت اور وقار میں چار چاند لگ جاتے اور ثوابِ آخرت تبلیغ کا اور حفاظتِ دین کا مزید براں۔

لہٰذا اس زمانہ میں موجودہ طریقہ پر علماء کا سیاسی لیڈر کی حیثیت سے سیاست میں شریک ہونا، میرے نزدیک سخت مضر ہو رہا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس طرز میں لیڈروں کو مقابلہ کا موقع دینے سے علماء کی وقعت اور عظمت مسلمانوں کے دلوں سے نکلی جا رہی ہے، جو مسلمانوں کے دین کو ہمیشہ کے لئے مضر ہو رہی ہے اور اگر یہ حضرات تبلیغ فرما کر لیڈروں کو سنبھالتے، تو اس طرز میں شرعی طریقہ پر ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت بھی ہوتی، اور علماء کی عظمت بھی بڑھتی، اور ہم خرما ہم ثواب کا مصداق ہوتا'' (البدائع ص۲۷، ۲۸ ملخصاً، بدیعہ نمبر۱۰، ناشر: مکتبہ تالیفاتِ اشرفیہ، تھانہ بھون، مظفر نگر، انڈیا)

اگرچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ تفصیل قیامِ پاکستان سے پہلے اپنے زمانہ کی سیاست کے

متعلق بیان فرمائی ہے، مگر اس سے اصولی درجہ میں یہ بات معلوم ہوگئی کہ علماء کو سیاست میں آنے سے زیادہ اہم اور ضروری ہے کہ ان کی عظمت اور وقعت کو ٹھیس نہ پہنچے، اور عوام الناس کے دلوں سے ان کا احترام واکرام نہ نکل جاوے۔

چنانچہ اگر آج بھی علماء کے سیاست میں آنے اور مروجہ سیاست میں عملاً حصہ لینے سے، ان کی عظمت اور وقار عوام کے دلوں سے نکلتی ہو، تو عملی سیاست سے الگ رہتے ہوئے دعوت وتبلیغ کے ذریعہ، سیاسی لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرنے کو ترجیح ہوگی۔

اور اگر اللہ نہ کرے، علماء کی جماعت سیاست میں عملی طور پر شریک ہونے کے بعد سیاست ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے، اور دین کے احکام کو خود بھی نظر انداز کردے، تو اس صورت کے ناجائز اور حرام ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہ ہوگا، جیسا کہ آج کل سیاست میں عملی طور پر مشغول رہنے والے بعض، یا اکثر علماء کی حالت ہے کہ وہ سیاسی اکھاڑے میں آنے کے بعد دین کے احکام کو یکسر گویا کہ بھول ہی جاتے ہیں، اور اپنی مدِّ مقابل سیاسی جماعت کی مخالفت میں وہی زبان بولے چلے جاتے ہیں، جو خالص دنیادار سیاسی لیڈروں کی ہوتی ہے، اللہ اور اس کے رسول کے احکامات وارشادات کا کوئی ذکر تک بھی نہیں کرتے، آخرت، جنت اور دوزخ کی کوئی بات ان لیڈرانِ قوم کے سامنے نہیں رکھتے، اور وہی اقتدار ومنصب کے جھگڑے، اور سیاست میں فتح وشکست اور اپنے مقابلین کو نیچا دکھانے کے لئے غیبت، بہتان والزام تراشی، اور غلط بیانی، جھوٹ اور دیگر منکرات میں ابتلاء تک نوبت پہنچ جاتی ہے، اگر سیاست ان ہی چیزوں کا نام ہے، تو پھر دینی اور دنیوی اور علماء وجہلاء کی سیاست میں کیا فرق رہ جائے گا؟

لہٰذا ان حالات میں مذکورہ مفاسد ومنکرات میں مبتلا، علماء کی جماعت کو اپنے طرزِ عمل کا بنظرِ انصاف جائزہ لے کر اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد 3 شمارہ 4، مئی 2006ء۔ ربیع الثانی 1427ھ)

(20)

طلباء کو نرمی کے ساتھ مانوس کرنے کی ضرورت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’آج کل بچوں کی تعلیم کے باب (بارے) میں بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے، نااہل استاد تعلیم دینے کے لئے مقرر ہوتے ہیں، نہ تو تعلیم ہی بچوں کی ہوتی ہے، نہ تربیت۔

ایک بڑی کوتاہی یہ ہو رہی ہے کہ بچہ کو مانوس بنا کر تعلیم نہیں دیتے، میرا یہ مطلب نہیں کہ گستاخی کے درجہ تک مانوس بنوانا مقصود ہے، مگر یہ بھی نہیں کہ متوحش بنایا جائے، توحش (وحشت ہونے) کی حالت میں بچہ پڑھ نہیں سکتا، اسی لئے ضرورت ہے کہ بچہ کو مانوس بنایا جائے، مانوس ہونے کی حالت میں (بچہ) نہایت سہولت سے پڑھ سکتا ہے، مگر یہ معلم (تعلیم دینے والے) لوگ اکثر سنگ دل اور کم عقل ہو جاتے ہیں، تعلیم کے لئے ترحم (رحم دلی) اور عقل کی ضرورت ہے، اور مزاحاً فرمایا کہ کبھی کبھی اکل (کھانے پینے) کی بھی ضرورت ہے، یعنی بچوں کو کچھ کھانے کو بھی دے دیا کریں، مگر آج کل بچوں کو گلگلہ (میٹھا پکوان شیرینی) تو دیتے نہیں، محض (صرف) غلغلہ (شور وغل) سے کام لیتے ہیں، سو اس سے کیا کام چلتا ہے،، نیز معلم کے لئے تقوے کی بھی ضرورت ہے، اس (یعنی بچوں کی تعلیم وتربیت) میں تقوے کو بھی بڑا دخل ہے، اس (تقوے) سے برکت ہوتی ہے، تعلیم میں‘‘ (’’الافاضات الیومیہ‘‘ مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر۵ ص ۳۱۳، ملفوظ نمبر ۳۴۶، بعنوان ’’معلم کو ترحم اور عقل کی ضرورت ہے‘‘ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

حضرت موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں:

’’لڑکوں کو جس قدر مکتب اور مدرسہ جانے سے وحشت ہوتی ہے، اس قدر وحشت

خوفِ موت سے بھی نہیں ہوتی، اس لئے سخت ضرورت ہے کہ ان (بچوں) کو مانوس بنا کر تعلیم دی جائے، تاکہ یہ وحشت دور ہو، مگر آج کل کے استاد بجائے مانوس بنانے کے، بچوں کو اس قدر مارتے ہیں کہ اور وحشت بڑھ جاتی ہے، سو یہ طرز بہت ہی برا ہے'' (''الافاضات الیومیہ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر۵ ص ۳۱۵، ملفوظ نمبر ۳۴۹، بعنوان: ''لڑکوں کو مکتب سے وحشت کا سبب'')

حضرت حکیم الامت نے بڑے کام کی بات بتلائی ہے، جس کا اگر مدرسہ ومکتب کے استاد اہتمام کرلیں، تو بچوں کی تعلیم وتربیت بہت آسان ہوجائے۔

اور وہ ہے بچوں کو اپنے سے اور خاص طور پر تعلیم سے مانوس بنایا جائے، ان کے دل اور دماغ میں تعلیم کی انسیت ومحبت اور شوق وذوق پیدا کیا جائے، ان کے اندر ایسا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ جو اِن کو تعلیم پر آمادہ کرے، اور اس کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے پر بچوں کو ابھارے، اگر بچوں میں یہ چیز پیدا کرنے میں کامیابی حاصل ہوجائے، تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ آسان ہوجائے گا، تعلیم کو بچہ اپنے اوپر بوجھ نہیں سمجھے گا، اور بددلی کے ساتھ تعلیم کے ساتھ وابستہ نہ ہوگا اور اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے:

''ایک رحم دلی اور دوسرے عقل''

رحم دلی کی وجہ سے طالبِ علموں کے ساتھ شفقت اور نرمی کا برتاؤ ہوگا، جس سے طالبِ علم مانوس ہوں گے اور عقل کے ذریعہ سے اُصولوں کی پابندی کرائی جائے گی، جس کی وجہ سے طالبِ علم گستاخ اور بے خوف نہ ہوسکیں گے۔

اور رحم دلی وعقل دونوں کی وجہ سے طالبِ علموں میں ایک اعتدال کی کیفیت قائم رہے گی۔

اُمید بھی ہوگی، اور خوف بھی۔

اور ایمان کا امید اور خوف سے گہرا تعلق ہے۔

چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْعُقُوْبَةِ، مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهٖ أَحَدٌ، وَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الرَّحْمَةِ، مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهٖ أَحَدٌ (صحيح مسلم، رقم الحديث ۲۷۵۵ "۲۳" كتاب التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى، وأنها سبقت غضبه)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مومن اللہ کے پاس ''عقوبت'' (یعنی سزا وعذاب) کی حقیقت کو جان لے، تو جنت کی کوئی بھی حرص نہ کرے، اور اگر کافر اللہ کے پاس رحمت کی حقیقت کو جان لے، تو اس کی جنت سے کوئی بھی مایوس نہ رہے (صحیح مسلم)

اور حضرت موصوف نے تیسری ایک اور چیز استاد کے اندر ہونے کی نشاندہی فرمائی، اور وہ ہے تقویٰ و پرہیز گاری کہ اس سے تعلیم میں برکت ونورانیت پیدا ہوتی ہے۔

اب حضرت موصوف کی مذکورہ تین باتوں کا خلاصہ درج ذیل ہوا۔

(1)...... طالبِ علموں کے ساتھ رحم دلی اور شفقت کا برتاؤ کرنا، اور سنگ دلی سے پرہیز کرنا۔

تاکہ طالبِ علم، دینی تعلیم اور استاد سے مانوس ہوجائیں، اور اُن کی وحشت دور ہوجائے۔

(2)...... عقل کے ذریعہ طالبِ علموں کو پڑھائی میں کامیاب کرنے، اور ترقی دینے کے اُصول اور ذرائع اختیار کرنا۔

تاکہ طالبِ علم بے خوف اور گستاخ نہ ہونے پائیں۔

(3)...... استاد کا تقویٰ اور پرہیز گاری کو اختیار کرنا۔

جو تعلیم اور تربیت میں برکت، اور نورانیت کا ذریعہ ہے۔

آج کل مذکورہ چیزوں میں افراط اور تفریط کی وجہ سے طلبہ، یا تو علمِ دین سے محروم رہتے ہیں، یا پھر ظاہری اور روایتی علم تو حاصل ہوجاتا ہے، مگر اس علم میں برکت ونورانیت پیدا نہیں ہوتی۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 3 شمارہ 5، جون 2006ء- جمادی الاولیٰ 1427ھ)

(21)

طلبہ پر بے جا سختی اور تشدُّد کے نقصانات

علامہ عبدالرحمٰن بن خلدون رحمہ اللہ مقدمہ ابنِ خلدون میں لکھتے ہیں:

’’خوب یاد رکھیے! تعلیم کے سلسلے میں مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ ...... مضر ہے خصوصاً چھوٹے چھوٹے بچوں کے حق میں، کیونکہ یہ استاد کی نااہلی اور غلط تعلیم کی نشانی ہے، جن (بچوں) کی نشو ونما ڈانٹ ڈپٹ اور قہر وتشدد سے ہوتی ہے، خواہ وہ پڑھنے والے بچے ہوں، یا لونڈی غلام ہوں، یا نوکر چاکر ہوں، ان کے دل ودماغ پر استاد کا قہر ہی چھایا رہتا ہے، بے چاروں کی طبیعت بجھ کر رہ جاتی ہے، اُمنگ وحوصلہ پست ہوجاتا ہے، شوق ودلچسپی جاتی رہتی ہے، اور طبیعت میں سستی پیدا ہوجاتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو دماغ ہی معطل ہوکر رہ جاتا ہے، اور سلب کا مادہ سلب ہوجاتا ہے۔

قہر وتشدد سے بچوں میں جھوٹ بولنے کی بھی عادت پڑجاتی ہے، اور بدباطنی کی بھی، بچے ڈر کے مارے مار پیٹ سے بچنے کے لئے مکروفریب سے کام لینے لگتے ہیں، گویا قہر وتشدد بچوں کو مکروفریب، جھوٹ، اور دغابازی کی تعلیم دیتا ہے، اس طرح جب ان پر ایک زمانہ جھوٹ بولتے بولتے گذر جاتا ہے، اور کچی عمر ہوتی ہی ہے، تو یہ عیب ان کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتے ہیں، اور سنجیدگی کی عمر میں بھی نہیں جاتے، نیز ایسے بچوں سے اجتماعی حیثیت سے انسانیت کی خوبیاں سلب (زائل وختم) ہوجاتی ہیں، یعنی حمیت، غیرت، خودداری، اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے مدافعت۔

الغرض یہ تمام خوبیاں جاتی رہتی ہیں، اور دل مُردہ ہوجاتا ہے، اور ایک قسم کی

بزدلی پیدا ہوجاتی ہے، ایسے بچے ان تمام (خوبی والی) باتوں میں دوسروں کے محتاج ہوجاتے ہیں۔

بلکہ ان میں فضائل واخلاقِ جمیلہ حاصل کرنے کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں، اور وہ انسانی جوہر کھوکر اسفلُ السافلین میں جاگرتے ہیں۔

ہراس قوم کا بھی یہی حال ہوتا ہے، جو دوسری قوم کے قہر وتسلط کی مٹھی میں آجاتی ہے اور جوروستم کا شکار رہنے لگتی ہے، ظلم وتشدد وہی کرتا ہے، جو مغلوب الغضب (غصے کا تابعدار) ہوتا ہے، اپنے غصہ پر قابو نہیں پاتا اور اس میں اتنی علمی مہارت نہیں ہوتی کہ صحیح طریقے سے سمجھا سکے۔

جب تم اس قسم کے اساتذہ کا تتبع (تلاش) کروگے، تو ان سب میں یہی عیب کارفرما نظر آئیں گے، یہودیوں پر غور کرو اور ان کی بداخلاقیوں پر بھی، جو ان میں پائی جاتی ہیں حتیٰ کہ ان میں لوگ دنیا کے ہر گوشے میں اور ہر زمانے میں خباثتِ نفس اور مکروفریب میں مشہور ہیں، اس کا سبب وہی حقیقت ہے، جو ہم نے تمہارے سامنے رکھی ہے، اس لئے استاذ کو طلبہ پر اور والدین کو اولاد پر حد سے زیادہ سختی نہیں کرنی چاہیے'' (مقدمہ ابنِ خلدون، حصہ دوم، صفحہ ۵۱۰، ۵۱۱، چھٹا باب، فصل نمبر ۳۲،

ترجمہ اُردو: مولانا راغب رحمانی دہلوی، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی نمبر ا، طباعتِ اول، اپریل ۱۹۷۰ عیسوی)

معلوم ہوا کہ سختی اور ضربِ شدید سے طرح طرح کی باطنی بیماریوں اور گناہوں کی عادت پڑجاتی ہے، اور اصلاح کے بجائے بچہ میں زندگی بھر کے لئے، فساد وبگاڑ کا روگ پیدا ہوجاتا ہے، جس سے بچہ خود تو گویا کہ روحانی موت مَر ہی جاتا ہے، ساتھ ہی معاشرے کے لئے بھی طرح طرح کی خرابیوں کا باعث ہوتا ہے۔

اتنے بڑے مؤرخ اور احوالِ زمانہ سے واقف ایک عالِمِ دین کے واضح، اور بالکل صریح کلام پر یقیناً اہلِ علم حضرات غور فرمائیں گے۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر اولاد، یا طالبِ علم کی سخت مار پٹائی کے بغیر اصلاح نہ ہوتی ہو، تب بھی سخت مار پٹائی کی اجازت نہیں۔

چنانچہ عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام فرماتے ہیں:

فإن قيل: إذا كان الصبى لا يصلحه إلا الضرب المبرح فهل يجوز ضربه تحصيلا لمصلحة تأديبه؟ قلنا لا يجوز ذلک، بل يجوز أن يضربه ضربا غير مبرح؛ لأن الضرب الذى لا يبرح مفسدة، وإنما جاز لكونه وسيلة إلى مصلحة التأديب، فإذا لم يحصل التأديب سقط الضرب الخفيف، كما يسقط الضرب الشديد؛ لأن الوسائل تسقط بسقوط المقاصد .فإن قيل: إذا كان المعزر البالغ لا يرتدع عن معصيته إلا بتعزير مبرح فهل يلحق بالصبى؟ قلنا: لا يلحق به بل نعزره تعزيرا غير مبرح ونحبسه مدة يرجى فيها صلاحه (قواعد الاحكام فى مصالح الانام، ج ا ص ۱۲۱، ۱۲۲، فصل فى اجتماع المصالح مع المفاسد، فائدة إذا قذف امرأة عند الحاكم)

ترجمہ: اگر کہا جائے کہ جب بچے کی ضربِ شدید کے بغیر اصلاح نہ ہوتی ہو، تو کیا اس کی اصلاح کی مصلحت کی خاطر، اُس کو ضربِ شدید کے ساتھ مارنا جائز ہوگا؟ اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ جائز نہیں ہوگا، بلکہ اس صورت میں بھی، ہلکی پھلکی ضرب کی اجازت ہوگی، کیونکہ ضربِ شدید، فاسد اور ناجائز ہے، البتہ اصلاح کی خاطر صرف وسیلہ اور ذریعہ کے طور پر جائز ہوتی ہے اور جب اصلاح نہ ہو رہی ہو، تو ہلکی پُھلکی ضرب بھی ساقط ہو جاتی ہے، جیسا کہ ضربِ شدید ساقط ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وسائل، مقاصد کے حاصل نہ ہونے سے ساقط ہو جاتے ہیں، اور اگر کہا جائے کہ جب سزا دیے جانے والا بچہ، بالغ ہو اور وہ سخت

سزا کے بغیر گناہ سے باز نہ آتا ہو، تو کیا اس کو بھی چھوٹے بچے کا حکم حاصل ہوگا؟ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ نہیں، بلکہ ہم اس کو سزا دیں گے، لیکن وہ سزا شدید اور سخت نہ ہوگی، اور ہم اسے اتنی مدت تک قید و بند میں رکھیں گے، جس سے اس کی اصلاح کی امید ہو (قواعد الاحکام)

رہا یہ کہ ''سخت مار پٹائی اور ضربِ شدید'' کسے کہا جاتا ہے؟

تو اس سلسلہ میں فقہائے کرام ومفسّرین عظام کے اقوال ملاحظہ فرمالئے جائیں۔

قرآن مجید کی وہ آیت جس میں بیویوں کو ضرورت کے وقت ''وَاضْرِبُوْهُنَّ'' کے الفاظ سے شوہر کو مار پیٹ کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس کی تفسیر کرتے ہوئے تفسیر قرطبی میں ہے:

والضرب فی هذه الآية هو ضرب الأدب غير المبرح، وهو الذی لا يكسر عظما ولا يشين جارحة كاللكزة ونحوها، فإن المقصود منه الصلاح لا غير .فلا جرم إذا أدى إلى الهلاک وجب الضمان، وكذلک القول فی ضرب المؤدب غلامه لتعليم القرآن والأدب

(تفسیر قرطبی ،ج۵ص ۱۷۲ ،سورة النساء)

ترجمہ: اس آیت میں مار پیٹ سے مراد اصلاح اور ادب دینے والی مار پیٹ ہے، جو کہ شدید نہ ہو اور وہ ایسی مار ہے، جس سے ہڈی نہ ٹوٹے، زخم نہ ہو، جیسا کہ مُکّا وگھونسا وغیرہ مارنا، اس لئے کہ مقصود اس سے اصلاح ہے، کچھ اور نہیں، لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ جو مار پٹائی ہلاکت تک پہنچا دے، تو مارنے والے پر تاوان لازم ہوگا، اور یہی معاملہ بچہ کو قرآن مجید کی تعلیم دینے اور اصلاح کرنے والے معلِّم اور مربِّی کا بھی ہے (تفسیر قرطبی)

علامہ ابنِ عابدین شامی ''ردُّ المحتار'' میں لکھتے ہیں:

ليس له أن يضربها فی التأديب ضربا فاحشا، وهو الذی يكسر

العظم أو يخرق الجلد أو يسوده كما في التتارخانية .قال في البحر: وصرحوا بأنه إذا ضربها بغير حق وجب عليه التعزير اهـ أي وإن لم يكن فاحشا (ردالمحتار، ج۴ص ۷۹، کتاب الحدود، باب التعزیر)

ترجمہ: جائز نہیں ہے کہ ادب دینے کی غرض سے عورت کو شدید حد تک زدوکوب کرے، شدید زدوکوب سے مراد اس طرح مارنا ہے کہ ہڈی ٹوٹ جائے، یا کھال پھٹ جائے، یا کھال سیاہ ہوجائے، البحرُ الرائق میں فرمایا کہ فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر عورت کو بلا کسی معقول وجہ کے مارا، تو مارنے والے شوہر کو اس کی سزا دی جائے گی، اگرچہ اس نے سخت مار پٹائی نہ بھی کی ہو (ردالمحتار)

اور فقہ حنفی کی ''تبيينُ الحقائق ،شرح كنزُ الدقائق'' میں ہے:

ولأن الضرب على الفرج متلف وعلى الرأس سبب لزوال الحواس كالسمع والبصر والشم والفهم وكذا على الوجه وهو مجمع المحاسن أيضا فلا يؤمن ذهابها فيكون إهلاكا من وجه فلا يشرع (تبيين الحقائق ،ج۳ ص ۱۷۰ ،كتاب الحدود)

ترجمہ: شرمگاہ پر مارنا، اس لئے جائز نہیں کہ اس جگہ مارنے سے ہلاکت کا خوف ہے اور سر پر مارنا اس لئے منع ہے کہ اس کی وجہ سے سُننے، دیکھنے، سونگھنے اور سمجھنے کے حواس، معطل اور زائل ہونے کا ڈر ہے، اور اسی طرح چہرے پر مارنا بھی ممنوع ہے، کیونکہ چہرہ محاسن کا مظہر بھی ہے، تو اس پر مارنے سے محاسن کے ضائع اور تلف ہونے کا خوف ہے، لہٰذا ان مقامات پر مارنا، ایک طرح سے ہلاکت میں ڈالنا ہے، لہٰذا شریعت نے اس کو روا نہیں رکھا (تبیین الحقائق)

اور تفسیر خازن میں ہے:

يعني ضربا غير مبرح ولا شائن ،قيل هو أن يضربها بالسواك ونحوه (تفسير الخازن ،ج ۱ ص ۳۷۱، سورة النساء)

ترجمہ: یعنی غیر شدید مار مارے، زخم ڈالنے والی نہ ہو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ غیر شدید مار یہ ہے کہ مثلاً مسواک، یا اس جیسی کسی دوسری چیز سے مارے (تفسیر خازن)

پھر اسی کتاب میں مزید ہے:

ولیتق الوجه لأنه یجمع المحاسن (تفسیر الخازن، ج ۱ ص ۳۷۱، سورۃ النساء)

ترجمہ: اور چہرے پر مارنے سے پرہیز کرے، کیونکہ وہ محاسن کا مظہر ہے (تفسیر خازن)

اور مذکورہ کتاب میں ہی مزید ہے:

وقیل ینبغی أن یکون الضرب بالمندیل والید ولا یضرب بالسوط والعصا (تفسیر الخازن، ج ۱ ص ۳۷۱، سورۃ النساء)

ترجمہ: اور کہا گیا ہے کہ ہاتھ اور رومال سے مارے، ڈنڈے اور کوڑے سے نہ مارے (تفسیر خازن)

اور ''کشاف القناع'' میں ہے:

(وقیل): یضربها (بدرة، أو مخراق) وهو (مندیل ملفوف، لا بسوط، ولا خشب) لأن المقصود التأدیب وزجرها، فیبدأ فیه بالأسهل فالأسهل (کشاف القناع عن متن الاقناع، ج ۱۲ ص ۱۲۶، باب عشرة النساء والقسم والنشوز وما یتعلق بها)

ترجمہ: اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رومال لپیٹ کر اس سے مارا جائے، کوڑے اور ڈنڈے سے نہ مارا جائے، کیونکہ مار پیٹ کا مقصد دوسرے کی اصلاح کرنا، اور دوسرے کو غلطی پر متنبہ وآگاہ کرنا، اور غلطی کا احساس دلانا ہے، لہٰذا اصلاح اور

تنبیہ کے معاملہ میں سہل سے سہل تر پہلو سے آغاز کیا جانا چاہیے (کشاف القناع)

اور علامہ ابوعبداللہ محمد خرشی مالکی لکھتے ہیں:

غیر مبرح وهو الذی لا یکسر عظما ولا یهشم لحما ولا یشین جارحة (شرح الخرشی علیٰ مختصر خلیل، ج۴ص۷، باب النکاح، احکام النشوز)

ترجمہ: ہلکی پھلکی ضرب وہ ہے، جس میں ہڈی نہ ٹوٹے اور زخم نہ ہو (شرح مختصر خلیل)

اور ''**غذاءُ الالباب فی شرح منظومة الآداب**'' میں ہے:

غیر مبرح، أی غیر شدید یفرقه علی بدنها ویجتنب الوجه والبطن والمواضع المخوفة والمستحسنة (غذاء الالباب فی شرح منظومة الآداب ج۲ ص۲۰۴، مطلب فی ضرب الرجل زوجته تادیباً لها)

ترجمہ: ضربِ غیرمبرح، یعنی غیرشدید ضرب بدن کے مختلف حصوں پر ہونی چاہیے، اور چہرے اور پیٹ اور اُن اعضاء پر نہیں ہونی چاہیے، جن سے موت کا خوف ہوتا ہے، اور نہ مستحسن اعضاء مثلاً چہرے پر بھی نہیں (غذاء الالباب)

اور ''**دررُالحکام شرح غرر الحکام**'' میں ہے:

وکذا المعلم إذا ضرب الصبی ضربا فاحشا یعزر کذا فی مجمع الفتاوی (درر الحکام، شرح غرر الحکام، ج۲ ص۷۷، کتاب الحدود، فصل التعزیر)

ترجمہ: اور اسی طرح مُعلِّم اگر بچہ کو ضربِ فاحش، یعنی سخت مارپِٹائی کرے گا، تو اس کو اس کی سزا دی جائے گی، مجمع الفتاویٰ میں اسی طرح ہے (درر الحکام)

اور ''**منحةُ الخالق علی البحر الرائق**'' میں ہے:

لو ضرب المعلم الصبی ضربا فاحشا، فإنه یعزر ویضمنه لو مات (منحة الخالق علی البحر الرائق، ج۵ ص۵۴، کتاب الحدود، فصل فی التعزیر)

ترجمہ: اگر مُعلِّم بچہ کو ضربِ فاحش، یعنی سخت اور بے جا مار پٹائی کرے گا، تو مُعلِّم

کواس کی سزادی جائے گی ،اور بچہ اس مار پیٹ کی وجہ سے فوت ہوگیا،تو مُعلِّم

پراس کا تاوان (ڈنڈ) لازم ہوگا (منحۃ الخالق)

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ چہرے پر مارنا، ایک ہی مقام پر مسلسل مارنا، یا اس طرح مارنا کہ جسم پر نشان پڑ جائے یا جلد سیاہ ہوجائے، یا چمڑی پھٹ جائے اور خون نکل آئے، یا ہڈی ٹوٹ جائے، یا کوڑے اور ڈنڈے سے مارنا اور پیٹ سینہ، دماغ اور جسم کے ایسے حصوں پر مارنا، جو طبی اعتبار سے خاص نزاکت کے حامل ہوں، یہ سب ضربِ شدید میں داخل اور ناجائز وگناہ ہیں، خواہ نیک نیتی واصلاح کی خاطر ہی یہ عمل کیوں نہ کیا جائے اور ایسی سخت مار پٹائی کرنے والے استاد و معلِم کو سزا جاری کی جائے گی، اور اللہ نہ کرے سخت مار پٹائی سے کسی کی جان چلی جائے، تو استاد و معلِم اس کا ضامن و ذمہ دار ہوگا۔

آخر میں معزز و محترم اساتذۂ کرام و معلّم حضرات سے التماس ہے کہ بے شک سخت مار پٹائی سے کچھ عارضی ونقدی فوائد، اور مصالح محسوس کئے جاسکتے ہیں، مثلاً وقتی طور پر بچہ اس کو برداشت کرلیتا ہے اور ڈر کے مارے سبق یاد کرلیتا ہے اور مار پٹائی کے ڈر کی وجہ سے مطیع وفرمانبردار اور تابعدار نظر آتا اور محسوس ہوتا ہے۔

اس قسم کے وقتی ونقدی فوائد و مصالح کو دیکھ کر معلِّم حضرات اس سلسلہ میں کسی کی سننے کے لئے تیار نہیں، لیکن انہیں غور کرنا چاہیے کہ کیا کسی مصلحت اور فائدہ کی خاطر ”جب کہ وہ بھی عارضی اور وقتی ہو“ کوئی گناہ کا کام جائز ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ورنہ تو کتنے گناہ ایسے ہیں کہ جن میں کچھ عارضی ونقدی فوائد حاصل ہوجاتے ہیں، مگر اس کے باوجود وہ گناہ ہیں اور ان کا کرنا جائز نہیں، تعلیم و تعلّم کا اصل مقصد رضائے الٰہی ہے، اگر یہ کام کوئی گناہ کر کے کیا گیا، تو رضائے الٰہی کیسے حاصل ہوگی، اور اس عارضی ونقدی فائدہ و مصلحت کا کیا فائدہ جس سے بچہ کا مستقبل تباہ ہوجائے۔

اگر کوئی بچہ حافظِ قرآن ، یا عالمِ دین بن بھی گیا، مگر انسانیت کے جوہر کھو بیٹھا، اور زندگی

بھر کے لئے بُری عادتوں اور خصلتوں میں مبتلا ہوگیا، تو اس کا حافظِ قرآن، یا عالِمِ دین بننا، اس کی اپنی نجات کے لئے، اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے کافی نہ ہوگا، جتنی ضرورت کسی کو حافظِ قرآن یا عالِمِ دین بنانے کی ہے، اس سے زیادہ ضرورت اس کو زندگی بھر کی بُری عادات اور خصلتوں سے بچانے کی ہے۔

اللہ تعالیٰ فہمِ سلیم عطاء فرمائے، اور شریعت کے مقابلہ میں نفسانی وشیطانی تاویلات سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ "التبلیغ" جلد 3 شمارہ 6، جولائی 2006ء۔ جمادی الاخریٰ 1427ھ)

---

(22)

ختمِ بخاری کے عنوان سے ہونے والی بے اعتدالیاں

ختمِ بخاری ودستار بندی کی روایت بعض مشائخ سے چلی آ رہی ہے، اپنی ذات میں جلسۂ دستار بندی وختمِ بخاری کی تقریب ایک بابرکت تقریب ہے، اور اس کا صحیح طریقے پر شرعی اصولوں کے مطابق انعقاد فائدہ اور نفع کا باعث ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ ہر چیز کے صحیح استعمال سے ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اگر ایک قیمتی اور نفع بخش چیز کا استعمال غلط طریقہ پر کیا جائے، یا اس کے حقیقی مقصد کو نظر انداز کر کے غلط اور فاسد مقصد اور غرض کے لئے اس کا استعمال کیا جائے، تو وہ چیز باوجودیکہ اپنی ذات میں فائدہ مند اور نفع بخش ہو، اس کے باوجود بھی طریقۂ استعمال اور غرض وغایت کے غلط ہونے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ حقیقی منافع سے محرومی مقدر بن جاتی ہے، بلکہ فائدہ کے بجائے نقصان کا باعث ہو جایا کرتی ہے۔

اہلِ علم حضرات کے سامنے یہ چیزیں واضح ہیں، کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لہٰذا جب تک ختمِ بخاری کے عمل کو صحیح صحیح طریقہ پر اس کی حقیقی غرض وغایت کے مطابق انجام

دیا جاتا رہے گا، نہ صرف یہ کہ شرعی اعتبار سے جائز ہوگی، بلکہ خیر و برکت کا باعث بھی ہوگی۔
لیکن جب اس کو غلط طریقہ پر اور اس کی غرض وغایت سے ہٹ کر انجام دیا جائے گا، تو نہ صرف یہ کہ یہ عمل خیر و برکت سے محرومی کا باعث ہوگا، بلکہ اسی کے ساتھ شرعی اعتبار سے اس کو جائز کہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

اہلِ علم حضرات اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اگر کسی مباح، بلکہ مستحب عمل میں بھی مفسدہ پیدا ہو جائے، تو وہ عمل مباح نہیں رہتا، اور نہ مستحب عمل مستحب رہتا ہے، بلکہ مکروہ وممنوع ہو جاتا ہے، اور ختمِ بخاری کے عمل کو مستحب سے زیادہ درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

چند سالوں سے ہمارے یہاں عام طور پر اکثر و بیشتر ختمِ بخاری و دستار بندی کی تقاریب، جس انداز سے انجام دی جا رہی ہیں، ان کو سامنے رکھ کر یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ عمل موجودہ انداز کے ساتھ انجام دینا کوئی مستحب عمل رہ بھی گیا ہے، یا نہیں؟

سلف کا طریقہ تھا کہ ختمِ بخاری کے موقع پر اکثر پورے سال بخاری شریف کی تعلیم دینے والے شیخ الحدیث، اور کبھی کوئی اور اللہ والے صاحبِ علم بزرگ کسی نمود ونمائش اور شہرت وتفاخر کے بغیر بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیا کرتے تھے، جس میں ایمان ویقین کی باتیں ہوتی تھیں، علم ومعرفت کے انوار کی بارشیں ہوا کرتی تھیں، حدیث کی اہمیت وعظمت پر وعظ ونصیحت ہوا کرتی تھی، طلبۂ کرام کو تقوے و پرہیزگاری کی وصایا کی جاتی تھیں، اور آخر میں دعائیں ہوتی تھیں، اور علم وانوار سے پُرنور یہ تقریب نہایت سادگی کے ساتھ اختتام پذیر ہو جایا کرتی تھی۔

نہ اسراف اور فضول خرچی کا کوئی نام ونشان ہوتا تھا، نہ نام ونمود پیشِ نظر ہوتا تھا، نہ فخر وتفاخر اور نہ ایک دوسرے سے مقابلہ بازی کا کوئی وجود تھا، نہ فاسق وفاجر سیاسی شخصیات کو منبر ومحراب پر براجمان کرنے کی کوئی رسم ہوتی تھی، نہ حکمرانوں کے خلاف زبان درازی ہوتی تھی، نہ نااہل طلبہ کو عوام کے سامنے مقتدا اور پیشوا بنا کر ظاہر کرنا ہوتا تھا، نہ طلبہ کی تعداد کی

کثرت پر زور ہوتا تھا، نہ اپنے مدرسہ کی کارگزاری پیش کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا تھا، اور نہ اس تقریب سے چندہ کا حصول مقصد ہوا کرتا تھا، اور نہ مختلف مزاج و مذاق کے سیاسی وغیر سیاسی مقررین کا ہجوم ہوتا تھا، نہ تو طلبہ کے گلوں میں نوٹوں کے ہار ڈالے جاتے تھے، اور نہ ہی دوسرا کوئی شور شرابا ہوتا تھا، اور نہ ہی کنبہ اور برادری کے سب لوگوں کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام ہوتا تھا، نہ تو بے پردہ خواتین کا ہجوم ہوتا تھا، نہ اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر، بلکہ قرض تک لے کر کھانوں کا کوئی انتظام ہوتا تھا، نہ اشتہارات اور دعوت ناموں کے ذریعہ سے فارغ شدہ طلبہ کی تعداد کا اظہار کیا جاتا تھا، نہ مدارس اور دارالاقاموں کی زیبائش اور نمائش ہوتی تھی، نہ آج کل کی شادی بیاہ کی واہیات رسموں کی طرح اس خالص دینی تقریب میں کوئی رسم ہوتی تھی۔

دوسری طرف آج کل کی اکثر و بیشتر ختمِ بخاری کی یہ مروج تقاریب ہیں، جن میں مذکورہ، یا اس جیسی بیسیوں خرابیاں شامل ہو چکی ہیں، جن کو ختمِ بخاری کا نام دینا بھی قطعاً غیر مناسب معلوم ہوتا ہے، اوپر سے مصالح پرستی کے فتنہ نے ان مفاسد کو سوچنے سمجھنے، اور ان سے بچنے کی صلاحیت واستعداد کو بھی دبا کر رکھ دیا ہے۔

اگر اللہ نہ کرے یہ سلسلہ بلانکیر اسی طرح جاری رہا، تو معلوم نہیں آگے چل کر، کیا صورتِ حال پیدا ہو جائے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس (جلسہ دستار بندی) میں ہم لوگوں کی اغراض مختلف ہو گئی ہیں، جن میں بعض اغراض خراب بھی ہیں، کہیں اس سے اپنی کارگزاری کا اظہار مقصود ہوتا ہے، کہیں چندہ کی کوشش کے لئے اس قسم کے جلسوں کو ذریعہ بنایا جاتا ہے، اور چندوں میں حدودِ شرعیہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا، کہیں اس کی حقیقت اور اس فعل کے درجہ کو واضح نہیں کیا جاتا، جس سے عوام کو غلطی، اور خود فارغ شدہ جماعت کو بھی

دھوکہ ہوتا ہے، لوگ ان لوگوں کو ابھی سے مقتداء اور معتمد سمجھنے لگتے ہیں، اور خود فارغ شدہ جماعت بھی اپنے متعلق یہ اعتقاد کر لیتی ہے کہ بس ہم آج سے مقتداء ہوگئے، باقی اصل مقصود اس تقریب سے تعلیم کا اہتمام، اور غیر فارغ شدہ جماعت کو تکمیل کی رغبت دلانا ہے'' (وعظ ''الاسعاد والابعاد'' مشمولہ: خطبات حکیم الامت، ج۲۶ ص ۱۹۷، بعنوان ''اصلاحِ اعمال'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: رمضان ۱۴۳۰ھ)

اور ایک مقام پر موصوف فرماتے ہیں:

''جہاں تک غور کرکے اور تجربہ کی شہادت سے دیکھا جاتا ہے، بڑی غرض ان جلسوں کے انعقاد کی دوامر معلوم ہوتے ہیں (1) فراہمی چندہ (2) اور اپنی کارگزاری کی شہرت، یا یوں کہئے کہ مدرسہ کی وقعت ورفعت۔ جس کا حاصل حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ نکلتا ہے، جس سے نصوصِ کثیرہ میں نہی فرمائی گئی ہے'' (امداد الفتاویٰ، ج۴ ص ۶۵، بعنوان ''تحقیق متعلق جلسہائے متعارفہ مدارس'' کتاب الحظر والاباحۃ، تعلیم وتعلم اور کتب ومدارس کے احکام، ناشر: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی ۲۰۱۰ء)

اور ایک مقام پر موصوف فرماتے ہیں:

''وجوبِ ترک کے لئے صرف قبیح بالذات (بذاتِ خود بُرا ہونا) شرط نہیں، بلکہ قبیح بالغیر (کسی واسطہ سے بُرا ہونا) کافی ہے، سو یہ امر تو مسلَّم (تسلیم) ہو چکا ہے کہ بہت سے، بلکہ کُل جلسے مفاسدِ معروضہ سابقہ (ماقبل میں پیش کئے گئے مفاسد) سے خالی نہیں ہوتے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسداد (روک، تھام) حتی الامکان ضروری ہے، اور ان کی ترویج مباشرۃً یا تسبباً منہی عنہ (بذاتِ خود، یا سبب بن کر ان کو رواج دینا ممنوع) ہے، ایسی حالت میں اگر کوئی مہتمم مدرسہ نہایت احتیاط کے ساتھ جلسہ کرے، تو مباشرِ مفاسد (بذاتِ خود مفاسد کا مرتکب) تو نہ ہوگا۔

مگراس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسرے غیراحتیاطی جلسوں کی ترویج کا سبب تو بنے گا،فقہاء نے بہت مواقع میں بعض مباحات کومحض **سدًّا لِلذرائع وحسماً لمادّۃ الفساد** (ناجائز کاموں کے اسباب اورفساد کی بنیاد کوختم کرنے کے لئے) تاکید سے روکا ہے‘‘ (امدادالفتاویٰ، ج۴ص۶۹، بعنوان’’تحقیق متعلق جلسہائے متعارفہ مدارس‘‘ کتاب الحظر والاباحۃ، تعلیم وتعلم اور کتب ومدارس کے احکام)

حضرت موصوف مزید فرماتے ہیں:

’’جو مصلحتیں ان جلسوں (کومنعقد کرنے) میں ارشاد ہوئی ہیں (مثلاً یہ کہ جولوگ شریکِ چندہ ہیں، ان کوواقعی کیفیت بلازیادتی اورکمی کے سنائی جائے ،اورانعام تقسیم کرکے جوطلبہ قابل ہیں، ان کوخوش کرنامقصود ہوتا ہے،تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو،اورنیز چندعلماء جمع ہوکروعظ ونصیحت کریں،تاکہ لوگوں کوہدایت ہو،اورمخلوق کو فائدہ پہنچے وغیرہ) ان کے مصلحت ہونے میں کلام نہیں،مگرمصالح اورمفاسد میں جب تعارض ہوتا ہے،مفاسد کے اثر کوترجیح ہوتی ہے،جبکہ مصالح ،حدِضرورتِ شرعی تک نہ پہنچے ہوں ،اور مانحن فیہ (ہماری زیر بحث صورت) میں ظاہر ہے کہ ضرورتِ شرعی نہیں ہے (پس مواقعِ ضرورت بشرطِ رعایتِ احتیاط مستثنٰی ہوں گے،اورگویہ قلیل ہوں،مگرمعدوم نہیں) بلکہ مصلحت بھی اسی صورت میں منحصرنہیں ہے‘‘ (امدادالفتاویٰ، ج۴ص۶۹، بعنوان’’تحقیق متعلق جلسہائے متعارفہ مدارس‘‘کتاب الحظر والاباحۃ، تعلیم وتعلم اور کتب ومدارس کے احکام)

اورایک جگہ موصوف فرماتے ہیں:

’’بعض مدارس میں ایسے لوگوں کوسندِ فراغت دے دی جاتی ہے، یادستاربندی کردی جاتی ہے، جوباعتبارِ صلاح وعمل کے اس کے اہل نہیں ہوتے ،جب ان لوگوں کی علمی وعملی کوتاہیاں دوسروں پرظاہرہوتی ہیں،توسارے علماء کوان پرقیاس

کر کے سب سے بدظنی ہو جاتی ہے، تو دین کے معاملات میں پھر کس سے رجوع کریں گے، کس کے قول پر عمل کریں گے، پھر دین کا کیا حشر ہوگا؟ تو ان مفاسد کا سبب وہ بے احتیاط لوگ ہوئے، جو نا اہلوں کو قوم کے سامنے سند دے کر اہل ظاہر کرتے ہیں'' (تحفۃ العلماء، ج۱، استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے ص۱۱۵، بحوالہ تجدید تعلیم وتبلیغ ص ۴۷، بعنوان: ''سند دینے میں اہلِ مدارس کی ذمہ داری'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

یوں تو اس موضوع پر ابھی بہت کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہے، لیکن اس مختصر تحریر کے ذریعہ اہلِ علم حضرات کو متوجہ کرنا، اور غور وفکر کرنے کی دعوت دینا مقصود ہے، اگر اکابر ومشائخ کے مندرجہ ذیل ارشادات کو ملحوظ رکھ کر نیک نیتی واخلاص کے ساتھ، اور خالی الذہن ہو کر مسئلہ ھٰذا کے مالہ وماعلیہ کا جائزہ لینے کا اہتمام کیا جائے گا، تو امید ہے کہ نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ مشکل نہ ہوگی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''فی الحقیقت جو امرِ خیر کہ بذریعہ نامشروعہ حاصل ہو، وہ خود ناجائز ہے'' (تذکرۃ الرشید، ج۱ ص۱۲۷، ۱۲۸، تفقہ وافتاء، ناشر: امیر المطابع، میرٹھ)

''اوپر کے کلیہ سے مباح منضم کا حال معلوم ہو چکا کہ جب تک اپنی حد پر ہوگا جائز، اور جب اپنی حد سے خارج ہوا، تو ناجائز، اور امورِ مرکبہ میں اگر کوئی ایک جزو بھی ناجائز ہو جاوے تو مجموعہ پر حکم عدمِ جواز کا ہو جاتا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ مرکب حلال وحرام سے حرام ہوتا ہے، یہ کلیہ فقہ کا ہے'' (تذکرۃ الرشید، ج۱ ص ۱۳۳، تفقہ وافتاء، ناشر: امیر المطابع، میرٹھ)

اور حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فعلِ مباح بلکہ مستحب بھی کبھی امرِ غیر مشروع کے مل جانے سے غیر مشروع وممنوع

ہو جاتا ہے۔......

امرِ مشروع بوجہ اقتران وانضمامِ غیرمشروع کے غیرمشروع ہو جاتا ہے (اصلاح الرسوم، صفحہ ۱۳۷، بابِ سوم، پہلی فصل، قاعدہ دوم، ناشر: مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

یہ امر بھی یقینی ہے کہ جو امرِ خیر بذریعہ غیرمشروع حاصل ہو، وہ امرِ خیر نہیں ہے اور جب قیود کا غیرمشروع ہونا ثابت ہو جاوے، تو اس کا ثمرہ کچھ ہی ہو، جائز الحصول نہ ہوگا (تذکرۃ الرشید، ج۱ص۱۳۰، تفقہ وافتاء، ناشر: امیر المطابع، میرٹھ)

''مصالح میں مفاسد ومنکرات کے انضمام کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ مصلحت واجبُ التحصیل نہ ہو، تو اس کا چھوڑنا جائز تو ہر حال میں ہے، اور کبھی مستحب، اور کبھی واجب بھی ہو جاتا ہے، اور اگر واجبُ التحصیل ہو، اختلافاً، یا اتفاقاً، تو وہاں اس واجب کو بلا عذر ترک نہ کریں گے، لیکن اختلافی میں یہ عدمِ جوازِ ترک، اختلافی ہوگا، مگر اُن مفاسد پر ہر حال میں انکار کریں گے، اور جس درجے کا مَفسَدہ ہوگا، اُسی درجے کا انکار واجب ہوگا، اور اگر کوئی عذر ہو تو اعتقاداً اتفاق واجب ہوگا اور عملاً معتقدِ عذر معذور ہوگا'' (اشرف السوانح، جلد۳صفحہ ۲۵۲، المسئلة السادسة عشر، مضمون رابع ''الروضة الناضرة فی المسائل الحاضرة'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول ۱۴۲۷ھ)

''جو امر مفاسد کا ذریعہ بنے، اگرچہ وہ امر مباح ہو، لیکن بسبب ذریعۂ مفاسد بننے کے حرام ہو جاتا ہے'' (رسالہ تحقیق تعلیم انگریزی، ص۵، مقدمہ ثانیہ، ناشر: مجمع الفقہ الحنفی، سہارن پور، انڈیا، سنِ طباعت: ۱۴۳۹ھ)

''جو حکم کسی عارض کی وجہ سے کیا جاتا ہے، اس حکم کا دارومدار اس عارض پر ہوتا ہے، پس اگر زمانہ کے اختلاف، یا ملک کے تبدیل سے وہ عارض جاتا رہے، تو وہ حکم بھی جاتا رہے گا'' (رسالہ تحقیق تعلیم انگریزی، ص۹، مقدمہ عاشرہ، ناشر: مجمع الفقہ الحنفی، سہارن پور، انڈیا، سنِ طباعت: ۱۴۳۹ھ)

’’جس امر میں کراہت، عارضی ہو، اختلافِ ازمنہ وامکنہ واختلافِ تجربہ ومشاہدۂ اہلِ فتویٰ سے اس کا مختلف حکم ہوسکتا ہے، یعنی یہ ممکن ہے کہ ایسے امر کو ایک زمانہ میں جائز کیا جاوے۔

اس وقت اس میں وجوہ کراہت کی نہیں تھیں، اور دوسرے زمانہ میں ناجائز کہہ دیا جاوے، اس وقت علت کراہت کی پیدا ہوگئی، یا ایک مقام پر اجازت دی جاوے، دوسرے ملک میں منع کردیا جاوے، اس فرقِ مذکور کے سبب، یا ایک وقت اور ایک موقع پر ایک مفتی جائز کہے، اور اس کو اطلاع نہیں کہ عوام نے اس میں اعتقادی، یا عملی خرابی کیا کیا پیدا کردی ہیں، دوسرا مفتی ناجائز کہے کہ اس کو اپنے تجربہ اور مشاہدہ سے عوام کے مبتلا ہونے کا علم ہوگیا ہے، تو واقع میں یہ اختلاف ظاہری ہے، حقیقی نہیں، اور تعارض صوری ہے، معنوی نہیں، حدیث اور فقہ میں اس کے بے شمار نظائر مذکور ہیں‘‘ (اصلاح الرسوم، صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹، بابِ سوم، پہلی فصل، قاعدہ چہارم، ناشر: مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

’’کسی شئ پر حکم لگانا باعتبار غالب اور اکثر کے ہے، ایک آدھ فرد کا اس سے نکل جانا، اس حکم کے مخالف نہ کہلائے گا‘‘ (رسالہ تحقیق تعلیم انگریزی، ص۶، مقدمہ سادسہ، ناشر: مجمع الفقہ الحنفی، سہارن پور، انڈیا، سنِ طباعت: ۱۴۳۹ھ)

’’حکم واقعاتِ اکثریہ پر لگایا جاتا ہے اور جو بات شاذ ونادر ہوا کرتی ہے، اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا‘‘ (تحفۃ العلماء ج۲، رسالہ ’’فقہ حنفی کے اصول وضوابط‘‘ ص۸۳، ۸۴، بحوالہ افاضات ج۱۰ ص۱۵۶، بعنوان ’’حکم واقعاتِ اکثریہ پر عائد ہوتا ہے، شذوذ کا اعتبار نہیں‘‘ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد3 شمارہ7، اگست 2006ء- رجب 1427ھ)

(23)

دینی نصاب، عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے

ہر زمانے میں مسلمانوں کے لئے تعلیمی نصاب ایسا تجویز کیا جاتا رہا ہے، جو دینی وعصری تقاضوں کو بیک وقت پورا کرتا ہو، دینی وعصری نصابوں میں تقسیم وتفریق کی اسلامی دور میں آج کل کی طرح روایت نہیں ملتی، اسی لئے ہر دور میں اس دور کے جائز ومفید علوم وفنون کو نصاب کا حصہ سمجھا جاتا رہا ہے۔

اور آج بھی ہمارے دینی مدارس کے درسِ نظامی میں بہت سے ایسے علومِ آلیہ موجود ہیں، جن کی وضع وایجاد بحیثیتِ دین نہ ہوئی تھی اور نہ ہی ان سب علوم کے موجد علماء وصلحاء تھے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اس موضوع پر تفصیلی کلام کیا ہے، جو اس دور کے علماء وفقہاء اور بطورِ خاص دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم کا حق رکھنے والے اہلِ حل وعقد کی رہنمائی کے لئے کافی وافی ہے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> ’’درسِ نظامی کے ابتدائی عہد میں جو فارسی زبان اور علومِ منطق، فلسفہ، ریاضی، حساب وغیرہ کو اعلیٰ پیمانہ پر رکھا گیا تھا، یہ تو ظاہر ہے کہ یہ فنون ہمارے دینی علوم نہ تھے، نہ قرآن وسنت اور علومِ دینیہ کا سمجھنا فی نفسہٖ ان پر موقوف تھا، سکندر لودھی کے زمانہ سے پہلے ان میں سے بعض چیزوں کا تو رواج ہی نہ تھا، اور ریاضی حساب وغیرہ جو رائج تھے، وہ بھی اس لئے نہیں کہ قرآن وسنت، یا دین کا سمجھنا ان پر موقوف تھا، بلکہ صرف اس لئے کہ ایک عالمِ دین ملکی، سیاسی ودفتری معلومات میں بھی قابل وماہر تعلیم یافتہ انسان سمجھا جائے، فارسی زبان ظاہر ہے کہ قرآن وسنت کی زبان نہ تھی، مگر سلطنت کی دفتری زبان بن گئی تھی، اس لئے تمام علمائے

عصر اس میں بھی وہ مہارت پیدا کرتے تھے کہ اس میدان میں بھی وہ کسی سے پیچھے نظر نہ آئیں، اور اسی وجہ سے اس درس کا فاضل حکومت میں بھی ہر عہدہ و منصب کے قابل سمجھا جاتا تھا۔

تعلیم میں علومِ دینیہ اور دنیویہ کی کوئی تفریق نہ تھی، یہ تفریق صرف انگریزی عہد کے آثارِ باقیہ میں سے ہے کہ حکومت سے مایوس ہو کر علماء کو دینی علوم کی حفاظت کے لئے جداگانہ نظام بنانا پڑا، جس کے نتیجہ میں دیوبند اور اس کے ملحقہ مدارس قائم ہوئے۔

یہ بات قابلِ نظر ہے کہ ایک اسلامی حکومت میں دوری اور تفریق کیوں پیدا ہوئی، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ درسِ نظامی جو اَب تک ہمارے مدارس میں رائج ہے، علومِ دینیہ کی حفاظت واشاعت کے لئے تو بلاشبہ کافی ہے، مگر ملکی، دفتری ضروریات آج بالکل بدلی ہوئی ہیں، ان میں ہماری قدیم منطق وفلسفہ اور قدیم ریاضی اور فارسی زبان کام نہیں دیتی، آج فارسی زبان کی جگہ انگریزی نے لے لی ہے، اور قدیم معقولات کی جگہ نئی سائنس اور فلسفہ نے، نیز دوسرے علومِ جدیدہ نے لے لی ہے، اگر ہمارے متقدمین پہلے زمانہ کی ضروریات کے پیشِ نظر فارسی زبان کو اپنا سکتے ہیں، یونانی منطق وفلسفہ اور ریاضی کی تعلیم کو نصاب کا ایک بڑا جزو بنا سکتے ہیں، تو ان کا اتباع آج اس میں نہیں کہ ہم اس وقت بھی وہی منسوخ شدہ سکّے لے کر بازاروں میں پھریں، بلکہ وقت کی ضروریات کے مطابق انگریزی زبان اور فنونِ جدیدہ کو پڑھنا پڑھانا، وہی درجہ رکھے گا، جو اُس زمانہ میں فارسی زبان اور یونانی فلسفہ کا مقام تھا، اگر آج اس حقیقت کو سمجھ کر ہمارے علماء فارسی زبان کی جگہ انگریزی کو اور یونانی فلسفہ کی جگہ جدید سائنس اور فلسفہ کو دے دیں، تو اس میں نہ علومِ دینیہ کی تعلیم میں کوئی غلط تصرف ہے، اور نہ یہ اسوۂ اسلاف ہی

سے مختلف ہے، البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ آج فارسی زبان اور قدیم منطق وفلسفہ کو یکسر چھوڑ بیٹھنا بھی ہمارے لئے بہت سے علمی ذخائر سے محرومی کا سبب بن سکتا ہے، کیونکہ بہت سے علوم وفنون اور بہترین تصانیف فارسی زبان میں ہیں اور چونکہ یونانی منطق وفلسفہ کی اصطلاحات اوران کی تحقیقات، علمِ دین کے پڑھنے پڑھانے والوں کی زبان پر چھائی ہوئی تھیں، توان کی تصانیف میں بھی وہی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں، آج ان کی بہت سی تصانیف بھی قدیم منطق وفلسفہ کے جانے بغیر نہیں سمجھی جاسکتیں، اس لئے ہم پر دوہرا بوجھ پڑ گیا کہ فارسی زبان اور قدیم منطق وفلسفہ کو بھی کسی نہ کسی درجہ میں باقی رکھیں، اور جدید فنونِ عصریہ اور مروّجہ زبان بھی سیکھیں۔

ہم سے پہلے مسلمانوں نے وقت کی ضرورت سمجھ کر قدیم فلسفہ اور منطق، ریاضی وغیرہ اور فارسی زبان کو اپنایا، اس کا تجربہ تو یہ ہوا کہ اس زبان اور فنون نے مسلمانوں کے عقائد، اعمال، اخلاق، معاشرت پر کوئی غلط اثر نہیں ڈالا، بلکہ ان میں جو غلط اور مضر اثرات تھے، ان کی بھی اصلاح ہوتی چلی گئی، فارسی زبان عربی کے بعد دوسری اسلامی زبان بن گئی، یونانی فلسفہ اور منطق ریاضی وغیرہ اسلامی علوم کا ضمیمہ بن گئے، مگر انگریزی زبان اور اس کے ذریعہ آئے ہوئے علوم وفنون کا معاملہ اس کے بالکل مختلف نظر آیا، وقت کی ضرورت دیکھ کر ملک کے کئی اداروں نے قدیم علومِ اسلامیہ کے ساتھ، انگریزی اور علومِ عصریہ کا امتزاج کیا، مگر کہیں تو یہ کام چلا ہی نہیں، اور کسی جگہ چلا، تو اس طرح چلا کہ وہاں کے طلبہ میں علومِ عصریہ اور انگریزی زبان سے تو کچھ واقفیت پیدا ہوگئی، لیکن اسلامی علوم میں مہارت کا فقدان ہی محسوس ہوتا رہا، اس کے علاوہ ان طلباء کے عقائد واعمال ومعاشرت پر بھی مغربیت غالب آ گئی، جس نے اسلامی تعلیم کا مقصد ہی فوت

کردیا، اس طرح کے تجربات دیکھ کر بہت سے محتاط حضرات نے انگریزی زبان اوراس کے فنون ترک کردینے ہی کو ''سلامت برکناراست'' قرار دے دیا، لیکن ضرورت اس کی تھی کہ حالات اور معاملات کا تجربہ کرکے دیکھا جاتا کہ قدیم علومِ فلسفیہ اور فارسی زبان کیوں ہمارے اعمال واخلاق پر اثر انداز نہیں ہوئی، اور انگریزی زبان اور موجودہ فنونِ عصریہ کیوں ہمارے عقائد سے لے کر اعمال واخلاق تک سب کو یورپ کا تابع بنادیتے ہیں، اس تجزیہ سے جو اسباب مضرت کے ثابت ہوتے، ان سے اجتناب کیا جاتا، اور جو مفید کام ہیں، ان کو سرے سے نظر انداز نہ کیا جاتا۔

معمولی غوروفکر سے فرق کی دو وجوہ سمجھ میں آتی ہیں، ایک یہ کہ فارسی زبان اور یونانی علوم کو ہم نے اس حال میں لیا، جب کہ دنیا پر غالب حکومت ہماری تھی، ہمارے ذہن دوسروں سے مرعوب ومغلوب نہ تھے، ان تمام چیزوں کو وقت کی ضرورت سمجھ کرلیا، اور اپنے عقائد اور تعلیمات کا تابع بنا کر رکھا، اصل علومِ دینیہ پر برتری اور تفوق کا وسوسہ بھی کسی کو نہ آتا تھا۔

دوسرے یہ کہ تعلیم دینے والے ان فنون کے بھی وہی حضرات تھے، جو علومِ کتاب وسنت کے ماہر، عقائد میں پختہ، تقویٰ وطہارت، عبادت وزہادت سے آراستہ تھے، ان کی صحبت اور تعلیم نے طلبہ کو ان عجمی اثرات سے محفوظ رکھا، جو ہر فن اور ہر زبان کے ساتھ طبعی طور پر آیا کرتے تھے، اس کے برعکس ہم نے انگریزی زبان اور اس میں آئے ہوئے علومِ فنون کو ایسے زمانہ میں لیا، جب کہ دنیا کی حکومت وقیادت انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی، جن کی طرف سے یہ زبان اور فنون آئے تھے، ہم نے اس کو اپنے آقاؤں کی زبان اور ان کا دیا ہوا تحفہ سمجھ کر احساسِ کمتری کے ساتھ قبول کیا، انگریزی حرف لکھنے پڑھنے اور بولنے میں اپنی عزت

اور فخر محسوس کیا، ان فنون کے جاننے کو ہی ایسا سرمایۂ سعادت سمجھا کہ اپنے علوم وفنون سے یکسر غافل وجاہل ہوتے چلے گئے۔

دوسری طرف اس زبان اور فنون کی تعلیم کے اساتذہ بھی ہمیں یورپ ہی سے درآمد کرنے پڑے، اپنے استادوں کے عقائد، اعمال، اخلاق، معاشرت سب ہی سے متاثر ہونا، ایک فطری امر تھا، جو پیش آ کر رہا، اور جب مسلمانوں میں اپنی بدنصیبی سے اس زبان اور فنونِ جدیدہ کی ترقی کا وقت آیا، تو یہ محسوس ہوا کہ وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھے، نہ ان کو اپنے اصلی علوم کتاب وسنت سے کوئی حق واسطہ رہا، نہ اسلامی عقائد وعبادات، اور اخلاق ومعاشرت سے کوئی تعلق رہا۔

یہ اسباب تھے، جن کی وجہ سے انگریزی زبان اور فنونِ جدیدہ نے ہمیں اور چاہے کچھ بھی بنا دیا ہو، مگر مسلمان نہیں بننے دیا۔

میری نظر میں اگر دونوں مضر، اسباب سے مکمل پرہیز کرتے ہوئے انگریزی زبان اور عصری علوم وفنون کو پوری کوشش، اور توجہ سے حاصل کیا جائے، تو وہ پچھلے فلسفہ اور منطق سے زیادہ اسلامی عقائد اور اسلامی علوم کے خادم نظر آئیں گے۔

ضرورت اس کی ہے کہ اصل کو اصل سمجھا جائے، اور تابع کو تابع، اور تابع کو اس کے اپنے درجہ سے نہ بڑھنے دیا جائے، اس کے حاصل کرنے کو دنیا کی ضرورت سمجھا جائے، سرمایہ فخر وغرور نہ بنایا جائے، نیز علوم کے حاصل کرنے کے لئے اساتذہ ایسے مہیا کئے جائیں، جو اپنے عقائد، کردار، معاشرت اور عبادت وخدا ترسی کی رو سے پکے مسلمان اور اسلامی تعلیمات کے معلم ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے ہوں، تو پھر نہ انگریزی زبان میں کوئی زہر ہے، نہ فلسفۂ جدیدہ اور سائنسِ جدید میں۔

اس وقت اس موضوع پر کوئی مستقل، اور مکمل تصنیف کرنا مقصد نہیں، وقتی طور پر

عاجلانہ انداز میں جو کچھ سامنے آیا، حوالہ قلم کیا گیا ہے‘‘ (مجالسِ مفتی اعظم ص ۵۷۵ تا ص ۵۷۹، مجلس: ۶۳ ’’اسلام کے قرنِ اول میں تعلیم کا نصاب اور نظام‘‘ بعنوان ’’ایک لمحۂ فکریہ‘‘، ناشر: ادارۃ المعارف، کراچی، طبع جدید: ربیع الاول ۱۴۲۴ھ، مئی ۲۰۰۳ء)

امید ہے کہ جدید سائنس، فلکیاتِ جدیدہ، ومعاشیاتِ جدیدہ وغیرہ جیسے علوم کی اصلاحات کے بعد درسِ نظامی کا حصہ بنانے پر اہلِ علم حضرات ضرور متوجہ ہوں گے۔

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 3 شمارہ 8، ستمبر 2006ء- شعبان 1427ھ)

---

(24)

اہلِ علم کو استغناء کی ضرورت

اہلِ علم حضرات کو اور خاص طور پر وہ علماء، جو دین کی خدمت میں مصروف ہیں، انہیں چاہئے کہ استغناء اور توکل علی اللہ کی دولت کو اپنا اصلی سرمایہ بنائیں، لوگوں کے مال ودولت ہی پر نظر نہ رکھیں۔

کیونکہ اللہ والوں کے نزدیک اصل سرمایہ توکل علی اللہ کی دولت ہوتی ہے، اور وہ اسی کو اصل سمجھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے لوگوں کے دلوں میں بھی ان کی عزت اور وقعت پیدا فرماتا ہے۔

اس کے برخلاف جن اہلِ علم کی نظر لوگوں کے مال پر ہوتی ہے، اور وہ اسی کی فکر اور ادھیڑ بن میں لگے رہتے ہیں، وہ اس اصل سرمایہ سے محروم ہوتے ہیں، اور جب اصل سرمایہ سے محروم ہوتے ہیں، تو ان کو کبھی اطمینان وسکون نصیب نہیں ہوتا، اور لوگوں کی نظروں میں بھی ان کی کوئی وقعت وعظمت نہیں ہوتی، یوں ظاہری رکھ رکھاؤ کے طور پر لوگوں کا جھک کر سلام کر لینا اور دو چار شان بڑھانے والے الفاظ زبان سے نکل جانا اور بات ہے۔

لیکن یہ صرف ایسا ظاہر ہوتا ہے، جس کا باطن خراب ہوتا ہے، کیونکہ دل سے لوگ ایسے اہلِ علم

کو ذلیل اور حقیر ہی سمجھتے ہیں اور پیٹھ پیچھے بھی ذکرِ خیر نہیں کرتے، اور اس کی اصل وجہ وہی ہے جس کا پیچھے ذکر ہوا کہ اصل سرمایہ استغناء اور توکل علی اللہ ہے اور جس کے پاس اصل سرمایہ ہی نہ ہو، اس کو اطمینان وسکون کب نصیب ہوسکتا ہے، اور ایسا شخص لوگوں کی نظروں میں کب عزیز ہوسکتا ہے۔

پھر لالچی اور حریص قسم کے مریض علماء دوسرے علماء کی بھی توہین وتحقیر کا باعث بنتے ہیں، کیونکہ انہیں دیکھ کر لوگ دوسرے علماء کو بھی ان جیسا ہی خیال کرنے لگتے ہیں، اور پھر اس کے نتیجہ میں علماء کی پوری جماعت ہی کی طرف سے ایسے متنفر ہو بیٹھتے ہیں کہ اپنی اولاد کو بھی دینی علم نہیں پڑھاتے، اور یہی خیال کرتے ہیں کہ دین کا علم پڑھا کر ہماری اولاد بھی دوسروں کی دستِ نگر اور بھکاری ہی بن جائے گی۔

اور بعض اہلِ علم حضرات کا یہ سمجھنا کہ ہم تو اس غرض سے مال حاصل کرنے کی فکر کرتے ہیں کہ مال ودولت زیادہ ہوگی، شان وشوکت اور ٹھاٹھ باٹھ خوب ہوگی، تو عوام کے دلوں میں اس سے علماء کی وقعت وعظمت بڑھے گی، یہ خام خیالی ہے، کیونکہ جو مال لوگوں کی نظروں میں ذلیل اور حقیر بن کر حاصل کیا جائے، وہ کبھی بھی فخر وعزت کا باعث نہیں ہوا کرتا۔

البتہ اگر اللہ تعالیٰ استغناء اور توکل کی دولت کے ہوتے ہوئے حلال مال عطاء فرمائے، تو یہ عطیۂ الٰہی ہے، کیونکہ اس صورت میں استغناء اور توکل علی اللہ کا اصل سرمایہ موجود ہے، اس باریک فرق کو اچھی طرح ملحوظ رکھنا چاہئے، اور حق وباطل میں تلبیس وخلط نہیں کرنا چاہئے، نفس اور شیطان بڑے مکار اور چالاک ہیں، بعض اہلِ علم حضرات، نفس وشیطان کی پٹی پڑھانے میں آ کر تاویلات کے راستہ سے فتنوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ اہلِ علم حضرات کو استغناء کی نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

’’علماء ہاتھ پھیلانے کی بدولت نظروں میں ذلیل ہوگئے، اسی وجہ سے امراء اپنے

بچوں کو عربی نہیں پڑھاتے، اور بعض تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم کو اپنی اولاد گدا (فقیر) بنانا منظور نہیں (العلم والعلماء، ص۲۶۲، بحوالہ حقوق العلم، باب ۸: استغناء، غیرت، خودداری، فصل نمبر ا، بعنوان ''عزت کا مدار'' بحوالہ التبلیغ نمبرا، وعظ امید رحمت کے صحیح معنیٰ، ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتورا باندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت بارِ دوم: ۱۴۱۲ھ)

''علماء کی بے قدری سادگی سے اور پھٹے ہوئے کرتے، پھٹے ہوئے جوتے سے نہیں ہوتی، اس کی تو وہ کچھ بھی پرواہ نہ کریں، مگر اللہ کے لئے مستغنی ہو کر رہیں، ایک شخص پھٹے ہوئے لباس میں ہو، لیکن عالم ہو، متقی ہو، تو ممکن نہیں کہ مسلمانوں کی نظروں میں اس کی عزت نہ ہو، برخلاف اس کے جو لوگ عبا اور قبا میں ہوتے ہیں، چاہے کیسے ہی مہذب طریقہ سے سوال کریں، مگر ذلت ضرور ہوتی ہے، خاص کر اس وقت جب کہ سوال بھی اپنی ذات کے لئے ہو، سوال ضرور ذلت ہے، میں علماء سے کہتا ہوں کھانے کو نہ ملے، تم اپنے گھر بیٹھو، مزدوری کر کے کھاؤ، کسی کونے میں مر جاؤ، مگر ہاتھ مت پھیلاؤ، ہفت اقلیم کی سلطنت بھی بحمداللہ میرے نزدیک کچھ نہیں، مجھے فاقہ سے بیٹھا رہنا، اور گھر کے اندر مر جانا گوارہ ہے، مگر کسی کے سامنے اپنی حاجت کا ظاہر کرنا گوارہ نہیں، اگر کپڑے نہیں، تو پھٹے ہوئے پہنیں، پیوند لگے ہوئے پہنیں، اور امیروں اور نوابوں کی پرواہ نہ کریں، اپنے فاقہ ہی میں مست ہوں، مَر جائیں، مگر سوال نہ کریں، کسی سے آنکھ ان کی نہ لپے، اپنے اللہ سے کام رکھیں۔

جب علماء، حق تعالیٰ کا کام کریں گے، تو کیا حق تعالیٰ ان کو بھول جائیں گے؟''

(العلم والعلماء، ص۲۶۱، ۲۶۲، بحوالہ حقوق العلم، باب ۸: استغناء، غیرت، خودداری، فصل نمبر ا، بعنوان ''عزت کا مدار'' بحوالہ التبلیغ نمبرا، وعظ امید رحمت کے صحیح معنیٰ، ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتورا باندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت بارِ دوم: ۱۴۱۲ھ)

فائدہ: ملاحظہ فرمائیے! کتنے اہتمام اور مضبوطی کے ساتھ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے علماء کو استغناء کی ہدایت فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 3 شمارہ 9، اکتوبر 2006ء۔ رمضان 1427ھ)

---

(25)

مولوی کے بعد مولانا اور اب ڈاکٹر کی باری ہے

جب ہم نے قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد دینی کتب کی تعلیم کے سلسلہ کا آغاز کیا، تو ہمیں ’’حمد باری‘‘ نامی ایک منظوم رسالہ حفظ کرایا گیا، یہ منظوم رسالہ یوں تو بہت مختصر تھا، لیکن اتنا مفید اور جامع تھا کہ بہت سے کارآمد اور روزمرہ استعمال کے الفاظ کے معانی، شعر شعر کے انداز میں معلوم ہوجایا کرتے تھے، اس منظوم رسالہ کے بالکل ابتدائی صفحہ پر ایک شعر یہ بھی ہم نے پڑھا تھا:

علمِ مولیٰ ہو جسے ہے مولوی   جیسے حضرت مولوی معنوی

اس شعر میں مولوی کا معنیٰ بیان کیا گیا ہے کہ جسے مولیٰ کا علم ہو، مولوی کا لفظ دراصل اسی معنیٰ میں استعمال ہوتا تھا، اور اس اعتبار سے یہ لفظ بہت زیادہ معنیٰ خیز تھا، علمائے کرام کو مولوی کے لقب سے ہی یاد کیا، اور جانا پہچانا جاتا تھا، لیکن جب یہ لفظ زیادہ عام اور پرانا ہوگیا، تو اس کے متبادل ’’مولانا‘‘ کا لقب استعمال ہونے لگا، اور رفتہ رفتہ ’’مولوی‘‘ کا لفظ پسِ منظر میں چلا گیا، اور مولوی ایک ایسا لقب بن گیا کہ عام علماء کے طبقہ میں اس لقب کو ناپسندیدہ سمجھا جانے لگا، چنانچہ آج اگر کسی عالمِ دین کو مولوی کے نام سے یاد کیا جائے، تو اسے یہ نام کچھ اچھا نہیں لگتا۔

بہرحال مولوی کے بعد ’’مولانا‘‘ کا لفظ علماء کے ماحول میں مہذب اور پسندیدہ شمار کیا جانے لگا، چنانچہ اپنے نام کے ساتھ مولانا کا لفظ سن کر ایک عالم کو اچھا محسوس ہوتا تھا، مگر اس کے باوجود مولوی کا لفظ عملی طور پر مولانا سے کوئی جداگانہ مفہوم نہ رکھتا تھا۔

لیکن اب ایک اور لقب چل پڑا ہے ''ڈاکٹر'' یا ''دکتور'' دکتور اصل میں بنیادی طور پر تو انگریزی زبان کا لفظ تھا، یعنی ڈاکٹر، جب عربی دنیا میں اس کو پذیرائی حاصل ہوئی، تو عربی زبان کے خاص نہج پر لانے کے لئے ''ڈاکٹر'' سے ''دکتور'' بنالیا گیا۔

مولوی، یا مولانا کے مقابلہ میں ''ڈاکٹر'' یا ''دکتور'' کا لقب، دراصل ایک ایسی شخصیت کے لئے ایجاد کیا گیا تھا، جو دینی مدارس وجامعات کے مخصوص نصاب ونظامِ تعلیم، اور اہلِ علم کی مخصوص وضع قطع سے آزاد ہوتا تھا۔

بالکل ابتداء میں تو یہ نصاب ونظامِ تعلیم مستشرقین (Orientalist) نے اپنے زیرِ اثر ادارے قائم کر کے شروع کیا تھا۔

مستشرقین کے ان اداروں کے طرزِ عمل کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

> ''مستشرقین کے ان اداروں کا مقصد اور خواہ کچھ بھی ہو، لیکن طلبِ حق نہیں ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ دن رات قرآن وسنت کا مشغلہ رکھنے کے باوجود اس کے حقیقی نور (ایمان ویقین اور اعمالِ صالحہ) سے محروم ہیں، اور مقامِ عبرت ہے کہ کفر تک کی ظلمتوں سے نجات حاصل نہیں کر سکے، لیکن اس سے زیادہ عبرتناک مسلمان ملکوں کا یہ طرزِ فکر ہے کہ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود انہوں نے اسلامی علوم کے بارے میں بھی انہی اداروں کی ڈگریوں کو اپنے معاشرے میں بڑا اونچا مقام دے رکھا ہے، اور مسلمانوں کو مجبور کر رکھا ہے کہ اگر سرکاری سطح پر اسلامی علوم میں اپنی قابلیت منوانی ہے، تو انہی اداروں میں پڑھ کر آؤ، اور ان لوگوں کے معیار پر پورے اترو، جو اِن اسلامی علوم سے ایمان اور عملِ صالح کی دولت حاصل کرنا نہیں چاہتے، گویا کہ اسلام کا بھی وہی علم معتبر ہے، جسے اسلام کی حقانیت سے انکار کرنے والے، یہ غیر مسلم صحیح قرار دیں، ذہنی غلامی اور غیرت کے دیوالیہ پن

کی یہ انتہا ہے، جو آج بہت سے مسلم ملکوں میں ایک فیشن بنی ہوئی ہے، اسی بنیاد پر دین اور دین کے علوم میں مہارت وقابلیت کو جانچا جارہا ہے، اوران سے کوئی یہ کہنے والا موجود نہیں کہ:

کرمکِ ناداں! طوافِ شمع سے آزاد ہو اپنی ہستی کے تجلی زار میں آباد ہو

(ماخوذ از ''جہانِ دیدہ'' صفحہ ۵۹۴ بتغیر ''دیارِ مغرب میں تین ہفتے'' ناشر: ادارۃ المعارف، کراچی)

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں اسلامی ممالک میں مستشرقین کے طریقِ کار، ان کے عزائم ومقاصد اور معاشرے پر ان کے پڑنے والے اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ابتداء میں ان اداروں سے تعلیم یافتہ شخصیات کو ڈاکٹروں کا لقب دیا جاتا تھا، بعد میں عرب ممالک میں ایسے ادارے، کالج و یونیورسٹیوں کی شکل میں قائم کیے گئے کہ ان اداروں کے اغراض ومقاصد کو تو مستشرقین کے قائم کردہ اداروں کے اغراض ومقاصد کے عین مطابق قرار دینا ناانصافی ہوگی، لیکن ان اداروں میں کچھ عناصر ضرور مستشرقین کے اداروں سے شعوری، یا غیر شعوری طور پر منتقل ہوگئے تھے۔

کیونکہ ان اداروں کے ذمہ دار اور معلمین دینی مدارس وجامعات کی طرح تقوے وطہارت، پاکیزگی، یہاں تک کہ وضع قطع میں شرعی اُصولوں کے پابند نہ تھے، اوران کی تعلیم وتحقیق کے انداز میں بھی آزادانہ رویہ اور مغربی تجدد پسندی اور اباحیت پرستی کے جراثیم کا بھی معمولی حصہ شامل تھا، رفتہ رفتہ یہ اثرات ہمارے ملک میں بھی داخل ہوگئے، اور یہاں بھی ایسے ادارے قائم ہوگئے، جن سے فاضل حضرات کو مولوی، یا مولانا کے بجائے دُکتور، یا ڈاکٹر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، ان اداروں میں دین کی تحقیق وریسرچ میں کافی توسع اور اباحیت پرستی کی آمیزش پائی جاتی ہے، اور بعض روشن خیالی کے محبین اور دعویداروں کی نظروں میں اولاً تو مستشرقین سے براہِ راست استفادہ کرنے والے، اور ثانیاً اسلامی ملکوں کے فاضل یہی ڈاکٹر

یا ڈکتور اسلام کے معتدل ترجمان، اور بین المذاہب ہم آہنگی، یا تقاربِ ادیان کے مسئلہ میں معین سمجھے جاتے ہیں، اور ان کے مقابلہ میں معروف معنیٰ میں مولوی، یا مولانا حضرات مذہبی انتہاء پسند قرار دیئے جاتے ہیں۔

ہمیں ان اداروں اور ان کی تعلیم کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن یہ شکوہ ضرور ہے کہ دینی مدارس وجامعات کے بالمقابل ان اداروں کی ڈگریوں کو، اب اہلِ علم حضرات بھی زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں، اور ان اداروں سے اپنا تعلق جوڑ کر مخصوص دینی وضع قطع اور چال وچلن سے بھی منحرف ہو رہے ہیں۔

ان حالات میں اندیشہ ہے کہ اگر معاملہ بلاکسی نکیر واصلاح کے یونہی جاری رہا، تو ہمارے ملک میں دینی وضع قطع کے حوالے سے جو مخصوص تصور عوام کے ذہنوں میں قائم ہے، وہ بھی نہ جاتا رہے اور یورپی وعربی ممالک کی طرح کل وہ دن دیکھنا نہ پڑے کہ ہمارے منبر ومحراب سے دین کی صدائیں بلند کرنے والے وہ لوگ ہوں، جو مولوی، یا مولانا کے بجائے ڈاکٹر، یا ڈکتور کی ڈگری وسندا اپنے پاس رکھتے ہوں، اور اس دینی وضع قطع اور مخصوص حلیہ سے بالکل آزاد ہوں۔

مغربی طرز پر قائم یونیورسٹیوں میں جو دینی وعصری علوم پڑھائے جا رہے ہیں، اگر ان کی اہلِ علم حضرات کے لئے ضرورت محسوس کی جاتی ہے، تو مناسب یہ تھا کہ ان علوم کو دینی مدارس وجامعات کے نصابوں کو متنوع بنا کر مدغم کیا جاتا، تو شاید مغربی جراثیم سے حفاظت رہتی۔

لیکن وفاق المدارس کی سطح پر صرف ایک ہی نصاب پر پوری اجتماعی صلاحیتوں کو خرچ کرنے کی وجہ سے، ابھی تک اس ضرورت کو پورا نہیں کیا جاسکا، جس کی وجہ سے دینی مدارس کے فضلاء ایک دینی وسیع درسِ نظامی کے نصاب سے گذر کر ان یونیورسٹیوں کے نصابوں کے محتاج ہوتے ہیں، اور وہاں پہنچ کر ان کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں، الا ماشاء اللہ۔

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 3 شمارہ 10، نومبر 2006ء- شوال 1427ھ)

(26)

ادارہ کے نصاب کی بنیاد، کن خطوط پر ہونی چاہئے

آج ملک کے اندر، دینی تعلیم کے لیے کئی وفاق موجود ہیں، جن کی بنیاد، اپنے اپنے مسالک کے رجحانات پر ہے، ہم نے تاحال درسی کتب کے لیے کسی وفاق سے الحاق نہیں کیا، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم موجودہ دور کے علماء کے لیے، جس نصاب کی ضرورت سمجھتے ہیں، وہ موجودہ وفاقوں کے نصابوں میں موجود نہیں، اور کسی وفاق کے ساتھ الحاق کرنے کے بعد ہمیں نصاب میں زمانہ وحالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، ترمیم وتبدیلی کا خود سے کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

وفاق کی نہج کیونکہ بہت وسیع ہوتی ہے، اور وفاق کی سطح پر نصاب میں کوئی غیر معمولی تبدیلی لانا، اور اس کو پھر نافذ کرنا آسان کام نہیں ہوتا، جب نظام وسیع ہوتا ہے، تو مسامحت اور رعایتوں کا میدان بھی وسیع ہوتا ہے، سب کو ساتھ لے کر چلنا سہل کام نہیں ہوتا۔

دوسرے غیر معمولی اقدامات اٹھانے کے لئے دل گردہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس میں بہت سوں کو ناراض بھی کرنا پڑتا ہے، ایسے موقع پر بہت سے لوگ الحاق سے خروج بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

اس لئے میں نے عرض کیا کہ اس کے لئے بڑی ہمت اور حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے، اگر وہ نہ ہو، تو پھر گاڑی نہیں چلتی، اور پھر اس وسعت والی رعایت سے کام کی نوعیت عام تو ہوتی رہتی ہے، مگر تام نہیں ہوتی، اور جب تک کام تام نہ ہو، اُس کام کا صرف عام ہونا، اصل مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا، البتہ بعض جزوی فوائد ضرور حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

بہر حال وفاق اپنے مخصوص اغراض و مقاصد اور تقاضوں کے پیش نظر بہت سے ایسے

اقدامات کرنے سے قاصر ہے، جن کی ایک طرح سے ضرورت ہے، خود وفاق کے ساتھ الحاق شدہ بہت سے بڑے جامعات ومدارس کے ذمہ داران کو وفاق کی سطح پر جاری نصاب سے جزئی، یا کُلّی اختلاف ہے، اور باقاعدہ ان کی تحریرات اس سلسلہ میں موجود ہیں، مگر باوجود مدتِ دراز گزرنے کے وہ صرف کاغذوں کی زینت ہیں، بلکہ خود وفاق کے اہلِ حل وعقد بعض اوقات، کوئی تجویز منظور کرتے ہیں، مگر وہ عملاً نافذ نہیں ہوتی۔

ہم یہاں اس بحث میں پڑنا، اس وقت مناسب نہیں سمجھتے کہ اہلِ وفاق کو کیا کرنا چاہئے، اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔

کیونکہ ایک تو ہم دوسروں کے مقابلہ میں اپنے عمل کے ذمہ دار اور مکلّف پہلے ہیں۔

دوسرے آج کل سننے اور برداشت کرنے کا مزاج بھی نہیں، اس لئے اس قسم کی باتوں کو مخالفت برائے مخالفت پر محمول کیا جاتا ہے۔

تیسرے کوئی توقع بھی نہیں، جب بڑے بڑے اکابر ومشائخ کی پیش کردہ ہدایات وترمیمات اور تجویزات کو قابلِ اعتناء، یا قابلِ عمل نہیں سمجھا جاتا، تو ہم کیا حیثیت رکھتے ہیں؟

بہر حال ہمیں ادارہ کے نصاب کی ترتیب وتشکیل دیتے وقت ادارہ اور مدرسہ کی چار دیواری کے اندر کے تقاضوں، اور معلمین واساتذۂ کرام کی خوشنودیوں، اور مدارس میں رائج مخصوص نصاب کی رعایت کے بجائے، باہر کے لوگوں کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھنے کی زیادہ ضرورت ہے کہ اس وقت لوگوں کو کن کن شرعی مسائل اور احکامات کی ضرورت ہے، اور اس وقت ایک عالمِ دین کے لئے کونسا نصاب لوگوں اور معاشرہ کی ضرورت کو پورا کرسکتا ہے۔

اس وقت دنیا میں غیر معمولی تبدیلی آچکی ہے، جو تبدیلی پہلے زمانوں میں صدیوں میں آتی تھی، وہ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ سالوں اور مہینوں میں آرہی ہے، اور غیر معمولی تبدیلی کے اعتبار سے موجودہ صدی گذشتہ تمام صدیوں سے زیادہ تیز رفتاری کی حامل ہے۔

لیکن بقول حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ کے کہ جو صدی نصاب کے اعتبار سے زیادہ

تبدیلی اور تنوع کی حامل تھی، بدقسمتی سے وہی صدی نصاب کے اعتبار سے زیادہ جامد رہی ہے ،اور اہلِ علم حضرات کی طرف سے اس صدی کے تقاضوں کا صحیح حق اداءنہیں کیا جاسکا۔

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے بقول ہم آج بھی بازار میں پرانے منسوخ شدہ سکے لئے پھر رہے ہیں۔

میں اعتماد اور شرح صدر کے ساتھ یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ موجودہ درسِ نظامی کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد عموماً ایک عالمِ دین کے اندر، وہ صلاحیت اور وہ استعداد پیدا نہیں ہو پاتی، جو اِس وقت ایک عالمِ دین کی شان ہونی چاہئے، کیونکہ ہر علاقہ کے لئے ایسے عالمِ دین کا وجود فرضِ کفایہ ہے کہ جو علاقہ کے لوگوں کو روزمرہ پیش آنے والے مسائل بتلا سکے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ دورہ حدیث میں اچھی استعداد کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے کے باوجود ایک عالمِ دین میں یہ استعداد پیدا نہیں ہوتی، اور فرضِ کفایہ تو بعد کی چیز ہے، اِس دور کے اعتبار سے فرضِ عین مسائل واحکام پر خود اپنے آپ کو بھی عبور نہیں ہو پاتا۔

البتہ فقہا، محدثین، متکلمین، نحویین، صرفیین اور منطقیین وغیرہ کی روائتی اختلافی بحثیں یاد ہو جاتی ہیں، ان میں بھی زیادہ حصہ ایسے مواد پر مشتمل ہوتا ہے، جن کی خود اس عالم کو، اور اس سے متعلقہ کسی انسان کو زندگی بھر عملی ضرورت پیش نہیں آتی۔

کیونکہ عوام کو روزمرہ پیش آنے والے معاملات سے عموماً ان بحثوں کا کوئی خاطر خواہ تعلق نہیں ہوتا۔

ہمیں نصاب برائے نصاب نہیں پڑھانا چاہئے کہ پڑھ لینے کے بعد رواجی واصطلاحی تعلیم وتعلُّم اور پڑھنے پڑھانے کے تو وہ کام آسکتا ہو، لیکن اصطلاحی درس وتدریس سے ہٹ کر اس کا مصرف نہ ہو۔

اس لئے ہمیں مدرسہ سے باہر کے حالات کو دیکھنا چاہیے کہ اس وقت کون کون سے فتنے جنم لے رہے ہیں، اور عوامُ الناس کے ایمان کو بگاڑ رہے ہیں، کون کون سے فرقِ باطلہ گمراہیاں

پھیلا رہے ہیں، کیا کیا باطل عقائد ونظریات رائج ہورہے ہیں، میڈیا اور ذرائع ابلاغ پر دین کے خلاف کیا کچھ زہر اگلا جارہا ہے۔

غرضیکہ دین کے جتنے بھی شعبے ہیں خواہ عقائد کا شعبہ ہو، یا عبادات کا شعبہ ہو، یا معاملات کا شعبہ ہو، یا معاشرت کا شعبہ ہو، یا اخلاق کا شعبہ ہو یا سیاست کا شعبہ ہو، دین کے تمام شعبوں کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

اور یہ امر ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ایسا نصاب تشکیل دیا جائے کہ اس نصاب کے دورانیہ سے گزر کر ایک طالبِ علم میں اتنی استعداد اور شعور پیدا ہو کہ ان شعبوں کے موجودہ تقاضوں اور فتنوں کو سمجھ سکے اور ان کا مقابلہ ودفاع کرسکے۔

مثال کے طور پر عقائد ونظریات کے شعبہ میں زندقہ والحاد پھیل رہا ہے، اہلِ سنت والجماعت سے خروج کیا جارہا ہے، تو اصولی انداز میں ایسے قواعد نصاب کا حصہ بنائے جائیں، جن سے مدلل انداز میں ان کی تردید ہوسکے۔

اور اگر ایسا نصاب پڑھا کر سند فراغت دے دی جائے گی، اور دستار بندی کردی جائے گی، جب کہ یہ طالبِ علم اس نصاب کو پڑھ کر معاشرہ میں جا کر، ان رائج فتنوں سے باخبر اور آگاہ ہی نہ ہوگا، تو عالم دین کا مقصد اس نصاب سے کیسے حاصل ہوسکے گا؟

اگر آج عبادات کے شعبہ میں تحریف ہورہی ہے، تو ہمارے نصاب میں اس تحریف کی اصولی انداز میں نشاندہی اور مدلل انداز میں تردید ہونی چاہئے۔

معاملات ومعاشیات کا میدان اس دور میں بہت متنوع ہوگیا ہے، اس تنوع کو پیشِ نظر رکھ کر، سود، رشوت، حرام خوری وغیرہ کی رائج شکلوں کا احاطہ کرنے والے اصول وقواعد کو نصاب کا حصہ بنانا چاہئے، تاکہ ایک عالمِ دین ادارہ کی چاردیواری سے باہر نکل کر لوگوں کو حلال وحرام سے آگاہ کرسکے، اور محراب ومنبر پر پہنچ کر اس کی تبلیغ کرسکے۔

اس دور میں مغربی معاشرت رائج ہوگئی ہے، اور بعض دوسرے مذاہب کی رسوم بھی معاشرہ

میں موجود ہیں، ایک عالمِ دین کو اصولی انداز میں اسلامی اور غیر اسلامی معاشرت سے تعارف کرانا چاہئے، اسی طرح اخلاق کا صرف نام رہ گیا ہے، حالانکہ اس شعبہ کا ایک درجہ فرضِ عین ہے، اگر ایک عالمِ دین بھی اس فرضِ عین درجہ سے واقف نہیں ہوگا، تو وہ فرضِ کفایہ کے منصب کو کیا اداء کر پائے گا۔

اس کے علاوہ اس زمانہ میں تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف وتاریخ وغیرہ کے راستوں سے مختلف فتنے آرہے ہیں، ایک عالمِ دین کو اصولی درجہ میں ان فتنوں سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔

مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑ رہی ہے کہ ایک عالمِ دین مروَّجہ دستارِ فضیلت اور سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے اندر اس چیز کی قابلیت نہیں پاتا کہ کسی فرقِ باطلہ کے ایک عامی شخص کے ساتھ بات کر سکے، اس کو سمجھا سکے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ فرقِ باطلہ کا ایک عامی شخص دوسرے کو قائل کرنے اور گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور ہمارا ایک عالمِ دین یہ کام نہیں کر پاتا۔

اگر کہا جائے کہ ہم نے ان اغراض کے لئے مختلف قسم کے تخصصات تشکیل دیدیئے ہیں، جن کے ذریعہ سے یہ مقصد حاصل ہو رہا، اور یہ استعداد وقابلیت پیدا ہو رہی ہے، تو اس بارے میں سمجھ لینا چاہئے کہ اولاً تو وہ صرف برائے نام ہیں۔

دوسرے غور طلب بات یہ ہے کہ کیا درسِ نظامی کا وسیعُ المدت نصاب پڑھ لینے کے بعد بھی، ان اہم امور کی تعلیم کے لئے الگ، اور مستقل نصاب کی ضرورت رہ جاتی ہے۔

کیا یہ بات غیر معقول نہیں ہے کہ اہم امور کو وسیعُ المدت نصاب سے گزرنے پر موقوف کر دیا جائے، جبکہ ان امور کی ضرورت فرضِ کفایہ درجہ سے کم نہیں، اور ایسے ہی عالم کا وجود ہر علاقہ میں فرضِ کفایہ تھا، جو اس قسم کے امور سے واقف ہو، آخر اگر اتنی اہم ضرورتیں بھی پوری نہ ہوں ، تو پھر کن اغراض کے لئے فرض کفایہ کے عنوان سے علماء کی کھیپ تیار ہو رہی ہے؟

تعلیم وتعلم کوئی روایتی چیز تو ہے نہیں کہ بس رسم وروایت کے طور پر پڑھنے پڑھانے کے عمل کو

اختیار کرلیا جائے، یا پیشہ کے طور پر اس کو اختیار کرلیا جائے، اس کے مقصد اور حقیقت پر نظر رکھنی چاہئے، اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس وقت ضرورت ہے کہ ہم روایتی ورسمی طور وطریقوں کے بجائے، اور پکی پکائی کھانے کے بجائے خود سے کچھ کرکے کھائیں۔

اس غرض کے لئے ہمیں خود سے اس میدان میں کام کرنا ہوگا، دوسروں کے بھروسہ پر رہنے سے کام نہیں ہوتا، اور یہ تمام کام بحمداللہ تعالیٰ مختلف رسائل اور تصنیفات وتالیفات کی شکل میں ہو چکا ہے، بس منتشر جواہر پاروں کو جمع کرنے کی ضرورت ہے، اردو زبان ہی میں اتنا مواد موجود ہے کہ ہمیں عربی کتب کی طرف مراجعت کی ضرورت بہت کم پیش آئے گی، ان کتب سے استفادہ کیا جائے، اور مختلف موضوعات پر لکھی جانے والی تصنیفات وتالیفات سے استفادہ کرکے مواد اصولی انداز میں جمع کیا جائے، اور نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

مجھے امید ہے کہ آپ سب حضرات ہمت اور حوصلہ اور ولولہ کے ساتھ سنجیدہ اور غیر جذباتی انداز میں قدم آگے بڑھائیں گے، اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی کوششوں اور صلاحیتوں کو صرف اور خرچ فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرما کر قبول ومنظور فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ... ۲۴/شوال ۱۴۲۷ھ بروز جمعہ

(ماہنامہ "التبلیغ" جلد 3 شمارہ 11، دسمبر 2006ء- ذیقعدہ 1427ھ)

---

(27)

مدرسین ومعلمین کے لئے چند مفید باتیں

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کوئی درسی فن مشکل نہیں، اگر ترتیب سے ہو اور کوئی فن آسان نہیں، اگر بلا

www.idaraghufran.org

ترتیب ہو، بس یہ چیز مفقود ہے، مدرسین اور متعلمین دونوں میں (چند سطور کے بعد فرماتے ہیں) آج کل بعضے مدرسین خود ہی کچھ محنت نہیں کرتے، بے پروائی کے ساتھ بے ترتیب تقریریں کرتے ہیں" (حسن العزیز، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۱۷ ص ۴۴، ملفوظ نمبر ۴۲۳، بعنوان "درسِ نظامی کے مشکل و آسان ہونے کا راز" ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر ۱۴۲۵ھ)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے مختلف موقعوں پر مدرسین و معلمین کے لئے اس قسم کی قیمتی اور مفید ہدایات بیان فرمائی ہیں، جو بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ کوئی بھی شعبہ روایتی اور رسمی انداز میں نہیں ہونا چاہئے، بلکہ ہر شعبہ میں اس کی حقیقت اور اصل مقصود کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے، درس وتدریس کا مشغلہ بھی رسمی اور روایتی چیز سمجھ کر اختیار نہیں کرنا چاہئے۔

کتاب اصل مقصود نہیں ہوا کرتی، اصل مقصود اس کتاب کا مضمون اور وہ فن ہوا کرتا ہے، جس فن سے اس کتاب کا تعلق ہے، اس کتاب کے الفاظ اور ظاہری عبارت اصل مقصود نہیں ہوا کرتی۔

اگر کتاب کی عبارت میں اغلاق اور پیچیدگی ہو، تو پڑھانے والے کو ایسے انداز اور ایسی ترتیب سے پڑھانا چاہئے کہ اس کا مضمون بہتر طریقہ پر حل ہو جائے، لکیر کا فقیر نہیں بننا چاہئے۔

سبق پڑھانے سے پہلے جو کچھ پڑھانا ہے، اس کی ترتیب ذہن میں بٹھا لینی چاہئے، اور سبق پڑھانے کی ایسی ترتیب بنانی چاہئے، جس سے وہ مضمون ایسے طریقہ پر حل ہو جائے کہ وہ طلبہ کو پوری طرح ذہن نشین ہو جائے، اگر آسان ترتیب کے ساتھ سبق اچھی طرح پڑھا دیا جائے، تو وہ ایسا ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ پوری زندگی اس کا خاکہ ذہن سے نہیں نکلتا، خواہ وہ مضمون کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو اور اگر ترتیب کے بغیر الٹ سلٹ پڑھا دیا جائے، اس کو صحیح طرح منضبط نہ کیا جائے، تو وہ مضمون اولاً تو ذہن میں بیٹھتا ہی نہیں ہے، اور اگر بیٹھ بھی جاتا ہے، تو وہ دیرپا نہیں ہوتا، خواہ وہ مضمون کتنا ہی سہل کیوں نہ ہو۔

آج کل ایک خرابی یہ ہے کہ **الاھم فالاھم** کالحاظ نہیں ہوتا، کتاب تو کسی فن کی ہوتی ہے اور بحث دوسرے فن کی کی جاتی ہے، مثلاً کتاب تو ہے فقہ کی اور سارا زور نحوی صرفی، یا منطقی بحث پر لگایا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل فن اور اصل مقصود حاصل نہیں ہوتا، اور کیونکہ وہ کتاب اس فن کی ہوتی نہیں، جس پر سارا زور لگایا جاتا ہے، اس لئے وہ بحث بھی لاحاصل ہو جاتی ہے، کیونکہ کتاب لکھنے والے کے پیش نظر وہ فن اور اس کے اصول ہوتے ہی نہیں، جس فن کے اعتبار سے بحث ہو رہی ہوتی ہے، اس لئے جب مصنف کے پیش نظر وہ فن نہیں ہے، جس سے بحث کی جا رہی ہے، تو اس فن کی بحثوں میں الجھنا کیا سود مند ہو سکتا ہے، بلکہ اس سے تو زیادہ نقصان کا خدشہ ہے۔

اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھنا چاہئے کہ مثلاً اردو زبان میں کسی نے ایک موضوع پر کوئی کتاب لکھی، اب اس مصنف کے سامنے اور اس کے پیش نظر وہی موضوع ہے، دوسرا موضوع نہیں، مثلاً مسئلہ فقہ کا بیان کیا گیا ہے، تو لکھنے والے کے پیش نظر اردو کی نحو وصرف اور گرائمر نہیں ہے، اب اس عبارت میں اگر کوئی اصل موضوع کو چھوڑ کر گرائمر کے قواعد اس پر منطبق کرنا شروع کر دے، تو ظاہر ہے کہ اس سے ایک طرف تو اصل موضوع ومقصود سے محرومی ہو جائے گی، اور دوسرے گرائمر کے مسائل بھی حل نہ ہوں گے۔

آج کل ہمارے یہاں عربی زبان کی کتاب کی عبارت پر سارا زور لگایا جاتا ہے، لیکن جس فن کی کتاب ہے، اس فن کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا، اور وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ طلبہ کی عربی باعتبار نحو وصرف کے کمزور ہے، اس کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے، تو ظاہر ہے کہ اس طریقہ سے وہ فن حل نہیں ہوتا، اور عربی اور نحو وصرف کی کمزوریاں اس لئے دور نہیں ہوتیں کہ یہ اس کتاب کا موضوع نہیں۔

تو کتاب کو بحیثیتِ فن پڑھانا چاہئے، اب ہوتا یہ ہے کہ آج کل طلبہ کی عربی کمزور ہوتی ہے، جس کی وجہ سے انہیں عربی عبارت کے ذریعہ سے سبق کو حل کرنا مشکل ہوتا ہے، اور وہ کتاب کے اصل فن کو بھی حل نہیں کر پاتے، ایسے وقت ضرورت تھی کہ اس فن کو سہل زبان میں پڑھا دیا

جاتا، کیونکہ فن تو خود مقصود ہوتا ہے۔

مثلاً اگر آج کسی کو عربی زبان کی کتاب سے فقہ کے مسائل مشکل معلوم ہوں، تو اسے اردو زبان میں لکھے ہوئے فقہ کے مسائل پڑھانا چاہئے، تاکہ اسے مسائل کا علم ہو۔

اگر ایسے وقت عربی پر ہی زور رکھا جائے گا، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کو فقہ کے مسائل نہیں آسکیں گے، اسی طرح منطق وغیرہ کے فنون کو سمجھ لینا چاہئے۔

اسی سلسلہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو کام آسانی سے ہو سکے، اس کو دشواری کے طریقہ سے نہیں کرنا چاہئے، حدیث میں ہے:

''مَا خُيِّرَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ اَمْرَيْنِ اِلَّا اِخْتَارَ اَيْسَرَهُمَا'' [1]

یہ سلامت طبع کی دلیل ہے کہ ہمیشہ آسانی کی طرف جاوے، جب دونوں شقیں برابر ہوں، یعنی ہر طرح ثواب میں بھی مصلحت میں بھی، غرض ہر طرح یکساں ہوں، تو آسان شق کو اختیار کرنا چاہئے، باوجود تساوی کے پھر بھی مشکل میں پڑنا، اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے (چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں) مثلاً کوئی عبارت پیچدار ہی لکھنے کی فکر میں رہتے ہیں، بھلا فضول اپنے آپ کو غور وفکر کی مشقت میں ڈالنے سے کیا حاصل'' (حسن العزیز، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۶ص۱۷۰، ملفوظ نمبر۱۷۶، بعنوان ''سلامتی فطرت'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر۱۴۲۵ھ)

درس وتدریس اور تعلیم وتعلم سے متعلق آج کل ایک خرابی یہ ہے کہ فن سے زیادہ کتاب کو اہمیت دی جاتی ہے۔

---

[1] عن عائشة رضی الله عنها أنها قالت ما خير رسول الله صلى الله عليه وسلم بين أمرين إلا أخذ أيسرهما ما لم يكن إثما فإن كان إثما كان أبعد الناس منه وما انتقم رسول الله صلى الله عليه وسلم لنفسه إلا أن تنتهک حرمة الله فينتقم لله بها(صحيح البخاری، رقم الحديث ۳۵۶۰)

www.idaraghufran.org

اور اگر کتاب کا مضمون قابل اصلاح ہو، یا قابل فہم نہ ہو، تو بجائے اس کے کہ کوئی اور راستہ فن کو حل کرنے کا تلاش کیا جائے، اس کو ہی مِــنْ وَعَــنْ پڑھایا جاتا ہے، اور اس کی اصلاح وقابلِ فہم بنانے کے لیے شروحات سے مدد لی جاتی ہے، آج کل اکثر کتابیں ایسی ہیں، یا ان کو ایسے انداز میں پڑھایا جاتا ہے کہ طلبہ اور اساتذہ دونوں ہی شرح کے بغیر اس کتاب کے مضمون کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

اور پھر ایک شرح سے کام نہیں چلتا، تو ایک سے زیادہ شروحات سے مدد حاصل کی جاتی ہے، حالانکہ اگر کوئی کتاب بغیر شرح کے سمجھنا، سمجھانا مشکل ہے، تو اس کتاب کو بدل کر اس کی جگہ ایسی کتاب تجویز کرنی چاہئے، جو بغیر شرح کے پڑھائی جاسکے۔

اگر کوئی کتاب ایسی ہو کہ وہ کسی ایسے زمانہ میں لکھی گئی ہو کہ اس دور کے تقاضے اور حالات کچھ اور تھے، اور بعد میں وہ حالات اور تقاضے بدل گئے، تو ایسی صورت میں ایسی کتاب کے بجائے، اس کتاب کو پڑھانا زیادہ مفید ہے، جس میں موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو ملحوظ اور پیش نظر رکھا گیا ہو، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس زمانے اور جس دور میں کوئی مصنف اور مؤلف کتاب لکھتا ہے، اس دور میں ایک مسئلہ معرکۃ الآ را حیثیت کا حامل ہوتا ہے، اس لئے اُس وقت اس مسئلہ پر زیادہ بحث کی ضرورت ہوتی ہے، یا کسی زمانے میں ایک مسئلہ نظری ہوتا ہے، اس لئے بھی اس پر زیادہ کدوکاوش کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن مابعد کے زمانہ میں وہ مسئلہ لوگوں کے خاص مزاج و مذاق، یا ماحول اور عرف کی وجہ سے، یا اس مسئلہ کی غیر معمولی تبلیغ واشاعت ہونے کی وجہ سے اس درجہ کا نظری نہیں رہتا، اس لئے اب اس پر دلائل قائم کر کے صلاحیتوں اور وقت کو خرچ کرنے کی اتنی ضرورت نہیں رہتی، کسی زمانہ میں کوئی مسئلہ بدیہیات میں سے ہوتا ہے، کیونکہ اس چیز کا رواج اور عرف ہونے، یا اس مسئلہ کی غیر معمولی تبلیغ واشاعت ہوجانے کی وجہ سے، لوگوں کو اس مسئلہ سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

لہٰذا اس زمانہ کے مصنف اور مؤلف کے نزدیک اس مسئلہ پر زیادہ روشنی ڈالنے، اور دلائل

قائم کرنے ، بلکہ بعض اوقات اس مسئلہ سے تعرض کرنے کی ہی ضرورت نہیں ہوتی ، لیکن مابعد کے زمانہ میں وہ مسئلہ اس مذکورہ رواج اور عرف کے بدل جانے ، یا علم کی کمزوری وغیرہ کے باعث نظری درجہ میں داخل ہو جاتا ہے، اور اب اس کی تبلیغ واشاعت کی ، یا اس پر دلائل وغیرہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔

جیسا کہ تفسیروں کا معاملہ ہے کہ جس دور میں جس قسم کے فتنے رونما ہوئے ، اور جس قسم کی ضرورت وحالت پیش آئی ، مفسرین نے اپنے دور میں تفسیر اسی انداز کی لکھی کہ اس دور کے فتنوں کا قلع قمع ہو سکے، اور اس دور کی ضرورت وحالت کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکے، یہی وجہ ہے کہ ایک کتاب کسی دور میں تو بہت زیادہ مقبول اور نمایاں سمجھی جاتی ہے، لیکن مابعد کے زمانہ میں اس کی وہ شان باقی نہیں رہتی۔

اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے۔

ہماری پرانی فقہ کی کتابوں میں غلام اور باندیوں کے موضوع پر تفصیل سے ابواب قائم کر کے بحث کی گئی ہے، اور مُکَاتَب، مُدبَّر، اِمِ ولد وغیرہ کے مسائل کو الگ الگ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، یہ ساری بحث فقہ کی کتابوں میں پڑھائی جاتی ہے۔

مگر شاید آج کل کسی عالم کو ساری زندگی بھی ان مسائل سے سابقہ نہ پڑتا ہو، اگرچہ ان مسائل کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ کیا اس دور کے اور مسائل ایسے نہیں رہے کہ ان کو چھوڑ کر ان ہی مسائل کی تعلیم وتعلم کی زیادہ ضرورت ہے۔

غلام اور باندیوں کی بحثیں پہلے دور میں اس لئے زیادہ اہمیت کی حامل تھیں کہ غلام اور باندیوں کا مسلمانوں کے معاشرہ میں عام رواج تھا، اور تقریباً ہر کس وناکس کو ان کے مسائل سے سابقہ پڑتا تھا، مگر آج دنیا میں شرعی غلام اور باندیوں کا رواج ہی مفقود ہے، کیونکہ شرعی جہاد ہی کا ایک عمومی انداز میں فقدان پایا جاتا ہے۔

پہلے زمانہ میں شرعی غلام اور باندی کی تعریف اور ان کی حقیقت سے آگاہ کرنے کی اتنی

ضرورت نہ تھی، لیکن ان مسائل کی ضرورت تھی، مگر آج کل غلام اور باندیوں کے تفصیلی احکام کے بجائے شرعی غلام اور باندیوں کی تعریف، ان کی حقیقت، اور ان پر وارد ہونے والے اعتراضات وشبہات، اور ان کے جوابات اور آج کے دور میں کافروں کے ساتھ غلام اور باندی نہ بنانے کے معاہدہ ہونے کے تناظر میں، غلام اور باندی شرعاً بنانے کے جواز وعدم جواز وغیرہ کی بحثوں کی زیادہ ضرورت ہے۔

اس قسم کی بحثیں سابقہ نصابی کتب میں نایاب، یا کم یاب ہیں، اسی طرح سیاست، جہاد، فلسفہ اور سائنس کے بے شمار مسائل کی حالت ہے،، اسی طرح کسی دور میں ایک مسئلہ کا عرف اور ہوتا ہے، اور دوسرے زمانہ میں عرف بدل جاتا ہے، تو جو مسائل عرف پر مبنی ہوتے ہیں، ہر مصنف ومؤلف اپنے دور کے عرف ورواج کے مطابق مسئلہ کی نوعیت بیان کرتا ہے، لیکن بعد کے زمانہ میں عرف بدل جانے کی وجہ سے اس مسئلہ کی وہ نوعیت بدل جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس مسئلہ کے جواز، یا عدمِ جواز کا مذکورہ حکمِ خاص بھی بدل جاتا ہے۔

اب اگر اسی سابقہ عرف والی کتاب سے مسئلہ کی تعلیم وتدریس کی جائے گی، تو یا تو مسئلہ غلط پڑھا دیا جائے گا، اور اگر زیادہ محنت اور کوشش کی جائے گی، تو بھی پہلے کتاب کے مطابق مسئلہ کی تقریر کرنی پڑے گی، اور پھر عرف بدل جانے کی وجہ سے، اسی مسئلہ کی تردید کرنی ہوگی، تو اس دوہری محنت کے بجائے اگر اپنے دور کے عرف کے مطابق ہی سیدھا سیدھا مسئلہ پڑھا دیا جاتا، تو وقت بھی کم خرچ ہوتا، اور معلم ومتعلم کا ذہن بھی غیر معمولی مشوش نہ ہوتا۔

اس دور میں معاملات ومعاشیات اور سیاست کے میدانوں میں اتنا تنوع پیدا ہو گیا ہے کہ سابقہ ادوار کی کتب اس کے لئے ناکافی ہیں۔

اگر وہی کام اختیار کیا جائے گا، جس کو لکیر کا فقیر ہونا کہتے ہیں، اور بس پکی پکائی جیسی بھی ہو، باسی، اور جلی ہوئی، اسی کو کھانے کی جستجو میں لگے رہیں گے، اور خود سے تازہ پکانے کی کوشش نہیں کریں گے، تو ضرور پیٹ خراب ہوگا، اور اس طرح مسائل حل نہیں ہوں گے۔

جبکہ آج کے دور میں تو اس دور کے تقاضوں کے مطابق کتب کی تجویز، بلکہ تالیف وتصنیف سب کام ہی بہت آسان ہو گئے ہیں، پہلے دور میں یہ آسانیاں نہیں تھیں۔

کیونکہ پہلے زمانہ میں ایک مقام کی تصنیف شدہ کتاب کا دوسرے علاقہ تک پہنچنا آسان کام نہ تھا، ایک علاقہ کے عالم کا دوسرے علاقہ کے عالم سے رابطہ آسان نہ تھا، نشرواشاعت اور طلب ورسد کے اتنے انتظامات نہ تھے، جتنے آج کل موجود ہیں، کتب کا اتنا ذخیرہ موجود نہ تھا جتنا آج کے دور میں موجود ہے، وفاق کی سطح پر ادارے قائم نہ تھے کہ ہزاروں لاکھوں مدارس اور علماء ایک نصابِ تعلیم کے نظام کے ساتھ وابستہ ہوں، بلکہ عام طور پر درجہ بندی کے ساتھ درس وتدریس کا اتنا رواج بھی نہ تھا۔

مگر آج جبکہ یہ سب چیزیں اور یہ سب سہولیات موجود ہیں، اس کے باوجود بھی جدید دور کے تقاضوں اور حالات کو پیش نظر رکھ کر نصاب کی تجویز اور ترتیب قائم نہ کرنا، اور نئی کتب کی تالیف وتصنیف کے بجائے سارا زور پرانے دور کی کتب کی شروحات وحواشی پر خرچ کر کر کے نصاب کو طول دیتے رہنا، کہاں کی عقل مندی ہوگی۔

مگر افسوس کہ آج ہم اس میدان میں بہت پیچھے ہیں، عصری اور دنیاوی تعلیم گاہوں کے اہلِ حل وعقد نے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر کتب کی تجویز وترتیب اور تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے، مگر ان کے مقابلہ میں اہلِ علم حضرات بہت پیچھے ہیں۔

ہمارے ملک میں وفاق کا دینی مدارس بورڈ کو قائم ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے، جبکہ اس بورڈ کے لئے یہ کام کوئی بھی مشکل نہیں تھا، کیونکہ کسی ایک فرد کے مقابلہ میں پوری جماعت اور ادارہ کو کام کرنا زیادہ سہل ہوا کرتا ہے، پورے ملک میں ہر فن وعلم کے علماء اور رجال موجود ہیں، فقہ کے بھی، منطق کے بھی، علمِ کلام کے بھی، علمِ تفسیر کے بھی، اسماءُ الرجال کے بھی، اور اسی طرح دوسرے فنون اور موضوعات کے ماہرین اور اسپیشلسٹ موجود ہیں، اگر نظم وضبط کے ساتھ ان سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیا جاتا، تو یہ بورڈ پورا نصاب اس دور کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کرسکتا تھا۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے خول سے نکلنے کی توفیق عطاء فرمائے، اور ہمیں اپنے دور کے تقاضوں کو سمجھنے، اور اس کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین... ۲۷شوال ۱۴۲۷ھ بمطابق 21 نومبر 2006ء، بروز منگل

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 3 شمارہ 12، جنوری 2007ء - ذی الحجہ 1427ھ۔ وجلد 4 شمارہ 1، 2، فروری، مارچ 2007ء- محرم، صفر 1428ھ)

---

(28)

طالبِ علم اور طالبِ دنیا کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا

معزز طلبۂ کرام! اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو دین کے عظیم الشان اور مہتم بالشان علم کے حاصل کرنے میں مشغول کردیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل وکرم ہے۔

ہمیں ساری زندگی کے لیے دین کے علم میں مشغولی کا ارادہ کرنا چاہیے، اور پھر اس کے مطابق عمل بھی کرنا چاہیے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ، مَنْهُوْمٌ فِيْ عِلْمٍ لَا يَشْبَعُ، وَمَنْهُوْمٌ فِي دُنْيَا لَا يَشْبَعُ (المستدرک علی الصحیحین، للحاکم، رقم الحدیث ۳۱۲، کتاب العلم) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو حریص آدمیوں کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا، ایک علم کے حریص کا پیٹ نہیں بھرتا، اور دوسرے دنیا کے حریص کا پیٹ نہیں بھرتا (حاکم)

---

[1] قال الحاكم: هذا حديث صحيح على شرط الشيخين، ولم يخرجاه ولم أجد له علة وقال الذهبي في التلخيص: على شرطهما ولم أجد له علة.

www.idaraghufran.org

مطلب یہ ہے کہ طالبِ علم اور طالبِ دنیا دونوں ایسے ہیں کہ وہ ساری زندگی اپنی اپنی طلب میں لگے رہیں، اور اپنے مطلوب کو حاصل کرنے میں مصروف اور مشغول رہیں، مگر اس کے باوجود ان دونوں کو شکم سیری حاصل نہیں ہوتی، اور ان دونوں کی طلب کبھی پوری اور ختم نہیں ہوتی۔

اور طالبِ علم کے لئے تو یہ اچھی صفت اور صحت کی نشانی ہے، لیکن طالبِ دنیا کے لئے بری صفت اور مریض ہونے کی نشانی ہے۔ [1]

لہٰذا ایک سچے طالب علم کی شان یہ ہونی چاہئے کہ زندگی بھر اس کے علم کی پیاس ختم نہ ہو، خواہ وہ اصطلاحی طالب علم ہو، اور متعلم بن کر پڑھ رہا ہو، اور خواہ وہ اصطلاحی طالب علمی کے دور سے گزر گیا ہو، اور معلّم واستاذ بن چکا ہو، ہر حالت میں اس میں علم کی طلب برقرار رہنی چاہئے، اور اگر کسی طالب علم کی علم کی طلب کا شوق پورا ہو گیا، اور علم کی طلب باقی نہیں رہی، تو وہ حقیقی طالب علم نہیں۔

اس حدیث سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ طالبِ علم اور طالبِ دنیا دو الگ الگ اور ایک دوسرے کے مدمقابل اشخاص وافراد ہیں، جو طالبِ علم ہوگا، وہ طالبِ دنیا نہ ہوگا، اور جو طالبِ دنیا ہوگا، وہ طالبِ علم نہ ہوگا۔

لہٰذا جو طالبِ علم ہو کر طالبِ دنیا ہو، وہ حقیقی طالبِ علم نہیں۔

اور ایک بات اس حدیث میں قابل غور یہ ہے کہ طالبِ علم کو حدیث میں پہلے بیان فرمایا، اور طالبِ دنیا کو بعد میں بیان فرمایا، جس کی وجہ یہ ہے کہ اصل قابلِ توجہ چیز علم کی طلب ہے، دنیا

---

[1] (وعنه) : أى :عن أنس (أن النبى -صلى الله عليه وسلم -قال :(منهومان) : حريصان على تحصيل أقصى غايات مطلوبيهما، وفى النهاية النهمة :بلوغ الهمة فى الشىء (لا يشبعان) : أى لا يقنعان (منهوم فى العلم لا يشبع منه) : لأنه فى طلب الزيادة دائما لقوله تعالى :(وقل رب زدنى علما) (سوره طٰهٰ :) وليس له نهاية إذ فوق كل ذى علم عليم (ومنهوم فى الدنيا) : أى فى تحصيل مالها وجاهها (لا يشبع منها) : فإنه كالمريض(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج ١، ص ٣٢٩، كتاب العلم)

www.idaraghufran.org

کی طلب نہیں، علم کی طلب اچھی خصلت ہے، اور دنیا کی طلب اس کے مقابلہ میں گھٹیا ہے۔

اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث کے ان جملوں کے ساتھ یہ اضافہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ:

یہ دونوں برابر نہیں ہیں؛ طالبِ دنیا کی تو سرکشی اور ضلالت وبدبختی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور طالبِ علم رضائے الٰہی کے حصول میں آگے بڑھتا رہتا ہے۔

پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دونوں باتوں کی تائید میں یہ آیات پڑھیں:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى. اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (سورة العلق ، رقم الآيات ٦ و٧)

یعنی انسان بڑا سرکش اور سر چڑھا ہے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (سورة فاطر، رقم الآية ٢٨)

یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کے علم والے بندے ہی ڈرتے ہیں۔ [1]

اس طرح کی حدیث دوسری سندوں سے بھی مروی ہے، اور بعض سندیں اگرچہ ضعیف ہیں، لیکن ایک دوسرے کی تائید کرنے کی وجہ سے مجموعی طور پر معتبر ہیں۔ [2]

---

[1] أخبرنا جعفر بن عون، أنبأنا أبو عميس، عن عون، قال: قال عبد الله رضى الله عنه، "منهومان لا يشبعان: صاحب العلم، وصاحب الدنيا، ولا يستويان .أما صاحب العلم، فيزداد رضا للرحمن، وأما صاحب الدنيا، فيتمادى فى الطغيان، ثم قرأ عبد الله "كلا إن الإنسان ليطغى أن رآه استغنى "قال: وقال الآخر: "إنما يخشى الله من عباده العلماء" (سنن الدارمی،رقم الحديث ٣٤٤،باب فی فضل العلم والعالم)

قال المحقق حسين سليم أسد الدارانى: إسناده منقطع :عون بن عبد الله بن عتبة أرسل عن ابن مسعود وهو مرسل(حاشية سنن الدارمى)

حدثنا إبراهيم العبسى، حدثنا جعفر بن عون، عن أبى العميس، عن القاسم قال: قال عبد الله: " منهومان لا يشبعان: طالب العلم، وطالب الدنيا، ولا يستويان: أما طالب العلم: فيزداد رضا الله الرحمن، وأما صاحب الدنيا: فيزداد فى الطغيان .ثم قرأ: "كلا إن الإنسان ليطغى ،أن رآه استغنى" (معجم شيوخ ابن الاعرابى ،رقم الحديث ١٠٠٩، حرف الهمزة، تحت ترجمة "إبراهيم بن عبد الله العبسى")

[2] حدثنا يوسف بن موسى، قال :حدثنا جرير، عن ليث، عن طاووس، أو مجاهد، عن ابن عباس رفعه قال :منهومان لا يشبعان طالب علم وطالب دنيا.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

بہر حال جو صحیح معنیٰ میں طالب علم ہوتا ہے، وہ ہمیشہ علم کی طلب وجستجو میں لگا رہتا ہے، جس طرح بھوکا اور پیاسا شخص اس وقت تک کھاتا پیتا رہتا ہے، جب تک اس کی بھوک اور پیاس ختم نہ ہو۔

اور کھانے پینے کی خواہش تو ایک وقت میں کھاتے کھاتے مکمل ہو جاتی ہے، مگر علم اور دنیا کی طلب کی خواہش مکمل نہیں ہوتی، لہٰذا جس چیز کی خواہش مکمل نہیں ہوتی، اس کے حصول اور جستجو کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہوتا۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس دعاء کی تلقین فرمائی ہے۔

''رَبِّ زِدُنِیُ عِلُماً''

''اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرمادیجئے''

اور یہ دعاء ہر مسلمان کو مانگنے کی تلقین فرمائی گئی ہے، خواہ کوئی جاہل ہو، یا عالم ہو، اور جوان ہو، یا بوڑھا ہو، اور پھر کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو، یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل ہوا، اور سب سے پہلے اس دعاء کا براہِ راست خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہوا کہ ''قُلُ رَّبِّ زِدُنِیُ عِلُماً'' آپ یہ کہئے کہ اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما دیجئے''

تو جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت جن کے بارے میں کیا خوب کہا گیا ہے کہ ع

''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وكان ليث قد أصابه شبه الاختلاط ولم يثبت ذلك عنه فقد بقى فى حديثه لين بذلك السبب وهذا الحديث لا نعلمه يروى عن النبى صلى الله عليه وسلم من وجه أحسن من هذا الوجه(مسند البزار،رقم الحديث ٤٨٨٠)

قال السخاوى:

وفى الباب عن ابن عمر وأبى هريرة، وهى وإن كانت مفرداتها ضعيفة فمجموعها تقوى(المقاصد الحسنة فى بيان كثير من الأحاديث المشتهرة على الألسنة،ص ٦٧٩،حرف الميم)

کو بھی اس دعاء کی تعلیم دی گئی ہے، جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے خزانۂ علم کی وسعت کے مقابلہ میں بہت محدود ہے۔

تو اس کے بعد اب کسی انسان کی کیا مجال ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ میرا علم کامل اور مکمل ہو چکا ہے، اور اب مجھے مزید علم کی ضرورت نہیں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسے علم کی طلب والا بنا دے کہ جنت میں پہنچنے سے پہلے ہمارے دین کے علم کی بھوک ختم نہ ہو۔

میرے عزیز طالب علم بھائیو! علم بہت بڑی دولت اور نعمت ہے، جس کو حاصل کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے، جتنا کہ ہم نے سمجھا ہوا ہے، کیونکہ جتنی بڑی دولت ہوتی ہے، اس کو حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔

اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کیا ہم حدیث میں بیان کئے ہوئے اس معیار پر پورے اتر رہے ہیں، یا نہیں؟ اس کا پتہ ہم اپنی حالت اور اپنے عمل سے اچھی طرح چلا سکتے ہیں؟

کیا ہم دین کے علم کی طلب اور جستجو میں اسی طرح راغب و طالب نظر آتے ہیں، جس طرح ایک بھوکا کھانے اور پیاسا پینے کی طلب اور جستجو میں راغب نظر آیا کرتا ہے، یا جب ہمیں بھوک پیاس لگی ہوئی ہو، اس وقت کھانے پینے کی طرف رغبت کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اور دین کے علم کے متعلق ہماری کیا کیفیت ہے؟

پس ہماری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ:

> سچا طالبِ علم وہ ہے، جسے دین کے علم کی دُھن ہو، بس ہر وقت اپنے علم میں اضافہ کی فکر اور جستجو میں لگا رہے، اپنے قیمتی اوقات کو فضول باتوں اور کاموں میں ضائع نہ کرے، بلکہ دین کے علم میں مشغول و مصروف رکھے۔

۲۹ شوال ۱۴۲۷ھ بمطابق 22 نومبر 2006ء بروز بدھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 4 شمارہ 3، اپریل 2007ء - ربیع الاول 1428ھ)

Idaraghufran

www.idaraghufran.org

(29)

مقتدَر ومقتداء علماء کو سنجیدہ طرزِ عمل کی ضرورت

اہلِ علم حضرات کے لیے یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ وہ عوام کے مقتداء اور قائد ہوتے ہیں، ان کے قول وفعل کے عوام پر اچھے اور بُرے اثرات پڑتے ہیں، اور عوام کی اصلاح وفساد میں علمائے کرام کے کردار کا خاص دخل ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے علمائے کرام اور اہلِ علم حضرات کے لیے شریعت کی طرف سے بعض ایسی حدود وقیود مقرر کی گئی ہیں، جو عوام کے لیے نہیں ہیں۔

اس لیے اہلِ علم حضرات کو چاہیے کہ وہ اپنے قول وفعل میں انتہائی احتیاط کا لحاظ فرمائیں۔

اور ہمہ وقت اس پر نظر رکھیں کہ ان کے کسی قول اور فعل سے عوام کی اصلاح وفساد کے حوالہ سے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

خصوصاً وہ اہلِ علم حضرات جن کا ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عوام کے بڑے طبقہ سے واسطہ پڑتا ہے، مثلاً آج کل کی سیاست میں مشغول اہلِ علم حضرات بطورِ خاص اس امر کو ملحوظ رکھنے کے لائق ہیں۔

اس کا اندازہ آپ حضرات کو ایک واقعہ سے اچھی طرح ہوسکتا ہے، جو میرے ساتھ پیش آیا، اور اس کی صورت ایک مکالمہ کی سی بن گئی۔

وہ یہ کہ ایک مرتبہ آج سے کئی سال پہلے ''متحدہ مجلس عمل'' قائم ہونے کے زمانے میں، جمعہ کی نماز سے فراغت کے بعد میرے پاس ایک اجنبی شخص تشریف لائے، اور انہوں نے اعتراض کے انداز میں سوال کیا کہ:

آج تک تو آپ حضرات، اہلِ تشیع حضرات کو کافر قرار دیتے تھے، اور ''کافر کافر شیعہ کافر'' کے نعرے لگاتے تھے، اور اب فلاں سیاسی اتحادی مجلس بنا کر ان کے

Idara Ghufran

پیچھے جماعت سے نماز بھی پڑھنے لگے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا کافر کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

میں نے ان صاحب کی پوری گفتگو سُن کر ان سے عرض کیا کہ:

نہ تو ہم پہلے تمام اہلِ تشیع کو علی العموم اور علی الاطلاق کافر قرار دیتے تھے، نہ ان کے کفر کے نعرے لگاتے تھے، بلکہ ہم تو یہ کہتے تھے کہ جس میں فلاں فلاں (مثلاً حفاظتِ قرآن کا انکار، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر نعوذ باللہ غلط کاری کا الزام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معبود اور الٰہ سمجھنے کی) کفریہ وجوہات موجود ہوں، وہ کافر ہے اور جس میں کفر کی وجوہات نہ پائی جاتی ہوں، وہ کافر نہیں ہے۔

اور کفر کی یہ وجوہات، تمام اہلِ تشیع میں نہیں پائی جاتیں۔

اور اب بھی ہم یہی بات کہتے ہیں، جو مؤقف ہمارا اہلِ تشیع کے بارے میں پہلے تھا، وہی مؤقف اب بھی ہے۔

رہا فلاں سیاسی اتحادی مجلس کا معاملہ، تو اس مجلس کے بنانے، اور قائم کرنے سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے، اور رہا نماز کا مسئلہ تو ہم نے آج تک کسی اہلِ تشیع کی اقتداء میں نماز نہیں پڑھی۔

لہٰذا آپ نے ان باتوں کی ہماری طرف نسبت کیونکر کر دی؟

اس کے جواب میں ان صاحب نے کہا کہ:

میری مراد خاص آپ کی ذات، یا آپ کی شخصیت نہیں ہے، بلکہ آپ کے بڑے اور وہ مشائخ وسرپرست حضرات ہیں، جنہوں نے یہ کام کیے ہیں۔

میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ:

نہ وہ ہمارے پیر ہیں، اور نہ سرپرست ہیں، آپ نے ان کو ہمارا شیخ اور سرپرست کیسے قرار دے دیا، اور اس کی بھی دلیل درکار ہے کہ ان کاموں کی ان کی طرف

نسبت کرنے میں کس قدر صداقت ہے۔

یہ سُن کر وہ صاحب کہنے لگے کہ:

مجھے تو یہ بات معلوم نہیں کہ وہ آپ کے سرپرست ہیں، یا نہیں ہیں، آپ کے شیخ ہیں، یا نہیں ہیں، اور آپ کا اور ان کا مؤقف ایک ہی ہے، یا نہیں ہے، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ آپ کا اور فلاں فلاں عالم حضرات کا (جن کا فلاں سیاسی اتحادی مجلس میں اہم کردار ہے) ایک ہی مسلک ہے، اور وہ جو کچھ کہتے، اور کرتے ہیں، وہ اس مسلک کے سب علماء کی ترجمانی ہوتی ہے۔

میں نے ان صاحب کو اس کے جواب میں کہا کہ:

جب آپ کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ وہ حضرات میرے سرپرست اور شیخ ہیں بھی، یا نہیں؟ تو معلوم ہونے سے پہلے آپ نے کیسے حکم لگا دیا، اگر آپ کو اس کا علم نہیں تھا، تو آپ کو معلوم کرنا چاہیے تھا، اور جب معلوم ہو جاتا، اس کے بعد آگے کوئی بات اس کے مطابق کرنی چاہیے تھی، اسی کے ساتھ آپ کو میرے موقف کا مجھ سے معلوم کرنا چاہیے تھا، تب کوئی بات اس سے متعلق آپ کو کرنی چاہیے تھی۔

رہا مسلک کا ایک ہونا، تو کسی بھی عالم کے قول وفعل کو اس مسلک کا ترجمان نہیں سمجھنا چاہیے، وہ الگ بات ہے کہ عالم کو اپنے قول وفعل میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے، لیکن اگر کوئی عالم احتیاط نہیں کرتا، تو بھی عوام کو تحقیق کرنا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں شریعت کا حکم کیا ہے؟ اور کیا نہیں؟

اس پورے سوال وجواب بلکہ مکالمے کے بعد ان صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور بات ختم ہوئی۔

اس واقعے کا مطالعہ کرنے سے یقیناً یہ چیز واضح ہوگئی ہوگی کہ اہلِ علم حضرات خاص کر قائدین وسیاسی علماء کے کردار کا پورے معاشرے پر کیا اثر پڑتا ہے؟

یہ واقعہ تو بطورِ مثال اور نمونہ کے پیش کیا گیا، ورنہ تو ایسے سینکڑوں نہیں، ہزاروں واقعات ہیں، جو عوام الناس کی تشویش، یا تضلیل کا باعث بن رہے ہیں۔

آج کل ایک مرض یہ ہے کہ کسی واقعہ کا شرعی حکم معلوم اور تحقیق کیے بغیر اس پر مثبت، یا منفی طریقہ پر اقدام یا ردِ عمل شروع کر دیا جاتا ہے، پھر بعد میں جب بات بہت آگے، اور کہیں کی کہیں نکل جاتی ہے، اور اس واقعہ کی تحقیق ہوتی ہے، تو واقعہ کچھ اور نکلتا ہے، اور مسئلہ کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے، یا شریعت کا حکم اس بارے میں کچھ اور سامنے آتا ہے، مگر پھر لوگوں کو اپنی بات سے رجوع کرنا، اور اپنی غلطی کو تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، نفس کی تربیت واصلاح بھی اس درجہ کی نہیں ہوتی کہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں، اس لیے اس بات کو جانتے ہوئے بھی کہ ہم غلطی پر ہیں، اس غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ لوگ ہر طرح کی کوششیں کرتے ہیں اور دور دراز کی تاویلات کا سہارا لیتے ہیں، مگر یہ سب کوششیں رائیگاں ہی جاتی ہیں، اور لوگوں کو ایک نہ ایک دن ان کا غلطی پر ہونا معلوم ہو ہی جاتا ہے، اہلِ علم کے لیے یہ بات نہایت توجہ کی حامل ہے کہ وہ جذبات میں آ کر ہرگز کوئی اقدام نہ کیا کریں، بلکہ سوچ سمجھ کر، شرعی حکم معلوم کر کے اور اپنے بڑوں سے مشاورت کے بعد آگے بڑھا کریں۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 4 شمارہ 4، مئی 2007ء- ربیع الآخر 1428ھ)

---

(30)

مدرسہ سے مقصود، رضائے الٰہی ہونا چاہئے

دینی مدارس کی بنیاد اور قیام کی اصل غرض رضائے الٰہی ہے، اسی غرض کو سامنے رکھ کر دینی مدارس کا قیام واجراء ہونا چاہئے، اور اسی غرض کو سامنے رکھ کر مدارس کے معاملات کو چلانا اور آگے بڑھانا چاہئے، اس کا اثر یہ ہوگا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ کسی قدم پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والا کام نہ ہوگا، اگر اللہ نہ کرے اس سے نظر ہٹ گئی، تو پھر قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی

www.idaraghufran.org

والے کام سرزد ہوں گے، چنانچہ اگر کسی نے مدرسہ میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ اور کثرت ہی کو اپنا مقصود بنالیا، یا مدرسہ کی عالیشان عمارت ہی کو اپنا مطلوب بنالیا، یا کام کے وسیع ہونے ہی کو اپنا قبلہ وکعبہ بنالیا، تو پھر رضائے الٰہی کا حاصل ہونا مشکل ہے۔

اسی کو حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''آج کل اہلِ مدارس نے مختَرَع ثمرات کو مطلوب سمجھ رکھا ہے کہ ہمارا مدرسہ بارونق ہو، اس میں پانچ سو، ہزار طلبہ ہوں، پچاس، سو مدرس ہوں اور ایسی عمارت ہو اور ہر سال اس میں سے اتنے طلبہ فارغ ہوں اور یہ باتیں بدون زیادہ رقم کے ہو نہیں سکتیں، تو اب ہر وقت ان کی نظر آمدنی پر رہتی ہے، اور جہاں سے بھی چندہ آتا ہے، رکھ لیا جاتا ہے، واپس کرتے ہوئے یہ خیال ہوتا ہے کہ حرام اور مشتبہ مال کو واپس کرنا شروع کریں، تو اتنی آمدنی کس طرح ہوگی، جو اتنے بڑے کارخانے کو کافی ہوسکے، بس یہی جڑ ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ رضائے حق مقصود نہیں۔

اس جڑ کو اُکھاڑ پھینکو، اور ثمرات پر ہرگز نظر نہ کرو، نہ زیادہ کام کو مقصود سمجھو، بلکہ رضائے حق کو مقصود سمجھو، چاہے مدرسہ رہے، یا نہ رہے، اور اگر یہ نہیں ہوسکتا، تو پھر دین داری اور علم کا نام مت لو، نہ اللہ سے محبت کا دعویٰ کرو۔

افسوس! اللہ سے محبت اور غیر پر نظر'' (وعظ''ارضاء الحق، حصہ دوم'' مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت، جلد ۱۵، ص ۹۰، ۹۱، بعنوان: ''تسلیم ورضا'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ)

ثمرات مقصود نہیں ہیں، صرف رضائے حق مقصود ہے، نہ مدرسہ مقصود ہے، نہ طلبہ کی کثرت مطلوب ہے، نہ عمارت مقصود ہے، صرف رضا مطلوب ہو، اگر رضائے حق کے ساتھ یہ کام چلتے رہیں، تو چلاؤ، اور حسبِ ہمت وطاقت ان میں کام کرتے رہو، اور جو کام طاقت سے زیادہ ہو، اُس کو الگ کرو...... مدرسہ جاری کرو

www.idaraghufran.org

اور رضائے حق پر نظر رکھو، یہ ثمرہ متعین نہ کرو کہ ہمارا مدرسہ ایسا ویسا ہونا چاہیے، یہ دُھن کہاں کی لگائی؟ یہ دُھن نہیں، بلکہ گھن ہے (وعظ ''ارضاء الحق، حصہ دوم'' مشمولہ: خطباتِ حکیم الامت، جلد ۱۵، ص ۹۱، ۹۲، بعنوان: ''تسلیم ورضا'')

حضرت موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''اکثر عربی مدرسوں میں طلبہ کی خواہش ومذاق اور کثرتِ تعداد کے مقابلہ میں اصول وقواعد کی پرواہ کم کی جاتی ہے، اس سے بھی مفاسد پرورش پاتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ طلبہ کو قواعد کا پابند بنایا جائے، خواہ اِن کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو جائے، کام کے دو چار، ناکارہ سو دوسو سے افضل ہیں'' (العلم والعلماء، ص ۱۲۷، بحوالہ تجدید تعلیم ص ۱۲۸، باب: ۵، فصل نمبر ۱، بعنوان ''طلبہ کو قواعد کا پابند بنایا جائے'' ناشر: ادارہ افاداتِ اشرفیہ، ہتوراباندہ، یو، پی انڈیا، سنِ طباعت باردوم: ۱۴۱۲ھ)

معلوم ہوا کہ مدرسہ کی ظاہری رونق اور زیب وزینت اور عمارت کے عالیشان ہونے، نیز طلبہ کی کمیت اور تعداد بڑھانے کی دُھن میں پڑنا، اور ان چیزوں کو مقصود ومطلوب اور قبلہ وکعبہ بنالینا، یہ سب چیزیں، ایک ایسے گھن کی طرح ہیں، جو اندر ہی اندر سے اخلاص اور قبولیت میں خلل انداز ہوتی ہیں، اور انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ شاید دین کا بہت عظیم الشان کام کررہا ہے، جس طرح اندر ہی اندر گھن لگی ہوئی چیز کا ظاہر درست ہوتا ہے، اور اوپر سے وہ چیز خوبصورت اور پائیدار نظر آتی ہے، لیکن اندر سے کچھ نہیں ہوتا، یہی مثال ان چیزوں کو مقصود بنا کر کام کرنے والوں کی ہے۔

اصل چیز اور اصل مقصود رضائے الٰہی ہے، اسی کی دھن لے کر اور اسی کو اپنا قبلہ وکعبہ بنا کر کام کرنا چاہئے، پھر خواہ بظاہر کمیت اور مقدار میں کام تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، کیفیت کے اعتبار سے اچھا ہو وہ کافی وشافی ہے۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 4 شمارہ 5، جون 2007ء۔ جمادی الاولیٰ 1428ھ)

---

(31)

طلبۂ کرام کو فضولیات سے بچنے، بچانے کی ضرورت

معزز طلبۂ کرام! آپ دینی علم کے طالب ہیں، اسی لیے آپ کا نام ''طالبِ علم'' ہے، اور علم کی طلب کے لیے ضروری ہے کہ طالبِ علم اپنے آپ کو علمِ دین کے حصول اور اس کے تقاضوں کے علاوہ دوسری ہر قسم کی سرگرمیوں سے بچا کر رکھے، اور غیر ضروری تعلقات قائم نہ کرے، دوستی اور غیر ضروری میل جول چھوڑ دے، ادھر اُدھر بلا ضرورت آمد ورفت نہ کرے، اخبار اور دوسری خارجی کتابوں کا مطالعہ نہ کرے، خاص طور پر ان کتابوں کا، جن سے کوئی دینی فائدہ بھی نہیں۔

اکابر ومشائخ تو طلبہ کے لیے اس کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے کہ طلبہ خط وکتابت کے مشغلہ میں مصروف ہوں، اور اس کی وجہ بھی یہی بیان فرماتے تھے کہ اس کی وجہ سے طلبہ کو اپنی تعلیم کے لیے یکسوئی نہیں رہتی، اور یکسوئی طالبِ علم کے لیے شرط ہے۔

اور اسی طرح اکابر ومشائخ طالبِ علمی کے زمانے میں خارجی کتابوں کے مطالعہ کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔

سلف کی ہدایات کو نظر انداز کر کے آج کل طالبِ علم خارجی کتابوں، بلکہ اخباروں کا مطالعہ کرتے ہیں، موبائل فون رکھتے ہیں، اور جب چاہیں، اور جن سے چاہیں رابطہ کرتے ہیں، اور ان سے دوسرا بھی جس وقت چاہے، رابطہ کر سکتا ہے۔

یہاں تک کہ مطالعہ کرنے کے دوران، تکرار کے دوران اور اس سے بڑھ کر سبق پڑھنے کے دوران بھی فون پر دوسرے سے بات کر لیتے ہیں، خاص طور پر ان مدارس میں جہاں طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اور سبق میں زیادہ طلبہ ہوتے ہیں، وہاں زیادہ ابتلاء ہوتا ہے، کیونکہ تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے استاذ کی نظر سب کی نقل وحرکت پر پڑنا مشکل

ہوتی ہے، یہ کیسی طالبِ علمی ہے؟

شدید ضرورت کے بغیر، موبائل پر رابطہ کرنا تو خط وکتابت سے بھی زیادہ یکسوئی کے لیے نقصان دہ ہے، کیونکہ خط وکتابت کے لیے تو لکھنے، پڑھنے، روانہ کرنے، وصول کرنے کی جدوجہد بھی کرنی پڑتی ہے، اور یہ سب کام ہر حالت میں مشکل ہیں، لیکن موبائل فون کے ذریعہ ہر حالت میں بآسانی رابطے ہوسکتے ہیں، اور بات صرف یہاں تک ہی نہیں، بعض طلبہ تو موبائل فون سے ریڈیو بھی سنتے ہیں، کھیل اور میچ بھی سنتے ہیں۔

اور بھی نہ جانے موبائل فونوں میں کمپنیوں کی طرف سے کِن کِن رابطوں کی مراعات دی جارہی ہیں، نفس نے جب چاہا، جو کچھ چاہا، اس فون کے ذریعہ سے نفس کی خواہش پوری ہوجاتی ہے۔

موبائل فون چھوٹی سی چیز ہے، جیب میں آسانی سے آجاتا ہے، اس کے علاوہ کانوں کے ساتھ لگا کر آواز سننے، اور اپنی آواز دوسرے کو سنانے کے لیے ایک چھوٹا سا آلہ بھی ایجاد ہوچکا ہے، جس کی تار موبائل فون میں لگا کر کان کے سوراخ میں اس کو رکھ لیا جاتا ہے، اس کے بعد موبائل فون ہاتھ میں پکڑ کر، یا جیب وغیرہ میں رکھ کر، موبائل کو کانوں سے لگانے کی بھی ضرورت نہیں، اپنی حالت پر بیٹھے ہوئے بآسانی دوسرے سے گفت وشنید کی جاسکتی ہے، اور اس حالت کا استاذ اور دوسرے کو علم ہونا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔

پھر اس موبائل فون میں مختلف قسم کے کھیل اور گیم بھی نصب کردیے گئے ہیں، طلبہ ان سے بھی کھیل کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔

سلف اکابر ومشائخ اگر طلبہ کے ان حالات کا مشاہدہ فرماتے، تو ایسے طلبہ کو مدرسہ میں ایک لمحہ کے لیے رکھنا گوارا نہ فرماتے۔

میری رائے میں تو طلبہ کو طالبِ علمی کے دوران موبائل فون استعمال کرنے، بلکہ بطورِ خاص ٹچ موبائل فون رکھنے کی اجازت ہی نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ یہ طلبہ کے لیے سمِ قاتل ہے۔

رہا یہ کہ اگر طالبِ علم کو کسی سے رابطہ کرنے کی ضرورت پڑے، تو وہ کیا کرے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جگہ جگہ فون پر رابطہ کی سہولت موجود ہے، وہاں سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

مگر یہ اجازت بھی ضرورت کے ساتھ خاص ہے، اور ضرورت بھی معقول ہونی چاہئے، یہ نہیں کہ چلو کافی دن ہوگئے، فلاں دوست سے رابطہ نہیں ہوا، چلو کچھ ان سے ہائے ہیلو اور غپ شپ ہی کر لیتے ہیں۔

اوّلاً تو یہ غپ وشپ ویسے ہی فضول چیز ہے، جس کو آج کل بہت معزز چیز اور قابلِ فخر سمجھا جانے لگا ہے، دوسرے طالبِ علم کی شان کے تو بالکل ہی خلاف ہے۔

اسی طرح اخبارات کا مطالعہ کرنا بھی طلبہ کے لیے ٹھیک نہیں، خواہ اسلامی اخبار ہوں، یا غیر اسلامی اخبار۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ آج کل کچھ طالبِ علم کھیلوں اور میچوں کا بھی شوق رکھتے ہیں، خاص طور پر کرکٹ کے کھیل سے زیادہ دل چسپی رکھتے ہیں، اور جب ملکی سطح پر میچ کھیلے جاتے ہیں، تو ان کی لمحہ بالمحہ خبر رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، حالانکہ جو کھیلنے والے ہیں، ان کا تو یہ پیشہ ہے، اس پر انہیں اجرت اور معاوضہ ملتا ہے، اگرچہ کھیل کود کو پیشہ اور مشغلہ بنانا، اور اس کھیل کود کے اوپر ہی پھر کھلاڑی نام بھی رکھ دینا، یہ انسان کی زندگی کے مقصد کے سراسر خلاف ہے۔

لیکن جن لوگوں کو کھیل دیکھنے کے اوپر کچھ اجرت ومعاوضہ بھی نہیں مل رہا، ان کا بلاوجہ کھیل کود دیکھ کر اپنا وقت ضائع کرنا، تو کھیلنے والوں سے بھی بڑی حماقت ہے۔

ایسے لوگوں پر یہ کہاوت ثابت آتی ہے کہ:

''کامی کام کریں، بے وقوف ساتھ پھریں''

ایک عالمِ دین کی بات مجھے پسند آئی، انہوں نے فرمایا کہ کرکٹ میچ کھیلنے والے، دیکھنے والے، سُننے والے اور تجسس کرنے والے سارے ہی بے وقوف ہیں، فرق اتنا ہے کہ کوئی بڑا بے وقوف ہے، اور کوئی چھوٹا بے وقوف ہے۔

پہلے نمبر کے بڑے بے وقوف تو وہ لوگ ہیں کہ جو عاقل بالغ ہوکر اور بال بچے دار ہوکر بیٹ بلے سے بچوں والا کھیل کھیل رہے ہیں، اور اس کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ تن من دھن کی قربانی ایک گیند کی خاطر لگا رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں، گر رہے ہیں، پڑ رہے ہیں، اچھل رہے ہیں، کود رہے ہیں، زخمی ہو رہے ہیں، بے ہوش ہو رہے ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک جا رہے ہیں۔

یہ سب دینی اعتبار سے بے وقوفانہ حرکتیں ہیں، اور اگلے آنے والے اور چھوٹے بے وقوفوں کی بے وقوفی انہیں کھلاڑیوں کی نقل وحرکات کے ساتھ چلتی ہے، اس لیے یہ بڑے بے وقوف ہوئے۔

اور دوسرے نمبر کے بے وقوف وہ ہیں، جو میدان میں جا کر بھاری رقم اور قیمتی وقت خرچ کر کے تماشہ دیکھ رہے ہیں، مال بھی خرچ کیا، اور وقت بھی برباد کیا۔

اور تیسرے نمبر کے بے وقوف وہ ہیں، جو ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر کھیل دیکھ رہے ہیں، اور خوامخواہ وقت برباد کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر رہے ہیں۔

اور چوتھے نمبر کے بے وقوف وہ ہیں جو ریڈیو پر، کھیل سُن رہے ہیں۔

اور پانچویں نمبر کے بے وقوف وہ ہیں، جو دوسروں سے تجسس کر رہے ہیں کہ کیا ہوا؟ کون جیتا کون ہارا؟

اور چھٹے نمبر کے بے وقوف وہ ہیں، جو بعد میں اخباروں میں کھیلوں کی جیت ہار کی خبریں ٹٹول رہے ہیں۔

اور ایک بڑے بے وقوف وہ بھی ہیں، جو کھیل پر جوا کھیل رہے ہیں، ایک ایک گیند پر، ایک ایک رَن پر، چوکے، چھکے پر، آؤٹ ہونے پر، دوڑنے پر، گرنے پر، غرضیکہ ہر ہر چیز پر جوا لگا رہے ہیں، کتنی بڑی حماقت ہے۔ ’’**لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم**‘‘

مجھے ایک بات پر بڑا تعجب ہوا، معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑے دینی جامعہ میں طلبہ کو کرکٹ کے کھیل کی تربیت دی جاتی ہے، اور تربیت دینے کے لیے بھاری معاوضہ پر ایک کوچ رکھا

گیا ہے، جو طلبہ کو کرکٹ کھیلنا سکھاتا ہے اور اس جامعہ کے طلبہ کی کرکٹ ٹیم دوسروں سے مقابلہ میں کھیلتی ہے، افسوس کہ کرکٹ جیسا کھیل جو چھوت کی بیماری سے کم نہیں، اس کی لت اتنی بُری ہے کہ جسے پڑ جائے، اس سے چھوٹنا مشکل ہے، خود مدرسہ کے ذمہ دار حضرات ہی اس طرح کے کھیل کی تربیت دلوا رہے ہیں، ایسے میں تعلیم کیا خاک ہوسکے گی؟ طلبہ تو رات دن کرکٹ کرکٹ ہی پڑھیں گے، معلوم نہیں کہ ان اہلِ مدارس کو کیا ہوگیا؟

عزیز طلبۂ کرام! آج یہ باتیں شاید تمہیں کڑوی معلوم ہو رہی ہوں، لیکن بڑے ہونے اور فارغ ہونے کے بعد تمہیں سمجھ آئے گی کہ یہ باتیں کس حد تک تمہارے لیے ضروری اور فائدہ مند تھیں اور کس حد تک نہیں، ہم جب چھوٹے تھے ہمیں بھی ناسمجھی کی وجہ سے بڑوں کی باتیں اچھی محسوس نہ ہوتی تھیں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ عطاء فرمائے اور اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائے اور اپنے اسلاف کے سلسلے کا بدنام کنندہ نہ بنائے۔ آمین۔

۱۰/ جمادی الاُخریٰ ۱۴۲۸ھ۔ 26/ جون 2007ء بروز منگل

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 4 شمارہ 6، جولائی 2007ء۔ جمادی الاخریٰ 1428ھ)

---

(32)

علماء اور ہاتھ سے تغییرِ منکر کا منصب

آج کل فتنوں، ہنگامہ آرائیوں اور منکرات کے عام ہونے کے دور میں بعض حضرات منکرات کی تغییر کے لئے، اپنے ہاتھ کی طاقت کے استعمال کو اہلِ علم، یا عوام کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، اور جو اس طرزِ عمل میں شریک نہ ہو، اس کو گناہ گار خیال کرتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت کر دی جائے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث میں رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ

ارشاد مروی ہے کہ:

مَنْ رَّأٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۴۹ ”۷۸“ کتاب الایمان، باب بیان کون النهی عن المنكر من الإيمان الخ)

ترجمہ: تم میں سے جو شخص منکر (گناہ وبُرائی) کو دیکھے، تو اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اُسے بدل دے، اور اگر اس کی طاقت وقدرت نہ ہو، تو اپنی زبان سے بدل دے، اور اگر اس کی بھی طاقت وقدرت نہ ہو، تو اپنے دل سے بدل دے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے (مسلم)

ایک دوسری روایت میں نہی عن المنکر کے فریضے سے حسبِ قدرت سبکدوش ہونے کی مزید وضاحت کردی گئی ہے۔

چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں مروی ہے کہ:

مَنْ رَّأٰی مُنْكَرًا فَغَيَّرَهٗ بِيَدِهٖ فَقَدْ بَرِءَ، وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يُّغَيِّرَهٗ بِيَدِهٖ، فَغَيَّرَهٗ بِلِسَانِهٖ فَقَدْ بَرِءَ، وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يُّغَيِّرَهٗ بِلِسَانِهٖ، فَغَيَّرَهٗ بِقَلْبِهٖ فَقَدْ بَرِءَ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ (سنن النسائی، رقم الحدیث ۵۰۰۹، کتاب الایمان وشرائعه، باب تفاضل اهل الایمان)

ترجمہ: جو شخص کسی منکر (و گناہ) کو دیکھے، پھر اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، تو وہ بریٔ الذمہ ہوگیا، اور جو شخص اپنے ہاتھ سے اس کو بدلنے کی طاقت نہ رکھے، پھر وہ اپنی زبان سے بدل دے (یعنی زبان سے نہی عن المنکر کردے) تو وہ بھی بریٔ الذمہ ہوگیا، اور جو شخص اپنی زبان سے اس کو بدلنے کی طاقت نہ رکھے، پھر وہ اپنے دل سے اس کو بدل دے (یعنی دل سے اس منکر کو برا اور غلط سمجھے) تو وہ بھی بریٔ

الذمہ ہوگیا اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے (نسائی)

حدیث شریف میں جو یہ فرمایا گیا کہ یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ منکَر کے انکار کا اپنی ذات میں کمزور درجہ ہے، یہ مطلب نہیں کہ جو ہاتھ وزبان سے طاقت نہ رکھتا ہو، اس کے لیے اور اس کے حق میں بھی کمزور درجہ ہے، کیونکہ ایسے شخص کے حق میں تو اُس کی وسعت اور طاقت کے اعتبار سے یہ کامل ہی درجہ ہے۔

چنانچہ علامہ سندھی رحمہ اللہ، اس حدیث کی شرح لکھتے ہیں:

’’أضعف الإيمان ‘‘أضعف أعمال الإيمان المتعلقة بانكار المنكر فى ذاته لا بالنظر إلى غير المستطيع فإنه بالنظر إليه هو تمام الوسع والطاقة وليس عليه غيره (حاشية السندى على النسائى، ج۸ ص ۱۱۱، كتاب الايمان وشرائعه، باب تفاضل اهل الايمان)

ترجمہ: ’’ایمان کا کمزور ہونا‘‘ یعنی ایمان کے اعمال کا کمزور ہونا، منکَر کے انکار کی ذات کے اعتبار سے ہے، نہ کہ غیر قادر کے اعتبار سے، اس لیے کہ غیر قادر کے اعتبار سے تو یہ کامل وسعت اور طاقت ہے، اور اس پر اس کے علاوہ کچھ اور لازم نہیں (حاشیۃ السندی)

اور بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ یہ اپنے ثمرہ کے اعتبار سے ایمان کا کمزور درجہ ہے، نہ یہ کہ نہی عن المنکر کرنے والے کے اعتبار سے ایمان کا کمزور درجہ ہے۔

چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ، صحیح مسلم کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

’’فبقلبه‘‘ معناه فليكرهه بقلبه وليس ذلك بإزالة وتغيير منه للمنكر ولكنه هو الذى فى وسعه وقوله صلى الله عليه وسلم (وذلك أضعف الإيمان) معناه والله أعلم أقله ثمرة (شرح النووى علىٰ مسلم، ج۲ ص ۲۵، كتاب الايمان، باب بيان كون النهى عن المنكر من الإيمان)

ترجمہ: اپنے دل سے منکر کو بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ اُسے اپنے دل سے بُرا سمجھے، اور یہ درحقیقت اس کی طرف سے منکر کو بدلنا، اور زائل کرنا نہیں ہے، لیکن کیونکہ اُس کی وسعت صرف اتنی ہی ہے (اس لیے اُس کے حق میں اس کو ازالہ وتغییر سے تعبیر کردیا گیا ہے) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے ثمرے ونتیجے کے اعتبار سے کمزور درجہ ہے، واللہ اعلم (شرح النووی)

اوراسی وجہ سے بعض حضرات نے فرمایا کہ تغییر کی دو قسمیں ہیں ایک حسّی اور ایک معنوی، پہلی قسم کا تعلق تو ہاتھ سے اور بعض اوقات زبان سے ہوتا ہے، اور دوسری قسم کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد اس طرح مروی ہے کہ:

بِحَسْبِ الْمَرْءِ أَنْ يَّرٰى مُنْكَرًا لَا يَسْتَطِيْعُ لَهٗ غَيْرًا أَنْ يَّعْلَمَ اللّٰهُ أَنَّهٗ لَهٗ مُنْكِرٌ (المعجم الكبير للطبرانی، رقم الحديث ١٠٥٤١، ج١٠ ص٢٢٣، التاريخ الكبير للبخاری، ج٣ص٢٧٨، تحت ترجمة "ربيع بن سهل بن ركين" رقم الترجمة ٩٥١) [1]

ترجمہ: آدمی کی نہی عن المنکر کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ جب وہ کسی منکر کو دیکھے اور اس کو (اپنے ہاتھ اور زبان سے) بدلنے کی قدرت نہ ہو کہ اللہ کے علم میں اس کی نیت کے بارے میں یہ بات ہو کہ وہ اس کو دل سے برا سمجھتا ہے (طبرانی)

امام قرطبی رحمہ اللہ، تفسیر قرطبی فرماتے ہیں:

[1] قال الهيثمی: رواه الطبرانی، وفيه الربيع بن سهل وهو ضعيف (مجمع الزوائد ج٧ص٢٧٥، تحت رقم الحديث ١٢١٧٣، باب الانكار بالقلب)

www.idaraghufran.org

قال العلماء: الأمر بالمعروف باليد على الأمراء، وباللسان على العلماء، وبالقلب على الضعفاء، يعنى عوام الناس (تفسير القرطبى ج۴ص ۴۹، سورة آلِ عمران)

ترجمہ: علماء نے فرمایا کہ امر بالمعروف ہاتھ کے ساتھ حکّام کے ذمہ ہے، اور زبان کے ساتھ علماء کے ذمہ ہے، اوردل کے ساتھ ضعفاء، یعنی عوام الناس کے ذمہ ہے (تفسیر قرطبی)

اورامام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فإن غلب على ظنه أن تغييره بيده يسبب منكرا أشد منه من قتله أو قتل غيره بسبب كف يده واقتصر على القول باللسان والوعظ والتخويف (شرح النووى علىٰ مسلم، ج۲ص ۲۵، كتاب الايمان ،باب بيان كون النهى عن المنكر من الإيمان)

ترجمہ: اگراس چیز کاغالب گمان ہو کہ ہاتھ سے منکر کی تغییر کرنا،اس سے زیادہ شدید منکر، مثلاً اس کے، یاغیر کے قتل کا سبب بنے گا،تواپنے ہاتھ کوروک لے اورزبان سے کہنے اوروعظ ونصیحت کرنے اورعذاب وغیرہ کاخوف دلانے پر اکتفاء کرے (شرح النووی)

اوراگرکوئی شخص اپنی ذات کے لیے مالی وجانی نقصان برداشت کرکے نہی عن المنکر کرے،تو اُس کوبعض حضرات نے عزیمت سے تعبیر کیاہے،مگر ظاہر ہے کہ یہ مشقت اپنی ذات کے ساتھ خاص ہے،دوسروں کواس کا مکلّف بنانا صحیح نہیں۔

علامہ ابن الحاج رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں وضاحت کے ساتھ تفصیل بیان فرمائی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

وقد قال العلماء رحمة الله عليهم إن التغيير باليد متعين على الأمراء وباللسان متعين على العلماء وبالقلب متعين على غيرهما،

www.idaraghufran.org

وما قالوه هو فی غالب الحال، وإلا فقد نجد كثيرا منه يتعين تغييره باليد على غير الأمير وغير العالم فضلا عنهما.

وإذا كان الأمر كذلک فينقسم التغيير بالنسبة إلى العالم قسمين: قسم يتغير باليد، وقسم يتغير باللسان، والشاذ النادر الذی يتعين عليه بالقلب.

وقد نقل ابن رشد – رحمه الله تعالى – فی البيان والتحصيل ما هذا لفظه إن الأمر بالمعروف والنهی عن المنكر واجب على كل مسلم بثلاثة شروط:

أحدها: أن يكون عارفا بالمعروف والمنكر؛ لأنه إن لم يكن عارفا بهما لم يصح له أمر ولا نهی إذ لا يأمن من أن ينهى عن المعروف ويأمر بالمنكر لجهله بحكمهما وتتميز كل منهما عن الآخر.

والثانی: أن لا يؤدی إنكاره المنكر إلى منكر أكبر منه مثل أن ينهاه عن شرب الخمر فيؤول نهيه عن ذلک إلى قتل نفس وما أشبه ذلک؛ لأنه إذا لم يأمن ذلک لم يجز له أمر ولا نهی.

والثالث: أن يعلم أو يغلب على ظنه أن إنكاره المنكر مزيل له، وأن أمره مؤثر ونافع؛ لأنه إذا لم يعلم ذلک ولا غلب على ظنه لم يجب عليه أمر ولا نهی.

فالشرطان: الأول والثانی مشترطان فی الجواز والشرط الثالث مشترط فی الوجوب فإذا عدم الشرط الأول والثانی لم يجز أن يأمر ولا ينهى، وإذا عدم الشرط الثالث ووجد الشرط الأول والثانی جاز له أن يأمر وينهی ولم يجب ذلک عليه (المدخل لابنِ الحاج، ج ۱ ص ۷۰، ۷۱، فصل فی العالم وكيفية نيته)

ترجمہ: علمائے کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ منکر کی تغییر ہاتھ کے ذریعہ سے متعین ہے حکّام پر، اورزبان کے ذریعے متعین ہے، علماء پر، اوردل کے ذریعے ان دونوں کے علاوہ دوسرے (لوگوں) پر۔

اورعلماء کی یہ بات اکثر حالات کے اعتبار سے ہے، ورنہ بسااوقات ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہاتھ کے ذریعہ تغییر غیر حاکم اور غیر عالم اوران کے علاوہ پر بھی متعین ہوجاتی ہے، اورجب بات اس طریقہ سے ہے، توعالم کے اعتبار سے تغییر کی دوقسمیں ہوجائیں گی، ایک تغییر ہاتھ کے ساتھ اورایک تغییر زبان کے ساتھ، اور جو صورت بہت کم پیش آتی ہے، وہ دل کے ساتھ متعین ہوگی، اورعلامہ ابنِ رشد رحمہ اللہ نے وضاحت اور جامعیت کے ساتھ جونقل کیا ہےاس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

’’امر بالمعروف اورنہی عن المنکر ہر مسلمان پر تین شرائط کے ساتھ واجب ہے۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ معروف اورمنکر سے واقف ہو، کیونکہ اگر وہ ان دونوں سے واقف نہیں ہوگا، تواس کا امرونہی کرنا، صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس بات کا اطمینان نہیں ہوسکتا کہ وہ معروف سے منع کرنے لگےاورمنکر کا حکم دینے لگے، ان احکام سے اپنی جہالت اورایک دوسرے سے تمیز نہ ہونے کی وجہ سے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا منکر پرنکیر کرنا، اس سے بڑے منکر کی طرف نہ پہنچا دے، مثلاً اگروہ شراب کے پینے سے منع کرے، تواس کا اس سے منع کرنا کسی کے قتل کی طرف پہنچادے، یااسی طرح کی کوئی اورخرابی لازم آئے، کیونکہ اس صورت میں اس کے لئے امرونہی جائزنہیں ہوگی۔

اورتیسری شرط یہ ہے کہ اس کواس بات کا یقین، یاغالب گمان ہو کہ اس کے منکر پر نکیر کرنے سے وہ منکر ختم ہوجائے گا، اوراس کا معروف کا حکم دینا، مؤثراورنافع ہوگا، کیونکہ اگراس بات کا یقین، یاغالب گمان نہیں ہوگا، تواس پر امرونہی واجب

www.idaraghufran.org

نہیں ہوگی۔

پس پہلی اور دوسری دونوں شرطیں تو جائز ہونے سے متعلق ہیں، اور تیسری شرط واجب ہونے سے متعلق ہے، لہٰذا جب پہلی اور دوسری شرط موجود نہ ہو، تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جائز ہی نہیں ہوگا، اور جب تیسری شرط موجود نہ ہو، لیکن پہلی اور دوسری شرطیں موجود ہوں، تو امر بالمعروف ونہی عن المنکر جائز ہوگا، لیکن واجب نہیں ہوگا'' (المدخل)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ نے قدرت واستطاعت کی بہت عمدہ وضاحت فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں جس قدرت واستطاعت کا ذکر ہے اس سے لغوی قدرت مراد نہیں، بلکہ شرعی قدرت مراد ہے۔

چنانچہ حضرت فرماتے ہیں:

''قدرت سے مطلقِ قدرت مراد نہیں، ورنہ عدمِ استطاعت تغییر بالید کا کبھی تحقق ہی نہ ہوگا، کیونکہ مطلق قدرت تو ہر شخص کو حاصل ہے، خواہ اس کا انجام کچھ ہی ہو، بلکہ مراد وہ قدرت ہے، جس کے استعمال پر کوئی فتنہ نا قابلِ برداشت مرتب نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ (عام حالات میں) رعیت کو ایسی قدرت بادشاہ پر نہیں ہے'' (امداد الفتاویٰ، جلد پنجم صفحہ ۱۲۸، کتاب ما یتعلق بالحدیث، رسالہ ''جزل الکلام فی عزل الامام'' ناشر: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی ۲۰۱۰ء)

اور حضرت موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں:

خوب سمجھ لیجئے! کہ قدرت کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں، اس پر تو ہم کو قدرت ہے، لیکن اس کے کر لینے کے بعد جن خطرات کا سامنا ہوگا، ان کے دفعہ کرنے پر قدرت نہیں ہے، دوسرے یہ کہ فعل پر بھی قدرت ہے، اور اس کے کر لینے کے بعد جو خطرات پیش آئیں گے، اُن کی مدافعت پر بھی قدرت

ہو، پہلی صورت استطاعتِ لغویہ ہے، اور دوسری صورت استطاعتِ شرعیہ۔

خوب سمجھ لیجئے گا! اور مدافعت کی فرضیت کے لیے پہلی استطاعت کافی نہیں، بلکہ دوسری صورت، یعنی استطاعتِ شرعیہ شرط ہے، جس کو اس حدیث نے صاف کردیا ہے۔

”قال من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ“

(جب کوئی شخص کسی گناہ کو دیکھے، تو اس کو ہاتھ سے مٹادے، اگر اس کی قدرت نہ ہو، تو زبان سے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو، تو دل سے)

ظاہر ہے کہ استطاعت باللسان ہروقت حاصل ہے، پھر اس کے انتفاء کی تقدیر کب محقق ہوگی، یعنی اگر کسی فعل کی فرضیت کے لئے محض اس فعل پر قادر ہونا کافی ہو، اور اس سے جو خطرات پیش آنے والے ہوں، ان کی مدافعت پر قادر ہونا، شرط نہ ہو، تو زبان سے انکار کرنا، ہرحالت میں فرض ہونا چاہیے، کیونکہ زبان کا چلانا ہروقت ہماری قدرت میں ہے، پھر وہ کونسی صورت ہوگی، جس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر زبان سے بھی مٹانے کی قدرت نہ ہو، تو دل سے مٹادو، اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس فعل پر قدرت ہونے کے ساتھ اس میں ایسا خطرہ بھی نہ ہو، جس کی مقاومت اور مدافعت ومقابلہ بظنِ غالب عادتاً ناممکن ہو۔

ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہوجائیں

(”الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ“ مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱ص۱۰۵، ۱۰۶، ملفوظ نمبر۱۱۶، بعنوان ”آج کل کے لیڈر اور سیاسی تحریکات کے بارے میں حضرت کا تفصیلی نقطہ نظر“ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ)

www.idaraghufran.org

اور تفسیر بیانُ القرآن میں حضرت موصوف فرماتے ہیں:

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضرور ہے کہ اور لوگوں کو بھی خیر کی طرف بلایا کریں، اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں، اور بُرے کاموں سے روکا کریں، اور ایسے لوگ آخرت میں ثواب سے پورے کامیاب ہوں گے۔

ف: تفصیل اس مسئلہ کی یہ ہے کہ جو شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر قادر ہو، یعنی قرائن سے غالب گمان رکھتا ہے کہ اگر میں امر ونہی کروں گا، تو مجھ کو کوئی ضَرَر معتدبہٖ لاحق نہ ہوگا، اس کے لیے اُمورِ واجبہ میں امر ونہی کرنا واجب ہے، اور اُمورِ مستحبہ میں مستحب۔

مثلاً نمازِ پنجگانہ فرض ہے، تو ایسے شخص پر واجب ہوگا کہ بے نمازی کو نصیحت کرے، اور نوافل مستحب ہیں، اس کی نصیحت کرنا مستحب ہوگا، اور جو شخص بالمعنی المذکور قادر نہ ہو، اس پر امر ونہی کرنا، اُمورِ واجبہ میں بھی واجب نہیں، البتہ اگر ہمت کرے، تو ثواب ملے گا۔

پھر اس امر ونہی میں قادر کے لیے ہونے اُمورِ واجبہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر قدرت ہاتھ سے ہو، تو ہاتھ سے اس کا انتظام واجب ہے، جیسے حکّام، محکومین کے اعتبار سے، یا ہر شخص خاص اپنے اہل وعیال کے اعتبار سے، اور اگر صرف زبان سے قدرت ہو، تو زبان سے کہنا واجب ہے، اور غیر قادر کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ تارکِ واجبات ومرتکبِ محرمات سے دل سے نفرت رکھے (بیان القرآن، جز۲ صفحہ ۴۵، سورۃ آلِ عمران آیت ''ولتکن منکم اُمة یدعون الی الخیر '' الخ)

ایک مقام پر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ہاتھ سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے کا حکم عام نہیں، بلکہ اہلِ حکومت کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ جہاں حکومت نہ ہو، وہاں نرمی ہی مناسب ہے، امام

Idara Ghufran

صاحب نے اس راز کو خوب سمجھا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کا طنبور، یا مزامیر (یعنی گانے بجانے کے آلات) توڑ دے، تو اس پر ضمان (تاوان) لازم آئے گا، اور صاحبین فرماتے ہیں کہ ضمان لازم نہ ہوگا، کیونکہ اس نے منکر کا ازالہ کیا ہے، اور حدیث میں ازالۂ منکر کا حکم ہاتھ سے بھی ہے۔ امام صاحب اس کا جواب دیتے ہیں کہ ہاتھ سے ازالۂ منکر کرنے کا اختیار حکومت کے لوگوں کو ہے، عوام کو اختیار نہیں۔ امام صاحب کے قول کا راز یہی ہے کہ عوام کی دست درازی سے فساد ہوگا، اور شریعت کا مقصود امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے شریعت کا مقصود اصلاح ہے، نہ کہ فساد، لیکن حکومت کے دو درجے ہیں، باپ کو بیٹے پر، اور شوہر کو بیوی پر، استاد کو شاگرد پر (مہتمم کو طلبہ واساتذہ پر) فی الجملہ حکومت ہوتی ہے، لہٰذا ان کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہاتھ سے بھی امر بالمعروف کرنے کا حکم ہے، لیکن غیروں کے ساتھ ایسا نہ کرنا چاہیے، وہاں تو صرف زبان سے کام لیں، اور وہ بھی نرمی سے، نیز امر بالمعروف بزرگوں کو بھی کیا جاتا ہے، مگر وہاں نرمی کے ساتھ ادب بھی ضروری ہے (''ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ'' مشمولہ: ملفوظات حکیم الامت، ج ۲۳ ص ۱۱۶، بعنوان ''امر بالمعروف کا طریق'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ذوالقعدة ۱۴۲۷ھ)

حضرت موصوف ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

''امام ابوحنیفہ کی عجیب نظر ہے، دیکھئے امام صاحب کا قول ہے کہ آلاتِ لہو کو توڑ ڈالنا واعظ کو، یا کسی کو جائز نہیں، اگر کوئی توڑ دے، تو ضمان (تاوان) لازم آئے گا، یہ کام سلطان (حاکم) کا ہے، وہ احتساب کرے، اور توڑے پھوڑے، اور سزا دے، جو چاہے کرے، دیکھئے اس میں کتنا امن ہے، سوائے سلطان (حاکم) کے اور کسی کے احتساب کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ کام بند تو ہوتا نہیں، جنگ وجدل اور فتنہ

www.idaraghufran.org

ہوتا ہے اور باہمی تنازعات بڑی دور تک پہنچ جاتے ہیں۔

علیٰ ہذا اقامتِ حدود (حدود وسزاؤں کا نفاذ واجراء) سلطان (وحاکم) ہی کے ساتھ خاص ہے‘‘ (حسن العزیز، مشمولہ: ملفوظات حکیم الامت، ج ۲۰ ص ۱۰۱، بعنوان’’احتساب سلطان کا کام ہے‘‘ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر ۱۴۲۵ھ)

امام صاحب اور صاحبین رحمہم اللہ کا اختلاف، اور ضمان لازم ہونے نہ ہونے کے اعتبار سے مفتیٰ وغیر مفتیٰ بہ ہونے کا مسئلہ اپنی جگہ ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کسی غیر حاکم کے ہاتھ سے تغییرِ منکر کرنے سے اس سے بڑا، یا اجتماعی مفسدہ لازم آتا ہو، اور اس کے خطرناک اور بھیانک نتائج برآمد ہوتے ہوں، خصوصاً جبکہ بے گناہ اور معصوم جانوں کا اتلاف بھی لازم آتا ہو، یا اجتماعی علمی وروحانی امور میں خلل واقع ہوتا ہو، تو شرعاً اس کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

یہاں یہ ملحوظ رہنا بھی ضروری ہے کہ علماء کا درس وتدریس اور دینی تعلیم وتعلم میں مشغول رہنا بھی تبلیغ، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان شکل، اور ایسی عظیم دینی خدمت ہے کہ وہ اگر عمر بھر اخلاص وصدق کے ساتھ اس خدمت میں مشغول رہیں، تو ان کے لئے بہت بڑا صدقۂ جاریہ اور کارِ خیر ہے، اس خدمت میں مشغول ہونے کے باوجود، انہیں دوسری پُرخطر اور اپنی اس عظیم خدمت کے لئے نقصان دہ کسی اور صورت کا اپنے آپ کو مکلّف سمجھنا محلِ تأمل ہے۔

آج کل عوام اور بہت سے علماء کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کی تمام صورتوں اور جہاد وقتال، یہاں تک کہ بہت سے دینی احکام پر عمل پیرا ہونے کی ذمہ داریوں کا علماء ہی کو مکلّف سمجھتے ہیں، اور ہر چیز میں علماء ہی کو قربان کرنا چاہتے ہیں، یہ تأثر انتہائی غلط ہے، تقسیمِ کار ایک مسلّمہ مسئلہ ہے۔

اہلِ علم حضرات کو اس قسم کی غلط فہمیوں سے آگاہ رہنا، اور اپنی حقیقی ذمہ داریوں سے باخبر رہنا

بہت ضروری ہے۔

جس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسلاف واکابرین کے اصولی ومجموعی حالات وواقعات سے واقفیت حاصل کی جائے، اوران کونمونہ بنا کراپنے لئے راہِ عمل متعین کی جائے۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد4 شمارہ7، اگست 2007ء۔ رجب1428ھ)

---

(33)

عالِمِ دین، شرعی احکام سے بری نہیں

چند دن پہلے ایک مسجد کی انتظامیہ اور امام وخطیب کے درمیان تنازعہ پیدا ہوگیا تھا، اور اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ مسجد کے خطیب وامام، مسجد میں اقامتی ورہائشی مدرسہ شروع کرنا چاہتے تھے، اوراس کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے، جبکہ مسجد کی انتظامیہ اس چیز پر راضی نہیں تھی۔

کیونکہ تنازعہ غیر معمولی طول پکڑتا جارہا تھا، اس لیے مسجد کی انتظامیہ نے اس سلسلہ میں شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے ہمارے ادارہ کے دارالافتاء سے فتویٰ طلب کیا۔

سوال میں واضح طور پر تحریر کیا گیا تھا کہ مذکورہ مسجد کی موجودہ انتظامیہ نے خطیب وامام مذکور کو صرف امامت وخطابت کے لیے مقرر کیا تھا، اور مدرسہ کے اجراء وغیرہ کے بارے میں کچھ طے نہ ہوا تھا، اور نہ ہی دیگر اختیارات امام صاحب کو تحویل کیے گئے تھے۔

اس کا شرعی جواب واضح تھا کہ مذکورہ صورت میں امام صاحب کے لیے انتظامیہ کی رضامندی کے بغیر اس طرح مدرسہ کا اجراء درست نہیں ''لانہٗ خلاف اُصول الاجارۃ والمعاھدۃ''

بہرحال فتویٰ جاری ہوگیا۔

چند دن بعد میرے ایک رفیق کی ایک بڑے جامعہ کے مہتمم صاحب سے ملاقات ہوئی، جو کہ مذکورہ امام وخطیب صاحب کے حامی تھے۔

ان مہتمم صاحب نے میرے متعلق ان سے کہا کہ ''مفتی صاحب کو (یعنی مجھے) نہ جانے کیا ہوگیا، جو علماء کے خلاف اس قسم کے فتوے جاری کرتے ہیں، پہلے سے ہی علماء کو بڑی مشکلات پیش آ رہی ہیں، اس قسم کے فتووں سے اور مشکلات بڑھتی ہیں، ہم علمائے کرام کے احترام و تعظیم کی جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں، اور مفتی حضرات اس قسم کے فتوے جاری کر کے ساری محنت پر پانی پھیر دیتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہا۔

چند دن بعد انہی صاحب کو مذکورہ امام وخطیب صاحب بھی کسی مقام پر ملے، اور انہوں نے بھی اسی قسم کی باتیں کیں۔

میرے رفیقِ کار نے ان سے کہا کہ فتویٰ تو کوئی غلط جاری نہیں ہوا، بلکہ شرعی اُصولوں کے عین مطابق جاری ہوا ہے، اور مفتی تو سوال کا پابند ہوتا ہے، جیسا اس سے سوال کیا جاتا ہے، وہ ''صورتِ مسؤلہ، صورتِ مذکورہ'' کی قید لگا کر جواب تحریر کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال جب اس واقعہ کا مجھے علم ہوا، تو بڑی حیرت ہوئی، اور افسوس بھی۔

اور میں نے جواباً کہا کہ اوّلاً تو کسی کو ہمارے معاملہ میں مداخلت کی ضرورت ہی نہیں، جب ہم دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے، تو دوسروں کو ہمارے معاملات میں مداخلت کا کیا حق پہنچتا ہے؟

جہاں تک شرعی مسئلہ کا تعلق ہے، تو وہ علماء ومفتیانِ کرام کی ذمہ داری ہے، اور شرعی حکم دریافت کرنے پر اس کا صحیح صحیح جواب دینا، یہ اہلِ حق علماء کا منصب ہے، اور کسی عالم، یا بڑے عہدہ والے کی رعایت کرتے ہوئے دنیا کی فاسد غرض کی خاطر شرعی حکم کو چھپالینا، یا اس میں کوئی تحریف کرنا، یہ علماءِ سوء کی نشانی اور احبار ورھبان کا طریقہ ہے، جس کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا مذمت بیان فرمائی ہے، شرعی حکم بیان کرنے کو مداخلت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

اور اصل اور بڑی مداخلت تو یہ ہے کہ شرعی حکم بتلانے والے کو مَورَدِ الزام ٹھہرایا جائے، یہ بڑی مداخلت اس لیے ہے کہ یہ شریعت میں مداخلت کرنا، اور شرعی احکام میں ٹانگ اڑانا ہے۔

ہاں اگر شرعی حکم غلط بتلایا گیا ہے، تو اس پر بات کرنے کا حق ہے، اگر کسی کو اس حکم کے صحیح وغلط ہونے میں شک ہے، قطع نظر اپنی ذاتیات کے، تو اسے اس پر تحقیق واستفسار کا حق حاصل ہے، لیکن شرعی حکم صحیح ہوتے ہوئے، بلکہ اسے حق سمجھتے ہوئے، پھر بھی اس سے ذاتی اغراض کی بناء پر اختلاف کرنا یہ سخت جرم ہے۔

کسی کے شرعی اور صحیح حکم بیان کرنے پر کسی کو پابندی لگانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

افسوس کہ وہ علمائے کرام جن کے ذمہ شرعی احکام کی تبلیغ کی ذمہ داری تھی، وہ بجائے خود شرعی احکام بیان کرنے، اور ان پر عمل کرنے کے، اگر دوسرے پر بھی شرعی حکم بیان کرنے میں رُکاوٹ ڈالیں گے، تو پھر دین کا اللہ ہی حافظ ہے۔

اس وقت ایک بڑی خرابی معاشرہ میں تعصب اور تملق کی پیدا ہوگئی ہے۔

تملق، دراصل چاپلوسی کو کہتے ہیں، جو شرعاً حرام ہے، یعنی دنیا کی فاسد غرض خواہ مال کی ہو، یا جاہ کی، اس کی خاطر دوسرے کو خوش کرنے کے لیے اوپر اوپر سے چکنی چوپڑی باتیں کرنا، جسے آج کل مکھن لگانا کہتے ہیں، یہ تملق، یا چاپلوسی ہے۔

بعض لوگ تو اس روحانی بیماری کے باعث شرعی حکم بیان کرنے سے محروم رہتے ہیں، اور بعض تعصب کی وجہ سے محروم رہتے ہیں، یہ تعصب کی بیماری بھی آج کل تقریباً ہر شعبہ میں داخل ہوگئی ہے، خواہ سیاست کا شعبہ ہو، یا معاشرت کا، یا تجارت کا، یا مذہبی اداروں کا، اور یہ عصبیتیں بھی مختلف طبقوں میں مختلف نوعیّتوں کی ہیں، مثلاً لسانیت پر مبنی تعصب، اسی طرح علاقائیت، وطنیت، قومیت وغیرہ پر مبنی تعصّبات، پھر کسی خاص پیشہ کا کہ اپنے شعبہ والے کی ہر حال میں طرف داری کی جاتی ہے، خواہ وہ حق پر ہو، یا نہ ہو۔

اسی طرح بعض اہلِ علم میں بھی یہ بیماری داخل ہوگئی ہے کہ وہ اہلِ علم کی جا اور بے جا ہر حال میں طرف داری کرتے ہیں، اور صرف اس وجہ سے کہ وہ ان کے شعبہ سے تعلق رکھتا ہے، اس کو صحیح اور دوسرے کو غلط کہتے ہیں۔

بعض علماء کا ایسا حلقہ بھی ہے، جو مسجدوں پر اپنی قوم اور اپنے علاقہ کے شخص کو امامت وخطابت کے لیے ترجیح دیتے ہیں، خواہ اس میں اہلیت ہو، یا نہ ہو، لوگوں کی نمازیں مکروہ ہوں، یا غارت ہوں، اس سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

اور اسی لیے شریعت میں تعصب کو حرام قرار دیا گیا ہے کہ اسی کی وجہ سے حق وباطل کی تمیز انسان کو نہیں رہتی۔

سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے کی صلاحیت اس تعصب کے نتیجہ میں مغلوب ہوجاتی ہے، اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ شرعی حکم بیان کرنے سے علماء کے لیے مشکلات پیدا ہوتی ہیں، یا وہ عوام میں بدنام ہوتے ہیں، تو یہ بالکل غلط سوچ ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ شرعی احکام کو توڑنے کے نتیجہ میں جس طرح آخرت کی حقیقی عزت سے انسان محروم ہوجاتا ہے، دنیا کی غیر حقیقی عزت سے بھی محروم ہوجاتا ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کے دل ودماغ میں انسان کی عزت نہیں رہتی، ہم لاکھ سمجھتے رہیں کہ عزت ہے۔

اور اصل عزت اور وقار جو کہ آج علماء کا ختم یا کم ہوگیا ہے، یا ہورہا ہے، اس کی بڑی وجہ خود یہ تعصّبات، مداہنت، نااہلیت اور مختلف رسوم ومنکرات میں ملوّث ہونا ہے، ایک عالم کی اس قسم کی غلطی سے دوسرے حق پرست علماء بھی بدنام ہوتے ہیں۔

شرعی حکم بیان کرنا اور کسی عالم پر بحیثیتِ عالم ہونے کے اعتراض کرنا، دو الگ الگ چیزیں ہیں، پہلا شریعت کا حکم ہے، اور وارثینِ انبیاء کا فرضِ منصبی، اور دوسرا شریعت کا حکم نہیں، بلکہ گناہ اور موجبِ وبال ہے۔

پس کسی عالم پر لاگو ہونے والے شرعی حکم کو ظاہر کرنے سے، یہ کیونکر لازم آگیا کہ یہ اس عالم پر بحیثیت عالم کے اعتراض ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ سلف اکابر ومشائخ جو حق پرست تھے، انہوں نے ہمیشہ شرعی حکم بیان فرمایا، اور اور کسی عالم پر لاگو ہونے والے شرعی حکم کو محض اس کے عالم ہونے کی وجہ سے چھپایا نہیں،

ہمارے اردو فتاویٰ میں اس قسم کے فتاویٰ کثرت سے موجود ہیں، خواہ نماز کی امامت کا مسئلہ ہو، یا مسجد میں مدرسہ قائم کرنے کا مسئلہ ہو، یا مسجد کی حدود میں قیام اور وہاں تدریس کا مسئلہ ہو، یا متولی اور واقف، یا انتظامیہ سے اختلاف کا مسئلہ ہو؛ یہ سب اور اس جیسے ہزاروں مسائل فتاویٰ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

لیکن آج بعض دینی مدارس میں تو مفتی حضرات کو فتوے دینے کا کلّی اختیار بھی نہیں ہے۔

بہت سی پابندیاں عائد ہیں، اور ان پابندیوں میں زیادہ دَخَل نفسانی اغراض کو ہے۔

ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اکابر ومشائخ کی دعاؤں وتوجہات کی برکت سے فتاویٰ کے شعبہ میں تملق، یا تعصب سے کام نہیں لیا، اور نہ آئندہ کے لیے اس قسم کا کوئی ارادہ ہے، لہٰذا ہم سے کوئی ایسی توقع نہ رکھے، اور اعتراض کرنے والوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف کریں اور اپنی قبر وآخرت کو سامنے رکھ کر چلیں۔

اگر ایسا نہیں کرتے تو دنیا میں بھی مختلف قسم کے عذابات اور مصائب کا سامنا کریں گے (جیسا کہ کر بھی رہے ہیں، گو اپنی شامتِ اعمال کے باعث مانتے نہیں) اور آخرت میں بھی کریں گے۔

اس قسم کا واقعہ کوئی میری زندگی کا نیا واقعہ نہیں ہے، بلکہ وقتاً فوقتاً اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اور میں نے مجبور ہو کر اس پر لب کشائی کی ہے، تاکہ حقیقت واضح ہو، اور اس بیماری سے جو اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہو، بچا کر رکھے۔

اور میرے احباب ورفقائے کار تو کم از کم اس بات کو سمجھ سکیں کہ شرعی احکام سب کے لیے ہیں؛ خواہ کوئی عالم ہو، یا عامی، شرعی احکام سے کوئی بَرِی نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اہلِ حق سلف، بزرگوں اور ہدایت یافتہ حضرات کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔ یکم جولائی ۲۰۰۷ء، بروز اتوار

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 4 شمارہ 8، ستمبر 2007ء۔ شعبان 1428ھ)

---

www.idaraghufran.org

(34)

علماء، عوام کے مقتداء، یا مقتدی؟

ہمارے ایک رفیق عالم صاحب نے فرمایا کہ آج کل بہت سے علماء عوام کی اقتداء کرتے ہیں، خود مقتداء ہوکر بھی عوام کے مقتدی ہیں، یعنی وہ عوام کی خواہشات کو دیکھتے ہیں کہ ان کی کیا خواہشات ہیں؟

اوران کے مطابق اپنے لئے راستہ منتخب کرتے ہیں، ان حضرات کی یہ حالت قابلِ اصلاح ہے، واقعی انہوں نے ان علماء کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

افسوس کہ علماء جو عوامُ النّاس کی اصلاح کا ذریعہ تھے، ان کا رخ خرابیوں اور برائیوں سے اچھائیوں کی طرف پھیرنے کی ان کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داری عائد تھی، لیکن انہوں نے عوام کی اصلاح کے بجائے اپنے آپ کو ہی ان کے تابع وماتحت کردیا۔

"اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن"

یہ سب حبِ مال اور حبِ جاہ کے کرشمے ہیں، واقعی اللہ والوں نے بالکل سچ فرمایا کہ مذموم دنیا ان دونوں امراض میں منحصر ہے، یعنی حبِ مال اور حبِ جاہ میں۔

اور یہی جاہ ومال کا مرض انسان کو اشرفُ المخلوقات کے منصب سے گرا کر جانور، کتے بلکہ اس سے بھی گئی گذری ہوئی چیز کی فہرست میں داخل کردیتا ہے، اوران حضرات میں ان امراض کی وجہ یہ ہے کہ اللہ والوں سے اپنی نفسانی اصلاح کروانے کی طرف سے بہت زیادہ غفلت اور لاپرواہی پیدا ہوگئی ہے۔

اصلاح وتزکیہ سے غفلت کا ایک ایسا ہمہ گیر وبال آیا ہے، جس میں علمی حلقوں کے گروہ کے گروہ مبتلا ہیں، ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہر سال طلبہ فارغُ التحصیل ہوتے ہیں، مگران میں ایسے طلبہ جن کا کسی اللہ والے سے صحیح اصلاحی تعلق قائم ہو، ان کی تعداد آٹے میں

نمک کے برابر بھی نہیں ہوتی۔

بڑے بڑے مدارس اور جامعات جہاں کئی کئی ہزار طلباء موجود ہیں، اولاً تو وہاں اصلاحِ نفس کی مجالس کا کوئی اہتمام ہی نہیں، اور اگر کہیں انتظام ہے بھی، تو ان مجالس میں طلبہ کی شرکت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے، مگر یہ کہ انتظامیہ کی طرف سے شرکت کو لازم ہی کر دیا جائے، تو الگ بات ہے، مگر اس میں مزیداری نہیں، کیونکہ دل کی چاہت ورغبت کے بغیر اصلاحِ نفس کا مرحلہ طے ہونا مشکل کام ہے۔

ایک صاحب جو کہ بڑے بزرگ اور عالم ہیں، اور جامعہ خیر المدارس سے فارغ التحصیل ہیں، اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمہ اللہ کے زمانے کے فارغ التحصیل ہیں، بلکہ حضرت رحمہ اللہ سے انہوں نے کچھ کتابیں بھی پڑھی ہیں، وہ بندے کے پاس تشریف لاتے رہتے ہیں، فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمہ اللہ کی اس زمانے میں جامعہ خیر المدارس میں اصلاحی مجالس ہوا کرتی تھیں، لیکن میرے اور ایک دو طلبہ کے علاوہ اور افراد اس اصلاحی مجلس میں شرکت سے محروم رہتے تھے، اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ تنہا میں ہی ایک فرد مجلس میں موجود ہوتا تھا۔

اندازہ لگائیے کہ جب اس وقت طلبہ کی یہ حالت تھی، تو آج کیا حالت ہوگی؟ اس میں جہاں ایک طرف طلبہ مجرم ہیں، وہاں خود مقتداء، علماء اور ان کے اساتذہ بھی مجرم ہیں، کیونکہ جب اساتذۂ کرام اور مہتمم حضرات ہی اپنے لئے اصلاح وتزکیہ کی ضرورت نہ سمجھیں گے، اور اپنے تئیں اس کام کی اہمیت کے قائل نہ ہوں گے، تو پھر وہ اپنے لائق شاگردوں کو خاک اس طرف متوجہ کریں گے، ہمارے حضرت مسیح اللہ خان جلال آبادی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل جب علماء واساتذہ ہی کی اصلاح نہیں ہو پاتی، اور وہ استاذ اور شیخ الحدیث بن بیٹھتے ہیں، تو ان کے شاگردوں کی کیا اصلاح ہوگی، اسی کو ایک اور بزرگ نے مختصر لفظوں میں اس طرح بیان فرمایا کہ:

"آج کل مربّہ بننے سے پہلے مربّی بن جاتے ہیں"

مطلب یہ ہے کہ اپنی تربیت ہوتی نہیں، دوسروں کی تربیت کے ذمہ دار بن جاتے ہیں، اوران بزرگ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ:

جب کسی چیز کا مربّہ بنایا جاتا ہے، تواس کو صاف کیا جاتا ہے، پکایا جاتا ہے، گودا جاتا ہے، یعنی تخلیہ اور تحلیہ دونوں کام ہوتے ہیں، تب جا کر یہ مربّہ تیار ہوتا ہے۔

اور آج کل طلبہ وعلماء اپنے نفس کا اخلاقِ ذمیمہ سے تخلیہ، اوراخلاقِ حمیدہ سے تحلیہ نہیں کراتے، اوراستاد ومربی بن جاتے ہیں، اس کی وجہ سے یہ سب گڑ بڑ اور خرابی پیدا ہوتی ہے، ہمارے تو بڑے یہ فرماتے فرماتے دنیا سے رخصت ہوگئے کہ طلبہ کے لئے اصلاح وتزکیہ کو باقاعدہ نصاب کا حصہ بنایا جائے، لیکن سنتا کون ہے؟

آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، تو میں بہر حال یہ عرض کررہا تھا کہ جو علماء عوام کے تابع ہوکر چلتے ہیں، اپنے حلقہ اوراپنے معتقدین کی خواہشات کو دیکھتے ہیں، اوراسی کے مطابق اپنے قول وفعل کا رُخ موڑتے ہیں، وہ مقتداء کہلانے کے قابل نہیں، بلکہ مقتدی کہلائے جانے کے مستحق اور حقدار ہیں، کیونکہ مقتداء کی شان تو مقتدیوں کواپنے ساتھ لے کر چلنا ہوتی ہے، نہ کہ خودکو مقتدیوں کے ساتھ لے کر چلنا۔

تو علماء کواپنے آپ کواس مرض سے بچانا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ اس وقت شریعت کا کیا حکم ہے؟ رب کی منشاء کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کیا ہے؟ اکابر سلف کا طرزِ عمل کیا ہے؟ اگراس کواپنا قبلہ وکعبہ بنا کراخلاص کے ساتھ کام کریں گے، توان شاء اللہ قوم کی اصلاح وفلاح ہوگی، اور دنیا میں بھی سرخرو ہوں گے، اور آخرت میں بھی، ورنہ خود بھی ڈوبیں گے، اور دوسروں کو بھی لے ڈوبیں گے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ آمین۔

۳۰ شعبان ۱۴۲۸ھ بروز جمعرات

(ماہنامہ "التبلیغ" جلد 4 شمارہ 9، اکتوبر 2007ء۔ رمضان 1428ھ)

---

www.idaraghufran.org

(35)

خطاب، مخاطب کو ہونا چاہیے

یکم شوال 1428 ہجری۔ بمطابق 2007ء، عیدالفطر کا دن تھا، ایک چھوٹی سی نشست تھی، جس میں میں بھی موجود تھا کہ ایک صاحب نے ایک دوسرے صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے اس مرتبہ فلاں مقام پر عیدالفطر کی نماز پڑھی ہے، عید کی نماز سے پہلے بیان کے دوران خطیب صاحب نے موجودہ حکومت اور حکمرانوں کے خلاف بولنے کی انتہاء کر دی، اتنا سخت بولے اتنا سخت بولے کہ شاید ہی کوئی آج تک اتنا سخت بولا ہو۔

یہاں تک نوبت آ گئی کہ اگلی صف میں کچھ لوگ کھڑے ہو گئے، اور انہوں نے کہا کہ نماز شروع کریں، اور اس کے نتیجہ میں ہڑبڑا کر قبل از وقت ہی اچانک خطیب صاحب نے عید کی نماز شروع کر دی، کئی لوگوں کو اس طرح اچانک نماز شروع کرنے کا پتہ بھی نہیں چلا، اور عید کی نماز کا طریقہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کافی مشکل پیش آئی۔

اس بات کے مخاطب دوسرے صاحب نے فرمایا کہ وہ خطیب صاحب کوئی وعظ تو نہیں کرتے، وہ تو صرف تقریر کرتے اور بولتے ہیں، وعظ تو وہ ہوتا ہے، جس میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آخرت کی باتیں ہوں، اور یہ صرف پہلا موقع نہیں، ہم تو تقریباً بیس سال سے زیادہ عرصہ سے اس مقام پر عید کی نماز پڑھ رہے ہیں، وہ ہمیشہ حکومتِ وقت کے خلاف ہی بولتے ہیں، اور یہ طریقہ صرف موجودہ خطیب صاحب کا اپنا ذاتی معمول ہی نہیں، بلکہ ان کو وراثت میں اپنے والد صاحب سے ملا ہے، ان سے پہلے ان کے والد صاحب عید کی نماز پڑھایا کرتے تھے، جو فوت ہو چکے ہیں، ان کا معمول بھی یہی تھا کہ وہ جو بھی حکومت ہوتی تھی، اس کے خلاف ہی بولا کرتے تھے۔

یہ گفتگو سن کر میں نے تو لاحول پڑھی، اور دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیا انبیائے کرام علیہم السلام

کا بھی طریقہ یہی تھا کہ وہ اپنے مخاطبین اور حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے، ان کی اصلاح کے پہلو کو چھوڑ کر اس زمانے کے حکمرانوں کے خلاف ہی بولا کرتے ہوں، قرآن مجید کے اسلوب اور انبیائے کرام کی سیرت سے تو اس قسم کا انداز معلوم نہیں ہوتا۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ وقت کے نبی کا خطاب مخاطبین اور حاضرین سے ہوا کرتا تھا، نہ کہ غیر حاضرین اور غائبین سے، اور آج بعض حضرات کا طرزِ عمل اس کے برعکس ہے۔

بھلا جس غرض کے لئے لوگ وہاں آئے تھے، یعنی عید کی نماز اداء کرنے کے لئے جب انہیں اس کا طریقہ بھی نہیں بتلایا جاسکا، اور عید کی نماز پڑھنے میں بھی لوگوں کو مشکل پیش آئی، تو پھر ان لوگوں کو اپنی آمد کا اصل مقصد کیسے حاصل ہوگا؟

اسی لئے بعض اللہ والے فرماتے ہیں کہ آج کل بولنے کو کمال سمجھا جاتا ہے، بس بولنے والا ہو، خواہ کچھ بھی بولے، حالانکہ انبیائے کرام علیہم السلام واعظ اور مذکّر ہوتے ہیں، صرف بولنے والے نہیں ہوتے اور وعظ وتذکیر کا تعلق اللہ اور آخرت سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سالہا سال تک ایسے لوگوں کے خطاب سے مستفید ہونے والے لوگوں کو ان کے خطاب سے آخرت کی رغبت، دنیا کی بے رغبتی، اللہ تعالیٰ کی محبت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسنت کی توفیق اور شرعی بنیادی احکام کا بھی علم نہیں ہوتا۔

البتہ سیاسی حالات کا تجزیہ ہوجاتا ہے، اور یہ کام تو آج کل اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ بھی کررہے ہیں، اس میں ایک نبی کے وارث کی کیا تخصیص رہ گئی ہے۔

پھر آج کل جو سیاسی تبصرے ہوتے ہیں، وہ بھی عموماً شرعاً غیبت، بہتان اور دوسرے گناہوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اور گناہوں کے مضامین پر مشتمل خطاب کو وعظ وتقریر کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح کا واقعہ یہاں راولپنڈی کی ایک مسجد میں جمعہ کے دن اس وقت پیش آیا تھا، جبکہ کافی سال پہلے صدر صدام حسین کے دور میں عراق پر امریکی بمباری ہورہی تھی کہ ان خطیب صاحب نے پورے ہفتہ کا حساب لگا کر جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے آنے والے حاضرین کو

بتلایا کہ اس ہفتہ امریکہ کی طرف سے صدر کلنٹن نے اتنے وزن کی بمباری کرائی ہے، اتنا اتنا بارود عراق پر برسایا ہے۔

خطیب صاحب کی یہ گفتگو سن کر درمیان ہی میں حاضرین میں سے ایک صاحب کھڑے ہوگئے، اور کہنے لگے کہ مولانا صاحب! آپ نے غلط حساب لگایا ہے، میں نے رات ہی ٹی وی پر خبریں سنی ہیں، اتنے وزن کی بمباری نہیں کی گئی، جتنی آپ بتلا رہے ہیں، بلکہ اتنے وزن کی کی گئی ہے، لہٰذا آپ کا حساب غلط ہے۔

ملاحظہ فرمائیے کہ ان خطیب صاحب کی کیا عزت رہ گئی، بھلا یہ باتیں کوئی ایک عالم دین کو منبر پر بیٹھ کر کرنا زیب دیتی ہیں۔

افسوس کہ حاضرین کے نماز، روزہ، وضو اور غسل اور اسی طرح دوسری دینی ضروریات کی بات کرنے کی تو توفیق نہیں ہوتی، جس کے بارے میں قیامت کے دن باز پرس ہوگی، اور عام مسلمانوں کی دین سے جہالت کی جو حالت ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، کہ فرضِ عین درجہ کے علم سے بھی اکثر مسلمان واقف نہیں۔

ان حالات میں ضرورت تھی کہ عامۃُ المسلمین، خصوصاً مخاطبین کی دینی ضروریات، اور ان کی عملی زندگی کے حالات کو سامنے رکھ کر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا جاتا، مگر آج بعض حضرات کی طرف سے اس کے بجائے ان شخصیات پر تبصروں اور طعن و تشنیع پر سارا زورِ زبان خرچ کر دیا جاتا ہے، جو مخاطب ہی نہیں ہوتیں، اس طرزِ عمل میں جہاں ایک طرف مخاطبین کی حق تلفی لازم آتی ہے، وہاں غیبت و بہتان تراشی کا گناہ بھی لازم آتا ہے، اور جس طرح شرعی اعتبار سے غیبت کرنا، اور بہتان لگانا منع و گناہ ہے، اسی طرح غیبت و بہتان سننا بھی گناہ و منع ہے۔

غیبت و بہتان تراشی جو آج کل سیاسی میدان کا لازمی حصہ بن گئی ہے، وغیرہ پر مشتمل مضامین بیان کرنے، اور سننے کو وعظ و نصیحت سے کیسے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ بعض حضرات نے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے حکمرانوں کے خلاف حزبِ اختلاف بنالیا ہے، اور یہ سلسلہ مساجد، مدارس اور عیدگاہوں میں شروع ہوگیا ہے۔

نامعلوم ان حضرات کو اپنی اصلی اور حقیقی ذمہ داریوں کا احساس کیوں نہیں رہا، کیا سارا دین ایک حکومت، یا حکمران کے اردگرد گھومتا ہے؟

اگر کسی کی یہی سوچ ہے تو وہ غلط سوچ ہے، کیونکہ لاکھوں انبیائے کرام علیہم السلام ایسے ہوئے ہیں، کہ نبوت تو ان کو عطاء کی گئی، مگر حکومت وسلطنت عطاء نہیں کی گئی اور وہ اسی حال میں اپنی امت کے لئے ہدایت کا سامان کر کے چلے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبوت اصلی منصب ہے، حکومت و سیاست اصل منصب نہیں ہے، اور جب نبی کے لئے نبوت اصل ہے، نہ کہ سیاست وحکومت، تو اسی طرح ان کے ورثاء و جانشینوں کے لئے بھی ظاہر ہے کہ سیاست وحکومت اصل نہیں ہوگی۔

لہٰذا حکومت و سیاست کو اپنا قبلہ وکعبہ اور اوڑھنا بچھونا بنا لینا، ایک نبی کے وارث کی شان نہیں، یہ سمجھنا کہ حکومت و سیاست کے بغیر ہدایت ملنا ناممکن ہے، یہ سوچ لاکھوں انبیاء علیہم السلام کی سوچ کے خلاف ہے۔

اصل محنت امت کے اعمال اور کردار پر ہونی چاہئے، اور امت کو ہدایت واصلاح کی طرف متوجہ کرنا چاہئے، اگر اس کام کو اجتماعی اور منظّم انداز میں کیا جائے، تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہماری حکومت وسیاست بھی درست ہو جائے گی، اور اس کے بجائے امت کی ہدایت واصلاح کے بغیر براہِ راست اوپر سے تبدیلی کے لئے ساری توانائیاں خرچ کرنا، ہواؤں میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ اس غلط سوچ اور روش کی اصلاح فرمائے، اور خطاب غائبین کے بجائے حاضرین ومخاطبین کو کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد4 شمارہ10، نومبر 2007ء- شوال 1428ھ)

---

(36)

جوش وجذبہ میں اعتدال، اور جامعہ حفصہ کا قضیہ

مستند علم کے ساتھ اصلاح وتربیت یافتہ اکابر ومشائخ کا طرزِ عمل الحمدللہ تعالیٰ ہمیشہ سے سنجیدگی، صبر وتحمل اور بردباری والا رہا ہے، انہوں نے ہوش کے بغیر جوش وجذبہ کے استعمال اور غیر سنجیدہ طرزِ عمل کو پسند نہیں کیا، جو کہ ان کے اپنے نفس پر قابو ہونے کا اثر تھا، اور اپنے متبعین ومعتقدین کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے، وہ سنجیدگی اور صبر وتحمل کی تعلیم وتلقین فرماتے رہے، اگرچہ جذباتی اور جوشیلے طبقے کی طرف سے اُن کے جذبات پر زَد پڑنے کی وجہ سے لعن طعن کا سامنا کرنا پڑتا رہا، اور نہ جانے کیا کیا الزامات ان کو دئے جاتے رہے، مگر اللہ والے، ماحول سے متأثر نہیں ہوا کرتے، اور اس قسم کے اعتراضات سے وہ اپنے اس مؤقف کو جسے حق اور سچ سمجھ رہے ہوں، چھوڑا نہیں کرتے، کیونکہ ان کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے، لوگوں کی خوشنودی کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی۔

آج کل یوں تو اپنے بڑوں اور بزرگوں سے آزادی اوران سے بغاوت ویسے ہی عام ہے۔

گھر گھر میں بڑوں سے آزادی کے مناظر سامنے آرہے ہیں، لیکن دین کے معاملہ میں اپنے بزرگانِ دین کی سرپرستی اور ہدایات سے آزادی، یہ دنیا کے معاملہ سے زیادہ خطرناک اور سنگین ہے، اور یہ اس دور کا بہت بڑا فتنہ ہے، جس معاشرہ میں یہ سوچ پنپتی اور پروان چڑھتی ہے، وہ معاشرہ برباد ہو جاتا ہے۔

اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ بڑوں پر اعتماد واعتقاد کا اصل امتحان اسی وقت ہوتا ہے، جب ان کی ہدایات ونصائح اپنے مزاج ومذاق اور جذبات کے خلاف واقع ہوں، کیونکہ میٹھی چیز کو ہضم کرنا آسان ہوتا ہے، بنسبت کڑوی چیز کے، اور اسی وجہ سے اصلاح کے لئے ضروری شرط اعتماد واعتقاد قرار دی گئی ہے، ورنہ تو یہ حالت ہوتی ہے، جو کسی شاعر نے بیان کی ہے۔

ناصحا! مت کر نصیحت، دل مرا گھبرائے ہے
میں اسے سمجھو ہوں دشمن، جو مجھے سمجھائے ہے

ہر کام کو کرنے کے لئے سلیقہ اور طریقہ کی ضرورت ہے، اور طریقہ وسلیقہ کے لئے ہوش کی ضرورت ہے، اس کے لئے جوش کافی نہیں، بلکہ نرا جوش اکثر وبیشتر کام کے بگاڑ کا سبب بنتا ہے، اور ایسے کام میں ٹھہراؤ اور استقلال بھی نہیں ہوتا، اس کے برخلاف جو کام جوش کے بجائے ہوش کے تحت کیا جائے، اس میں برکت ہوتی ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’کام وہی مفید ہوتا ہے، جو ہوش سے کیا جائے‘‘ (’’الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ‘‘ مشمولہ: ملفوظاتِ حکومت الامت، جلد نمبر ۳ ص ۲۳۷، ملفوظ نمبر ۳۸۱، بعنوان ’’شریعت میں دشمنی کی حدود مقرر ہیں‘‘ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ)

حضرت موصوف ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

’’میری تو دل سے تمنا ہے کہ دین کے ساتھ مسلمانوں کی دنیا کی بھی فلاح ہو، مگر طریقہ کے ساتھ، یونہی اڑنگ بڑنگ کرنے سے کام نہیں چلا کرتا، نہ اس میں برکت ہوتی ہے، میرا تجربہ ہے کہ آج کل مسلمانوں کا کام جوش کے ماتحت ہوتا ہے اسی لیے اس میں استقلال (واستحکام) نہیں ہوتا، اگر ہوش کے ماتحت ہو، تو دنیا کی تمام قومیں بیٹھی دیکھا کریں‘‘ (’’الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ‘‘ مشمولہ: ملفوظاتِ حکومت الامت، جلد نمبر ۳ ص ۲۷، ملفوظ نمبر ۷۹ ملخصاً، بعنوان ’’تدبیر الفلاح یعنی کامیابی کا راستہ‘‘)

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ہر کام کو جوش سے بچ کر اصولوں کے ماتحت کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے، اور آج کل کی طرح ان کو بھی جذباتی لوگوں کی طرف سے طرح طرح کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا تھا، چنانچہ حضرت ایک مقام پر فرماتے ہیں:

’’ہر کام اصول سے ہوسکتا ہے، بے اصول تو گھر کا بھی انتظام نہیں ہوسکتا، ملک

کا تو کیا خاک انتظام ہوگا۔

یہ ہیں وہ اصولی باتیں ،جن پر مجھ کو برا بھلا کہا جاتا ہے اورقسم قسم کے الزامات وبہتان میرے سر تھوپے جاتے ہیں اورلوگ مجھ سے خفا ہیں اور وجہ خفا ہونے کی صرف یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اصول کے ماتحت کام کرو، جوش سے کام مت لو،ہوش سے کام لو، جوش کا انجام خراب نکلے گا،حدودِ شرعیہ کی حفاظت رکھو، وہ ان باتوں کو اپنے مقاصد میں روڑا اٹکانا سمجھتے ہیں۔......

اے صاحبو! آج سے پہلے بھی تو اسلام اور مسلمانوں پر اس سے بڑے بڑے حوادث پیش آئے ہیں کہ اِس وقت اُس کا عشرِ عشیر(دسویں حصے کا سواں حصہ) بھی نہیں ،مگرانہوں نے اُس حالت میں بھی اصولِ اسلام اوراحکامِ اسلام کو نہیں چھوڑا،سلف کے کارناموں کو پیشِ نظر رکھ کر کچھ تو غیرت آنا چاہیے،تم تو معمولی معمولی باتوں میں احکامِ اسلام کو ترک کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہو، وہ حضرات عین قتال کے وقت بھی حدود(واصول) کی حفاظت اوررعایت فرماتے تھے،جس پر آج ہم کو فخر ہے ،اب تم ہی فیصلہ کرلو کہ وہ تھے، خیر خواہِ اسلام، ہمدردِ اسلام، جانبازِ اسلام، یا تم ؟ تحریکِ خلافت کے زمانے میں صاف الفاظ میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ مسائل کا وقت نہیں ،کام کرنے کا وقت ہے (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ''،مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱ص۱۱۵،ملفوظ نمبر۱۱۶،بعنوان''آج کل کے لیڈر اور سیاسی تحریکات پر حضرت کا تفصیلی نقطہ نظر'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ)

ظاہر ہے کہ جب بڑے بڑے اکابر ومشائخ کو بھی جذباتی لوگوں کی طرف سے اصولوں کے ماتحت،کام کرنے اورنرے جوش سے بچنے کی تلقین کرنے کے نتیجہ میں مختلف الزامات دئے گئے،تو آج اس قسم کے الزامات واعتراضات کا ہونا،کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ اکابرِ سلف کی سنت

ہے،اوروہ اعتراضات اس قسم کے بھی ہو سکتے ہیں، کہ اگر کسی کام کے مقاصد کی بجائے طریقۂ کار سے اختلاف کیا جائے،تو اس کو مقاصد کا منکر قرار دیا جائے،اور اس قسم کے الزامات واعتراضات ایسے ہیں،جیسا کہ جب اہلِ بدعت کے سامنے عبادات میں بدعات کے ارتکاب سے منع کیا جاتا ہے،تو وہ منع کرنے والوں کو اصل عبادت کا ہی منکر قرار دیتے ہیں،جیسا کہ آگے آتا ہے۔

اورغور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے اعتراض کرنے والے اکثر وبیشتر دوسرے کو جذبات دلا کر،اوراسے آگے بڑھا کراور خطرات میں پھنسا کرخود پیچھے قدم ہٹالیتے ہیں،اور زبان سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ''قدم بڑھاؤ،ہم تمہارے ساتھ ہیں''حالانکہ وہ جس چیز پر دوسروں کواعتراضات کا نشانہ بناتے ہیں، ان اعتراضات کے زیادہ مستحق وہ خود ہوتے ہیں،اس لئے کہ طریقۂ کار سے اختلاف کرنے والے تو اس عمل کے مکلّف ہی نہیں، جبکہ اختلاف نہ کرنے والے مکلّف ہیں، پھروہ کیوں محض تماشائی بنے رہنے،یازبانی جمع خرچ کرنے پراکتفاء کرتے ہیں۔

آج مسلمانوں میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ جب وہ کسی کام سے ظاہری فائدہ ہوتا ہوا دیکھتے ہیں،خواہ وہ دنیا کا ہی فائدہ کیوں نہ ہو،تو صرف اس فائدہ کو بنیاد بنا کراس کام،یا طریقہ کو جائز،مفید، بلکہ ضروری تک قرار دینے لگتے ہیں،اور شرعی اصولوں کی خلاف ورزی کی پرواہ نہیں کرتے،حالانکہ شریعتِ مطہرہ نے کسی کام کی ظاہری افادیت کی بنیاد پر، جبکہ اس میں کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی،یا کوئی بڑا مفسدہ لازم آرہا ہو، جائز ودرست نہیں رکھا۔

فقہائے کرام نے جابجااس اصول کی وضاحت فرمائی ہے۔

اس باریک نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تحریکات کی مصالح (فوائد) مسلَّم سہی،مگر حدودِ شرعیہ کا اتباع تو ہم پر ہر وقت اور ہر حالت میں فرض ہے اوراحکامِ شرعیہ ہر وقت اور ہر حالت میں واجبُ العمل

ہیں‘‘ (’’الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ‘‘مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر۳ص ۲۳۷ و ۲۳۸، ملفوظ نمبر۳۸۲، بعنوان: ’’حدودِ شرعیہ کا اتباع اور چند بزرگوں کے واقعات‘‘ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ)

مطلب یہ ہے کہ کسی تحریک سے کچھ فوائد و منافع کا حاصل ہونا، اپنی جگہ مسلّم ہے، ان فوائد کا انکار نہیں، لیکن شرعی اصول و حدود کی اتباع اس حالت میں بھی ضروری ہے، اور کسی فائدہ یا منفعت کی خاطر اصول شکنی، اور حدود سے تجاوز جائز نہیں ہو جاتا۔

ایک اور مقام پر حکیم الامت فرماتے ہیں:

’’ان تحریکاتِ حاضرہ (وموجودہ) میں مصالح (فوائد) سے زائد، مفاسد (نقصانات) ہیں اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک مفسدہ (نقصان) ہو اور پچاس مصلحت (فوائد) ہوں، وہاں مفسدہ ہی غالب سمجھا جائے گا، نہ کہ جہاں مفاسد غالب ہوں، وہاں جواز کا حکم کیسے ہوسکتا ہے، طیب اور خبیث کا مجموعہ خبیث ہی ہوگا‘‘ (’’الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ‘‘مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر۵ ص ۱۹۹، ملفوظ نمبر۱۹۴، بعنوان ’’تحریکاتِ حاضرہ میں مصالح سے زیادہ مفاسد ہیں‘‘ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

بلکہ ایک مقام پر تو حضرت موصوف نے دنیوی مصلحت، یا مصالح سے متاثر ہونے کو دین کے کمزور ہونے کی علامت قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

دین میں دنیوی مصالح سے متأثر ہونا، سب کمزوری کی باتیں ہیں، بڑی چیز دین ہے، یہ محفوظ رہے، خواہ تمام مصالح، بلکہ سارا عالَم فنا ہو جائے، کچھ پرواہ نہیں (’’الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ‘‘مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر۲ ص ۳۸۳، ملفوظ نمبر ۶۴۰، بعنوان: ’’بڑی چیز دین ہے‘‘ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ)

مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لئے اصل چیز دین ہے، اس کی حفاظت دنیا کی ہزار مصلحتوں، بلکہ دنیا کے فنا ہونے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

ایک اور مقام پر حضرت تھانوی فرماتے ہیں:

”اگر پچاس دنیوی مصلحتیں (یعنی دنیا کے فائدے) ہوں اور ایک دینی مفسدہ (ایک دینی نقصان) ہو، تو مفسدہ (نقصان) ہی غالب سمجھا جاوے گا، عرض کیا گیا کہ جن نصوص (قرآن وحدیث) میں جہاد کا حکم ہے، یا صبر کا، اس کے اعتبار سے حکم منصوص (قرآن وحدیث کا حکم) ہوتے ہوئے، اپنی رائے سے اس کے خلاف ایک طریقہ کا اختیار کرنا کہ نہ وہ جہاد ہے، نہ صبر ہے، یہ مسکوت عنہ (یعنی ایسا کام کہ جس سے نہ شریعت نے منع کیا اور نہ ہی اس کا حکم دیا، بلکہ سکوت رکھا) ہوگا، یا اس کو منہی عنہ (ممنوع) کہیں گے، جواب فرمایا کہ باوجود ایسی ضرورتیں واقع ہونے کے متقدمین نے جب اس کو ترک کیا، اختیار نہیں کیا، تو یہ اجماع ہو گیا، اس کے ترک پر، اس لئے ممنوع ہوگا، یہ احتمال بھی نہ رہا کہ نصوص کو مأول، یا معلل کہہ لیا جاوے (یعنی قرآن وحدیث میں بیان کیے ہوئے دلائل میں کوئی تاویل کرکے، یا کوئی علت نکال کر معنیٰ کچھ اور مراد لے لئے جاویں)“ (”الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ“ مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر۵ ص ۱۵۷، ملفوظ نمبر ۱۵۲، بعنوان ”دینی مفسدہ سے منع کیا جائے گا“ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور متقدمین نے جس طریقہ کو ضرورت کے باوجود اختیار نہیں کیا، خواہ وہ نعمت اور راحت کی حالت ہو، یا مصیبت اور تکلیف کی، تو اس کے خلاف کوئی طریقہ اختیار کرنا، شرعاً ایک جائز اور مباح کام نہیں، بلکہ ناجائز اور ممنوع کام ہے، اور دنیوی کئی فائدے بھی اس طریقہ سے حاصل ہو رہے ہوں، تب بھی ایک دینی مفسدہ کو ترجیح حاصل ہوگی۔

اور قدرت اور قوت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے حضرت تھانوی فرماتے ہیں:

”اگر قدرت ہے، تو تلوار لے کر غلبہ حاصل کرو، منع کون کرتا ہے؟

اور اگر اس کی قدرت نہیں، جیسا کہ ظاہر ہے، تو صبر کرو، حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)

سارا مدار قوت اور قدرت پر ہے، جیسے نماز روزہ فرض ہے (اسی طرح اسلامی) حکومت بھی فرض ہے، لیکن اسی وقت جبکہ قدرت ہو اور عدمِ قدرت (قدرت نہ ہونے) پر ایسا کرنا، اپنے کو ہلاکت میں پھنسانا ہے، اور (اِس وقت) کافی قدرت کا نہ ہونا، اظہر من الشمس (سورج سے بھی زیادہ ظاہر) ہے، اور (اِس وقت) جتنی قدرت (حاصل) ہے، اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ کسی نے دیا سلائی جلائی اور اس پر دوسرے نے ہاتھ رکھ دیا، بجھ گئی، ایسی قوت اور قدرت سے کیا کام چل سکتا ہے'' (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۸ ص ۳۳۶ ملفوظ نمبر ۴۶۷، بعنوان: ''انتظام واہتمام کی حد'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول ۱۴۲۸ھ)

موصوف اور ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''اگر کسی ظالم کے مقابلے میں قدرت ہو، تو ضرب یضرب (یعنی جہاد وقتال) پر عمل ہو، اگر قدرت نہ ہو، تو صَبَرَ یَصْبِرُ (یعنی صبر) پر عمل ہو، یہ بیچ کی صورت جس کو ستیہ گرہ (حکومت کے خلاف پُر امن تحریک) کہا جاتا ہے، اس کا کوئی ماخذ سمجھ میں نہیں آتا'' (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۵ ص ۳۰۱، ملفوظ نمبر ۳۲۶، بعنوان ''ستیہ گرہ کا مآخذ سمجھ میں نہیں آیا'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

''تحریکاتِ حاضرہ میں بڑا ہی ہڑبونگ لوگوں نے مچایا، باوجود اس کے کہ بابِ فتن (یعنی فتنوں کے وقت سے متعلق مستقل موضوع) حدیث میں موجود ہے، اور تمام احکام بالتصریح (واضح طور پر) مذکور ہیں، اور دونوں نمونے (یعنی فتنے و مغلوبیت اور امن وغلبہ دونوں قسم کے حالات مکی اور مدنی دور میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر گذرے ہیں، پھر زیادہ کلام کی گنجائش کہاں ہے، بس یہ دیکھنا کافی ہے

کہ اگر مظالم سے بچنے پر قادر نہیں ہو، اپنے کو مکی سمجھو، اور صبر کرو، اور اگر قادر ہو، مدنی سمجھو، اور قدرت سے کام لو، مگراب تو یہ ہورہا ہے کہ، یا تو مکی کی جگہ مکھی اور ذلیل (بزدل) بنیں گے اور یا مدنی کی جگہ بدنی اور پہلوان (جوشیلے) بنیں گے، اور خطرات میں پھنسیں گے، شارع (نبی علیہ السلام) نے ہر چیز کا انتظام کیا ہے“

(”الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ“ مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر۲ ص۲۲۱،۲۲۲، ملفوظ نمبر۳۱۱، بعنوان ”تحریکات میں مدنی بنو، یا مکی رہو، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخ اشاعت: ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ)

معلوم ہوا کہ قدرت نہ ہونے کے وقت صبر سے کام لینے، اور اپنے آپ کو مکّی سمجھنے کا مطلب بزدلی نہیں، بلکہ تحمّل اور بُردباری ہے، جو شجاعت و بہادری کے ساتھ جمع ہوتی ہے، کیونکہ کمزور آدمی اپنے آپ پر قابو نہیں رَکھ پاتا اور جوش وجذبہ میں آکر آپے سے باہر ہوجاتا ہے۔

اسی طرح قوّت کے وقت مقابلہ کرنے اور اپنے آپ کو مدنی سمجھنے کا مطلب نرے جوش وجذبہ کا استعمال نہیں۔

خلاصہ یہ کہ مکی ومدنی حالات کی حقیقت بزدلی اور جوش کی افراط تفریط سے پاک ہے۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ:

”جتھے مقابلے کے لئے جاتے ہیں اور گرفتار ہوتے ہیں، خاموش مقابلہ کرتے ہیں، اگر حکومت کی طرف سے تشدّد بھی ہو، تو تب بھی جواب نہیں دیا جاتا، ان صورتوں کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

آپ نے جواب میں فرمایا:

”عقلی دو ہی احتمال ہیں، یا تو مقابلے کی قوت ہے، یا قوت نہیں، اگر قوت ہے، تو گرفتار ہونے کے کیا معنیٰ؟ مقابلہ کرنا چاہئے، اور جب مقابلہ نہیں کرسکتے، تو یہ صورت عدمِ قوت (قوت نہ ہونے) کی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے، تو عدمِ قوت

(قوت نہ ہونے) کی حالت میں قصداً ایسی صورت اختیار کرنے کی کہ خود ضرب وحبس (قید اور مار پٹائی) میں مبتلا ہو، شریعت اجازت نہیں دیتی، بلکہ بجائے ایسے مخترع (خودساختہ) مقابلہ کے، مکارہ (ناگوار اُمور) پر صبر سے کام لینا چاہئے، خلاصہ یہ کہ اگر قوت ہے، مقابلہ کرو، اگر قوت نہیں صبر کرو، ان دوصورتوں کے علاوہ تیسری کوئی صورت منقول نہیں، تو کیا ان تدابیر کو مسکوت عنہ (یعنی ایسی چیز جس پر شریعت نے کوئی حکم نہیں لگایا) کہا جائے گا؟

فرمایا کہ مسکوت عنہ (یعنی ایسی چیز جس پر شریعت نے کوئی حکم نہیں لگایا) وہ ہوگا، جس چیز کی ضرورت خیر القرون میں واقع نہ ہوئی ہو، بلکہ خیر القرون کے بعد اس کی حاجت پیش آئی ہو، اور باوجود ضرورت پیش آنے کے یہ تدابیرِ خاص اختیار نہ کی گئیں، اس کو مسکوت عنہ (یعنی ایسی چیز جس پر شریعت نے کوئی حکم نہیں لگایا) نہ کہیں گے، منہی عنہ (ممنوع) کہیں گے۔ اس میں ہم لوگوں کو اجتہاد کی گنجائش نہیں، اب اس قاعدہ کے بعد یہ سمجھو کہ خیر القرون میں زیادہ وقت اسی قسم کا گزرا اور بہت زیادہ ضرورتیں مخالفین کے مقابلے کی پیش آئیں، مگر باوجود ضرورت کے اور ضرورت بھی سخت ضرورت، پھر بھی ان تدابیر کو اختیار نہیں کیا گیا تو یہ تدابیر منہی عنہ (ممنوع) ہوں گی، نہ کہ مسکوت عنہ (یعنی ایسی چیز جس پر شریعت نے کوئی حکم نہیں لگایا)'' (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۵ ص ۱۹۴ و ۱۹۵، ملفوظ نمبر ۱۹۰، بعنوان ''خیر القرون میں دوصورتیں'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

حضرت سے ایک موقعے پر سوال کیا گیا کہ:

''کشمیر پر جو مسلمانوں کے جتھے جارہے ہیں، اُن کا وہاں پر جا کر لڑنا مقصود نہیں، صرف حکومت پر اثر ڈالنا ہے، یہ صورت شرعاً کیسی ہے''؟

آپ نے اس کے جواب میں فرمایا:

’’یہ شرعی لڑائی تو ہے نہیں، اب دو ہی صورتیں ہیں، یا قتال پر قدرت ہے، یا عجز؟ اگر قدرت ہے، تو قِتال اور اگر قدرت نہیں، تو صبر، درمیان میں اور کوئی چیز نہیں ہے، نہ یہ درمیانی صورتیں سمجھ میں آتی ہیں، اور نہ آج کل کی درمیانی صورتیں اسلامی صورتیں ہیں، سب دوسری قوموں کی تقلید ہے‘‘(’’الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ‘‘ مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱ص۱۰۳، ملفوظ نمبر ۱۱۶، بعنوان ’’آج کل کے لیڈر اور سیاسی تحریکات کے بارے میں حضرت کا تفصیلی نقطہ نظر، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ)

معلوم ہوا کہ شریعت سے ثابت شُدہ صورتوں (یعنی قدرت کے وقت مقابلہ اور قدرت نہ ہونے کے وقت صبر) کے علاوہ جو صورتیں لوگوں نے حکومت پر اثر ڈالنے کے لیے گھڑ رکھی ہیں، وہ دراصل غیر مسلموں کی تقلید ہیں، اور یہ اسلامی صورتیں نہیں ہیں۔

حضرت موصوف سے سوال کیا گیا:

’’اِس وقت کے زمانے کے لحاظ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کمزور کو قوی کے مقابلہ میں اسی صورت سے کامیابی ہوسکتی ہے، یعنی پبلک حکومت کا مقابلہ اسی صورت سے کرسکتی ہے‘‘؟

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

’’یہ نصوص کے مقابلہ میں اجتہاد ہے، اور اجتہاد کا ہم کو حق نہیں، میں نے جو دو صورتیں بیان کیں، یہ تو منصوص ہیں، اور آپ جو تدابیر اور طریق کار بیان کررہے ہیں، یہ اس مضمون کا معارِض (ومقابل) ہے، اسی لیے یہ طریق سلف سے منقول نہیں‘‘ (’’الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ‘‘ مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱ص۱۰۳، ملفوظ نمبر ۱۱۶، بعنوان ’’آج کل کے لیڈر اور سیاسی تحریکات کے بارے میں حضرت کا تفصیلی نقطہ نظر‘‘)

آپ سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ:

''لڑ تو سکتے نہیں، پھر کیا صورت ہو''؟

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

''جو میں عرض کر رہا ہوں، وہ منصوص ہے، اسی پر عمل کریں، یعنی قدرت کو دیکھ لیں، اگر قدرت اور قوت ہے، تو بجائے جتّھے بھیجنے کے قتال کریں، جہاد کریں، تلوار ہاتھ میں لیں، لڑیں، اور اگر قدرت نہیں، جیسا کہ ظاہر ہے، صبر کریں، نیز عجز کی صورت میں یہ بھی ہوگا کہ آئندہ اگر کوئی ضرر پیش آیا، تو اس کے برداشت کی بھی قوت نہ ہوگی اور جس ضرر سے بچنے کی قدرت نہ ہو، یا مشکل ہو، اس میں نہ پڑنا چاہیے (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۱ص ۱۰۵، ملفوظ نمبر۱۱۶، بعنوان'' آج کل کے لیڈر اور سیاسی تحریکات کے بارے میں حضرت کا تفصیلی نقطہ نظر''

آج کل جب کوئی شخص اہم اور مفید مقصد کو لے کر کھڑا ہوتا ہے، تو اس میں بعض اوقات یہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے کہ جوش اور جذبہ میں آ کر طریقۂ کار غیر مناسب ہو جاتا ہے، اور مقصد کے مفید اور اہم ہونے کی وجہ سے طریقۂ کار کے غیر مناسب ہونے سے لوگوں کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔

حالانکہ کسی بھی دین کے معاملے میں صرف نیت اچھی ہونے، اور موقف درست ہونے کی بنیاد پر ہر قسم کے طریقِ کار کو درست قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ شریعت کی طرف سے جس طرح سے کسی کام کے لیے نیت کا درست ہونا ضروری ہے، اسی طرح اس کام کو انجام دینے کے طریقۂ کار کا درست ہونا بھی ضروری ہے، اور انہیں دونوں چیزوں کا نام شریعت نے اخلاص اور صحتِ عمل رکھا ہے۔ [۱]

---

[۱] قرآن مجید میں سورہ ملک کی آیت نمبر۲ یعنی:

''الذی خلق الموت والحیوۃ لیبلو کم ایکم احسن عملا''

'' اللہ تبارک وتعالیٰ نے موت وحیات کے دو متوازی ومتقابل سلسلے پیدا فرمائے، تاکہ تمہیں جانچے اور آزمائے کہ تم میں کس کا عمل زیادہ اچھا ہے'' ﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

چنانچہ اگر کوئی شخص دین کا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ اور اونچے سے اونچا کام نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ انجام دے، مگر اس میں شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ کی رعایت نہ کرے، بلکہ اس کی مخالفت کرے، تو شرعاً نیت اچھی ہونے کے باوجود اس طرح عمل کرنے کو درست نہیں کہا جاسکتا، مثلاً نماز ہی کا عمل ہے، جو ایمان کے بعد سب سے بڑا رُکن ہے، مگر اس میں بھی اگر کسی کی نیت تو اچھی ہو، لیکن مکروہ وقت میں، یا بے وضو، یا ناپاک کپڑوں میں نماز پڑھے، یا رکوع وسجود کی مخالفت کرے، تو اس سے تو منع ہی کیا جائے گا۔

چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان تحریکات میں شرکت کرنے والوں پر جو مجھ کو غصہ ہے، اس کا اصلی سبب (اصل وجہ) ان کی محبت ہے، اس طرح سے کہ اپنے ہوکر پھر حدود سے تجاوز، ایسا کیوں کرتے ہیں، مجھ کو مقاصدِ شرعیہ اور سلطنتِ اسلامیہ اور مقاماتِ مقدسہ کی امداد اور تحفظ سے خدا نہ کرے، کیسے اختلاف ہوسکتا ہے؟ اختلاف صرف طریقِ کار سے ہے'' (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۵ ص ۲۰۱، ملفوظ نمبر ۱۹۶، بعنوان ''تحریکات میں شرکت کرنے والوں پر غصہ کا سبب'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

مطلب یہ ہے کہ میں مختلف تحریکات کے شرکاء کے غلط طرزِ عمل سے اختلاف، یا ان پر غصہ کرتا ہوں، یہ کسی عداوت اور دشمنی کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان سے محبت اور ہمدردی کی وجہ سے ہے، کہ وہ اپنے اور مسلمان بھائی ہوکر جوش وجذبہ میں آکر حدود سے تجاوز کیوں کرتے ہیں، اور

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

اس آیت کی تفسیر کشاف نے یوں کی ہے:

أحسن عملا .قيل: أخلصه وأصوبه، لأنه إذا كان خالصا غير صواب لم يقبل، وكذلك إذا كان صوابا غير خالص، فالخالص: أن يكون لوجه الله تعالى، والصواب: أن يكون على السنة (تفسير الكشاف، ج۴ص ۵۷۵،سورة الملك)

بغوی نے معالم التنزیل میں فضیل بن عیاض سے بھی یہی تفسیر اس مقام پر نقل فرمائی ہے۔

خالصا صوابا فالخالص إذا كان الله والصواب إذا كان على السنة(تفسير البغوى، ج۵ص ۱۲۵، سورة الملك)

مجھ کو شرعی مقاصد، اسلامی حکومت کے قیام، اور مقاماتِ مقدسہ (مثلاً حرمین شریفین، بیت المقدس اور مساجد و مدارس) کی حفاظت اور ان کی مدد کرنے سے اختلاف نہیں، کیونکہ ان چیزوں سے کس مسلمان کو اختلاف ہوسکتا ہے، میرا اختلاف تو صرف طریقِ کار سے ہے۔

ایک اور مقام پر حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں:

> جو طریقۂ کار اختیار کر رکھا ہے، مجھ کو اس سے اختلاف ہے، میں نے طریقہ کی قید اس لئے لگائی کہ مقاصدِ شرعیہ اور مسلمانوں کی فلاح اور بہبود سے کون ایسا مسلمان ہے، جس کو اختلاف ہو (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۸ ص ۳۳۹ ملفوظ نمبر ۴۷۴، بعنوان: ''تدابیر غیر مشروعہ کی ممانعت'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول ۱۴۲۸ھ)

پس کسی بھی کام کے لیے صرف مقصد کا نیک اور شریعت کے موافق ہونا، کافی نہیں، بلکہ اس کے طریقۂ کار اور اس کی تدابیر کا بھی شریعت کے موافق ہونا، ضروری ہے۔

اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ شریعت کے بتلائے ہوئے طریقے کو پیچھے ڈال کر اور ان کی خلاف ورزی کر کے دین کی کوئی خدمت کرے گا، تو وہ ایسی خام خیالی میں مبتلا ہے کہ اس پر نہ تو اللہ تعالیٰ کی رضا مرتب ہوتی، اور نہ ہی وہ کام جائز ہوجاتا۔

ماضی میں بھی بعض جذباتی اور جوشیلے لوگوں کی طرف سے اس طرح کی غلطیاں ہوئیں کہ انہوں نے جوش اور جذبات کے نتیجے میں بعض اچھے اور مفید مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے طریقے ایسے اختیار کیے، جن سے غیر معمولی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا، اور تربیت یافتہ سنجیدہ اکابر ومشائخ کی ہدایات کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا، بلکہ ان ہدایات کے عوض ان کی طرف طرح طرح کے الزامات منسوب کیے گئے۔

اور آج بھی وقتاً فوقتاً اس طرح کے مختلف واقعات سرزد ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ دنوں جامعہ حفصہ، اسلام آباد میں بعض علماء کی طرف سے جوش اور جذبات کے

استعمال، اوراس کے نتیجے میں ہونے والے ناقابلِ تلافی نقصان کے بعد ایک جذباتی طبقہ میں اپنے تربیت یافتہ جمہور اکابر ومشائخ سے نفرت، اوران کی اتباع سے روگردانی، بلکہ ان کی شان میں گستاخی کا رجحان بڑھ رہا ہے، حالانکہ اس معاملے میں جمہور علماء واکابر نے اسلام کے نفاذ، بے حیائی کے خاتمے اورشرعی مساجد کے انہدام کا سلسلہ بند ہونے کے مطالبات کو برحق قرار دیا تھا، لیکن ان حضرات کو موجودہ حالات میں حکومت سے ان مطالبات کومنوانے اورتسلیم کرانے کے صرف جذباتی طرزِ عمل اورطریقِ کار سے اختلاف تھا، اوراسی وجہ سے انہوں نے بارہا، اس طریقۂ کار کے مذکورہ حالات میں درست اور مناسب نہ ہونے کی نہ صرف نشاندہی فرمادی تھی، بلکہ انہوں نے بڑی دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ اس کی متعدد کوششیں بھی فرمائی تھیں کہ اس طرزِ عمل کواختیار نہ کیا جائے، کیونکہ ان حضرات کے تجربے، بصیرت اوردوراندیشی کی روشنی میں اس طریقۂ کار کواختیار کرنے میں بہت سے خدشات وخطرات تھے، اوراس طریقۂ کار کے مؤثر ونتیجہ خیز ہونے کی بھی امید نہ تھی، جس کے بعد وہ خدشات درست بھی ثابت ہوئے۔

اس طرزِ عمل کے نتیجہ میں حکومت نے ظالمانہ وجابرانہ کاروائی کر کے بے شمار علماء، طلبہ وطالبات کوشہید کردیا، طرزِ عمل وطریقۂ کار سے سنجیدہ اکابرومشائخ کا اختلاف اپنی جگہ تھا، لیکن یہ اختلاف اتنا بڑا اورشدید نہیں تھا کہ جس کی سزا سفاکانہ اورظالمانہ اجتماعی قتلِ عام ہو۔

یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ اکابر ومشائخ نے حکومت کے اس طرح طاقت کے اندھادھند استعمال کی نہ صرف مذمت کی، بلکہ اپنی ممکنہ کوششیں بھی اس مسئلے کے مناسب حل کے لئے کیں، جوایک مرحلہ پرکارگرثابت ہوتی ہوئی دکھائی دیں، لیکن بعض پس پردہ قوتوں کی طرف سے مداخلت کے بعد ساری امیدوں پر پانی پھر گیا، اوروہ کچھ ہوا، جس پرساری قوم رنجیدہ اورغم زدہ ہے۔

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سنجیدہ اکابر ومشائخ کی طرف سے پیش کیے گئے خدشات کے درست ثابت ہونے، اوران کی سنجیدہ کوششوں کے باوجود بھی ایک جذباتی طبقے

کی طرف سے سنجیدہ اکابر ومشائخ کو غلط اور مجرم قرار دیا جارہا ہے، اور جذبات کے نتیجے میں بعض لوگ یہاں تک بھی جری ہوگئے ہیں کہ اسلاف اور اپنے اکابرین کے طرزِ عمل کو منافقانہ اور بزدلانہ یا احمقانہ قرار دے رہے ہیں۔

جبکہ مستند اکابر ومشائخ کی شان میں اس طرح کے گستاخانہ الفاظ استعمال کرنا بہت بڑی دلیری، جرأت، بے باکی اور سنگین نتائج کی حامل ہے۔

سنجیدہ اکابر ومشائخ پر عدمِ اعتماد کے یہ جراثیم بہت خطرناک ہیں، جو ایک سازش کے تحت مسلکِ حقہ کو نقصان پہنچانے اور بدنام کرنے کے لئے پھیلائے جارہے ہیں۔

جذباتیت کی رو میں بہنے اور سنجیدہ اکابر ومشائخ سے اختلاف کا اگر یہی سلسلہ جاری رہا، تو وہ دن دور نہیں کہ مسلکِ حقہ میں آزادی وبے راہ روی کے جراثیم جڑیں پکڑ لیں، اور ہر شخص جذبات میں آکر اپنی مرضی کے مطابق جس طرزِ عمل کو مناسب سمجھے، اس کو اختیار کرے اور اس طرح نقصانات کا سلسلہ مزید ترقی کرجائے۔

صدر وفاق المدارس، حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب کا ایک مضمون جو 8/ اپریل 2007ء کو روزنامہ اسلام میں شائع ہوا، اس میں انہوں نے اسی نکتہ پر بہت پہلے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا، جو پیش گوئی کے طور پر بعد میں درست ثابت ہوا کہ:

> ’’اپنی رائے کے سامنے بڑوں اور بزرگوں کی رائے کو بے دھڑک رد کیا جاسکتا ہے، جو ظاہر ہے کہ مہلک اور تباہ کن سوچ ہے، جس معاشرے میں یہ سوچ پنپتی اور پرورش پاتی ہے، وہ تباہ اور برباد ہوجاتا ہے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہمارے یہاں یہی انداز ہے، اس لئے وہاں اساتذہ اور انتظامیہ کے ساتھ بدسلوکی کے واقعات روزمرہ میں شامل ہیں، ہمارے اسلاف اور اکابر کا یہ طرز نہیں ہے اور جس نے اس طرز کی مخالفت کی ہے، وہ نقصان میں رہا اور خفت اٹھائی ہے‘‘ (روزنامہ اسلام، صفحہ۴، 8اپریل 2007ء)

اور کیونکہ اس وقت ایک طبقہ مذکورہ اکابر ومشائخ کے خلاف زبان درازی میں سرگرم عمل ہے، اور نہ جانے ان کو کس قسم کا مجرم سمجھ رہا ہے، اس لئے ایسے موقع پر ضروری ہے کہ اکابرین کے اس موقف کا اعادہ کردیا جائے، تاکہ ان کے موقف سے متعلق پھیلائی گئی، غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکے اور ان کا موقف پوری طرح سمجھا جاسکے۔

۲۹/ ربیع الاول، وکیم ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ، مطابق 18 / 19، اپریل 2007ء کو ”مجلسِ عاملہ وفاق المدارس العربیہ، پاکستان“ نے ایک نہایت ہی معتدل اور بصیرت آمیز اعلامیہ جاری کیا، جس کا ایک اقتباس یہ ہے:

> جامعہ حفصہ اسلام آباد کے قبضہ کے حوالہ سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلسِ عاملہ اپنے اِس موقف کا اِعادہ ضروری سمجھتی ہے کہ جہاں تک جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات اور لال مسجد کی انتظامیہ کے اِن مطالبات کا تعلق ہے کہ:
>
> (1)...... ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔
>
> (2)...... اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کو فوری طور پر دوبارہ تعمیر کیا جائے۔
>
> (3)...... بدکاری اور فواحش کے اڈے ختم کیے جائیں۔
>
> (4)...... نام نہاد تحفظِ حقوقِ نسواں ایکٹ کی خلافِ اسلام دفعات، منسوخ کی جائیں۔
>
> یہ مطالبات نہ صرف یہ کہ دُرست اور ضروری ہیں، بلکہ ملک کے عوام کے دل کی آواز ہیں اور دستورِ پاکستان کا ناگزیر تقاضہ ہیں، اس لیے یہ اجلاس اِن مطالبات کی مکمل حمایت کرتے ہوئے حکومت پر زور دیتا ہے کہ وہ اپنے اِسلامی اور دستوری فرائض کی پاسداری کرتے ہوئے اِن کی منظوری کا اعلان کرے اور اِن پر عملدر آمد کے لیے عملی اقدامات کا آغاز کرے۔
>
> البتہ اِس سلسلہ میں جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات اور لال مسجد کے منتظمین

نے جو طریق کار اختیار کیا ہے، اُسے یہ اجلاس دُرست نہیں سمجھتا اور اِس کے لیے نہ صرف وفاق المدارس العربیہ کی قیادت خود اسلام آباد جا کر متعلقہ حضرات سے متعدد بار بات چیت کر چکی ہے، بلکہ ''وفاق'' کے فیصلہ اور مؤقف سے انحراف کے باعث جامعہ حفصہ کا ''وفاق'' کے ساتھ الحاق بھی ختم کیا جا چکا ہے۔

یہ اجلاس وفاق المدارس کی اعلیٰ قیادت کے موقف اور فیصلہ سے جامعہ حفصہ اسلام آباد اور لال مسجد کے منتظمین کے اس انحراف کو افسوس ناک قرار دیتا ہے، اور ان سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے ملک کی اعلیٰ ترین علمی و دینی قیادت کی سرپرستی میں واپس آجائیں، تاکہ اس مسئلہ کا کوئی باوقار اور نتیجہ خیز حل نکالا جاسکے، اس کے ساتھ ہی یہ اجلاس حکومت کو خبردار کرتا ہے کہ اس کی طرف سے جبر اور تشدد کی کوئی بھی کارروائی اس مسئلہ کو مزید بگاڑنے کا باعث بنے گی، اس لیے وہ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اپنی پالیسیوں میں تبدیلی کا احساس کرتے ہوئے مذاکرات اور گفت وشنید کے ذریعہ یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرے (ماہنامہ ''الفاروق''، جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ، صفحہ نمبر۱۲؛ ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی؛ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ، مئی 2007ء صفحہ نمبر ۲۸۔ ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' جامعہ مدنیہ، لاہور، ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ۔ وروزنامہ ''اسلام'' اتوار۴/ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ صفحہ نمبر۴)

وفاق المدارس کے اعلامیہ کے مذکورہ اقتباس کو بار بار پڑھ کر بنظرِ انصاف غور فرمائیے کہ اس میں طرفین کے لئے کتنی معتدل رہنمائی ہے، کتنی سنجیدگی اور تحمل کے ساتھ جوش اور جذبات سے بچتے ہوئے اور راہِ اعتدال پر قائم رہتے ہوئے، ایک ایک لفظ، بلکہ ایک ایک حرف کا انتخاب کیا گیا ہے۔

ہمارے نزدیک تو یہ صرف طرفین کے لئے رہنما ہدایت ہی نہیں، بلکہ خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سنگین نتائج کی پیشین گوئی سے کم حیثیت نہیں رکھتا، اور یہ اعلامیہ ایسے وقت کا

جاری شدہ ہے، جبکہ آئندہ آنے والے وقت میں کسی کو پتہ بھی نہ تھا کہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔
مولانا زاہدُ الراشدی صاحب زید مجدہم کا ایک مضمون، جو نوائے حق کے ذیل میں مؤرخہ 21/ ربیع الاول 1428ھ کو روزنامہ اسلام راولپنڈی میں شائع ہوا تھا، اُس میں انہوں نے تحریر فرمایا تھا:

جہاں تک اسلام آباد کی مساجد کے تحفظ، ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ اور معاشرہ میں فواحش ومنکرات کے سدِ باب کے حوالے سے ان کے موقف اور مطالبات کا تعلق ہے، تو ان سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور یہ ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے، نیز ان مطالبات کے حق میں معروف طریقوں سے احتجاج کرنے اور حکومت پر دباؤ ڈالنے کی جدوجہد کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس حوالے سے حکومت کے ساتھ تصادم، قانون کو ہاتھ میں لینے، یا متوازن نظام قائم کرنے کے طرزِ عمل سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔
اس سلسلے میں ملک کے اکابر علمائے کرام نے جو موقف اختیار کیا ہے، اور جس کا اظہار حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں کیا ہے، اُصولی طور پر وہی موقف درست ہے، اور تمام اہلِ دین کو اس کی حمایت وتایید کرنی چاہیے (روزنامہ ''اسلام'' منگل ۲۱/ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ صفحہ نمبر ۴)

ہم اس موقع پر یہ بات کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ احتجاج کے معروف طریقوں کو بنیاد بنا کر ہی لوگوں کو غیر معروف طریقوں کی جرأت ہوتی ہے، اس لیے معروف طریقوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔
جامعہ خیرُ المدارس کے ترجمان ماہنامہ ''الخیر''، ملتان میں کلمۃُ الخیر کے تحت ایک مضمون شائع ہوا، اُس میں تحریر کیا گیا:

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا موقف واضح ہے، وفاق مساجد ومدارس کے

انہدام کے حکومتی فیصلے کو قطعی غلط قرار دیتا ہے، اور اس کی بھرپور مذمت ومخالفت کرتا ہے۔

مساجد ومدارس کا تحفظ ہمارے فرائض میں شامل ہے، مساجد کو سیکورٹی رسک، یا کسی توسیعی منصوبے کا بہانہ بنا کر، گرانا قطعی ناقابلِ قبول ہے، اس پر احتجاج ہمارا آئینی، قانونی اور جمہوری حق ہے، لیکن سرکاری عمارات پر قبضہ، یا قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا، نہ صرف ہماری روایات کے خلاف ہے، ہمارے مقاصد کے لیے بھی مفید نہیں۔

اس طرح کے اقدامات سے مدارس پر لغو اور بے ہودہ الزامات عائد کرنے والوں کو موقع مل سکتا ہے، کہ وہ اہلِ دین کو مزید بدنام کریں۔

پاکستان کی ایک ایک مسجد اور مدرسہ کی حفاظت ہمارا دینی فریضہ ہے اور ہم یہ فرض آخر وقت تک اداء کرتے رہیں گے، مگر ہم اپنے جائز مطالبات منوانے کے لیے کوئی ایسی راہ اختیار نہیں کریں گے، جو ہماری روایات اور قانون سے متصادم ہو۔

مدرسہ حفصہ کی طالبات اور اس کی انتظامیہ کا جذبہ قابلِ قدر ہے، اور انہوں نے بھرپور احتجاج کر کے اپنا فرض اداء بھی کر دیا ہے، اب انہیں چاہیے کہ وہ اپنے ان بزرگوں پر اعتماد کریں، جو مسئلہ کے حل کے لیے سرگرمِ عمل ہیں اور مفاہمت کی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔

ہمارا ''جہاد'' جہالت اور جاہلیت کے خلاف ہونا چاہیے، وہ جاری رہے گا، ہم ریاستی جبر اور قوت آزمائی کا مقابلہ صبر اور اپنے موقف پر استقامت کے ساتھ کریں گے، ہمارے پاس تعلیم کے لیے آنے والے بچے اور بچیاں قوم کی امانت ہیں، ان کے عقیدہ وایمان اور عمل کی حفاظت کے ساتھ ان کی عزت وآبرو اور جانوں کی حفاظت بھی ہماری دینی، اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے، ہم اس وقت

کسی بھی قسم کے تصادم، یا محاذ آرائی کے متحمل نہیں ہیں (ماہنامہ ''الخیر'' صفر ۱۴۲۸ھ، مارچ 2007ء صفحہ نمبر ۸)

حضرت مولانا عزیز الرحمان صاحب دامت برکاتہم مدیر مسئول ماہنامہ البلاغ، جامعہ دارالعلوم کراچی نے مذکورہ ماہنامہ کے اداریہ میں ایک بڑا پُر مغز اور دلسوز مضمون تحریر فرمایا تھا، اس موقع پر اس کو ملاحظہ کر لینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا، لکھتے ہیں:

اس معاملہ میں اہلِ علم اور دینی حلقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر یہ بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ احتجاج شریعت، قانون اور تہذیب واخلاق کے دائرے میں رہے، جامعہ حفصہ کی طالبات جن دینی جذبات سے سرشار ہیں، اور غیر شرعی اقدامات کا ازالہ کرنے کے لیے کھڑی ہوئی ہیں، وہ جذبہ بلاشبہ مبارک ہے، لیکن جو حالات درپیش ہیں، اس کے پیشِ نظر مدرسہ کی طالبات کے لیے ازالۂ منکرات کی کوشش کا یہ انداز، ملک بھر کے علماء کی رائے میں غلط ہے کہ اس میں جان و مال اور عزت وآبرو کے پامال ہونے کا غالب اندیشہ ہے، ملک کے کسی بھی طبقہ کے پاس، کسی بھی حصے میں، منکرات کے ازالے کے لیے مطلوبہ شرعی استعداد اور درکار قوت دستیاب نہیں ہے، اگر خدانخواستہ حکومت نے غیر ملکی ''این۔ جی۔ اوز'' اور لادین عناصر کے دباؤ میں آکر احمقانہ طور پر طالبات کے خلاف ایکشن لینے کا فیصلہ کیا اور اس کے نتیجے میں منظّم اداروں کی طرف سے طاقت کا استعمال ہوا، تو بڑے پیمانے پر جانی ومالی نقصان کا اندیشہ ہے، اور مسلمانوں کے اس ملک میں، جو شامتِ اعمال سے پہلے ہی سیاسی اور معاشی انتشار کا شکار ہے، طالبات کے خلاف ایکشن آگ پر تیل کا کام کرے گا اور اس کے ردِّ عمل میں بھڑکتے شعلوں کو بجھانا، سخت دشوار ہو جائے گا۔

مختلف مواقع میں ملک بھر کے چیدہ چیدہ علماء نے لال مسجد کے ذمہ داروں کو پوری

دلسوزی اور خیر خواہی سے مذکورہ بالا حقیقت گوش گزار کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے، جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں، ان میں دعوتِ دین اور ازالۂ منکرات کے کام کے لیے صبر آزما، مسلسل اور ان تھک محنت کی ضرورت ہے، لیکن یہ سب کچھ حکمت اور عاقبت اندیشی کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔

ہماری بہنیں اور بیٹیاں جامعہ حفصہ میں، یا ملک بھر کے دیگر مدارس میں، جس لگن سے حصولِ علم اور اصلاحِ اخلاق واعمال کے خاموش اور دُوررَس جہاد میں مشغول ہیں، اس حکیمانہ جہاد کے اثرات ان شاء اللہ ضرور رنگ لائیں گے؛ لیکن خوش فہمی میں پڑ کر جذباتی طرزِ عمل اپنانا، حکمت اور عاقبت اندیشی کا ہرگز تقاضا نہیں ہے، جبکہ اس طرزِ عمل سے ملک بھر میں خاموش انقلاب کے ان تعلیمی، اصلاحی اور تربیتی مورچوں کے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے؛ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا، تو یہ ملک وملت کے لیے بڑا المیہ ہوگا۔

مولائے کریم ہمیں حکمت سے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائے، اور خودرائی کے ان راستوں سے اپنی پناہ میں رکھے، جن کی منزل موہوم ہے، آمین (ماہنامہ البلاغ، ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ مطابق مئی 2007ء)

اس قسم کے مضامین اس وقت شائع ہوئے تھے، جب تک وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کو نہ ملا تھا، جس پر آج ساری قوم غم زدہ اور رنجیدہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اکابر ومشائخ کی یہ ہدایات محبت اور ہمدردی ہی پر مبنی تھیں۔ اور ؏

”قلندر ہرچہ گوید، دیدہ گوید“

کا مصداق تھیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو ایسا نورِ بصیرت عطاء فرماتا ہے کہ وہ اس کی روشنی میں جو کچھ کہتے ہیں، وہ برحق ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس بصیرت اور فہم کی سلامتی کی نعمت سے ہم سب کو مستفید فرمائے، آمین۔

پھر حکومت کی طرف سے جبر وتشدد کی سیاہ تاریخ رقم ہونے کے بعد مذکورہ حضرات نے جو کچھ فرمایا، وہ بھی ملاحظہ فرمائیں، کہ انہوں نے اس وقت بھی راہِ اعتدال کو نہیں چھوڑا اور ان کی نظر میں، جس کا جتنا قصور تھا، اس کو واضح کیا۔

چنانچہ مولانا عبید اللہ خالد صاحب مدیر ماہنامہ الفاروق، کراچی تحریر فرماتے ہیں:

> جہاں تک جامعہ حفصہ وجامعہ فریدیہ اور لال مسجد کی انتظامیہ کے رویے کا معاملہ ہے، وفاق المدارس کا موقف اس سلسلے میں بہت ہی دوٹوک اور واضح رہا ہے، لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے منتظمین کے مطالبات اگرچہ جائز اور برحق ہیں، لیکن انہیں منوانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، وہ شرعی، اخلاقی، اور قانونی اعتبار سے درست نہیں، لیکن دوسری طرف ان کو انتہائی ریاستی جبر وتشدد اور جنگی جنون کے ذریعہ دبانے کا جو طریقہ حکومت نے اختیار کیا ہے، وہ اس سے بھی زیادہ سنگین، خطرناک اور تباہ کن ہے، یہ بات کسی عام شہری کی جانب سے نہیں کہی گئی، بلکہ دینی مدارس کے بورڈز کے اتحاد کے سربراہ اور بزرگ عالمِ دین حضرت مولانا سلیم اللہ خان، نیز مفتی محمد تقی عثمانی اور مفتی محمد رفیع عثمانی، جیسے جید علمائے کرام کی جانب سے کہی گئی ہے (ماہنامہ الفاروق، رجب المرجب ۱۴۲۸ھ)

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم (صدر وفاق المدارس العربیہ، پاکستان) فرماتے ہیں:

> جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے طریقۂ کار سے ہمیں اور وفاق المدارس کی مجلسِ عاملہ کو اختلاف رہا، اور اسی بناء پر وفاق سے ان کا الحاق بھی ختم کیا گیا، لیکن دوسری طرف ہم نے حکومت سے بار بار کہا کہ طاقت کے استعمال سے گریز کیا جائے، اور یہ کہ طاقت اس مسئلہ کا حل نہیں ہے، اس قضیے کو بات چیت اور مذاکرات ہی

www.idaraghufran.org

کے ذریعے حل کرنے کی کوششوں سے مایوس ہونے کی بجائے ،انہیں بڑھایا جائے، اوران میں سنجیدگی لائی جائے، ہمیں افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ حکومت نے مسئلہ کو حل کرانے کے لیے مذاکرت اور بات چیت کے لیے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا (ماہنامہ الفاروق، جامعہ فاروقیہ؛ کراچی۔شعبان ۱۴۲۸ھ صفحہ نمبر۵)

مفتیِ اعظم پاکستان اور صدر جامعہ دارالعلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم اپنے تفصیلی خطاب میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

توغازی برادران کی کل غلطیاں کتنی ہوئیں؟

ایک یہ کہ شمیم کو پکڑ کرلائے ،مگر مارے پیٹے بغیران کوواپس کردیا، دوسری یہ کہ چینی مساج سینٹر کی خواتین کو لے کرآئے اوران کو مارے پیٹے بغیر واپس کردیا، تیسری یہ کہ اپنے طلباء کو چھڑانے کے لیے پولیس کے بعض لوگوں کو پکڑا، چوتھی غلطی یہ تھی کہ لائبریری پر قبضہ کیا۔

یہ چاروں غلطیاں ہم مانتے ہیں، ہم ان کی کوئی تاویل نہیں کرتے، ہم ان کو بتاتے رہے کہ تم غلط کررہے ہو، تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا، حکومت کے اندر حکومت قائم کرنا، ریاست کے اندر ریاست قائم کرنا، قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے، اس کو شریعت جائز نہیں کہتی۔

عجیب بات ہے کہ آج مغربی دنیا، ہمارے قلم کار، کالم نگار، صحافی، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ یہ کہہ رہے ہیں کہ دیکھیے مدرسے بدنام ہوگئے، مدرسے ایسے ہوتے ہیں، لاقانونیت پھیلانے والے ہوتے ہیں، اسلحہ بندی کرنے والے ہوتے ہیں، زبردستی کرنے والے ہوتے ہیں، تشدد پسند ہوتے ہیں، انتہاء پسند ہوتے ہیں۔

تو مدارس کے بارے میں دنیا میں کیا تصور قائم ہوگا؟ مجھ سے ایک ٹی وی والوں نے اسی قسم کا ایک سوال کیا، تو میں نے کہا کہ مجھے تعجب ہے کہ آپ یہ بات کہہ

رہے ہیں، حالانکہ یہ بات آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جامعہ حفصہ کی ان چار باتوں کو سب نے مل کر غلط کہا، جس پر ذرائع ابلاغ گواہ ہیں۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے جو مدارس ملحق ہیں، ان میں جامعہ فریدیہ (اور طالبات کے لیے جس کے کیمپس کا نام جامعہ حفصہ تھا) ایک بڑا مدرسہ تھا، اس میں اور اس کی شاخوں میں تقریباً دس ہزار طلباء وطالبات زیرِ تعلیم تھیں، لیکن وفاق المدارس نے صرف اس وجہ سے اس مدرسہ کے الحاق کو ختم کر دیا کہ وفاق المدارس اُن کی اس لاقانونیت کو صحیح نہیں سمجھتا تھا، اس انتہاء پسندی کو صحیح نہیں سمجھتا تھا، اس تشدد کو جائز نہیں کہتا تھا، چنانچہ وفاق المدارس نے صرف اسی وجہ سے اس مدرسے کا رجسٹریشن منسوخ کر دیا، اساتذہ، طلبہ وطالبات کی درخواستیں اور فون مسلسل آتے رہے کہ ہمارا سال ضائع ہونے سے بچالیجیے، لیکن ہم نے کہا نہیں۔

حالانکہ کاروائی جامعہ حفصہ میں ہو رہی تھی، لیکن کاروائی کرانے والے چونکہ مولانا عبدالعزیز صاحب تھے، وہی جامعہ حفصہ کے بھی مہتمم تھے، اور جامعہ فریدیہ کے بھی، اس لیے ہم نے جامعہ فریدیہ کے الحاق کو بھی منسوخ کر دیا، اور ان کے طلباء وطالبات کو بھی سالانہ امتحان میں شامل کرنے سے انکار کر دیا، یہ ایک بہت مشکل فیصلہ تھا، مگر ہمیں کرنا پڑا۔

وفاق المدارس نے اپنا اعلامیہ بار بار شائع کیا، یہ سب باتیں جو میں غازی برادران کی غلطیوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں، وفاق المدارس نے اپنے اعلامیہ میں بیان کر دی تھیں، کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وفاق المدارس اپنے کسی مدرسے کی انتہاء پسندی کو، دہشت گردی کو جائز قرار نہیں دیتا، نہ صرف یہ کہ جائز قرار نہیں دیتا، بلکہ ایسے کسی مدرسہ کے الحاق کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے، جس کے اندر انتہا پسندی ہو، یا تشدد کا راستہ اختیار کیا جا رہا ہو، یا قانون کو ہاتھ میں

لینے کا ڈھنگ اختیار کیا جارہا ہو۔

پھر نہ صرف وفاق المدارس، بلکہ پورے ملک کے تمام مدارس اور علماء نے، بلکہ تمام مکاتبِ فکر کے علمائے کرام نے جامعہ حفصہ کے منتظمین کے اس غلط طریقۂ کار کی مذمت کی، اس کو غلط کہا۔

کیا یہ اس بات کی کھلی دلیل نہیں کہ تمام مدارس دینیہ اور تمام علمائے کرام، انتہاء پسندی کے خلاف ہیں، تشدد کے خلاف ہیں، لاقانونیت کے خلاف ہیں، قانون کو ہاتھ میں لینے کے خلاف ہیں۔

اس واقعہ سے تو پوری دنیا میں یہ پیغام جانا چاہیے کہ تمام مدارس اور علماء انتہاء پسندی اور دہشت گردی اور تشدد کے راستہ کو غلط سمجھتے ہیں اور اتنا غلط سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے پرانے ساتھیوں کو بھی اپنے وفاق سے الگ کردیا۔

میں نے ''ٹی-وی'' والوں سے کہا کہ آپ دنیا کو یہ پیغام دیجیے اور جو زمینی حقیقت ہے، اسے واضح کیجیے۔

لیکن (اس کے برعکس دوسری طرف) ہماری حکومت نے یہ کیا کہ لال مسجد کے حضرات کے ان چار مطالبات میں سے کسی ایک مطالبہ پر بھی کوئی کاروائی نہیں کی، آج تک پاکستان کے لوگوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ کسی طرح یہ معلوم ہو کہ آنٹی شمیم کے اڈے کی سرپرستی جو حکام برسوں سے کررہے تھے وہ کون سے حکام تھے؟ جنہوں نے اس اڈے کو چلانے کی اجازت دے رکھی تھی، اس میں کون لوگ حرام کاری کے لیے آتے جاتے تھے؟

کیا وہ سب بے گناہ ہیں؟ معصوم ہیں؟ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا؟ کیا جرم صرف انہوں نے کیا، جو شمیم کو اپنے پاس امن وامان کے ساتھ لے کر آئے اور اس سے توبہ کرا کر اس کو واپس کردیا۔

بتایئے اس میں جرم کس کا زیادہ ہے؟ اڈہ چلانے والوں کا؟ یا جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کا؟ (ماہنامہ ''البلاغ'' رجب المرجب ۱۴۲۸ھ مطابق اگست 2007ء صفحہ ۵ تا ۷۔ ماہنامہ ''الابرار'' خانقاہ امدادیہ اشرفیہ جامعہ اشرف المدارس، کراچی، رجب المرجب، شعبان، رمضان ۱۴۲۸ھ)

ملاحظہ فرمایئے کہ مذکورہ خطاب میں کتنا اعتدال ہے کہ ہر اختلاف کو ترازو میں رکھ کر اور ناپ تول کر اس پر تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ ''فاعتبروا یا اولی الابصار''

اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ان حضرات کی از اول تا آخر ان مخلصانہ کوششوں کا اجر عطاء فرمائے گا، اور ان کی شان میں گستاخی و نازیبا انداز اختیار کرنے والوں کو ان کے اپنے عمل کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ:

''لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت''

چند دن پہلے بعض حضرات نے دینی مدارس کے طلبہ و طالبات کے لیے ایک تحریک تشکیل دی ہے، جس کے لیے بیعت کا سلسلہ بھی جاری ہے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ تحریک وفاق المدارس کے اکابر و مشائخ کی طرف سے مجوّزہ نہیں ہے۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں رقم فرماتے ہیں:

اسی دوران ایک اور معاملہ بھی میرے علم میں لایا گیا کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے افسوسناک سانحہ کے پسِ منظر میں پشاور میں ایک اجلاس کے دوران ''تحریک طلبہ و طالبات'' کے نام سے ایک فورم کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے، جس کے سربراہ حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ دامت برکاتہم کو منتخب کیا گیا ہے اور ان کی امارت میں صوبائی امراء اور دیگر ذمہ داروں کا تعین کر کے اسی رخ پر تحریک کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا ہے، جو لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے خلاف آپریشن

سے قبل موجود تھا۔

تحریک طلبہ وطالبات کا مقصد اسی تحریک کو آگے بڑھانا بیان کیا جارہا ہے، اور اس کے لئے مختلف سطح پر رابطوں کا سلسلہ بھی تازہ معلومات کے مطابق شروع ہوگیا ہے، مجھ سے اس سلسلے میں رائے پوچھی گئی، تو میں نے عرض کیا کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام اور انسدادِ منکرات کے لئے (شرعی حدود میں رہتے ہوئے) جدوجہد کرنا، مطالبات کرنا، رائے عامہ کو منظّم کرنا، عوامی دباؤ کو بڑھانا اور پُرامن جدوجہد کا ہر ممکن راستہ اختیار کرنا، نہ صرف ہمارا حق ہے، بلکہ ہمارا دینی فریضہ بھی ہے۔

لیکن ان مقاصد کے لئے قانون کو ہاتھ میں لینا، حکومت کے ساتھ تصادم کی صورت اختیار کرنا، ہتھیار اُٹھانا اور کوئی بھی ایسی صورت اختیار کرنا، جسے فقہائے کرام نے ''خروج'' سے تعبیر فرمایا ہے، ہمارے نزدیک درست نہیں ہے اور ہم اس کی تائید کے لئے تیار نہیں ہیں۔

البتہ ہمارے جو بزرگ اسے درست سمجھتے ہیں، اس کے شرعی اور جائز ہونے پر مطمئن ہیں اور اسے اختیار کرنا چاہتے ہیں، ان کا یہ حق ہم تسلیم کرتے ہیں، مگر اس درخواست کے ساتھ کہ اس تحریک کا مورچہ ''دینی مدارس'' سے الگ رکھا جائے اور کسی دینی مدرسے کو ایسی کسی تحریک کا مورچہ نہ بنایا جائے، ہماری ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں مدرسہ کبھی کسی مسلّح تحریک کا مورچہ نہیں رہا۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرَّہٗ العزیز نے بھی اس دور میں جب وہ برصغیر کی آزادی کے لئے برطانوی استعمار کے خلاف مسلح تحریک کے تانے بانے بُن رہے تھے، جسے تاریخ میں تحریک ریشمی رومال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

تو اس تحریک کا مورچہ بھی دارالعلوم دیوبند کو نہیں بنایا تھا، بلکہ اس سے علیٰحدگی اختیار کرکے اپنا نظام الگ تشکیل دیا تھا، تاکہ دارالعلوم دیوبند اور اس سے متعلقہ

دینی اداروں کا تعلیمی کردار کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے اور ان کے لئے خواہ مخواہ مشکلات اور رکاوٹیں کھڑی نہ ہوں۔

ہمارے نزدیک دینی مدارس کا تعلیمی کردار ''ان کا آزادانہ وجود'' دینی تعلیمات کے فروغ کے لئے، ان کی جدوجہد اور عام مسلمان کا دین کے ساتھ تعلق برقرار رکھنے کے لئے ان کی مساعی، دیگر تمام امور سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

کسی بھی تحریک کے لئے اس کو خطرے میں ڈالنا اور کسی بھی حوالے سے دینی مدارس کے لئے مشکلات پیدا کرنا، نہ شریعت وحکمت کے لحاظ سے درست ہے اور نہ ہی ہمارے اکابر و اسلاف، بالخصوص شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور ان کے رُفقائے کار کی روایات اور مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔

اگر کچھ دوست اکابر کے طے کردہ ان تحفظات کا دائرہ قائم رکھتے ہوئے ''تحریک طالبان'' کی کوئی صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں، تو اس طریقِ کار پر شرحِ صدر نہ ہونے کے باعث ہم ان کا ساتھ تو نہیں دے سکیں گے، مگر ان کے خلوص اور مقصد کی سچائی کی وجہ سے ہماری دعائیں ضرور ان کے ساتھ ہوں گی (روزنامہ ''اسلام''

راولپنڈی، جمعرات ۱۲/ شوال ۱۴۲۸ھ۔25 / اکتوبر 2007ء صفحہ نمبر ۴؛ نوائے حق)

ہمیں امید ہے کہ مذکورہ ہدایات کو ملاحظہ کرنے کے بعد ایک منصف قاری کو اس قسم کے معاملات میں جمہور اکابر کے سنجیدہ طریقۂ کار پر اعتماد میں شبہ نہ رہے گا۔

اور جو مختلف قسم کے الزامات ان کی طرف منسوب کرکے، جذباتی نوجوانوں کو ان سے متنفر کرنے کی درپردہ کوششیں جاری ہیں، ان کی حقیقت کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 4 شمارہ 10، نومبر 2007ء۔ شوال 1428ھ)

(37)

طلبہ کے لئے یکسوئی اور تحریکات وغیرہ سے اجتناب

معزز طلبۂ کرام! رمضانُ المبارک اور عیدُ الفطر کے موقعہ پر سالانہ تعطیل کے بعد اب آپ حضرات کے تعلیمی سال کا آغاز ہو رہا ہے، الحمد للہ تعالیٰ طلبۂ کرام طویل چھٹیوں کے بعد دوبارہ تعلیم کے لئے تشریف لا چکے ہیں، اور کچھ طلبہ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو تعطیل کے زمانے میں باہر کے ماحول سے متاثر ہو کر دینی تعلیم سے متوحش، یا متنفر ہو جاتے ہیں، اور دوبارہ زندگی بھر کبھی ادھر کا رخ ہی نہیں کرتے۔

تعطیلات کے ذریعہ سے دراصل کھرے کھوٹے طالبِ علموں کا بہتر طریقے سے امتحان ہو جاتا ہے، کیونکہ اصل امتحان اسی وقت ہوا کرتا ہے، جب مخالف سمت کا بھی وجود ہو۔

دینی ماحول سے نکل کر جب دنیا کے ماحول میں جاتے ہیں، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے، اور علمِ دین کا کس پر کتنا رنگ چڑھا ہے، اور آئندہ چل کر کس طالبِ علم میں عوام کا مقتداء اور کس میں مقتدی بننے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

اور آج کل عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ طلبہ میں جتنی مستعدی اور چستی چھٹیوں کے کرنے میں پائی جاتی ہے، اتنی تعطیلات کے بعد واپس آنے میں نہیں پائی جاتی۔

حالانکہ ایک سچے طالبِ علم کی شان تو اس کے برعکس ہونی چاہئے تھی کہ اسے تعلیمی مشغلہ اور تعلیمی ماحول چھوڑ کر دوسری جگہ جانے میں اتنی دل چسپی نہ ہوتی اور اس کے مقابلہ میں گھر بار چھوڑ کر تعلیمی مشغلہ کے لئے آنے میں زیادہ مستعدی اور دل چسپی ہوتی، مگر اب اکثر طالبِ علموں کے حالات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تعلیمی ماحول اور تعلیمی مشغلہ کے ساتھ بامرِ مجبوری جڑے رہتے ہیں، اور دوسری چیزوں کی طرف ان کی دل چسپی اور ان کا رجحان و میلان زیادہ ہوتا ہے۔

اس لئے طالبِ علموں کو اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ ان کو تعلیم اور اس ماحول سے کتنی دلچسپی ہے، اور دوسرے مشاغل سے کتنی دل چسپی ہے۔

ہمارے بزرگوں نے تو طلبۂ کرام کے لئے یہاں تک اہتمام فرمایا ہے کہ انہیں تعلیم کے علاوہ دوسرے مفید مشغلوں کی طرف متوجہ ہونے کی بھی اجازت نہیں دی، چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے مرضُ الوفات میں جو ملفوظات ارشاد فرمائے، جو ایک طرح سے طلبۂ کرام کے لئے وصیت کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں طلبۂ دین کے لئے اس سلسلہ میں جو وصیت فرمائی، وہ میں آپ کو سنا دیتا ہوں، فرمایا:

''میں نے قرآن وسنت اور عمر بھر کے تجربہ، نیز جن بزرگوں کی خدمت کا شرف حاصل ہوا، ان سب کے طرزِ عمل سے مدرسہ کے بارہ میں جو کچھ اصلح (سب سے زیادہ درست) سمجھا، وہ یہ ہے کہ مدارس اور ان کے متعلقین کو سیاسیاتِ حاضرہ سے بالکل مجتنب (اور الگ تھلگ) رہنا چاہئے، اور صرف سیاسیات ہی سے نہیں بلکہ ہر اس کام سے جو تعلیمی مشاغل میں خلل انداز ہو، اگر چہ وہ کام فی نفسہٖ کیسا ہی محمود (اچھا) اور مفید کیوں نہ ہو۔

ہمارے بزرگوں نے طلباء کو بیعت کرنے اور سلوک میں مشغول ہونے سے بھی باوجود اس کو اہم سمجھنے کے طالبِ علمی کے زمانہ میں ہمیشہ منع فرمایا ہے، حضرت گنگوہی قدس سرّہٗ کبھی کسی طالبِ علم کو فراغت سے پہلے بیعت نہ فرماتے تھے، پھر کسی سیاسی اور ملکی تحریک میں شرکت کیسے گوارا کی جاسکتی ہے'' (مآثر حکیم الامت ص ۴۲۵، اشرف الملفوظات فی مرض الوفات، ناشر: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، طباعت بارِ ششم: صفر ۱۴۰۶ھ)

اس مختصر مگر جامع نصیحت، بلکہ اس کے ہر ہر جملہ کو بار بار ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے، کتنے اہتمام اور کتنے وثوق اور یقین کے ساتھ حضرت رحمہ اللہ نے تاکیدی کلمات ارشاد فرمائے کہ ''قرآن وسنت'' اور پھر فرمایا ''عمر بھر کے تجربہ'' اس کے بعد ''جن بزرگوں کی خدمت کا

شرف حاصل ہوا، ان سب کے طرز عمل‘‘ کا حوالہ دیا۔

قرآن وسنت کا حوالہ بھی دیا، اپنی عمر بھر کے تجربہ کا حوالہ بھی دیا، اور پھر جن بزرگوں کی خدمت کا شرف حاصل ہوا، ان سب ہی کے طرزِ عمل کا حوالہ دیا۔

اب ایک طرف تو حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کی قرآن وسنت پر گہری نظر کا معاملہ ہے، جس سے اہلِ علم حضرات بخوبی واقف ہیں، دوسری طرف آپ کی عمر بھر کا تجربہ ہے، ایک حکیم الامت کی عمر بھر کا تجربہ، اور تیسری طرف اپنے مخدوم تمام بزرگوں کے طرزِ عمل کا معاملہ ہے، حضرت کے مخدوم بزرگ آپ حضرات کو معلوم ہیں کہ اس سلسلے کے ستون اور تھم ہیں، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ، ان حضرات کے طرز عمل کی سند کتنی اہمیت کی حامل ہے۔

پھر ان سب نسبتوں اور حوالوں کے بعد جو بات ارشاد فرمائی، وہ یہ ہے کہ مدرسہ کے بارے میں اصلح یعنی سب سے زیادہ درست بات یہ ہے کہ مدارس، بلکہ ان کے متعلقین کو سیاساتِ حاضرہ بلکہ ہر اس کام سے جو تعلیمی مشاغل میں خلل انداز ہو، اگرچہ وہ کام اپنی ذات میں کتنا ہی اچھا اور فائدہ مند کیوں نہ ہو، بالکل الگ تھلگ رہنا چاہئے۔

اور اشرفُ السوانح میں حضرت کے اس ملفوظ کے بارے میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ یہ ملفوظ حضرت نے اس وقت ارشاد فرمایا، جبکہ آپ پر ضعف اور کمزوری کا غلبہ تھا، اور آواز بھی پوری طرح سے نکالنے کی قدرت نہیں تھی، حضرت نے سامعین کو اپنے بالکل قریب بلا لیا تھا، اور اس مجلس میں صرف خاص الخاص علماء شریک تھے، جن میں دار العلوم دیوبند کے مہتمم صاحب بھی تھے۔

اللہ اکبر! طلبۂ کرام کی صحیح تعلیم کی کتنی اہمیت حضرت کے دل میں تھی اور ان کی پختہ، مضبوط و ٹھوس تعلیم کا کس قدر اہتمام تھا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی مدارس اور طلبہ کی تعلیم اور مدارس کے اصل مقصود اور مشن کو زندہ وتابندہ رکھنے کی طلب اور تڑپ دل میں پیوست تھی، گویا کہ حضرت نے اپنے قول وفعل سے خود بھی ثابت کر دیا، اور طلبہ کو بھی بتلا دیا، کہ ان کا مشرب

اور طور وطریقہ یہ ہونا چاہئے، جو کسی نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

ہمیں دنیا سے کیا مطلب، مدرسہ ہے وطن اپنا

مریں گے ہم کتابوں پر، ورق ہو گا کفن اپنا

ہم تو اسی ذوق کو پسند کرتے ہیں، اور اپنے طلبہ کو بھی اپنے بزرگوں کی اتباع میں یہی نصیحت کرتے ہیں، اگرچہ یہ نصیحت آج کے بعض جذباتی، اور جوشیلے لوگوں کو کڑوی معلوم ہوتی ہے، اور وہ بجائے اس کے کہ خود بھی اپنے بزرگوں کی ''جن کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں'' اس نصیحت پر عمل کریں، الٹا یہ چاہتے ہیں کہ جو لوگ اپنے بزرگوں کی نصیحت پر عمل پیرا ہیں، وہ بھی اپنے بزرگوں کو چھوڑ کر خود ان کے طرزِ عمل کو اختیار کر لیں۔

استغفر اللہ! کیا الٹی سوچ ہے؟ اس حماقت بلکہ اپنے بزرگوں سے بغاوت کی بھی کوئی حد ہے۔

گذشتہ دنوں بعض مدارس کے طلبہ کی طرف سے اسی قسم کی ایک جذباتی تحریک اٹھی تھی، جس کو ہمارے بزرگوں نے خصوصاً طلبہ واہلِ مدارس کی شان کے موافق نہ سمجھ کر اسے چھوڑ دینے کی بار بار تلقین کی تھی، مگر بقول کسے ع ''نیکی ہی ان کے گلے پڑ گئی''

نہ جانے بزرگوں کی شان میں (نعوذ باللہِ تعالیٰ) بکاؤ مال، غیروں کے ایجنٹ، وغیرہ اور کیا کیا کہا جانے لگا۔انا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون.

ایک مقام پر میں نے اپنے بزرگوں کی اتباع میں یہی بات کہہ دی کہ یہ طرزِ عمل ہمارے بزرگوں اور خصوصاً اہلِ مدارس کی شان کے مطابق نہیں، اور اس سے ہمیں اور ہمارے بزرگوں کو اتفاق نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

بس پھر کیا تھا، بعض ایسے افراد کو بھی جو سالہا سال سے مجھے اپنا بزرگ، سرپرست وغیرہ کا درجہ ظاہر میں دیا کرتے تھے، اور اپنے ذاتی معاملات میں بھی مشورہ کیا کرتے تھے، ان کو بھی یہ بات اتنی کڑوی اور ناگوار گزری کہ بڑے چھوٹے کی کوئی تمیز نہ رہی۔

اسی لئے تو میں کہا کرتا ہوں کہ آج کل کے بڑے ''دہی بڑوں'' کی طرح ہیں، زبان سے

دوسروں کو اپنا بڑا اور بزرگ، شیخ اور نہ جانے کیا کچھ ظاہر کرتے ہیں، اور دل میں اس کی حقیقت کا شعور تک بھی نہیں ہوتا، اور بڑوں کے مقابلے میں اپنی سوچ اور اپنی رائے کو ہی درست اور صحیح سمجھتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ جو طرزِ عمل پہلے چند حضرات نے اپنے بزرگوں اور بڑوں کے خلاف اختیار کیا تھا، آج وہی طرزِ عمل یہ حضرات اپنے بڑوں کے خلاف اختیار کر رہے ہیں، اور طرح طرح سے اسلاف پر اعتراضات کر رہے ہیں۔

بہر حال اس طرح کے جذباتی لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی کم علمی اور نادانی کی باتوں سے متأثر ہو کر سلف کے طرز اور طریقے کو چھوڑ دیں گے، یہ ان کی غلط فہمی ہے، ہم تو اپنے سلف کے باغی بننا نہیں چاہتے، اگر تم کو باغی بننا پسند ہے، تو پسند ہوتا رہے، تم کو ہی مبارک ہو۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اہلِ مدارس اور طلبۂ کرام کو اپنے تعلیمی مشاغل سے ہی کام رکھنا چاہئے، اور اس سے ہٹ کر کسی اور کام میں نہیں لگنا چاہئے۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے طلبہ کے لئے دوسرے مشاغل اور سیاست وتحریکات میں لگنے کا نقصان بھی بتلا دیا ہے، چنانچہ انہی مرض الوفات کے ملفوظات میں حضرت نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

> اس لئے میری پختہ رائے یہ ہے کہ طلبہ کو سیاسیات میں مبتلاء نہ کیا جاوے، طلبہ اگر ان قصوں میں پڑ گئے، تو وہ تعلیم سے بھی جاتے رہیں گے، اور تربیت بھی ان کی نہ ہوگی، چنانچہ جب سے طلبہ کو اس میں ڈال دیا گیا ہے، ان میں آزادی پیدا ہوگئی، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ ہی لوگ (یعنی علماء، مدرسین اور مہتممین) ہر وقت ان کی طرف سے متفکر اور خائف رہتے ہیں، میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار یہ کہا، اور اب پھر کہہ رہا ہوں، لیکن میں اس کے قبول کے آثار نہیں دیکھتا (تتمہ: اشرف السوانح، ج۴ ص۴۰، بعنوان ''حضرت کا آخری خط'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول ۱۴۲۷ھ)

ایک اور مقام پر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میری رائے یہ ہے کہ کسی تحریک میں بھی طالبِ علموں کو شرکت کی اجازت نہ ہونی چاہئے، اس میں سخت مضرت (یعنی نقصان) ہے، آئندہ کے لئے، جو کہ اس وقت محسوس نہیں ہوتی، آخر میں پوچھتا ہوں کہ پڑھنے پڑھانے میں جب کوئی مشغول نہ رہے گا، تو پھر یہ جماعت علماء کی آئندہ (خالص دین کا) کام کرنے والی کہاں سے پیدا ہوگی (''ملفوظات الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۱ص ۲۷، ملفوظ نمبر ۵، بعنوان ''میدان میں آنا چاہیے'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ)

معلوم ہوا کہ طلبہ کے سیاست اور کسی بھی تحریک میں شامل ہونے سے ان میں آزادی پیدا ہوتی ہے، اور وہ تعلیم وتربیت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

آج حضرت موصوف کا بیان کردہ یہ نقصان ہماری آنکھوں کے سامنے ہے کہ اکثر طلبہ میں نہ ٹھوس علم ہے اور نہ ہی ان کی تربیت ہے۔

ایک مرتبہ میرا ایک مضمون ہمارے ماہنامہ التبلیغ میں ''عوام علماء کے مقتدا، یا مقتدی؟'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد چکوال سے ایک مفتی صاحب نے بڑا درد بھرا خط تحریر فرمایا، جس میں انہوں نے اس مضمون کی تائید کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ آج کل بعض دینی مدارس میں اساتذۂ کرام خود تو اپنی اصلاح اور تربیت سے غافل ہوتے ہی ہیں، اس سے زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ ان کے شاگرد جو اصلاح وتزکیہ اور اتباعِ سنت کا اہتمام اور پابندی کرتے ہیں، ان کو بھی اس پر استادوں کی طرف سے لعن طعن کیا جاتا ہے اور طعنے کے طور پر ''صوفی'' وغیرہ نام رکھ کر ایسے دیندار طلبہ کو اتباعِ سنت اور اصلاح و تزکیہ سے متنفر ومتوحش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، یا کم از کم شرمندہ کرنے میں تو کوئی کسر چھوڑی ہی نہیں جاتی۔

اپنے اس خط میں انہوں نے چند طلبۂ کرام کے ایسے واقعات بھی تحریر فرمائے کہ بعض اتباعِ سنت اور تزکیہ واحسان کو اختیار کرنے والے طلبہ نے استادوں اور طلبہ کی لعن وطعن سے تنگ آ کر اپنا حلیہ بدل لیا، اور خود بھی دوسروں کی طرح ہو گئے، تب انہیں سکون ملا۔

افسوس! صد افسوس! اس پر افسوس اور حیرت کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے، جب دینی مدارس میں یہ حال ہوگا، تو دوسرے اداروں یا دوسری جگہوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس طرزِ عمل کی اصلاح فرمائے۔

مفتیِ اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے کسی مقام پر فرمایا ہے کہ ہمارے مدرسے تقریباً تیس سال سے بانجھ ہو گئے ہیں، اور ان سے رجالِ کار پیدا نہیں ہو رہے۔

غور کیا جائے تو جتنے عرصہ سے بانجھ ہونے کی شکایت حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے فرمائی ہے، یہ وہی تحریکات کا زمانہ ہے کہ جب سے تحریکات کی وباء دینی مدارس میں داخل ہوئی، اور طلبہ اس میں مبتلا ہوئے، اسی وقت سے رجالِ کار کا فقدان اور قحط ہونا شروع ہو گیا۔

چنانچہ آپ دیکھ لیجئے کہ ہزاروں کی تعداد میں طلبہ ہر سال فارغ ہو رہے ہیں، مگر اکثریت کا حال یہ ہے کہ ان میں نہ پختہ اور ٹھوس علم ہے، اور نہ ہی ان کی تربیت ہے۔

پھر جس طرح حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے اپنے ارشاد میں فرمادیا کہ:

''میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار یہ کہا اور اب پھر کہہ رہا ہوں، لیکن میں اس کے قبول کے آثار نہیں دیکھتا''

یعنی مجھے اس بات کے قبول ہونے کے آثار نظر نہیں آ رہے۔

میں بھی حضرت کی یہی بات دہراتا ہوں کہ مجھے بھی قبولیت کے آثار نظر نہیں آتے۔

لیکن بہرحال کوئی مانے، یا نہ مانے قبول کرے، نہ کرے، کم از کم حق بات کا پہنچانا تو اپنی ذمہ داری ہے، اور ایک ادارہ کا مدیر اور ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ اپنے زیرِ ادارت ادارہ میں داخل ہونے والے طلبہ کو اپنے بزرگوں کا پیغام پہنچا دیا جائے۔

اس لئے میرے عزیز طلبۂ کرام! میری آپ سے یہی گزارش ہے کہ دوسرے تمام مشاغل اور دھندوں کو پسِ پشت ڈال دو، اور پوری دلجمعی، یکسوئی اور توجہ کے ساتھ حصولِ علم میں مشغول رہو، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو، تعلیم کے حقوق کو پہچانو!

بعض سلف سے منقول ہے کہ علم اپنا بعض حصہ اس وقت تک نہیں دیتا، جب تک کہ اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالے نہ کر دیا جائے، علم اپنا بعض اس وقت دیتا ہے، جب اپنا پورا، اس کو دے دیا جائے، یعنی اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالہ کر دیا جائے:

"اَلْعِلْمُ لاَ یُعْطِیْکَ بَعْضَهٗ حَتّٰی تُعْطِیَهٗ کُلَّکَ" [1]

تو اگر ایک طالب اپنے آپ کو پورا اس کے حوالے نہ کرے، بلکہ بعض حصہ حوالہ کرے، تو علم اپنا بعض بھی حوالہ نہ کرے گا، پھر علم کہاں سے حاصل ہوگا، اسی وجہ سے تو سلف فرماتے ہیں کہ تعلیم کے علاوہ ہر دوسرے مشغلہ کو ترک کر دو، تب علم حاصل ہوگا۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے عزیز طلبۂ کرام کو پوری توجہ، دلجمعی، یکسوئی اور انہماک کے ساتھ حصولِ علم کی عبادت میں مشغول فرمائے اور حصولِ علم کے علاوہ ہر قسم کی تحریک اور مشغلہ سے پوری طرح مجتنب اور بچے رہنے کی توفیق بخشے۔ آمین، ثم آمین۔

۱۸ شوال ۱۴۲۸ھ بمطابق 31 اکتوبر 2007ء بروز بدھ

(ماہنامہ "التبلیغ" جلد 4 شمارہ 11، دسمبر 2007ء- ذیقعدہ 1428ھ)

---

[1] وأخبرنی محمد بن أبی القاسم الأزرق، أنا أبو بکر محمد بن الحسن بن زیاد النقاش أن محمد بن عبد الرحمن السامی، أخبرهم بهراة، قال: أنا علی بن الجهد، قال: سمعت قاضی القضاة یعنی أبا یوسف، یقول: العلم شیء لا یعطیک بعضه حتی تعطیه کلک وأنت إذا أعطیته کلک من إعطائه البعض علی غرر (الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع للخطیب البغدادی، ج۲ ص ۱۷۴، رقم الروایة ۱۵۲۳)

أخبرنی الحسن بن محمد الخلال ، نا عبید الله بن محمد الفقیه ، نا محمد بن یحیی بن عبد الله الندیم ، نا محمد بن یزید المبرد ، نا عمرو بن بحر ، قال: سمعت إبراهیم بن سیار النظام ، یقول : " العلم: شیء لا یعطیک بعضه حتی تعطیه کلک ، وأنت إذا أعطیته کلک ، من إعطائه البعض علی خطر "(الفقیه والمتفقه للخطیب البغدادی، ج۲ ص ۲۰۴، رقم الروایة ۸۶۴)

(38)

بعض سیاسی علماء کا غیر معتدل طرزِ عمل

ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ اس علاقہ کے فلاں مولانا صاحب جو کہ سیاسی اعتبار سے مجلسِ عمل نام کی ایک مذہبی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اور جمعہ وعیدین کے اجتماعات میں اپنی مخالف سیاسی جماعت کے خلاف بیان وتقریر کیا کرتے تھے، اور میں نے ان کے متعلق ایک واقعہ بھی اس عیدُ الفطر کے حوالہ سے بیان فرمایا تھا کہ وہ عیدُ الفطر کے موقع پر اپنی مخالف سیاسی جماعت کے خلاف اتنا بولے، اتنا بولے کہ حد کردی، اور لوگوں کو عید کی نماز کا طریقہ بھی نہیں بتلا سکے، اور عید کی نماز اسی طرح کھڑی کرنی پڑی، وہ مولانا صاحب اب اُس مخالف سیاسی جماعت کے حق میں اپنے انتخابی امیدوار ہونے سے دستبردار ہوگئے ہیں، اور اُس مخالف سیاسی جماعت کے حق میں بیٹھ گئے ہیں۔

لاحول ولاقوۃ اور بھی کئی مقامات پر ایسا ہی ہو رہا ہے؛ تعجب کی بات ہے کہ جن لوگوں کے خلاف سالہا سال تک ایک عالِم دین نے منبر ومحراب سے صدائیں بلند کی ہوں، اور اپنے نمازیوں اور سامعین وحاضرین کو سِوائے غیبت، بہتان والزام تراشی کے اور کوئی سبق نہ دیا ہو، وہی آج ان کے حق میں بیٹھ کر عملی طور پر فریقِ مخالف کے دیانت وامانتدار ہونے اور ان کے حق میں ووٹ کے ذریعے، اہلیت کی گواہی دینے کی سفارش کر رہے ہیں۔

اسی قسم کے اہلِ علم نے سیاست کے میدان میں آ کر علماء کو عوام کے سامنے سخت بدنام کیا ہے، اور گزشتہ مرتبہ الیکشن کے موقع پر مجلسِ عمل کے نام سے جو مذہبی جماعتوں کا اتحاد بن کر عوام کے سامنے آیا تھا، اس وقت دینی ذہن رکھنے والے لوگوں کو اس جماعت سے غیر معمولی امیدیں وابستہ تھیں کہ یہ مذہبی جماعتیں متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ملک کے انتظامی معاملات کو بہتر بنانے، اور اسلام دشمن قوتوں کا مقابلہ کرنے میں مددگار ثابت ہونے کے

ساتھ ساتھ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا ذریعہ بنیں گی۔

اور اسی قسم کی امیدیں وابستہ کر کے عوام کے بہت بڑے طبقہ نے اس جماعت سے وابستہ شخصیات کے حق میں ووٹ استعمال کر کے غیر معمولی کامیابی دلائی تھی، اور ملکی تاریخ میں مذہبی جماعتوں کے لیے یہ ایک تاریخی کامیابی تھی، اُس وقت بھی ایک طبقہ کا خیال یہ تھا کہ اس جماعت کے پسِ پردہ کچھ بہتر عوامل کارفرما نہیں ہیں، اس لیے اس سے کوئی بہتر توقع نہ رکھی جائے، لیکن اس جماعت میں مختلف مسلکوں کے معروف نمائندگان کے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس خیال کو زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

مگر وقت گزرنے کے ساتھ عوام الناس نے اس تأثر کو قبول کرنا شروع کر دیا۔

اور اس جماعت کی بعض اعلیٰ قیادتوں کی طرف سے کیے گئے مختلف وعدوں اور وعیدوں اور ان سے انحراف کے سامنے آنے، اور اسلام کے نام کو محض ڈھال کے طور پر استعمال کرتے رہنے سے گزشتہ دَورِ حکومت میں علماء، عوام کی زبان پر اتنے بدنام ہوئے کہ **الامان والحفیظ**۔

علماء اپنے قول وفعل کے ساتھ عوام کے مقتداء شمار ہوتے ہیں، ان کی طرف سے کوئی غلط قول وفعل سرزد ہونے پر عوامی دنیا میں بہت غلط اَثر پڑتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس طرزِ عمل کو اس جماعت سے وابستہ، یا اس کے حامی حضرات سیاسی حکمتِ عملی سے تعبیر کریں۔

لیکن اس سلسلہ میں ہم تو صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اُس قسم کی سیاسی حکمتِ عملی، تو جھوٹ اور مکر وفریب سے بھری ہوئی ہمارے ملک کی غیر اسلامی جمہوری سیاست کا حصہ ہے، جس کو منافقت سے تعبیر کرنا، زیادہ مناسب ہے، مگر دین ومذہب اور اس سے وابستہ افراد کے لیے یہ کسی طرح زیب نہیں دیتا، اور سیاست برائے سیاست کے بجائے سیاست برائے شریعت کا اصول ہی اسلام کا حقیقی تقاضہ ہے۔

ایک مقام پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حسی کامیابی کا ہو جانا تو کوئی کمال کی بات نہیں، اس لیے کہ ایسی کامیابی کافروں کو بھی ہو جاتی ہے، اور مسلمانوں کی اصل کامیابی تو وہ ہے کہ چاہے غلامی ہو، مگر اللہ راضی ہو، اور اگر حکومت ہوئی اور ان کی مرضی کے خلاف ہوئی، وہ راضی نہ ہوئے تو فرعون کی حکومت اور تمہاری حکومت میں کیا فرق ہوا؟ بس ان کے راضی کرنے کی فکر کرو، ان سے صحیح معنوں میں تعلق کو جوڑو، اسلام اور احکامِ اسلام کی پابندی کرو (''الافاضاتُ الیومیہ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد۵ صفحہ ۱۹۵،۱۹۶، ملفوظ نمبر ۱۹۰، بعنوان''خیرالقرون میں دوصورتیں'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

اگر کسی کو شرعی پابندیوں سے آزاد ہوکر مروَّجہ سیاست اور سیاسی عہدوں کا زیادہ ہی شوق ہو، تو وہ اسے مبارک ہو، لیکن یہ کام تو بے شمار غیر مذہبی جماعتیں اور کرپٹ شخصیات پہلے ہی کر رہی ہیں۔ اہلِ علم اور مذہبی مقتداؤں کے لیے یہ طرزِ عمل بہرحال کسی طرح درست نہیں لگتا، اس سے بہتر یہ ہے کہ علمی شخصیات مروَّجہ سیاست سے عملی طور پر الگ رہ کر سیاسی لوگوں کو وعظ وتلقین کرتی رہیں۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے ان چیزوں پر بہت مفصَّل ومدلَّل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

چنانچہ ایسی سیاست کے بارے میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ، اہلِ علم حضرات کے لیے ارشاد فرماتے ہیں:

''تجربہ اس پر بھی شاہد ہے کہ عام سیاسی لیڈر مصالحِ ملکی (یعنی ملکی مصلحتوں) کو دین پر مقدم رکھتے ہیں، اور جب مصلحت ومذہب میں تعارض (اور ٹکراؤ) ہوتا ہے، تو مذہب میں بعید سے بعید (یعنی دور دراز کی) تاویل کرنے میں دریغ نہیں کرتے، چنانچہ علماءِ مذکورین بھی اس میں مبتلا ہو رہے ہیں، اور ان کی تاویل چونکہ برنگِ دین ہوتی ہے، اس لئے وہ عام مسلمانوں کو زیادہ غلطی میں مبتلاء کرتی ہے، لہٰذا اس وقت طریقِ کار یہ مفید ہو سکتا ہے کہ سیاسی جماعت علیٰحدہ ہو،

اور مذہبی علیحدہ، اور مذہبی جماعت اپنا اصلی کام تبلیغ کا اس طرح انجام دے کہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت کی نگرانی کرے کہ یہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے حقوق کا گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف عمل نہ کر بیٹھے، اور چونکہ موجودہ زمانہ میں سیاسی جماعت مذہبی جماعت سے پوچھ کر عمل کرنے کی عادی نہیں رہی، اس لئے علماء کے ذمہ تھا کہ خود اس جماعت کے پاس پہنچتے اور احسن طریقہ سے تبلیغ کرتے۔......

اگر علماء اپنا اصلی کام تبلیغ ہی رکھتے اور اصل سیاست (علماء کے حق میں) یہی تھی کہ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دیا جاوے، تو آج (اپنے) جس وقار اور عظمت کے کھونے کی علماء شکایت فرماتے ہیں، اس سے عظمت اور وقار میں چار چاند لگ جاتے اور ثوابِ آخرت تبلیغ کا اور حفاظتِ دین کا مزید براں۔

لہٰذا اس زمانہ میں موجودہ طریقہ پر علماء کا سیاسی لیڈر کی حیثیت سے سیاست میں شریک ہونا، میرے نزدیک سخت مضر ہو رہا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس طرز میں لیڈروں کو مقابلہ کا موقعہ دینے سے علماء کی وقعت اور عظمت مسلمانوں کے دلوں سے نکلی جا رہی ہے، جو مسلمانوں کے دین کو ہمیشہ کے لئے مضر ہو رہی ہے اور اگر یہ حضرات تبلیغ فرما کر لیڈروں کو سنبھالتے، تو اس طرز میں شرعی طریقہ پر ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت بھی ہوتی اور علماء کی عظمت بھی بڑھتی اور ہم خرما ہم ثواب کا مصداق ہوتا'' (البدائع ص ۲۷، ۲۸ ملخصاً، بدیعہ نمبر ۱۰، ناشر: مکتبہ تالیفاتِ اشرفیہ، تھانہ بھون، مظفر نگر، انڈیا)

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت وبصیرت کی نعمت سے مستفید فرمائے۔ آمین

۲۳/ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ، 3/ جنوری 2008ء بروز جمعرات

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 4 شمارہ 12، جنوری 2008ء- ذی الحجہ 1428ھ)

(39)

صحیح اور غلط روایات میں امتیاز کی ضرورت

ایک مرتبہ میرے پاس ایک مولانا صاحب ملاقات کے لئے تشریف لائے، جن سے میری پہلے سے شناسائی تھی اورانہوں نے کہا کہ میں پہلے فلاں گاؤں کی ایک مسجد میں امام وخطیب تھا، لیکن ان لوگوں نے مجھے فارغ کر دیا ہے، اب میرا ارادہ ایک اکیڈمی قائم کرنے کا ہے، جس میں ناظرہ وحفظ قرآن مجید کے علاوہ بچوں کوعصری تعلیم دی جائے گی، اور یہ ابتدائی سطح کی تعلیم ہوگی، جیسا کہ ہمارے ملک میں اقراء روضۃ الاطفال وغیرہ نامی اکیڈمیاں کام کر رہی ہیں، ایک تو آپ سے اس سلسلہ میں مشاورت کرنی ہے، اور نصائح وھدایات حاصل کرنی ہیں، اور دوسرے اس کی افتتاحی تقریب میں آپ سے بیان وخطاب کا وقت لینا ہے۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ جہاں تک مذکورہ نوعیت کی اکیڈمی قائم کرنے کا تعلق ہے، تو اگرچہ اس طرح کی اکیڈمیوں کے اغراض ومقاصد تو بڑے خوشنما معلوم ہوتے ہیں، اور آج کل بہت سے حضرات اس طرح کی اکیڈمیاں قائم کر رہے ہیں، لیکن ان اکیڈمیوں میں سے اکثر اکیڈمیوں کی جو کارکردگی اب تک سامنے آئی ہے وہ کچھ حوصلہ افزاء اور قابلِ اطمینان نہیں ہے۔

اگرچہ ان اکیڈمیوں کے اہلِ حل وعقد کی طرف سے دعوے تو ''دینی ودنیاوی تعلیم کے حسین امتزاج'' وغیرہ کے کئے جاتے ہیں؛ مگر عام طور پر یہ امتزاج حسین وخوبصورت کے بجائے بدصورت ہی سامنے آتا ہے، اِلَّا ماشاءاللہ۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جتنے عرصہ میں صرف دین کی تعلیم ، یا صرف دنیوی اور عصری تعلیم دی جاتی ہے، اس مختصر عرصہ میں اس طرح کی اکیڈمیوں کے ذریعے سے دینی ودنیوی دونوں قسم کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

اور اسی قسم کے خوشنما دعووں سے متاثر ہو کر ہی عام طور پر لوگ دینی مدارس کے بجائے ان اکیڈمیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، لیکن دینی تعلیم کی خاطر عصری تعلیم کمزور رہ جاتی ہے

اور عصری تعلیم کی خاطر دینی تعلیم کمزور رہ جاتی ہے، اور نتیجتاً بچے

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم　　　نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

کا مصداق بن جاتے ہیں، اور پھر عوام الناس ان سے متنفر ہوتے ہیں۔

اس لئے ''دینی ودنیوی تعلیم کے حسین امتزاج'' اور مختصر عرصہ میں دینی ودنیوی تعلیم دینے کے دعوے سے پہلے ہی پرہیز کیا جائے، تو اچھا ہے، تاکہ لوگ کم از کم متنفر تو نہ ہوں۔

اس لئے بعض اکابر واسلاف فرماتے ہیں کہ دین کی مکمل تعلیم کا دعویٰ ہی نہ کرو، عصری اور دنیا ہی کی تعلیم دو، البتہ تربیت اور ذہن سازی اسلامی طرز پر بچوں کی کرو، اور کچھ تھوڑا بہت اخلاقیات وایمانیات سے متعلق دینی مواد بھی شامل کرلو، اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ جو حضرات خالص دین کی تعلیم کے خواہاں ہیں، وہ اپنے بچوں کو دینی مدارس چھڑوا کر ادھر نہیں بھیجیں گے، اور وہ دینی مدارس ہی میں اپنے بچوں کو رکھ کر خالص دینی تعلیم دیں گے۔

اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جب تربیت اور ذہن سازی اچھی اور بہتر ہوگی، تو دنیاوی اور عصری تعلیم کے خواہاں لوگ اس طرف متوجہ ہوں گے۔

اور اس طرزِ عمل سے عصری تعلیم کے میدان میں بہتری آئے گی، اور دینی مدارس ومکاتیب متاثر نہیں ہوں گے۔

دراصل آج کل ہو یہ رہا ہے کہ ایک ہوا اور رسم چلتی ہے، اس کے تحت ہم بغیر سوچے سمجھے ''بھیڑ کی چال کی طرح'' کام کرتے ہیں۔

آج کل اس طرح کی اکیڈمیوں کی ہوا چلی ہوئی ہے، جس طرح پہلے مدرسۃ البنات کی ہوا چلی ہوئی تھی کہ جس سے اور کوئی کام نہیں ہوتا تھا، وہ ایک لڑکیوں کا مدرسہ بنا کر بیٹھ جاتا تھا، اور اب اس کے بجائے اس طرح کی اکیڈمیاں قائم کرنے کی ہوا چلی ہوئی ہے، جس عالم سے اور کچھ نہیں ہوتا، وہ اکیڈمی قائم کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

بہر حال یہ بہت نازک کام ہے، اس کے لئے کام کرنے والی جماعت ہونی چاہئے، اور خوب

اچھی طرح سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہئے، اور مبالغہ آمیز دعووں سے بچنا چاہئے۔

بعض لوگ جوش میں کام شروع کر دیتے ہیں، اور پھر وہ کام قابو میں نہیں آتا، تو پریشان ہوتے ہیں، یا کام کو بے قاعدگی سے کرتے ہیں، قواعد واصول کی رعایت بہت ضروری ہے۔

اور جہاں تک آپ کی اس بات کا تعلق ہے کہ افتتاحی تقریب میں مجھے خطاب کے لئے مدعو کرنا چاہتے ہیں، تو میں نے تو خود اپنے ادارہ کی اس طرح کی رسمی افتتاحی تقریب نہیں کی، اور میں اس طرح کی رسمیات کا مزاج نہیں رکھتا۔

اکابر واسلاف رسوم سے اپنے آپ کو بچا کر رکھا کرتے تھے، اس لئے وہ اپنے مقصود میں کامیاب تھے اور آج ہم کام کے بجائے رسوم کا اہتمام کرتے ہیں، جس کی وجہ سے مقصود کے حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔

افتتاح کے معنیٰ ہیں ''شروع کرنا'' اگر کوئی تعلیم گاہ ہے، اس کا افتتاح کرنا ہے، تو اس کا افتتاح تعلیم سے ہوگا، تو اگر وہ کام پہلے شروع ہو چکا ہے، مثلاً اسباق شروع ہو چکے، تو سمجھنا چاہئے کہ اس کا حقیقی افتتاح تو ہو چکا، اب اس رسمی افتتاح کی کیا ضرورت، جس میں اور بھی نہ جانے کتنی خرابیاں آج کل جمع ہوگئی ہیں، اور اگر اس طرح کی تقریب سے اس کام کا تعارف کرانا مقصود ہے، تو اس کا نام تعارفی تقریب وغیرہ رکھنا چاہئے، اور اگر وہ کام ابھی تک شروع نہیں ہوا، تو پھر یہ رسمی تقریب تو خود وہ کام نہیں، بلکہ یہ تو ایک دوسری رسم ہے، لہٰذا اس سے اس کام کا افتتاح کیسا۔

لہٰذا بندہ اس طرح کی رواجی ورسمی افتتاحی تقاریب کو انجام دینے اور شرکت سے معذور ہے۔

البتہ اگر طلبہ وغیرہ کو اصلاحی باتیں، یا ہدایات وغیرہ دینی ہوں، تو الگ بات ہے، مگر آج کل اصلاحی باتوں اور ہدایتوں کو سنتا کون ہے؟

آج کل اہلِ علم میں ایک اور رسم تعزیتی جلسوں کی چل گئی ہے، پہلی رسم آغاز کی تھی، تو یہ رسم اختتام کی ہے کہ کسی بڑی شخصیت کے فوت ہونے کے بعد ''تعزیتی جلسہ'' رکھا جاتا ہے، اس سے مقصود اگر تعزیت ہے، تو تعزیت تو اجتماعی انداز میں شرعی اعتبار سے درست نہیں، اور

جلسہ کے نام سے واضح ہے کہ اس میں اجتماع ہوتا ہے، دوسرے تین دن کے بعد بلا عذر تعزیت مکروہ ہے، اسی طرح ایک دفعہ تعزیت کے بعد دوبارہ تعزیت بھی مکروہ ہے اور یہ تعزیتی جلسے عموماً تین دن کے بعد ہوتے ہیں، نیز ان میں ایسے حضرات بھی شریک ہوتے ہیں، جو پہلے سے تعزیت کر چکے ہیں، اور سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ تعزیت میں تو پسماندگان کو مختصر لفظوں میں تسلی اور مرحوم کو مختصر دعاء دی جاتی ہے، اس کے لئے اتنا طویل اجتماع چہ معنیٰ دارد؟

بہرحال یہ تعزیتی جلسہ شرعی اصولوں سے میل نہیں کھاتا۔

ایک عالم صاحب سے جب میں نے تعزیتی جلسے کے بارے میں یہ خدشات ذکر کئے، تو انہوں نے فرمایا کہ دراصل اس جلسہ سے مقصود تعزیت نہیں ہوتا، بلکہ فوت شدہ بزرگ کی خدمات اور تعارف کا ذکر مقصود ہوتا ہے۔

میں نے اس پر عرض کیا کہ پھر نام بھی تعارفی جلسہ، یا اسی قسم کا کوئی اور رکھا جاسکتا ہے، عنوان تو معنون کی ترجمانی کے لئے ہوا کرتا ہے، لہٰذا عنوان معنون کے خلاف اختیار کرنا، مناسب نہیں، بہرحال اس قسم کی خرابیاں، رسوم کی پابندیوں سے پیدا ہوتی ہیں، رسم و رواج کی پابندی انسان کو رفتہ رفتہ مقاصد سے دور کردیتی ہے، اسی لئے کسی شاعر نے کہا ہے۔

حقیقت روایات میں کھوگئی ۔۔۔ یہ امت خرافات میں کھوگئی

آج کل کسی کام کو انجام دینے سے پہلے صرف اس کی روایت اور کسی بڑے کی طرف اس کی نسبت کو دیکھ لینا کافی نہیں، کیونکہ اولاً تو آج کل کے بڑے وہ بڑے نہیں رہے، اور دوسرے بعض اوقات بڑوں کی طرف سے کسی کام کی ابتداء تو کسی اور حیثیت اور غرض سے ہوتی ہے لیکن بعد والوں کے ہاتھوں میں آنے کے بعد اس کی حیثیت اور غرض میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے، اس لئے صحیح وغلط روایات میں امتیاز کرنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی اور خصوصاً اہلِ علم حضرات کی رسوم ورواج سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 5 شمارہ 3، اپریل 2008ء۔ ربیع الاول 1429ھ)

(40)

اپنے کسی موقف سے رجوع اہلِ حق کا شعار ہے

ہمارے اکابرواسلاف نے حق پرستی کی وہ مثالیں قائم فرمائی ہیں کہ قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں، ہمارے اکابرواسلاف باوجود علم کے سمندر ہونے کے حق کی اتباع میں اتنے حریص تھے کہ اُنہیں اس کی تلاش وپیروی میں اپنی شان کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی، اورحق بات اگراُنہیں اپنے کسی چھوٹے، بلکہ دُشمن کی طرف سے بھی ملتی تھی، تو اُسے قبول کرنے میں کوئی عذرنہ ہوتا تھا۔

لیکن اگرکسی بات کے حق ہونے پرشرح صدرنہیں ہوتا تھا، تو پھرخواہ پوری دنیاایک طرف ہو، اس سے متأثر ہونے کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی محسوس نہ ہوتا تھا، اس سلسلہ میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کا مشائخِ دیوبند میں نمایاں مقام رہا ہے۔

اور آج اپنے کسی سابق موقف سے رجوع کرلینا، ہمارے علمی معاشرہ میں ایک عیب سمجھا جانے لگا ہے، اوراس کا تذکرہ کمزوری اور کوتاہی اور عیب کے ساتھ کیا جانے لگا ہے، جبکہ ظہورِخطاء کے بعدرجوع کرنا، ہمارے اکابرواسلاف کے کمال کی شان تھی۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے حق پرستی کی یہ شان تھی کہ اگرکسی مسئلے میں بمقتضائے بشریت خطا واقع ہوئی، تو اطلاع پاتے ہی فوراًرجوع فرماتے، اور غلطی کا بالتصریح اقرارفرمالیا کرتے تھے

(ملاحظہ ہو: تذکرۃ الرشید جلد۲صفحہ۴۶، اخلاق واوصاف، ناشر: امیرالمطابع، میرٹھ)

اس سلسلہ میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ سے متعلق ایک انتہائی مؤثر مگرمختصرمضمون پیشِ خدمت ہے۔

حضرت مولانامفتی محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمہ اللہ جوکہ حضرت مولانا رشیداحمد گنگوہی صاحب رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے (یہ مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب بلندشہری مہاجر مدنی رحمہ

اللہ کے علاوہ ہیں) انہوں نے حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کی حیات میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی سوانح حیات پر ''تذکرۃُ الرشید'' نام کی ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی، جو کہ اہلِ علم حضرات کے لیے بطورِ خاص بہت مفید ہے، اس کتاب میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے تفقہ وافتاء کے ذیل میں مولانا میرٹھی رحمہ اللہ نے حضرت گنگوہی اور حضرت تھانوی رحمہما اللہ کے مابین ایک مراسلہ کا ذکر کیا ہے، جو چند مسائل سے متعلق ہے اور ان مسائل پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا موقف پہلے کچھ اور تھا، اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے طویل مراسلت کے بعد وہ موقف تبدیل ہوگیا تھا، اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی تحقیق کی طرف رجوع فرمالیا تھا۔ [1]

حضرت گنگوہی وحضرت تھانوی رحمہما اللہ کے اس مراسلہ کو حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمہ اللہ نے نقل کرنے سے پہلے تذکرۃُ الرشید میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ اس دَور میں علماء کے لئے مشعلِ راہ ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''سب سے مقدم اس مراسلہ کو ہدیۂ ناظرین کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جو حضرت امام ربانی قدس سرہٗ اور مولانا الحافظ الحاج القاری شاہ اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہٗ کے مابین ۱۳۱۴ھ میں پیش آیا، چونکہ علامۂ زمن مولانا اشرف علی صاحب زید مجدہٗ کا تبحرِ علمی ہندوستان کے ہر ہر عالم کو تسلیم ہے، اس لئے شکوک وشبہات کی تقویت اسی سے اندازہ ہوسکتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی مولانا تھانوی دام ظلہٗ کا وہ طبعی خداداد جوہر قابلِ لحاظ ہے، جس کو سلامتیِ قلب، اطاعتِ حق، فروتنی، وہیچ مدانی اور سچا اسلام یعنی گردن نہادن بطاعت کہا جاتا ہے، آپ کا رجوع الی الحق،

[1] یہ رجوع فیصلہ ''ہفت مسئلہ'' سے متعلق تھا، فیصلہ ''ہفت مسئلہ'' کے نام سے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے حکم پر ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا تھا، اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے مکاتبت کے بعد اس میں مندرجہ مسائل میں اپنے جواز کے رجحان سے رجوع فرمالیا تھا، مگر افسوس کہ آج تک بعض علماء اس رسالہ کی تبلیغ کررہے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

www.idaraghufran.org

جوتکبر ونخوتِ علمی سے بے لوثی کی علامت، اور برحق علم کے سچے اثر کا ثمرہ ہے، آپ کے کمال کو اُس حد تک پہنچا رہا ہے کہ واللہ العظیم مولانا تھانوی کے پاؤں دھو کر پینا، نجاتِ اُخروی کا سبب ہے۔

یہ امتثال واذعان کی مثال علمائے زمانہ کے لئے مولانا تھانوی کی وہ پائیدار یادگار ہے، جو مُردہ سنت کے زندہ کرنے میں اس چودھویں صدی کے اندر سب سے پہلے مولانا کے ہاتھوں ظاہر ہوئی، چونکہ مولانا تھانوی میرے عقیدہ میں سرتاجِ علماء ہونے کے علاوہ خود میرے محترم پیشوا اور دینی آقا ہیں، اس لئے اس پاکیزہ تحریر کو جو ان شاء اللہ قیامت کے ہولناک دن میں مغفرت کی دستاویز اور قلبی سلامتی وایمان کی مہری سند بنا کر علیٰ رؤس الاشہاد مولانا کے ہاتھ میں دی جائے گی، سوانح میں شائع کرتا ہوں تاکہ احیاءِ سنتِ ممیتہ کی کسی درجہ میں تائید کا حصہ مجھ ناکارہ کو بھی مل جائے، اور تھانوی آقا کی کسی ادنیٰ مرتبہ میں حشر کے دن مجھے بھی معیت نصیب ہوجائے (تذکرۃ الرشید، جلد اوّل صفحہ ۱۱۳، تفقہ اور افتاء، ناشر: امیر المطابع، میرٹھ)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی طرف سے اپنے مضامین سے متعلق **ترجیح الراجح** کا مستقل سلسلہ تھا، جس میں کسی مسئلے کی وضاحت، یا رجوع کی اشاعت کی جایا کرتی تھی۔

اس کے علاوہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے اپنے وصایا میں بھی اس کا خاص اہتمام فرمایا ہے، چنانچہ آپ کی وصیتوں میں سے ایک وصیت یہ ہے:

''تالیفات کے بعض مقامات میں مجھ سے اختصارِ موہم، یا زیادتِ موہمہ، یا غفلت سے کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہیں، جو اس وقت ذہن میں حاضر ہیں، ان کی اطلاع جزئی طور پر دیتا ہوں، اور جو اس وقت ذہن میں حاضر نہیں، اُن کے لیے دو قاعدے عرض کرتا ہوں:

www.idaraghufran.org

ایک یہ کہ میری کسی ایسی تصنیف میں، جو اُس محلِ لغزش سے متاخر ہو، اس کی اصلاح کردی گئی ہو، اور متاخر ہونا تاریخ کے ملانے سے جو کہ ہر تصنیف کے آخر میں التزاماً لکھی گئی ہے، معلوم ہوسکتا ہے، اور اسی سے یہ بھی معلوم کرلینا چاہئے کہ میری تالیفات میں جو مضمون متعارض ہو، اُس میں اخیر کا قول میرا سمجھا جائے۔

دوسرا قاعدہ یہ کہ ایسے مواقع مشتبہ کو دوسرے علماء محققین سے تحقیق کرلیا جاوے، اور اُن کے قول کو میرے قول پر ترجیح دی جاوے، اسی طرح اگر میرا لکھا ہوا کوئی مشتبہ فتویٰ کسی کی نظر سے گزرے، اُس میں بھی یہی تقریر معروض ہے، کیونکہ بعض اوقات لکھنے کے بعد خود مجھ کو بعض جوابوں کا غلط ہونا محقق ہوا ہے، میں نے سائل کا پتہ معلوم ہونے پر اس کو مطلع بھی کردیا ہے، لیکن پتہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں، یا اس سائل کے پاس میری تصحیح کے محفوظ نہ رہنے کی تقدیر پر احتمال غلطی پڑنے کا ہوسکتا ہے، اس لئے احتیاطاً یہ عرض کیا گیا'' (اشرف السوانح، ج۳ص۱۷۴و ۱۷۵، تیئیسواں باب: وصایا، بعنوان ''تالیفات کے بارے میں وضاحتیں'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، جدید ایڈیشن: ربیع الاول ۱۴۲۷ھ)

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد5 شمارہ4، مئی 2008ء- ربیع الآخر 1429ھ)

---

(41)

اکابر کی موجودگی میں اصاغر کے علمی کام کی حیثیت

آج کل ہمارے علمی ماحول میں عام طور پر کچھ اس طرح کا مزاج بن گیا ہے کہ جب بھی کسی علمی وتحقیقی کام کی ضرورت پیش آتی ہے، تو جب تک اکابر کی طرف سے کوئی تحقیق سامنے نہ آجائے، اس وقت تک کسی مسئلہ پر تحقیق اور غور وفکر کرنے کی ہمت وجرأت نہیں کی جاتی۔

یا تو اس وجہ سے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کام اکابر کے ہی لائق ہے، اور اصاغر کو اس پر کچھ تحقیق و

لَب کُشائی اور قلم آزمائی کرنا، گستاخی، یا کم از کم بڑی بے باکی ہے۔
یا پھر اس وجہ سے کہ ہر تحقیقی کام کو اکابر کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے، اور خود سے کسی علمی وتحقیقی کام میں مشغولی کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھا جاتا، اور اگر اکابر کی موجودگی میں کبھی اَصاغر کی کسی علمی تحقیق کا انکشاف بھی ہوتا ہے، تو صرف اصاغر کی طرف اس مضمون کی نسبت کا علم ہوجانے سے ہی اس کو غیر معتبر وغیر مستند اور اس سے بڑھ کر بعض اوقات مَردود خیال کیا جاتا ہے۔
اور اس صورتِ حال کے تناظُر میں اکثر وبیشتر، بہت سے علمی وتحقیقی کاموں کا سالہا سال گزرنے کے باوجود کوئی فیصلہ ونتیجہ کُن موقف کو اختیار کرنے کی نوبت نہیں آتی۔
ہمارے خیال میں اس صورتِ حال کی اصلاح کی ضرورت ہے، اوّلاً تو عمومی سطح پر اکابر واصاغر کے درمیان کسی حدِّ فاصِل اور معیار کو متعین کرنا آسان کام نہیں، کیونکہ علمی وتحقیقی حوالہ سے مدار، عمر کی زیادتی پر تو نہیں رکھا جاسکتا، اور علم وعلماء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ موجود ہے کہ:

وَفَوۡقَ كُلِّ ذِي عِلۡمٍ عَلِيمٌ (سورة يوسف، رقم الاية ٧٦)

یعنی ”ہر علم والے کے اوپر اس سے زیادہ علم والا موجود ہے“ [1]

خصوصاً جبکہ فضا بھی اس قسم کی بنی ہوئی ہو کہ مختلف طبقات نے اکابر واصاغر کے مفہوم ومصداق بھی اپنے اپنے طور پر اختیار کر رکھے ہوں کہ ہر مخصوص طبقہ کی طرف سے اپنے ادارہ، یا سلسلہ کی کسی مرکزی اور کلیدی عہدہ کی شخصیت یا اپنے حلقہ کی مشہور شخصیت، یا پھر اپنے ذاتی اعتقاد واعتماد کی بنیاد پر کسی شخصیت کو اکابر، اور اس کے مقابلہ میں دوسروں کو اَصاغر کا درجہ دیا جاتا ہو، تو مجموعی طور پر اکابر واصاغر کی تعیین، ایک دُشوار ترین مرحلہ اور

---

[1] مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں ہم نے علم کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے، بڑے سے بڑے عالم کے مقابلہ میں کوئی اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہوتا ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ پوری مخلوقات میں کوئی اس سے زیادہ علم نہیں رکھتا، تو پھر رب العزت جل شانہٗ کا علم تو سب سے بالاتر ہی ہے (کذافی معارف القرآن، ج۵ ص۱۱۸، سورہ یوسف، ناشر: مکتبہ معارف القرآن، کراچی)

www.idaraghufran.org

ایک لاینحل مسئلہ ہے۔

اور اگر کسی طرح سے تعیین ہو بھی جائے، تب بھی بعض حضرات کو اکابر اور بعض کو اَصاغر تسلیم کر لینے کے بعد بھی ضروری نہیں کہ اصاغر کی ہر تحقیق خطاء اور اکابر کی ہر تحقیق صواب پر مبنی ہوا کرے، کیونکہ اس سے تو اَکابر کا معصوم عن الخطاء ہونا لازم آتا ہے، جو کہ صحیح نہیں۔

دوسرے خیرُ القرون کے دَور سے لے کر آج تک کے بے شمار واقعات اور علمی و تحقیقی سلسلہ خود اس اُصول کے خلاف نہ صرف شاہدِ عدل ہیں، بلکہ ہم تک سلسلہ بہ سلسلہ دین پہنچنے کا مضبوط ذریعہ ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اہم بات یہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں تحقیق کا مدار دلائل پر ہوا کرتا ہے، نہ کہ شخصیتِ محض پر؛ لہٰذا جس طرح اس بات کا امکان ہے، اور یہ امکان زیادہ ہے کہ اکابر کے دلائل قوی ہوں، اسی طرح یہ امکان بھی موجود ہے، اگرچہ وہ کم درجہ میں ہی کیوں نہ ہو کہ اَصاغر کے دلائل قوی ہوں۔

بعض اوقات بڑوں سے وہ چیز مخفی رہ جاتی ہے، جو اللہ تعالیٰ چھوٹوں پر ظاہر فرما دیتا ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری، اور صحیح ابنِ حبان وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے یہ سوال فرمایا کہ درختوں میں ایک درخت ایسا ہے، جس کے پتے جھڑتے نہیں، اور اس کی مثال ''مسلم'' کی طرح ہے، بتلاؤ! وہ درخت کونسا ہے؟ صحابہ جنگل کے درختوں پر غور کرنے لگے، عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میرا دل میں خیال آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے، لیکن مجھے، اپنے والد عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی وجہ سے جواب دینے میں حیاء محسوس ہوئی، پھر صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درخت کے بارے میں معلوم کیا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

پھر اس واقعہ کا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ اگر تم اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیتے، تو مجھے اس کی خوشی اتنی

زیادہ ہوتی کہ فلاں فلاں چیز، یعنی سرخ اونٹوں کے ملنے پر بھی اتنی خوشی نہ ہوتی۔ [1]
اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کم عمر والے کو بڑی عمر والوں کے مقابلہ میں زیادہ صلاحیت عطاء فرما دیتا ہے، اور چھوٹے کا بڑوں کی موجودگی میں اظہارِ خیال بے ادبی نہیں، ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پر خوشی کی تمناء نہ کرتے۔

اور ان سب چیزوں سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر کے عملی طور پر یہ بات ممکن بھی نہیں ہے کہ چند شخصیات کو اکابر کا درجہ دے کر ہر علمی وتحقیقی مسئلہ کو ان کی ذمہ داری سمجھ کر سارا بوجھ اُن پر ڈال دیا جائے، کیونکہ اس کا نتیجہ اہمالِ محض کے سوا شاید کچھ بھی برآمد نہ ہو۔

لہٰذا ان معروضات کی روشنی میں ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اکابر واَصاغر کے عنوان سے علمی وتحقیقی معاملات کو اَکابر کی ذمہ داری، یا صرف اُن کی شان سمجھ لینا، یا اَصاغر کی حوصلہ افزائی کے بجائے، ان کی لب کشائی کو گستاخی، یا بے باکی وغیرہ قرار دینے، یا سمجھنے کی مروَّجہ روِش درست نہیں۔ واللہ اعلم۔

اس موقع پر بعض علماء کو ایسی احادیث وروایات سے شبہ ہوا ہے، جن میں اصاغر کے پاس سے

---

[1] عن عبد الله بن عمر : أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إن من الشجر شجرة لا يسقط ورقها، وهى مثل المسلم، حدثونى ما هى؟ فوقع الناس فى شجر البادية، ووقع فى نفسى أنها النخلة، قال عبد الله: فاستحييت، فقالوا: يا رسول الله، أخبرنا بها .فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: هى النخلة .قال عبد الله: فحدثت أبى بما وقع فى نفسى فقال: لأن تكون قلتها أحب إلى من أن يكون لى كذا وكذا(صحيح البخارى،رقم الحديث ۱۳۱ ، كتاب العلم، باب الحياء فى العلم)
أخبرنا الفضل بن الحباب قال حدثنا أبو عمر الضرير قال حدثنا عبد العزيز بن مسلم القسملى عن عبد الله بن دينار عن ابن عمر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "من يخبرنى عن شجرة مثلها مثل المؤمن أصلها ثابت وفرعها فى السماء تؤتى أكلها كل حين بإذن ربها "؟ قال عبد الله :فأردت أن أقول هى النخلة فمنعنى مكان أبى فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم " :هى النخلة "فذكرت ذلک لأبى فقال :لو قلتها كان أحب إلى من كذا وكذا أحسبه قال :حمر النعم(صحيح ابنِ حبان،رقم الحديث ۲۴۳)
قال شعيب الارنؤوط:إسناده صحيح(حاشية صحيح ابنِ حبان)

علم تلاش کرنے کو قیامت کی علامت بتلایا گیا ہے۔

جیسا کہ حضرت ابوامیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ ثَلَاثَةً: إِحْدَاهُنَّ أَنْ يُّلْتَمِسَ الْعِلْمَ عِنْدَ الْأَصَاغِرِ (المعجم الكبير للطبرانی، رقم الحديث ٩٠٨، ج٢٢ص ٣٦١، المعجم الاوسط، رقم الحديث ٨١٤٠، الزهد والرقائق لابن المبارك، رقم الحديث ٦١) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی علامتوں میں سے تین ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ علم اصاغر سے تلاش کیا جائے گا (طبرانی)

حالانکہ اس طرح کی احادیث میں اصاغر سے مراد، وہ افراد نہیں، جو آج کے دور میں اکابر کے مقابلہ میں اصاغر کے عنوان سے مراد لئے جاتے ہیں، بلکہ اصاغر سے، یا تو جاہل اور اپنی رائے سے بات کرنے والے مراد ہیں، یا ''فساق، اور ارذل'' لوگ مراد ہیں، یا ''اہلِ بدعت'' مراد ہیں، یا صحابہ کے مابعد کے لوگ مراد ہیں۔

چنانچہ علامہ ابنِ عبدالبر نے مذکورہ حدیث پر جو باب قائم کیا ہے، وہ یہ ہے:

''باب حال العلم إذ كان عند الفساق والأرذال''

جس کے ذیل میں ابنِ عبدالبر نے مذکورہ بالا حدیث کے بعد فرمایا:

قال نعيم: قيل لابن المبارك: من الأصاغر؟ قال: الذين يقولون برأيهم، فأما صغير يروى عن كبير فليس بصغير وذكر أبو عبيد فى تأويل هذا الخبر عن ابن المبارك أنه كان يذهب بالأصاغر

[1] قال الالبانی: قلت: وهذا إسناد جيد لأن حديث ابن لهيعة صحيح إذا كان من رواية أحد العبادلة عنه وابن المبارك منهم. فما نقله المناوى عن الهيثمى أنه أعله بقوله: فيهابن لهيعة ضعيف ليس بجيد ولذلك قال الحافظ المقدسى عقبه " :وإسناده حسن (سلسلة الاحاديث الصحيحة، تحت رقم الحديث ٦٩٥)

www.idaraghufran.org

إلى أهل البدع ولا يذهب إلى السن، قال أبو عبيد: وهذا وجه، قال أبو عبيد: والذى أرى أنا فى الأصاغر أن يؤخذ العلم عمن كان بعد أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فذاك أخذ العلم عن الأصاغر (جامع بيان العلم وفضله، ج ۱، ص ۶۱۲، رقم الحديث ۱۰۵۲، باب حال العلم إذ كان عند الفساق والأرذال)

پھر چند روایات نقل کرنے کے بعد ابنِ عبدالبر نے فرمایا:

قال أبو عمر: قد تقدم من تفسير ابن المبارك وأبى عبيد لمعنى الأصاغر فى هذا الباب ما رأيت، وقال بعض أهل العلم: إن الصغير المذكور فى حديث عمر وما كان مثله من الأحاديث إنما يراد به الذى يستفتى ولا علم عنده وأن الكبير هو العالم فى أى سن كان. وقالوا: الجاهل صغير وإن كان شيخا، والعالم كبير وإن كان حدثا (جامع بيان العلم وفضله، ج ۱، ص ۶۱۷، تحت رقم الحديث ۱۰۶۰، باب حال العلم إذ كان عند الفساق والأرذال)

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 5 شمارہ 5، جون 2008ء۔ جمادی الاولیٰ 1429ھ)

---

(42)

اہتمام میں وراثت جاری نہیں ہوتی

آج کل عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے، کہ دینی مدارس کے اہتمام وانصرام کا عہدہ وراثت در وراثت منتقل ہوتا ہے، اور اہتمام وانصرام کی اہلیت وقابلیت اور امانت ودیانت داری کے مقابلہ میں قرابت داری کو ترجیح دی جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں بڑے بڑے دینی ادارے نہ صرف تباہ وبرباد ہو کر رہ جاتے ہیں، بلکہ اسی کے ساتھ نااہل ورثاء، بزرگوں کی بدنامی کا

ذریعہ وسبب بھی بنتے ہیں، اوراس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عموماً اہتمام وانتظام کے عہدے ومنصب کو مال وجائیداد کی طرح وراثت کی چیز سمجھا جاتا ہے۔

ان حالات میں ایک طبقہ تواس مروجہ وراثتی نظام سے من وعن اتفاق رکھتا ہے،اور دوسرا طبقہ اس پر مرتب ہونے والے مفاسد کو دیکھتے ہوئے، کسی عزیز وقریب کواہتمام وانتظام سپرد کرنے کی کلی مخالفت کرتا ہے۔

مگر شریعت نے اس سلسلہ میں جو نظام پیش کیا ہے، وہ ہر طرح کی افراط وتفریط سے پاک ہوکراعتدال کے اصول پر مبنی ہے۔

شریعت کے پیش کردہ نظام میں نہ تواہتمام وانتظام کا معاملہ، مالی وراثت کی طرح ہے،اور نہ ہی کسی عزیز وقریب کواس عہدے کا سپرد کرنا، فی نفسہٖ کوئی شجرۂ ممنوعہ ہے، بلکہ اس کا دارومدار قابلیت،اہلیت وصلاحیت اور امانت ودیانت پر ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی نے اپنے والد کوحضرت موسیٰ علیہ السلام کے ملازم رکھ لینے کامشورہ دیتے وقت یہ دلیل پیش فرمائی تھی کہ:

يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (سورة قصص، رقم الآية ٢٦)

ترجمہ: اے میرے والد! آپ ان کوملازم رکھ لیجیے، کیونکہ اچھا ملازم وہ شخص ہے، جومضبوط (ہواور) امانت دار (بھی) ہو(اور حضرت موسیٰ میں دونوں صفتیں ہیں)

اس سے کسی شخص کوکوئی عہدہ سپرد کرنے کی دوصفات معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ وہ قوی ہو،جس سے مراد اس کام کی قوت وصلاحیت والا ہونا ہے، جو کام اُس کے سپرد کیا جائے؛ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ امین ہو،جس سے مراد یہ ہے کہ اُس کی سابقہ زندگی کے حالات اس کی امانت ودیانت کی گواہی دیتے ہوں (کذافی معارف القرآن، جلد۶ صفحہ ۱۰۷، سورہ طٰہٰ، ناشر: مکتبہ معارف القرآن، کراچی، طبع جدید: ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ، اپریل ۲۰۰۸ء)

اس قرآنی ہدایت کی روشنی میں اہتمام ایسے شخص کوسپرد کرنا چاہئے،جس میں اہتمام کو چلانے

www.idaraghufran.org

کی صلاحیت واستعداد ہو، اور وہ امانت ودیانت دار ہو، پھر اگر یہ دوصفات دوسروں کے مقابلہ میں کسی عزیز وقریب میں پائی جائیں، تو اس کو اہتمام سپرد کردینے میں بھی کوئی حرج نہیں، بلکہ بعض اوقات یہ زیادہ مفید ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کلامِ الٰہی کا خاص شرف حاصل ہوا، اور نبوت ورسالت کا منصب عطاء ہوا، تو اللہ تعالیٰ سے اُنہوں نے چند دُعائیں کی تھیں، جن میں سے ایک دُعاء یہ تھی:

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ. هٰرُوْنَ اَخِيْ. اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ. وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ (سورة طٰهٰ رقم الآيات ۲۹ الى ۳۲)

ترجمہ: اور میرے واسطے میرے گھر والوں میں سے ایک وزیر (ومعاون) مقرر کردیجیے، یعنی ہارون کو جو میرے بھائی ہیں، اُن کے ذریعے سے میری قوت کو مستحکم کردیجیے، اور اُن کو میرے کام میں شریک کردیجیے (سورہ طٰہٰ)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ان آیات کے ضمن میں فرماتے ہیں:

اس دعاء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو وزیر طلب فرمایا، اُس کے ساتھ ایک قید مِّنْ اَهْلِيْ کی بھی لگادی کہ یہ وزیر میرے خاندان واقارب میں سے ہو، کیونکہ اپنے خاندان کے آدمی کے عادات واخلاق دیکھے بھالے، اور طبائع میں باہم اُلفت ومناسبت ہوتی ہے، جس سے اس کام میں مدد ملتی ہے، بشرطیکہ اس کو کام کی صلاحیت میں دوسروں سے فائق دیکھ کرلیا گیا ہو، محض اقربا پروری کا داعیہ نہ ہو۔

اس زمانے میں چونکہ عام طور پر دیانت واخلاص مفقود اور اصل کام کی فکر غائب نظر آتی ہے، اس لیے کسی امیر کے ساتھ اس کے خویش وعزیز کو وزیر، یا نائب بنانے کو مذموم سمجھا جاتا ہے، اور جہاں دیانت داری پر بھروسہ پورا ہو، تو کسی صالح واَصلح خویش وعزیز کو کوئی عہدہ سپرد کردینا کوئی عیب نہیں، بلکہ مہمّاتِ اُمور کی تکمیل کے لیے زیادہ بہتر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے

راشدین میں عموماً وہی حضرات ہوئے، جو بیتِ نبوت کے ساتھ رشتہ داریوں کے تعلقات بھی رکھتے تھے (معارف القرآن، جلد۶ صفحہ ۸۷، سورہ طٰہٰ، ناشر: مکتبہ معارف القرآن، کراچی، طبع جدید: ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ، اپریل ۲۰۰۸ء)

دراصل کسی اجتماعی عہدے و منصب کا معاملہ ایک ذمہ داری ہے، اس کو ذمہ داری سمجھ کر ہی اختیار اور دوسرے کو سپرد کرنا چاہیے، اور اس کو اپنی قدر و منزلت بڑھانے اور حصولِ جاہ کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

جس شخص کے پیشِ نظر اس منصب کی بھاری ذمہ داری کا معاملہ ہوگا، وہ ہرگز بھی اس کو حلوہ بے دود سمجھ کر چٹ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ ،وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ ،اَلْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ ،وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِيْ اَهْلِهٖ، وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِيْ بَيْتِ زَوْجِهَا ،وَمَسْئُوْلَةٌ عَنْ رَّعِيَّتِهَا ،وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِيْ مَالِ سَيِّدِهٖ، وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ.

قَالَ: وَحَسِبْتُ اَنْ قَدْ قَالَ: وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِيْ مَالِ اَبِيْهِ ،وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ ،وَكُلُّكُمْ رَاعٍ ،وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ (صحيح البخاری، رقم الحديث ۸۹۳، كتاب الجمعة، باب الجمعة فی القرى والمدن)

ترجمہ: تم سب نگران و ذمہ دار ہو، اور تم سب سے اپنی نگرانی و ذمہ داری کے متعلق (قیامت کے دن) سوال کیا جائے گا، امام (یعنی حکمران و صاحبِ اقتدار) نگران ہے، اور اس سے اپنی رعایا کے متعلق سوال کیا جائے گا، اور آدمی اپنے گھر والوں کا نگران ہے، اور اس سے اس کی رعایا (گھر والوں) کے متعلق سوال کیا جائے گا، اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اور اس سے اس کی رعایا (گھریلو امور) کے متعلق سوال کیا جائے گا، اور خادم اپنے مالک کے مال کا نگران ہے

اوراس سے اس کی رعایا (مالک کے مال) کے متعلق سوال کیا جائے گا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اور آدمی اپنے والد کے مال کا نگران ہے، اوراس سے اس کی رعایا (والد کے مال) کے متعلق سوال کیا جائے گا، اور تم سب نگران ہو اور ہر ایک کی رعایا کے متعلق سوال کیا جائے گا (بخاری)

اور ایک روایت کے میں الفاظ یہ ہیں:

اَلاکُلُّکُم رَاعٍ، وَکُلُّکُم مَسئُولٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ ، فَالْاَمِیرُالَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ ،وَھُوَمَسئُولٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِہٖ ، وَھُوَ مَسئُولٌ عَنھُم ،وَالْمَرْأَۃُ رَاعِیَۃٌعَلٰی بَیْتِ بَعْلِھَا وَوَلَدِہٖ ، وَھِیَ مَسئُولَۃٌ عَنھُم، وَالْعَبْدُ رَاعٍ عَلٰی مَالِ سَیِّدِہٖ ،وَھُوَمَسئُولٌ عَنْہُ . اَلافَکُلُّکُم رَاعٍ ،وَکُلُّکُم مَسئُولٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ (صحیح مسلم ،رقم الحدیث ۱۸۲۹ ''۲۰''کتاب الامارۃ،باب فضیلۃ الإمام العادل .وعقوبۃ الجائر، والحث علی الرفق بالرعیۃ، والنھی عن إدخال المشقۃ علیھم، صحیح البخاری رقم الحدیث ۲۵۵۴)

ترجمہ: آگاہ ہوجاؤ! کہ تم سب راعی (نگران وذمہ دار) ہو، اور تم سب سے اپنی رعایا (زیرِ نگرانی وذمہ داری) کے بارے میں (قیامت کے دن) سوال کیا جائے گا، پس لوگوں کا امیر نگران ہے، اوراس سے اپنی رعایا (لوگوں) کے بارے میں سوال کیا جائے گا، اور آدمی اپنے گھر والوں کا نگران ہے، اوراس سے گھر والوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا، اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور شوہر کی اولاد کی نگران ہے، اوراس سے ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا، اور غلام اپنے مالک کے مال کا نگران ہے، اوراس سے مالک کے مال کے بارے میں سوال کیا

جائے گا، خبردار ہو جاؤ کہ تم سب نگران ہو اور تم سب سے اس کی نگرانی وذمہ داریوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا (بخاری، مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی بھی عہدہ ومنصب ایک ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ [1]

لہٰذا جب اس عہدے ومنصب کو اَحسن طریقے پر نباہنے اور چلانے کی استعداد وقابلیت نہ ہو، یا استعداد وقابلیت تو ہو، مگر امانت ودیانت اور اللہ کے خوف کا فقدان ہو، تو ہرگز بھی اس عہدے ومنصب کو اختیار نہیں کرنا چاہیے، اور جب یہ دونوں صفات موجود ہوں، خواہ کسی عزیز وقریب میں ہوں، یا اجنبی میں، تو پھر کسی عہدے ومنصب کو سنبھالنے میں حرج نہیں، بلکہ بعض جہات سے عزیز وقریب میں ان صفات کا پایا جانا زیادہ مؤثر وکارآمد ہے (کمامرّ بحوالہ معارف القرآن)

لہٰذا دینی اداروں اور مدرسوں کے اہتمام اور اسی طریقے سے مساجد کی امامت وخطابت کو وراثت کی چیز سمجھنا بہت بڑا جُرم ہے، اور کیونکہ ان عہدوں اور منصبوں سے قوم کا اجتماعی حق وابستہ ہوتا ہے، اس لیے ان میں خیانت کا ارتکاب کرنا کوئی عام جُرم نہیں ہوگا، بلکہ اجتماعی جُرم ہوگا، جس کی تلافی ومعافی آسان کام نہیں۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 5 شمارہ 6، جولائی 2008ء- جمادی الاخریٰ 1429ھ)

---

(43)

موجودہ اسلامی بینکاری سے متعلق اظہارِ خیال

آج کل ملک کے بعض علماء کے طبقہ میں بعض اداروں اور بینکوں کی اسلامی تجکاری وبینکاری

---

[1] قوله صلى الله عليه وسلم (كلكم راع وكلكم مسؤول عن رعيته) قال العلماء الراعى هو الحافظ المؤتمن الملتزم صلاح ما قام عليه وما هو تحت نظره ففيه أن كل من كان تحت نظره شىء فهو مطالب بالعدل فيه والقيام بمصالحه فى دينه ودنياه ومتعلقاته (شرح النووى علىٰ مسلم، ج ۱۲، ص ۲۱۳، كتاب الامارة، باب فضيلة الأمير العادل وعقوبة الجائر والحث على الرفق)

کی کارکردگی کے جائز وناجائز اور صحیح وغلط ہونے پر بحث جاری ہے۔

اہلِ علم کا ایک طبقہ تو وہ ہے، جو اسلامی بینکاری کے عنوان سے جاری سلسلوں کی کلی مخالفت کرتا ہے، اور اس کے نزدیک یہ سب سلسلے کلیتاً غیر اسلامی ہیں، اور ان کو اسلامی قرار دینا، گویا کہ صرف ایک دھوکہ ہے۔

اس کے برعکس ایک طبقہ کے خیال میں یہ نظام گویا کہ سو فیصدی اسلامی ہے، اور اس کو کسی بھی حیثیت سے غیر اسلامی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جبکہ اہلِ علم حضرات ہی کا ایک بڑا طبقہ وہ ہے، جو اِن دونوں کے بین بین ہے، اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ نظام سو فیصدی اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے، اور اس میں ابھی بہت کچھ اصلاحات کی ضرورت ہے، لیکن اس کو پوری طرح غیر اسلامی قرار دینا بھی ناانصافی ہے، کیونکہ سودی نظام کے خاتمہ اور نجات کے لئے انتہائی کوششوں کے بعد اسلامی بینکاری کو وجود میں لایا گیا ہے، اور کفریہ خالص سود پر مشتمل نظام کا اس میں کافی حد تک خاتمہ کیا جاچکا ہے اور اس سلسلہ میں مزید کوششیں جاری ہیں۔

ہماری تحقیق کے مطابق اس تیسرے طبقہ کا موقف دلائل وحقائق کے لحاظ سے بہت وزن رکھتا ہے، اور افراط وتفریط سے پاک ہوکر اعتدال کے اصولوں پر مبنی ہے۔

ہمارا مدتِ دراز سے یہی موقف ہے، اور سائلین کے بعض اسلامی بینکوں سے معاملات کرنے کے جواب میں بھی یہی عرض کیا جاتا ہے کہ جب تک کوئی مجبوری نہ آن پڑے، اس وقت تک ان اسلامی بینکوں سے بھی معاملہ نہ کیا جائے، البتہ مجبوری ہو، تو ان بینکوں کے شرعی ایڈوائزروں سے رابطہ کرکے ان کے مشورہ کے مطابق آپ کے لئے گنجائش ہے۔

البتہ اسی کے ساتھ غیر اسلامی بینکوں کے بجائے اسلامی بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانے، اور خرید وفروخت وغیرہ کے لئے بینک کے واسطہ کی ضرورت کے مواقع پر اسلامی بینکوں کو استعمال کرنے کی عوام کو ترغیب دینے کی ضرورت ہے، اس سے جہاں ایک طرف

لوگ غیر اسلامی معاملات میں معاون بننے سے محفوظ رہیں گے، اسی کے ساتھ اسلامی بینکوں کی ترقی اور غیر اسلامی بینکوں کی حوصلہ شکنی کا بھی باعث ہوں گے۔

مورخہ 20 جولائی تا 23 جولائی 2008ء کو میزان اسلامی بینک کے تعاون سے اسلام آباد میں چار روزہ ''اسلامی بینکاری وانشورنس وتکافل'' کورس منعقد ہوا۔

یہ کورس اسلام آباد میں الشفاء انٹرنیشنل کے بالمقابل نیباف (NIBAF) نامی بلڈنگ کے ایک ہال میں منعقد ہوا، جس میں راولپنڈی اور اسلام آباد کے دارالافتاؤں سے منسلک علماء نے شرکت فرمائی۔

اس کورس میں جن اہلِ علم حضرات نے لیکچر دیا، ان کا اسلامی بینکوں کی نگرانی اور مشاورت سے تعلق تھا، ان میں ایک تو جناب مولانا مفتی ارشاد صاحب زید مجدہٗ تھے جو کہ ''البنک الاسلامی'' کے شرعی ایڈوائزر ہیں۔

اور دوسرے جناب مولانا ڈاکٹر عمران اشرف صاحب زید مجدہٗ تھے، جو میزان اسلامی بینک کے شرعی ایڈوائزر ہیں۔

21 اور 22 جولائی کی نشستوں میں بندہ بھی شریک رہا، اور باقی دنوں کی نشستوں میں مولانا مفتی امجد صاحب سلمہٗ ادارہ غفران کی طرف سے شریک ہوئے، ان نشستوں میں شریک ہو کر بھی بندہ کو اپنے سابقہ موقف ہی کی تائید محسوس ہوئی۔

اور مذکورہ حضرات کے لیکچروں سے مجھے جو کچھ محسوس ہوا، اس کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ یہ حضرات رائج اسلامی بینکاری کو سو فیصدی اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ قرار نہیں دیتے، اور برابر اصلاحات کے لئے کوشاں ہیں، اور ناجائز امور کو، یا تو بالکلیہ ختم کرنے کے متمنی ہیں، یا بامر مجبوری ان کے متبادل جائز پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں، اور بعض موقعوں پر فقہائے کرام کی طرف سے تجویز کردہ کتاب الحیل سے بھی استفادہ کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے، عالمی سطح سے لیکر ہر اسلامی بینک کی برانچ تک میں اہلِ علم

حضرات غیر معمولی تعداد میں مقرر ہیں، جو شرعی تناظر میں نظام کا جائزہ لیتے رہتے ہے، اور اصلاحات کا اہتمام کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ہمارے ملک کے نامور فقیہ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی خدمات اتنی وسیع اور ہمہ گیر و ہمہ جہتی ہیں، جو ایک بڑے ادارہ کے لئے بھی انجام دینا ایک مشکل امر تھا، اللہ تعالیٰ حضرت کا سایہ قائم رکھے، اور اس سلسلہ میں ان کو مزید کامیابیاں عطاء فرمائے۔ آمین۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ علمائے کرام سب سے پہلے تو اسلامی بینکاری کے نظام کو خالی الذہن ہو کر سمجھنے کا اہتمام کریں، اور اس کے بعد شرعی اصولوں کی روشنی میں تمام حالات کو سامنے رکھ کر سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں، اور اس کے بغیر یکطرفہ طریقہ پر کوئی فتویٰ جاری نہ فرمائیں، اور جو باہمی علمی نوعیت کے اختلافات ہیں، ان کا آپس میں مذاکرہ کر کے اتفاق کا راستہ نکالیں (ورنہ عوام جس کے فتوے پر عمل کریں، ان پر نکیر نہ کریں)

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 5 شمارہ 7، اگست 2008ء۔ رجب المرجب 1429ھ)

---

(44)

علماء وطلبہ کے لئے تحریر و کتابت کی ضرورت واہمیت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مولوی حبیب احمد صاحب کیرانوی مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں طالبِ علموں کو پڑھانے کے لئے آئے تھے، مگر اب میں نے ان کو درس کے کام سے نکال کر تصنیف کے کام میں لگا دیا ہے، اس کی آج کل سخت ضرورت ہے۔

مدرس تو بہت ہیں، مصنف بھی ہونے چاہئیں، یہ کام اگر علماء اپنے ہاتھ میں لے لیں، تو غیر علماء کو ہمت نہ ہو، اور نہ کوئی ان کی تصانیف کے سامنے ان کی قدر کرے۔

میرا ارادہ اس شعبہ کو مستقل کردینے کا ہے، اس کی آج کل سخت ضرورت ہے

(حسن العزیز، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۰ص۱۳۷، بعنوان ''مصنفین کی ضرورت'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر۱۴۲۵ھ)

اور حضرت موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں:

تصنیف کا کام بھی بہت مشکل کام ہے، جو کام کرتا ہے وہی جانتا ہے کہ کیا مشکلات پڑتی ہیں، آج کل جو اکثر تصنیفات ہیں کہ مصنفین برساتی مینڈک کی طرح اُمڈ پڑتے ہیں، اس وقت ان کا ذکر نہیں، ان کا تو یہ قصہ ہے کہ ایک پہلو لے لیا اور رسالہ لکھ مارا، چاہے آگے پھر کچھ بھی ہوا کرے۔

ذکر اِن مصنفین کا ہے جو محقق ہیں، جن کے سامنے ہر پہلو ہے، اور ہر جزئی اور کلی پر ان کی نظر ہے، اور اس حالت میں پھر تصنیف کرتے ہیں، ان کی حالت تصنیف کے وقت ایسی ہوتی ہے، جیسے جان کنی کے وقت ہوتی ہے (''آدابِ تقریر وتصنیف'' ص۱۹۶، باب: ۵، فصل: ۱، بحوالہ: الافاضات الیومیۃ ہفتم نمبر۲ ص۳۶۲، ناشر: مکہ کتاب گھر، لاہور، اشاعت: اکتوبر۱۹۹۶ء)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تفسیر معارفُ القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

علمائے سلف وخلف نے ہمیشہ تعلیمِ خط وکتابت کا بڑا اہتمام کیا ہے، جس پر ان کی تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آج تک شاہد ہیں۔

افسوس ہے کہ ہمارے اس دور میں علماء وطلباء نے اس اہم ضرورت کو ایسا نظر انداز کیا ہے کہ سینکڑوں میں دو چار آدمی مشکل سے تحریرِ کتابت کے جاننے والے نکلتے ہیں، **فالی اللہ المشتکٰی** (معارف القرآن، ج۸ص۷۸۶، سورۃ العلق، ناشر: مکتبہ معارف القرآن، کراچی، طبع جدید: ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ، اپریل ۲۰۰۸ء)

حضرت مفتی صاحب موصوف نے بالکل درست فرمایا کہ خط وکتابت کی تعلیم وتربیت کا

علمائے سلف وخلف کے یہاں بہت اہتمام تھا، اوراسی وجہ سے ان کے قلم سے تصنیف شدہ عظیم الشان ذخائر آج تک موجود ہیں۔

لیکن اس زمانے کے علماء وطلبہ میں اس ضرورت سے بہت غفلت پائی جاتی ہے، اوراگر کچھ حضرات اس ضرورت کو پورا کرنے والے بھی ہیں، توان میں بھی اکثر وہ ہیں جو دینی مدارس اور علمی ماحول کے انداز سے تو مانوس ہیں، عوامی انداز سے وہ بھی محروم ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام کا بڑا طبقہ علماء کے کام سے مستفید نہیں ہورہا۔

اوراس کے نتیجہ میں تحریر وکتابت کا میدان خالص دنیادار لوگوں کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کا کھیل بن کررہ گیا ہے، چنانچہ اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین اکثر وبیشتر دنیادار لوگوں کے ہوتے ہیں، یہی لوگ دینی رنگ کے مضامین اپنے قلم سے تحریر کرتے ہیں، اور مطلوبہ دینی علم نہ ہونے کے باعث قدم قدم پر غلطیاں کرتے ہیں، جو کہ عوام کے دین کی تباہی وبربادی کا بھی باعث بنتا ہے۔

ہمارے یہاں بڑے بڑے دینی ادارے اور جامعات ہیں، جن میں سے بعض اداروں سے کچھ رسائل وجرائد بھی شائع ہوتے ہیں، لیکن ان اداروں کے اندر بڑی بڑی علمی شخصیات موجود ہونے کے باوجود بہت سے مضامین دوسرے ایسے لوگوں کے ہوتے ہیں جو ٹھوس دین کا علم نہیں رکھتے، اور وہ مضامین عوام کی دینی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتے، بلکہ بعض مضامین تو غیر تحقیقی بھی ہوتے ہیں۔

اس کی ایک وجہ بھی وہی ہے جو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بیان کی کہ:

> علماء وطلباء نے تحریر اور خط وکتابت کی ضرورت کواس دور میں ایسا نظر انداز کیا ہے کہ سینکڑوں میں دو چار آدمی مشکل سے تحریرِ کتابت کے جاننے والے نکلتے ہیں،
>
> **فالی اللہ المشتکی۔**

پس ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مدارس میں علماء وطلبہ تحریر اور خط وکتابت کی ضرورت کو

سہل زبان میں انجام دینے کی طرف توجہ کریں، اوراس فن کی مشق وتربیت حاصل کرنے کرانے کا اہتمام کریں، تاکہ بقول حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ:

یہ کام اگر علماء اپنے ہاتھ میں لے لیں، تو غیر علماء کو ہمت نہ ہو، اور نہ کوئی ان کی تصانیف کے سامنے ان کی قدر کرے۔

اس سے ان شاءاللہ تعالیٰ عوامی دنیا پر بہت اچھے اور مفید اثرات مرتب ہوں گے۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 5 شمارہ 8، ستمبر 2008ء۔ شعبان المعظم 1429ھ)

---

(45)

مناظرہ جائز ہونے کی شرائط

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مناظرہ کا جواز اِن (آنے والی) شرائط کے ساتھ مقید ہے:

(1)...... وہ مسئلہ دین میں مقصود بھی ہو۔

(2)...... دل سے یہ ارادہ ہو کہ حق واضح ہو جائے گا، تو فوراً قبول کرلیں گے یہ نیت نہ ہو کہ ہر بات کو رد کردیں گے، گو سمجھ میں آجائے۔

(3)...... مخاطب پر شفقت ہو۔

(4)...... اگر وہ شفقت کے قابل نہ ہو، تو صبر اور معدلت (انصاف) کے ساتھ مقابلہ کرے۔

(5)...... اگر قرائن سے عناد مشاہد ہو، تو مناظرہ سے معافی کی درخواست کرکے ترک کردے۔

(6)...... تمام صورتوں میں واجب ہے کہ الفاظ اور مضمون نرم ہو، متانت اور تہذیب کے خلاف نہ ہو، اگر دوسرا درشتی (سختی بے ادبی) بھی کرے، تو صبر افضل ہے۔

www.idaraghufran.org

(7)...... جوبات معلوم نہ ہو نہ جاننے کا اقرار کرنے سے عار نہ کرے وغیرہ ذالک۔

جہاں یہ شرائط نہ ہوں گی، جیسا آج کل مشاہد ہے، وہاں مناظرہ نافع ہونے کے بجائے بالیقین مضر ہوگا (اصولِ مناظرہ، باب نمبرا، بعنوان ''مناظرہ کے جواز کے شرائط'' بحوالہ: حقوق العلم ص۷۸، مشمولہ: تحفۃ العلماء، ج۲ص۴۹۹، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے مناظرہ جائز ہونے کی شرائط بیان فرما کر آخر میں یہ بھی واضح فرمادیا کہ آج کل مناظرہ میں ان شرائط کے نہ پائے جانے کا مشاہدہ ہے، اس لیے یہ مناظرے نقصان دہ ثابت ہو رہے ہیں۔

جو اہلِ علم حضرات مناظرہ کے شوقین ہیں، ان کو ان شرائط کو بار بار ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے۔

باقی جو معاند اہل البدع والاہواء پروپیگنڈہ، اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، ان کی مغالطہ آمیزی سے عامۃُ المسلمین کی حفاظت کے لئے مثبت انداز میں اپنے اپنے حلقہ اثر میں کام کرنے کی ضرورت ہے، ضروری درجے میں دین کی اصولی وفروعی معتدل تعلیمات سے جب عامۃُ الناس واقف ہوں گے، تو ان شاء اللہ تعالیٰ باطل پرستوں کی مغالطہ آمیزیوں سے متاثر نہ ہوں گے۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد5 شمارہ9، اکتوبر 2008ء- رمضان، شوال 1429ھ)

---

(46)

علماء کے وارثِ انبیاء ہونے کا تقاضا

اہلِ علم اور خاص کر وہ حضرات جو اہلِ عمل بھی ہیں، ان کے لئے یہ انتہائی اعزاز کی بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو انبیاء کا وارث قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس طرح مروی ہے:

إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَّلَا دِرْهَمًا إِنَّمَا

وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَ بِهِ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ (سنن الترمذی ، رقم الحدیث ۲۶۸۲، ابواب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة،سنن ابی داوٗد، رقم الحدیث ۳۶۴۱) [1]

ترجمہ: علماء انبیاء کے وارث ہیں، اور انبیاء درہم و دینار میراث میں نہیں چھوڑ کر جاتے ، بلکہ علم میراث میں چھوڑ کر جاتے ہیں، پس جس نے اس کو حاصل کیا، اس نے بہت بڑی چیز حاصل کی (ترمذی، ابوداؤد)

اور وارث کو جو نسبت اپنے مورِث (یعنی وارث بنانے والے) سے حاصل ہوتی ہے، وہ بالکل ظاہر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیتے ہوئے یہ وضاحت بھی فرمادی کہ انبیائے کرام درہم و دینار میراث میں نہیں چھوڑا کرتے ، بلکہ علم وراثت میں چھوڑ کر جاتے ہیں، اور اہلِ علم کے وارثِ انبیاء ہونے کی بنیاد اسی پر ہے۔

اور وراثت کا قانون و قاعدہ یہ ہے کہ مورث کی مملوکہ تمام چیزوں میں وارث کے لئے میراث جاری ہوا کرتی ہے۔

اس قاعدہ وقانون کا تقاضا یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے وارثوں میں بھی علم کے تمام شعبوں کی میراث جاری ہو، جس کی وہ عوام میں تبلیغ کریں، خواہ عقائد کا شعبہ ہو، یا عبادات کا، یا معاملات کا شعبہ ہو، یا معاشرت کا، اور یا پھر اخلاق کا، ان سب شعبوں کو اپنے میدانِ عمل میں لانا ایک وارث کی ذمہ داری ہے، ورنہ وہ کامل اور صحیح وارث کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہوگا۔

آج اہلِ علم حضرات کو میراث کے اس قاعدہ وقانون پر اپنے آپ کو منطبق کرنے، اور اس کی روشنی میں اپنی حالت کا جائزہ لینے کی بہت سخت ضرورت پیش آ گئی ہے۔

کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے علماء نے اپنی اپنی مرضی کے میدان منتخب کر کے ان ہی کو پورا دین قرار دیا ہوا ہے، خواہ حالاً ہو، یا قالاً۔

---

[1] قال شعیب الارنؤوط: حسن بشواهده (حاشية سنن ابی داوٗد)

www.idaraghufran.org

چنانچہ بعض لوگوں کے نزدیک پورا دین سیاست تک محدود ہے۔
بعض کے نزدیک جہاد تک محدود ہے۔
بعض کے نزدیک کافروں کی ذات تک محدود ہے۔
اور بعض کے نزدیک کسی خاص فرقہ وجماعت تک محدود ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری زندگی کی صلاحیتیں اور تگ ودو خاص اس محدود میدان کی ہی نذر ہو جاتی ہے، اور دوسرے شعبوں کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اعتدال پر قائم رہنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 5 شمارہ 10، نومبر 2008ء۔ ذیقعدہ 1429ھ)

---

(47)

اختلافِ رائے کے ساتھ احترامِ رائے کی ضرورت

مجتہد فیہ مسائل میں اجتہاد واختلاف کا سلسلہ خیر القرون سے آج تک جاری ہے، اور قیامت تک جاری رہے گا، وہ الگ تفصیل ہے کہ کس قسم کے مسائل میں اب اجتہاد کی ضرورت نہیں، اور ان میں اجتہاد مکمل ہو چکا، تابعین واتباعِ تابعین کا وہ دور، جس میں فقہائے اربعہ کے اجتہاد کا سلسلہ جاری تھا، اور مختلف فروعی مسائل میں باہم اختلاف پیش آجاتا تھا (اس اجتہاد واختلاف کے معاملہ میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے) لیکن اجتہادی اختلاف میں ایک بات ہر زمانے میں قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی رہی ہے، اور وہ احترامِ رائے کا لحاظ ہے۔

یہی وجہ ہے، کہ ائمہ اربعہ کے بعد ان کے متبعین ومقلدین کے دلوں میں اپنے امام کے علاوہ دوسرے ائمہ کرام کا احترام بھی پایا جاتا رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ائمہ اربعہ کے مقلدین میں کم ظرف اور کم علم لوگوں کا ایک طبقہ ایسا بھی پایا گیا ہے، جس نے اجتہادی مسائل کو منصوص مسائل اور فروعی مسائل کو اصولی مسائل کا درجہ دے کر، دوسری رائے پر بے جا نکیر کی، مگر اس

نکیر کو تقویت اس لئے نہیں مل سکی کہ غیر منکر پر نکیر کرنا روا نہیں ہوتا، بلکہ وہ نکیر کرنا ہی بعض اوقات منکر کی حد میں داخل ہو جاتا ہے، اور موجودہ دور میں ایسے طبقہ کا وجود ہو گیا ہے، جو کم علمی کے باعث اجتہادی وغیر اجتہادی مسائل میں یا تو امتیاز کرنے سے قاصر ہے، یا پھر کم ظرفی کے باعث اپنے اندر برداشت وحوصلہ کی صلاحیت نہیں رکھتا، بہر حال جو کچھ بھی ہو، اہلِ علم حضرات کو خاص طور پر اجتہادی اور مجتہد فیہ مسائل میں دوسرے سے اختلاف اور اپنے موقف پر دلائل قائم کرنے، اور دوسرے کے دلائل کا رد کرتے وقت بھی اس مسئلہ میں دوسرے مجتہد (خواہ وہ جزوی مجتہد ہو) کا احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے، البتہ دوسرے کی طرف سے کوئی منکر طرز ودلیل سامنے آئے، تو اس پر نکیر کی جا سکتی ہے، لیکن اس موقعہ پر بھی اس کا لحاظ ضروری ہے کہ مقصود اس قول وفعل کی تردید واصلاح ہو، قائل کی تحقیر نہ ہو، یعنی نکیر تو ہو، تحقیر نہ ہو، جیسا کہ کسی کو گناہ کرتے ہوئے دیکھ کر گناہ کو تو حقیر سمجھا جائے گا، لیکن گناہ گار کو حقیر سمجھنا شریعت کی نظر میں پسندیدہ نہیں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو اعتدال پر قائم رہنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 5 شمارہ 11، نومبر 2008ء- ذوالحجہ 1429ھ)

---

(48)

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کا 171واں اجلاس

اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے ایک سو اکہترویں اجلاس کی جو سفارشات حکومت کو پیش کی ہیں، ان کا جو اجمالی خاکہ ہمارے سامنے آیا ہے، وہ درجِ ذیل ہے:

(1)...... یہ قانون بنا دیا جائے کہ بیوی اگر کبھی تحریری طور پر طلاق کا مطالبہ کرے گی، تو شوہر نوے دن کے اندر اسے طلاق دینے کا پابند ہوگا، وہ اگر ایسا نہیں کرے گا، تو یہ مدت گزر جانے کے بعد طلاق واقع ہو جائے گی، اِلَّا یہ کہ بیوی اپنا

مطالبہ واپس لے لے، اس کے بعد شوہر کے لیے رجوع کا حق نہیں ہوگا، اور بیوی پابند ہوگی کہ مہر اور نان نفقہ کے علاوہ اگر کوئی اموال واملاک شوہر نے اسے دے رکھے ہیں، اور اس موقع پر وہ انہیں واپس لینا چاہتا ہے، تو فصل نزاع کے لیے عدالت سے رجوع کرے، یا اس کا مال اسے واپس کر دے۔

(2)...... کونسل نے نکاح فارم میں کچھ تبدیلیوں کی منظوری دیتے ہوئے نکاح نامے کی طرح طلاق نامہ بھی تجویز کیا ہے، جس کے مطابق ملک میں نکاح کی طرح طلاق کی رجسٹریشن کرانے کی سفارش کی گئی ہے۔

(3)...... رؤیتِ ہلال کے مسئلہ پر غور وخوض کے بعد کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے لیے خالص سائنسی طریقے سے مکہ مکرمہ کو مرکز بنا کر چاند کی ولادت کے لحاظ سے پوری دنیا کے لیے ایک ہجری کیلنڈر بنا دیا جائے، اور تمام مذہبی تہوار اسی کے مطابق منائے جائیں۔

(4)...... کونسل نے ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور انتہا پسندانہ رجحانات کے پیشِ نظر ایک خصوصی رپورٹ شائع کرنے کا فیصلہ کیا، جس کی روشنی میں حکومت کو دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے سفارشات پیش کی جائیں گی، اس سلسلے میں کونسل نے اس بات پر بھی توجہ دی ہے کہ دہشت گردی کی صورت میں ایک عام آدمی کو کیا کرنا چاہیے۔

(5)...... کونسل نے محرم کے بغیر خواتین کے سفرِ حج کے بارے میں کہا ہے کہ دستورِ پاکستان اور دیگر ملکی قوانین کے تحت، خواتین آزادی سے اندرون ملک اور بیرون ملک سفر کرسکتی ہیں، اس پر کوئی قدغن نہیں ہے، سعودی عرب کے قوانین، کونسل کے دائرۂ کار میں نہیں آتے۔

(6)...... کونسل نے نفاذِ شریعت کے حوالے سے کچھ راہنما اصول منظور کیے ہیں،

جنہیں نفاذِ شریعت پر کونسل میں ہونے والی آئندہ ورکشاپوں میں علمائے کرام کے سامنے رکھا جائے گا۔

(7)...... اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے 171 ویں اجلاس میں نادار اقرباء کی کفالت کے لیے قانون سازی کی سفارش کی، اور اس کے لیے ایک ڈرافٹ منظور کیا۔

کیونکہ یہ سفارشات اسلامی نظریاتی کونسل کی پیش کردہ ہیں، اس لیے ان کا اسلامی نظریات سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔

ان سفارشات کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے تو ضروری ہے کہ کونسل کی طرف سے اس سلسلہ میں پیش کردہ تفصیلی دلائل سامنے آئیں، لیکن اجمالی خاکہ ملاحظہ کرنے کے بعد ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں، اس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

سفارش نمبر ایک میں عورت کی طرف سے طلاق کا مطالبہ کرنے پر، علی الاطلاق شوہر کو 90 دن کے اندر طلاق دینے کا پابند کرنا، اور مدتِ مذکورہ گزرنے کے بعد خود بخود طلاق کو مؤثر قرار دینا، اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں۔

یہ بات ہر مسلمان پر واضح ہے کہ شرعاً طلاق دینے کا اختیار مَرد کو حاصل ہے، عورت کو یہ اختیار حاصل نہیں، لہٰذا عورت کے طلاق کے مطالبہ کو قانونی تحفظ فراہم کرنا، اور شوہر کی رضامندی اور اس کے طلاق دیئے بغیر 90 دن کی مدت گزر جانے پر، طلاق کو مؤثر قرار دینا درست نہیں۔

اگر میاں بیوی میں اختلاف ونزاع ہوجائے، اور بات عدالت تک پہنچ جائے، تو شریعت نے قاضی وجج کو تنازعہ کی تحقیق وتفتیش کا حکم دیا ہے، اور اس کے لیے تفصیلی طریقۂ کار تجویز کیا ہے۔ اس تفصیل کو نظر انداز کر کے مذکورہ سفارش، شریعت سے متصادم نظر آتی ہے۔

سفارش نمبر 2 میں نکاح فارم میں جو کچھ تبدیلیوں کی منظوری دی گئی ہے، اس کا شرعی تناظر میں صحیح جائزہ اس وقت لیا جاسکتا ہے، جبکہ وہ تبدیلیاں سامنے آئیں کہ کیا کچھ ہیں؟

جہاں تک نکاح نامہ کی طرح طلاق نامہ اور اس کی رجسٹریشن کا معاملہ ہے، تو طلاق نامہ اگر شرعی اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر تیار کیا جائے، اور ملک میں اس کی رجسٹریشن کا قانونی طور پر انتظام کیا جائے، تو بظاہر اس میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا، بلکہ بعض وجوہات سے مفید بھی معلوم ہوتا ہے؛ البتہ اگر طلاقہ نامہ میں کوئی شق خلافِ شریعت ہو، تو اس کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ شرعاً طلاق واقع ہونے کے لیے تحریر ضروری نہیں، اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو زبانی طلاق دے دیتا ہے، تو بھی شرعاً طلاق واقع ہو جاتی ہے، اور اگر بالفرض کوئی شخص اپنی بیوی کو زبانی طلاق دے کر مُکر جاتا اور منکِر ہو جاتا ہے، تو اس کا کیا حل ہونا چاہیے؟ کونسل کو اس قسم کے اُمور پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

رؤیتِ ہلال کے مسئلہ پر کونسل نے جو خالص سائنسی طریقے سے مکہ مکرمہ کو مرکز بنا کر پوری دنیا کے لیے اسلامی کیلنڈر تیار کرنے، اور اسی کے مطابق تمام مذہبی تہوار منانے کی تجویز دی ہے، اس سے اتفاق کیا جانا مشکل ہے، کیونکہ بہت سے علماء کے نزدیک رؤیتِ ہلال میں چاند کی رؤیت ضروری ہے، جیسا کہ ''رؤیتِ ہلال'' کے نام سے واضح ہے، اس کی بنیاد خالص سائنسی طریقہ کے مطابق محض چاند کی ولادت پر رکھنا راجح نہیں، سعودی عرب کی ''ھیئۃ کبار العلماء'' کونسل اور ''جدہ فقہ اکیڈمی'' وغیرہ کی طرف سے اس پر باقاعدہ قرار دادیں منظور ہو چکی ہیں، اور اس موضوع پر سلف وخلف علماء کی تفصیلی تحریرات موجود ہیں۔[1]

ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی وانتہا پسندی کے کے خاتمہ کے لیے واقعی مؤثر اقدامات کی ضرورت ہے، اور ملک کے مشہور ومعروف اہلِ علم حضرات اس سلسلہ میں حکومت کو پہلے ہی تجاویز پیش کر چکے ہیں۔

چنانچہ ''تمام مکاتبِ فکر کے علمائے کرام کی ارکانِ پارلیمنٹ سے دردمندانہ اپیل'' کے نام سے ایک مضمون مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہو چکا ہے۔

---

[1] جن کا خلاصہ ہم نے اپنے رسالہ ''پاکستان کی موجودہ رؤیتِ ہلال کمیٹی کا شرعی حکم'' میں تحریر کر دیا ہے۔

www.idaraghufran.org

جس میں مندرجہ ذیل تجاویز دی گئی ہیں:

(1)...... بمباری، میزائلوں کی بارش اور اندھا دھند فوجی کارروائیاں فوری طور پر بند کی جائیں۔

(2)...... ملک بھر کے مختلف علاقوں سے ریاستی مشینری کے ہاتھوں اغو کئے گئے اور ٹارچر سیلوں میں بند، نیز امریکہ کے حوالے کئے گئے، مظلوم مَردوں، عورتوں اور بچوں کی باعزت رہائی کو یقینی بنایا جائے۔

(3)...... ہر علاقے کے مقامی علماء، دین دار حضرات اور محبِ وطن عمائدین کو ساتھ ملا کر جرائم پیشہ اور ملک دشمن عناصر اور غیر ملکی ایجنٹوں کو پکڑا جائے، اور ان کو سرِ عام عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔

(4)...... محبِ وطن اور پرامن باشندگانِ ملک اور ہتھیار اٹھانے والے نوجوانوں کے جو جائز مطالبات ہیں، انہیں فوری طور پر خلوصِ دل سے اس طرح پورا کیا جائے کہ لوگوں کو یہ اطمینان ہو کہ حکومت یہ کام محض وقت گزاری کے لئے نہیں کر رہی، بلکہ پوری سنجیدگی سے، یہاں انصاف مہیا کر کے امن وامان قائم کرنے میں مخلص ہے۔

(5)...... اندرون ملک، ہر طرح کی خلافِ اسلام پالیسیوں اور اقدامات کا سلسلہ بند کیا جائے۔

(6)...... غیر ملکی طاقتوں کی اطاعت وفرمانبرداری کا رویہ ختم کر کے محبِ وطن عوام کو ساتھ ملایا جائے، اور ان کے تمام جائز مطالبات کو امکانی حد تک پورا کیا جائے۔

(7)...... اپنی موجودہ خارجہ پالیسی اور خصوصاً امریکہ کے ساتھ کئے جانے والے ”تعاون برخلاف دہشت گردی“ کے پُرفریب اور شرمناک معاہدے سے جان چھڑانے کا محتاط راستہ جلد از جلد نکالا جائے، جو درحقیقت اپنی ہی سلامتی کا راستہ

ہے، جب تک افغانستان میں امریکی ونیٹوافواج موجود ہیں اور پاکستان ان کے ساتھ معاہدے میں شریک ہے، پاکستان میں امن وامان کی امید کرنا خودفریبی کے مترادف ہوگا۔

(8)......عدلیہ کو آزاد اور بحال کیا جائے، کیونکہ فوری انصاف کی فراہمی اور آزاد عدلیہ کے بغیر امن وامان کا قیام ممکن نہیں۔

لیکن اصل مسئلہ ان تجاویز پر عمل کرنے کا ہے، اگر ان تجاویز سے قطع نظر کر کے ملک وملت کے دشمنوں کی تجاویز کو من وعن قبول کیا جاتا رہے، اور اوپر سے ان کو دہشت گردی وانتہاء پسندی کے خاتمہ کا ذریعہ بھی سمجھا جائے، جبکہ دشمنانِ اسلام کی اس قسم کی سازشوں سے ہی ملک میں دہشت گردی وانتہا پسندی کو وجود ملا ہے، تو پھر اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے؟

کونسل کا خواتین کو محرم کے بغیر سفرِ حج کرنے کی علی الاطلاق اجازت دینا محلِ نظر ہے (جس کی تفصیل اس مختصر مضمون میں کرنا مشکل ہے، اگر دوسرے فقہاء کے قول پر جواز کا حکم لگایا جائے، تو اس کی متعلقہ شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے)

جہاں تک نفاذِ شریعت کے حوالہ سے کونسل کے منظور شُدہ رہنما اُصول اور اسی طرح کونسل کی طرف سے نادار اقرباء کی کفالت کے لیے قانون سازی پر سفارش اور منظور شدہ ڈرافٹ کا تعلق ہے، تو ان کی تفاصیل سامنے آنے پر ہی کچھ عرض کیا جاسکتا ہے۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 5 شمارہ 11، نومبر 2008ء۔ ذوالحجہ 1429ھ)

---

(49)

کیا ٹیلی ویژن کا استعمال جائز ہوگیا؟

آج کل بعض دیندار عوام اور بعض اہلِ علم میں ٹیلی ویژن کے بارے میں بحث چلی ہوئی ہے، اہلِ علم حضرات کے ٹیلی ویژن پر آنے والی جاندار کی تصویر کے شرعاً تصویر ہونے، نہ ہونے

کے اختلاف کے منظرِ عام پر آنے کے بعد بعض لوگوں میں یہ تاثر قائم ہو رہا ہے کہ بعض علماء نے ٹیلی ویژن پر دکھائی دینے والی تصویر کو شرعاً تصویر ہونے کے مفہوم سے خارج قرار دے دیا، لہٰذا اب ٹیلی ویژن کے پروگرام دیکھنا اور سننا جائز ہو گیا۔

حالانکہ یہ تاثر درست نہیں، کیونکہ اہلِ علم حضرات کا جو اختلاف پیدا ہوا، وہ ریل۔سی۔ڈی وغیر میں ڈیجیٹل طریقہ پر جاندار چیز کی تصویر کے بارے میں ہے، کہ آیا اس طرح کا منظر شرعی وفقہی اعتبار سے ممنوع تصویر کی حقیقت وتعریف میں داخل ہے، یا نہیں؟

اگر داخل ہے، تو اس کو دیکھنا اور اس منظر کا نظر آنا تصویر دیکھنے اور تصویر موجود ہونے کا حکم رکھتا ہے، اور اس پر تصویر کے احکام جاری ہوتے ہیں، اور اگر یہ منظر تصویر کی حقیقت وتعریف میں داخل نہیں، تو پھر اس پر تصویر کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

جس سے ظاہر ہے کہ یہ اختلاف ٹیلی ویژن کے پروگرام میں جاندار چیز کے منظر کے شرعاً تصویر ہونے نہ ہونے کے پہلو تک محدود ہے۔

اور دلائل دونوں طرف موجود ہیں، کیونکہ یہ مجتہد فیہ مسئلہ ہے، جس میں اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے، اور اجتہاد کا ثمرہ اختلاف کی شکل میں بھی ظاہر ہو جایا کرتا ہے، اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ جس چیز کے جائز و ناجائز ہونے میں اختلاف پیدا ہو جائے، احتیاطی پہلو اس سے گریز واجتناب کرنے میں ہی ہوا کرتا ہے۔

اور جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ اختلاف تصویری پہلو کے اعتبار سے ہے، نہ کہ کسی اور اعتبار سے، تو یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہ رہا کہ ٹیلی ویژن کے مروّجہ پروگرام جن میں موسیقی، بے پردگی، فحاشی، بے حیائی، غیبت، بہتان، طعن و تشنیع، استہزاء اور تضییعِ اوقات وغیرہ جیسے کئی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔

اور نہ صرف شامل ہوتے ہیں، بلکہ مروّجہ ٹی وی نشریات کا جزو لاینفک اور لازمی حصہ بنے ہوئے ہیں، تو ان کے ناجائز ہونے میں یہ اجتہاد و اختلاف مؤثر نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ

www.idaraghufran.org

تصویری پہلو سے ہٹ کر باقی تمام مذکورہ مفاسد ومنکرات کے ناجائز ہونے پر اہلِ علم حضرات کے ہردوفریقوں کا اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے۔

یعنی باقی مفاسد ومنکرات بالاتفاق ناجائز ہیں۔

لہٰذا اہلِ علم حضرات کے ڈیجیٹل تصویر کے جائز وناجائز ہونے کے اختلاف کو ٹیلی ویژن کے مروّجہ پروگراموں میں اثرانداز سمجھ لینا، یا بعض علمائے کرام کے اس منظر کو شرعاً تصویر قرار نہ دیئے جانے کی رائے کو بنیاد بنا کر ٹیلی ویژن کے مروّجہ پروگراموں کو جائز سمجھ لینا، اوران کو بلاکھٹک دیکھنا، سننا درست نہیں۔

کیونکہ اہلِ علم حضرات کے مذکورہ اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ اگر ٹیلی ویژن اور ڈیجیٹل ذریعہ سے کسی جاندار کا منظر دکھائی دے، اور دوسری کوئی خرابی وگناہ اس میں شامل نہ ہو، تو آیا یہ منظر شرعاً تصویر ہوگا، یا نہیں؟

بعض اہلِ علم حضرات اس صورت میں بھی اس منظر کو شرعاً تصویر قرار دیتے ہیں، اور بعض اس کو تصویر قرار نہیں دیتے۔

امید ہے کہ یہ مختصر گزارشات اہلِ علم حضرات کے اس طبقہ کے متعدد شکوک وشبہات کی دوری کا باعث ہوگی، جو اکابر اہلِ علم حضرات کے اختلاف کے دائرہ سے پوری طرح واقف نہیں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ فہمِ سلیم عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد6 شمارہ1، جنوری2009ء- محرم1430ھ)

---

(50)

اسلامی بینکاری کا سفر

یہ بات کسی صاحبِ بصیرت سے مخفی نہیں کہ اس دور میں بڑی جنگ، معاشی جنگ سمجھی جاتی ہے، معاش کے قوی وضعیف ہونے پر ہی ظاہری اسباب کے درجہ میں اس وقت کسی قوم و

ملک کی فتح، یا شکست کا بڑا مدار سمجھا جاتا ہے۔

اور شریعتِ مطہرہ نے بھی معاد کے ساتھ ساتھ معاش اور معاشی مسائل پر خصوصی توجہ دی ہے، اور اس کے لئے ایسے فطرت کے مطابق قوانین و اصول وضع کئے ہیں کہ ان کو اختیار کر کے معاشی زندگی کو بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے، خواہ اس زندگی کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہو، یا اجتماعی زندگی سے۔

لیکن بد قسمتی سے گذشتہ چند صدیوں سے مسلمانوں نے اسلام کے معاشی نظام کے قوانین و اصولوں کو ایسا نظر انداز کیا کہ اس کے نتیجہ میں دنیا میں دشمنانِ اسلام کی طرف سے کئی خود ساختہ غیر اسلامی نظامہائے معیشت وجود میں آ گئے، جنہوں نے انسانیت کو اپنی دلدل میں ایسا جکڑا کہ ان سے نکلنا آسان نہ رہا۔

پھر اوپر سے ان خود ساختہ و غیر فطری معاشی نظاموں میں جگہ جگہ اسلام کا لیبل بھی لگایا گیا، جس سے معاملہ اور زیادہ پیچیدہ ہو گیا، اور مسلمانوں کے ایک طبقہ نے ان نظاموں کی اصلاح کے بجائے انہی کو اسلامی معاشی نظام سمجھ کر اختیار کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ خود ساختہ اور غیر فطری نظام پوری دنیا کے کونے کونے میں غالب و رائج ہو گئے۔

اس غیر اسلامی نظام کا بڑا حصہ غیر اسلامی بینکنگ بھی تھا جس کی بنیاد خالصتاً سود پر مبنی تھی، مگر اس کے باوجود دنیا بھر کے بیشتر افراد کو اس کے ساتھ کسی نہ کسی جہت سے وابستہ کر دیا گیا، چنانچہ بجلی، گیس وغیرہ کے بل جمع کرنے، اور بعض اداروں کے ملازمین کی تنخواہ کے حصول کے لئے بینکوں سے تعلق قائم کر دیا گیا، بہت سی چیزوں کی خریداری کے لئے بینکوں کی مدد حاصل کرنے کی ضرورت پیش آنے لگی، فتنوں کے دور میں رقوم وغیرہ کی حفاظت کے لئے بینکوں کا سہارا لینا پڑا، اور اس قسم کی بے شمار لوگوں کی ضروریات بینکوں کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔

اس صورتِ حال کے نتیجہ میں اہلِ علم حضرات کی ایک جماعت کو اس نظام کی اصلاح کی فکر غالب رہی، اور وہ اپنی زندگی کی صلاحیتوں کا اہم حصہ اس سسٹم و پروگرام، یا نظام کی اصلاح

کی کوشش میں صرف کرتے رہے، جس میں انہیں غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

سب سے پہلی مشکل تو خود اس نظام کو سمجھنے کی تھی، پھر اگلی مشکل اس کا اسلامی قوانین وقواعد کی روشنی میں جائزہ لینے کی، اور اس سے بھی اگلی مشکل کسی طرح سے اس کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے، اور اس غیر اسلامی نظام کے مقابلہ میں اسلامی نظام کا اجراء، اور پھر اس کو رواج دینے کی صورت میں پیش آئی، لیکن اللہ کے بندوں کی اس مذکورہ جماعت نے اپنی جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا، اور اس کی اصلاح کے لئے اپنی توانائیاں صرف کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ان کو اس سفر میں جتنی اور جس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ہم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے اور بعض مخصوص مجبوری والی صورتوں میں فقہائے کرام کے بیان فرمودہ حیل کو بھی اختیار کرنا پڑا۔

ان حضراتِ گرامی کی مخلصانہ جدوجہد کے نتیجہ میں، سود اور حرام خوری کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں امید کی ایک کرن اور شمع روشن ہوئی، اور غیر اسلامی بینکاری کے مقابلہ میں اسلامی (یا غیر سودی) بینکاری کی داغ بیل قائم ہوئی۔

اور اس کی روشنی میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہونا شروع ہوا، جوں جوں اصلاحات کا عمل اور سفر آگے بڑھا، اس کے ساتھ ساتھ اسلامی بینکاری کے نظام کی خوبیوں کا بھی دنیا نے مشاہدہ کرنا شروع کیا، سفر کا سلسلہ جاری تھا، لیکن ابھی تک منزل تک رسائی نہیں ہوسکی تھی۔

اور جو مخلص اہلِ علم حضرات بینکاری نظام کی اصلاح کی خدمات سرانجام دے رہے تھے اور اس کو طے کررہے تھے، ان کا ہرگز اور ہرگز یہ دعویٰ نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی منزلِ مقصود کو پالیا ہے اور ان کا سفر مکمل طے ہوگیا ہے، اور وہ اس نظام سے مطمئن ہوکر اپنے گھروں میں جا کر نہیں بیٹھ گئے تھے، بلکہ ابھی اپنے آپ کو منزلِ مقصود سے دور تصور کرتے ہوئے، اور مایوسی سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے، اسلامی بینکاری کی اصلاح کے سفر کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔

اہلِ علم کے اس خدمت گزار گروہ کے مقابلہ میں اہلِ علم حضرات ہی کے کچھ افراد ایسے بھی تھے کہ انہیں اس میدان میں خدمت کا موقع نہیں مل سکا تھا، ان میں سے بعض حضرات کی نظر

تو ''اسلامی بینکنگ'' کے عنوان پر رہی، جس سے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ نظام سو فیصدی اسلامی نظام بن چکا ہے، اور گویا کہ انہوں نے اس سفر کو، جس کا پہلے ذکر کیا گیا، منزل خیال کرلیا، اسی کے ساتھ ان حضرات کا اسلامی بینکاری کے لئے اصلاحات کی کوشش وجدوجہد کرنے والے اہل علم حضرات پر بھی غیر معمولی اعتماد رہا، لیکن خود سے اس تحقیق کی نوبت نہیں آسکی کہ ان اہلِ علم حضرات نے اس نظام کو سو فیصدی اسلامی قرار دیا ہے، یا پھر وہ اس کی اصلاح کی کوششوں میں مشغول ہیں، اور مقصود ومنزل کی طرف سفر جاری ہے۔

اس لئے اہلِ علم حضرات کے اس ناواقف گروہ کی اسلامی بینکاری کے متعلق خوش فہمی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی وابستہ وقائم ہوگئی۔

بینکاری اور بالخصوص اسلامی بینکاری کی اصلاحات کی خدمات سے الگ تھلگ اہلِ علم حضرات ہی کا ایک گروہ وہ تھا، جو ابتداء ہی سے بینکاری نظام کے خلاف تھا، یا پھر ان کی نظر سفر کے اس حصہ پر تھی جو ابھی تک طے نہیں ہوا تھا، اور سفر کا جو حصہ طے ہوگیا تھا، اس کو وہ بارِ خاطر میں نہ لاتے تھے، اور ان حضرات کو اہلِ علم کی اس جماعت پر، جو اسلامی بینکاری پر کام کررہی تھی، اس درجہ کا اعتماد نہیں تھا (خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اس جماعت کے اکابر ومعاصر ہوں، اور وہ اس جماعت کی اتباع کی ضرورت نہ سمجھتے ہوں، یا کوئی اور وجہ ہو) اس لئے یہ گروہ اسلامی بینکاری کے حق میں نہ تھا، اور ساتھ ہی اس گروہ کے بعض افراد اسلامی بینکاری کی ضرورت کا ہی انکار کرتے رہے۔

اور اہلِ علم حضرات میں سے کچھ حضرات ایسے بھی تھے کہ انہیں بعض چیزوں میں ان اہلِ علم حضرات سے فقہی قواعد ونظائر کی روشنی میں اختلاف تھا، جو اسلامی بینکاری کی اصلاحات کی کوششیں فرمارہے تھے، اور انہوں نے غور وفکر واجتہاد کے نتیجہ میں بعض امور کو جائز قرار دیا تھا، خواہ اس کی وجہ انہوں نے ضرورت سمجھی ہو، یا ضرورت کے بغیر دلائل کی رو سے ابتداءً ہی جائز سمجھا ہو، لیکن یہ اختلاف اس درجہ کا نہیں تھا کہ جس کی وجہ سے اس پورے سفر ہی کو غلط کہا

جائے، اور مبدءِ سفر پر رجوع کا حکم لگایا جائے، بلکہ وہ سفر کے راستہ کے نشیب وفراز کی تعیین ونشاندہی کے درجہ کا تھا، جس پر غور وفکر کی اپنی جگہ ضرورت تھی، اور کسی نہ کسی درجہ میں ان امور پر غور وفکر بھی جاری تھا۔

لیکن گذشتہ دنوں چند اہلِ علم حضرات کی طرف سے اسلامی بینکنگ کے خلاف پرزور انداز میں آواز اٹھائی گئی اور اس نظام پر گویا کہ سو فیصدی حرام وسود پر مشتمل اور غیر اسلامی ہونے کا حکم لگایا گیا اور اس پورے سفر ہی کو گویا کہ غلط قرار دیا گیا۔

اہلِ علم حضرات کا کسی مجتہد فیہ مسئلہ میں اختلاف ہو جانا، نہ تو مذموم ہے، اور نہ ہی اس کے خاتمہ کی ضرورت ہے، لیکن اس کے لئے ان اہلِ علم حضرات کی طرف سے یکطرفہ طور پر جو سخت موقف اختیار کیا گیا، وہ فقہ واجتہاد سے زیادہ ہم آہنگ محسوس نہیں ہوا۔

ایک طرف تو ان حضرات نے مجتہد فیہ مسائل کو منصوصِ قطعی کے درجہ میں پیش کیا، اور دوسری طرف بعض امور پر صرف تخمینہ اور ظن کی بنیاد پر حکم لگا دیا گیا، اور تیسرے بعض امور کی بناء پر سارے نظام پر ہی ناجائز وحرام ہونے کا حکم لگا دیا گیا، جس سے تشویش واضطراب پیدا ہوا۔ اور عوامی وعلمی حلقوں میں کئی پریشان کُن مسائل نے جنم لیا، اور دنیا بھر کے جید اور مستند اہلِ علم حضرات کی طرف سے کی گئی محنت اور جدوجہد کو بیک جنبشِ قلم نظر انداز کر دیا گیا، اور پھر اوپر سے چند اہلِ علم حضرات کے فیصلے کو متفقہ فتوے اور فیصلے کا عنوان دیا گیا، اس فتوے وفیصلے سے کن حضرات کو اتفاق ہے، اور کن کو اختلاف؟ اس کی حقیقت شاید آنے والے وقت میں منکشف ہو کر سامنے آ جائے۔

اسی کے ساتھ اپنے اس موقف کی انتہائی جذباتی انداز میں تبلیغ وتشہیر بھی شروع کر دی گئی، جس کے بعد آج کل کے ماحول میں رجوع کے راستے بھی مسدود ہو جاتے ہیں۔

حالانکہ صحیح طریقہ یہ تھا کہ ان حضرات کو ابتداءً اپنی رائے اسلامی بینکاری پر کام کرنے والے اہلِ علم حضرات کے سامنے پیش کرنی چاہئے تھی، پھر ان حضرات کی طرف سے جواب موصول

ہونے اور نظرِ ثانی کے بعد (اختلاف برقرار رہنے کے باوجود) شائع کرنے میں حرج نہ تھا۔

جہاں تک اس رائے کو متفقہ فیصلہ وفتویٰ قرار دینے کا تعلق ہے، تو جتنی تعداد اور جس درجہ کا فقہی ذوق ومنصب رکھنے والے اہلِ علم حضرات اس میں شریک ہوئے اس سے زیادہ نہیں تو اس کے برابر تعداد میں معاشی میدان میں زیادہ علم وتجربہ رکھنے والے اہلِ فقہ حضرات بھی اپنا مفصل ومدلل فتویٰ فیصلہ صادر کرنے کا حق رکھتے ہیں، پھر اس فیصلے وفتوے کو غیر متفقہ اور پہلے کو متفقہ قرار دینے میں مابہ الفرق کیا چیز رہ جائے گی؟

اور ہمارے خیال میں موجودہ حالات میں، جبکہ ایک طرف سے پوری شدومد کے ساتھ اسلامی بینکاری کے متعلق، بالکلیہ عدمِ جواز کے بارے میں تبلیغ وتشہیر کی جارہی ہے، تو اہلِ علم حضرات کی اس جماعت پر جو اسلامی بینکاری کی اصلاح واجراء کی خدمت کی ذمہ داری انجام دے رہی ہے، یہ فریضہ عائد ہو چکا ہے کہ عدمِ جواز کے قائلین کے دلائل کا اجتماعی طور پر جائزہ لے کر ان بنیادوں اور دلائل کو منظرِ عام پر لائیں، جن کی بناء پر وہ جواز کا قول کرتے رہے ہیں، اور ساتھ ہی ان پر وارد ہونے والے شبہات ودلائل کے جواب سے بھی آگاہ کریں۔

ورنہ بصورتِ دیگر جواز کے قول کو اختیار کئے رکھنے کا عوامی دنیا میں کوئی اثر باقی نہ رہے گا۔

افسوس ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے باوجود اس جماعت کی طرف سے کوئی مؤثر وٹھوس اور شافی جواب کا منظرِ عام پر نہ آنا، طرح طرح کے شکوک وشبہات کا باعث بن رہا ہے۔

ہم نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی بینکاری کی اصلاحات کا منزل کی طرف سفر جاری رکھنے والی جماعت کا موقف دلائل وحقائق کے اعتبار سے درست ہے، اور اس سفر کو منزل سمجھنے، یا اس طے شدہ سفر کو غلط قرار دینے، یا اس کو درمیان میں ختم کر کے واپس آنے کی خواہش ومطالبہ رکھنے والی جماعت کا موقف دلائل وحقائق کے لحاظ سے درست نہیں، بلکہ نتائج کے اعتبار سے بھی مفید نہیں، جس کا پتہ آئندہ آنے والے وقت میں ہی چلے گا۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 6 شمارہ 2، فروری 2009ء۔ صفر 1430ھ)

(51)

فتویٰ دہندہ کے لیے چند اہم ہدایات

حضرت مولانا ظفیر الدین صاحب (مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل ومکمل) نے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی پہلی جلد کے شروع میں ایک تفصیلی مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جس میں انہوں نے مفتی اور فتوے کے بارے میں انتہائی قیمتی ہدایات واصول ذکر فرمائے ہیں، ان کا مطالعہ اس دور کے فتوے دینے والے حضرات کے لئے انتہائی اہم ہے۔

یوں تو موصوف کا مضمون بہت مفصل ہے۔

لیکن اس وقت فتوے کے میدان میں بعض حضرات کی طرف سے جو طمع وخواہشاتِ نفس کی پیروی اور حیلوں کے بارے میں، افراط وتفریط اور عوام کے لئے رخصت وعزیمت کے پہلو کے انتخاب میں غلو کی صورتیں سامنے آرہی ہیں، ان کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے۔

چنانچہ مفتی صاحب موصوف فرماتے ہیں:

خواہشات سے اجتناب......: ہر حال میں خواہشاتِ نفس، لالچ اور اس طرح کے دوسرے رذائل سے فتویٰ دینے کے وقت مفتی کا بچنا ضروری ہے۔

اس لئے کہ ان جذبات کی پیروی حرام ہے:

ویحرم اتباع الھوی والتشھی والمیل الی المال الذی ھو الداھیة الکبریٰ والمصیبة العظمٰی، فان ذالک امر عظیم لایتجاسر علیه الا کل جاھل شقی (بستان الفقیه ابی اللیث، باب من یصلح له الفتویٰ ص ۵)

ترجمہ: خواہشاتِ نفس کی پیروی، میلانِ نفس اور مال ودنیا طلبی کا رجحان حرام ہے، جو سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑی ہلاکت ہے، یہ ایسا خطرناک قدم ہے جس کی جسارت جاہل بدبخت کے سوا کوئی دوسرا نہیں کرسکتا ہے۔

ناجائز حیلے......: جو حیلے حرام اور مکروہ ہوں، مفتی کے لئے ان کا اختیار کرنا

درست نہیں، اسی طرح ان رخصتوں کی تلاش میں پڑنا بھی، جن سے غلط طور پر کچھ لوگ استفادہ کے خواہاں ہوں۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لایجوز للمفتی تتبع الحیل المحرمة والمکروھة ولاتتبع الرخص لمن اراد نفعه فان تتبع ذالک فسق وحرام استفتاء ہ (اعلام الموقعین ج۲ص۲۵۸)

ترجمہ: حرام اور ناجائز حیلوں کی تلاش وجستجو مفتی کے لئے درست نہیں ہے، اسی طرح ایسے شخص کے لئے رخصتوں کی جستجو میں پڑنا بھی جائز نہیں ہے، جو ناجائز نفع اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہو، کیونکہ یہ فسق ہے، اوراس طرح کا استفتاء حرام ہے۔

طحطاوی میں ہے:

ویحرم التساھل فی الفتویٰ واتباع الحیل ان فسدت الاغراض (طحطاوی علی الدرالمختار ج۳ص۱۷۵)

ترجمہ: فتویٰ میں تساہل اور حیلوں کی پیروی، جب اغراضِ فاسدہ کے پیشِ نظر ہو، حرام ہے۔

جائز حیلے......: البتہ وہ شرعی حیلے، جن پر عمل فقہائے امت نے جائز قرار دیا ہے، اوراس میں کوئی شرعی مفسدہ نہیں ہے، ان کے ساتھ فتویٰ دینا درست ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

فان حسن قصدہ فی حیلة جائزة لاشبھة فیھا ولامفسدة لتخلیص المستفتی بھا من حرج جاز ذالک وبل استحب، وقد ارشداللہ تعالیٰ نبیه ایوب علیه السلام الی التخلص من الحنث بان یاخذ بیدہ ضغثا فیضرب به المرأة ضربة واحدة وارشد النبی ﷺ

بلالا الی بیع التمر بدارھم ثم یشتری بالدراھم تمرا آخر (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۵۸)

ترجمہ: اگرکوئی جائز حیلہ اچھے ارادہ سے اختیار کرے، جس میں نہ کوئی شبہ ہو، نہ مفسدہ، بلکہ منشاء مستفتی کو تنگی سے نکالنا ہو، تو یہ جائز ہے، بلکہ مستحب، خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت ایوب علیہ السلام کی حنث (قسم توڑنے کے گناہ) سے بچاؤ کے لئے رہنمائی فرمائی تھی، اور بتایا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مٹھا لے لیں، اوراس سے اپنی اہلیہ کو ایک مرتبہ ماریں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے بتایا کہ وہ کھجور، دراہم کے بدلے بیچ دیں، اور پھر ان دراہم سے دوسری کھجور خرید لیں۔

(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل ومکمل، مقدمہ ج ۱ ص ۸۸، ۸۹، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، تاریخ طباعت: دسمبر ۲۰۰۲ء)

پھر دوسطروں کے بعد مفتی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:

سہل پہلو اور رخصت پر فتویٰ......: جو چیزیں بغیر کراہت جائز ہیں، اور شریعت میں ان کے لئے رخصت ہے، مفتی کو چاہئے، عوام کے لئے ایسے سہل پہلو کو اختیار کرے، اوراس پر فتویٰ دے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وفی عمدة الاحکام من کشف البزدوی یستحب للمفتی الاخذ بالرخص تیسرا علی العوام مثل التوضی بماء الحمام والصلاة فی الاماکن الطاھرة بدون المصلی الخ (عقد الجید ص ۷۳)

ترجمہ: کشف البزدوی کے حوالہ سے عمدۃ الاحکام میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مفتی کے لئے مستحب ہے کہ عوام کی آسانی کی غرض سے رخصتوں پر فتویٰ دے، جیسے حمام کے پانی سے وضو کرنا، اور پاک جگہوں میں بغیر جائے نماز کے نماز پڑھنا وغیرہ۔

www.idaraghufran.org

لیکن جو لوگ محتاط اور خواص ہیں، ان کے لئے عزیمت پر ہی عمل بہتر ہے۔

ولایلیق ذالک باھل العزلة بل الاخذ بالاحتیاط والعمل بالعزیمة اولیٰ بھما (ایضا)

ترجمہ: یہ رخصت گوشہ نشینوں کے لئے مناسب نہیں، بلکہ ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ یہ احتیاط کو اختیار کریں، اور عزیمت پر عمل کریں۔

مفتی کو یہ بھی چاہئے کہ لوگوں کو ایسی بات کا فتویٰ دے، جو ان کے حق میں زیادہ آسان ہو، بالخصوص کمزوروں کے لئے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ینبغی للمفتی ان یاخذ بالایسر فی حق غیرہ خصوصاً فی حق الضعفاء لقولہ علیہ السلام لابی موسیٰ الاشعری ومعاذ حین بعثھما الی الیمن یسرا ولا تعسرا (عقد الجید ص ۷۴)

ترجمہ: مناسب یہ ہے کہ مفتی ایسا قول اختیار کرے، جو دوسروں کے حق میں خصوصاً کمزوروں کے حق میں آسان تر ہو، اس وجہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کیا، تو ارشاد فرمایا ''تم دونوں آسانی کرنا اور تنگی نہ کرنا''

(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل ومکمل، مقدمہ ج ا ص ۸۹، ۹۰، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی، تاریخِ طباعت: دسمبر ۲۰۰۲ء)

گزشتہ تفصیل سے فتویٰ دینے والے کے لئے خواہشاتِ نفس، لالچ اور دوسرے رذائل سے بچنے اور عوام کے لئے شرعی حدود میں سہولت اور یسر کی اہمیت، اور جائز وناجائز حیلوں میں فرق معلوم ہو گیا۔

جن کو ملحوظ رکھنے سے آج کل پائی جانے والی افراط اور تفریط کی کئی صورتوں سے حفاظت ہو سکتی ہے۔

(رخصت وعزیمت، اتباعِ ہویٰ، اور تتبعِ رُخص اور تلفیق وغیرہ جیسے امور پر ہم

www.idaraghufran.org

نے، علامہ ابنِ تیمیہ، ابنِ قیم، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، اور دیگر محققین کی عبارات وتصریحات کی روشنی میں مدلل ومفصل کلام اپنی تالیف ''شاہ ولی اللہ کے فقہی افکار''اور''عمل بالحدیث کا حکم'' میں کر دیا ہے)

(ماہنامہ''التبلیغ'' جلد6 شمارہ3، مارچ 2009ء- ربیع الاول 1430ھ)

---

(52)

بڑھتے ہوئے خودکش حملے اور اہلِ علم کی ذمہ داری

پچھلے چند سالوں سے ہمارے ملکِ پاکستان میں خودکش حملوں کا سلسلہ شروع ہو کر طول پکڑ تا جا رہا ہے، اور ختم ہونے میں نہیں آ رہا، خودکُش حملوں کے اسباب وعوامل کیا ہیں؟ اور کیا نہیں، یہ ایک مستقل اور الگ موضوع ہے، جس کے بارے میں عام تجزیہ یہی ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے بعض علاقوں میں بمباری اور ظلم وستم اور پاکستانی حکومت کا ان سے تعاون ہے، لیکن اس وقت یہ ہمارا موضوع بحث نہیں۔

ممکن ہے کہ خودکش حملہ آوروں نے اپنے اہداف مخصوص ومتعین کر رکھے ہوں، لیکن اب تک ہونے والے خودکش حملوں میں سے بے شمار حملے ایسے ہیں کہ جن میں کافر اور سیاسی شخصیات کے بجائے براہِ راست مسلمان عوامُ الناس، اور سِول لوگ ہی زد میں آ کر ہلاک، یا ہمیشہ کے لیے معذور ہو چکے ہیں۔

ابھی حال ہی میں مؤرخہ ۱۸/ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ، 16 / مارچ 2009ء، بروز منگل کو راولپنڈی میں پیرودھائی موڑ پر ہونے والے خودکش حملہ میں بھی یہی صورتِ حال پیش آئی کہ اس حملے میں مسافر، مزدور اور غریب طبقہ ہی زیادہ تر متأثر ہوا۔

راولپنڈی کے پیرودھائی موڑ پر ہونے والے، اس خودکش حملہ میں تقریباً 14 / افراد موقع پر ہلاک اور متعدد افراد زخمی ہو گئے تھے۔

عینی شاہدین کے مطابق خودکش حملہ آور اور اس کے چند ساتھی جو نوجوان تھے، کچھ دیر سے وہاں چہل قدمی کررہے تھے، تھوڑی دیر بعد ایک کے علاوہ باقی ساتھی تو وہاں سے چلے گئے، اور ایک ساتھی مسافر ویگن کے قریب موجود تھا، کہ یکا یک خودکش حملہ ہوگیا؛ جس کے نتیجہ میں ٹیکسی ڈرائیور اور ویگن میں سوار متعدد مسافر ہلاک، یا زخمی ہوگئے، اور انسانوں کے اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہوکر دُور دراز تک بکھر گئے، کچھ مکانوں اور دوکانوں کی چھتوں پر جا کر گرے، کچھ دیواروں اور دوکان کے دروازوں اور شٹر گیٹوں کے ساتھ جا کر چپک گئے۔

اور کچھ اوپر کی طرف جا کر بجلی کے تاروں میں پھنس گئے۔

خودکش حملہ آور کے جسم سے نکلنے والے چھرے دُور دُور تک پہنچے، جو دوکانوں پر کام کرنے والے مزدور طبقے اور مسافروں وغیرہ کے جسم میں داخل ہوگئے، جس سے وہ بُری طرح زخمی، یا فوت ہوگئے۔

متعدد عمارتوں کے شیشے ٹوٹ گئے، یا دروازے اور شٹر گیٹ وغیرہ ٹیڑھے ہوگئے۔

اس قسم کے خودکش حملوں کے خوف کی وجہ سے ملک کا ہر باشندہ گھر سے باہر نکلتے ہوئے، راستہ سے گزرتے ہوئے، بازاروں اور دوکانوں سے خریداری کرتے ہوئے، گاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے، ایک وحشت محسوس کرتا ہے، اور شہری زندگی میں سکون واطمینان کا فقدان نظر آتا ہے۔

معلوم نہیں کہ اس قسم کے خودکش حملہ آور جو غریب ومسافر اور غیر موذی مسلم طبقہ کو نشانہ بنارہے ہیں، وہ کیا عزائم رکھتے ہیں؟ اور دین واسلام کے کن دلائل کی بنیاد پر وہ اس کو کارِ خیر خیال کررہے ہیں۔

یا پھر یہ دشمنانِ اسلام کی طرف سے مجاہدین کو بدنام کرنے کی ایک سازش ہے۔

حقیقتِ حال سے تو پوری طرح اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی کے حضور میں ہر ایک نے حساب وکتاب کے لیے حاضر وپیش ہونا ہے۔

اگرچہ اہلِ علم حضرات کا مروَّجہ خودکش حملوں کے جواز وعدمِ جواز اور اس کی شرائطِ جواز وغیرہ کے بارے میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

لیکن ایسے خودکش حملے جن میں غیر متعلقہ غریب ولاچار مسلمان، سِول عوام مارے جائیں، یا زخمی ومعذور ہوجائیں، ان کے ناجائز ہونے میں شاید کسی عالم کو اختلاف نہ ہو۔

اس لیے اہلِ علم حضرات کے اوپر اس موقع پر یہ خصوصی ذمہ داری عائد ہوچکی ہے کہ وہ اس قسم کے حملوں کے بارے میں شریعت کی تعلیم سے عوام کو آگاہ فرمائیں، تاکہ دین وعبادت کے نام پر اس ظلم وستم کا خاتمہ ہو، اور دشمنانِ اسلام کی سازشوں سے مسلمانوں کو آگاہ ہونے کی طرف توجہ ہو۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد6 شمارہ4، اپریل2009ء۔ ربیع الآخر1430ھ)

---

(53)

دینی موضوع، عملی زندگی سے متعلق ہونا چاہئے

آج کل کثرت سے دیکھنے میں آرہا ہے کہ دین کے موضوع کو بھی بہت سے لوگوں نے ایک ذہنی تفریح کا ذریعہ بنالیا اور خیالی دنیا کی چیز سمجھ لیا ہے۔

چنانچہ سیاسی میدان ہو، یا معاشی، یا کوئی اور میدان ہو، ہر جگہ کم وبیش اس کے اثرات نظر آتے ہیں، اور دینی ذہن رکھنے والا اہلِ علم کا ایک طبقہ بھی اس مزاج ومذاق کے قریب تر ہوتا جارہا ہے۔

حالانکہ اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ دینِ اسلام، عملی زندگی سے متعلق موضوع کو اہمیت دیتا ہے اور اسی پر بحث کرتا ہے، اور جس چیز کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو اور اس کا اپنے نامۂ اعمال سے تعلق نہ ہو، اس سے کنارہ کشی کی تعلیم دیتا ہے، البتہ علمی حد تک، بقدرِ ضرورت اہل حضرات کو بحث وتمحیص کی اجازت دیتا ہے۔

مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے دین کو ایک ہیولیٰ بنا رکھا ہے، جس میں نہ

عقائد ونظریات کا ذکر ہے، اور نہ ہی نماز وروزے کا اور نہ ہی حلال وحرام معاملات کا اور نہ ہی اچھے اور بُرے اخلاق کا۔

بلکہ ہواؤں میں تیر مار کر دین کی اصل روح کو مسخ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مثلاً بعض لوگ اس موضوع کو بہت اہمیت دیتے ہیں کہ حضرت مہدی علیہ الرحمۃ پیدا ہوچکے ہیں یا نہیں، اور یہ کہ وہ کون سے سال میں ظاہر ہوں گے، اور کون سی صدی ہوگی؟ وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ شریعتِ مطہرہ نے ان کی پیدائش اور ظہور کے بارے میں کسی متعین مہینے اور متعین سال وصدی کی نشاندہی نہیں فرمائی، البتہ اس کے بجائے کچھ حالات وآثار کی نشاندہی ضرور فرمائی ہے، اور مختلف فتنوں کے رونما ہونے کی خبر دی ہے، اور اس موقع سے متعلق عملی ہدایات عطاء فرمائی ہیں کہ اس زمانے میں لوگوں کے ایمان کی کیا حالت ہوگی؟ اور کس کس قسم کے گناہ عام ہوں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا اس کا تقاضا یہ تھا کہ اپنے ایمان اور اعمال کا جائزہ لیا جاتا، اور ایمان کو پختہ کرنے، اعمالِ صالحہ کو اختیار کرنے اور گناہوں سے تائب ہونے کی طرف متوجہ ہوا جاتا، کیونکہ ان چیزوں کا ہی عملی زندگی سے تعلق ہے، مگر افسوس کہ ان چیزوں سے قطع نظر کر کے فضول بحثوں میں لگ کر اپنا وقت برباد کیا جاتا ہے۔

اسی طرح مثلاً آج کل بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ دجال کسی خاص فرد وشخصیت کا نام نہیں، بلکہ ایک کردار کا نام ہے، اس قسم کا کردار جس قوم اور جس ملک کی طرف سے بھی رونما ہوگا، اس کو دجال قرار دیا جائے گا، اور آج کے دور میں مثلاً اسرائیل، یا امریکہ کا کردار دجال کی طرح ہے، اس لئے وہی دجال ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ یہاں بھی وہی اصولی غلطی ہے، بلکہ اس سے بھی بڑی غلطی ہے، کیونکہ اولاً تو شریعت کی طرف سے واضح طور پر بتلا دیا گیا ہے کہ دجال دراصل ایک خاص شخص اور فرد ہوگا۔

اور دوسرے دجال کی طرف سے پیش آنے والے فتنوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے کہ مثلاً

دجال لوگوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالے گا، اور لوگ اس کے جال میں پھنس کر اپنے ایمان کو تباہ و برباد کریں گے، اور دجال کے فتنے سے محفوظ رہنے کے لئے فلاں فلاں عمل مؤثر ہوگا۔

تو دجال کے ظہور وخروج کے متعلق بھی شریعت کی طرف سے پیش کردہ عملی تعلیمات کو اختیار کرنا چاہئے اور اپنے ایمان کو پختہ کرنا چاہئے۔

اسی طرح مثلاً کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی فلاں سورت، یا فلاں آیت کے اتنے نمبر ہیں، اور ان نمبروں کے مجموعہ سے امریکہ میں رونما ہونے والے گیارہ ستمبر کے واقعہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ یہ بھی خودساختہ اور فضول تصور ہے، جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور اس کے بجائے مسلمانوں کو متحد ومتفق ہونا چاہئے، اور کافروں کے شر وظلم اور سازشوں سے نجات کا جو طریقہ شریعت نے عملی زندگی سے متعلق تجویز کیا ہے، اسے اختیار کرنا چاہئے۔

اسی طرح مثلاً کہا جاتا ہے کہ قیامت فلاں سنہ اور فلاں فلاں سال آئے گی، اور دنیا کی کل عمر اتنی اور اتنی ہوگی اور اب فلاں سال اور فلاں سنہ چل رہا ہے، لہٰذا قیامت کے آنے میں اب اتنا اور اتنا عرصہ باقی رہ گیا ہے۔

حالانکہ شریعت نے قیامت کے قائم ہونے کے متعلق کسی خاص سال اور صدی کی تعیین نہیں فرمائی، بلکہ اس کی کچھ علامات ضرور بتلائی ہیں، اور وہ کئی قسم کی علامات ہیں، کچھ دور زمانے سے تعلق رکھتی ہیں اور کچھ قریب زمانے سے تعلق رکھتی ہیں، اور کچھ درمیانے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن وہ علامات کونسے سن وسال میں ظاہر ہوں گی، اور کونسے سال وسن میں ختم ہوں گی، ان چیزوں سے شریعت نے خاموشی اختیار کی ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ قیامت کے وقوع سے متعلق کسی خاص سن وسال کی تعیین کی بحثوں سے بچا جاتا، اور قیامت کے دن سے متعلق اپنی زندگی کے اعمال درست کر کے تیاری کی جاتی۔

اس طرح مثلاً کہا جاتا ہے کہ چاند پر فلاں چیز کی تصویر ہے، یا فلاں کلمہ لکھا ہوا ہے، اور اس

www.idaraghufran.org

میں مختلف آراء پائی جانے پر بحث ومباحثہ اوراختلاف کیا جاتا ہے۔

حالانکہ شریعت نے اس بحث میں پڑنے کی تعلیم نہیں دی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے چاندکوانسانوں کی خدمت وراحت کے لئے پیدا کیا ہے،اورانسانوں کواپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے، اس لئے اس کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی پیدائش کے مقصود میں عملی طور پر مشغول ہوا جاتا، اوراس قسم کی بحثوں میں الجھ کراپنے وقت کو برباد کرنے سے بچا جاتا۔

اسی طرح مثلاً اس پر بحث کی جاتی ہے کہ چاند پر زندگی کے آثار کو حاصل کرلیا جائے گا، یا نہیں؟ اورحاصل کرلیا جائے گا، تواس میں کتنا عرصہ لگے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ یہ بحث بھی فضول ہے، اس کے بجائے چاند کے خالق و مالک کی عبادت واطاعت میں لگنا چاہئے۔

اسی طرح مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں سیارہ زمین سے قریب ہوتا جارہا ہے،اوراندیشہ ہے کہ وہ زمین پر نہ گر پڑے، اوراس کی وجہ سے زمین پر بسنے والے انسانوں کے لئے خطرہ نہ پیدا ہوجائے، اوراگرایسا ہوا تو وہ زمین کے کونسے حصے کوزیادہ متاثر کرے گا، اورکون سے حصے کوکم متاثر کرے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ شریعت نے اس قسم کی آفات و بلیات سے حفاظت کے لئے توبہ واستغفاراوراعمالِ صالحہ کانسخہ فراہم کیا ہے، اس کواختیار کرنا چاہئے۔

یہ تو میں نے چند مثالیں دی ہیں ، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ آج کل فضول بحثوں اور فضول موضوعات کا معاشرہ میں ایک طوفان برپا ہے، جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور جن چیزوں کا عملی زندگی سے تعلق ہے، ان کونظرانداز کیا ہوا ہے، مذکورہ مثالوں سے ان موضوعات اوربحثوں کی حقیقت کو سمجھنا کوئی بھی مشکل نہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ عوام الناس عموماً اور اہلِ علم خصوصاً اس فتنہ کو سمجھیں، اوراس سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں۔

میڈیا، ذرائع ابلاغ اوراخبار وجرائد ورسائل پرنظر ڈالنے سے اس قسم کے موضوعات اور

بحثوں کا ایک اتنا بڑا انبار نظر آتا ہے کہ جس کو پڑھنا اور سننا اور دیکھنا بھی دراصل اپنی قیمتی زندگی کو فضولیات اور خیالی دنیا کے نذر کر دینے کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو بے مقصد زندگی گزارنے کے بجائے بامقصد زندگی گزارنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 6 شمارہ 8، اگست 2009ء۔ شعبان 1430ھ)

---

(54)

علماء کے ہوا کے رُخ پر چلنے کا نقصان

عالمِ دین کی حقیقی شان یہ ہونی چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور مختصراً یہ کہ شریعت کو اپنا مطمحِ نظر بنائے، اور اپنی رفتار وگفتار کو ہمہ وقت شریعت کے تابع رکھے۔

شریعت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے رونما ہونے والے حالات واحوال کے ماتحت اور تابع نہ ہو، کیونکہ عالمِ دین کا منصب بگڑے ہوئے اعمال واحوال کی اصلاح کرنا ہے، جس کے لئے ظاہر ہے کہ حالات کی مخالفت کرنی پڑتی ہے، اور ہواؤں کے مخالف رخوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن حضرات سے دین کی خدمت کا صحیح کام لیا ہے، انہیں بگڑے ہوئے معاشرے کی مخالف سمت کو اختیار کرنا پڑا، بلکہ جتنے انبیائے کرام علیہم السلام دنیا میں مبعوث ہوئے، ان سب نے بگڑے ہوئے معاشرے کی مخالف سمت کا انتخاب کیا اور کسی بھی موقعہ پر اپنے آپ کو اس کا ماتحت وتابعدار نہیں بنایا، اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب کہ مقصود رضائے الٰہی ہو، اور اگر دنیا پر نظر ہو، تو پھر اس بات کو اختیار کرنا مشکل ہے، لیکن آج کل اہلِ علم کے ایک بڑے طبقہ کے طرزِ عمل سے یہ بات نمایاں ہو کر سامنے آرہی ہے

کہ انہوں نے اپنے آپ کو حالات واحوال کے تابع کیا ہوا ہے، جس طرف کو ہوا کا رخ ہوتا ہے، وہ اپنا قبلہ وکعبہ اسی سمت کو بنا لیتے ہیں، یہاں تک کہ کسی ایک مسئلہ میں حالات کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ایک سے زیادہ موقف اختیار کر لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل اخلاص ورضائے الٰہی سے میل نہیں کھاتا، اوراس قسم کے طرزِ عمل کو اختیار کرنے والے اہلِ علم اپنے تئیں یہ سمجھتے ہوں گے کہ اس طرزِ عمل سے انہیں معاشرے کی خوشنودی حاصل ہوجاتی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اولاً تو ایسی خوشنودی کس کام کی، جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا شامل نہ ہو، دوسرے ایک نہ ایک دن ایسے اہلِ علم کے اس دوہرے معیار کا بھانڈا دنیا میں بھی پھوٹ جاتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی دنیا میں بھی عزت ووقعت ختم ہوجاتی ہے، اس لئے دنیا وآخرت کی عزت اسی میں ہے کہ رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر آگے بڑھا جائے، اور ابنُ الوقت کے بجائے ابوالوقت بنا جائے۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 6 شمارہ 9، ستمبر 2009ء۔ رمضان ۱۴۳۰ھ)

---

(55)

تراویح کے بعد خلاصۂ قرآن

رمضان المبارک کے بابرکت مہینہ کا آغاز ہوچکا ہے، اوراس کی ابتدائی تراویح بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اداء کر لی گئی ہے، جس پر ہم سب کو اللہ تعالیٰ کا شکر اداء کرنا چاہئے، اور رمضان المبارک کے پورے مہینہ کی قدردانی کی کوشش ودعاء کرنی چاہئے۔

میرا مدت سے تراویح پڑھانے کے بعد مختصر بیان کرنے کا معمول رہا ہے، اور اکثر وبیشتر یہ عادت رہی ہے کہ تراویح میں جو پارہ پڑھا جاتا ہے، اس میں سے کسی آیت کا حسبِ ضرورت وحسبِ موقع، انتخاب کرکے اس کی ضروری تفسیر وتشریح کردی جاتی ہے۔

بعض لوگ میرے اس بیان کو خلاصۂ قرآن کا نام دیتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اولاً تو

قرآن مجید، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اس میں کوئی ایک لفظ، بلکہ ایک حرف بھی زیادہ نہیں، اور خلاصہ ایسی چیز کو کہا جاتا ہے کہ جس میں زائد چیزوں کو حذف کر کے اور نکال کر مختصر انداز میں سارے مضمون کو بیان کردیا جائے۔

اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں زائد چیزوں کا نظریہ وعقیدہ رکھنا ہی درست نہیں، اور بات دراصل یہ ہے کہ خود قرآن مجید ایسی جامع اور مختصر کتاب ہے کہ اس کا مزید خلاصہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس لئے کسی بھی درس کو خلاصۂ قرآن کا نام دینا، کسی طرح بھی درست نہیں، البتہ خلاصۂ تفسیر کا نام دیا جاسکتا ہے، اور وہ بھی اس وقت ہے کہ جب کہ واقعی تفسیر بیان کی جائے، اور وہ تفسیر بھی مکمل ہو، اور آج کل جو اجتہادی چیزوں اور نکات کو تفسیر کا نام دیا جاتا ہے، یا چند آیات کا باہم ربط بیان کر کے اور کسی ایک مضمون کو کچھ تفصیل سے بیان کر کے اس کو خُلاصہ تفسیرِ قرآن کہہ دیا جاتا ہے، اور سمجھا جاتا ہے، بلکہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ تراویح میں جو کچھ پڑھا گیا، اس سب کا خلاصہ بیان ہوگیا، یہ سراسر جہالت ونادانی کی بات ہے۔

اس کی اصلاح ضروری ہے، اسی طرح آج کل بعض لوگ صرف آیات کے باہمی ربط وتعلق کو بتلاتے ہیں، اور اس کا نام خلاصۂ قرآن رکھتے ہیں، یہ اور بھی غلط ہے، کیونکہ آیات کا باہمی ربط وتعلق تو اکثر وبیشتر منصوص طریقہ پر ثابت بھی نہیں، بلکہ اس کو اہلِ علم حضرات نے اجتہاد و استنباط سے اخذ کیا ہے، اور اسی وجہ سے خود ربط وتعلق کی وجوہات متعدد ہیں، کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ بیان کیا ہے۔

لہٰذا اس ربط وتعلق کو قرآن مجید کا مقصودی درجہ دینا بھی درست نہیں۔

ان غلط فہمیوں کی اصلاح ضروری ہے، کیونکہ قران مجید کے عنوان سے اس قربِ قیامت کے دور میں بڑے فتنے رونما ہورہے ہیں، انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مہینہ، یا چالیس دن میں پورے قرآن مجید کی تفسیر پڑھائی جاتی ہے، اور اسے دورۂ تفسیر قرآن کا عنوان دیا جاتا

ہے، میرے نزدیک تو اللہ تعالیٰ کے کلام کے مقصود کو اس مختصر سے عرصہ میں عوام کا سمجھنا ممکن نہیں، چہ جائیکہ عوام کو یہ مختصر سا دورہ کرا کر انہیں سند بھی جاری کی جائے، اس سے ایک تو اللہ کے کلام کی اہمیت کم ہوتی ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ بس کلام اللہ میں صرف انہیں مضامین کا بیان ہے، جو مختصر سے عرصہ میں بیان کر دیئے گئے۔

اور غور طلب بات ہے کہ اگر پورے قرآن مجید کی تفسیر اتنی ہی آسان اور سہل ہوتی، تو پھر طلبہ کو دینی مدارس میں اتنا طویل وقت کیوں خرچ کرنا پڑتا۔

اور دوسری خرابی یہ ہے کہ عوام اور نوجوان اس دورہ سے اپنے آپ کو مفسر سمجھ کر معاشرہ میں قرآن مجید کے عنوان سے مختلف فتنے پیدا کرتے ہیں۔

اور یہ تو اس وقت ہے، جبکہ اس قسم کے دورہ میں کچھ معتبر تفسیری مضامین بیان کیئے جائیں۔ ورنہ آج کل ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو دورۂ تفسیر کے عنوان سے صرف خاص خاص چیزوں کو پڑھاتے ہیں، مثلاً بریلویت، یا شیعیت کا رَد، یا اسی طرح کی کوئی خاص چیز، لیکن قرآن مجید کے دورہ کو اس قسم کے ایک شعبہ تک محدود کرنے کا تاثر درست نہیں۔

اس لئے میں اس طرزِ عمل کے بجائے کسی ایک آیت کے ضروری اور مفید مضامین کو بیان کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔ یکم رمضان ۱۴۳۰ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 6 شمارہ 10، اکتوبر 2009ء- شوال 1430ھ)

---

(56)

قرآن فہمی کے متعلق چند غلط فہمیاں

قرآن مجید اور فرقانِ حمید، اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، جس کے بعد قیامت تک کسی اور آسمانی کتاب کے آنے کا امکان نہیں۔

اور اسی کے ساتھ یہ آسمانی کتابوں میں سب سے جامع اور مفصل کتاب ہے، جس میں

قیامت تک آنے والے انسانوں کی صلاح وفلاح اور رشد وہدایت کا ذخیرہ موجود ہے۔

پھر قرآن مجید میں ایک حصہ تو وہ ہے، جو وعظ ونصیحت اور عبرت وبصیرت پر مشتمل ہے، اور اس حصہ کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی تذکیر کے لئے نازل فرمایا ہے، اور اسی لئے اس حصہ کو نہایت سہل وآسان بھی بنایا ہے۔

اور قرآن مجید کا دوسرا حصہ وہ ہے، جو حلال وحرام اور جائز وناجائز وغیرہ کے احکام پر مشتمل ہے، یہ حصہ کیونکہ علمی نوعیت کا ہے، جس کو سمجھنے کے لئے مختلف علوم کی ضرورت ہے، ان علوم میں عربی زبان کے علاوہ، نحوی وصرفی قواعد اور لغت وغیرہ بھی داخل ہیں، اور اسی لئے اس حصہ کو سمجھنے کے لئے کئی سالوں پر مشتمل دینی مدارس میں مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی ہے، اور ان علوم پر مہارت حاصل ہونے کے بعد قرآن مجید کے اس حصہ کو صحیح سمجھنے کی صلاحیت ولیاقت پیدا ہوتی ہے۔

اور اسی وجہ سے قرآن مجید کا یہ حصہ صرف ترجمہ اور مختصر تفسیر کے مطالعہ سے ہر عامی شخص کو سمجھنا مشکل ہے۔

مگر آج کے دور میں کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید کو علی الاطلاق سمجھنے کے لئے کسی دوسرے علم کی ضرورت نہیں، اور اگر کچھ ضرورت بھی ہے، تو وہ صرف تھوڑے بہت نحوی وصرفی علم وفن کی ضرورت ہے، اور اسی خیال کے نتیجہ میں ان لوگوں کی طرف سے آج عامۃُ الناس کو براہِ راست قرآن فہمی کی دعوت دی جاتی ہے، اور اس غرض کے لئے مختلف کورس اور دورے منعقد کئے جاتے ہیں، اور چند دن لیکچر دے کر سمجھا جاتا ہے کہ قرآن فہمی کا مقصد پورا ہوگیا۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے مختصر دورے کر کے، اور لیکچر سُن کر، قرآن فہمی کے مقصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا، اور اگر کچھ حاصل بھی ہوجائے، تو اس کو حقیقی، یا کامل قرآن فہمی سے تعبیر کرنا مشکل ہے۔

پھر جہاں قران فہمی کے سلسلہ میں مذکورہ غلطی کا ارتکاب کیا جاتا ہے، اس کے ساتھ ہی ایک

فاحش اور خطرناک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ قرآن فہمی کے لئے جن حضرات کو بطورِاستاذ مقرر کیا جاتا ہے، وہ خود قرآنی ہدایات وتعلیمات اور سیرتِ نبوی کی دولت سے کوسوں دور ہوتے ہیں، نہ سیرت، نہ صورت، نہ کردار اور نہ سنت کی پیروی، ان سب ہی چیزوں سے محروم ہوتے ہیں۔

حالانکہ سلفِ صالحین کا ارشاد ہے کہ:

''کتابُ اللہ کو رجالُ اللہ سے سیکھو، اور رجالُ اللہ کو کتابُ اللہ سے پہچانو!''

بھلا جو لوگ قرانی ہدایات پر ہی عمل پیرا نہیں ہوں گے، ان سے قرآن فہمی کے مقصد کو حاصل کرنے کی کیا خاک توقع کی جاسکتی ہے۔

آج کل ذرائع ابلاغ کے علاوہ عوامی سطح پر بھی ایسے لوگوں کی کثرت ہے، جو قرآن فہمی کے عنوان سے مختلف قسم کی گمراہیاں پھیلانے میں مصروف ہیں۔

اور یہ سب خرابیاں تو ایک طرف ہیں، علماء کے ایک طبقہ میں بھی عوام الناس کو قران فہمی کے حقیقی مقصود سے محروم کر کے قرآن مجید کی طرف غلط نسبتیں کی جارہی ہیں، اور قرآن مجید کی تعلیمات کو بہت محدود کر کے پیش کیا جارہا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید کی ہر ہر سورت اور آیت کو اپنے مخصوص جذبات وخیالات کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے، جو حضرات سیاسی ذہن ومزاج رکھتے ہیں، وہ ہر ہر سورت اور آیت سے سیاست کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور وہ اپنے جذبات میں یہاں تک بھی کہہ جاتے ہیں کہ حضرت سلیمان، حضرت یوسف، حضرت ذوالقرنین وغیرہ کے قصے سیاست کی اہمیت وضرورت کی وجہ سے ہی بیان کئے گئے ہیں، اور بس۔

اور جو حضرات جہادی ذہن رکھتے ہیں، وہ اپنے جذبات وخیالات کو ہر ہر سورت وآیت سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ وہ آیات اور سورتیں مکی ہی کیوں نہ ہوں، اور ہجرت سے پہلی ہی نازل کیوں نہ ہوئی ہوں (جبکہ اس وقت تک قتال کا حکم بھی نہیں آیا تھا)

اور جو حضرات تبلیغی ذہن رکھتے ہیں وہ ہر ہر سورت اور آیت سے دعوت وتبلیغ کو ثابت کرنے

کی کوشش کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہر مقام پر جہاد اور فی سبیل اللہ کے مفہوم کو تنگ کر کے اور کسی بھی طرح کی تاویل کر کے مروّجہ دعوت وتبلیغ پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور جو لوگ کسی خاص قسم کا تحریکی وتنظیمی مزاج رکھتے ہیں وہ قرآن مجید سے اپنی تحریکی وتنظیمی کوششوں اور ان کی افادیت واہمیت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

گویا کہ ہر ایک نے قرآن مجید کی تعلیمات کو اپنے جذبات وخیالات کے تابع بنا کر رکھا ہوا ہے، اور اعتدال کی نعمت ودولت سے اپنے آپ کو محروم کیا ہوا ہے۔

غلط قرآن فہمی کے سلسلہ کی ایک کڑی وہ بھی ہے، جو آج کل مختصر دورۂ تفسیر قران کے عنوان سے رائج ہے، کہ چالیس، یا تیس روزہ مختصر دورۂ تفسیر کرا کر سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کا مقصد حاصل ہو گیا، حالانکہ تیس، یا چالیس روز میں اور وہ بھی جز وقتی طور پر قرآن فہمی کے حقیقی مقصود کو حاصل کیا جانا، بہت مشکل، بلکہ ناممکن ہے۔

پھر بہت سی جگہ اس دورۂ تفسیر میں شرکت کے لئے نہ کسی قاعدہ وقانون کی پابندی کی ضرورت سمجھی جاتی، اور نہ ہی خاص علمی صلاحیت ولیاقت کو ضروری سمجھا جاتا، اور نہ عمل وکردار کا لحاظ کیا جاتا، بلکہ مدارس کے طلبہ ہوں، یا سکول وکالج کے سٹوڈنٹس، یا پھر کاروباری اور تجارتی شعبہ سے منسلک عوام، سب کو بلاتفریق وامتیاز اس میں شمولیت کی نہ صرف اجازت دی جاتی ہے، بلکہ اس کی طرف دعوت دی جاتی ہے، اور پھر بہت سی جگہ اوپر سے دورۂ تفسیر کی سندِ فراغت واجازت بھی فراہم کر دی جاتی ہے۔

حالانکہ اس مختصر دورانیہ میں قرآن مجید کے شانِ نزول کی بحث کو بھی پوری طرح سمجھا وسمجھایا نہیں جا سکتا، پھر معلوم نہیں کہ کس چیز کی تعلیم دے کر قرآن فہمی کے عنوان کو ہوا دی جاتی ہے۔

ہمیں جہاں تک معلوم ہوا، اس قسم کے دورہ ہائے تفسیرِ قرآن میں عام طور پر مخصوص بحثوں کو ہی پڑھایا جاتا ہے، اور اس میں بھی عام طور پر معلم کے اپنے جذبات وخیالات کی ترجیحات کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔

اس قسم کی بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہے کہ اب قرآن فہمی کا معاملہ نااہل اور عوام کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا ہے، اور اس کے نتیجہ میں عوام میں در پردہ یہ خیال ترقی پکڑ رہا ہے کہ قرآن مجید نعوذ باللہ تعالیٰ بہت محدود موضوع کی کتاب ہے، بس جس موضوع کو ترجیحی بنیادوں پر پڑھا گیا، اسی موضوع سے متعلق قرآن کے مقصودِ نزول کو محدود سمجھ لیا جاتا ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ قرآن فہمی کے نام پر ہونے والی اس قسم کی بے اعتدالیوں کا حصہ بننے کے بجائے اہلِ علم حضرات ان کے ازالہ واصلاح کی طرف اپنی توجہات کو مبذول فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 6 شمارہ 11، نومبر 2009ء۔ ذوالقعدہ 1430ھ)

---

(57)

ہر کام، علماء کے ذمہ نہیں

ایک مرتبہ میں اپنے یہاں مسجد میں جمعہ سے پہلے حسبِ معمول بیان کر رہا تھا، اور یہ اُن دنوں کی بات ہے جب حکومت کی طرف سے عصری نصاب میں کچھ تبدیلی کی گئی تھی اور اسلامیات میں کافی کچھ تبدیل وتحریف سے کام لیا گیا تھا، اور اس پر علماء کی طرف سے خاص طور پر اور عوام کی طرف سے عام طور پر تشویش کا اظہار کیا جا رہا تھا۔

میرے بیان کے دوران ایک صاحب نے رقعہ دیا، جس میں تحریر تھا کہ حکومت کی طرف سے نصاب میں کی گئی، تبدیلی کے خلاف آواز اٹھائیں، اور جدوجہد کریں، اور حکومت کے خلاف کوئی ٹھوس قدم اٹھائیں، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس رقعہ کو پڑھ کر عرض کیا کہ میرے پاس یہ رقعہ آیا ہے، اور اہلِ علم حضرات اس سلسلہ میں پہلے ہی اپنا فریضہ اداء کر چکے ہیں اور عوام الناس کو مختلف طریقوں سے بہت وضاحت اور صراحت اور دلائل کے ساتھ یہ باور کرا چکے ہیں کہ نصاب میں کی گئی تبدیلی بہت

غلط اور تباہ کن ہے، اور اس نصاب کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنے والوں کے نظریات وخیالات پر بہت برا اثر پڑنے کا خطرہ ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔

اس طرح اہلِ علم حضرات اپنی ذمہ داری پوری کر چکے ہیں، اب حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ اس پر عمل درآمد کرے، اور اگر حکومت اس پر عمل نہیں کرتی، تو عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اس تبدیل وتحریف شدہ نصاب سے بچانے، اور دور رکھنے کی کوشش کریں۔

میں نے یہ بھی عرض کیا کہ ہم تو اس عصری نصاب کے پہلے بھی حامی نہیں تھے، جب تک کہ اس میں موجودہ تبدیلی نہیں کی گئی تھی، کیونکہ اس وقت بھی یہ نصاب دینی ضرورت کے مطابق نہیں تھا، اور اس میں اس وقت بھی کافی کچھ اصلاحات کی ضرورت تھی، اور اسی وجہ سے اس نصاب کو پڑھ کر علماء اور شرفاء تیار نہیں ہو رہے تھے۔

اور اب جبکہ پہلے والے نصاب کو بھی تبدیل کر دیا گیا ہے اور اسلام کی کئی باتوں میں تحریف سے کام لیا گیا ہے، تو اب موجودہ صورتِ حال میں ہم اس نصاب کی کیونکر حمایت کر سکتے ہیں۔

اور کیونکہ علماء کی طرف سے بار بار صراحت ووضاحت اور اصلاح کی آواز اُٹھانے کے باوجود حکومت اس کی اصلاح کا اہتمام نہیں کر رہی، تو اب علماء، اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے ہیں، اور اب ذمہ داری اُن عوام پر عائد ہو چکی ہے، جو اس نصاب کو قائم وجاری رکھنے میں مدد فراہم کر رہے ہیں، جس کی ایک شکل تو اس نصاب کو فروخت کرنا ہے، اور ایک شکل اس نصاب کو خریدنا ہے، اور ایک شکل اس نصاب کی تعلیم دینا، اور تدریس کرنا ہے، اور سب سے بڑی شکل اس نصاب کی تعلیم حاصل کرنا ہے، اور یہ سب کام ظاہر ہے کہ آپ حضرات عوام ہی کر رہے ہیں۔

اگر آپ حضرات اس موجودہ ترمیم وتحریف شدہ نصاب کو نہ تو فروخت کریں، نہ ہی خریدیں، اور نہ ہی اس کی تعلیم دیں، اور نہ ہی اپنے بچوں کو ایسا نصاب پڑھائیں، بلکہ صاف اعلان کر دیں کہ ہم اس نصاب کی نہ تو خرید وفروخت کریں گے، اور نہ ہی پڑھائیں گے، اور نہ ہی

پڑھیں گے، اور عملی طور پر اس نصاب کا مقاطعہ بھی کر دیں، اور اس سے بڑھ کر ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیں کہ آج سے ہم اس تحریف وترمیم شدہ نصاب کے بجائے، فلاں، فلاں، یا دینی مدارس وجامعات کے نصاب کو پڑھیں، اور پڑھائیں گے، اور اپنی اولاد کو دینی مدارس میں داخل کریں گے، تو زیادہ دن نہیں، اور چند دن نہیں، بلکہ یقین جانئے کہ ایک ہی دن میں حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔

اور حکومت کو فوری طور پر نصاب میں کی گئی تبدیلی کے اپنے فیصلے کو واپس لینے پر مجبور ہونا پڑے گا، مگر افسوس ہے کہ عوام الناس اپنا فریضہ اور اپنی ذمہ داری تو اداء کر نہیں رہے، اور علماء کے آواز اٹھانے، بلکہ حکومت سے لڑنے اور گویا کہ حکومت سے مقابلہ کر کے جیل بھرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

دوسری طرف بے چارے اس قسم کے علماء بھی نادان ہیں کہ جن کا اس نصاب کے نہ پڑھنے سے تعلق ہے، اور نہ پڑھانے سے تعلق ہے، بلکہ ان کے پاس قیمتی دینی نصاب موجود ہے، مگر وہ جذباتی عوام کے جوش وجذبہ دلانے اور ابھارنے، بلکہ بقول کسے: ع

چڑھ جاؤ سولی پر، رام بھلا کرے گا

کی مثال کے مطابق خواہ مخواہ میں اپنے آپ کو حکومت کے مقابلہ میں طاقت استعمال کر کے پریشانی میں ڈالتے ہیں۔

لہٰذا علماء کو اس قسم کے حالات کے وقت خبردار رہنا چاہئے، اور حکومتِ وقت سے مقابلہ کرنے اور اس کے خلاف آواز اٹھاتے رہنے کے بجائے، عوام الناس کو اپنی اصل ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا چاہئے۔

لیکن کیونکہ ہمارے یہاں ایک مدت سے بہت سے اہلِ علم حضرات نے یہ سمجھا ہوا ہے، یا ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہوا ہے کہ سارے کام بس ہمارے ذمہ ہیں، اور عوام کے ذمہ کوئی کام نہیں، اور اسی وجہ سے وہ بس ہر وقت اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا رُخ حکومتِ وقت کے خلاف

جدوجہد کرنے کی طرف رکھتے ہیں، اور اپنے مخاطب عوام کو دینی ضروریات، اور شرعی احکام کی ترغیب وترہیب اور تعلیم دینے کی ذمہ داری سے محروم رہتے ہیں، اور وہ اپنے اس طرزِ عمل کی وجہ سے گویا کہ ہمیشہ حکومتِ وقت کے سامنے حزب اختلاف بنے رہتے ہیں، اور اسی وجہ سے ہر آنے والی حکومت ان سے متوحش وخائف رہتی ہے، اور ان کے اس طرزِ عمل سے عداوت وشقاوت پیدا ہونے کے باعث، ان کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتی، اور اوپر سے ان کو دبانے کی کوشش میں مشغول رہتی ہے۔

اس لئے علماء کو ''کامی کام کرے اور بے وقوف ساتھ پھرے'' کا مصداق بننے کے بجائے اپنی ذمہ داریوں کے دائرہ کار پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 6 شمارہ 12، دسمبر 2009ء۔ ذُوالحجہ 1430ھ)

---

(58)

طاقت کا غلط اور بے جا استعمال

میں ایک مرتبہ اپنے یہاں صبر وتحمل اور حلم کے فضائل واہمیت، اور غصہ وتشدد کی برائی ومذمت پر بیان کر رہا تھا، بیان کے دوران غم وغصہ سے پیدا ہونے والے نقصانات، مثلاً طلاق، قتل وغارت گری اور خودکشی وغیرہ کا بھی ذکر آیا۔

بیان سے فراغت کے بعد حاضرین میں سے ایک سولہ سترہ سالہ نوجوان نے کہا کہ میں نے آپ کا بیان سنا، جس سے بہت فائدہ ہوا، اور اگر میں آپ کا بیان نہ سنتا، تو قریب تھا کہ میں کسی حملہ ودھماکہ کا حصہ بن جاتا، اس لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

میں نے نوجوان سے کہا کہ آپ ایسا کیوں کرنے والے تھے؟

اس نوجوان نے کہا کہ میں دراصل پچھلے دنوں کچھ گھریلو حالات اور زندگی کے واقعات سے اکتایا ہوا تھا، اسی دوران مجھے کچھ نماز وغیرہ کا شوق ہوا، اور میں نے مسجد میں جا کر نماز پڑھنا شروع کی،

اس مسجد میں مولوی صاحب درس بھی دیا کرتے تھے، ان کے درس میں بھی شرکت کی۔
وہ مولوی صاحب اپنے درس میں ہمیشہ ملک میں ہونے والے حالات سنا سنا کر غم وغصہ دلایا کرتے تھے، حکومت، فوج اور عوام کے کردار سے مایوسی پیدا کیا کرتے تھے، اور پھر جہاد اور انقلاب کے نام سے جوش وجذبہ پیدا کیا کرتے تھے، اور شہادت کے فضائل بتلا کر مرنے اور مارنے کا جوش دلایا کرتے تھے، جیسا کہ بعض مولویوں کی یہی عادت ہے، اور میں تو پہلے سے ہی اپنی زندگی سے تنگ آیا ہوا تھا، لیکن خودکشی کے گناہ سے ڈر کی وجہ سے کوئی اقدام نہیں کیا کرتا تھا، لیکن ان مولوی صاحب کے بیان کو سُن کر میں نے سوچا کہ خودکشی کے گناہ سے بچنے اور مصیبت زدہ زندگی سے جان چھڑانے کا یہ آسان اور اچھا راستہ ہے کہ کسی طرح اللہ کے راستہ میں مقبول ہو جاؤں، اس طرح سانپ بھی مر جائے گا، اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی، اور آخرت میں بھی اجر وانعام پاؤں گا۔
میں نے یہ سُن کر اس نوجوان کو سمجھایا کہ ایسی بات نہیں ہے، اور اگر ان مولوی صاحب نے واقعتاً اس قسم کی باتیں کی ہیں، تو وہ مولوی صاحب کم علم، نادان اور ناعاقبت اندیش انسان ہیں، آپ اس طرح کا اقدام کر کے ہرگز خودکشی کے گناہ سے نہیں بچ سکتے تھے، کیونکہ اصل مقصد دنیا سے تنگ آ کر اس سے رخصت ہونا تھا، اسی غرض سے آپ میں یہ جذبہ پیدا ہوا، اور نفس وشیطان نے اس پر جہاد اور شہادت کا لیبل چڑھا دیا۔
پھر میں نے نفس اور شیطان کی تلبیسات اور تخدیعات کا کچھ ذکر کیا کہ نفس اور شیطان کس کس طرح سے تلبیس کر کے انسان کو گناہ میں مبتلا کرتا ہے، اور کیا کیا رنگ دکھاتا ہے، اور کس کس طرح سے دین کے نام پر اپنے جال میں پھنساتا ہے۔
اور پھر اس کے ساتھ میں نے اس نوجوان کو جہاد اور شہادت کے بارے میں بتلایا کہ جہاد کا مفہوم تو بہت وسیع ہے، اور اس میں نفس کے خلاف جہاد کرنا، بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اور قتال بھی جہاد کا ایک اعلیٰ فرد ہے، لیکن قتال تو کافروں سے ہوتا ہے، مسلمانوں سے نہیں ہوتا، البتہ

آپ مسلمانوں میں جاری گناہوں کے خلاف قلمی اور زبانی جدوجہد کرکے جہاد کر سکتے ہیں۔

پھر میں نے ان صاحب کو یہ بھی بتلایا کہ جہاد وقتال سے اصل مقصود اعلائے کلمۃ اللہ ہے، نہ کہ صرف شہید ہو جانا، اور جہاد وقتال کے اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے اگر شہادت حاصل ہو جائے، تو وہ بھی بہت بڑی نعمت ہے، لیکن جہاد کے اس مقصودِ اصلی کو نظر انداز کر کے کسی بھی طرح صرف قتل ہو جانے، اور شہید ہو جانے کو مقصود بنا لینا اور پھر اسی جذبہ کے تحت یہ عمل کرنا جہاد کے اصل مقصود کو نہ سمجھنا ہے۔[1]

اور آپ کو دنیا کے مسائل ومصائب سے تنگ آ کر موت کا متلاشی نہیں ہونا چاہئے، بلکہ صبر وہمت سے حالات کا مقابلہ کر کے اپنی زندگی کی قدر کرنی چاہئے، اور نیک اعمال کے ذریعہ سے اپنی آخرت کو درست کرنا چاہئے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے، نہ ناری ہے

میری تمام تر گفتگو سننے کے بعد اس نوجوان نے کہا کہ آپ کی باتیں سُن کر مجھ پر حقیقت کھلی، ورنہ وہ مولوی صاحب تو مجھے قبر میں پہنچا کر ہی دَم لیتے۔

اسی طرح ایک اور نوجوان نے مجھے ایک مرتبہ بتلایا کہ میں ایک مرتبہ ایک مولوی صاحب کے بیان میں شریک ہوا، رمضان کا مہینہ اور آخری عشرہ تھا، اور اس دن اس مسجد میں ختم قرآن کی

---

[1] چنانچہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:
قتل سے مراد خودکشی نہیں ہے، بلکہ مراد قتال ہے، یعنی لڑو جنگ کرو، اس نیت سے کہ جان اور مال اور ایمان بچ جائے، پھر اس قتال میں اگر جان چلی جائے، تو چلی جائے، وہ شہادت ہے اور خود قتل مقصود نہیں ہے، وہ بھی جبکہ اس قتال کی سب شرطیں پائی جائیں اور موانع مرتفع ہوں جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں ہے اور خود قتل کا مقصود نہ ہونا، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں ہر جگہ یُقْتَلُوْنَ (بصیغۂ مجہول) بعد میں ہے یَقْتُلُوْنَ (بصیغۂ معروف) پہلے، پس معلوم ہوا کہ یُقْتَلُوْنَ (یعنی قتل ہونا) خود مقصود، نہیں، بلکہ یَقْتُلُوْنَ (یعنی قتل کرنے) سے کبھی لازم آجاتا ہے (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۱ص ۱۰۷، ۱۰۸، ملفوظ نمبر ۱۱۶، بعنوان ''آج کل کے لیڈر اور سیاسی تحریکات کے بارے میں حضرت کا تفصیلی نقطہ نظر'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ)

تقریب تھی، اور میں ان مولوی صاحب کے بیان کی شہرت سن کر ان کے بیان میں شرکت کے لئے گیا تھا، ختمِ قرآن کے بعد مولوی صاحب نے ان سورتوں کی تفسیر بیان کی اور رات کے تین بجے تک سلسلہ جاری رہا، اور مولوی صاحب نے ہر سورت اور ہر آیت سے جہاد و قتال کو ثابت کیا، اور لوگوں کو اس کا جوش و جذبہ دلایا اور معاشرہ میں بے حیائی اور بے غیرتی اور فسق و فجور کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی دعوت دی، جس کو سُن کر مجھے اتنا جوش پیدا ہوا کہ دل قابو میں نہیں آ رہا تھا، اور بار بار تقاضا پیدا ہو رہا تھا کہ اسی وقت اُٹھ کر باہر جاؤں، اور ماروں، یا پھر مر جاؤں، یا کوئی بم پھاڑ کر بازار میں پھرنے والی ان بے پردہ خواتین اور بدنظری میں مبتلا لوگوں کے پرخچے اُڑا دوں۔

مگر میرے ساتھ ایک میرے دوست تھے، جب میں نے اپنے ارادہ کا ان پر اظہار کیا، تو انہوں نے مجھے اس کام سے روکا۔

انہوں نے مجھے کہا کہ اتنا بڑا اقدام کسی مستند عالمِ دین سے مشورہ کئے بغیر نہیں اُٹھانا چاہئے، زندگی ایک ہی مرتبہ ملتی ہے، بار بار نہیں ملتی، لہٰذا اپنی قیمتی جان کو اسی طرح گنوا دینا ٹھیک نہیں۔

پھر میں نے بعض علماء سے اپنا ارادہ ظاہر کر کے معلوم کیا، تو انہوں نے اس سے منع کیا، اور کہا کہ یہ طریقہ صحیح نہیں، بلکہ آپ کو ہمت و حوصلہ اور صبر و تحمل کے ساتھ رہنا چاہئے، اور زبانی و قلمی جہاد کرنا چاہئے۔

اندازہ لگایئے کہ ہمارے یہاں اس قسم کے مولوی بھی ہیں کہ جو جہاد و قتال کے عنوان سے لوگوں اور بالخصوص کم علم نوجوانوں کو جوش و جذبہ دلا کر غلط راستہ پر لگاتے ہیں، اور قرآن مجید کو ڈھال بناتے ہیں، بھلا قرآن مجید کی آخری سورتوں میں جو کہ مکی ہیں، قتال کا ذکر کہاں سے آ گیا، جہاد و قتال کا حکم اپنی جگہ ہے، لیکن ہر جگہ اور ہمیشہ ہاتھ کے ذریعہ سے منکرات کے روکنے کو جہاد و قتال کا درجہ دینا صحیح نہیں، اور خواہ جہاد و قتال کا معاملہ ہو، یا کسی اور چیز کا، شریعت نے ہر چیز کے کچھ اصول و آداب اور قواعد و شرائط اور حدود مقرر کی ہیں، ان کو کسی بھی

طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے معاشرہ میں یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ یا تو شریعت کے کسی حکم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، اور جب اہمیت دیتے ہیں، تو پھر جوش وجذبہ میں آ کر اس کی حدود سے بھی آگے گزر جاتے ہیں، گویا کہ کبھی افراط کی خرابی میں مبتلا ہوتے ہیں، تو کبھی اس کو چھوڑ کر تفریط کی خرابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور اس مثال کا حصہ بن جاتے ہیں کہ: ع

کنویں میں سے نکلے، تو کھائی میں جا پڑے

اور بہر صورت راہِ اعتدال سے محروم رہتے ہیں، اور اس کی بنیادی وجہ شریعت کی تعلیمات سے پوری طرح واقف نہ ہونا، اور اپنے نفس کی اصلاح نہ کرانا ہے۔

چنانچہ جہاد کا مسئلہ ہو، یا دعوت وتبلیغ کا، یا پھر سیاست کا ہر شعبہ میں آج کل افراط وتفریط سامنے آ رہی ہے، اور اعتدال پر قائم رہنے والے حضرات عنقاء ہیں، اور جب بھی ضلالت و گمراہی نے دنیا میں جنم لیا، وہ یا افراط کی شکل میں جنم لیا، یا پھر تفریط کی شکل میں جنم لیا۔

اس لئے موجودہ دور کے بعض جذباتی حضرات، جو کم علم اور بالخصوص کم عمر نوجوانوں کو جہاد و قتال کے نام پر شہادت کے فضائل کے ذریعہ سے جذبہ پیدا کر کے غیر شرعی جہاد پر اُبھارتے ہیں، ان کو اپنے اس طرزِ عمل کی اصلاح کرنی چاہئے، اور مسلمانوں کی جان و مال کے غلط استعمال کرانے کی صورتوں سے بچنا چاہئے۔

ورنہ کل قیامت کے دن ان کے جوش وجذبہ دلانے کے نتیجہ میں اپنی جان کی قربانی دینے والے نادان اور کم علم مسلمانوں کے خون اور اس کے نتیجہ میں دوسرے مسلمانوں کے مالی و جانی نقصان سے اپنے نامۂ اعمال سیاہ کرنے کے وبال سے بچنا مشکل ہوگا۔

ہم افسوس کے ساتھ اس بات کے کہنے پر مجبور ہیں کہ ہمارے یہاں ایک مدت سے دین کے نام پر طاقت کا غلط اور بے جا استعمال ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کی جانی و مالی اور ایمانی طاقتیں اور صلاحیتیں کسی تعمیری کام میں استعمال وخرچ نہیں ہو رہیں۔

کاش کہ مسلمانوں کی اس طرح وقتاً فوقتاً استعمال ہونے والی یہی طاقت وصلاحیت جوش کے بجائے ہوش کے ساتھ اور نادانی وجہالت کے بجائے، علم کی روشنی میں استعمال ہو، اور ملک وملت کی تعمیر وترقی اور فلاح وبہبود کا حصہ بنے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ہر شعبۂ زندگی سے متعلق شریعت کے احکام کا صحیح اور مکمل علم حاصل کر کے، اس کو اعتدال کے ساتھ انجام دینے کی توفیق عطاء فرمائے، اور افراط وتفریط کی خرابیوں سے حفاظت فرمائے، اور کم علم مقتداؤں کے فتنوں سے امت کو محفوظ فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 7 شمارہ 1، جنوری 2010ء- محرم الحرام 1431ھ)

---

(59)

علماء کو وقت کے ضیاع اور فضول اختلاط سے بچنے کا حکم

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

آج کل لوگ وقت کی قدر ہی نہیں جانتے، حالانکہ زندگی کی ہر گھڑی، ہر سیکنڈ اور منٹ اتنا قیمتی ہے کہ ساری دنیا بھی اس کی قیمت نہیں ہوسکتی، مرتے وقت اس کی قدر معلوم ہوگی کہ ہائے ہم سے کتنا بڑا خزانہ فضول برباد ہوگیا، اس وقت آپ تمنا کریں گے کہ کاش ہم کو ایک دو منٹ کی اور مہلت مل جائے، وقت آنے کے بعد نہ ایک منٹ اِدھر ہوسکے گا، نہ اُدھر، غرض وقت بہت قابلِ قدر چیز ہے، لیکن لوگ اس کی قدر نہیں کرتے، فضول باتوں میں ضائع کردیتے ہیں (تحفۃ العلماء، ج۱، استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے ص۱۷۳، بحوالہ التبلیغ ج۲۰ ص۱۴۸، بعنوان: ''وقت کی قدر وقیمت''، باب ۱۲: اہلِ علماء وطلباء کے لیے ضروری اور مفید باتیں، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

اگرچہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے وقت کی قدر نہ کرنے کی شکایت عام لوگوں سے فرمائی ہے، مگر آج بکثرت دیکھنے میں آرہا ہے کہ بہت سے اہلِ علم حضرات بھی اس تضییعِ اوقات کا شکار ہیں، جو فضول باتوں میں بڑا وقت ضائع کردیتے ہیں، اگر وہ یہی وقت مطالعہ، درس وتدریس، اور تبلیغ وتصنیف میں خرچ، یا پھر ذکر وعبادت میں صرف کیا کریں، تو کتنا فائدہ ہو۔

اور حضرت موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں:

بے کار وقت کھونا نہایت برا ہے، اگر کچھ بھی کام نہ ہو تو انسان گھر کے کام میں لگ جائے، گھر کے کام میں لگنے سے دل بھی بہلتا ہے، اور عبادت بھی ہے، یہ مجمعوں میں بیٹھنا خطرہ سے خالی نہیں، کسی کی حکایت، کسی کی شکایت، بعض مرتبہ غیبت تک نوبت آجاتی ہے، اس سے اجتناب کی ضرورت ہے (تحفۃ العلماء، ج۱، استاد اور شاگرد کے حقوق اور تعلیم وتربیت کے طریقے ص۱۷۴، بحوالہ الافاضات، بعنوان: ''بے کار وقت کھونا، اور ادھر ادھر ملنا جلنا، گھومنا پھرنا''، باب ۱۲: اہلِ علماء وطلباء کے لیے ضروری اور مفید باتیں، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

واقعی حضرت نے درست فرمایا کہ بلاضرورت مجمعوں میں بیٹھنا، اور اختلاط پیدا کرنا خطرہ سے خالی نہیں، کیونکہ اس کے نتیجہ میں تضییعِ اوقات کے علاوہ اور بھی کئی گناہ سرزد ہوتے ہیں، اہلِ علم حضرات کے لئے اس چیز کا اہتمام بہت ضروری ہے کہ وہ تضییعِ اوقات اور فضول اختلاط سے پرہیز کریں۔

واقعہ یہ ہے کہ فضول تعلقات بڑھانے اور اختلاط پیدا کرنے والے حضرات کے اوقات میں قطعاً برکت نہیں ہوتی، اور اگر کوئی ساری زندگی اس میں مبتلا رہے، تو واقعی اس کی ساری زندگی اسی طرح گزر جاتی ہے، نہ تو دین کا کام صحیح طور پر ہو پاتا، اور نہ دنیا کا۔

اللہ تعالیٰ وقت کے ضیاع اور فضول اختلاط سے بچنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 7 شمارہ 2، فروری 2010ء- صفر المظفر 1431ھ)

www.idaraghufran.org

(60)

سجدۂ تلاوت سے متعلق ایک مسئلہ کی وضاحت

ہماری کتاب ''ماہِ رمضان کے فضائل واحکام'' مطبوعہ، رجب ۱۴۳۰ھ کے صفحہ ۳۴۸، و۳۴۹ پر تراویح میں سجدۂ تلاوت سے متعلق احکام کے ذیل میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ:

اگر نماز میں سجدہ کی آیت کے بعد تین آیتوں سے زیادہ پڑھ چکا ہو، تو اب اس سجدہ تلاوت کا وقت جاتا رہا، اب یہ سجدہ تلاوت نہ نماز میں اداء ہوسکتا، اور نہ نماز کے باہر، بلکہ اب صرف توبہ واستغفار کرنا چاہئے (محمودیہ بحوالہ محیط)

یہ مسئلہ دراصل حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب مدظلہم (دارالعلوم کراچی) کی تصنیف ''تراویح کے اہم مسائل'' سے ماخوذ ہے، جس میں تحریر ہے کہ:

آیتِ سجدہ کے بعد فوراً ہی سجدہ تلاوت کرنا افضل ہے، لیکن اگر نماز میں آیتِ سجدہ کے بعد سجدۂ تلاوت نہ کیا، بلکہ رکوع کرلیا، اوراس میں اس سجدہ تلاوت کی نیت کرلی، تب بھی سجدۂ تلاوت اداء ہوجائے گا، اوراگر رکوع میں نیت نہیں کی تواس کے بعد نماز کے سجدہ سے بلانیت بھی یہ سجدۂ تلاوت اداء ہوجائے گا۔

لیکن یہ جب ہے کہ آیتِ سجدہ کے بعد تین آیتوں سے زیادہ نہ پڑھا ہو، اگر آیتِ سجدہ کے بعد تین آیتوں سے زیادہ پڑھ چکا ہو، تو اب اس سجدۂ تلاوت کا وقت جاتا رہا، نہ نماز میں اداء ہوسکتا ہے، نہ خارجِ نماز، بلکہ توبہ واستغفار کرنا چاہئے (فتاویٰ محمودیہ بحوالہ محیط)

(فقہی رسائل، جلدِ اول، صفحہ ۳۰۱، تراویح کے اہم مسائل۔ مطبوعہ: میمن اسلامک پبلشرز، کراچی، اشاعت جنوری ۱۹۹۸)

ابتداء میں یہ مسئلہ مذکورہ کتاب سے اعتماد کی بنیاد پر اخذ کیا گیا تھا، اور تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔

اب اس مسئلہ کی تحقیق کی گئی، تو اس میں وضاحت کی ضرورت پیش آئی۔

مذکورہ مسئلہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر نماز میں آیتِ سجدہ تلاوت کرنے کے بعد تین آیتوں سے زیادہ پڑھ چکا ہو، تو اب اس سجدۂ تلاوت کی ادئیگی کی کوئی صورت نہیں۔

جبکہ کتبِ فقہ حنفی میں مراجعت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ طویل فصل (جس کی مقدار بعض حضرات نے تین آیات سے زائد بیان فرمائی ہے) کے بعد، بلکہ دوسرے رُکن، یا دوسری رکعت میں پہنچنے کے بعد، اور اس سے بڑھ کر سلام پھیرنے کے بعد بھی، جب تک نماز کے منافی وخلاف کوئی عمل نہیں کیا، اُس وقت تک اس سجدۂ تلاوت کا وجوب اور اس کی ادائیگی کا وقت باقی رہتا ہے، اگرچہ طویل فصل کے بعد یہ حیّزِ قضاء میں داخل ہو جاتا ہے۔

اور حیّزِ قضاء میں داخل ہونے کے بعد قضاء کرنے کی صورت میں سجدۂ سہو بھی واجب ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] (وهی علی التراخی) علی المختار ويكره تأخيرها تنزيها، ويكفيه أن يسجد عدد ما عليه بلا تعيين ويكون مؤديا وتسقط بالحيض والردة (إن لم تكن صلوية) فعلى الفور لصيرورتها جزئا منها ويأثم بتأخيرها ويقضيها ما دام فی حرمة الصلاة ولو بعد السلام فتح ثم هذه النسبة هی الصواب، وقولهم صلاتية خطأ قاله المصنف لكن فی الغاية أنه خطأ مستعمل وهو عند الفقهاء خير من صواب نادر(الدرالمختار)

(قوله فعلى الفور) جواب شرط مقدر تقديره فإن كانت صلوية فعلى الفور ح ثم تفسير الفور عدم طول المدة بين التلاوة والسجدة بقرائة أكثر من آيتين أو ثلاث على ما سيأتی حلية.

(قوله ويأثم بتأخيرها إلخ) لأنها وجبت بما هو من أفعال الصلاة .وهو القرائة وصارت من أجزائها فوجب أداؤها مضيقا كما فی البدائع ولذا كان المختار وجوب سجود للسهو لو تذكرها بعد محلها كما قدمناه فی بابه عند قوله بترك واجب فصارت كما لو أخر السجدة الصلبية عن محلها فإنها تكون قضاء، ومثله: ما لو أخر القرائة إلى الأخريين على القول بوجوبها فی الأوليين وهو المعتمد . أما على القول بعدمه فيهما فهی أداء فی الأخريين كما حققناه فی واجبات الصلاة فافهم.

(قوله ولو بعد السلام) أی ناسيا ما دام فی المسجد وروی أنه لا يسجد بعد السلام ناسيا تتارخانية.

(قوله ثم هذه النسبة هی الصواب) أی قول المصنف صلوية برد ألفه واوا وحذف التاء، وإذا كانوا قد حذفوها فی نسبة المذكر إلى المؤنث كنسبة الرجل إلى بصرة فقالوا بصری لا بصرتی كی لا تجتمع تائان فی نسبة المؤنث فيقولون بصرتية فكيف بنسبة المؤقت إلى المؤنث فتح(ردالمحتار، ج۲، ص ۱۰۹، و ۱۱۰، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

بندہ کے نزدیک یہی راجح ہے، اور سابقہ ماہِ رمضان کے مذکورہ ایڈیشن میں منقول مسئلہ مرجوح ہے۔

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

(علی الفور من قراءة آية) أو آيتين وكذا الثلاث على الظاهر كما فى البحر (الدرالمختار)

(قوله على الظاهر كما فى البحر) أى عن البدائع والمتبادر من عبارته أنه استظهار من صاحب البدائع، لا أنه ظاهر الرواية وفى الإمداد الاحتياط قول شيخ الإسلام خواهر زاده بانقطاع الفور بالثلاث .وقال شمس الأئمة الحلوانى: لا ينقطع ما لم يقرأ أكثر من ثلاث وقال الكمال بن الهمام: قول الحلوانى هو الرواية .اهـ

قلت: وصرح فى شرح المنية بأنه الأصح رواية، فإن محمدا نص على أنه إذا بقى بعد السجدة آيات من آخر السورة أى كسورة الانشقاق وسورة بنى إسرائيل إن شاء ختم السورة وركع لها وإن شاء سجد لها ثم قام فأكمل السورة ثم ركع اهـ ومثله فى الفتح .لكن فى البحر عن المجتبى أن الركوع ينوب عنها بشرط النية وأن لا يفصل بثلاث إلا إذا كانت الثلاث من آخر السورة .اهـ

ومقتضاه: أن الخلاف فيما فى وسط السورة وأن هذه وفاقية وبه صرح فى الحلية عن الأصل وغيره؛ نعم قال بعده إن الفرق ظاهر الوجه .قلت: قد يوجه بأن قراءة الثلاث من آخر السورة لا تفصل لأنها إتمام للسورة وعدم رفض باقيها فكان فى قراءتها زيادة طلب فلم تفصل بخلاف الثلاث من وسط السورة فإنه ليس فيها زيادة طلب لعدم ما ذكرنا فعدت فاصلة تأمل (ردالمحتار، ج٢ص ١١١،١١٢، كتاب الصلاة ، باب سجود التلاوة)

وأما المتلوة فى الصلاة فإنها تجب على سبيل التضييق لقيام دليل التضييق، وهو أنها وجبت بما هو من أفعال الصلاة وهو القراءة فالتحقت بأفوالها وصارت جزئا من أجزائها؛ ولهذا قلنا إذا تلا آية السجدة، ولم يسجد، ولم يركع حتى طالت القراءة ثم ركع ونوى السجدة لم تجز، وكذا إذا نواها فى السجدة الصلبية؛ لأنها صارت دينا، والدين يقضى بما له لا بما عليه (البحر الرائق شرح كنز الدقائق، ج٢،ص ١٢٩ ، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة)

(قوله وأما المتلوة فى الصلاة إلخ) قال فى الشرنبلالية يجوز أن يقال تجب الصلاتية موسعا بالنسبة لمحلها كما لو تلا فى أول صلاته وسجدها فى آخرها اهـ.

ولا يخفى ما فيه؛ لأنه يلزم عليه أنه لا يأثم فى هذه الصورة، وهو خلاف المنصوص عليه بل تصير قضاء ويأثم بتأخيرها كما يفيده كلام المؤلف هنا وسيصرح به عن البدائع فى شرح قوله، ولم تقض الصلاتية خارجها ويجب عليه سجود السهو لو تذكرها فى آخر صلاته فى الأصح كما قدمناه فى باب السهو، وهذا عين التضييق فكيف يكون موسعا بالنسبة للصلاة وكأنه أراد أن يفرق بين التضييق فى الصلاتية والتضييق فى غيرها عند آخر العمر بأنه فى الأولى يمكن التدارك بالقضاء ما دام فى حرمة الصلاة فكان فيه نوع توسعة بخلاف الثانى ولكن هذا القدر لا يسوغ إطلاق أن

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

البتہ اس سلسلہ میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ صُلبِ صلاۃ، یعنی نماز والے سجدہ، بلکہ رکوع میں نیت کرنے سے، اس سجدۂ تلاوت کی ادائیگی اُس وقت تک معتبر ہوتی ہے، جب تک آیتِ سجدہ کی قرائت اور صُلبِ صلاۃ کے سجدہ کے درمیان طویل مدت وفصل حائل نہ ہوا ہو، جس کی مقدارِ مشہور تین آیات سے زائد کی قرائت ہے، اور طویل مقدار کے فصل کے بعد صُلبِ صلاۃ کے سجدہ سے اس سجدۂ تلاوت کی ادائیگی معتبر نہیں ہوتی۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

الوجوب فيها موسع فتدبر(منحة الخالق على البحر الرائق، ج٢، ص ١٢٩، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة)

قال محمد رحمه الله فى الأصل: إذا سلم ساهياً وعليه سجدة، فهذه المسألة لا تخلو إما أن يكون عليه سجدة تلاوة أو سجدة صلبية أو سجدة سهو، وأياً ما كان، فإنه يأتى بها؛ لأنه فى حرمة الصلاة بعد؛ لأن سلام الساهى لا يجزئه عن حرمة الصلاة، وإذا لم يخرجه عن حرمة الصلاة صار وجود هذا السلام والعدم بمنزلة، ولو لم يوجد السلام أليس إنه يأتى بها، كذا ها هنا(المحيط البرهانى، ج ١ ص ٥١٥، كتاب الصلاة، الفصل السابع عشر فى سجود السهو)

تنبيه إنما قال المصنف خارجها لأنها تقضى داخلها بأن أخرها حتى طالت القرائة فإنها تصير قضاء ولكنه يسجدها فيها أما إذا لم تطل القرائة فينوب عنها سجود الصلاة ولو من غير نية وقدمنا عن الدراية أنه يقضيها ما دام فى حرمة الصلاة ولو بعد السلام ما لم يأت بمناف اهـ(حاشية الطحطاوى على المراقى، ص٤٩٣، كتاب الصلاة، باب سجود التلاوة)

[1] (وأما) فى الصلاة فإنها تجب على سبيل التضييق لقيام دليل التضييق وهو أنها وجبت بما هو من أفعال الصلاة وهو القرائة فالتحقت بأفعال الصلاة وصارت جزئا من أجزائها ولهذا يجب أداؤها فى الصلاة ولا يوجب حصولها فى الصلاة نقصانا فيها، وتحصيل ما ليس من الصلاة فى الصلاة إن لم يوجب فسادها يوجب نقصانا، وإذا التحقت بأفعال الصلاة وجب أداؤها مضيقا كسائر أفعال الصلاة بخلاف خارج الصلاة؛ لأن هناك لا دليل على التضييق ولهذا قلنا إذا تلا آية السجدة فلم يسجد ولم يركع حتى طالت القرائة ثم ركع ونوى السجود لم يجزه.

وكذا إذا نواها فى السجدة الصلبية؛ لأنها صارت دينا والدين يقضى بما له لا بما عليه والركوع والسجود عليه فلا يتأدى به الدين على ما نذكر ولهذا قلنا: إنه لا يجوز التيمم للتلاوة فى المصر؛ لأن عدم الماء فى المصر لا يتحقق عادة والجواز بالتيمم مع وجود الماء لن يكون إلا لخوف الفوت أصلا كما فى صلاة الجنازة والعيد ولا خوف ههنا لانعدام وقت معين لها خارج الصلاة فلم يتحقق التيمم طهارة والطهارة شرط لأدائها بالإجماع(بدائع الصنائع ج ١ ص ١٨٠، كتاب الصلاة، فصل سجدة التلاوة)

وأما بيان وقت أدائها فما وجب أداؤها خارج الصلاة فوقتها جميع العمر؛ لأن وجوبها على التراخى على ما مر.

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

اوراس صورت میں صُلبِ صلاۃ کے سجدہ سے ادائیگی نہ ہونے کی وجہ فقہاء نے یہ بیان کی ہے کہ وہ سجدہ اس پر دَین ہوگیا ہے، اور دَین اسی عمل سے اداء ہوسکتا ہے، نہ کہ اُس چیز سے جو اُس پر پہلے سے واجب ہو، اور صُلبِ صلاۃ کا سجدہ اس پر پہلے سے واجب ہے، لہٰذا اس صورت میں بمالہٖ سے ہی دَین کی ادائیگی ہوگی، اور مستقل سجدہ بمالہٖ میں داخل ہے، فافترقا۔

اور غالبًا اسی صُلبِ صلاۃ کے مسئلہ سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس فصل کے بعد مطلقاً سجدۂ تلاوت کی ادائیگی کو غیر معتبر سمجھ لیا، حالانکہ صُلبِ صلاۃ کے سجدہ سے ادائیگی ہونے، نہ ہونے کا مسئلہ الگ ہے، اور خود مستقل سجدۂ تلاوت کے ذریعے سے ادائیگی ہونے نہ ہونے کا مسئلہ اس سے الگ ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب تک نماز میں قرائت کی ہوئی آیتِ سجدہ کو زیادہ وقت نہ گزرا ہو، جس کی مشہور مقدار تین آیات سے زائد ہے، اُس وقت تک اس سجدہ کے اداء ہونے کا وقت باقی رہتا ہے، اور اس وقت تک، جس طرح یہ سجدہ مستقل سجدۂ تلاوت کے کرنے سے اداء

﴿ گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ ﴾

وأما ما وجب أداؤها فی الصلاة فوقتها فور الصلاة؛ لما مر أن وجوبها فی الصلاة علی الفور وهو أن لا تطول المدة بین التلاوة وبین السجدة، فأما إذا طالت فقد دخلت فی حیز القضاء وصار آثما بالتفویت عن الوقت، ثم الأمر فی مقدار الطول علی ما ذکرنا من اختلاف المشایخ(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ج ۱، ص ۱۹۱، و ۱۹۲، فصل فی بیان وقت أداء سجدة التلاوة)

ولو لم یرکع حتی طالت القرائة لم یجز، وإن نواه عن السجدة، وکذا السجدة الصلبیة لا تنوب عنها إذا طالت القرائة؛ لأنها صارت دینا لوجوبها مضیقا والدین یقضی بما له لا بما علیه والرکوع والسجود علیه فلا یتأدی به الدین(البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ج ۲، ص ۱۳۳، کتاب الصلاة، باب سجود التلاوة)

وقد صرحوا بأنه إذا لم یسجد ولم یرکع حتی طالت القرائة ثم رکع ونوی السجدة لم یجز، وکذا إذا نواها فی السجدة الصلبیة؛ لأنها صارت دینا علیه، والدین یقضی بما له لا بما علیه، والرکوع والسجود علیه کذا فی البدائع فی فصل کیفیة وجوبها، وسیظهر أن قول الحلوانی هو الروایة إن شاء الله تعالی .هذا وما ذکر من الإجماع علی عدم الاحتیاج إلی النیة فی سجدة الصلاة حالة الفور فی البدائع ما یفید خلافه من ثبوت الخلاف .قال: ثم إذا رکع قبل أن تطول القرائة هل تشترط النیة لقیام الرکوع مقام سجدة التلاوة؟(فتح القدیر لابن الهمام، ج ۲، ص ۱۸، و ۱۹، کتاب الصلاة، باب سجود التلاوة)

www.idaraghufran.org

ہوجاتا ہے، اسی طریقے سے صُلبِ صلاۃ ، یعنی نماز والے سجدہ سے بھی اداء ہوجاتا ہے، اور زیادہ وقت گزرنے کے بعد اس کی ادائیگی کا وقت ختم ہوجاتا ہے، اور یہ قضاء بن جاتا ہے، اور پھر یہ صُلبِ صلاۃ ، یعنی نماز والے سجدہ سے اداء نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے مستقل سجدہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس کے قضاء کرنے کا وقت نماز کا سلام پھیرنے تک باقی رہتا ہے، اور اگر نماز کا سلام پھیر چکا، مگر نماز کے خلاف کوئی عمل (مثلاً چلنا پھرنا، قبلہ سے سینہ پھرنا، وضو توڑنا، بات چیت کرنا) نہیں پایا گیا، اُس وقت تک بھی اس کو قضاء کرنا درست ہوجاتا ہے، اور اس کے قضاء کرنے کی صورت میں سجدۂ سہو بھی حنفیہ کے نزدیک واجب ہوتا ہے، اور اگر کسی نے اس وقت تک بھی سجدہ نہیں کیا، تو اب اس کی قضاء کا وقت بھی ختم ہوجاتا ہے، اور اس کے بعد حنفیہ کے نزدیک فقط توبہ واستغفار سے اس کی تلافی کی صورت باقی رہ جاتی ہے۔

فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم

محمد رضوان۔ ۹/ ربیعُ الآخر ۱۴۳۳ھ۔ 3/ مارچ 2012۔ بروز ہفتہ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 9 شمارہ 5، اپریل 2012ء۔ جمادی الاولیٰ 1433ھ)

---

(61)

مجتہَد ومختلَف فیہ مسائل پر ایک تحریر کا جواب

بعض علمی مسائل پر اختلاف سے متعلق ایک صاحبِ علم کا تفصیلی خط موصول ہوا، جس کے جواب میں درجِ ذیل مضمون تحریر کیا گیا۔ اہلِ علم حضرات کی افادیت کے لئے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی جناب ....صاحب زید مجدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بندہ کے رسالہ ''شرائط التضحیة'' پر جناب کی رائے موصول ہوئی۔

جزاکم اللہ تعالیٰ خیرالجزاء......

جہاں تک جناب کی طرف سے بندہ کے بعض علمی امور ومضامین کی طرف توجہ دلانے کا تعلق ہے، تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ بندہ کے زیرِ ادارت ''ماہنامہ التبلیغ'' اور ادارہ غفران راولپنڈی کی طرف سے شائع ہونے والی کتب ورسائل میں، بندہ کے نام سے جو مضامین شائع ہوتے ہیں، وہ بندہ کے خود ترتیب دیئے اور تالیف کئے ہوئے ہوتے ہیں، جن میں مستدلات وماٰخذ بھی ساتھ ہی مذکور ہوتے ہیں، اور شائع ہونے کے بعد اگر کسی وقت بندہ کو اپنے کسی سابق موقف کی توضیح وتشریح، یا رجوع وغیرہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، تو بندہ مختلف صورتوں میں اس کی وضاحت بھی کرتا رہتا ہے، نیز بعض اوقات اگلی اشاعتوں میں مناسب موقعوں پر حذف، اضافہ واصلاح، اور رجوع کی وضاحت کر دیتا ہے، اور بندہ کسی اور کے مضامین کو اپنے نام سے شائع کرنے کو پسند نہیں کرتا۔

تو اگر آنجناب کے ذکر کردہ مضامین سے اس قسم کے مضامین مراد ہیں، تو بندہ کی طرف ان کی نسبت درست ہے، اور اگر کسی اور جگہ سے شائع ہوئے (اگرچہ بندہ کی طرف سے تا حال بندہ کے مضامین کسی اور ادارہ کو شائع کرنے کی باضابطہ اجازت نہیں) تو جب تک بندہ ان کو دیکھ نہ لے کہ وہ بندہ ہی کے مِن وعَن مضامین ہیں، اس وقت تک ان کی تصدیق مشکل ہے۔

البتہ علمی ومجتہد فیہ امور میں اہل علم حضرات کا باہم اختلاف کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ ہر دور میں رہا ہے، اور اگر وہ اختلاف نیک نیتی کے ساتھ دلائلِ شرعیہ پر مبنی ہو، تو نہ صرف یہ کہ شرعاً مذموم نہیں، بلکہ ہر صاحبِ علم کی اپنی بساط کی حد تک ذمہ داری ہے، اور ایسی صورت میں خطاء ایک اجر کا اور صواب دو اجر کا باعث ہے۔

پھر اختلاف بعض اوقات دلائل کے بجائے اختلافِ امزجہ پر بھی مبنی ہوتا ہے، چنانچہ جس انسان کا جس شعبہ، یا جس ذوق کی بزرگ شخصیت اور جس سلسلہ سے تعلق اور وابستگی ہوتی ہے، فطری طور پر انسان کا اس طرف جھکاؤ ولگاؤ زیادہ ہوتا ہے، اگرچہ فی نفسہٖ اس کے دلائل مرجوح وکمزور کیوں نہ ہوں، اور اس شعبہ سے خصوصی تعلق ولگاؤ کی وجہ سے دوسرے کی

طرف سے بعض قابلِ اصلاح امور پر تنبیہ، یا اختلاف (دلائل مضبوط ہونے کے باوجود بھی) طبعاً ناگوار، یا کمزور محسوس ہوا کرتا ہے۔

لیکن الحمدللہ تعالیٰ بندہ نے قرآن وسنت کی تعلیمات اور اپنے بزرگوں سے جو اعتدال کا راستہ اخذ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ دین کے کسی ایک سلسلہ، یا شعبہ کی طرف کلی طور پر مائل ہونے اور اس میں ہی اپنی صلاحیتوں کا تمام تر زور خرچ کرنے کے بجائے، دین کے جملہ سلسلوں اور شعبوں سے متعلق شریعت کی تعلیمات کو مدِ نظر رکھنا چاہیے، اس وجہ سے بندہ کی تحریرات کا ہدف، یا موضوع تصوف، یا کوئی دوسرا ایک شعبہ نہیں ہے، اور اسی وجہ سے موجودہ وقت تک بندہ کی تقریباً ستّر کے قریب چھوٹی بڑی شائع شدہ تالیفات مختلف موضوعات سے متعلق ہیں، جن میں کئی مضامین اہلِ مدارس وعلماء اور تبلیغ وجہاد، اور سیاست وغیرہ کے مختلف اُمور پر تنبیہ و اصلاح سے بھی متعلق ہیں، اور تزکیہ واصلاحِ نفس، یا اصلاحِ اخلاق سے متعلق ایک تفصیلی کتاب زیرِ تالیف ہے، اور اس کے علاوہ ذکر ودعاء کے فضائل واحکام پر بھی مستقل طور پر کام جاری ہے، پھر اس طرح کے مضامین، یا موضوعات صرف یکطرفہ طور پر شائع نہیں ہوتے، بلکہ ان کے مد مقابل موقف اختیار کرنے والے بھی اپنے مضامین میں اپنا موقف اور دلائل شائع کرتے رہتے ہیں، لہٰذا ایک طرف سے شکایت اور دوسری طرف سے عدمِ شکایت والا طرزِ عمل مبنی بر اعتدال کہلائے جانے کا مستحق معلوم نہیں ہوتا، البتہ ایسے حالات میں جن حضرات کو جس کے موقف ودلائل پر اطمینان ہو، ان کو وہی موقف اختیار کرنا چاہیے، پھر اگر وہ دلائل کے قوی ہونے کی وجہ سے کسی موقف کو اختیار کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی کوئی اور گناہ بھی کرتا ہے، تو اس گناہ کی ذمہ داری، اس شخص پر عائد نہیں ہوتی، جس کے موقف پر اس نے عمل کیا ہے، کیونکہ یہ اس شخص کا اپنا فعل ہے۔

تاہم اجتہادی وعلمی امور سے اختلاف کی کچھ حدود وقیود مقرر ہیں، ان کی پابندی سب پر لازم ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی فریق سے ہو، اور حدود وقیود کی پامالی طرفین سے مذموم ہے۔

اب آنجناب بندہ کے جس طرزِ عمل کو فتنہ، یا سخت خطرہ کا باعث سمجھتے ہیں، وہ آپ کے نزدیک بے شک حق ہو، لیکن اس سے بہر حال دوسرے کا اتفاق ضروری نہیں، کیونکہ اس قسم کے تصورات بعض اوقات ایک خاص مزاج سے ناشی، یا خاص سلسلہ سے وابستہ اور خاص ماحول سے منسلک ہونے کا نتیجہ ہوتے ہیں، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ''وکل حزب بمالدیھم فرحون''

بندہ اپنی حدتک دلائل کے پیشِ نظر اگر کسی چیز میں غلو محسوس کرتا ہے، تو اس کی نشاندہی اور ساتھ ہی اس کے درجہ کی وضاحت بھی کر دیتا ہے، اگرچہ بعض حضرات کو اس مسئلہ میں تخفیف وتسہیل فراہم کرنا محسوس ہو رہا ہو، یا اس کو ملاحظہ کر کے بعض لوگوں کے لئے اس میں رخصت و گنجائش نکل رہی ہو، کیونکہ شریعت کی طرف سے جس عمل کا جو درجہ اور مقام طے ہے، اس عمل کو اس درجہ اور مقام پر رکھ کر انجام دینا ہی دین ہے، اور جس طرح اس میں عملی اعتبار سے افراط وتفریط روا نہیں، اسی طرح نظریاتی اعتبار سے بھی روا نہیں، پس اگر کسی زمان، یا مقام میں کسی مستحب، یا غیر مسنون، یا مسنون، مگر غیر موکد حکم کو نظریاتی، یا عملی طور پر موکد، یا لازم سمجھا جا رہا ہو، تو اس کے موکد ولازم ہونے کی نفی کرنا، اور اس کے درجہ کو واضح کرنا بھی اہلِ علم حضرات کی ذمہ داری میں داخل ہے۔

اور رہا آپ کا مجالسِ ذکر پر کلام، تو اس سلسلہ میں بندہ اپنا موقف شائع کر چکا ہے، جس کے تازہ ایڈیشن میں مدلل مأخذ ومراجع بھی شائع ہو گئے ہیں، اور اس کے دوسرے حصہ کا بھی کافی حدتک کام ہو گیا ہے، جس میں متعلقہ احادیث، ان کی اسنادی حیثیت اور تشریح وتوضیح پر کلام کیا گیا ہے اور اس کی اشاعت ابھی باقی ہے (وہ اب الحمدللہ شائع ہو چکی ہے)

اس موقع پر یہ بات ذکر کرنا بھی مناسب ہے کہ کسی فعل وعمل کی شرعی حیثیت طے ومتعین ہونے کے بعد ہی اس کی ظاہری افادیت وعدمِ افادیت کو قبول، یا رد کیا جا سکتا ہے، اس سے صرفِ نظر کر کے نہیں۔

بندہ نے بحمداللہ تعالیٰ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون سے قرآن مجید کے حفظ کی تکمیل کی، اور

تعلیم کا کچھ حصہ مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ میں حاصل کیا، اوراس کے بعد حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمہ اللہ کے مدرسہ وخانقاہ مفتاح العلوم قصبہ جلال آباد میں درجہ ثانیہ میں داخل ہوکر کئی سال کا عرصہ گزارا، جس میں دورۂ حدیث اورافتاء وتخصص کے شعبوں کی تعلیم بھی داخل ہے، اس عرصہ میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا محمد مسیح اللہ جلال آبادی رحمہ اللہ سے قریبی تعلق قائم رہا، اوراصلاحی مجالس میں باقاعدہ شرکت ہوتی رہی، اور دیگر کئی جید فقہائے کرام اورصوفیائے عظام اور دیوبند و سہارنپور کے مدارس وجامعات سے وابستگی واستفادہ کا تعلق قائم رہا۔

اورحضرت جلال آبادی رحمہ اللہ، نیز حضرت مولانا فقیر محمد صاحب پشاوری رحمہ اللہ کے خلیفۂ اجل حضرت نواب محمد عشرت علی خان قیصر صاحب وحضرت ڈاکٹر تنویر احمد خان صاحب رحمہما اللہ سے بھی تعلق رہا، اوران شخصیات کی اجازت ومشاورت سے بحمداللہ تعالیٰ آج بھی ادارہ غفران میں تزکیہ واصلاح سے متعلق اصلاحی مجلس کا سلسلہ قائم وجاری ہے۔

اس لیے بحمداللہ بندہ کا بچپن سے اب تک صوفیا واولیائے کرام اورفقہائے عظام سے تعلق رہا ہے۔

اورفراغت کے بعد بحمداللہ تعالیٰ دینی وعلمی خدمات سے وابستگی اور زبانی وکلامی کے علاوہ تحریری طور پر بھی اکابر فقہاء وصوفیاء سے استفادہ کا سلسلہ قائم ہے، اورتصوف اورولایت کی غرض وغایت اورطریق کار سے بحمداللہ درجہ بدرجہ شناسائی حاصل ہے۔

یہ سب لکھنے کی ضرورت آنجناب کی طویل تحریر کے نتیجہ میں پیش آئی، تاکہ واضح ہوکہ تصوف اورولایت کو چند علمی اختلافی امور تک محدود کر کے یہ خیال نہ کیا جائے کہ تصوف، یاولایت چند اختلافی ومجتہد فیہ اُمور کے درمیان دائر ہے، اور بندہ تصوف، یاولایت کا نعوذ باللہ تعالیٰ فریق ہے، بلکہ بندہ تو رفیق ہے، البتہ رفقائے کار سے علمی دلائل پر مبنی اختلاف عین دیانت ہے۔

لہٰذا اگر آنجناب کو بندہ کے موقف سے اتفاق نہ ہو، تو کوئی بات نہیں، اختلاف ہوتے ہوئے بھی ان شاء اللہ بندہ کے قلب میں، جناب کا وہی مقام رہے گا، جو اتفاق کی صورت میں ہوتا،

لیکن ایک عالمِ دین کو بہر حال یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس کا تعلق اگر کسی بھی شعبہ، سلسلہ، یا بزرگ سے ہو، وہ اپنی جگہ سہی، لیکن علمی امور پر اس کی ذمہ داری بہر حال پھر بھی باقی رہتی ہے، اور اس کے نتیجہ میں اگر اپنے شیخ واستاذ سے بھی اختلاف کی نوبت آئے تو مذموم نہیں، جس پر ہمارے اکابر کے کارنامے شاہد ہیں، اور بحمد اللہ تعالیٰ بندہ بھی اسی طریقہ پر کار بند رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

جہاں تک آنجناب کی تحریر میں بعض امور پر پیش کردہ دلائل کا تعلق ہے، تو اولاً تو بندہ ان پر اپنے متعلقہ مضامین میں کلام کر چکا ہے، ثانیاً بعض علمی وفقہی امور میں غیر متعلقہ چیزوں کو بندہ دلائل کی فہرست میں شمار نہیں کرتا، اور علمی وفقہی دلائل کے مقابلہ میں ان سے تعرض کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، البتہ کسی اور صاحبِ علم کا یہ ذوق ہو، تو یہ ان کا اپنا معاملہ ہے، اگر وہ ہماری طرف سے پیش کردہ علمی وفقہی دلائل کو اپنے اوپر حجت نہیں سمجھتے، تو انہیں ہم پر اس سے نچلی سطح کے امور کو حجت سمجھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

وکل حزب بمالدیھم فرحون

فقط و اللّٰہ المستعان وعلیہ التکلان .ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ

محمد رضوان۔۱۶/محرم الحرام/۱۴۳۴ھ 20/اکتوبر/2012ء بروز ہفتہ

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

---

(62)

بندہ کی کتب ومضامین سے متعلق اہم انتباہ

بندہ محمد رضوان کے ترتیب دیئے اور تالیف وتصنیف کئے ہوئے مختلف موضوعات پر کئی رسائل وکتب کی اشاعت ہو چکی ہے، جن کے متعلق چند اہم امور پر متنبہ ومتوجہ کیا جاتا ہے:

(1)...... فی الحال بندہ کی طرف سے ادارہ غفران، راولپنڈی کے علاوہ ملک وبیرون ملک

کسی اور ادارہ، یا فرد کو بندہ کی کسی تالیف کی اشاعت کی باضابطہ اجازت نہیں ہے، لہٰذا بندہ کے نام سے کسی دوسری جگہ سے تالیف شدہ کسی کتاب، یا رسالہ، یا اس کے متعلقہ مضامین کی بندہ کی طرف نسبت سے احتیاط کی جائے۔

(2)...... بندہ کی بعض کتب ورسائل کی ایک سے زیادہ مرتبہ اشاعت ہوچکی ہے، اور تقریباً ہر اشاعت کے موقع پر نظرِ ثانی، اصلاح واضافہ کا کام ہوا ہے، لہٰذا اگر بعض نسخوں میں کسی مسئلہ، یا پہلو میں اختلاف وتضاد محسوس ہو، تو آخری اشاعت میں درج تحقیق کو بندہ کی آخری تحقیق سمجھا جائے، اِلَّا یہ کہ بندہ کی بعد کی کسی اور تالیف میں اس مسئلہ کی اصلاح کی گئی ہو، اور اس کا پتہ کتاب، یا مضمون میں کی گئی وضاحت، یا پھر اس کے آخر میں موجود آخری مرتبہ کی تاریخ سے چلایا جاسکتا ہے، جس کا حتی الامکان بندہ اہتمام کرتا رہا ہے۔

اور اصلاح واضافہ، یا سابق قول سے رجوع کرنا، کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ ہر دور میں اہلِ علم حضرات کی طرف سے اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔

(3)...... بندہ کی کسی تالیف میں اگر کوئی ایسی غلطی محسوس ہو کہ جو کتابت کی غلطی سے سرزد ہوگئی ہو، تو اس کو بندہ کا موقف سمجھنے کے بجائے کتابت کی غلطی پر محمول کرنا چاہئے، اور ممکن وسہل ہو، تو بندہ کو بھی مطلع کردیا جائے''جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء''

محمد رضوان۔ مورخہ: ۸/صفر المظفر/۱۴۳۴ھ 22/دسمبر/2012ء بروز ہفتہ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد10 شمارہ2، جنوری2013ء- صفر المظفر 1434ھ)

---

(63)

فروعی مسائل میں تشدد ونکیر سے اجتناب کی ضرورت

دین کے فروعی اور مجتہد فیہ مسائل میں جن میں کہ اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مشہور فقہائے کرام کی آراء مختلف ہیں، ان میں سے کسی قول کے بارے میں بے جا سختی اور تشدد مناسب نہیں، نہ تو

اس سلسلہ کی تبلیغ کرتے وقت اس میں سختی وتشدداور نکیر کا انداز مناسب نہیں، اور نہ ہی عوام میں سے کسی شخص کے دوسرے قول پر عمل کرنے کی صورت میں اس پر بے جا تشدد ونکیر مناسب ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ دوسرے قول کوراجح سمجھ کراس پرعمل کررہا ہو، بلکہ اگرکوئی محقق عالمِ دین تحقیق کے دوران کسی دوسرے فقیہ وامام کے قول کوراجح سمجھے،اوراس پرفتویٰ دے،تو اس پر بھی نکیر نہیں کی جاسکتی،فقہائے کرام کی عبارات میں ان چیزوں کی صراحت ملتی ہے۔

مگرافسوس کہ آج بہت سے حضرات اس سلسلہ میں کئی طرح کی بے اعتدالیوں کا قولاً، یا فعلاً ارتکاب کرتے ہیں، اورفروعی مسائل میں جانبِ مخالف قول کی اس طرح تردید کے درپے ہوتے ہیں کہ جیسا کہ وہ کسی فاسق وفاجراورگمراہ شخص، بلکہ دین کے دشمن کا قول ہو،اوراس پر عمل کرنے والا بھی اس کے نتیجہ میں فاسق اور گناہ گارٹھہرتا ہے،اوراس کے نتیجہ میں دَرپردہ بڑے بڑے فقہاء وصلحاء بھی زد میں آجاتے ہیں۔

اورعلماء کا بڑا طبقہ اس طرح کے فروعی مسائل میں جانبِ مخالف اقوال کی تردید کی تبلیغ میں اپنی صلاحیتوں کوخرچ کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس غلو وتشدد سے حفاظت فرمائے۔04 جنوری 2016ء

(ماہنامہ''التبلیغ'' جلد13 شمارہ5، مارچ2016ء - جمادی الاولیٰ 1437ھ)

---

(64)

فروعی واجتہادی اختلاف کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا خاتمہ فرمادیا،اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح اعلان فرمادیا کہ:

''أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ''

''میں خاتم النبیین ہو، میرے بعد کوئی نبی نہیں''

اب قیامت تک کوئی شخص بھی نبی ہونے کی حیثیت سے نہیں آئے گا،اورتا قیامت نبی صلی

اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کی لائی ہوئی شریعت جاری رہے گی، خواہ وہ حضرت مہدی علیہ الرحمۃ کا دور ہو، یا قربِ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نزول، یا اس کے بھی بعد کا دور ہو، ہر طرح کے پُرفتن دور اور علاقہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وشریعت ہی قابلِ عمل وقابلِ اتباع رہے گی۔

لیکن اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کو اتنا جامع اور ہمہ گیر اور وسیع بنا دیا گیا کہ اس میں بڑے بڑے محدثین، مفسرین اور فقہائے کرام کو سمو دیا گیا، اور ہر صدی میں دین کے مجددِ دین کی شکل میں مختلف شخصیات کی آمد کا انتظام کر دیا گیا، جن کے مزاجوں، کاموں اور فقہی ذوق کو بھی ایک دوسرے سے مختلف رکھ دیا گیا، تاکہ امت کے مختلف زمانے اور طبقے کے لوگ جن کے مزاج، کام اور ذوق ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان سب کے لئے رہنماء ورہبر موجود ہوں، اور اس امت کے کسی علاقہ اور زمانہ کے لوگ رہنمائی اور عمل کرنے سے محروم نہ رہیں، اور ان کے لئے مشکلات سے نجات کا راستہ موجود ہو، اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اجتہادی وفروعی نوعیت کے اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا ہے، اگرچہ بعض لوگ اس رحمت کو زحمت بنائے بیٹھے ہیں، اور وہ امت کی ضرورت کے وقت دوسرے قول کی روشنی میں حل نکالنے کے لئے تیار نہیں، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار ’’یسروا ولا تعسروا ‘‘ فرما کر آسانی پیدا کرنے اور دشواری سے بچنے کا حکم فرمایا ہے، جس کی ذمہ داری بطورِ خاص اہلِ علم حضرات پر عائد ہوتی ہے، اگر وہ اس میں کوتاہی اختیار کریں گے، تو مؤاخذہ کے مستحق ہوں گے۔

بعض اہلِ علم حضرات کی حالت پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ خود تو آسانی وتیسیر کی شکل میں حل نکالنے پر آمادہ نہیں، اور اگر کوئی دوسرا شرعی وفقہی اصول وقواعد کی روشنی میں حل نکالے، تو اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، یہ تعصب اور جمودِ محض ہے، جو شریعت کی نظر میں قابلِ مذمت طریقہ ہے۔

07 جنوری 2016ء

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 13 شمارہ 6، اپریل 2016ء - جمادی الاخریٰ 1437ھ)

---

(65)

علماء کو موجودہ سائنس سے استفادہ کی ضرورت

موجودہ دور کی سائنس چونکہ مشاہدہ اور حقیقت پر مبنی چیزوں کا اعتراف کرتی ہے، اور جو چیزیں مشاہدہ سے خارج ہوتی ہیں، ان کے بارے میں مختلف تخمینے اور تجربے قائم کرتی ہے، اور سائنس کی موجودہ ٹیکنالوجی اور جدید ترین مشینری سے بہت سی ایسی چیزیں معلوم کر لی گئی ہیں، جو پہلے دور میں معلوم نہیں کی گئی تھیں، اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ شریعت اور حقیقت کے ٹھوس دلائل میں کوئی تعارض وٹکراؤ ہرگز نہیں ہوسکتا، بشرطیکہ شریعت کی وہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہو، اور حقیقت بھی واقعہ کے مطابق ہو، تو وہ ایک دسرے کے معارض اور مقابل نہیں ہوسکتے۔

اس اصول کی بنیاد پر اب موجودہ سائنس نے جو بہت سے حقائق معلوم کر لئے، وہ نصوص کے موافق ہیں، اور ان کی وجہ سے شریعت کی بہت سی باتیں، جو بظاہر مشاہدات کی رُو سے سمجھنا مشکل ہوتا تھا، اب مشاہداتی دلائل اور حقائق سے ثابت ہو رہی ہیں، جبکہ بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ جو اجتہادی نوعیت کی حامل تھیں، اور فقہی اعتبار سے ان کا حکم معلوم کرنا مشکل تھا، اب سائنسی حقائق سے ان کے اجتہادی پہلوؤں کا تعین کرنا سہل ہوگیا ہے، اس لئے اہلِ علم حضرات کو موجودہ سائنس کا مطالعہ کر کے ان کی روشنی میں جائزہ لینے اور شرعی امور کو سائنسی حقائق سے بھی ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔

مگر افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں جس کام کی ضرورت تھی، وہ کام ابھی تک نہیں ہوا، اور اہلِ علم حضرات کے علاوہ دیگر عام لوگ جو کام کر رہے ہیں، اس میں قدم قدم پر غلطیاں سرزد ہو رہی ہیں۔

15 جنوری 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 7 مئی 2016ء - رجب المرجب 1437ھ)

www.idaraghufran.org

(66)

بڑے شہروں میں سفر وقصر کا آغاز کب ہوگا

آج کل بعض شہروں کی آبادی بڑی وسیع ہوگئی ہے، اوراتنی زیادہ پھیل گئی ہے کہ بعض اوقات سفر کرنے والے کی مدتِ مسافت کی مقدار اِن شہروں کی آبادی کے اندر ہی پوری ہوجاتی ہے۔

ان حالات میں موجودہ دور کے اہلِ علم واہلِ فقہ حضرات نے اس پر غور کیا کہ ایسے شخص کے مسافر ہونے کا حکم کب شروع ہوگا؟

بعض حضرات نے غوروفکر کر کے یہ قرار دیا کہ گھر سے نکلتے ہی مدتِ مسافت کا آغاز ہوجائے گا، اگرچہ مسافراس وقت ہوگا، جبکہ اپنے شہر کی آبادی سے نکل جائے گا، اور بہت سے حضرات نے یہ قرار دیا کہ جب تک اپنے شہر کی آبادی سے باہر نہیں نکلے گا، اس وقت نہ تو سفر کا آغاز ہوگا، یعنی نہ تو مدتِ مسافت شروع ہوگی اور نہ ہی مسافرت والے احکام قصر وغیرہ کے شروع ہوں گے۔

ہماری تحقیق بھی یہی ہے کہ نہ تو اپنے شہر کی آبادی سے نکلنے سے پہلے مدتِ مسافت کا آغاز ہوگا اور نہ ہی شرعاً مسافر بنے گا، اور نہ ہی نماز میں قصر کرنے کی اجازت ثابت ہوگی، اس موضوع پر بندہ کے کئی علمی وتحقیقی رسائل مختلف اوقات میں شائع ہوئے ہیں، جن میں سے ایک رسالہ کا نام ”**النظر و الفکر فی مبدء السفر و القصر**“ ہے، اورایک رسالہ کا نام ”**بدایة السفر و القصر فی حالة الحضر و المصر**“ ہے۔

اہلِ علم حضرات کے لئے یہ دونوں رسائل قابلِ مطالعہ ہیں، وہ الگ بات ہے کہ کون کس موقف کو ترجیح دیتا ہے، مجھے اپنی رائے پر دوسروں کو پابند کرنے، یا دوسروں کے ساتھ سختی کرنے کا طرزِ عمل مناسب معلوم نہیں ہوتا، اس لئے میں اپنی رائے تو اس طرح کے مسائل میں دلائل کے ساتھ لکھ دیتا ہوں، لیکن مجھے دوسروں کی رائے پر بے جا نکیر کرنا، یا دوسروں کو

اپنی رائے کا پابند و مکلّف کرنے پر اصرار کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

18 جنوری 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 7 مئی 2016ء - رجب المرجب 1437ھ)

---

(67)

علماء کو قرآن وسنت کی طرف رجوع کی ضرورت

آج کل قرآن وسنت سے امت بہت دور ہوگئی ہے، یہاں تک کہ بہت سے علمائے کرام کی بھی قرآن وسنت کے علم کی استعداد کافی حد تک کمزور ہوگئی ہے، اوراس کے برعکس چند قصے، واقعات اور معلومات وغیرہ پر اور علومِ آلیہ پر بہت محنت کی جاتی ہے، جو افسوسناک صورتِ حال ہے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ قرآن وسنت ہی کے ذریعہ بے شمار کفار ومشرکین کو ہدایت حاصل ہوئی، اسی کے ذریعہ سے بے شمار یہود ونصاریٰ کو اسلام کی توفیق ہوئی، اور بے شمار مسلمانوں کی نہ صرف یہ کہ اصلاح ہوئی، بلکہ وہ لا متناہی منازل طے کرکے کہیں سے کہیں جا پہنچے، جہاں تک آج کے دور کے رائج تمام تر علوم کے ماہرین نہیں پہنچ سکے، اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ ان کے سامنے قرآن وسنت کی سرتا پا ہدایت پر مشتمل تعلیمات وہدایات موجود تھیں، جن سے وہ براہِ راست سیراب ہوا کرتے تھے، اوراپنے ہر مسئلہ کا حل تلاش کیا کرتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ آج دنیا جہان کی کتابوں میں مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے، مگر صلاحیت موجود ہونے کے باوجود قرآن وسنت سے استفادہ نہیں کیا جاتا، جس میں اہلِ علم کا بڑا طبقہ بھی داخل ہے کہ اس کو بھی قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کی کم ہی توفیق ہوتی ہے، اگرچہ زبانی دعوے اس کے متعلق بہت ہوتے ہیں۔ 29 جنوری 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 8 جون 2016ء - شعبان المعظم 1437ھ)

---

www.idaraghufran.org

(68)

اہلِ علم کو آئینِ پاکستان کو ملاحظہ کرنے کی ضرورت

مدت سے خواہش ہے کہ پاکستان کے مدارس اور جامعات میں کم از کم پاکستان کے آئین کی تعلیم ہو، جس کے مرتب کرنے میں بڑے بڑے بزرگ اور اصحابِ علم شامل رہے ہیں۔

علماء کو چاہئے کہ وہ پاکستان کے آئین کی تشریح اور توضیح بھی کریں، اور جو باتیں تنقیح طلب ہیں، ان پر مزید کام کریں، اور پاکستان کے آئین کو سامنے رکھ کر پاکستان میں تعمیر وترقی کے لئے سنجیدہ کوششیں کریں۔

لیکن بہت سے علماء کی موجودہ حالت کو دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ ان کو پاکستان کے آئین اور دستور کو ملاحظہ کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی، اور اوپر سے اپنی تحریر وتقریر میں ان چیزوں کے خلاف جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں، جن کے بارے میں ان کے بزرگوں اور اہلِ علم حضرات نے مثبت رائے قائم کردی ہے۔

مثلاً آج دینداروں اور اصحابِ علم کا بڑا طبقہ، ووٹوں کے ذریعہ حکومت کے انتخاب کا سختی سے مخالف ہے، اور اس کے خلاف خوامخواہ کے دلائل قائم کر کے اپنا وقت ضائع کرتا ہے، جبکہ پاکستان کے آئین اور دستور میں ووٹوں کے ذریعہ حکومت کے انتخاب کا ذکر موجود ہے، جو بڑے بڑے بزرگوں واہلِ علم حضرات کا تصدیق شدہ ہے۔

البتہ کسی چیز سے جزوی درجہ کا اختلاف، یا کسی چیز کے استعمال اور طریقِ کار میں قابلِ اصلاح پہلوؤں کا معاملہ الگ نوعیت رکھتا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصل چیز ہی کی مخالفت شروع کردی جائے۔

30 جنوری 2016ء ہفتہ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 8 جون 2016ء - شعبان المعظم 1437ھ)

(69)

مفتی کو فقہ اور حالاتِ حاضرہ کے علم کی ضرورت

مفتی کو فقہ کے ساتھ ساتھ عرفِ زمانہ اور حالاتِ حاضرہ سے واقفیت اور تعارف، بہت ضروری ہے، اس کے بغیر فتویٰ وتحقیق کا صحیح طور پر کرنا، جس سے لوگوں کی ضروریات پوری ہوں، اور مشکلات دور ہوں، از حد دشوار ہے۔

مگر آج کل ہر شعبہ میں افراط وتفریط کی فراوانی ہے، اگر کسی کو فقہ کا علم ہوتا ہے، تو اس کو عرف وحالاتِ حاضرہ سے واقفیت نہیں ہوتی، اور حالاتِ حاضرہ سے واقفیت ہوتی ہے، تو فقہ کا صحیح علم نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے گڑبڑ پیش آتی ہے۔

اور آج کل جس طرح جگہ جگہ مدارس میں تخصص کا کورس عام ہوگیا ہے، اور اس کے نتیجہ میں تھوک کے حساب سے مفتیانِ کرام کی کھیپ تیار ہورہی ہے، ان میں سے اکثر مفتیانِ کرام تو مفت کے ہی مفتی ہوتے ہیں، جن کو قیمتی کے مقابلہ میں مفتی کہنا چاہئے، اور یہ حضرات جس طرح فقہ کے صحیح علم سے کورے ہوتے ہیں، اسی طرح عرفِ زمانہ اور حالاتِ حاضرہ سے بھی واقف نہیں ہوتے، اور اوپر سے عوام کے ساتھ حرص وطمع کا تعلق رکھتے ہیں، بلکہ ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال ہڑپ کرتے ہیں، گزشتہ دنوں ہمارے ملک بھر میں بڑے بڑے نامی گرامی مفتیوں کا مضاربہ سکینڈل عوام کے سامنے آیا، جس میں اچھے اچھوں کے مفتی، اور عالم اور بزرگ ہونے کی قلعی کھل گئی، ایسے لوگ کیا خاک دین کی خدمت اور تحقیق کریں گے، اور ان سے امت کے مسائل اور مشکلات کے حل کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ امت کی اس طرح کے نااہل لوگوں سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

یکم فروری 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 8، جون 2016ء - شعبان المعظم 1437ھ)

(70)

تحقیق واجتہاد کے لئے اجتماعیت

آج کل اجتہاد وتحقیق کا کام مل کر اور اجتماعی انداز میں کرنے کی بہت ضرورت محسوس ہوتی ہے، مگر اس کام کے لئے باصلاحیت اور مخلص ومحنتی افراد کا ملنا بہت مشکل ہوتا ہے، کئی مرتبہ میں نے یہ کوشش کی کہ اہلِ علم حضرات کی ایک جماعت اہم فقہی وتحقیقی اور علمی کاموں پر مل کر کام کرے، اور اس کے لئے محدود پیمانہ پر مختلف اجتماعات بھی اپنے طور پر منعقد کئے، لیکن وہی بات ہوئی کہ ''نشستن، گفتن، برخواستن'' اور بقول بعض ایک اضافہ یہ بھی ضروری، بلکہ مقدم ہے کہ ''خوردن'' کیونکہ اس کے بغیر تو آج کل اجتماع بھی مشکل ہوتا ہے۔

امت کو اس وقت جس طرح کے کام کی ضرورت ہے، بندہ کو وہ مقصد اجتماعی طور پر مل کر کرنے سے حاصل ہونا مشکل ہوا، یہاں تک کہ خود کام کر کے بھی دوسروں کی خدمت میں جوابی لفافوں وغیرہ کے ساتھ پیش کئے گئے، مگر اکثر مقامات سے ''جواب ندارد'' ہی کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا، اس لئے بالآخر بعض بزرگوں کے مشورہ سے یہی طے کیا کہ جتنا اور جس طرح کا کام خود سے ہو جائے، وہ کر لیا جائے، اور اس کام میں دوسروں سے مشاورت و استفادہ، جس انداز کا بھی ہو جائے، وہ کافی ہے۔

اور اگر اپنی کوشش کرنے کے باوجود کسی کی طرف سے مثبت ومنفی کسی قسم کی رائے سامنے نہ آئے، تو بھی دوسروں کے انتظار میں اپنے کام کو موقوف نہ رکھا جائے، پھر کسی مرحلہ پر کوئی رائے سامنے آئے، تو اس پر غور کیا جاتا رہے۔

دوسروں کے انتظار میں کام روک کر رکھنے سے، اکثر اوقات تاخیر، یعنی مؤخر ہونا، تو لازم آتا ہی ہے، تعطیل، یعنی کام کا معطل ہونا بھی لازم آ جاتا ہے۔

اس لئے ایک عرصہ سے جو کام بندہ اپنی حسبِ توفیق کرتا ہے، وہ اپنے قریبی احباب، بلکہ

اپنے چھوٹوں کو بھی دکھالیتا ہے، اور نظرِ ثانی و مشاورت کے بعد اور بعض اوقات دیگر حضرات کی خدمت میں ارسال کر کے جواب آئے، یا نہ آئے، بہر حال اس کو شائع کر دیتا ہے۔

البتہ مالا یدرک کله لا یترک کله کے تحت پھر بھی مختلف اہلِ علم حضرات کو ادارہ میں مدعو کر کے ایک ہلکی پھلکی مجلس قائم کر کے کام کرنے کی کوشش جاری ہے۔

08 فروری 2016ء، مجلسِ خاص

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 10، اگست 2016ء - شوال المکرّم 1437ھ)

---

(71)

ایک معترض کے اعتراض پر تبصرہ

میری ایک کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی اور فکرِ ولی اللّٰہی'' سے متعلق کراچی کے ایک نوجوان جذباتی عالمِ دین کا خط آیا تھا، جس میں انہوں نے اپنے دل کا غبار نکالا تھا، اور مجھے جواب دینے کا حکم بھی صادر فرمایا تھا، میں نے ان کو سنجیدہ جواب تحریر کر دیا تھا، مگر شاید انہوں نے سنجیدگی کو کمزوری پر محمول کیا، اس لئے پھر دوبارہ اس طرح کا ایک اور جذباتی خط لکھا، مگر پہلا اور دوسرا خط دلائل سے عاری وخالی اور صرف تنقید برائے تنقید پر مشتمل تھا، اس لئے محسوس ہوا کہ ان صاحب کو تو سمجھانا، یا قائل کرنا مشکل ہے، اور ان کے ساتھ اُلجھنا تضییعِ اوقات محسوس ہوا، البتہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں ان کے بعض اعتراضات کا اصولی انداز میں جواب شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اس لئے بندہ نے ان کے خط کا مکمل جواب لکھ کر اپنے ایک بزرگ کی خدمت میں ساری صورتِ حال پیش کی، تو انہوں نے ذاتی امور کا جواب حذف کر کے صرف اصولی باتوں کا جواب دینے کی رائے دی، جس کے مطابق بندہ نے عمل کیا، اب بحمداللہ تعالیٰ وہ کتاب دوبارہ شائع ہو چکی ہے۔

آج کل یہ مرض بہت عام ہوگیا ہے کہ جب اپنے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی، تو انسان خوامخواہ دوسرے کے خلاف اعتراض کرنے بیٹھ جاتا ہے، حالانکہ اختلاف برائے اختلاف اچھی چیز نہیں، اور اس سے کبھی فائدہ نہیں ہوتا، اور اگر اس طرح کے معترض کے جواب کے درپے ہوا جائے، تو خوامخواہ وقت ضائع ہوتا ہے، اور اختلاف میں شدت پیدا ہوتی ہے۔

ایسے حالات میں انسان کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، اور بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ کسی اللہ والے بزرگ کا دامن تھامے رکھنے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔

08 فروری 2016ء، مجلسِ خاص

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 10، اگست 2016ء - شوال المکرّم 1437ھ)

---

(72)

بحث ومباحثہ سے پرہیز کی افادیت

ایک صاحب نے میری ایک کتاب کے بعض مضامین پر خوامخواہ کے اعتراضات لکھ کر بھیجے تھے، اور مجھے خط کے ذریعہ سے جواب لکھنے کا حکم بھی تحریر کیا تھا، ان کے اعتراضات میں کیونکہ بندہ کو زیادہ وزن نظر نہیں آیا تھا، بلکہ بظاہر اعتراض برائے اعتراض مقصود تھا، اس لئے اس تحریر کے جواب پر دل آمادہ نہ تھا، لیکن کیونکہ صاحبِ علم تھے، اور جواب کا انہوں نے حکم بھی فرمایا تھا، اس لئے میں نے ان کے خط کے جواب میں مہذب انداز میں چند باتیں لکھ دی تھیں، تاکہ اگر واقعتاً کوئی شبہ ہو، تو دور ہو جائے۔

لیکن انہوں نے سمجھا کہ شاید میں نے دوسرے کو دبا لیا، اس لئے پھر دوسری مرتبہ انہوں نے اسی طرح کا خط لکھا، بندہ نے اس خط کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا، البتہ ان صاحب کے خط میں مذکور چند شبہات کے جواب پر مشتمل ایک تحریر اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے ضمیمہ میں شائع کرنے کا ارادہ کیا، اس تحریر میں نام کے بغیر ان صاحب کے خط اور ان کے

بے جا اعتراضات کا اجمالی ذکر بھی تھا، جس کے شائع کرنے پر مجھے اطمینان نہ تھا، بلکہ کچھ تردد محسوس ہورہا تھا، کیونکہ یہ انداز بندہ کے عام معمول سے کچھ مختلف تھا، میں نے ان کے دونوں خط اور اپنا جوابی خط اور یہ تحریر اپنے شیخ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی کو بغرضِ اصلاح ارسال کی، جس پر حضرت والا نے فرمایا کہ اس خط کا حوالہ اور ذکر کئے بغیر اور ذاتی چیزوں کے جوابات سے تعرض کیے بغیر، چند شبہات کا ازالہ مناسب ہے، ورنہ بحث ومباحثہ طول پکڑے گا، اور فائدہ نہ ہوگا، حضرت والا کی رہنمائی کے مطابق میں نے فوراً اس مضمون کی اصلاح کی، اور وہ تمام غیر متعلقہ چیزیں بالکل حذف کردیں، اور بحمد اللہ تعالیٰ دل کو اطمینان ہوگیا، اب الحمد للہ تعالیٰ یہ کتاب اس مضمون اور ضمیمہ کے ساتھ دوبارہ شائع بھی ہوگئی ہے، بزرگوں کی اصلاح ورہنمائی سے انسان کو بڑے فوائد حاصل ہوتے ہیں، اور کئی قسم کے فتنوں سے حفاظت رہتی ہے۔

مگر آج کل کسی سے اصلاح طلب کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں کی جاتی، اور بعض لوگ بزرگوں سے برائے نام، یا صرف رسمی تعلق رکھتے ہیں، جس سے اصلاح کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اصلاح کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

21 فروری 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 14 شمارہ 1، اکتوبر 2016ء - محرم الحرام 1438ھ)

---

(73)

اہلِ علم کے لئے مختلف اُردو فتاویٰ کا ایک نقصان

آج کل اُردو زبان میں بہت سے فتاویٰ چھپ کر منظرِ عام پر آگئے ہیں، اور روز بروز نئے فتاویٰ آتے جارہے ہیں، جن سے اگرچہ جزوی فوائد کے حاصل ہونے میں تو شبہ نہیں، لیکن ان کا ایک نقصان یہ سامنے آرہا ہے کہ موجودہ دور کے بہت سے مفتیانِ کرام نے اصل

مآخذ ومراجع، دلائل اور امہاتِ کتب سے مراجعت ترک کردی ہے، اور صرف اُردو فتاویٰ پر تکیہ اور سہارا حاصل کرکے بیٹھ گئے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں استعدادیں کمزور رہنا شروع ہوگئی ہیں، جس طرح سے اس سے پہلے درسِ نظامی کی اُردو شروحات سے استعدادوں کو نقصان پہنچا تھا کہ خود اصل کتابوں سے عبارات نکال کر اور ان کو حل کرنے کی محنت کمزور ہوگئی تھی، اسی طرح اب اُردو فتاویٰ سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ بعض اوقات ایک سوال، کسی خاص پسِ منظر اور مخصوص عرف وحالات پر مبنی ہوتا ہے، اور اس کا جواب بھی اسی تناظر میں ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر اس طرح کا سوال کسی دوسرے پسِ منظر اور دوسرے عرف وحالات پر مبنی ہو، تو اس کا جواب بھی اسی تناظر میں ہونا چاہئے، لیکن آج کل کے عام مفتی ان چیزوں پر نظر کئے بغیر جو بھی سوال آتا ہے، اس کا جواب گزشتہ کسی فتوے سے مِن وعَن اور جوں کا توں نقل کردیتے ہیں، جس کی وجہ سے کئی مشکلات پیش آتی ہیں، اور بے اعتدالیاں پیدا ہوتی ہیں، یہ طرزِ عمل افتاء کے آداب کے خلاف ہے۔ 08 فروری 2016ء، مجلسِ خاص

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 10، اگست 2016ء - شوال المکرّم 1437ھ)

---

(74)

فتاویٰ کے سلسلہ میں ایک تجربہ کی بات

فتاویٰ اور مسائل کے شعبہ میں کام کرنے اور اس شعبہ کے ساتھ وابستگی کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ چالیس سال کی عمر سے پہلے انسان اور مفتی میں جذبات کا غلبہ ہوتا ہے، اور عقل میں پختگی زیادہ نہیں ہوتی، اور جب چالیس سال کی عمر ہوجاتی ہے، تو عقل پختہ ہوجاتی ہے، اور اسی عمر میں عام طور پر انبیاء اور رسولوں کو بھی نبوت ورسالت سے سرفراز فرمایا جاتا ہے، اور ان پر وحی کا آغاز ہوتا ہے، قرآن مجید میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔

www.idaraghufran.org

چنانچہ ارشاد ہے کہ:

حَتّٰی إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (سورة الاحقاف، رقم الآية ۱۵)

ترجمہ: یہاں تک کہ جب پہنچ جاتا ہے وہ جوانی کو، اور پہنچ جاتا ہے وہ چالیس برس کو، تو کہتا ہے کہ اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کئے ہیں، میں ان کا شکر گزار بنوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جن کو تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں صلاح (وتقویٰ) دے، میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں (سورہ احقاف)

اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثاء کے لئے بھی یہی عمر خصوصی وراثت واہلیت کی حامل ہوگی۔

اسی وجہ سے چالیس سال کی عمر سے پہلے کے فتاویٰ اور تحقیق میں اور چالیس سال کی عمر کے بعد کے فتاویٰ وتحقیق میں واضح فرق نظر آتا ہے۔

اس لئے میرا تجربہ یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر سے پہلے جہاں تک ممکن ہو، تجربہ کار اور پختہ عمر کے بزرگ فقیہ کی نگرانی، یا کم از کم مشاورت سے کام کرنا چاہئے، بندہ نے خود بھی اس پر عمل کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے، اور تصنیف وتالیف کے سلسلہ میں بندہ نے جو کام چالیس سال کی عمر سے پہلے کیا تھا، اس کی بعد میں نظرِ ثانی کر کے حذف واصلاح کے ساتھ شائع کیا ہے، اور کچھ کام ابھی بھی جاری ہے، جس سے کافی بہترائی محسوس ہوئی، اس لئے یہ مفید تجربہ دوسروں تک پہنچانا بھی مناسب معلوم ہوا۔ 09 فروری 2016ء، مجلسِ خاص

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 10، اگست 2016ء - شوال المکرّم 1437ھ)

(75)

عوامی مسائل میں عدمِ تشدد کی ضرورت

مفتی اور عالمِ دین کو اس بات کا لحاظ کرنا بہت ضروری ہے کہ عوام الناس کے حالات کو ملحوظ رکھ کر مسائل کا حل بیان کیا کرے، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مبتلیٰ بہ ایمان وعمل کے اعتبار سے غیر معمولی کمزور ہوتا ہے، اور اسے اگر مشکل قول کے مطابق حکم بتلایا جاتا ہے، تو نتیجتاً وہ کسی غلط مسلک والوں کی طرف رجوع کرتا ہے، یا پھر بالکل آزاد ہوکر نفس وشیطان کی خواہش کے مطابق عمل کرتا ہے، اور اس کے بجائے اگر اس کے لئے اپنے فقہ میں رہتے ہوئے کسی قول، یا اہلُ السنۃ والجماعۃ کے اور کسی فقہ کے مطابق حکم بتلایا جائے، تو اس کی ضرورت بھی پوری ہوجاتی ہے، اور مذکورہ خرابیوں سے بھی حفاظت رہتی ہے۔

اگرچہ اس طرزِ عمل سے آج بہت سے اہلِ علم اختلاف رکھتے ہیں، اور اس کو تلفیق اور ہوائے نفس وغیرہ کا عنوان دیتے ہیں، مگر بندہ دلائل کے پیشِ نظر جس موقف کو راجح سمجھتا ہے، وہ بندہ نے عرض کردیا ہے، تفصیل اور دلائل کا یہ موقع نہیں، بندہ نے اپنی متعدد تصانیف وتحریرات میں اس پر اجمالی روشنی ڈالی ہے، اور بعض تصانیف میں تفصیلاً بھی روشنی ڈالنے کا ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔ 09 فروری 2016ء، مجلسِ خاص

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 11، ستمبر 2016ء - ذوالقعدۃ/ ذوالحجہ 1437ھ)

---

(76)

دینی مدارس وجامعات میں اصلاح وتربیت

آج کل عموماً دینی مدارس وجامعات میں اکثر وبیشتر اصلاح وتربیت کا نظام بہت کمزور پڑ گیا ہے، اسی وجہ سے پہلے اور آج کے زمانہ کے اہلِ علم حضرات کے کام اور عمل میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔

پہلے زمانہ میں مدارس وجامعات میں اصلاح وتربیت کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی، مگر اب اکثر وبیشتر اصل کام یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ بس تعلیم اور حلِ سبق صحیح ہو، اسی چیز کی بنیاد پر مدارس اور جامعات کی تعریف وتوصیف کی جاتی ہے کہ فلاں مدرسہ وجامعہ میں تعلیم بڑی اچھی ہے، لیکن اصلاح وتربیت کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، جو کہ قابلِ افسوس صورتِ حال ہے۔

09 فروری 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 11، ستمبر 2016ء - ذوالقعدۃ/ ذوالحجہ 1437ھ)

---

(77)

دینی نصاب کی موجودہ تقاضوں کے مطابق ضرورت

اہلِ علم حضرات نے ہر زمانہ میں اس دور کے تقاضوں کے مطابق تعلیمی نصاب مرتب ومنتخب کیا ہے، اور موجودہ زمانہ میں جس تیزی سے انقلاب پیدا ہو رہا ہے، وہ اس بات کا زیادہ متقاضی ہے کہ موجودہ دور کے نصاب کو موجودہ حالات اور تقاضوں کے مطابق مرتب کیا جائے، جس کو پڑھ کر ایسے اہلِ علم حضرات تیار ہوں، جو موجودہ زمانہ کے مختلف شعبہائے زندگی میں رہنمائی بلکہ قیادت وسیادت کا فریضہ سرانجام دے سکیں، اور عامۃُ النّاس کو راہِ حق پر لانے کی کوشش کریں۔ 09 فروری 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 11، ستمبر 2016ء - ذوالقعدۃ/ ذوالحجہ 1437ھ)

---

(78)

خدماتِ فقہاء کی قدر وقیمت

اللہ تعالیٰ نے فقہائے کرام سے اجتہاد کے ذریعہ ایسا کام لیا ہے کہ مختلف حالات میں ان سے امت رہنمائی حاصل کرتی ہے، اور اس کے ذریعہ سے امت کے مسائل کا حل نکلتا ہے۔

www.idaraghufran.org

یہی وجہ ہے کہ جب عرف وحالات بدلتے ہیں، تو معتبر فقہائے کرام میں سے کسی نہ کسی قول کے مطابق اس کا حل نکل آتا ہے۔

اور تجربہ سے ثابت ہوا کہ فقہائے کرام میں سے ہر ایک کے قول پر کسی نہ کسی شکل میں دنیا میں عمل ہو رہا ہے، اور ان کے اقوال امت کے عمل کے ذریعہ سے کسی نہ کسی جگہ زندہ وتابندہ ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ کچھ لوگ تو فقہائے کرام کی خدمت کو اہمیت ہی نہیں دیتے، اور وہ اس عظیم خدمت کا انکار کرتے ہیں۔

اور اہلِ علم حضرات کا ایک طبقہ اس سلسلہ میں خاص قسم کے جمود وخمود کا شکار ہے، اور وہ فقہائے کرام کے وسیع تر اقوال کو ملاحظہ کرنے ہی کے لئے تیار نہیں، اور اس کی نظر مخصوص اقوال تک ہی محدود ہے، اور اوپر سے اس قسم کے اقوال پر جمود کو اکابر کے ساتھ وابستہ رہنے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعادت سمجھتا ہے، مگر یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتا کہ وہ اکابر اگر موجودہ زمانہ میں ہوتے، اور موجودہ حالات کا مشاہدہ کرتے، تو کیا وہ بھی اسی جمود کے طرزِ عمل کو اختیار کرتے، ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانہ میں یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا کہ حالاتِ حاضرہ اور عرفِ موجودہ کو نظر انداز کر کے جمود اختیار کیا ہو، جیسا کہ ان کے حالات وخدمات سے واضح ہے کہ انہوں نے مشکلات کا حل نکالا، جبکہ اس کے برعکس اور موجودہ حضرات کے جمود والے طرزِ عمل سے کئی قسم کی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس جمود وخمود سے نکلنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ 10 فروری 2016ء

(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد 13 شمارہ 11، ستمبر 2016ء - ذوالقعدۃ/ذوالحجہ 1437ھ)

---

(79)

تحقیقی کام کے لئے یکسوئی کی ضرورت

تحقیقی وعلمی کام کے لئے یکسوئی بہت ضروری ہے، جب تک یکسوئی نہ ہو، صحیح نہج پر تحقیقی وعلمی

کام کا ہونا بہت مشکل ہے۔

جب انسان یکسو ہوتا ہے، تو اس کا ذہن مسئلہ کے متعلقہ پہلوؤں تک رسائی کرتا ہے، اور شرح صدر کے ساتھ کام کرتا ہے، ورنہ سرسری اور سطحی کام تو ہو جاتا ہے، مگر کئی متعلقہ پہلوؤں کی طرف توجہ نہ ہونے سے گڑبڑ ہو جاتی ہے، اور اس کا بعد میں احساس ہوتا ہے، مگر بعد میں پھر از سرِنو اس مسئلہ میں اپنے آپ کو کھپانا پڑتا ہے، اور اس کا بعد میں موقع مشکل حاصل ہوتا ہے۔

ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، اور وہ کام اسی وقت ٹھیک اور صحیح طریقہ پر ہو پاتا ہے، بعض اوقات تحقیقی وعلمی کام کے دوران، نفس راہِ فرار اختیار کرتا ہے، اور اس کام کو دوسرے وقت پر ٹال دینے کی رائے دیتا ہے، پھر نفس کے اس تقاضہ پر عمل کرنے سے بعض اوقات وہ کام مؤخر ہونے کے بجائے معطل ہو کر رہ جاتا ہے، اور اگر اسی وقت ذرا سی مزید ہمت کر لی جائے، تو وہ کام ادھورا نہیں رہتا، اور ٹھکانے لگ جاتا ہے، علمی وتحقیقی کام کرنے والوں کو ان چیزوں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اور جو چیزیں یکسوئی میں مخل ہوں، ان سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے، بعض اوقات اہم علمی وتحقیقی کام کے لئے کچھ سنن ومستحبات کو بھی ترک کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً نکاح وغیرہ کی تقریب میں شرکت وغیرہ وغیرہ۔

9 مارچ 2016ء

(ماہنامہ "التبلیغ" جلد 14 شمارہ 1، اکتوبر 2016ء - محرم الحرام 1438ھ)

---

(80)

دماغی کام کرنے والوں کو مقویات اور چہل قدمی کی ضرورت

جو حضرات بیٹھ کر دماغی اور دینی کام کرتے ہیں، ان کو مقویٔ دماغ اشیاء کا استعمال کرنا چاہئے، اور ہوا خوری اور سبزہ زار جگہوں کی سیر، نقل وحرکت و چہل قدمی وغیرہ کا بھی معمول بنانا چاہئے، ورنہ آہستہ آہستہ دماغ کمزور ہو جاتا ہے، اور ایک جگہ بیٹھے رہنے اور دماغی کام کرتے

رہنے سے ایک عرصہ کے بعد دماغ پر خاص مضر اثرات پڑنے لگتے ہیں، اور صحت بگڑنے لگتی ہے، جس کے بعد کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ 11 فروری 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 13 شمارہ 11، ستمبر 2016ء - ذوالقعدۃ/ذوالحجہ 1437ھ)

---

(81)

مقررین اور واعظین کے لئے اہم ہدایت

آج کل ہمارے سلسلے کے بہت سے خطباء اور مقررین اکثر ایسے موضوعات اور مضامین کا انتخاب کرتے ہیں کہ جن سے مخاطبین کی اصلاح نہیں ہوتی، البتہ اس طرح کی باتیں سُن کر دوسرے مسلک کے لوگوں کے خلاف جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔

تبلیغ کا یہ طریقہ سراسر سنت اور انبیائے کرام صلی اللہ علیہم وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے خلاف ہے کہ جس میں مخاطب تو اصلاح سے محروم رہے، اور الٹا اس کو دوسروں کے خلاف بھڑکا دیا جائے۔

میری تو رائے یہ ہے کہ علمائے کرام کو اس وقت تک فراغت کی سند جاری نہ کی جائے، جب تک ان کو تبلیغ کی عملی تربیت نہ فراہم کر دی جائے، اور یہ تربیت سنجیدہ بزرگوں اور تربیت یافتہ بڑوں کی نگرانی میں ہونی چاہیے۔

اور تربیت کی یہ تجویز میری طرف سے کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ دنیا کے سارے شعبوں میں یہی صورتِ حال ہے کہ تربیت یافتہ اور تجربہ کار ماہرین کی زیرِ نگرانی جب تک اس کام کی عملی تربیت نہیں دے دی جاتی، اس وقت تک اس کو اس کام کا اہل نہیں سمجھا جاتا، پھر دین اور علمِ دین کے معاملہ کو اتنا ہلکا کیوں سمجھا جاتا ہے کہ اس میں باقاعدہ تربیت دیئے بغیر سندِ فراغت دیدی جائے، اور وہ پھر من مانی کے ساتھ تبلیغ کی مسند پر بیٹھ جائے۔

ایسے بہت سے واقعات آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں کہ غیر تربیت یافتہ اور اناڑی مبلّغ و مقرر کی تبلیغ وتقریر سے بڑے فتنے اور جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور عوام میں اشتعال، یا

اہلِ علم حضرات سے نفرت وکراہیت پیدا ہوتی ہے، یہ سب کچھ تربیت نہ ہونے کے ثمرات ونتائج ہیں۔12فروری2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد14 شمارہ1 اکتوبر2016ء - محرم الحرام1438ھ)

---

(82)

موجودہ دور میں ضعیف احادیث کی نشاندہی کی ضرورت

ضعیف احادیث کے بارے میں اہلِ علم حضرات کے بڑے طبقہ کی رائے یہ ہے کہ بعض شرائط کے ساتھ فضائل کے باب میں ان کو بیان کرنا جائز ہے، تاکہ نیک اعمال کی طرف رغبت پیدا ہو۔

لیکن ان ضعیف احادیث کے ثبوت پر عقیدہ رکھنا خلافِ احتیاط ہے۔

مگر آج کل تحقیق کی کمی اور علم کی کمزوری کی بناء پر عوام میں بہت سی ضعیف، بلکہ شدید ضعیف احادیث کے ثبوت کا عقیدہ پایا جاتا ہے، اور قوی اور ضعیف میں امتیاز کئے بغیر ان کو ایک درجہ میں رکھا جاتا ہے، جبکہ قوی اور ضعیف احادیث کا ایک درجہ نہیں ہے، اس لئے میرا ذوق یہ ہے کہ حتی الامکان ضعیف حدیث کا ضعف بیان کر دیا جائے، تاکہ اس کو قوی کا درجہ حاصل نہ ہو۔

جبکہ بعض اہلِ علم حضرات اس ذوق سے اختلاف کرتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ ضعیف احادیث کے ضعف کو بیان نہ کیا جائے، ورنہ ضعیف احادیث پر لوگوں کی عقیدت کمزور پڑ جائے گی، میں اس کے جواب میں کہا کرتا ہوں کہ ضعیف حدیث کے متعلق عقیدہ کمزور ہی ہونا چاہئے۔

ضعیف حدیث کے ضعف کو سن کر اس پر عقیدہ کا ضعیف ہونا ہی مطلوب ہے، پھر اس میں کیا خرابی ہے۔10مارچ2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد14 شمارہ2، نومبر2016ء - صفر المظفر 1438ھ)

---

(83)

تشدد وانتہاء پسندی کی ایک مثال

ہمارے یہاں ایک جذباتی طبقہ، تشدد وانتہاء پسندی پر اُترا ہوا ہے، جس میں دیندار اور اہلِ علم حضرات بھی معتد بہ مقدار میں شامل ہیں، ابھی چند سال پہلے پنجاب کے گورنر کو ایک سیکورٹی گارڈ نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا، اور اس کی وجہ اس گورنر کی طرف سے گستاخِ رسول ہونے کا مرتکب قرار دی گئی تھی، جس کے بعد عدالت نے اس سیکورٹی گارڈ کو پھانسی کی سزا سنائی، اور اس کو پھانسی دے دی گئی، اور اس طرح دونوں فریقین اب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، اور عالمِ برزخ میں پہنچ چکے ہیں، ایسے حالات میں سلامتی اور عافیت اسی میں تھی کہ ان دونوں حضرات کے معاملات کو آخرت پر چھوڑ دیا جاتا، اور ''مضیٰ ما مضیٰ'' اور ''لها ما كسبت و عليها ما اكتسبت'' پر عمل کر کے، اب اس موضوع کو طول دینے سے اجتناب کیا جاتا، مگر ابھی چند روز پہلے سیکورٹی گارڈ کی رسمِ چہلم کے موقع پر راولپنڈی میں جمِ غفیر جمع ہوا، اور اسلام آباد، یا پارلیمنٹ ہاؤس کی طرف مارچ کرتا ہوا پہنچا، سرکاری املاک کی توڑ پھوڑ کی گئی، مختلف بس سروسز بھی اس ہنگامہ آرائی کی وجہ سے کئی دن تک بندر ہیں، جس سے ہزاروں نہیں، لاکھوں لوگوں کو تکلیف و ایذاء پہنچی، دراصل یہ سب کچھ تشدد وانتہاء پسندی کی مثالیں ہیں، جس کے آئے دن ہمارے یہاں مختلف نمونے سامنے آتے رہتے ہیں۔30 مارچ 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 14 شمارہ 3، دسمبر 2016ء - ربیع الاول 1438ھ)

---

(84)

دورِ صدیقی، یا فاروقی

ایک بزرگ یہ فرمایا کرتے تھے کہ موجودہ دور، دورِ فاروقی کے بجائے دورِ صدیقی سے

مناسبت رکھتا ہے، اور پھر اس کی تشریح یہ فرمایا کرتے تھے کہ دورِ صدیقی میں مسلمانوں کی اندرونی اصلاح پر کام ہوا، گویا کہ داخلہ پالیسی درست کی گئی، اس کے بعد دورِ فاروقی شروع ہوا، تو تیزی کے ساتھ فتوحات ہوئیں، اور اسلام بڑی تیزی سے پھیلا، اور غیر مسلم جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے، اور گویا کہ خارجہ پالیسی کامیاب ہوئی، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ داخلہ پالیسی جب درست اور کامیاب ہوتی ہے، تو خارجہ پالیسی پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

جس طرح سے پہلے گھر کا ماحول اور نظام درست ہوتا ہے، تب اس گھر سے اچھے اور تربیت یافتہ افراد تیار ہو کر باہر نکلتے ہیں، اور محلّہ اور علاقہ پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مگر اس کے برعکس آج بہت سے مسلمان یہ سمجھتے، یا چاہتے ہیں کہ خود صحیح اور درست ہوئے بغیر غیر مسلموں کو درست کر دیں، اور انہیں اسلام میں داخل کریں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پاکستان اور دوسرے بے شمار ملک عطاء فرما رکھے ہیں، مسلمانوں کو چاہئے کہ جو علاقے ان کو حاصل ہیں، ان کے نظام کو درست اور ٹھیک کریں، اور اس کے بجائے غیر مسلموں کے زیرِ قبضہ علاقوں کو فتح اور حاصل کرنے کی جدوجہد اور کوشش کرنا اور اسی میں اپنی صلاحیتوں کو کھپانا درست طرزِ عمل نہیں، واقعی ان بزرگوں نے بڑی کام کی بات فرمائی۔

31 مارچ 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 14 شمارہ 3، دسمبر 2016ء - ربیع الاول 1438ھ)

---

(85)

بزرگوں اور بڑوں کے حقیقی ادب واحترام کا فقدان

آج کل بزرگوں اور اپنے بڑوں کا حقیقی ادب واحترام اور ان کا ڈر وخوف کمزور پڑ گیا ہے، بلکہ بعض جگہ تو معاملہ برعکس ہے، بڑوں کو اپنے چھوٹوں کو خوش رکھنے کے لئے ان سے ڈرنا اور

ادب والا رویہ رکھنا پڑتا ہے، بعض رسمی مشائخ اپنے مریدین کو خوش رکھنے اور ان کی ناراضگی سے بچنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرتے ہیں، بہت سی جگہ استاذ اور والدین اور شوہر کو بھی یہی رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے، اسی الٹی روش کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے کہ ؎

عورت تو ہے مردانی اور مرد زنانہ ہے   لاحول ولاقوۃ کیا الٹا زمانہ ہے

یہ سب زمانہ کی نیرنگی ہے، پہلے زمانہ میں بزرگوں اور بڑوں کا ادب واحترام اور ڈروخوف بہت تھا، یہاں تک کہ بڑوں کی موجودگی میں گھر کے اندر کوئی ناول، ڈائجسٹ وغیرہ کا لانا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا، اور ایسی چیزوں کو گھر میں لانے اور رکھنے کی ہمت وجرأت نہیں ہوتی تھی۔ بعض گھرانوں میں مرد کو ٹوپی، یا عورتوں کو پردہ کے بغیر گھر میں داخل ہونے کی ہمت وجرأت نہیں ہوتی تھی، مگر اب گھر گھر ٹی وی اور کیبل وغیرہ آ گیا ہے، جس کو بڑے چھوٹے، مرد وعورت سب مِل بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔

اور اصل بات یہ ہے کہ بڑوں نے بھی اس طرح کی حرکات کر کے اپنی بڑائی اور ادب واحترام کو خود نقصان پہنچایا ہے، اس لیے اب چھوٹوں کو ان کا ڈروخوف نہیں رہا۔

بڑوں کے حقیقی ادب کو کمزور بلکہ ختم کرنے میں میڈیا کا کردار بڑا اہم رہا ہے، کیونکہ میڈیا میں ایسے پروگراموں کو بہت ہوا دی جاتی ہے، جن میں بڑوں کے ادب کو جوتوں کی نوک پر اچھالا جاتا ہے۔

اور جو لوگ آج بڑوں کا ادب کرتے ہیں، ان میں بڑوں کا غیر رسمی، یعنی حقیقی ادب کرنے والے کم ہیں، زیادہ تر ایسے لوگ ہیں، جو دیکھا دیکھی اور رسمی انداز کا ادب کرتے ہیں، ادب کے حقیقی تقاضوں سے وہ بھی محروم، بلکہ لاعلم ہیں۔

چنانچہ بعض لوگ بزرگوں کی صرف جوتی اٹھالینے، یا کسی بھی فقہی اور علمی مسئلہ میں اختلاف نہ کرنے کو ادب سمجھتے ہیں، خواہ بڑوں کا وہ مسئلہ دلائل سے مرجوح کیوں معلوم نہ ہو رہا ہو، یہ طرزِ عمل قابلِ اصلاح ہے۔   02 اپریل 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 14 شمارہ 4، جنوری 2017ء - ربیع الآخر 1438ھ)

---

(86)

اکابر سے فقہی اختلاف، عظمت کے منافی نہیں

کسی شرعی و فقہی مسئلہ میں اکابر اور اپنے بڑوں سے نفسِ اختلاف، ان اکابر کی عظمت و عقیدت، بلکہ ان سے محبت کے منافی اور خلاف نہیں، جبکہ دلائل اور نیک نیتی پر مبنی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بہت سے شاگرد اور مرید تھے، جن میں حضرت امام ابو یوسف، حضرت امام محمد اور حضرت امام زفر رحمہم اللہ بھی داخل ہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان سب حضرات کے استاذ، مربی اور اکابر میں سے تھے، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ان شاگردوں، مریدوں اور اصاغر نے بہت سے مسائل میں حضرتِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف کیا، اور یہ اختلاف بھی مختلف نوعیّتوں کا ہے، اور مختلف ابواب سے متعلق ہے، اور اس طرح کے اختلاف کا آغاز امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی زندگی میں ہی رونما ہو گیا تھا، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو بھی اس کا علم تھا، اسی لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بعض مسائل میں اپنے شاگردوں کے قول کی طرف رجوع بھی فرمایا، جو کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مخلص، صادق اور سچا فقیہ ہونے کی علامت ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود نہ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس طرزِ عمل کو اپنے شیخ واستاذ، بلکہ امام ہونے اور دوسروں کے اپنے شاگرد، مرید ہونے کے منافی سمجھا، اور نہ ہی عظمت ومحبت یا عقیدت کے خلاف قرار دیا، اور نہ ہی اس طرح کے اختلاف کی وجہ سے شاگردوں کے دلوں میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی عظمت وعقیدت، یا محبت میں کمی واقع ہوئی، اور نہ ہی آج علمی وفقہی دنیا میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذکورہ شاگردوں، مریدوں اور عقیدت مندوں کے مذکورہ طرزِ عمل کو عقیدت وعظمت اور محبت کے خلاف سمجھا جاتا، بلکہ متعدد مسائل میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے مقابلہ میں آپ کے بعض شاگردوں کے قول کو راجح اور مفتیٰ بہ

قرار دیا جاتا ہے، مگر اس وقت بھی ان شاگردوں کے بجائے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی عقیدت وعظمت دل میں زیادہ ہوتی ہے، اور اس طرح کے اختلاف وترجیح کے موقع پر یہ الزام بھی نہیں دیا جاتا کہ بڑوں کی نظر جہاں پہنچتی ہے، چھوٹوں کی وہاں نہیں پہنچ سکتی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''بعض فقہ کے ایسے حاملین جن کو دوسرے سے فقہ کا علم حاصل ہوا، زیادہ فقیہ ہوتے ہیں'' [1]

اس سے معلوم ہوا کہ مذہبِ اسلام اور خاص طور پر مسلکِ حنفیہ میں بڑا اعتدال ملحوظ رکھا گیا ہے، اور اس کی مثالیں ہمارے سلف میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

مگر آج ہم مذکورہ طرزِ عمل کے برعکس بعض اوقات دیکھتے ہیں کہ اکابر سے فقہی وعلمی اختلاف کو ان کی عظمت وعقیدت اور محبت کے منافی سمجھا جاتا ہے، اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے والے کو اکابر کا گستاخ، نافرمان اور نہ جانے کیا کچھ کہا جاتا ہے، اور اگر کوئی چھوٹا اپنے اکابر سے دیانت دارانہ علمی، فقہی وفروعی اختلاف کرے، تو اس کو کہا جاتا ہے کہ بڑوں کی نظر جہاں پہنچتی ہے، وہاں چھوٹوں کی نظر ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔

جبکہ بعض لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اکابر سے ذرا سا اختلاف کر کے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں، اور اکابر کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھ کر ان کی شان میں گستاخی کرنے لگتے ہیں، یہ سب افراط وتفریط پر مبنی صورتیں ہیں۔

اور اعتدال والی صورت وہی ہے، جو پہلے ذکر کی گئی، جس کی تائید اسلافِ امت اور فقہائے امت کے طرزِ عمل سے ہوتی ہے، ہمیں اسی طرزِ عمل کو اختیار کرنا چاہیے، اور بے اعتدالیوں، یا

[1] عن زید بن ثابت، قال :سمعت رسول الله -صلى الله عليه وسلم -يقول" :نضر الله امرأ سمع منا حديثا فحفظه حتى يبلغه، فرب حامل فقه إلى من هو أفقه منه، ورب حامل فقه ليس بفقيه" (سنن ابی داوٗد، رقم الحديث ٣٦٦٠، کتاب العلم، باب فضل نشر العلم)

قال شعيب الارنؤوط:إسناده صحيح(حاشية سنن ابی داوٗد)

افراط وتفریط پر مبنی صورتوں سے بچنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ فہمِ سلیم عطاء فرمائے۔آمین۔

11 ربیع الاول 1438، 11 دسمبر 2016

(ماہنامہ:التبلیغ راولپنڈی’’جلد14شمارہ4‘‘جنوری2017ء - ربیع الآخر1438ھ)

---

(87)

علماء وطلبہ کو علم میں تفقہ وتعمق اور اعتدال کی ضرورت

کچھ عرصہ قبل بندہ محمد رضوان کا ایک جگہ اپنے سلسلہ کے بڑے جامعہ میں جانا ہوا، وہاں جاکر جامعہ کے ایک مفتی صاحب کی خدمت میں بھی حاضری کی توفیق ہوئی، میں تو ان مفتی صاحب کی زیارت و ملاقات اور ان سے استفادہ کے لیے حاضر ہوا تھا، اور میں ان مفتی صاحب کی دل سے قدر کرتا ہوں، اور اپنے سلسلہ کا بزرگ سمجھتا ہوں۔

ان مفتی صاحب کے پاس اس وقت تخصص کے طلبہ بھی موجود تھے، حضرت مفتی صاحب موصوف نے مجھے اپنے قریب میں بٹھا کر طلبۂ کرام سے میرا تعارف کرایا، اور پھر مجھ سے فرمایا کہ آپ طلبہ کو کچھ نصیحت فرمادیں، میں نے عرض کیا کہ آپ کی موجودگی میں مجھے لَب کشائی کرنا مناسب نہیں لگتا، اس لیے میرے بجائے آپ ہی نصیحت فرمادیں، تو بہتر ہے، لیکن انہوں نے فرمایا کہ میں تو روزانہ ہی نصیحت کرتا رہتا ہوں، آج آپ فرمادیں۔

خیر میں نے ایک عالم، بزرگ شخصیت کا حکم ہونے کی وجہ سے تعمیلِ حکم میں طلبۂ کرام کی مناسبت سے چند علمی وفقہی باتیں ان طلبۂ کرام کے سامنے عرض کیں۔

بے تکلف جو موضوع ذہن میں حاضر ہوا، وہ کچھ اس طرح سے تھا کہ فقہی ومجتہد فیہ امور میں علماء وطلبہ کو اپنے مطالعہ میں وسعت دینے، تفقہ وتعمق اور اعتدال پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

بہت سے مسائل وہ ہیں، جن میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، اور ایک ہی فقہ کی کتب میں ایک مسئلہ کے اندر ایک سے زیادہ فقہاء ومشائخ کے اقوال بھی پائے جاتے ہیں، جن میں کسی

ایک قول کا کسی دلیل، یا ضرورت کی وجہ سے راجح یا مفتیٰ بہ ہونا ممکن ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قول کو ایک زمانہ میں مخصوص عرف وحالت کی وجہ سے راجح، یا مفتیٰ بہ قرار دیا جائے، اور دوسرے قول کو کسی دوسرے زمانے میں عرف وغیرہ کے بدلنے، یا حالت کے مختلف ہونے کی وجہ سے راجح و مفتیٰ بہ قرار دیا جائے، جبکہ بعض مسائل کے اندر اونچ نیچ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ ترجیح وتصحیح وغیرہ میں بھی پہلے سے اختلاف پایا جاتا ہے۔

اور گزشتہ کسی زمانہ میں کسی صاحبِ فقہ واجتہاد اور صاحبِ افتاء نے کسی دلیل کی رُو سے کسی قول کو اگر راجح، صحیح، یا اصح، یا مفتیٰ بہ وغیرہ کہا ہو، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے راجح، یا صحیح، یا اصح، یا مفتی بہ وغیرہ ہو جائے، اور بعد کے کسی فقیہ ومفتی وغیرہ کو اس کی مخالفت جائز نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں بعد کے حضرات کا اپنے سے پہلے کے اکابر، اساتذہ ومشائخ اور اساتذہ وغیرہ سے اختلاف ہوتا رہا ہے (جیسا کہ ابھی ذکر آتا ہے) لیکن آج کے دور میں علماء کا مخصوص طبقہ، اس طرزِ عمل کو نکارت وحقارت وغیرہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے، اور اس کو تفرد وشذوذ کا الزام دینے لگا ہے، حالانکہ جو مسئلہ مجتہَد فیہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی فقیہ ومجتہد کا مسلک، یا قول بھی ہو، اس پر اس طرح کا الزام عائد کرنا درست نہیں۔

چنانچہ بہت سے مسائل میں ہمارے یہاں کچھ عرصہ سے فقہائے کرام ومشائخِ عظام میں سے کوئی ایک مخصوص قول مشہور ومعروف ہو گیا ہے، اور عام طور پر ایک مدت سے کتابوں میں وہی نقل در نقل ہوتا اور اختیار کیا جاتا رہا ہے، اور اس کے لیے ترجیحی واجتہادی دلائل پیش کیے جاتے رہے ہیں، جس کی وجہ سے دوسرے قول کا بہت سے اہلِ علم کو بھی علم نہیں ہوتا، اور وہ اس کے برخلاف قول کو صریح وقطعی طور پر غلط خیال کرنے لگے ہیں، پھر جب اس مسئلہ میں دوسرے قول پر عمل وفتوے کی ضرورت پیش آتی ہے، یا کوئی صاحبِ علم دلائل کی رُو سے دوسرے قول کی طرف اپنا رجحان ظاہر کرتا ہے، تو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شافعیہ، مالکیہ، یا حنابلہ میں سے کوئی قول، بلکہ حنفیہ میں

سے کوئی غیر معروف قول، مشہور غیر مقلد حضرات کا کوئی فرقہ، یا کوئی دوسرا فرقہ اختیار، بلکہ سرقہ کرلیتا ہے، اور پھراس کو اپنی طرف منسوب کر کے اس کی تشہیر وتبلیغ کرنا شروع کردیتا ہے، جس میں بعض اوقات وہ اپنی طرف سے کوئی اضافہ، یا کتر بیونت، یااس میں شدت پیدا کرلیتا ہے، لیکن وہ اس موقف کے لیے زیادہ تر اہلِ حق فقہائے کرام ومشائخِ عظام کے بیان کردہ دلائل واستنباطات کو ہی توڑ موڑ کر، یا گھما پھرا کر پیش کرتا ہے۔

جس کے ردعمل میں ہماری طرف سے بعض اوقات اس قول کی اس طرح سے علی الاطلاق تردید کی جانے لگتی ہے، جیسا کہ وہ قول بنیادی طور پر کسی باطل پرست کا ہو، اور غیر مجتہد فیہ، یا قرآن وسنت کی نصوص، یا اجماع وغیرہ کے صراحتاً متصادم ومخالف ہو، اوراس کے نتیجہ میں جلیل القدر فقہاء ومشائخ، بلکہ بعض اپنے سلسلہ کے اکابر بھی لازماً ہدف بنتے ہیں۔

چنانچہ کئی مسائل اس طرح کے ہیں کہ ان میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ان کے معزز تلامذہ، مثلاً امام محمد، امام ابو یوسف اور امام زفر رحمہم اللہ وغیرہ نے اختلاف کیا، اس کے بعد بھی متعدد مشائخِ حنفیہ واکابرِ احناف مختلف مسائل میں اپنے رجحانات کو ظاہر فرماتے رہے، جن میں ان کا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، یا اپنے سے پہلے حنفیہ کے مشہور ومعروف موقف سے اختلاف پایا جاتا ہے۔

متعدد مسائل میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے متعلق بھی اس طرح کے امور پائے جاتے ہیں، جبکہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی فکر پر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔

نیز علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ وغیرہ جیسے مشائخِ دیوبند بھی متعدد مسائل میں معروف اقوال سے ہٹ کر خاص موقف رکھتے ہیں، ان کے علاوہ بھی متعدد اکابر ومشائخ سے بہت سے مسائل میں اپنی اپنی ترجیحات ملتی ہیں، تو کیا کوئی حنفیت، یا مسلکِ دیوبند سے صحیح اور سچی وابستگی ونسبت رکھنے والا، ان مشائخ واکابر کی شان میں گستاخی، یا نازیبا رویہ پسند کرے گا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔

پھر بعض اوقات کسی زمانہ میں، یا کسی ضرورت کی وجہ سے خود ہمیں ان فقہائے کرام یا مشائخِ عظام میں سے اسی غیر معروف وغیر مشہور قول کو اختیار کرنے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے، تو پریشانی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جس قول کی تحریری وتقریری طور پر ایک مدت تک تردید کی جاتی رہی، اور اس کو اہلِ باطل کا مسلک قرار دیا جاتا، یا سمجھا جاتا رہا، اور اس پر تحریری، یا زبانی طور پر مناظرہ ومجادلہ کا بازار گرم ہوتا رہا، اب کس منہ سے اس قول کو قبول یا اختیار کریں۔

مثلاً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مشہور ومعروف قول یہ ہے کہ حجِ قران، یا حجِ تمتع کرنے والے کو ''یوم النحر'' کے تین اعمال میں ترتیب واجب ہے، جس کی خلاف ورزی پر ان کے نزدیک دَم واجب ہے، ایک جمرۂ عقبہ کی رمی، دوسرے قربانی اور تیسرے سر کا حلق، یا قصر۔

اب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس قول پر ایک عرصہ سے عمل کیا جاتا رہا، اور اس پر عمل کرنے میں سابق ادوار میں کسی معقول دشواری کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑا، کیونکہ اس زمانہ میں بہت سے لوگ اپنے اپنے علاقوں سے حجِ تمتع، یا حجِ قران کی قربانی کا جانور یعنی ہدی لے کر حرم اور منیٰ میں حاضر ہوا کرتے تھے، اور اس زمانہ میں ہدی کو اپنے ساتھ ساتھ رکھنے میں بھی کوئی دشواری نہیں تھی، ادھر دس ذی الحجہ کو رمی کی، اور اِدھر اپنے ساتھ موجود ہدی کی قربانی کی، اور وہیں سادگی کے ساتھ اپنے سر کا حلق، یا قصر کرلیا، چنانچہ فقہائے کرام نے ''سوقِ ہدی'' کے متعدد مسائل اپنے اپنے زمانہ میں بیان فرمائے ہیں، اور اس پر کئی احکام متفرع ومرتب فرمائے ہیں، جن کا کتبِ فقہ میں ذکر پایا جاتا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں یہ سب کام مشکل ہوگئے ہیں، اپنے یہاں سے ہدی اپنے ساتھ لے کر جانا، اس کو اپنے ساتھ ساتھ رکھنا، یہاں تک کہ منیٰ میں لے کر پہنچنا اور اس سے بڑھ کر رمی کرتے وقت بھی اپنے ساتھ رکھنا، اور رمی سے فارغ ہو کر وہیں اس کو ذبح کر دینا، یہ سب کام موجودہ رش وہجوم اور قانونی وانتظامی چیزوں وپابندیوں کی وجہ سے دشوار تر اور بعض تقریباً ناممکن ہوگئے ہیں۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہمارے یہاں پر بعض غیر مقلدین، یا سلفیین نے ان مذکورہ اعمال میں ترتیب کے واجب نہ ہونے، بلکہ سنت ہونے اور اس ترتیب کی خلاف ورزی پر دم لازم نہ آنے کے قول کو اختیار کرلیا، اور اس کی تحریری وزبانی طور پر تبلیغ بھی شروع کردی، اور ترتیب کی خلاف ورزی سے متعلق ''لا حرج'' والی مشہور حدیث سے بھی استدلال کیا۔

جس کے نتیجہ میں ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ مذکورہ اعمال میں ترتیب کے واجب نہ ہونے اور اس کے بجائے سنت ہونے کا قول تو غیر مقلدوں، یا سلفیوں کا ہے، اور اس کی زور وشور کے ساتھ تحریراً وتقریراً تردید کی جاتی رہی، اور مشہور حدیث ''لا حرج'' کی بھی مخصوص تاویل کی جاتی رہی۔

مگر یہ نہیں دیکھا گیا کہ مذکورہ اعمال میں ترتیب کے واجب نہ ہونے اور سنت ہونے کا قول اور اس کی مذکورہ دلیل تو خود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مشہور شاگرد، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کی ہے، جو حنفیہ کی کتب میں مذکور ومنقول ہے، اور ہم اس کو غیر مقلدین وغیرہ کا قول سمجھ کر اس کی تردید وتاویل میں متشدّدانہ طریقہ پر اپنی صلاحیتوں کو خرچ کر رہے ہیں، اور عوام کا بڑا طبقہ اس مشکل سے بچنے کے لیے سلفیت، یا غیر مقلدیت وغیرہ کی طرف رجوع کر رہا ہے۔

جب یومُ النحر کے مخصوص اعمال میں ترتیب کو اختیار کرنے میں عملی طور پر دشواری کا سامنا ہوا، اور اس کی وجہ سے بعض حنفی علماء وفقہاء نے ترتیب کے سنت ہونے کے قول پر گنجائش کی طرف اپنا رجحان ومیلان ظاہر کیا، اور صاحبین کی طرف سے پیش کردہ دلیل ''لا حرج'' کو استدلال میں پیش کیا، تو ان علماء کو سخت حیرت ہوئی، جنہوں نے ان سب چیزوں کا غیر مقلدوں اور سلفیوں کے ردّعمل میں انکار کیا تھا، اور اس پر تحریری وتقریری طور پر تبلیغ، بلکہ مناظروں کا بازار گرم کیا تھا۔

اور آج کل عام علماء کی اتنی تربیت واصلاح ہوتی نہیں کہ اپنی سابق تبلیغ وتحقیق سے رجوع کا

اعلان کریں، بلکہ اکثر و بیشتر اس انکاروتردید کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان کی طرف سے ایک مخصوص موقف کی تبلیغ اور نشرواشاعت ہوچکی ہوتی ہے، جس کے خلاف کوقبول کرنے میں اپنی شکست اور عارمحسوس ہوتی ہے، حالانکہ یہ کوئی دنیا کی ہارجیت، یا اونچ نیچ، یا دنیا کی عزت وذلت کا کھیل نہیں۔

میں نے ایسے کئی اصحابِ علم دیکھے کہ جو زبانی طور پر کسی خاص مسئلہ میں گنجائش اور کسی دوسرے موقف کے حامی اور قائل تھے، اور حرج وتنگی کی علت کو موثر سمجھ رہے تھے، اور خود عملی طور پر بھی توسع پر عمل پیرا تھے، لیکن اپنی کتابوں میں مذکور مشہور موقف سے مسلکی اَنا پرستی وغیرہ کی وجہ سے دوسروں کے لیے اس کے خلاف اجازت پر تحریری، یا زبانی اشاعت وتبلیغ کے لیے ہرگز آمادہ نہ ہوئے، جو کہ محققین کے طریقہ کے خلاف ہے۔ [1]

بہرحال اس طرح کے بے شمار مسائل ہیں، جن کے بارے میں علماء وطلبہ کو اپنے مطالعہ کو

---

[1] حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مختلَف فیہ مسائل میں وسعت دینی چاہیے، اس طرح ایک تو شریعت سے محبت ہوگی، دوسرے آرام رہے گا (انفاسِ عیسیٰ، ص۳۰۲، مطبوعہ: تجلی برقی پریس، دہلی)

محققین کا مسلک یہ ہے کہ اپنے نفس کے عمل میں تو تنگی برتے، اور اعلیٰ وادنیٰ کو عمل کے لیے اختیار کرے، مگر رائے اور فتویٰ میں وسعت رکھے، اور لوگوں کے لیے مقدور بھر آسانی کو تلاش کرے (آدابِ افتاء واستفتاء، الباب الثانی: آداب المفتی، بعنوان ''فتاویٰ میں امت کی سہولت وآرام کا خیال'' بحوالہ: الافاضات ج۱۰ص۱۱۴، مشمولہ: تحفۃ العلماء، ج۲ص۲۵۱، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

دوسرے کے عیب میں تو حتی الامکان فقہ سے گنجائش نکالے، اور اپنے نفس پر تنگی کرے (آدابِ افتاء واستفتاء، الباب الثانی: آداب المفتی، بعنوان ''غیروں کے لیے تنگی، اپنے اور متعلقین کے لیے سہولت اختیار کرنا بری بات ہے'' بحوالہ: الافاضات ۲۴۳، مشمولہ: تحفۃ العلماء، ج۲ص۲۵۱، ۲۵۲)

جس شخص پر فقہ اور فتویٰ کا رنگ غالب ہوتا ہے، اس کے فتویٰ کا رنگ اور ہوتا ہے کہ جزئیات میں تشدد کی عادت ہوتی ہے، اور جس پر حدیث کا رنگ غالب ہوتا ہے، اس کے فتویٰ کا رنگ اس سے مختلف ہوتا ہے کہ اس میں کچھ توسع ہوتی ہے (آدابِ افتاء واستفتاء، الباب الثانی: آداب المفتی، بعنوان ''فقیہ اور محدث کے فتوے میں فرق'' بحوالہ: مجالسِ حکیم الامت ص۲۳۶، مشمولہ: تحفۃ العلماء، ج۲ص۲۴۹)

www.idaraghufran.org

وسعت دیتے ہوئے ملاحظہ کرنے اوراس طرزِ عمل سے بچنے کی ضرورت ہے کہ جوقول کسی غیر مقلدوغیرہ کی طرف سے آئے، خواہ وہ فقہائے کرام بلکہ حنفی فقہاء ومشائخ سے ماخوذ کیوں نہ ہو، فوراًاس کی تردید نہ کردیں، بلکہ اس کا گہرائی اور وسعت کے ساتھ جائزہ لیں کہ بنیادی طور پر یہ قول کس کا ہے، اور کہاں سے لیا گیا ہے، اور کس حد تک اس مسئلہ میں اجتہادوترجیح وغیرہ کی گنجائش پائی جاتی ہے، اس سلسلہ میں فقہائے کرام کے کیا کیااقوال ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح مثلاً رفعِ یدین اورقرائت خلف الامام اورآمین بالجہر وغیرہ کے مسائل ہیں کہ یہ مسائل خوداہلِ حق فقہائے کرام، بلکہ صحابۂ کرام وتابعینِ عظام میں بھی اختلافی تھے، مگروہ حضرات اس قسم کے مسائل میں اختلاف کوحق و باطل کا اختلاف نہیں سمجھتے تھے، بلکہ زیادہ سے زیادہ اپنے گمان میں اجتہادی صواب وخطاء سمجھتے تھے، جس میں جانبِ مخالف، مجتہد کے لیے بھی کم ازکم ایک اجروثواب کے قائل تھے، نہ کہ گناہ کے، اسی لیے وہ ان مسائل میں تشدد اختیارنہیں کرتے تھے۔

اوراسی لیے وہ اس کی وجہ سے ایک دوسرے پرگمراہی وضلالت کے احکام وفتاویٰ صادرنہیں کیا کرتے تھے، بلکہ بہت سے حنفی سلسلہ سے وابستہ حضرات بھی ان مسائل میں حنفیہ کے مشہور اقوال کے خلاف دوسرے موقف کواختیار کرتے تھے۔

اب اگر کچھ غیر مقلد حضرات ان مسائل میں تشدداختیار کرتے ہیں، اوران کواپنے درجہ سے بڑھاتے ہیں، یا مخالف قول کے متعلق صریح خلافِ شریعت اور غلط ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، توبلاشبہ ان سب باتوں کی معقول اور سنجیدہ دلائل کے ساتھ توضیح وتبلیغ کرنے اوران کے درجات کومنقح کرنے کی ضرورت ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم جودوسروں کے طرزِ عمل و ردِعمل میں خودمخالف قول کی اس انداز میں تردیدشروع کردیتے ہیں کہ جس کی وجہ سے جلیل القدر فقہائے کرام، بلکہ صحابۂ کرام بھی زدمیں آجاتے ہیں، یہ طرزِعمل اہلِ حق کا شیوہ نہیں، اگراہلِ باطل اس طرزِعمل کواختیارو پسند کرتے ہوں، تواس کے وہ خودمجرم اور بروزِ قیامت

جوابدہ ہیں، لیکن ان کی تردید میں ہمیں خود اپنی طرف سے اس غلطی کو نہیں دُہرانا چاہئے، اہلِ حق کا یہی شیوہ ہے، جس پر نہ صرف یہ کہ آخرت میں بڑا اجر ہے، بلکہ دنیا میں بھی مآلاً اس کے عوامی دنیا پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، گو بظاہر اور فی الفور وہ اثرات ہمیں محسوس نہ ہوں۔

اگرچہ موجودہ دور میں اس طرح کے مسائل کے اندر ہر فریق دوسرے پر بے جا تشدد اختیار کرنے اور اپنی دہی کو میٹھا اور دوسرے کی دہی کو کھٹا قرار دینے کے اصول پر عمل پیرا ہے، اور اپنے بے جا تشدد کی اصلاح کے لیے تیار نہیں۔ [1]

---

[1] چنانچہ ایک مرتبہ ایک قابلِ قدر عالمِ دین نے بندہ کی طرف سے تحریر کردہ ''فقہ واجتہاد میں توسع واعتدال'' سے متعلق ایک مضمون کے بارے میں فرمایا کہ آپ کے فلاں مضمون میں، جو بعض فقہاء واکابر کے اقوال شائع ہوئے ہیں، وہ مجتہد حضرات تھے، اور ان اقوال سے عوام میں تشویش پیدا ہوتی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ خواہ وہ مجتہد تھے، یا غیر مجتہد، لیکن یہ تو معلوم ہونا ضروری ہے کہ ان کا فقہی واجتہادی ذوق اور اس کے دلائل کیا ہیں، قطع نظر اس سے کہ ان کے فقہی واجتہادی ذوق سے کسی کو اختلاف ہو، یا اتفاق۔

فرمانے لگے کہ آپ کے مضمون میں بڑے سخت الفاظ ہیں، مثلاً یہ لکھا ہے کہ بعض لوگ اس عمل کو مکروہ تحریمی، یا حرام کہتے ہیں، اور اس عمل کے مرتکب کو فاسق وغیرہ بھی کہہ دیتے ہیں، حالانکہ ہم نے کبھی ایسا نہیں کہا، البتہ غیر مقلدین تشدد اور سختی کرتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ اوّلاً تو جو کوئی تشدد اختیار نہ کرے، وہ ہمارا مخاطب نہیں، ہمارے مخاطب تو طرفین کے متشددین ہیں، دوسرے جب کسی عمل کو شرعی اور منصوصی حیثیت سے حرام یا مکروہ تحریمی قرار دے دیا گیا، اور اس میں تشدد اختیار کیا گیا، تو پھر اس عمل کا مرتکب فاسق ہی ہوتا ہے، اس کے بجائے کسی امام یا مجتہد کے نزدیک حرام، یا مکروہ کہنا چاہیے، اور دونوں باتوں میں فرق ہے۔

اور عوام میں تشویش، اعتدال والے موقف سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ پہلے سے متشددین کی طرف سے پیدا کردہ تشویش ختم ہوتی ہے، البتہ اگر کسی نے عوام میں تشدد والے کسی موقف کی تبلیغ وتشہیر کی ہو، تو پھر اس متشدد کے قول کے متعلق تشویش ضرور ہوتی ہے کہ یہ مسئلہ تو مجتہَد فیہ اور مختلَف فیہ تھا، مگر ہمیں اس حیثیت سے اس کی تعلیم نہیں دی گئی، اور مخالف موقف کو باطل قول قرار دیا گیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ ہر فریق دوسرے کو متشدد قرار دیتا ہے، مگر اپنے آپ کو قابلِ اصلاح نہیں سمجھتا، بندہ جو اللہ اور اپنے درمیان حق سمجھتا ہے، اسی رائے کا اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے اختیار کرنے کا مکلّف ہے، اگر دوسرے کو اس سے اختلاف ہے، وہ اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی رائے قائم کرے، اسے دوسرے کو اپنی رائے کا مکلّف سمجھنا درست نہیں، جہاں تک مشورہ اور رائے کا تعلق ہے، تو اس میں حرج نہیں، لیکن مشورہ دینے والے کو یہ سمجھنا کہ دوسرا اس کے مشورہ پر عمل کرنے کا پابند ہے، یہ درست طریقہ معلوم نہیں ہوا۔ محمد رضوان۔

اس طرح کی اور بھی کچھ باتیں، میں نے مذکورہ موقع پر کیں، جو بعینہٖ اس وقت مستحضر نہیں۔
بندہ کی یہ گفتگو کیونکہ ہمارے یہاں رائج عام روایات سے ہٹ کر اور عام علمی ماحول سے کچھ مختلف تھیں، اس لیے بندہ کی گفتگو ختم ہونے کے بعد مذکورہ مفتی صاحب نے اس پر کچھ اشکال پیش کیا، جس کا بندہ نے ادب کے ساتھ جواب دیا۔
پھر انہوں نے کچھ اشکال پیش کیا، بندہ نے پھر جواب دیا، اور اس طرح کچھ دیر کے لیے یہ سلسلہ چلتا رہا، لیکن الحمد للہ تعالیٰ اچھے ماحول میں گفتگو ہوئی، کوئی ناخوشگواری کا ماحول نہیں بنا، بندہ چائے نوشی وغیرہ کی ضیافت سے فراغت کے بعد وہاں سے اچھے طریقہ پر رخصت ہوکر واپس لوٹا۔
لیکن چونکہ بندہ ان مفتی صاحب کو اپنے سلسلہ کا بزرگ خیال کرتا تھا، اس لیے بندہ کو اس طرح سوال وجواب کے سلسلہ سے کچھ حیا محسوس ہوئی کہ شاید حضرت مفتی صاحب کو دل میں ناگواری محسوس ہوئی ہو، بندہ نے کیونکہ جو کچھ عرض کیا تھا، وہ فیما بینی و بین اللہ حق و سچ سمجھتے ہوئے عرض کیا تھا، اور کسی کو نیچا دکھانا، یا مناظرہ کرنا پیشِ نظر نہیں تھا، بلکہ وہاں حاضری کا مقصد بھی زیارت وملاقات تھا، نہ بیان وتقریر، بہرحال اپنے مقام پر پہنچنے کے بعد اگلے دن بندہ نے حضرت مفتی صاحب موصوف کو فون کیا، اور عرض کیا کہ حضرت والا کی موجودگی میں جو گفتگو اور سوال وجواب کا سلسلہ ہوا، اس کی وجہ سے دل پر بوجھ تھا کہ کہیں حضرت والا کے دل میں خفگی پیدا نہ ہوگئی ہو، اس لیے بندہ نے معذرت وصفائی کرنے کے لیے فون کیا ہے۔
حضرت مفتی صاحب نے بڑی وسعتِ قلبی کے ساتھ فرمایا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں، البتہ میں نے محسوس کیا کہ آپ میں کچھ تجدد پیدا ہو رہا ہے، اور اکابر کا جو موقف ہے، اس سے کہیں کہیں ہٹنے کا خدشہ ہے، ہمیں تمام مسائل میں اپنے اکابر کے موقف پر قائم رہنا چاہئے، اسی میں ہر طرح کی خیر ہے۔
بہرحال بندہ نے کیونکہ سابقہ گفت وشنید اور سوال وجواب کے سلسلہ پر معذرت کرنے کی وجہ

سے رابطہ کیا تھا، اس لیے اب اس موضوع کو ان کے سامنے طول دینے کے بجائے موقوف کر دینے کی طرف ہی رجحان ہوا، بندہ نے عرض کیا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ بندہ آپ کی ہدایت پر غور کرے گا، اور اجازت طلب کر کے سلام ودعاء کے بعد گفتگو کا سلسلہ ختم کیا۔

لیکن ساتھ ہی بندہ نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے بعض اہلِ علم بزرگوں نے موجودہ دور میں مجتہد فیہا مسائل کے اندر اجتہاد کی صلاحیت اور ضرورت نہ ہونے کا پختہ فیصلہ کر لیا ہے، اور وہ یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں کہ ہمارے بزرگوں اور اکابر نے اپنے دوور اور اپنے زمانہ کے حالات ومقتضیات کے مطابق کام کیا تھا، وہ اگر آج کے زمانہ اور دور میں ہوتے، تو آج کے زمانہ کے حالات ومقتضیات کے مطابق کام کرتے، ظاہر ہے کہ وہ حضرات آج کے دور میں ہو کر گزشتہ دور کے حالات ومقتضیات کے کام پر جمود اختیار نہ کرتے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خود بھی اپنے زمانہ اور اپنے دور میں یہ سوچنے پر اکتفاء نہ کیا کہ ہمارے سے پہلے اکابر اور بزرگ جو کام کر گئے تھے، وہی کافی ہے، اور ہمیں اپنے زمانہ کے حالات ومقتضیات کے مطابق کام کرنے اور سابق اکابر کے موقف پر راجح ومرجوح کے اعتبار سے غور وفکر کرنے اور اس سے ہٹنے اور کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں، بلکہ انہوں نے اپنے دور میں جو کام کیا، اس میں دلائل اور ضرورت کے پیشِ نظر متعدد مسائل میں سابق اکابر وفقہاء کے موقف کو ترک کیا، اور انہوں نے اپنے اور اللہ کے درمیان جو حق سمجھا، اس کو اختیار کیا، اور اپنی آراء قائم کیں، اور اس عظیم الشان کارنامہ کی وجہ سے ہی ان کو یہ مقام حاصل ہوا کہ آج ان کو اپنے اکابر ومشائخ وغیرہ قرار دینے والے بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجتہد فیہا اور فقہی وفروعی مسائل میں ہر دور کے حالات ومقتضیات اور دلائل کے پیشِ نظر اپنے اور اللہ کے درمیان حق وصواب سمجھے جانے والے موقف کو اختیار کرنا ہی دراصل اکابر کے نقشِ قدم پر چلنا ہے، کیونکہ اکابر کا یہی طریق ہے، خواہ اس کے نتیجہ میں اکابر سے کسی فروعی ومجتہد فیہ مسئلہ میں اختلافِ رائے کیوں نہ پیدا ہو جائے۔

مگر آج اس کے برعکس اکابر کے اس طریقہ کو چھوڑ کر ان کے زمانہ والے اختیار کردہ سابق موقف کے اختیار اور اس پر جمود واصرار کرنے کو ہی ان کے نقشِ قدم پر چلنا سمجھا جانے لگا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مسائل بعض قطعی ہوتے ہیں، ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی، بعضے اجتہادی وظنی ہوتے ہیں، ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاد کے ساتھ، مرید نے پیر کے ساتھ، قلیل جماعت نے کثیر جماعت کے ساتھ، واحد نے متعدد کے ساتھ اختلاف کیا ہے، اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں کی، اور نہ ایک نے دوسرے کو ضال اور عاصی کہا، نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا۔

مسائلِ اجتہادیہ ظنیہ میں اختلاف دو طرح سے ہوا ہے، ایک دلائل کے اختلاف سے، جیسے حنفی، شافعی میں ''قرائت خلف الامام'' کے مسئلہ میں، دوسرے واقعات، یا عوارض کے اختلاف سے، جیسے امام صاحب اور صاحبین نے نکاحِ صابئات کے مسئلہ میں (فقہ حنفی کے اصول وضوابط، الباب الثالث: اقسامِ احکام، بعنوان ''فتاویٰ میں امت کی سہولت وآرام کا خیال''، مشمولہ: تحفۃ العلماء، ج۲ص۷۹، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قلب میں اکابر کی محبت وعظمت اور ان کے علمی وعملی بلند مقام کی وقعت کے باوجود مسائلِ شرعیہ میں دلائل کے پیشِ نظر ان سے اختلافِ رائے واجب ہے (رسالہ ''صبح صادق''، مشمولہ احسن الفتاویٰ جلد۲ صفحہ۱۹۰، کتاب الصلاۃ، ناشر: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، طبع یازدہم: ۱۴۲۵ھ)

اور ہمارے شیخ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم العالی اپنے ایک فتوی میں تحریر فرماتے ہیں:

آخر میں یہ گزارش ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی عظمتِ شان، جلالتِ قدر اور علمی تبحر کے پیشِ نظر تو اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کی جرائت

کسی بڑے عالم کو بھی نہیں ہونی چاہئے، چہ جائیکہ مجھ جیسا طفلِ مکتب اس پر کچھ لکھے۔
لیکن الحمدللہ! جماعتِ دیوبند کی خصوصیت اور انہی بزرگوں کی تعلیم و تلقین نے ہمیں یہ صراطِ مستقیم دکھائی کہ مسائلِ شرعیہ میں آزادانہ اظہارِ رائے، ترکِ ادب نہیں، بلکہ شاگردوں کا اظہارِ خیال انہی بزرگوں کا معنوی فیض ہوتا ہے، اس لیے بنامِ خدا تعالیٰ جو کچھ اس میں تحقیق سے مجھ پر واضح ہوا، وہ لکھ دیا، اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ بزرگوں کی شان میں ادنیٰ ترکِ ادب سے بھی مجھے محفوظ رکھیں۔ آمین

(فقہی مقالات، جلد۲، صفحہ ۵۵، ۵۶، مطبوعہ: میمن اسلامک پبلشرز، کراچی، اشاعت: جولائی 1996ء)

حضرت شیخ مفتی صاحب موصوف مدظلہم کا مسائلِ شرعیہ میں آزادانہ اظہارِ رائے کو ادب کے خلاف سمجھنے کی نفی کرنا، موجودہ دور کے اہلِ علم حضرات کے لیے قابلِ نمونہ اور بہت اہمیت کا حامل ہے، جس کی خلاف ورزی کی وجہ سے علمی دنیا میں متعدد مفاسد جنم لے رہے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تلامذہ نے بھی جن مسائل میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف کیا، فقہاء ومشائخِ حنفیہ کی تصریح کے مطابق انہوں نے اس کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہی علمی فیض قرار دیا۔ [1]

جہاں تک ''تجدّد'' کا تعلق ہے، تو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہر ''تجدّد'' مذموم نہیں، بلکہ اگر وہ صحیح نہج پر اور شرعی اصول وقواعد کے مطابق ہو، یا کسی پیدا شدہ غلو، یا افراط وتفریط دور کرنے اور اعتدال پیدا کرنے کے لیے ہو، تو نہ صرف یہ کہ محمود ہے، بلکہ مطلوب بھی ہے، اور یہ دراصل کہنے کو تو تجدّد ہے، لیکن حقیقت میں شریعت کے اصل موقف کی تجدید ہے، جس کی ہر صدی میں ضرورت ہے۔

---

[1] روی عن جمیع أصحاب أبی حنیفة من الکبار کأبی یوسف ومحمد وزفر والحسن أنهم قالوا ما قلنا فی مسألة قولا إلا وهی روایة عن أبی حنیفة وأقسموا علیه أیمانا غلاظا (العقود الدریة فی تنقیح الفتاوی الحامدیة، ج ۱، ص ۱۰۹، کتاب الوقف، الباب الأول فی وقف المریض أرضه أو داره فی مرض موته)

چنانچہ سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ یہ حدیث مروی ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَبۡعَثُ لِهٰذِهِ الۡأُمَّةَ عَلٰى رَأۡسِ كُلِّ مِئَةٍ سَنَةٍ مَنۡ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيۡنَهَا (سنن ابی داود، رقم الحديث ۴۲۹۱، كتاب الملاحم، باب ما يذكر فی قرن المئة) ۱ے

ترجمہ: بے شک اللہ عزوجل اس امت کے (فائدہ ونفع کے) لیے ہر سو(100) سال کے سرے پر ان لوگوں کو مبعوث فرمائے گا، جو اس امت کے (فائدہ ونفع کے) لیے اس کے دین کی تجدید کریں گے (ابوداؤد)

قطع نظر اس سے کہ کس صدی میں کون کونسے مجدد ہوئے ہیں، یا ہوں گے؟

اس حدیث سے ہر صدی کے اندر دین میں تجدید واجتہاد کا مطلوب ومحمود ہونا معلوم ہوتا ہے، اسی لیے متعدد فقہائے کرام نے ہر زمانہ میں اجتہاد کے مشروع ہونے پر اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے، اور ایک زمانہ میں مختلف علوم وفنون کے لحاظ سے متعدد مجدّد دین ہونے کا قول کیا ہے۔ ۲ے

۱ے قال شعيب الارنووط: إسناده صحيح (حاشية سنن ابی داود)

۲ے ولا يلزم أن يكونوا مجتمعين فی بلد واحد، بل يجوز اجتماعهم فی قطر واحد وافتراقهم فی أقطار الأرض، ويجوز أن يجتمعوا فی البلد الواحد وأن يكونوا فی بعض منه دون بعض، ويجوز إخلاء الأرض كلها من بعضهم أولا فأولا إلى أن لا يبقى إلا فرقة واحدة ببلد واحد فإذا انقرضوا جاء أمر الله، انتهى ملخصا مع زيادة فيه.

ونظير ما نبه عليه ما حمل عليه بعض الأئمة حديث: إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها أنه لا يلزم أن يكون فی رأس كل مائة سنة واحد فقط بل يكون الأمر فيه كما ذكر فی الطائفة وهو متجه، فإن اجتماع الصفات المحتاج إلى تجديدها لا ينحصر فی نوع من أنواع الخير، ولا يلزم أن جميع خصال الخير كلها فی شخص واحد(فتح الباری لابن حجر، ج۱۳، ص ۲۹۵، كتاب الاعتصام بالسنة، باب لا تزال طائفة من أمتی ظاهرين على الحق)

(على رأس كل مائة سنة) : أی: انتهائه أو ابتدائه إذا قل العلم والسنة وكثر الجهل والبدعة (من

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

مذکورہ حدیث پر علامہ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ کا ایک مستقل رسالہ ہے، جو اہلِ علم حضرات کے لیے قابلِ ملاحظہ ہے۔

اور اگر اپنے زمانہ کے اعتبار سے تحقیق واجتہاد کا کام مستند ومتدین اہلِ علم حضرات نہیں کریں گے، جو کہ اس کے اصل اہل ہیں، تو پھر جاہل، یا کم علم، یا غیر محتاط اور غیر مقلدین حضرات اُلٹ پلٹ انداز میں یہ کام کریں گے، جیسا کہ کر رہے ہیں۔

اس لیے ہر طرح کے اجتہاد کے دروازہ کو بند کر کے بیٹھ جانا اور سابقہ دور کے فقہی ومجتہد فیہ معروف اقوال سے ذرہ برابر نہ ہٹنے پر اصرار اور جمود اختیار کرنا، درست اور معتدل طرزِ عمل نہیں، بلکہ یہ طرزِ عمل غلو پر مبنی اور قابلِ اصلاح معلوم ہوتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ دور میں اہلِ علم حضرات اپنے مطالعہ اور فکر میں وسعت و تعمق اور اعتدال پیدا کریں، اور علمی، تحقیقی واجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، دلائل اور حالات ومقتضیات کے مطابق کام کریں، اور جمود وتشدد سے اجتناب فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ اعتدال کو اختیار کرنے اور افراط وتفریط سے بچنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

18 ربیع الاول 1438ھ، 18 دسمبر 2016ء

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 3، دسمبر 2017ء - ربیع الاول 1439ھ)

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

يجدد) : مفعول يبعث (لها) أى: لهذه الأمة (دينها) أى: يبين السنة من البدعة ويكثر العلم ويعز أهله ويقمع البدعة ويكسر أهلها .قال صاحب جامع الأصول: وقد تكلم العلماء فى تأويله، وكل واحد أشار إلى العالم الذى هو فى مذهبه، وحمل الحديث عليه، والأولى الحمل على العموم فإن لفظة "من "تقع على الواحد والجمع، ولا يختص أيضا بالفقهاء فإن انتفاع الأمة بهم، وإن كان كثيرا فانتفاعهم بأولى الأمر وأصحاب الحديث والقراء والوعاظ والزهاد أيضا كثير، إذ حفظ الدين وقوانين السياسة وبث العدل وظيفة أولى الأمر، وكذا القراء وأصحاب الحديث ينفعون بضبط التنزيل والأحاديث التى هى أصول الشرع وأدلته، والوعاظ ينفعون بالوعظ والحث على لزوم التقوى لكن المبعوث بشرط أن يكون مشارا إليه فى كل فن من هذه الفنون .نقله السيد (مرقاة المفاتيح، ج ۱، ص ۳۲۱، كتاب العلم)

www.idaraghufran.org

(88)

نبی کے لیے ’’حضور‘‘ کے لقب کی حیثیت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لفظِ ’’حضور‘‘ یا ’’حضرت‘‘ کا استعمال فی نفسہٖ جائز ہے، مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم، کیونکہ ’’حضور‘‘ کا لفظ عرف میں ادب واحترام کے لیے استعمال ہوتا ہے، مثلاً غیر نبی کے لیے بھی کہا جاتا ہے کہ ’’حضور‘‘ یا ’’حضرت والا تشریف لے گئے‘‘ یا ’’حضور‘‘ یا ’’حضرت والا‘‘ تشریف لائیے، وغیرہ وغیرہ۔

البتہ اگر کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ’’حضور‘‘ کا لفظ غلط معنیٰ میں استعمال کرے، مثلاً اس سے اپنے سامنے، یا کسی جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حاضر ہونا مراد لے، جس کا شرعاً ثبوت نہیں پایا جاتا، تو پھر اُس کے لیے اِس کا استعمال ناجائز ہوگا۔

البتہ بندہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان القاب، یا الفاظ کا استعمال زیادہ بہتر اور افضل سمجھتا ہے، جو قرآن وسنت میں جا بجا استعمال ہوئے ہیں، مثلاً ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم‘‘ یا ’’نبی صلی اللہ علیہ وسلم‘‘ کیونکہ قرآن مجید میں اس طرح کے الفاظ کا ہی استعمال ہوا ہے، مثلاً ’’محمد رسول اللّٰه‘‘ اور ’’یا ایھا النبی‘‘ اور ’’یا ایھا الرسول‘‘ وغیرہ۔

اس کے علاوہ احادیث میں ایک ایک صفحہ پر کئی کئی مرتبہ ان الفاظ کا صحابۂ کرام، تابعینِ عظام، اتباعِ تابعینِ عظام نے استعمال فرمایا ہے، جن کو شمار میں لانا مشکل ہے۔

اس لیے بندہ نے بچپن کی عادت کی بناء پر جو اپنی تحریرات میں پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ’’حضور‘‘ کے الفاظ استعمال کیے تھے، اگلے ایڈیشنوں میں ان کو ’’نبی صلی اللہ علیہ وسلم‘‘ یا ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم‘‘ سے تبدیل کروانے کا اہتمام کیا، اور آئندہ کے لیے تقریراً وتحریراً ان جیسے مسنون وماثور الفاظ کے استعمال کی عادت بنانے کی کوشش کی۔ 21 صفر 1439 ہجری

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 15 شمارہ 5، فروری 2018ء - جمادی الاولیٰ 1439ھ)

---

(89)

صبح کاذب کا صادق کے بعد نظر آنا

آج کل بعض حضرات نے صبح کاذب اور صبح صادق کے مسئلہ کو چند غلط فہمیوں کی وجہ سے متنازع بنادیا ہے، ورنہ یہ سیدھا سادا مسئلہ تھا۔

صبح کاذب سے نہ تو روزہ کا تعلق ہے اور نہ نماز کا اور نہ ہی کسی دوسری چیز کا، اور اس کا ذکر احادیث میں صرف اس لیے آیا ہے، تاکہ اس کی وجہ سے حقیقی اور اصل فجر کا دھوکہ نہ کھایا جائے، صبح کاذب نبیادی طور پر رات کی ایک روشنی ہے، جس طرح رات کی کئی روشنیاں اور بھی ہیں، مثلاً چاند، ستارے، کہکشائیں کہ بنیادی طور پر یہ رات کی روشنیاں ہیں، اور جس طرح رات کی دوسری روشنیوں، مثلاً ستاروں کا طلوعِ فجر ہونے کے کچھ بعد تک نظر آنے کا امکان ہوتا ہے، اسی طرح صبح کاذب کے نظر آنے کا بھی امکان ہوسکتا ہے۔

اور جس طرح آب وہوا اور موسمی تغیرات کی وجہ سے کبھی رات کی کسی دوسری روشنی، مثلاً کسی مخصوص ستارے، چاند یا کہکشاں وغیرہ کا نظر آنا ممکن ہوتا ہے، اور کبھی ممکن نہیں ہوتا، اسی طرح صبح کاذب کا بھی مسئلہ ہے کہ اس کا بھی آب وہوا، اور موسمی تغیرات کے باعث کبھی نظر آنا سہل اور بہت سہل وممکن ہوا کرتا ہے، اور کبھی مشکل وناممکن ہوسکتا ہے۔

بلکہ آب وہوا اور موسمی تغیرات کے باعث کسی وقت دن میں سورج کا نظر آنا بھی مشکل ہوجاتا ہے، جیسا کہ سردیوں کے بعض دنوں میں دھند اور کہر، اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کافی کافی وقت، بلکہ کئی کئی گھنٹوں اور کبھی کئی کئی دنوں تک سورج نظر نہیں آتا، اس طرح کے موسم میں راستوں اور گزرگاہوں پر تھوڑے سے فاصلہ پر گاڑی، یا کوئی دوسری روشن چیز، مثلاً گاڑی کی لائٹ بھی نظر نہیں آتی۔

ایسے ہی اگر کبھی موسمی تغیرات اور آب وہوا کے باعث صبح کاذب نظر نہ آئے، تو بھی اعتراض کی بات نہیں۔

مگر بعض علماء اس بات پر بڑے سیخ پا ہوتے ہیں، لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ صبح کاذب دراصل رات کی روشنی ہے، نہ کہ دن کی، اس لیے اس کا نام کاذب ہے، اور ''صبح کاذب'' میں یہ ''کاذب'' صبح کی صفت ہے، یعنی یہ صبح نہیں ہے، اور اس کا صبح سے تعلق نہیں ہے، جس طرح ستاروں وغیرہ کا صبح سے تعلق نہیں، وہ بنیادی طور پر رات کو چمکتے ہیں، لیکن کچھ ستارے صبح صادق کے کچھ بعد تک بھی نظر آ سکتے ہیں۔

افسوس کہ کم فہمی، یا غلط فہمی کی وجہ سے لاکھوں ستاروں کی روشنیوں کے بارے میں جو بات تسلیم شدہ ہے، وہ ایک صبح کاذب کی روشنی میں کیوں تسلیم نہیں۔

اللہ تعالیٰ کم علمی اور ضد بازی سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

23 صفر 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 5، فروری 2018ء - جمادی الاولیٰ 1439ھ)

---

(90)

''اللہ'' کے لیے ''خدا'' کے لفظ کا استعمال

آج کل اللہ تعالیٰ کے لیے لفظِ ''خدا'' کے استعمال کے جائز و ناجائز ہونے میں بہت زیادہ غلو اور افراط و تفریط ہو رہی ہے، ایک فریق، اللہ عزّ وجلّ کے لیے لفظِ ''خدا'' کے استعمال کو سراسر حرام قرار دیتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ ''خدا'' کا لفظ قرآن وسنت میں کسی بھی جگہ استعمال نہیں کیا گیا، لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی، یا صفاتی نام نہ ہوا، اور اس کا استعمال حرام و ناجائز ہوا۔

اور دوسرا فریق اس سے اختلاف کرتے ہوئے لفظِ ''خدا'' کے استعمال کو بالکل جائز و درست قرار دیتا ہے، اور اپنی تحریر و تقریر میں جا بجا لفظِ ''خدا'' کا استعمال کرتا ہے، اور اس کے استعمال میں کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

بندہ ان دونوں فریقوں کے بجائے درمیانی اور معتدل موقف رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ ''خدا'' کا

لفظ، لفظِ ''اللہ'' کے درجہ کا نہیں ہے ''اللہ'' ذاتِ باری تعالیٰ کا ذاتی نام ہے، اور یہ درجہ کسی اور نام کو حاصل نہیں، اسی طرح اللہ عزّ وجلّ کے جن صفاتی ناموں کا ذکر قرآن وسنت میں آیا ہے، اور ان کو اسمائے حسنیٰ کہا جاتا ہے، ان کا درجہ اور حیثیت دوسری زبانوں کے صفاتی ناموں سے افضل اور اعلیٰ ہے، لہٰذا حتی الامکان لفظِ ''اللہ'' کو اور ضرورت وموقع کی مناسبت سے قرآن وسنت میں مذکور عربی صفاتی ناموں کو استعمال کرنا چاہئے، کیونکہ قرآن وسنت میں مذکورہ ناموں کی حیثیت یقیناً لفظِ ''خدا'' سے بہتر اور افضل ہے، جو کہ قرآن وسنت میں مذکور نہیں، کیونکہ لفظِ ''خدا'' عربی زبان کا لفظ نہیں، بلکہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔

لیکن لفظِ ''خدا'' کے استعمال کو ناجائز، یا بدعت قرار دینے سے بندہ کو اتفاق نہیں، کیونکہ یہ لفظ ''اللہ'' کے صفاتی نام کی حیثیت سے عرف میں استعمال ہوتا رہا ہے، اور عربی کا لفظ نہ ہونے سے اس کا ناجائز ہونا لازم نہیں آتا، جیسا کہ لفظِ ''نماز'' عربی کا لفظ نہیں، لیکن اسلام کے ایک رکن کے لیے عرف میں استعمال ہوتا ہے، اس کو بھی عربی کا لفظ نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہندوستان و پاکستان کے بہت سے علاقوں میں پہلے ایک زمانہ تک فارسی زبان کا استعمال رہا ہے، اس کی کچھ باقیات اب بھی ہمارے یہاں کی عرفی زبان میں پائی جاتی ہیں، بلکہ خود اردو زبان بھی دراصل مختلف زبانوں سے مرکب ہے، جس میں عربی، فارسی وغیرہ کے الفاظ بھی جابجا شامل ہیں۔

لہٰذا جب بات اردو زبان میں ہورہی ہو، اور ''نماز'' کا ذکر کرنے کی ضرورت پیش آئے، اور کوئی شخص اس لفظ کے قرآن وسنت میں مذکور نہ ہونے، بلکہ عربی زبان کا نہ ہونے کی وجہ سے منع کرے، یا بدعت و ناجائز قرار دے، تو اس کو درست نہیں کہا جاسکتا، ظاہر بات ہے کہ قرآن وسنت میں مذکور لفظِ ''صلاۃ'' سے عام لوگ مطلب نہیں سمجھیں گے، اور بات کرنے کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔

اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ ہر چیز کو اس کے درجہ پر رکھنا ضروری ہے، یہی اس کا اعتدال ہے، اور کسی چیز کو اس کے درجہ سے گھٹانا، یا بڑھانا، افراط وتفریط میں داخل ہو کر ممنوع، یا مفسدہ کا سبب ہے۔

دراصل آج کل لوگوں میں امانت ودیانت کا فقدان ہوتا جا رہا ہے، اور دین کی تحقیق اور لوگوں کے عمل کی اصلاح کے بجائے بہت سے لوگوں کا مقصد اپنے مدِّ مقابل دوسرے مسلک کو نیچا دکھانا اور اپنے آپ کو اونچا دکھانا، یا بالفاظِ دیگر اپنی دہی کو میٹھی اور دوسرے کی دہی کو کھٹی قرار دلوانا بن گیا ہے، جو کہ تعصب میں داخل ہے، اس لیے اس قسم کی بے اعتدالیاں اور اختلاف میں شدت لازم آ رہی ہے، اللہ حفاظت فرمائے۔ آمین۔

21 صفر 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 5، فروری 2018ء - جمادی الاولیٰ 1439ھ)

---

(91)

موجودہ انگریزی اعداد وشمار کے ہندسوں کا حکم

موجودہ دور میں ہمارے یہاں معروف اردو، یا عربی رسم الخط میں ہندسوں کا استعمال بہت کم ہو گیا ہے، اور ان کا استعمال خاص دینی مدارس وغیرہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، اور عوام الناس میں ان ہندسوں کی شناسائی نہیں رہی، بعض اوقات مختلف ذرائع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دینی کتابوں کے اوراق اور صفحات میں بھی اردو وعربی والے ہندسوں کو پڑھنا، یا سمجھنا بہت سے عوام کے لیے مشکل ہوتا ہے، بعض اوقات ایسے واقعات بھی ہمارے سامنے آئے کہ کسی دینی کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کی پیسٹنگ کرنے، یا بائنڈنگ کرنے والے صاحب کو صفحہ کے ہندسوں کی صحیح سمجھ نہیں آئی، اور ان کی غلط پیسٹنگ کر دی، یا غلط بائنڈنگ کر دی، جس کی وجہ سے بعد میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

بعض اوقات کسی شخص نے فون پر کتاب کی کسی عبارت کو سمجھنا چاہا، لیکن وہ اس کے صفحہ نمبر کو صحیح نہیں بتا سکا۔اس طرح کے اور بھی واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔

ان حالات اور واقعات کی وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ کتابوں کے صفحات وغیرہ پر موجودہ انگریزی کے معروف رسم الخط میں اعداد و شمار لکھے جائیں، تاکہ دین کی تعلیم کے سلسلہ میں عوام کو رکاوٹ پیش نہ آئے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی کہ موجودہ انگریزی رسم الخط والے ہندسے، کیا واقعتاً انگریزوں کی ایجاد ہیں؟ تو بعض حضرات کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ بنیادی طور پر عرب کے استعمال والا رسم الخط ہے، اور اب بھی عرب میں، بلکہ بلانکیر متعدد دینی طبقات وشعبات میں اس کا عام استعمال ہوتا ہے،اس تحقیق کے بعد بندہ نے لوگوں کے لیے نشر و اشاعت والے مواد میں ان ہندسوں کا استعمال شروع کر دیا، لیکن محدود سطح پر اور نجی و ذاتی مقاصد کے لیے اب بھی اپنے اردو رسم الخط والے ہندسوں کا حتی الامکان استعمال جاری ہے، تاکہ ان کا بالکلیہ متروک ومہجور ہونا لازم نہ آئے۔25 صفر 1439 ہجری

(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد 15 شمارہ 6، مارچ 2018ء - جمادی الاخریٰ 1439ھ)

---

(92)

مشورہ اور اعتراض

بعض حضرات ہمارے ماہنامے اور کتابوں کے مضامین پڑھ کر ہمدردانہ مشورہ اور خیر خواہی کے جذبہ سے بعض نصائح فرماتے رہتے ہیں، فون پر بھی اور بعض اوقات زبانی بھی، اور بعض اوقات کسی خط وغیرہ کے ذریعہ سے تحریری طور پر بھی۔

اور بعض حضرات زبانی، یا تحریری طور پر مختلف قسم کے اعتراضات بھی کرتے رہتے ہیں۔

بہر حال ہمدردانہ وخیر خواہانہ مشورہ ہو، یا اعتراض، ہم اس سلسلہ میں فیما بیننا و بین اللہ

یعنی دیانتاً منصفانہ غور وفکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں، بے شک اس طرح کے امور پیش کرنے والے کے متعلق یہ معلوم کیوں نہ ہوجائے کہ وہ ہمارا معاند ہے، کیونکہ اچھی اور مفید بات جس سے بھی ملے، اسے قبول کرلینا مومن کی شان ہے، لیکن اگر دوسرے کے مشورہ، یا اعتراض کے حق وصواب ہونے کی طرف رجحان نہ ہوسکے، تو پھر اس کو قبول کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں، اور ایسی صورت میں مشورہ دینے، یا اعتراض کرنے والے کو بھی حق نہیں کہ وہ دوسرے کو اپنے مشورہ، یا اعتراض کو قبول کرنے کا پابند ومکلّف سمجھے، یا اس پر نکیر کرے، مشورہ دینے والے کے لیے حکم ہے کہ وہ دیانت داری اور ذمہ داری سمجھ کر مفید مشورہ دے، اور پھر اپنے آپ کو فارغ کرلے، اسے مشورہ دینے کے بعد اس کا منتظر رہنا کہ اس کے مشورہ پر عمل کیا جائے، اور مشورہ کے مطابق عمل نہ ہونے پر خفگی کا اظہار، یا ردِعمل کرنا درست نہیں، بلکہ یہ مشورہ کے احکام وآداب سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

آج کل ہمارے یہاں کی معاشرت میں بڑی کوتاہیاں پیدا ہوگئی ہیں، جن کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے، اس مقصد کے لیے بندہ نے ایک مفصل کتاب ''حسنِ معاشرت اور آدابِ زندگی'' تحریر کی ہے، جو بحمداللہ طبع ہوچکی ہے، اس کتاب میں مشورہ کے آداب کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اور خاص مشورہ سے متعلق بھی بندہ کی ایک مستقل تالیف ہے۔ 28 صفر 1439ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد15 شمارہ6، مارچ2018ء - جمادی الاخریٰ1439ھ)

---

(93)

قرآن مجید کے ترجمہ کے لیے اہم چیز

قرآن مجید کے ترجمہ کے لیے میں ذاتی طور پر اس چیز کو ترجیح دیتا ہوں کہ ترجمہ لفظ بلفظ ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو الفاظ وکلمات اختیار فرمائے ہیں، ترجمہ میں حتی الامکان ان الفاظ وکلمات اور نظم کی ترتیب کا لحاظ کیا جائے، اور اگر ترجمہ سے اللہ کے کلام کی کوئی بات

سمجھ نہ آئے، تو اس کی توضیح الگ سے تفسیر وتشریح کے طور پر ذکر کی جائے۔

کیونکہ ترجمہ اور تفسیر، یا تشریح دو الگ الگ چیزیں ہیں، اس لیے دونوں کو الگ الگ ہی رکھنا مناسب ہے، اور دونوں کو خلط ملط کرنا مناسب نہیں۔

آج کل بعض حضرات ایسے سلیس ترجمہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، جس میں قرآن مجید کے الفاظ وکلمات اور نظم کی رعایت نہیں ہوتی، حالانکہ اس کی وجہ سے کئی کمزوریاں لازم آسکتی ہیں، مثلاً ممکن ہے کہ سلیس کرنے میں اس کی اس تفسیر کی رعایت کی گئی ہو، جو مترجم کے نزدیک راجح، یا مشہور ہو، لیکن اس کی وجہ سے دوسری تفاسیر کی رعایت فوت ہوگئی ہو، جبکہ دوسری تفسیر کے راجح ہونے کا بھی احتمال ہے۔

اسی طرح ترجمہ کو سلیس کرنے کی کوشش میں بعض اوقات قرآن مجید کے الفاظ وکلمات اور ترتیب کے ذریعہ سے حاصل ہونے والے احکام ونکات اور فوائد بھی فوت ہوجاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات غلط معنیٰ بن جاتے ہیں، میں نے خود ایسے بعض ترجمے دیکھے ہیں۔

اس لیے میرے نزدیک قرآن مجید کا ترجمہ ایسا کرنا مناسب ہے، جس میں حتی الامکان جملہ ممکنہ ومناسب تفاسیر کی رعایت پائی جائے، اور وہ ترجمہ حتی الامکان ان تمام تفاسیر کا احتمال رکھتا ہو، جس طرح اللہ کا کلام رکھتا ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ کا کلام تو قطعی ہے، لیکن اس کی ہر بیان کردہ تفسیر اور مطلب پر اس کی دلالت کا قطعی ہونا ضروری نہیں، بلکہ بعض بیان کردہ تفاسیر اور مطالب ظنی، یا اس سے نیچے درجہ کے بھی ہوسکتے ہیں، پس کسی ظنی، یا اس سے نیچے درجہ کی چیز میں اللہ کے کلام کو محدود کرنا مناسب نہیں، اور اسی لیے میرے نزدیک ترجمہ میں حتی الامکان ان امور کی رعایت بہت اہم ہے، اور اس سلسلہ میں کئی ترجموں میں کمزوری پائی جاتی ہے۔

3 ربیع الاول 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 7، اپریل 2018ء - رجب المرجب 1439ھ)

www.idaraghufran.org

(94)

اثباتِ حرام کے لیے تکلف وتعمق کا نقصان

علماء وفقہاء میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا ہے کہ اللہ کی پیدا کردہ اشیاء اور مخلوق میں اباحت وحلت اور طہارت اصل ہے، یا حرمت ونجاست وغیرہ اصل ہے؟

لیکن بہت سے حضرات نے ترجیح اس کو دی کہ اشیاء کے اندر حلت و واباحت کا ہونا اصل ہے، ہمارا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے، جس کے دلائل زیادہ قوی اور مستحکم ہیں۔

اور امت کا تعامل بھی اسی پر ہے، بلکہ اس کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں زندگی گزارنا مشکل ہے۔

مثلاً میں نے پاک سمجھ کر کپڑے پہن رکھے ہیں، جن کو پہن کر میں نماز بھی پڑھتا ہوں، لیکن میرے پاس ان کے پاک ہونے کی دلیل نہیں ہے، بغیر دلیل کے ہی میں نے ان کو پاک سمجھ رکھا ہے، کیونکہ اصل اشیاء میں حلت واباحت ہے، اسی طرح میرے سامنے روزمرہ کھانے پینے کی مختلف اشیاء آتی ہیں، جن کو میں تحقیق وجستجو کے بغیر استعمال کرتا ہوں، کیونکہ اصل اشیاء میں اباحت وحلت ہے۔

اسی طرح آپ اگر تاجر ہیں اور آپ کے پاس کوئی شخص خریداری کرنے کے لیے آتا ہے، یا آپ کو کوئی مسلمان کھانے پینے کی چیز پیش کرتا ہے، تو آپ دلیل کے بغیر اس کے ساتھ خرید و فروخت کا معاملہ کرتے ہیں، اور بے دھڑک کھاتے پیتے ہیں، اور اس کے حلال وحرام ہونے کی تحقیق وجستجو میں نہیں پڑتے، جس کا احادیث میں بھی ذکر آیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کے یہاں جائے، اور وہ اس کو کوئی کھانا کھلائے، تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کا کھانا کھالے، اور اس سے اس کے (حلال وحرام کے) متعلق کھود کرید نہ کرے، اور اگر کوئی چیز پلائے تو اسے چاہئے کہ اُس چیز کو پی لے، اور اس کے متعلق (حلال وحرام ہونے

کی) کھود کرید نہ کرے۔[1]

مگر افسوس کہ آج بہت سے اہلِ علم حضرات کو بھی شریعت کی ان بنیادی تعلیمات کی طرف توجہ نہیں، اور وہ خوامخواہ ہر چیز کے اندر، خاص طور پر مشتبہ چیز میں حلال اور طہارت کی دلیل کے متلاشی رہتے ہیں، اور اس کی تحقیق وجستجو میں بہت محنت وجدوجہد کرتے ہیں، جس کے نتیجہ میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں، اس مقصد کے لیے بڑے بڑے اجتماعات اور کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں، مگر ''مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی'' والی کہاوت صادق آتی ہے۔

عام طور پر مشتبہ چیز کی تحقیق وجستجو کے نتیجہ میں اس طرح کا مسئلہ منقح اور صاف نہیں ہوتا، جس کی وجہ یہ ہے کہ احادیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ ''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، اور ان کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں، جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے'' ایسی صورت میں ان سے بچنے میں احتیاط ہے، اور احتیاط کی خلاف ورزی حرام نہیں کہلاتی۔

اگر کسی کو زیادہ ہی احتیاط مطلوب ہے، تو اسے چاہیے کہ مشتبہ چیز کو ترک کردے۔[2]

اور اگر دوسرا مشتبہ چیز کو اختیار کرتا ہے، تو اس پر نکیر نہ کرے، خاص طور پر جبکہ وہ عامی شخص ہو، اور وہ چیز بھی ایسی ہو، جس میں ابتلائے عام ہو۔

---

[1] إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم، فأطعمه طعاما، فليأكل من طعامه، ولا يسأله عنه، وإن سقاه شرابا من شرابه، فليشرب من شرابه، ولا يسأله عنه (مسند احمد، رقم الحديث ۹۱۸۴)

[2] عن عامر قال: سمعت النعمان بن بشير يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: الحلال بين والحرام بين، وبينهما مشبهات، لا يعلمها كثير من الناس، فمن اتقى المشبهات استبرأ لدينه وعرضه، ومن وقع فى الشبهات كراعى يرعى حول الحمى يوشک أن يواقعه، ألا وإن لكل ملک حمى، ألا إن حمى الله فى أرضه محارمه(صحيح البخارى،رقم الحديث ۵۲، كتاب الايمان،باب فضل من استبرأ لدينه)

عن ابن عمر عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: الحلال بين ، والحرام بين ، فدع ما يريبک إلى ما لا يريبک(المعجم الصغير للطبرانى،رقم الحديث ۳۲، ج ۱ ص ۴۱، باب الالف)

قال الهيثمى:وإسناد الصغير حسن(مجمع الزوائد ، تحت رقم الحديث ۶۳۰۷ ،باب اجتناب الشبهات)

www.idaraghufran.org

اوراس طرح کی مشتبہ چیزوں میں عام طور پر فقہی اختلاف بھی رونما ہوجاتا ہے، اگرایک فقیہ کی تحقیق میں وہ چیز اجتہادی طور پر حرام وناجائز کے ساتھ لاحق ہوتی ہے، تو دوسرے کے نزدیک حلال وجائز کے ساتھ لاحق ہوتی ہے، اور یہ اختلاف بھی عوام کی سہولت کے لیے رحمت بن جاتا ہے۔

لہٰذا ایسے امور میں سختی کرنا مناسب نہیں، فقہائے کرام نے بھی اس سے منع کیا ہے۔

اور ویسے بھی شریعت کا مزاج اس قسم کے تکلفات میں پڑنے کا نہیں ہے۔ [1]

4ربیع الاول 1439ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد15 شمارہ7، اپریل 2018ء - رجب المرجب 1439ھ)

---

(95)

مذہبی انتہاء پسندی اوراس کے نتائج

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت ہمارے یہاں کچھ عناصر کی طرف سے مذہبی

---

[1] وأما المشتبهات فمعناه أنها ليست بواضحة الحل ولا الحرمة فلهذا لا يعرفها كثير من الناس ولا يعلمون حكمها وأما العلماء فيعرفون حكمها بنص أو قياس أو استصحاب أو غير ذلک فإذا تردد الشيء بين الحل والحرمة ولم يكن فيه نص ولا إجماع اجتهد فيه المجتهد فألحقه بأحدهما بالدليل الشرعی (شرح النووی علی مسلم، ج ١١ ص٢٧، ٢٨، کتاب البيوع، باب أخذ الحلال وترک الشبهات)

فإذا تردد الشيء بين الحل والحرمة ولم يكن نص ولا إجماع اجتهد فيه المجتهد وألحقه بأحدهما بالدليل الشرعی، فالمشتبهات على هذا فی حق غيرهم وقد يقع لهم حيث لا يظهر ترجيح لأحد الدليلين، وهل يؤخذ فی هذا المشتبه بالحل أو الحرمة أو يوقف؟ وهو كالخلاف فی الأشياء قبل ورود الشرع، والأصح عدم الحكم بشیء لأن التكليف عند أهل الحق لا يثبت إلا بالشرع، وقيل الحل والإباحة، وقيل المنع، وقيل الوقف .وقد يكون الدليل غير خال عن الاحتمال فالورع تركه(إرشاد الساری لشرح صحيح البخاری، للقسطلانی، ج ١، ص١٤٣، كتاب الإيمان، باب فضل من استبرأ لدينه)

المختار أن الأصل الإباحة عند الجمهور من الحنفية والشافعية اهـ (رد المحتار على الدر المختار، ج ١ ص١٠٥، كتاب الطهارة، مطلب المختار أن الأصل فی الأشياء الإباحة)

www.idaraghufran.org

انتہاء پسندی کا معاملہ بہت آگے بڑھ گیا ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات ہماری ریاست بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے، ورنہ انتشار وافتراق اور جانی ومالی نقصانات تو آئے دن کا معمول بن گئے ہیں۔

بعض عناصر کے مذہبی انتہاء پسندی کے واقعات کی وجہ سے دنیا بھر میں مسلمانوں کے تشخص پر بھی آنچ آتی ہے، اور ملک کا معاشی نقصان الگ ہوتا ہے۔

غرضیکہ مذہبی انتہاء پسندی اور اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والے واقعات کے نقصانات بہت زیادہ ہیں، جن کو مختصر وقت میں بیان کرنا مشکل ہے۔

دوسری طرف قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ کوئی فریق، یا جماعت اپنے آپ کو مذہبی انتہاء پسندی کا شکار سمجھنے کے لیے تیار نہیں، بلکہ ہر ایک اپنے مقابلہ میں دوسری جماعت، یا دوسرے فریق کو مذہبی انتہاء پسندی کا الزام عائد کرنے، اور اپنے آپ کو اعتدال پسند کہلوانے میں مصروف ہے۔

اور تیسری قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ مذہبی انتہاء پسندی کی نشاندہی کرنے اور اس کی اصلاح کی طرف ہمارے مصلحانِ قوم کی بھی توجہ نہیں، بلکہ بہت سے مقتداء و پیشوا حضرات خود برسرِ عام مذہبی انتہاء پسندی کے خلاف تعلیم وتربیت دینے کے بجائے انتہاء پسندی کی تعلیم وتربیت دینے میں مصروف ہیں، اگرچہ وہ اپنے آپ کو معتدل اور غیر انتہاء پسند کیوں نہ سمجھتے اور قرار دیتے ہوں۔

چوتھی قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ اگر کسی اللہ کے بندہ کو مذہبی انتہاء پسندی کی طرف توجہ دلانے اور اس کو ترک کرانے کی توفیق ہوتی ہے، تو اس بے چارہ کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے، اور بعض اوقات اپنے تربیت یافتہ انتہاء پسندوں کو اس کے خلاف چڑھ دوڑایا جاتا ہے۔

اس میں عوام کے اس طبقہ کا بھی بڑا ہاتھ ہے، جو اپنے مذہب اور دین کے مفہوم کو محدود وانتہاء پسندوں کے رحم وکرم پر چھوڑے رکھتا ہے، اور اس سے ذرہ برابر ہٹنے اور تحقیق، یا نظرِ ثانی

کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ اصلاح اور اعتدال کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

10 ربیع الاول 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 7، اپریل 2018ء - رجب المرجب 1439ھ)

---

(96)

علمائے سوء کی بہتات وکثرت

موجودہ زمانہ میں علمائے سوء کی بہتات وکثرت ہے، جن کی وجہ سے عام مسلمانوں کے دین کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے، اور خود علمائے حق بھی ان کی وجہ سے بدنام ہو رہے ہیں، بلکہ ان علمائے سوء کے کردار اور طرزِ عمل کی وجہ سے اب ہمارے عام معاشرہ میں عالم اور مولوی اور اس سے بڑھ کر مفتی کی کوئی عزت اور وقعت نہیں رہی۔

اور حد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کو علماء ومفتیانِ کرام کے نام سے ہی چڑ ہوگئی ہے، اس صورتِ حال کے پیدا ہونے میں علمائے سوء کے کردار کا بہت بڑا دخل ہے۔

اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ جتنی ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کے دلوں میں علمائے کرام کی عظمت واحترام کو پیدا کیا جائے، اتنی ہی ضرورت، بلکہ اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ علمائے کرام کی صحیح تعلیم وتربیت کی جائے، ان میں دین کا سچا جذبہ اور اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، خاص طور پر مال ودولت کی بے جا حرص وہوس سے نفرت دلانے کی کوشش کی جائے، اور اخلاقیات کو بہتر بنانے پر زور دیا جائے، اور علمائے کرام ومفتیانِ عظام کے نام سے جو علمائے سوء کالی بھیڑوں کی شکل میں جماعتِ علماء کے اندر داخل ہوگئے ہیں، اس طرح کے لوگوں کی کسی مسلک کی تفریق کے بغیر حوصلہ شکنی کی جائے، اور ان کی نشاندہی کی جائے، تاکہ علمائے حق اور علمائے سوء میں فرق پیدا ہو، اور اہلِ حق اور اہلِ باطل میں التباس واختلاط پیدا نہ ہو۔

مگر افسوس ہے کہ اس کام کی طرف اہلِ علم کے مقتداء حضرات کی خاطر خواہ توجہ نہیں، اور اگر ہے بھی، تو صرف مسلکی حد تک کہ اپنے مسلک کے علماء کو علی الاطلاق اہلِ حق، یا علمائے حق، اور دوسرے مسلک کے علماء کو علی الاطلاق اہلِ باطل، یا علمائے سوء قرار دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے تقریباً ہر مسلک میں علمائے سوء کی کافی بڑی تعداد موجود ہے، جن سے کوئی مؤاخذہ کرنے اور باز پرس کرنے والا نہیں، بلکہ اب تو یہ حالت ہے کہ علمائے سوء کے کردار کی وجہ سے اگر غیر علماء، مثلاً سیاسی، یا عوامی لوگوں کو شکایت ہوتی ہے، تو اس جماعت کے علماء تعصب وتحزب کی خاطر علمائے سوء کی بے جا نصرت وحمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جس سے علمائے سوء کی حوصلہ شکنی کے بجائے حوصلہ افزائی ہوتی، اور ان کی طرف سے سیئات پر مزید جرائت پیدا ہوتی ہے، اور اس طرح رفتہ رفتہ تقریباً ہر مسلک میں علمائے سوء کی تعداد و مقدار بڑھتی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ آمین۔ 15 ربیع الاول 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 7، اپریل 2018ء - رجب المرجب 1439ھ)

---

(97)

حدیث کی سند کے قواعد، بزرگیت سے جدا ہیں

ایک مرتبہ بندہ محمد رضوان کا ایک علمی مجلس میں جانا ہوا، وہاں پر کچھ اہلِ علم حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں سے ایک صاحب نے بندہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ کی ''درود شریف کے فضائل واحکام'' نامی کتاب میں جمعہ کے دن عصر کی نماز کے بعد اُسی حالت پر اور اُسی جگہ بیٹھے بیٹھے 80 مرتبہ پڑھے جانے والے مخصوص درود شریف اور اس کی وجہ سے 80 سال کے گناہ معاف ہونے، 80 سال کے درجات بلند ہونے اور 80 سال کی عبادت کا ثواب حاصل ہونے کی مخصوص فضیلت والی حدیث کے متعلق تحریر ہے کہ یہ حدیث معتبر ومستند طریقہ پر دستیاب نہیں ہو سکی، اس لیے اس پر عقیدہ رکھنا احتیاط کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس پر ایک عالم صاحب کا کہنا یہ ہے کہ فضائلِ درود، جس کو حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ نے تالیف فرمایا ہے، جمعہ کے دن مخصوص درود کی فضیلت سے متعلق یہ حدیث حضرت شیخ کی اس کتاب میں موجود ہے، اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ کا درجہ اور بزرگ ہونا، مفتی محمد رضوان صاحب سے زیادہ ہے، اس لیے ہم اس سلسلہ میں مفتی صاحب کی تحقیق کو نہیں مانتے، بلکہ حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ کی بات کو مانیں گے۔

اس کے جواب میں بندہ محمد رضوان نے عرض کیا کہ اولاً تو میرا مقصود کسی کو زبردستی اپنی بات منوانا ہی نہیں، اگر کوئی نہیں مانتا، تو نہ مانے، ہمارا اس سے جھگڑا نہیں، اسے اگر میرے بجائے کسی اور عالم ومحقق کی بات پر اعتماد واعتقاد ہو، تو اسے اس عالم ومحقق کی بات پر عمل کر لینے کا حق ہے، بشرطیکہ اُسے اس کی بات پر اپنی علمی بساط کی حد تک اطمینان ہو، میں نے تو اس میں اپنی رائے اور اپنی تحقیق لکھی ہے، پس اگر کوئی بندہ کی رائے کو راجح سمجھتے ہوئے قبول کرتا ہے، اس پر بھی کسی دوسرے کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

بندہ کی درود شریف کے متعلق کتاب کے اندر مذکورہ حدیث کے متعلق اجمالی طور پر اور نہایت مختصر انداز میں حکم بیان کیا گیا تھا، جس کے بعد کراچی کے ایک ماہنامہ میں اس سلسلہ میں مضمون نظر سے گزرا، جس میں مضمون نگار نے اس حدیث کی اسنادی تحقیق کا دعویٰ فرمایا تھا، اور عنوان بھی اسی نوعیت کا تھا، لیکن پورا مضمون اس حدیث کی اسنادی تحقیق سے عاری وخالی تھا، اور زیادہ زور اسی پر دیا گیا تھا کہ اس حدیث کو نقل کرنے والے فلاں فلاں حضرات ہیں، جن کا علمی مقام اتنا اور اتنا بلند ہے، وغیرہ وغیرہ، جس کے بعد بندہ نے اس موضوع پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیا تھا، اور وہ مضمون ایک مستقل رسالہ کی شکل میں ''جمعہ کے دن درود کی تحقیق'' کے عنوان سے بحمد اللہ تعالیٰ تیار ہو گیا ہے، جس میں اس موضوع کے متعلقہ پہلوؤں پر تحقیقی کلام کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ تفصیلی مضمون قسط وار، ماہنامہ ''التبلیغ'' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

جب اس مضمون کی پہلی قسط ماہنامہ ''التبلیغ'' میں شائع ہوئی، اس وقت بندہ کے موبائل فون پر دو مرتبہ ایک صاحب کا اسی طرح پیغام ومیسج پہنچا، جس میں کوئی تحقیقی بات کرنے کے

بجائے، اسی طرح کی باتیں درج تھیں کہ فضائلِ اعمال اتنی اہم کتاب ہے، اور یہ اتنی جگہ پڑھی جاتی ہے، اور اس کتاب پر آج تک ہمارے بڑوں نے اعتراض نہیں کیا، وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ کسی کتاب پر اعتراض کرنے اور کسی حدیث کی اسنادی تحقیق میں بڑا فرق ہے، بندہ نے اس پیغام کے جواب کی ضرورت نہیں سمجھی، اور نہ ہر شخص کے اعتراض کا جواب دینا کوئی عقل مندی ہے، بالخصوص جب معترض کے انداز سے محسوس ہو رہا ہو کہ اس کا مقصد بات کو سمجھنا نہیں، بلکہ تنقید برائے تنقید ہے۔

پھر بندہ نے ان صاحب سے جنہوں نے مجھ سے حضرت شیخ الحدیث اور بندہ کی بزرگیت میں تقابل سے متعلق گفتگو نقل کی، عرض کیا کہ میں نے اپنی درود شریف سے متعلق اس کتاب میں کہاں لکھا ہے کہ میرا درجہ اور بزرگیت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ سے زیادہ ہے، اور میں نے اپنے بزرگ ہونے کا دعویٰ کب کیا ہے، بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میرے جیسے دس اور حضرات بھی جمع ہو جائیں، تو وہ بھی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ اور سب علماء اور بزرگ مل کر بھی ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتے، اور ان کی وجہ سے حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق وتخریج کے اصول متاثر نہیں ہو سکتے، اور نہ ہی احادیث کی اسنادی تحقیق کے دروازے بند ہو سکتے۔

اس لیے ان تمام باتوں کے باوجود حدیث کی اسنادی اہمیت وحیثیت کی تحقیق اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ احادیث کی تحقیق اور احادیث کی جرح وتعدیل اور تضعیف وتصحیح کے قواعد بزرگیت سے جدا ہیں، اور عربی کا یہ قاعدہ تو بہت مشہور ہے کہ:

"لکل فن رجال"

"کہ ہر فن کے رجال ہوتے ہیں"

مطلب یہ ہے کہ ہرفن کے متعلق بات اس کے رجال کی ہی معتبر ہوا کرتی ہے۔

حیرت ہے کہ اعتراض کرنے والوں کو جو کام کرنا چاہیے تھا، وہ تو ان سے نہیں ہوسکا، الٹا کام کرنے والوں کو قصوروار ٹھہرانا شروع کردیا۔

اصل کام کرنے کا یہ تھا کہ تحقیق کے نتیجہ میں جس حدیث کی سند ثابت نہ ہو، یا وہ شدید ضعیف، یا موضوع وغیرہ ہو، اس کی نشاندہی کریں، اس کے بیان کرنے اور اس کے مضمون پر اعتقاد رکھنے سے لوگوں کو منع کریں، اگر ان کو اس سے اختلاف ہو، تو ان کے ذمہ لازم ہے کہ اس حدیث کا باسند اور صحیح ہونا ثابت کیا جائے، اور اگر وہ ایسا نہ کرسکیں، تو پھر کسی بزرگ، یا کتاب پر اعتماد کے عنوان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کرانے کے گناہ کو برداشت کرلینا، جس پر سخت وعیدیں آئی ہیں، کسی طرح بھی عقلمندی کا تقاضا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج سے پہلے بھی بڑے بڑے بزرگ گزرے ہیں، جن کی کتابوں میں ایسی احادیث موجود ہیں، جو سند کے اعتبار سے مستند ومعتبر ثابت نہیں ہوئیں، اور ان کو بعد کے ایسے حضرات نے غیر ثابت وغیر معتبر قرار دیا، جن کا درجہ ان احادیث کو نقل کرنے والے بزرگوں سے کم تھا، لیکن اس کی وجہ سے نہ تو بزرگوں کی کتابوں سے اعتماد اٹھا، اور نہ ان کتابوں کی اشاعت بند کی گئی، بلکہ اس کی وجہ سے ان کتابوں کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا کہ صحیح اور غیر صحیح اور قوی وضعیف وغیرہ میں امتیاز ہوگیا۔

چنانچہ امام غزالی اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہما اللہ وغیرہ کی کتابوں میں ایسی بے شمار احادیث وروایات درج ہیں، جن کی بعد کے حضرات نے تحقیق کر کے تردید فرمائی، اور ان کو بے اصل وغیرہ قرار دیا۔

علامہ عراقی رحمہ اللہ نے امام غزالی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب ''احیاء العلوم'' کی احادیث کی تحقیق وتخریج پر کام کیا ہے، اور تحقیق کے دوران بے شمار احادیث کے متعلق فرمایا کہ:

''لا اصل لہٗ''

کہ ''اس حدیث کی کوئی اصل نہیں''

لیکن اس کی وجہ سے امام غزالی رحمہ اللہ کی بزرگیت میں خلل نہیں آیا، اور نہ ہی کسی عالمِ دین نے علامہ عراقی اور امام غزالی رحمہما اللہ کی بزرگیت کے درجات کی بحث کی۔

یہی نہیں، بلکہ بڑے بڑے محدثین کی روایت کردہ بے شمار احادیث کے متعلق بھی بعد کے حضرات نے تحقیق وتخریج کے نتیجہ میں غیر ثابت، یا شدید ضعیف اور موضوع، یا ضعیف وغیرہ ہونے کا حکم لگایا ہے۔

چنانچہ امام ترمذی کی ''**سنن الترمذی**'' اور امام ابنِ ماجہ کی ''**سنن ابنِ ماجه**'' اور امام ابوداؤد کی ''**سنن ابی داؤد**'' اور امام احمد بن حنبل کی ''**مسند الامام احمد بن حنبل**'' وغیرہ کی احادیث پر ہر دور میں بحث وتحقیق ہوتی رہی، احادیث کی شروحات وتخریجات سے متعلق کتابوں میں ان کی تفصیل موجود ہے۔

لیکن اس پر یہ اعتراض نہیں کیا گیا کہ امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام ابنِ ماجہ، یا امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ وغیرہ کا درجہ ان بعد کے حضرات سے زیادہ ہے، جنہوں نے ان کی کتابوں میں مذکور احادیث کی اسناد پر جرح کی ہے، اس لیے ہم بعد کے حضرات کی بات نہیں مانیں گے، اور نہ ہی یہ کہا گیا کہ بعد کے حضرات نے یہ تحقیق کر کے اپنے سے پہلے بڑے بڑے محدثین، یا بزرگوں کی شان میں گستاخی، یا بے ادبی کا ارتکاب کیا ہے۔

اس قسم کی باتوں کا دلیل سے تعلق نہیں، بلکہ علمی اعتبار سے اس قسم کی باتیں محض بے وزن ہیں۔

سلفِ صالحین کے زمانے میں اس طرح کی باتیں نہیں ہوتی تھیں، صحابۂ کرام اور خلفائے راشدین سے بھی ان کے چھوٹے حضرات مسائل میں اختلاف کرتے تھے، خود فقہائے کرام اور ائمہ مجتہدین سے ان کے چھوٹوں نے اختلاف کیا، امام محمد اور امام ابو یوسف کا اختلاف تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مشہور ومعروف ہے، لیکن اس وقت بھی اس قسم کی باتیں نہیں کی گئیں، جس قسم کی باتیں آج کل بغلیں بجا بجا کر کی جاتی ہیں، اور ان کو دلیل، بلکہ برہان سمجھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس قسم کے فتنوں سے حفاظت فرمائے، اور ہر چیز میں اعتدال کو قائم رکھنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔ 18 ربیع الاول 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 8، مئی 2018ء - شعبان المعظم 1439ھ)

---

(98)

ہر صدی میں مجدّد ہونے کی توضیح

ایک مرتبہ بندہ کا ایک اجتماع میں جانا ہوا، وہاں بندہ کا بیان بھی رکھا گیا۔

یہ اجتماع حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کی نسبت سے منعقد ہوا تھا، اس موقع پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے متعلق بعض معتقدین حضرات کا طرزِ عمل یہ سامنے آیا کہ وہ ہر مسئلہ میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کی رائے کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں، ان کے مقابلہ میں اُس زمانہ اور اُس زمانہ کے بعد کے کسی فقیہ، محدث ومفتی کی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، خواہ اس کی فقہی رائے، دلائل کی رُو سے کتنی ہی مضبوط اور بعد کے زمانہ کے اقتضاء کے زیادہ موافق ومطابق کیوں نہ ہو، اور کہتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے ''مجدّد'' ہونے کا شرف عطاء فرمایا ہے، یہ شرف کسی دوسرے کو حاصل نہیں، لہٰذا ہم ان کے مقابلہ میں کسی دوسرے کی رائے کو اختیار نہیں کر سکتے۔

بندہ نے اس کی توضیح کی کہ حدیث شریف میں ''ہر صدی کے سرے پر مجدّد دین کی آمد کی پیشن گوئی کی گئی ہے''۔

اور یہ سلسلہ قیامت تک کے لیے ہے، اور محدثین نے مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہر صدی میں ایک سے زیادہ مجدّد دین کا ہونا بھی ممکن ہے، وہ اس طرح کہ کوئی علمِ تفسیر کے اعتبار سے مجدّد ہو، کوئی علمِ حدیث کے اعتبار سے مجدّد ہو، کوئی علمِ فقہ کے اعتبار سے مجدّد ہو، کوئی علمِ قرائت کے اعتبار سے مجدّد ہو، اور کوئی تزکیہ واصلاحِ اخلاق وغیرہ

کے اعتبار سے مجدّد ہو، وغیرہ وغیرہ، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی مجدّد ایسا ہو کہ اس میں ایک سے زیادہ شعبوں کے اعتبار سے مجدّد ہونے کی شان پائی جاتی ہو۔

اور حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجدّد دین کی ہر صدی کے سِروں پر ضرورت پیش آتی رہے گی۔

پھر یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ کسی مجدد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس کو باضابطہ طریقہ پر ''مجدد'' کا لقب دیا جائے، بلکہ حدیث میں ''**من یجدد لها دینها** '' وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ مجدد کے فعلِ تجدید کا ذکر کیا گیا ہے کہ مجدد حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی ہر صدی میں تجدید فرماتے رہیں گے، جس اللہ والے میں یہ فعل وصفت ہو، وہ مجدد ہے، خواہ وہ کسی درجہ کا بھی مجدد ہو۔

لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے کام اور خدمات کی قدر کریں، ان سے استفادہ کریں، اپنی اصلاح کے سلسلہ میں رہنمائی حاصل کریں، لیکن ہر فقہی واجتہادی مسئلہ میں صرف حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کی رائے کو ہر شعبہ اور ہر فن کا حتمی وقطعی مجدّد سمجھ کر اور آخری مجدّد سمجھ کر برتاؤ کرنے سے گریز کریں، اور صدی بدل جانے کے باوجود کسی دوسرے کو مجدّد نہ ماننے، اور اس کی رائے کو تسلیم وقبول نہ کرنے سے اجتناب کریں، کیونکہ یہ طرزِ عمل حدیث اور محدثین کی تشریحات سے میل نہیں کھاتا۔

بندہ کی اس بات کو بعض حضرات نے پسند کیا، بعض نے ناپسند کیا، اور بعض ناقدین نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ شاید بندہ خود اپنے آپ کے ''مجدّد'' ہونے کا راستہ کھولنا اور لوگوں کو اپنا مجدد ہونا باور کرانا چاہتا ہے۔

مگر بندہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا، اس کا حساب تو بندے نے آخرت میں اللہ کو دینا ہے۔

کسی کے کہنے اور اعتراض کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، اصل کلام اس میں ہے کہ بندہ نے جو کچھ

اپنے الفاظ میں بیان کیا، اس کا معنیٰ اور مطلب کیا ہے، رہا بندہ کی نیت کا معاملہ، تو بندہ خود اپنے کلام اور بیان کی نیت کو اچھی طرح جانتا ہے، سمجھتا ہے، جس کے پیشِ نظر بندہ شرح صدر سے یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ مذکورہ حضرات کا اعتراض بدگمانی پر مبنی ہے، بندہ نے نہ تو یہ دعویٰ کیا اور نہ ہی بندہ نے وہ بات اس غرض سے عرض کی، بلکہ بندہ کے پیشِ نظر ایک غلو اور غلط فہمی کو دور کرنا تھا، اور بندہ نے جو بات کہی، وہ حدیث اور اس کی مستند شرح کے عین مطابق ہے، اور اب بھی بندہ کا موقف یہی ہے، جو اوپر ذکر کیا گیا، جس کی خود حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے ارشادات سے بھی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ''امدادُ الفتاویٰ'' میں فرماتے ہیں:

> حق تعالیٰ جل جلالہ کی عادت اس امت میں یوں جاری ہے کہ ہر صدی کے شروع میں ایک مجدد پیدا ہوتا ہے کہ وہ قلع قمع بدعات ومخترعات کی کرتا ہے، جیسے ''رأس مائۃ اولیٰ'' پر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ''مائۃِ ثانیۃ'' پر امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، وعلیٰ ہٰذا القیاس ایسے ہی ہر صدی پر ایک شخص مخربِ دین ماحی آثارِ اسلام متین پیدا ہوا کرتا ہے، جس سے اِندرَاس سنن وشیوع بدعتوں کا ہو

(امدادالفتاویٰ، ج۶ص۱۶۸، بعنوان ''سرسید احمد اور اس کے متبعین کا حکم'' کتاب العقائد والکلام، ناشر: مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید: شعبان ۱۴۳۱ھ، جولائی ۲۰۱۰ء)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ملفوظات میں ایک مقام پر ہے کہ:

> ''ہر صدی پر ایک ''مجدد'' ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ کبھی ایک، کبھی دو، کبھی کئی کئی بھی ہوتے ہیں'' (جدید ملفوظات، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۱، ص۲۱۵، بعنوان ''مجدد کے لیے صاحبِ علم ہونا ضروری ہے، صاحبِ حکومت ہونا ضروری نہیں'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: 2001ء)

ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

مجدد شروع صدی میں ہوتا ہے، مطلب یہ کہ فیضِ اتم اس کا اس صدی کے شروع میں ظاہر ہو، گو وہ پہلی صدی میں پیدا ہوا ہو، اور اس کے کلام میں اثر ہوتا ہے، اس کو وہ بات سوجھتی ہے، جو اس کے بڑوں بڑوں کو نہیں سوجھتی، وہ ہر جزوِ دین میں اصلاح کے لیے دخل دیتا ہے، مجدد کی شان انبیاء کی سی ہوتی ہے، اس سے جو بداعتقاد ہوتا ہے، وہ برکاتِ باطنی سے محروم رہتا ہے، بس مجدد کا منصب صرف اتنا ہے کہ لوگوں نے جو دین میں گڑبڑ اور کمی بیشی کردی ہو، اس کو دور کر کے یہ دکھاوے کہ دین کی اصلی صورت یہ ہے، یہ ضروری نہیں کہ اس سے خواہ مخواہ اس کی اصلاح ہی ہو جائے، عرض کیا گیا کہ آیا ایک وقت میں کئی مجدد بھی ہوتے ہیں؟ فرمایا کہ کیا کئی کئی ڈپٹی کلکٹر نہیں ہوتے (مقالاتِ حکمت، جلد اول، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۲، ص۱۷۸، ملفوظ نمبر ۳۶، بعنوان ''گزشتہ صدی کے مجدد حضرت سید احمد شہید تھے'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے مذکورہ ارشادات سے معلوم ہوا کہ ہر صدی میں مجدد ہوتے ہیں، اور ایک وقت میں ایک سے زیادہ مجدد دین کا ہونا بھی ممکن ہے۔

اسی کے ساتھ مجدد کے اصل فعل وعمل اور تجدیدی کارنامہ کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی، مجدد کی اصل شان اور کام وہی ہے، جس کا حضرت رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا، جس میں یہ صفت اور شان پائی جائے، وہ عنداللہ مجدد ہوگا، خواہ اس کو ''مجدد'' ہونے کا لقب دیا جائے، یا نہ دیا جائے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ملفوظات میں ایک مقام پر ہے:

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا مجدد کا مجدد ہونا کسی دلیلِ قطعی سے معلوم ہوتا ہے؟ فرمایا نہیں، بلکہ دلائلِ ظنیہ سے، چنانچہ اب تک جتنے مجدد ہوئے ہیں، ان کے مجدد ہونے کا علم دلائلِ ظنیہ، یعنی علامات و آثار ہی سے حاصل ہوا ہے، پھر

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت مجدد الف ثانی کے لیے مجدد کا لقب اول کس نے استعمال کیا تھا؟ فرمایا اول مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی نے لکھا تھا، اور ان کے لکھنے کی وجہ ان کی عقیدت تھی، کوئی دلیل قطعی نہ تھی، البتہ اس کا مشہور ہوجانا یہ علامت تھی، اس لقب کے غیبی ہونے کی، پھر ان صاحب نے دریافت کیا کہ کیا مجددِ الف کا مرتبہ مجددِ مائۃ سے بڑھ کر ہوتا ہے؟ فرمایا کہ اس کی کوئی دلیل نہیں، پھر دریافت کیا گیا کہ حضرت مجدد الف ثانی کو مجدد الف ثانی کہنے کی کیا وجہ؟ فرمایا مجدد صاحب جس صدی کے مجدد تھے، وہ صدی اتفاق سے چونکہ الف ثانی کے شروع ہی میں تھی، اس لیے ''الف اول'' کے مجددوں سے امتیاز کے لیے مجدد صاحب کو مجدد الف ثانی کے لقب سے یاد کیا گیا، پھر ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ نووی نے لکھا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک صدی میں کئی مجدد ہوں، مثلاً کوئی شخص ایک جزوِ دین کی اصلاح کے لیے ہے، اور دوسرا دوسرے جزو کی اصلاح کے لیے، مثلاً ایک شخص تفسیر کے اندر جو لوگوں نے غلو کر رکھا ہو، اس کی اصلاح کے لیے ہو، اور دوسرا شخص حدیث کے اندر غلو کی اصلاح کے لیے ہو ''وعلیٰ ھٰذا'' (''الافاضات الیومیہ'' مشمول: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۰، ص۳۵۱، ملفوظ نمبر ۲۵۸، بعنوان ''مجدد الف ثانی کہنے کا سبب'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے مندرجہ بالا اور اس جیسے دیگر ارشادات سے مجدد کی حقیقت اور تفصیل بخوبی معلوم ہوسکتی ہے، جس میں کسی قسم کا ابہام نہیں، لیکن بعض حضرات اس قسم کے امور میں خواہ مخواہ غلو، یا افراط وتفریط کرتے ہیں، جبکہ وہ خود مجدد کی حقیقت اور اس کے فعل وشان سے واقف نہیں ہوتے۔

بندہ، خود حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ سے بہت قریبی نسبت وتعلق اور عقیدت ومحبت رکھتا ہے، لیکن اس میں کسی افراط وتفریط کا قائل نہیں، بلکہ افراط وتفریط کو خود حضرت تھانوی

رحمہ اللہ کی تصریحات وارشادات کے خلاف سمجھتا ہے، جبکہ افراط وتفریط کرنے والے حضرات خود حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی تصریحات کے خلاف افراط، یا تفریط میں مبتلاء ہیں، مگر الزام دوسروں کو دیتے پھرتے ہیں۔

اب کوئی حدیث اور اس سے متعلقہ مستند تشریحات وتوضیحات کے باوجود اس سیدھی سادی بات کو نظر انداز کر کے اس میں کیڑے نکالتا پھرے، اور اس میں کوئی افراط، یا تفریط کرے، تو وہ اس کا اپنا معاملہ ہے، اپنی بدگمانی اور بدزبانی کا وہ خود عنداللہ جواب دہ ہے، بندہ کو اس سے جواب لینے کی ضرورت نہیں، آخر اللہ تعالیٰ نے بھی تو حساب وکتاب کا ایک دن رکھا ہے، اس میں اس طرح کی سب چیزوں کا حساب وکتاب ہونے والا ہے، اللہ اس میں ہم سب کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے۔ آمین۔ 10 ربیع الآخر 1439 ہجری

(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد 15 شمارہ 8، مئی 2018ء - شعبان المعظم 1439ھ)

---

(99)

قیامِ پاکستان سے متعلق افراط وتفریط

بعض اوقات یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کو قائم ہوئے پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے، لیکن اب تک بعض حضرات قیامِ پاکستان کے سلسلہ میں افراط وتفریط اور مختلف قسم کی بے اعتدالیوں کا شکار ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات وہ بڑے بڑے اکابر اور جید علمائے کرام، مثلاً حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب رحمہما اللہ کی شان میں نازیبا الفاظ بھی کہہ بیٹھتے ہیں، اور پھر اپنے موقف کو مضبوط قرار دینے کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال مرحوم کی شان کو بھی گھٹانے، یا بڑھانے، بلکہ ان کے جنت، یا جہنم کے درجات طے کرنے کے فیصلے کرتے پھرتے ہیں، جیسا کہ نعوذ باللہ تعالیٰ ان پر وحی کے ذریعہ سے جبریلِ امین نے ان شخصیات کے متعلق اللہ کا

کوئی حتمی فیصلہ نازل کردیا ہو، استغفر اللہ۔

جہاں بعض حضرات پاکستان کے قیام کی کھل کر حمایت کرتے ہیں، تو دوسری طرف بعض حضرات قیامِ پاکستان کی کھل کر مخالفت کرتے ہیں، اور اس کے قیام کو سراسر غیر شرعی اور غیروں کی سازش قرار دیتے ہیں، اور اس ضمن میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو بھی انگریزوں کا ایجنٹ اور پٹھو اور نہ جانے کیا کیا قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ اس طرح کی باتیں ایک عام مسلمان کی زبان سے بھی زیب نہیں دیتیں، پھر علمائے کرام کی زبان سے کیسے زیب دیں گی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے بے شک متعدد معزز بزرگانِ دین اور اصحابِ علم کا اختلاف تھا، اور دونوں طرف ہی جلیل القدر اصحابِ علم اور بزرگ اور اصحابِ فقہ واجتہاد حضرات تھے، تعداد کے کم، یا زیادہ ہونے سے مسئلہ پر فرق نہیں پڑتا، لیکن یہ اختلاف قیامِ پاکستان سے پہلے تک تھا، قیامِ پاکستان کے بعد اس کی مخالفت کرنے والے بعض اصحابِ علم نے خود فرمایا تھا کہ اگر مسجد کے بننے میں اختلاف ہوجائے کہ کہاں بنے اور کہاں نہ بنے، اور کتنی بڑی بنے، تو یہ اختلاف بننے سے پہلے تک رہتا ہے، جب ایک مرتبہ کسی جگہ بھی چھوٹی، یا بڑی مسجد بن جائے، اب اس کی حفاظت وحرمت تمام فریقوں کے ذمہ ہوجاتی ہے، یہی حالت پاکستان بننے کے بعد کی ہے کہ اب اس کی حفاظت وحرمت سب مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، خواہ وہ پہلے قیامِ پاکستان کے حامی تھے، یا مخالف۔

ملاحظہ فرمایئے کہ بعض بڑے بڑے اصحابِ علم تو پاکستان کی مثال کتنے احترام وادب کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں، لیکن بعد میں ان کے موقف کو لے کر بات کرنے والے حضرات آج پتہ نہیں کہ اپنی زبان سے کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔

علامہ اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم کے متعلق بلاوجہ کی سخت اور متشددانہ باتیں مناسب نہیں، علامہ اقبال تو عظیم شاعر تھے، اور محمد علی جناح مسلمانوں کے ایک عظیم لیڈر

تھے، یہ حضرات اپنی جدو جہد کر کے گزر گئے، اب قیامت کے دن سب کا حساب ہوگا، اس کا انتظار کرنا چاہئے، اور کسی فوت شدہ مسلمان کے متعلق بدکلامی کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے، احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے، اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

"تِلْکَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ"

ہم سب کو قرآن وسنت کی ان اصولی تعلیمات پر ہی عمل پیرا ہونا چاہئے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ قیامِ پاکستان کے سخت حامی تھے، لیکن وہ اپنے زمانہ میں مسلم لیگ کو بھی قابلِ اصلاح سمجھتے تھے، لیکن اس کو کانگریس پر ترجیح دیا کرتے تھے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں قابلِ اصلاح، بلکہ واجبُ الاصلاح ہیں، ہاں مسلم لیگ نسبتاً کانگریس سے اچھی اور بہت اچھی ہے، لہٰذا اس میں اصلاح اور درستی کی نیت سے شریک ہونا چاہیے، میں کانگریس کو اندھے کے مشابہ سمجھتا ہوں، اور مسلم لیگ کو کانے کے مشابہ، اور ظاہر ہے کہ اندھے پر کانے کو ترجیح ہوگی، مثلاً اگر کسی کو نوکر رکھنے کی ضرورت ہو، اور اتفاقاً دو نوکر ملیں، ایک اندھا، ایک کانا، اب فرمایئے وہ کس کو نوکر رکھے گا، اندھے کو، یا کانے کو؟ یقیناً کانے ہی کو ملازم رکھے گا، بس اسی بناء پر میں مسلم لیگ کا حامی ہوں (جواہر الفقہ، ج۵ ص۳۳۹، رسالہ ''افاداتِ اشرفیہ در مسائلِ سیاسیہ''، مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: 2010ء)

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ، اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

کوئی ادنیٰ بصیرت رکھنے والا اس کا بھی انکار نہیں کرسکتا کہ صدر کانگریس کا لفظ خواہ کسی نام کے ساتھ لکھ دیا جائے، لیکن کانگریس کے اصلی قائد مسٹر گاندھی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل وغیرہ ہی ہیں، تو جو حضرات پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کی قیادت کو قبول کرسکتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مذہبی اعتراضات کی بناء پر مسٹر محمد علی جناح

www.idaraghufran.org

اور لیگ ہائی کمانڈ کی قیادت قبول نہ کرسکیں۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ جو حضرات کانگریس میں شریک اور گاندھی ونہرو کی قیادت میں کام کررہے ہیں، ان کو مسلم لیگ کے قائدین، یا ان کی قیادت پر اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں، اور نہ ان کے جوابات قابلِ تعرض ہیں، ہاں! میری نظر میں بعض جماعتیں اور بہت سے افراد ایسے بھی ہیں، جو کانگریس سے تو بیزار ہیں، لیکن مسلم لیگ کے قائدین پر مذہبی نقطۂ نظر سے کچھ اعتراضات رکھتے ہیں، اس لیے اس نظم میں داخل ہونا پسند نہیں کرتے، سو اِن اعتراضات میں بہت سے تو وہ بے بنیاد اور غلط افتراءات ہیں، جو کانگریسی ورکروں نے مسلم لیگ کو دیندار طبقہ کی نظر میں گرانے کے لیے ہی چلتے کیے ہیں، جن کی کوئی اصل نہیں، لیکن بہت سے وہ اعتراضات بھی ہیں، جو اپنی جگہ پر صحیح ہیں، اور دیندار طبقہ کے لیے مسلم لیگ، یا اس کے ہائی کمانڈ کی قیادت تسلیم کرنے میں ایک حد تک رکاوٹ کا سبب بن سکتے ہیں، اس لیے میں اس مجلس میں مسئلۂ قیادت اور اس کے سب پہلوؤں کو واضح کردینا چاہتا ہوں۔ واللہ المستعان۔

اس جگہ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی جماعت، یا انجمن کا، صدر وقائد ہونا اور چیز ہے، اور امارتِ شرعیہ اور چیز ہے، بہت سے شبہات صرف یہاں سے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک جماعت کے قائد کو اصطلاحی شرعی امیر قرار دے کر اس کے احکام اس پر جاری کیے جاتے ہیں، اور اس کی تمام شرائط وصفات اس میں ڈھونڈی جاتی ہیں۔

مسلمانوں نے مسٹر محمد علی جناح کو موجودہ جنگِ آزادی کا ایک ماہرِ فن جرنیل ہونے کی حیثیت سے قائد اعظم قرار دیا ہے، نہ اس حیثیت سے کہ وہ کوئی مفتی ہیں، ان سے حلال وحرام کے احکام میں فتویٰ لیا جائے گا، یا اس حیثیت سے کہ وہ کوئی شیخ

مرشد ہیں، ان سے اصلاحِ اعمال کا کام لیا جائے گا۔

میرے خیال میں شاید ایک مسلمان بھی یہ خیال لے کر ان کو قائد نہیں کہتا، ان کی قیادت ہندوستان کی مسلم جمہوریت نے صرف اس لیے تسلیم کی ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، اور انگریز اس وقت خواہ بین الاقوامی مقتضیات سے، یا اندرونی چیخ وپکار سے متاثر ہوکر جس قسم کی آزادی ہندوستان کو دینا چاہتا ہے، ہندو اپنی عددی اکثریت، مستحکم تنظیم اور بے حد وشمار سرمایہ کے بل بوتے پر اس کا تنہا مالک بن جانا چاہتا ہے، اس کا کھلا ہوا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی مستقل قوم اور ہندوستان کی عام اقلیتوں کو اپنا غلام بنائے رکھے، اس کے لیے اس وقت جنگ جاری ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ جنگ توپ تفنگ کی نہیں، محض آئین اور قانون کی ہے۔

اور ادھر باتفاقِ موافق ومخالف یہ امر مسلّم ہے کہ اس جنگ کے لیے مسٹر محمد علی جناح سے بہتر جرنیل نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ کسی دوسری قوم میں بھی نہیں۔

کس قدر بدنصیبی ہے اس قوم کی جو اپنے اندر ایسا جرنیل رکھتے ہوئے اس کو میدانِ عمل میں بڑھانے، یا اس کے جھنڈے کے نیچے جنگِ آزادی لڑنے میں اس لیے تأمل کرے کہ وہ اپنے جرنیل میں تقویٰ وطہارت کے اوصاف نہیں پاتی۔

ریل، موٹر، جہاز کا ڈرائیور اور کپتان مقرر کرتے وقت بڑے سے بڑا متقی دیندار اور دانش مند صرف اس کا اطمینان کر لینا ضروری سمجھتا ہے کہ وہ ڈرائیوری کے فن میں ماہر اور مکمل ہے، یا نہیں؟ اس میں اعتماد ہو جانے کے بعد اس کے ذاتی اعمال وافعال کا اچھا نہ ہونا، نہ عقلاً اس کی گاڑی میں سوار ہونے سے مانع ہو سکتا ہے، نہ شرعاً۔

اس میں شبہ نہیں کہ تقویٰ وطہارت اسلام کا مقصودِ اعظم ہے، اور مسلمانوں کے ہر کام کو چلانے والے اگر متقی، پارسا آدمی میسر آئیں، تو بلاشبہ سعادتِ کبریٰ اور

www.idaraghufran.org

موجبِ برکات ہے، لیکن جو کام لینا ہے، اس کا ماہر اگر متقی موجود نہ ہو، یا وہ کام کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو، یا اس کو اسباب میسر نہ ہوں، تو غیر متقی ماہرِ فن سے وہ کام لے لینا، آج اس شر القرون اور فسق وفجور کے زمانہ میں نہیں، بلکہ خیر القرون میں بھی جرم نہیں سمجھا گیا (جواہر الفقہ ، ج۵ص۴۴۶تا۴۴۹، رسالہ ''مسلمانوں کے قائدین اور جائز امور میں ان کی اطاعت''مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: 2010ء)

اس قسم کے حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامِ پاکستان اور اس کے محرک وبانیان سے متعلق افراط وتفریط صحیح نہیں، اور اس میں اعتدال کو قائم رکھنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ اعتدال کی توفیق عطاء فرمائے، اور افراط وتفریط سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

15 ربیع الآخر 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 8، مئی 2018ء - شعبان المعظم 1439ھ)

---

(100)

علماء میں معاشرت کا فقدان اور رسمیات کی کثرت

آج کل کے بیشتر عام علمائے کرام کی حالت کو دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ ان کو بنیادی آداب المعاشرت کا بھی علم نہیں، اور چند رسمی چیزوں کا انہوں نے ''دین'' نام رکھ لیا ہے، اور اسی کے اردگرد ''تیلی کے بیل'' کی طرح چکر لگانا شروع کر دیا ہے، اسلامی معاشرت اور حقیقی دین سے واقف حضرات موجودہ زمانہ کے لحاظ سے تعداد میں بہت کم ہیں۔

اسی لیے ایسے حضرات کو ''عالم'' کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، کیونکہ ''عالم'' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کا وارث ہوتا ہے، جبکہ یہ حضرات اس علمِ نبوت سے محروم ہیں، جس میں معاشرت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے ایک بڑے مفتی صاحب، جن کا نام مولانا مفتی مجد القدوس مدظلہم ہے، انہوں نے اسی قسم کے علماء کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بندہ کو فرمایا کہ میں آج

کل کے اس طرح کے اہلِ علم حضرات کو''علماء'' کے بجائے''فارغین'' کہا کرتا ہوں۔

بندہ گزشتہ دنوں ایک عالم صاحب کی دعوت پر کسی شہر میں بیان کے لیے گیا، جس کے لیے ان کی طرف سے بہت شدت واہتمام سے دعوت دی گئی تھی۔

پہلے تو بندہ اپنے چند احباب کے ساتھ ادارہ کے ضروری کام کاج کو چھوڑ کر صبح صبح روانہ ہوا، چند گھنٹوں کے سفر کے بعد پہلے ہم نے اس شہر کے آخری کنارہ میں ایک ہوٹل میں پہنچنا تھا، جہاں میزبان کی طرف سے ہمارے لیے ضیافت اور کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا، شہر کے اندر رَش اور ہجوم بہت زیادہ تھا، خیر ہم رَش اور ہجوم سے گزرتے ہوئے بمشکل متعلقہ ہوٹل میں پہنچے، اور وہاں پہنچ کر کھانا تناول کیا، کھانے میں اُس مسجد کے امام وخطیب اور اس پروگرام کے ذمہ دار بھی شریک تھے، جہاں یہ پروگرام منعقد ہونا تھا۔

خیر ہوٹل میں پرتکلف کھانا کھلایا گیا، لیکن وقت تنگ تھا، حالانکہ ہم طے شدہ پروگرام کے مطابق دوپہر تقریباً بارہ بجے ہوٹل پہنچ گئے تھے، تاکہ جلدی کھانا کھانے کے بعد اگلی منزل پر بروقت پہنچ سکیں، کھانے سے فارغ ہوکر ہم نے یہاں سے دوبارہ شہر کے اندر واپس جانا تھا، اور رش والی جگہ سے گزرنا تھا، تب اس متعلقہ مسجد والے مقام تک پہنچ سکتے تھے، جہاں پروگرام منعقد ہونا تھا، بھاگتے دوڑتے ہوئے کھانا کھایا، بعض ساتھی پوری طرح اطمینان سے فارغ بھی نہ ہوسکے، اور سرپٹ دوڑنا پڑا، کیونکہ مسجد میں ظہر کی نماز کے بعد پروگرام شروع ہونا تھا۔

راستہ میں رَش اور ہجوم بہت زیادہ تھا، اس لیے مشکل سے مسجد میں ظہر کی نماز کے وقت پہنچنا ہوا، حالانکہ تکلفات سے بچ کر کھانے کا انتظام متعلقہ مقام پر بھی ہوسکتا تھا، ایسا کھانا، جس سے راحت کے بجائے تکلیف پہنچے، اور اصل مقصود میں خلل واقع ہو، کس کام کا؟

نماز کے بعد مسجد میں پروگرام شروع ہوا، اور بندہ کو بھی وہیں پروگرام والی جگہ محبوس کر کے بٹھادیا گیا، بندہ کے بیان سے پہلے مروجہ، قرائت، حمد ونعت اور اس کے بعد اس نصاب کا

تعارف، پھر بچوں کی طرف سے نصاب سے متعلق کچھ کارگزاری وغیرہ میں اتنا زیادہ وقت خرچ کر دیا گیا کہ بندہ کے بیان کے لیے بہت تھوڑا وقت بچ گیا، بندہ وہاں بیٹھے بیٹھے تھک کر چور ہو گیا، صبح سے سفر جاری تھا، حالانکہ اس وقت میں تھوڑا سا آرام فراہم کر دیا جاتا، تو آسانی ہو جاتی، کیونکہ اسی شام واپسی کا سفر بھی تھا۔

بندہ نے جلدی جلدی بیان کیا، جس میں بندہ اپنا مافی الضمیر بھی پوری طرح بیان نہیں کر سکا، جبکہ انہوں نے بندہ کے نام کے اشتہار اور بینر وغیرہ بھی شائع کیے تھے، ظاہر ہے کہ لوگ اس قسم کے اشتہارات دیکھ کر پروگرام میں شریک ہوتے ہیں، اور دور دراز سے حاضر ہوتے ہیں، لیکن اگر لوگوں کو وہاں پہنچ کر تشہیر کیے گئے حضرات کا متعلقہ موضوع کے بارے میں پورا مدعا و موقف سننے کا موقع نہ ملے، جس کے لیے وہ حاضر ہوئے، تو یہ اشتہار کے مقصود کے خلاف ہے۔

بہر حال یہ تمام بدانتظامی کے مناظر دیکھ کر سخت کڑھن ہوئی، اتنا وقت خرچ ہوا، پیسہ بھی خرچ ہوا، ان جیسی وجوہات کی بناء پر بندہ آج کل کے مروجہ پروگراموں میں شرکت سے حتی الامکان اجتناب کرتا ہے، جس پر بعض حضرات کو ناگواری بھی محسوس ہوتی ہے کہ بندہ پروگراموں میں شرکت نہیں کرتا، لیکن ان حضرات کو اپنی معاشرتی حالتِ زار پر شکایت و ناگواری اور اصلاح کی توجہ نہیں ہوتی۔

اس قسم کے مشاہدات کے بعد بندہ کا تجربہ یہ ہوا کہ آج کل اس قسم کے دینی اجتماعات اور پروگراموں سے لوگوں کی اصلاح اور ان کی دینی ذہن سازی وغیرہ پیشِ نظر کم ہی رہ گئی ہے، اور اس کی جگہ رسمی اور نمائشی چیزوں نے جگہ لے لی ہے۔

اور الغرض موجودہ دور کے بہت سے علماء میں بھی معاشرت کا فقدان اور رسمی چیزوں کی کثرت ہو گئی ہے، پھر عوام سے کیا شکایت۔

اللہ اس طرزِ عمل سے حفاظت اور اس کی اصلاح فرمائے۔ آمین۔

15 جمادی الاخریٰ 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 9، جون 2018ء - رمضان المبارک 1439ھ)

(101)

مسائلِ جدیدہ میں علماء کا اختلاف اجتہادی ہے

موجودہ دور کے بہت سے فقہی مسائل ایسے ہیں کہ وہ اجتہادی نوعیت کے ہیں، اور ان میں علمائے عصر اور مشائخِ فقہاء کا اختلاف حق و باطل کے بجائے فقہی واجتہادی نوعیت کا ہے، جس میں موجودہ دور کا غیر سودی بینکاری نظام بھی داخل ہے، اور موجودہ دور کی ڈیجیٹل تصاویر وغیرہ بھی داخل ہیں۔

اس طرح کے فقہی واجتہادی مسائل میں دلائلِ شرعیہ وفقہیہ کی بنیاد پر اختلاف کی وجہ سے کوئی عالم، گناہ گار، گمراہ، یا اہلُ السنۃ والجماعۃ سے خارج نہیں ہو جاتا، یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام رحمہم اللہ کے مابین سینکڑوں نہیں، ہزاروں مسائل میں ہر دور کے مسائلِ حاضرہ وعصریہ کے اندر اختلاف رہا ہے، اور بعض اختلافات شدید نوعیت کے بھی ہیں، لیکن چونکہ اہلُ السنۃ والجماعۃ کے جو بنیادی اصول ہیں، ان میں سب ایک دوسرے سے متفق ہیں، اس لیے وہ سب فرقۂ ناجیہ اور اہلُ السنۃ والجماعۃ میں داخل ہیں۔

بہت سے مسائلِ دینیہ اور فقہیہ میں اختلاف، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین بھی تھا، لیکن وہ حضرات فقہی واجتہادی اختلاف کے باوجود نہ دوسروں کی تحقیر کو جائز سمجھتے تھے، اور نہ ہی وہ اپنے ساتھ اختلاف کی وجہ سے دوسروں پر اہلُ السنۃ والجماعۃ سے خارج، یا گمراہ اور گناہ گار و عاصی وغیرہ ہونے کا حکم لگاتے تھے، اور نہ ہی دوسرے کی تحقیر کو گوارا کرتے تھے۔

اسی طرح موجودہ دور میں غیر سودی بینکاری نظام کا بھی معاملہ ہے کہ یہ بھی اس دور کے فقہی و اجتہادی مسائلِ حاضرہ وعصریہ میں سے ہے، اور موجودہ دور کے مستند متدین اور فقیہ متعدد علماء وفقہاء کی بڑی جماعت اس کے جواز کی قائل ہے، اور بعض حضرات اس کے عدمِ جواز کے قائل ہیں، خواہ کسی کو ان حضرات میں سے کسی ایک جماعت کے دلائل زیادہ قوی اور وزنی محسوس ہوتے ہوں، لیکن اس کے باوجود دوسری جماعت کے قول کو قطعی باطل نہیں کہا جا سکتا،

بلکہ ان سب کے باوجود وہ ظنی اور اجتہادی نوعیت کے دلائل پر مبنی ہی قول کہلائے گا۔

اسی طرح موجودہ دور کی مخصوص، مثلاً ڈیجیٹل تصاویر کا بھی معاملہ ہے، جن کو علماء وفقہاء کی ایک جماعت حرام تصویر قرار دیتی ہے، اور دوسری جماعت حلال، یا مکروہ تنزیہی قرار دیتی ہے، اور دونوں طرف کے اہلِ علم حضرات کے پاس اپنے اپنے موقف کے اجتہادی وفقہی وظنی دلائل ہیں، ان میں بھی کسی ایک جماعت کے قول کو قطعی وحتمی باطل نہیں کہا جاسکتا۔

رہا دلائل کے ذریعہ کسی ایک موقف کے قوی اور مضبوط، یا راجح ہونے کا معاملہ، تو اس میں جس طرح کسی کے نزدیک ایک موقف کے دلائل قوی اور مضبوط، یا راجح ہو سکتے ہیں، اسی طرح دوسرے کے نزدیک دوسرے موقف کے دلائل بھی قوی اور مضبوط، یا راجح ہو سکتے ہیں۔

بلکہ اس طرح کے بہت سے مسائل میں جمہور کا موقف کسی ایک طرف رہا ہے، لیکن غیر جمہور کے قول کو صرف جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل نہیں کہا گیا، اور بڑے بڑے اہم مسائل میں طرفین سے مستقل رسائل اور کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں، جس میں قرائت خلف الامام اور رفع یدین اور آمین بالجہر وبالسر جیسے مسائل بھی ہیں، لیکن تمام تر دلائل کے بعد یہ مسائل اسی طرح مجتہَد فیہ سمجھتے جاتے رہے، جس طرح دلائل بیان کرنے سے پہلے تھے۔

ان مسائل میں دیگر اقوال کے حاملین کی نہ تو تحقیر کی گئی، نہ تذلیل کی گئی، بلکہ اہلِ حق کی طرف سے بڑے ادب واحترام کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا رہا، اور ذکر کیا جاتا ہے، اور ان شاء اللہ ذکر کیا جاتا رہے گا۔

بزرگانِ سلف سے اجتہادی امور میں جو خطائیں ہوئیں، اہلِ حق نے تو ان کی وجہ سے بھی ان حضرات کو مطعون نہیں کیا، اور بدگمانی کا ارتکاب نہیں کیا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ:

امورِ اجتہادیہ میں بزرگانِ سلف سے بھی بعض فروگزاشتیں ہوسکتی ہیں، لیکن ان کا اصل مسلک اور قصد اتباعِ سنت ہی تھا، جہلائے معترضین خوامخواہ ان کو متہم کرتے

ہیں(''الافاضات الیومیہ من الافادات القومیۃ''مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۳ص۲۷۴، ملفوظ نمبر ۴۵۲، بعنوان''غیر مقلدین اور بدگمانی''مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: جمادی الاولیٰ1423ہجری)

ایک مقام پر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

پہلے لوگوں کا یہ طرز تھا کہ اختلاف اپنی حد پر ہے، اور دوسرے کے کمالات بھی پیشِ نظر ہیں۔

اب تو ذرا ذرا بات میں اپنے مخالف کو کھلم کھلا برا بھلا کہتے ہیں، نہ کوئی علمی تحقیق ہے، نہ اصول پر مناظرہ ہے، گالیوں سے اور کفر کے فتووں سے رسالے بھرے ہوتے ہیں، کیا اس کو دین کی خدمت کہیں گے(''الافاضات الیومیہ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۸ص۱۹۰، ۱۹۱، ملفوظ نمبر۱۹۴، بعنوان''پہلے لوگوں کے اختلاف کا معمول'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول ۱۴۲۸ھ 1425ہجری)

اور ایک مقام پر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

آج کل بعض اہلِ حق میں بھی یہ مرض عام ہوگیا ہے کہ مذاہبِ مجتہدین میں ایک مذہب سے دوسرے مذہب کا اس طرح موازنہ کرتے ہیں کہ اس سے دوسرے مذاہب کے بطلان کا وہم ہوتا ہے، مثلاً مذہب حنفی کے کسی مسئلہ کو اس طرح ترجیح دیں گے کہ اس سے شافعی مذہب کے ابطال کا شبہ ہوگا، سو میں اس طرز کو پسند نہیں کرتا، یہ طرز نہایت ہی خطرناک اور مضر ہے، توحید اور رسالت وعقائد اصل ہیں، اور قطعی دلائل اس پر قائم ہیں، اس میں سب شریک ہیں، آگے فروع ہیں، جن کے دلائل خود ظنی ہیں، ان میں کسی جانب کا عزم کرنا غلو فی الدین ہے(''الافاضات الیومیہ من الافادات القومیۃ''مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۷ص۱۱۷، ملفوظ نمبر۱۴۳، بعنوان''مذاہب مجتہدین کے موازنہ میں خطرناک طرز، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: محرم 1424ہجری)

اور ایک مقام پر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’جو اُمور شرعاً منکر ہیں، اُن کو اعتقاداً اور عملاً واجبُ الترک جانتا ہوں اور جو مستحسن اتفاقی (سب کے اتفاق سے اچھے) ہیں، اُن کو اعتقاداً تو حُسن (اچھا) جانتا ہوں، باقی عملاً جن پر قدرت ہے، اُن کو قابلِ عمل اور جن پر قدرت نہیں، اُن میں اپنے کو معذور سمجھتا ہوں۔

اور جو اختلافی ہیں، اُن میں اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں اور دوسری جانب کو بھی محلِّ ملامت نہیں سمجھتا اور نہ ان میں کسی کو اپنے مسلک کی طرف دعوت دیتا ہوں، البتہ کوئی مخلص، خواہ واقع میں مخلص ہو، خواہ اپنے کو مخلص ظاہر کرے اور میرا وِجدان اُس کی تکذیب نہ کرے، ایسا شخص اگر میرے مسلک کو دریافت کرتا ہے اور مجھ کو وِجدان سے دو اَمر مظنون ہوں؛ ایک یہ کہ متردِّد ہے، دوسرے یہ کہ عمل کے لئے پوچھتا ہے، کسی سے قیل وقال، یا بحث وجدال نہ کرے گا، اُس کو خاص طور پر بتلا دیتا ہوں۔

باقی کسی کو خود کچھ نہیں کہتا اور دیانت اسی کو سمجھتا ہوں کہ جس شِق کا حق ہونا محقق ہو، اُسی کو اختیار کرے، محض مال، یا جاہ کی غرض سے اُس کو ترک نہ کرے، ہاں شرعاً اِکراہ کا درجہ ہو جاوے، خواہ حکام سے، یا عوام سے، اُس وقت اِکراہ کے مسائل پر عمل کرے اور دوسری شِق مختلف فیہ میں اختلاف والوں کی مخالفت، یا اُن کے خلاف کی کوشش نہ کرے اور یہی دوسرے مسلمانوں کو بھی مشورہ دیتا ہوں‘‘

(اشرف السوانح، جلد۳ صفحہ ۲۵۳، المسئلة السادسة عشر، مضمون رابع ’’الروضة الناضرة فی المسائل الحاضرة‘‘ ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول ۱۴۲۷ھ)

علامہ محمد زاہد بن الحسن الکوثری (المتوفیٰ: 1371ہجری) فرماتے ہیں:

ثم التمييز بين المسائل الاجتهادية، ليس من قبيل تمييز الحق من

الباطل ، بل من قبيل تمييز الصواب من الخطأ ظنا فى مذهب اهل الحق ، وليس ائمة الاجتهاد من اهل الباطل اصلا، بل هم مأجورون سواء اصابوا ام اخطأوا، بخلاف اهل الباطل ، وائمة الاجتهاد فى الفروع على هدى من ربهم (احقاق الحق بابطال الباطل فى مغيث الحق، ص ۳۲، مطبوعة: المكتبة الازهرية للتراث، القاهرة، المصر)

ترجمہ: پھر اجتہادی مسائل کے مابین امتیاز، حق کے باطل کے ساتھ امتیاز کے قبیل سے نہیں ہے، بلکہ اہلِ حق کے مذہب کے مطابق ظنی اعتبار سے خطاء کے مقابلہ میں صواب کے امتیاز کے قبیل سے ہے، اور ائمہ اجتہاد قطعی طور پر اہلِ باطل سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ وہ اجر وثواب کے مستحق ہیں، خواہ وہ مصیب ہوں، یا مخطی ہوں، بخلاف اہلِ باطل کے، اور فروع میں ائمہ اجتہاد اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں (احقاق الحق)

مشاعرِ مقدسہ (منیٰ، مزدلفہ وعرفات) کے مکہ مکرمہ کے ساتھ الحاق وعدمِ الحاق اور حجاجِ کرام کو ان مقامات پر قصر، یا اتمام کرنے نہ کرنے اور ان مقامات پر مقیم یا مسافر ہونے نہ ہونے کے مسئلہ پر جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ، بنوری ٹاؤن، کراچی میں 4 / ذوالقعدۃ / 1428 ہجری کو متعدد اہلِ علم حضرات کا اجتماع ہوا، اس میں جو فیصلہ کیا گیا، اس میں یہ بات واضح طور پر تحریر کی گئی کہ:

یہ طے کیا گیا کہ جب تک کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہو جائے، اس وقت تک استفتاء کرنے والے حضرات کو یہ بتا دیا جائے کہ اس مسئلہ میں علماءِ عصر کا اختلاف ہے اور دونوں جانب علماء ہیں، ان کے پاس اپنے اپنے موقف پر دلائل ہیں، آپ کو جن علماء کے فتویٰ پر زیادہ اطمینان ہو، آپ ان کے فتوی پر عمل کر سکتے ہیں، لیکن دوسرے موقف کے علماءِ کرام پر طعن وتشنیع کرنا کسی کو جائز نہیں۔

شرعی دلائل کی بناء پر کسی مسئلہ میں علماءِ کرام کی آراء کا مختلف ہو جانا، کوئی نئی بات نہیں، اسلاف کے زمانہ سے اجتہادی مسائل میں علماء کے فقہی اختلافات چلے آ رہے ہیں، ایسے مسائل میں ایک عام آدمی کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ جس عالم کے علم وتقوی پر اس کو زیادہ اعتماد ہو، وہ اسی کے قول پر عمل کرے، اور دوسروں کی رائے کا احترام کرے، لہٰذا اس مسئلے میں بھی اسی اصول پر عمل کیا جائے کہ جس عالم پر کسی کو زیادہ اعتماد ہو، وہ اسی کے قول پر عمل کرے اور دوسروں کی رائے کا احترام کرے، لہٰذا منیٰ، یا عرفات میں جو لوگ اس مسئلہ میں بحث ومباحثہ کرتے ہیں، یا دوسرے موقف والوں پر اعتراض کرتے ہیں، یہ طریقہ قطعاً غلط اور ناجائز ہے، جس سے کلی اجتناب ضروری ہے (انتھیٰ)

پھر کیا وجہ ہے کہ بہت سے حضرات کی طرف سے موجودہ دور کے اجتہادی وفقہی مسائل میں اس طرزِ عمل کو ترک کر کے حق وباطل والا طرزِ عمل اختیار کیا جاتا ہے، اور ایک دوسرے کے خلاف سخت متشددانہ موقف اپنایا جاتا ہے، اپنے خلاف موقف ہونے کی وجہ سے علمائے محققین وربانیین کو متہم ومطعون کیا جاتا ہے، ان پر گمراہی، ضلالت اور فسق وفجور کے مرتکب وقائل وغیرہ ہونے تک کی نسبت کی جاتی ہے، اس طرح کی بے اعتدالیوں سے اہلِ علم حضرات کو اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

15 جمادی الاخریٰ 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 9، جون 2018ء - رمضان المبارک 1439ھ)

---

(102)

زقّوم اور اسٹابری (Strawberry)

ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ فلاں مولانا صاحب کے متعلق یہ سنا گیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں

کہ ہمارے یہاں جو اسٹابری (Strawberry) کے نام سے پھل بکتا اور خوب کھایا جاتا ہے، یہ جہنمیوں کا وہی کھانا ہے، جس کو قرآن مجید میں ''زقّوم'' کہا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ اگر انہوں نے واقعتاً یہ بات کہی ہے، تو بالکل غلط بات ہے، اگر واقعتاً جہنمیوں کا زقّوم والا کھانا یہی ہے، تو ''نعوذ باللہ تعالیٰ من ذٰلک'' جہنمیوں کے تو مزے آ جائیں گے، کیونکہ اسٹابری (Strawberry) نام کے پھل کو تو بچے، بڑے بہت سے لوگ خوب ذوق اور شوق کے ساتھ کھاتے ہیں، اور اس کے جوس اور ملک شیک (Milk-Shake) کو بھی بڑی رغبت سے پیتے ہیں، اور اس کا ذائقہ کچھ اس قسم کی کھٹاس کی طرف مائل ہوتا ہے، جس کی طرف رغبت ہوتی ہے۔

جبکہ اس کے مقابلہ میں زقّوم بالکل کڑوا ہوگا، جس کو نگلنا بھی مشکل ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے کہ ''اگر زقّوم کا ایک قطرہ بھی زمین پر گر پڑے، تو روئے زمین کا ذائقہ کڑوا ہونے کی وجہ سے زندگی گزارنا مشکل ہو جائے'' [1]

اور بعض روایات میں ہے کہ اگر زمین کے سمندروں میں ''زقوم'' کا ایک قطرہ گر پڑے، تو سمندروں کا ذائقہ فاسد ہو جائے۔ [2]

---

[1] عن مجاهد، أن الناس كانوا يطوفون بالبيت، وابن عباس، جالس معه محجن، فقال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " "يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولا تموتن إلا وأنتم مسلمون"ولو أن قطرة من الزقوم قطرت، لأمرت على أهل الأرض عيشهم، فكيف من ليس لهم طعام إلا الزقوم (مسند احمد، رقم الحديث ۲۷۳۵)

قال شعيب الارنؤوط:إسناده صحيح على شرط الشيخين (حاشية مسند احمد)

[2] عن ابن عباس رضى الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم تلا هذه الآية"يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولا تموتن إلا وأنتم مسلمون "قال: والذى نفسى بيده لو أن قطرة من الزقوم قطرت فى بحار الأرض لفسدت وفى حديث وهب بن جرير: لأمرت على أهل الدنيا معايشهم فكيف بمن تكون طعامه؟(مستدرک حاکم، رقم الحديث ۳۱۵۸)

قال الحاكم: هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه "

وقال الذهبى فى التلخيص:على شرط البخارى ومسلم.

اور یہ بات ظاہر ہے کہ آج کل اسٹابری کے پھل کی بازاروں میں بھرمار ہے، جگہ جگہ یہ پھل فروخت ہورہا ہے، اور کھایا جارہا ہے، اس کا ملک شیک (Milk-Shake) بھی رغبت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے، نہ ہی اس کی وجہ سے دنیا کا ذائقہ بدمزہ ہوا، اور اگر اس پھل کو سمندر میں ڈال دیا جائے، تو اس سے سمندر کا ذائقہ فاسد نہیں ہوتا۔

جبکہ جہنمیوں کے زقّوم کی طرف نہ تو رغبت ہوگی، نہ اس ہی اس کا کھایا جانا آسان، بلکہ ممکن ہوگا، جس کا قرآن وسنت میں ذکر آیا ہے۔[1]

حیرت ہے کہ آج کل بعض اہلِ علم حضرات اس طرح کی باتیں تحقیق کے بغیر کردیتے ہیں، اور عوام بھی بے چارے بے سوچ سمجھے اس طرح کی عجیب وغریب باتوں سے متاثر ہوجاتے ہیں، یہ سب کچھ کم علمی کی بناء پر ہے۔ اللہ حفاظت فرمائے۔ آمین۔

27 جمادی الاخریٰ 1439 ہجری، بروز جمعہ

(ماہنامہ "التبلیغ" جلد 15 شمارہ 10، جولائی 2018ء - شوال المکرّم 1439ھ)

---

(103)

حدود کے مطابق کام کو جائز قرار دینے پر سختی کی مذمت

شریعت کے جن کاموں کے جائز ہونے کی کچھ شرائط مقرر ہیں، ان کاموں کو ان کی متعلقہ شرائط کے ساتھ جائز قرار دینا چاہیے، خاص طور پر جب کوئی ضرورت مند سامنے آئے، تو اس کو اس عمل کی شرائط کے ساتھ بھی اجازت نہ دینا، درست طرزِ عمل نہیں۔

آج کل بہت سے مسائل میں بعض علماء کا مزاج یہ ہوگیا ہے کہ وہ بعض افراد کی طرف سے

---

[1] أَذٰلِکَ خَیْرٌ نُزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ . إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِلظَّالِمِينَ . إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ . طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ . فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ (سورة الصافات، رقم الآيات ٦٢ الیٰ ٦٦)

إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ . طَعَامُ الْأَثِيمِ . كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ . كَغَلْيِ الْحَمِيمِ (سورة الدخان، رقم الآيات ٤٣ الیٰ ٤٦)

شرائط کا لحاظ نہ کرنے پر سب کے لیے اس عمل کو ناجائز قرار دینے کا حکمِ عام لگا دیتے ہیں، جس کی زد میں شرائط کے مطابق عمل کرنے والے بھی آ جاتے ہیں۔

اور اس موقع پر بعض حضرات کا یہ شبہ کرنا درست نہیں کہ شرائط کے ساتھ جائز قرار دینے کی صورت میں دوسرے آزاد لوگوں کے لیے جو شرائط کی پابندی نہیں کرتے، راستہ کھلتا ہے کہ وہ شرائط کے مطابق اس کام کو کرنے والے کے عمل کو حجت اور سندِ جواز بنا کر اپنے لیے راستہ نکالتے ہیں۔

یہ شبہ اس لیے درست نہیں کہ جس نے متعلقہ شرائط کا لحاظ کر کے وہ عمل کیا، اس نے جائز کام کیا، اور جس نے شرائط کی خلاف ورزی کر کے وہ کام کیا، اس نے ناجائز کام کیا، تو اس صورت میں پہلے شخص نے جائز کام کیا، اس کے کام کو جائز قرار دینا چاہیے، اور دوسرے شخص نے ناجائز کام کیا، اس کے کام کو ناجائز قرار دینا چاہیے۔

دونوں کو ظاہر ہے کہ نہ تو ایک حکم دینا جائز ہے، اور نہ ہی دوسرے کے ناجائز کام کی وجہ سے پہلے کے کام کو ناجائز قرار دینا درست ہے۔

اسلام کی تعلیمات کا یہی طرۂ امتیاز ہے کہ اس میں گدھے گھوڑے برابر نہیں ہوتے۔

مگر ہمیں افسوس ہے کہ موجودہ دور میں بہت سے اہلِ علم کہلائے جانے والے حضرات بھی شریعت کے بہت سے احکام میں خلط ملط اور خلطِ مبحث کرتے ہیں، قصور تو شریعت کا حکم توڑنے والا کا ہوتا ہے، اور بے جا پابندیاں ان لوگوں پر لگاتے ہیں، جو شریعت کے احکام کی پابندی کرتے ہیں۔

ایسے موقع پر یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ جو لوگ شرعی احکام کے پابند نہیں، اور نہ ہی وہ اپنے کام کے جائز و ناجائز ہونے کے متعلق اہلِ علم حضرات کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت سمجھتے اور نہ ہی شریعت کے احکام کی پابندی کا اہتمام کرتے، وہ تو کسی کے فتوے اور عمل کے بغیر ہی گناہ کیے جا رہے ہیں، انہیں نہ کسی مفتی کے فتوے سے سروکار ہے اور نہ ہی کسی کے طرزِ عمل سے۔

اب اگر ایک ضرورت مند شخص وہ کام کرنا چاہتا ہے اور شریعت کی بتلائی ہوئی پابندیوں اور شرطوں کے ساتھ وہ کام کرنا چاہتا ہے، تو اس کو آزاد لوگوں کی وجہ سے اجازت نہ دینا، سراسر ناانصافی اور ظلم ہے۔

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سختی کرنے سے دین پر چلنے والوں اور شریعت کے احکام اور شرائط کی پابند کرنے والوں کو ہی مشکلات پیش آئیں گی، اور دین پر چلنے والا طبقہ ہی متاثر ہوگا۔

رہا آزاد لوگوں کی پابندی نہ کرنے کا مسئلہ، تو اس کی ذمہ داری، ان لوگوں پر نہیں آتی، جو شرائط کی پابندی کرنے والے ہیں، بلکہ خود ان کے اپنے اوپر آتی ہے، البتہ ایسی صورت میں ان شرائط کی اہمیت کو اجاگر کرنا اور ان کی پابندی کے اہتمام کی طرف توجہ دلاتے رہنا بھی ضروری ہے۔

آج کل بعض اہلِ علم حضرات کا ''سداً للباب'' اور ''مفضی الی المعصیة'' کے قاعدہ کو جا بجا منطبق کر کے شریعت کے ہر اس جائز کام پر ناجائز ہونے کا حکم لگانے کی کوشش کرنا، جن کو بہت سے لوگ، ناجائز طریقہ پر کر رہے ہیں، یہ درست طرزِ عمل نہیں۔

اس طرح کے قاعدوں کے لیے بھی کچھ حدود وقیود ہوتی ہیں، ان کی متعلقہ حدود وقیود کو نظر انداز کرنا درست نہیں ہوتا، اس دور میں تفقہ کی بڑی کمی، بلکہ فقدان ہوتا جا رہا ہے، جبکہ تفقہ فی الدین بڑی نعمت ہے، اور اللہ کی طرف سے عظیم خیر کا عمل ہے، جس کو حاصل کرنے کی ہر عالم کو جدوجہد کرنی چاہیے۔

ایک حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ:

''مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ''

''کہ جس کے ساتھ، اللہ خیر کا ارادہ کرتا ہے، اس کو تفقہ فی الدین کی نعمت عطاء فرما دیتا ہے'' (بخاری، رقم الحدیث ۷۱)

28 جمادی الاخریٰ 1439 ہجری، بروز ہفتہ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 10، جولائی 2018ء - شوال المکرّم 1439ھ)

www.idaraghufran.org

(104)

قبلہ کی طرف رُخ کر کے سونا، یا قضائے حاجت کرنا

بعض اوقات کوئی مسئلہ شدت اور سخت موقف کے ساتھ مشہور ہو جاتا ہے، جس کے بعد اس کے مقابلہ میں توسع اور گنجائش والے قول کے سامنے آنے پر تعجب اور حیرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

مثلاً ہمارے یہاں قبلہ کی طرف پاؤں کر کے سونے کو، یا قبلہ کی طرف پاؤں پھیلانے کو بہت معیوب، بلکہ سخت گناہ سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر مجبوری میں قبلہ کی طرف پاؤں کر کے سونا پڑ جائے، جیسا کہ آج کل شہروں اور تنگ آبادیوں میں بعض اوقات اس طرح کی مجبوریاں پیش آ جاتی ہیں، تو اس کو گوارا نہیں کیا جاتا۔

جبکہ کسی بھی قولی صحیح حدیث میں قبلہ کی طرف پاؤں کر کے سونے، لیٹنے، یا بیٹھنے میں ممانعت ہماری نظر سے نہیں گزری، اور اگر کسی کو اس سے اختلاف ہو، تو اسے ثبوت پیش کرنا چاہئے۔

البتہ ادب کے لحاظ سے بعض فقہائے کرام نے قبلہ کی طرف پاؤں پھیلا کر سونے، یا لیٹنے کو مکروہ قرار دیا ہے، لیکن اس کو بھی انہوں نے حرام، یا مکروہ تحریمی کے بجائے ''مکروہ تنزیہی'' قرار دیا ہے، جس کی خلاف ورزی سے گناہ لازم نہیں آتا، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ لیٹنے، بیٹھنے اور سونے کی ضرورت ہر جگہ پیش آ سکتی ہے، اگر اس میں سختی کی جاتی، تو لوگوں کو بڑی مشکل پیش آتی، پس اس کو ایسا درجہ دے دیا گیا کہ اگر کوئی بآسانی عمل کر سکتا ہو، تو بہتر ہے، ورنہ حرج نہیں، یہی دینِ اسلام کی خوبی ہے کہ وہ فطرت کے عین مطابق ہے۔

اس لیے قبلہ کی طرف پاؤں کرنے کو گناہ سمجھنا جائز نہیں، اور اگر کوئی مجبوری کی وجہ سے قبلہ کی طرف پاؤں پھیلائے، تو وہ بہرحال گناہ گار نہیں، بلکہ اگر مجبوری اور ضرورت میں کوئی قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف رخ، یا پشت کرے، بالخصوص جبکہ آبادی اور بیت الخلاء کے اندر بیٹھ کر ہو، جس میں اس کے اور قبلہ کے درمیان کوئی دیوار و پردہ وغیرہ حائل ہو، تو بھی گناہ گار نہیں۔

چنانچہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ آبادی اور عمارت کے اندر بیٹھ کر قضائے حاجت کرنے

کی صورت میں قبلہ کی طرف رخ، یا پشت کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، ایک روایت میں قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف پشت کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں، آج کل شہری آبادی میں، یا کسی تنگ جگہ میں بیت الخلاء کو قبلہ کی طرف رُخ، یا پشت کر کے تعمیر کرنے، یا اس طرح رُخ کر کے قضائے حاجت کی ضرورت اور مجبوری پیش آ جاتی ہے، اور دائیں، بائیں، انحراف کرنے، یا رُخ پھیرنے میں مشکل پیش آتی ہے، یا تو بیت الخلاء کے تنگ ہونے کی وجہ سے، یا سیٹ کا رُخ دائیں بائیں نہ ہونے کی وجہ سے، کسی دوسری طرف رُخ پھیرنے میں مشکل ہونے کی وجہ سے۔

اس طرح کے حالات میں امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کے قول پر عمل کر لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اس صورت میں اہلِ علم حضرات کو زیادہ سختی وتشدد مناسب معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ شریعت کی طرف سے گنجائش اور اختلاف اسی طرح کی مشکلات، یا زحمت کو دور کرنے کے لیے ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے اس کو رحمت قرار دیا جاتا ہے، بعض حضرات اس کو رحمت کے بجائے زحمت بنا دیتے ہیں۔ 28 جمادی الاخریٰ 1439 ہجری، بروز ہفتہ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 10، جولائی 2018ء - شوال المکرّم 1439ھ)

---

(105)

قرآن اور اصلاحِ اخلاق

بندہ محمد رضوان کو ایک مرتبہ ایک جلسہ میں مدعو کیا گیا، اور وہاں بندہ کا مختصر بیان بھی رکھا گیا، جس میں وہاں کے منتظم صاحب کی طرف سے بندہ کو ''اصلاحِ اخلاق'' کا موضوع دیا گیا، اس موضوع کا پہلے سے بندہ کو علم نہیں تھا، اور بندہ کے بیان سے پہلے اچانک یہ اعلان کیا گیا کہ مفتی محمد رضوان صاحب ''اصلاحِ اخلاق'' کے موضوع پر مختصر بیان فرمائیں گے۔

بندہ کو اس موضوع پر فی البدیہہ جو سمجھ آیا، اس پر بندہ نے مختصر بیان کر دیا۔

اس وقت بندہ کے بیان کا محور سورہ حجرات کی مندرجہ ذیل آیات تھیں:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ . يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى أَنْ يَّكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسٰى أَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ . يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ . يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (سورة الحجرات، رقم الآيات ١٠ الى ١٣)

بندہ نے مذکورہ آیات کا ترجمہ اور ساتھ ساتھ ضروری تفسیر وتشریح کی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مذکورہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے، اور آپس میں تمام مسلمانوں کو مصالحت اور تقوے کو اختیار کرنے کا حکم دے کر رحم کیے جانے کا ذکر فرمایا ہے، اور تمام مومنوں کے بھائی ہونے اور ان میں مصالحت کرانے کا یہ حکم تمام اسلامی فرقوں کو شامل ہے، جو احادیث میں بیان کردہ مسلمانوں کے ستّر سے زیادہ فرقوں کو حاوی اور محیط ہے۔

یہ مسلمانوں کے ساتھ حسنِ اخلاق کا اصولی اور بنیادی حکم ہے، جس میں تقوے کا بھی ذکر ہے، اور ساتھ ہی اس پر مرتب ہونے والے اجر، یعنی اللہ کی طرف سے رحم کیے جانے کا بھی ذکر ہے۔

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات میں چند بداخلاقیوں کا ذکر فرمایا ہے، جن میں ایک بداخلاقی ایک دوسرے کا تمسخر اور مذاق اڑانا ہے، اور دوسری بداخلاقی ایک دوسرے کی عیب جوئی وعیب گوئی ہے، اور تیسری بداخلاقی ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارنا ہے۔

اور اس طرح کی بداخلاقیوں کے مرتکب لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے توبہ نہ کرنے کی صورت میں

ظالم قرار دیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہ کبیرہ گناہ ہیں، جن سے توبہ ضروری ہے۔

پھر مومنوں کو بدگمانی سے منع کیا گیا ہے، اور بدگمانی کو گناہ قرار دیا گیا ہے، اور پھر تجسس کرنے سے منع کیا گیا ہے، اور پھر اسی کے ساتھ غیبت سے ایک خاص انداز میں منع کیا گیا ہے۔

اور آخر میں مساواتِ انسانی کا ذکر کر کے اور مسلم وغیر مسلم ہر انسان کی حضرت آدم وحواء علیہم السلام سے پیدائش کا ذکر کر کے اصلی کرامت وشرافت، جو اللہ کے نزدیک معتبر ہے، اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ تقوے کا ہونا ہے، جس میں جس قدر تقویٰ ہوگا، وہ اسی قدر اللہ کے نزدیک مکرم ومشرف ہوگا، غیر مومن کے مقابلہ میں مومن، اور مومن کے مقابلہ میں نیک اور متقی، جس میں درجہ بدرجہ صدیق، شہید، نبی اور نبیوں میں سب سے زیادہ متقی خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لیے وہ عنداللہ، سب سے زیادہ مکرم ومعزز ہیں۔

بندہ نے ساتھ ہی قرآن وسنت کی روشنی میں تقوے کی بھی مختصر تفسیر وتشریح کی۔

پھر بندہ نے موجودہ زمانے میں مذکورہ بداخلاقیوں کے چند نمونے اور مناظر ذکر کر کے تقوے پر بات کو مکمل کیا، اور تقوے کی بھی مختصر تشریح کر کے، یہ خلاصہ نکالا کہ ان آیات کا مختصر لب لباب ایک اور نیک ہونا ہے، آخر میں اس کے متعلق حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے ایک ملفوظ کا ذکر کیا، جس میں مسلمانوں کی تمام پریشانیوں کا حل اور تمام احکامِ شرعیہ کا خلاصہ ''مسلمانوں کے ایک رہنے اور نیک رہنے'' میں بیان کیا گیا ہے۔ [1]

---

[1] چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

میں ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا، اسی ڈبہ میں چند دیہاتی مسلمان بیٹھے ہوئے تحریکاتِ حاضرہ کے متعلق آپس میں گفتگو کر رہے تھے اور اپنی اپنی کہہ رہے تھے، میں بھی سن رہا تھا، ایک ان میں سے خاموش بیٹھا سن رہا تھا، جب سب اپنی اپنی کہہ چکے تو وہ شخص بولا، اپنی اپنی تو تم کہہ چکے، اب میری بھی سن لو، کیوں اتنے بکھیڑے کیئے، اگر مسلمان دو باتوں کی پابندی کر لیں، ساری دنیا ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، ایک بولا کہ بتلاوہ کیا بات ہے؟ کہتا ہے کہ: ایک رہو اور نیک رہو، دیکھیں پھر کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

کیسی عجیب بات کہہ گیا، آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، دو جملوں میں تمام احکامِ شرعیہ کا خلاصہ بیان کر گیا (''الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، جلد نمبر ۵ ص ۳۶۲، ملفوظ نمبر ۴۱۵، بعنوان ''اصولِ صحیحہ میں راحت'' ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

www.idaraghufran.org

اپنے بیان میں بندہ نے مختصراً مسلمانوں، بلکہ علماء میں جاری اجتہادی وفقہی مسائل میں تشدد و تعصب کا بھی ذکر کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اخوتِ ایمانی کی بنیاد پر تمام اہلِ اسلام کو بمع ناجی وناری، یعنی اہلُ السنۃ وغیر اہلُ السنۃ والجماعۃ فرقوں کے بھائی قرار دیا ہے، تو اجتہادی وفقہی مسائل کا اختلاف تو اہلُ السنۃ والجماعۃ اور ناجی فرقہ سے بھی خارج نہیں کرتا، پھر ان کے مابین اخوتِ ایمانی واسلامی کیسے جاری نہیں ہوگی، اور اس سلسلہ میں ایک دوسرے کے خلاف مذکورہ بداخلاقیوں کا ارتکاب کیونکر جائز ہوگا۔

پس اجتہادی وفقہی مسائل میں تشدد کرنا اور اس طرح کے اختلافات کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ مذکورہ بداخلاقیوں کا ارتکاب کرنا، اخوتِ ایمانی کے مقصود کے خلاف ہے۔

بندہ نے اپنے بیان میں اس کا بھی ذکر کیا کہ آج کل اسلامی یا غیر سودی بینکاری اور ڈیجیٹل، یا اس طرح کی دوسری تصاویر کی حلت وحرمت جیسے اجتہادی وفقہی مسائل میں ذکر کردہ متعدد بد اخلاقیوں کا ارتکاب ہورہا ہے، جو کہ درست طریقہ نہیں، اور اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

بندہ کے اس خطاب کو متعدد حضرات نے پسند کیا، لیکن بعد میں ایک عالم صاحب نے بندہ کے بیان کے متعلق کہا کہ یہ بیان اس اجتماع کے مقصد کے مطابق نہ تھا۔

حالانکہ یہ صاحب اس بیان میں موجود بھی نہ تھے، شاید کسی سے کوئی بات خلافِ طبع سن لی ہوگی۔

ان عالم صاحب کی گفتگو سن کر بندہ کو حیرت ہوئی کہ اگر قرآن وسنت میں بیان کیے گئے موضوع اور خود حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے ملفوظ کی تشریح بھی اس اجتماع اور اس کے مقصود کے خلاف ہو، جبکہ بندہ کو داعی کی طرف سے ہی یہ موضوع مقرر کرکے دیا گیا ہو، تو پھر کونسا موضوع اس اجتماع کے موافق کہلائے جانے کا مستحق ہے، کیا وہ بیان، جس میں نہ قرآن مجید کی آیات اور ان کی معتبر تفسیر کا ذکر ہو، اور نہ ہی مستند احادیث اور ان کی معتبر تشریح کا ذکر ہو، بلکہ اِدھر اُدھر بزرگوں کی چند باتیں ہوں، اور ان ہی پر دین کے اصول وقواعد کو قائم کیا جائے، اس کو اجتماع کا مقصود قرار دیا جائے، یہ کہاں کا انصاف ہے۔

اسی لیے بندہ آج کل کے اجتماعات اور جلسوں میں شرکت کو عموماً پسند نہیں کرتا، سوائے اس کے کہ بہت مجبوری ہو جائے، اور ان جیسی وجوہات کی بناء پر ہی حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے آج کل کے جلسوں کو ''جھلسا'' قرار دیا ہے۔ [1]

یعنی جن جلسوں میں قرآن وسنت اور اصلاح پر مشتمل موضوعات کو پسند نہ کیا جائے، اور اِدھر اُدھر کی باتوں کو زیادہ اہمیت دی جائے، جن سے مقصود فخر وتفاخر اور شہرت وغیرہ ہو، وہ جھلسے ہوئے جلسے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ آمین۔ 29 جمادی الاخریٰ 1439 ہجری، بروز اتوار

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 15 شمارہ 12، ستمبر 2018ء - ذوالحجہ 1439ھ)

---

(106)

بندہ کے نام کے ساتھ ''خان'' کی نسبت

بندہ کے ددھیالی رشتہ کی نسبت تھانہ بھون کی طرف ہے، بندہ کے دادا مرحوم ''منشی سلیمان صاحب رحمہ اللہ'' کا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے والہانہ اور گہرا تعلق تھا، جس کی وجہ سے بندہ بچپن کے زمانہ اور پھر بعد میں طالبِ علمی کے زمانہ میں اپنے نام کے ساتھ ''تھانوی'' کی نسبت لگایا کرتا تھا، جب زمانۂ طالب علمی کے بعد بندہ کو کچھ علمی وعرفی اور معاشرتی شعور پیدا ہوا، تو بندہ نے اپنے نام کے ساتھ اس لفظ کی نسبت کے استعمال کو ترک کر دیا، اور بندہ نے یہ عمل اس زمانہ میں اپنے شیخ حضرت نواب محمد عشرت علی خان قیصر صاحب رحمہ اللہ کی مشاورت وہدایت سے کیا، چنانچہ بندہ نے اس زمانہ میں حضرت والا رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ آج کل تھانوی کی نسبت ایک تو بہت سے حضرات صرف شہرت کے

---

[1] چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ:
میں تو آج کل کے جلسوں کو جھلسا کہا کرتا ہوں، اکثر میں تفاخر وشہرت ہی مقصود ہے (حسن العزیز، حصہ سوم، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۹، ص۳۹۲، بعنوان ''آج کل کے جلسے'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر 1425 ہجری)

لیے لگاتے ہیں، اس میں ان کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے، دوسرے ''اشرفی، مدنی، قاسمی'' وغیرہ کی نسبتوں کو ہمارے متعدد اکابر، بالخصوص حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اس لیے پسند نہیں کیا کہ اس کی وجہ سے اپنے اکابر اور بزرگوں کے مابین ایک طرح کی دھڑے بندی ظاہر ہوتی ہے، تیسرے اس قسم کی نسبت کی لاج رکھنا بھی ضروری ہے، اور ہمارا طرزِ عمل اور کردار اس قابل نہیں کہ اپنے نام کے ساتھ ہمہ وقت اس نسبت کا اظہار کریں، اور اپنے طرزِ عمل سے ان حضرات کے بدنام کنندہ بنیں۔

چنانچہ اسی زمانہ میں ایک مرتبہ بندہ سے ایک نووارد نے آ کر کہا کہ ''حضرت تھانوی سے ملنا ہے، کیا آپ ہی ہیں؟ جس سے بندہ کو بہت شرمندگی ہوئی، اور اس وقت اپنے شیخ حضرت نواب صاحب رحمہ اللہ کو اطلاع دے کر ان کے مشورہ وہدایت سے اس نسبت کے استعمال کو ترک کر دیا، اور اس کے بعد بندہ نے صرف ''محمد رضوان'' کا استعمال شروع کر دیا، اور تعارف کے لیے بوقتِ ضرورت ساتھ میں ''مفتی'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا رہا۔

لیکن گزشتہ دنوں معلوم ہوا کہ ''مفتی محمد رضوان'' کے نام سے موجودہ دور میں بعض دوسرے اصحابِ علم بھی موجود ہیں، بلکہ خود راولپنڈی میں قریب ہی ایک محلّہ کی مسجد میں ایک صاحب خطیب مقرر ہوئے، ان کا نام بھی یہی ہے، اور ان کی وجہ سے بندہ کے نام کے ساتھ لوگوں کو التباس واشتباہ ہوتا رہتا ہے، جس کے بعد بندہ نے اپنے موجودہ شیخ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی مشاورت سے، اپنے یہاں مشہور خاندانی نسبت ''خان'' کا استعمال شروع کر دیا۔

یہ نسبت چونکہ بندہ کے یہاں خاندانی طور پر مشہور اور اس کا استعمال عام ہے، اور بہت سے مخصوص افراد ''خان صاحب'' کے نام سے ہی مشہور ہیں، اور بندہ کے شناختی کارڈ میں بھی شروع سے درج ہے، اور اس کے لیے فقہاء نے ''تسامع'' کو کافی قرار دیا ہے، جس کا تعلق متعلقہ خاندان سے ہے، خواہ کسی دوسرے خاندان والے اور دور پرے والے کو اس کا علم نہ ہو۔

مگر بندہ ''پشتو زبان'' والے خان حضرات سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ خان کی نسبت اس برادری کے اعتبار سے ہے، جس کے اعتبار سے مولانا سلیم اللہ خان صاحب، ڈاکٹر تنویر احمد خان صاحب، نواب عشرت علی خان قیصر صاحب اور مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب رحمہم اللہ وغیرہ کی مشہور ہے، کیونکہ ''خان'' کی نسبت کئی اقوام میں چلتی ہے۔

پورا نسب نامہ تو بندہ کے پاس نہیں ہے، البتہ اتنا علم ہے کہ بندہ عجمی النسب ہے، اور بندہ کے نسب میں اوپر کسی جگہ غیر مسلم حضرات تک سلسلہ پہنچتا ہے، کسی زمانہ میں بعض آباء واجداد مسلمان ہوئے تھے، لیکن چونکہ فقہائے کرام نے اس سلسلہ میں ''تسامع'' اور ''شہرت'' کو کافی قرار دیا ہے، اس لیے شرعی وفقہی لحاظ سے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔

جہاں تک ناقدین ومعترضین کا تعلق ہے، تو ان کا منہ تو بند نہیں کیا جا سکتا، یہ سلسلہ تو قیامت تک چلتا رہے گا، کیونکہ جس طرح کسی سے محبت انسان کو اس کے عیوب ونقائص سے اندھا، بہرا کر دیتی ہے، اسی طرح کسی سے بغض بھی اس کے محامد ومحاسن اور مباحات سے اندھا کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔ اللہ حفاظت فرمائے۔ آمین۔ یکم رجب المرجب 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 01، اکتوبر 2018ء - محرم الحرام 1440ھ)

---

(107)

فقہی تفرد، یا تفردات کے الزام کی حقیقت

آج کل بعض علماء میں ایک دوسرے سے تحاسد وتباغض بہت زیادہ ہو گیا ہے، اس لیے وہ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے میں لگے رہتے ہیں، بندہ کے ساتھ بھی کئی کرم فرماؤں کی طرف سے اس طرح کا رویہ سامنے آتا ہے، اور جہاں کسی کے علمی کام میں اعتراض، یا نقص کی کوئی اور وجہ نہ ملے، وہاں فوراً دوسرے کی تحقیق پر ''تفردات'' کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔

گزشتہ دنوں بندہ کے پاس تفرد کے سلسلہ میں ایک سوال آیا تھا، جس کا بندہ نے تفصیلی جواب

تحریر کیا، اور وہ جواب مستقل ایک کتابچہ کی شکل اختیار کر گیا۔

یہ مضمون تو ایک سوال کے جواب میں اتفاق سے تیار ہوا تھا، اس کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ بعض حضرات، بندہ کی کتب سے تفردات جمع کر کے بندہ کے شیخ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ان حضرات کا مذکورہ طرزِ عمل سے مقصد خواہ کوئی بھی ہو، لیکن یہ بات سن کر بندہ کو بحمد اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی خوف لاحق نہ ہوا، بلکہ خوشی ہوئی کہ بندہ کے شیخِ محترم انتہائی مصروف شخصیت ہیں، اور ان کو بندہ کی تالیفات کا بالاستیعاب مطالعہ فرما کر تفردات کو تلاش کرنا مشکل ہوگا، یہ کام اللہ تعالیٰ ان حضرات کے ذریعہ سے لے لے گا کہ وہ بندہ کی تالیفات کا مطالعہ کر کے ان میں سے اجمالی تفردات نکال کر حضرت والا کو پیش کر دیں گے، جس کے لیے انہیں بندہ کی تحریرات کا حوالہ بھی دینا پڑے گا، اور اس طرح حضرت والا کو بندہ کے ان تفردات پر نظر ڈالنے کا بآسانی موقع میسر آ جائے گا، اور ساتھ ہی متعلقہ مقامات کو ملاحظہ کرنے کا بھی، پھر اس کے بعد حضرت خود نتیجہ اخذ فرمالیں گے کہ یہ تفردات میں داخل ہیں، یا نہیں؟ اور دونوں صورتوں میں بندہ کو بھی غور کرنے کا موقع حاصل ہو جائے گا، جس کے بعد بندہ کی طرف سے یا توضیح وتشریح ہوگی، یا رجوع ہوگا، اور دونوں صورتوں میں بندہ کو فائدہ ہی ہوگا، بلکہ اگر یہ حضرات، خود براہِ راست بندہ کو ہی وہ تفردات لکھ کر بھیجیں، اور ان کے تفردات ہونے کی دلیل اور وجہ بھی بیان کریں، تو اس صورت میں بھی بندہ مذکورہ طرزِ عمل ان شاء اللہ تعالیٰ اختیار کرے گا، کیونکہ بندہ دین کے معاملہ کو کسی کی ذات کی ہار جیت، یا اونچ نیچ کا کھیل نہیں سمجھتا، بلکہ خود بندہ کے شیخِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی اصلاحی عریضوں کے جواب میں تحریر شدہ ہدایات بندہ کے پاس موجود ہیں، ایک مرتبہ حضرت والا نے بندہ کو جواب میں تحریر فرمایا کہ:

’’مقصد رضائے حق ہے نہ کہ رضائے مخلوق، جو بات فیما بیننا و بین اللہ درست

سمجھتے ہوں، اس پر مخلوق کی ناپسندیدگی سے کبھی اثر نہ لینا چاہئے، اور انہیں معذور سمجھنا چاہئے۔

اور دیگر حضرات واکابر سے فقہی اختلاف ہونے کی صورت میں نہایت تواضع کے ساتھ اپنے رجحان کا ذکر کیا جائے، اور اس کے خلاف، دلیل آجانے پر رجوع میں کوئی رُکاوٹ بھی دل میں نہ ہو''۔

آج کل بہت سے علماء میں یہ مرض عام ہوتا جارہا ہے کہ وہ جب اپنے حلقہ میں کسی خاص فقہی معروف قول کے خلاف کسی عالم وفقیہ کا قول ملاحظہ کرتے ہیں، تو اس کے خلاف دلائل پیش کرنے اور تحقیق کرنے کے بجائے، فوراً اس پر تفرد کا الزام قائم کر کے اس کو رَد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ اس طرح کے الزام دینے سے وہ قول مردود، یا نا قابلِ اعتبار قرار نہیں پاتا، اور نہ ہی کسی کے کہنے اور دعویٰ کرنے سے کوئی قول ''تفرد'' کے زمرے میں داخل ہوجاتا، ورنہ تو خود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دوسرے فقہاء کے بہت سے اقوال بھی نا قابلِ اعتبار قرار پانا چاہییں۔

اس سلسلہ میں علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کا ایک نہایت محقق رسالہ ہے، جس کا نام ''**التدقیق الاقوم فی تحقیق السواد الاعظم**'' ہے، یہ رسالہ ''امداد الاحکام'' کی چوتھی جلد میں شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ نے موجودہ دور میں تفرد کے الزام کی حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے کئی مبہم ومجمل امور کی پردہ کشائی فرمادی ہے، اور انہوں نے ساتھ ہی اس سلسلہ میں پیش کیے جانے والے مختلف شبہات کا جواب بھی دیا ہے۔

اس رسالہ کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

ایک موقع پر علامہ موصوف فرماتے ہیں:

جبکہ اختلاف مسائلِ شرعیہ فرعیہ میں ہو، جماعتِ کثیرہ کا اتباع لازم نہیں، جماعتِ

قلیلہ یا عالمِ واحد کی رائے، جمہور کے خلاف بھی ہو، تب بھی اس میں احتمال، صواب کا اسی طرح ہے، جس طرح جمہور کی رائے میں احتمال، صواب کا ہے۔

علمائے امت کا زمانۂ صحابہ سے اس وقت تک تعامل چلا آ رہا ہے کہ انہوں نے مسائلِ مختلف فیہا میں کسی امام کے قول کو اس وجہ سے ترک نہیں کیا کہ یہ قول جمہور کے خلاف ہے، اور شخصِ واحد، یا جماعتِ قلیلہ کا قول ہے (امداد الاحکام، ج۴، ص۴۷۳، کتاب المتفرقات، رسالہ "التدقیق الاقوم فی تحقیق السواد الاعظم" مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع اول 1421 ہجری)

علامہ موصوف ایک صفحہ کے بعد مزید فرماتے ہیں:

"مسائلِ فرعیہ میں مخالفتِ جمہور کے جواز پر علمائے امت کا صحابہ سے لے کر اس (موجودہ) وقت تک ہر زمانہ میں اجماع رہا ہے، اور کوئی امام، مخالفتِ جمہور سے بچا ہوا نہیں، ہر امام کے متعدد اقوال جمہور علماء کے خلاف موجود ہیں، جس کو اس کے مقلدین نے مخالفتِ جماعتِ کثیرہ کی وجہ سے ہرگز رَد نہیں کیا، اور حنفیہ کے تو بہت سے مسائل اس شان کے ہیں، جن میں امام ابوحنیفہ، جمہور امت سے متفرد ہیں، جیسے نفاذ قضائے قاضی ظاهراً و باطناً، و جوازِ ربا فی دار الحرب، وقول بالمثلین فی وقت الظهر وغیرہ، اور ان اقوال کو حنفیہ نے اس عذر کی وجہ سے کبھی رَد نہیں کیا کہ امام صاحب ان میں متفرد ہیں۔

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یزال طائفة من امتی علی الحق منصورین لا یضرهم من خالفهم حتی یأتی امر الله. رواہ مسلم و غیرہ.

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہے گے، جس کی حق پر مدد کی جاوے گی، ان کو وہ لوگ ضرر نہ دے سکیں گے، جو ان کے مخالف ہوں گے، یہاں تک کہ اللہ کا حکم یعنی قیامت آ جاوے (بخاری ومسلم)

طائفة من الشیء قطعہ شئی کا ہوتا ہے، جو قلت پر دلالت کرتا ہے، پس فخرِ دو عالم

www.idaraghufran.org

صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ارشاد ہے کہ طائفہ قلیلہ خواہ رجلِ واحد ہی کیوں نہ ہو، حق پر ہوسکتا ہے، اوراس کے مخالف تمام دنیا بھی ہو، تو اس کا قول باطل ہوگا (ایضاً، ص ۴۷۴، ۴۷۵)

تفرد کے مسئلہ کی مکمل ومدلل تفصیل وتحقیق بندہ نے اپنی ایک تازہ تالیف ''تفرد کی حقیقت'' میں ذکر کردی ہے، جس میں علامہ ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کے مذکورہ رسالہ کی تفصیلی عبارات بھی مفید توضیحات کے ساتھ مذکور ہیں، اور مسئلہ ہٰذا کے مختلف پہلوؤں پر بحمداللہ تعالیٰ الگ الگ مدلل ومفصل کلام کیا گیا ہے، اُمید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہی یہ رسالہ شائع ہوکر منظرِ عام پر آجائے گا، اوراس سے اہلِ انصاف اوراعتدال پسند حضرات کوشبہات کے ازالہ کا موقع حاصل ہوگا، متشددین اور غالین اور غیر منصفین کا معاملہ الگ ہے۔

2/ رجب المرجب/ 1439ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد16 شمارہ01، اکتوبر 2018ء - محرم الحرام 1440ھ)

---

(108)

بعض صوفیاء ومشائخ کے ہاں ''التزام مالا یلزم''

موجودہ دور کے بہت سے صوفیائے کرام، تفقہ فی الدین کی نعمت سے محروم ہونے، بلکہ بعض تو جہالت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے افراط، یا تفریط میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اور بعض رسمیات، یا اپنے مشائخ کے طور وطریقوں بلکہ اپنے، یا اپنے بزرگوں کے طبعی طور پر پسندیدہ امور کو شریعت کے مشروع، بلکہ مسنون اعمال واحکام کا درجہ دے دیتے ہیں، جو کہ غیر معتدل طرزِ عمل ہے۔

نام نہاد مشائخ، صوفیاء اور سجادہ نشینوں کے یہاں تو جو کچھ ہوتا ہے، وہ الگ ہے، لیکن جو محتاط حضرات اور محققین کا سلسلہ ہے، اس میں بھی موجود دور کے بعض حضرات کئی قسم کی افراط وتفریط کا شکار ہوجاتے ہیں۔

www.idaraghufran.org

مثلاً ہمارے یہاں تھانوی سلسلہ کے بعض صوفیاء بزرگوں نے پانچ کلی ٹوپی کو اتنا اہم اور لازم وضروری سمجھ لیا ہے کہ اس کے بغیر وہ نہ کسی کو اپنا مرید تصور کرتے ہیں، نہ اپنے یہاں مدرسہ میں طالبِ علم کو داخل کرتے اور نہ ہی اپنے مدرسہ، یا خانقاہ میں ملازم رکھتے ہیں، ایسے شخص کو خلافت دینا تو بہت دور کی بات ہے، خواہ اس کے اخلاق کی اصلاح کیوں نہ ہو چکی ہو۔

حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مریدین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر اس طرح کی پابندیاں نہیں لگائیں۔

ایسے ہی ایک خانقاہ میں میرا جانا ہوا، جہاں پر سب لوگوں نے پانچ کلی ٹوپی پہن رکھی تھی، مگر میں نے اس وقت اپنے سر پر جالی کی گول ٹوپی پہنی ہوئی تھی، جو عام طور پر بازار سے دستیاب ہو جاتی ہے، اور ہمارے شیخ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی بھی عموماً اسی طرح کی ٹوپی پہنتے ہیں۔

وہاں کے شیخ صاحب نے اپنے مریدین سے میرا تعارف کرایا کہ ان کا نام مفتی محمد رضوان ہے، اور ان کے والد کا نام محمد غفران اور دادا کا نام منشی محمد سلیمان تھا، جو کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خاص خدام حضرات میں سے تھے، اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی ڈاک لایا کرتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔

ان شیخ صاحب نے اور ان کے تمام مریدین نے اس وقت چونکہ پانچ کلی ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور بندہ نے اس وقت اپنے سر پر جالی کی ٹوپی پہنی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے بندہ کا حلیہ دوسرے حاضرینِ مجلس سے الگ تھلگ ہی نمایاں طور پر محسوس ہو رہا تھا۔

جب یہ مجلس برخواست ہوگئی، تو شیخ موصوف کے ایک مرید صاحب نے مجھ سے ایک طرف ہو کر معلوم کیا کہ آپ نے جو یہ جالی کی ٹوپی پہن رکھی ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے، اور اس کا ثبوت کہاں سے ہے؟

میں نے اس کے جواب میں ان صاحب سے کہا کہ آپ نے جو پانچ کلی ٹوپی پہن رکھی ہے،

پہلے آپ خود اس کا ثبوت پیش کیجیے، اور بتلایئے کہ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیونکہ جس طرح کا ثبوت آپ کی پہنی ہوئی ٹوپی کا ہے، اسی طرح کا ثبوت میری پہنی ہوئی ٹوپی کا بھی ہے، اور جو جواب آپ کی اپنی پہنی ہوئی ٹوپی سے متعلق ہوگا، وہی جواب میرا بھی ہوگا، جیسا کہ عربی میں مشہور ہے کہ:

''فَمَا هُوَ جَوَابُکَ فَهُوَ جَوَابُنَا''۔

اعتراض کرنے والے وہ صاحب میری یہ بات سن کر دم بخود رہ گئے، اور کوئی جواب نہ بن پڑا، بڑے سٹپٹائے، کیونکہ انہوں نے اپنے شیخ اور اپنے تمام پیر بھائیوں کے طرزِ عمل کی وجہ سے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ان کی پانچ کلی مخصوص ٹوپی تو شرعاً ثابت ہے، اور اس کے علاوہ کوئی دوسری ٹوپی شریعت کی رُو سے ثابت نہیں۔

میں نے ان صاحب سے عرض کیا کہ بندہ نے ''ٹوپی کی شرعی حیثیت'' کے عنوان سے ایک مستقل کتاب تالیف کی ہے، جس میں باحوالہ یہ بات مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام، تابعینِ عظام اور جلیلُ القدر فقہاء ومحدثین وغیرہ سے مختلف اقسام کی ٹوپیاں پہننا ثابت ہے، جالی والی اور سوراخ والی بھی، اور گرم اونی بھی، اور بڑی ٹوپی بھی اور چھوٹی ٹوپی بھی، اور مختلف رنگوں کی ٹوپی بھی، یہاں تک کہ سیاہ اور کالے رنگ کی ٹوپی کا بھی ثبوت ملتا ہے، اور بہت سے فقہاء نے سیاہ رنگ کے لباس کو، جبکہ بعض فقہاء نے سبز رنگ کے لباس کو مستحب قرار دیا ہے، جس طرح سفید رنگ کے لباس کو بھی فقہائے کرام نے مستحب قرار دیا ہے، اور اس کے علاوہ دوسرے رنگوں کو جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ کوئی نسوانیت وغیرہ سے تشبہ لازم نہ آئے، ظاہر ہے کہ ٹوپی بھی لباس کا حصہ ہے، اس لیے اس میں بھی لباس والا حکم جاری ہوگا۔

اور ٹوپی سے مقصود سر کا حیا وغیرت کے طریقہ پر ڈھانپنا ہے، یہ مقصود جس طرح کی ٹوپی سے حاصل ہوجائے، اور اس میں کسی غیر قوم کی مشابہت بھی لازم نہ آتی ہو، تو اس سے ٹوپی پہننے، یا اوڑھنے کی سنت حاصل ہوجاتی ہے۔

پھر کسی خاص قسم کے رنگ، یا طرز کو لازم سمجھنا اور اس کے بغیر بزرگیت کو تسلیم نہ کرنا، یہاں تک کہ اس کو اپنی مخصوص جماعت، یا گروہ کا شعار بنا کر دوسروں کو حقیر ومعیوب سمجھنا شرعاً کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

فقہائے کرام نے ''التزام مالا یلزم'' کو معصیت اور گناہ کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

لہٰذا پانچ کلی ٹوپی کو ضروری درجہ دینا، یا اس کو اپنے مباح درجہ سے بڑھانا درست نہیں۔

اس کے علاوہ یہاں کچھ عرصہ پہلے ایک خانقاہی بزرگ بلکہ شیخِ طریقت تشریف لائے، جو کہ بندہ کے والد صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں، اور بندہ کے ساتھ بھی اسی نسبت سے محبانہ ومشفقانہ تعلق رکھتے ہیں۔

بندہ نے ان سے ملاقات کے وقت اپنی حسبِ عادت سیاہ رنگ کی جالی والی ٹوپی پہن رکھی تھی، جس کو بندہ فقہی اعتبار سے جائز، بلکہ مستحب سمجھتا ہے۔

ان بزرگ نے بندہ کی یہ ٹوپی دیکھ کر فرمایا کہ ارے آپ نے پانچ کلی ٹوپی نہیں پہنی، آپ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے سلسلہ کی پانچ کلی ٹوپی پہنیں، اور انہوں نے بندہ کو اپنے پاس سے دو عدد پانچ کلی ٹوپیاں فراہم کیں، ان میں سے ایک ٹوپی کو بندہ نے ادب کی خاطر اور اعزاز سمجھ کر اسی وقت پہن لیا، اور دوسری ٹوپی کو اپنے ساتھ رکھ لیا، لیکن ساتھ ہی یہ محسوس کیا کہ ہمارے یہاں بہت سے صوفیاء اور مشائخ کے حلقہ میں بعض مباحات کے اندر غلو ہونے لگا ہے، جس کو اعتدال پر لانے اور ان میں تفقہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکن تعجب وحیرت ہے کہ آج کل بعض صوفیاء ومشائخ اپنے مخصوص روایتی امور میں فقہی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے، بلکہ بعض تو فقہی چیزوں کا مذاق بھی بناتے ہیں، استغفر اللہ، جس کی وجہ سے متعدد بے اعتدالیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ صوفیائے کرام کے یہاں اس طرح کی بے اعتدالیوں کو دور کرنے اور اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ صوفیائے کرام خود بھی بے اعتدالیوں

کی وجہ سے گناہ گار ہونے سے محفوظ رہیں، اوران کے واسطہ سے عوام بھی محفوظ رہیں، کیونکہ دین، سب کے لیے ہے، اورکوئی شخص، یا مسلک، یا طبقہ، یا جماعت دین کے احکام سے بریٔ ومستغنی نہیں، مگر یہ کہ کوئی ہوش وحواس سے محروم ہونے کی وجہ سے مکلّف ہی نہ رہے۔

اسی طرح آج کل بعض مشائخ اور صوفیائے کرام کے یہاں حلقۂ ارادت میں داخل ہونے اوراس تعلق کو برقرار رکھنے کے لیے سر کے بال منڈا کر رکھنا، یا پھر سر پر اتنے چھوٹے چھوٹے بال ہونا ضروری سمجھا جانے لگا ہے، جن میں کنگھا کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے، اوران کے یہاں اتنے بڑے بال رکھنے کی اجازت نہیں کہ ان میں کنگھا ہوسکتا ہو، یا کنگھا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہو، اوراگر کوئی اس طرح کے بال رکھے، جن میں کنگھا ہوسکتا ہو، تو اس کو نہ تو بیعت کرتے، اور نہ ہی اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرتے، خلافت دینا تو در کنار۔

حالانکہ مرد حضرات کے حق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل اور دوامی سنت، جس میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں، وہ سر پر بال رکھنا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اعتدال کے ساتھ اپنے سر کے بالوں میں کنگھا کرنا اوراپنے ساتھ کنگھا رکھنا بھی ثابت ہے۔

جہاں تک کہ سر کے بال منڈانے کا تعلق ہے، تو اس کو بعض فقہاء نے مکروہ، بعض نے مباح اور بعض نے مستحب، یا سنت قرار دیا ہے، جبکہ بعض نے مرد حضرات کے حق میں سر کے بال منڈانے کو خوارج کی علامت قرار دیا ہے، کیونکہ اس کا کئی احادیث میں ذکر آیا ہے، چنانچہ بندہ نے ''خوارج سے متعلق احادیث کی تحقیق'' کے عنوان سے ایک رسالہ تالیف کیا ہے، اس میں اس کی تفصیل وتحقیق ذکر کی ہے۔

بہر حال اگر مرد حضرات کے حق میں سر کے بال منڈانے کے سنت ومستحب ہونے کے قول کو بھی لیا جائے، تب بھی اس سے مرد حضرات کو سر پر بال رکھنے کے قول کا ناجائز ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ سر پر بال رکھنے اوران میں اعتدال سے کنگھا کرنے کو ناجائز، یا بدعت کسی مجتہد نے بھی نہیں کہا، جب تک وہ بال اتنے بڑے نہ ہوں کہ ان میں عورتوں وغیرہ کی مشابہت

لازم آئے، یا اور کوئی خارجی خرابی لازم آئے، جبکہ سر کے بال منڈانے کے مکروہ وغیرہ ہونے کا قول بعض فقہاء ومجتہدین کا موجود ہے، اگرچہ وہ کسی کے نزدیک راجح نہ ہو، یہ الگ بحث ہے۔

لیکن ایک متفق علیہ سنت پر عمل کرنے والے پر نکیر کرنا اور اس عمل کی گنجائش نہ دینا اور اس کے خلاف کو تقوے و پاکیزگی اور اصلاحِ نفس کے لیے لازم وملزوم سمجھنا، یہ سب چیزیں شرعی وفقہی اصولوں سے ناواقفیت اور غلو وتشدد پر مبنی ہیں، جس سے شریعت نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے، اور اس سلسلہ میں یہ صوفیاء اور مشائخ جو اپنے مدعا پر دلائل پیش کیا کرتے ہیں، وہ شرعی و فقہی اعتبار سے قابلِ اطمینان معلوم نہیں ہو سکے۔

اسی طرح بعض صوفیاء ومشائخ کے یہاں سفید لباس کو بھی ایسا لازم سمجھ لیا گیا ہے کہ گویا کہ اس کے بغیر نہ تصوف وطریقت میں قدم رکھا جاسکتا ہے، نہ تقویٰ حاصل کیا جاسکتا ہے، اور نہ ہی اس کے بغیر بزرگیت کا تصور کیا جاسکتا ہے، اور اگر کوئی عالم، یا بزرگ سفید لباس کے علاوہ کسی دوسرے رنگ کا لباس پہنے، تو اسے معیوب اور سنت وبزرگی، بلکہ عالمِ دین کی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

یہ طرزِ عمل بھی درست نہیں، کیونکہ بلاشبہ سنت سے سفید رنگ کا پسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے، لیکن اولاً تو سفید رنگ کے ساتھ ساتھ عام دوسرے رنگوں کے لباس کی ممانعت نہیں، سوائے مخصوص رنگوں کے، جن میں کوئی تشبہ بالغیر، یا تشبہ بالنساء وغیرہ کی وجہ پائی جائے، لہٰذا جائز اور مباح چیز کو معیوب سمجھنا اور اس پر نکیر کرنا جائز نہیں، دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خود عملی طور پر ہمیشہ سفید رنگ کے لباس کا اہتمام اور معمول ثابت نہیں، بلکہ احادیث وسنت پر نظر کرنے والے پر یہ بات مخفی نہیں ہو سکتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں مختلف الوان اور رنگوں کا لباس پہنا ہے، اور ہمیشہ سفید لباس پہننے کا اہتمام اور تکلف نہیں کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج تو تکلف کا تھا ہی نہیں، جس وقت جیسا لباس میسر آیا، ویسا پہن لیا، جب

تک اس میں کوئی خرابی شامل نہ ہو۔

اس کے علاوہ سنت سے سیاہ اور سبز لباس کا پسندیدہ ہونا بھی معلوم ہوتا ہے، اس لیے بعض فقہاء نے سیاہ اور سبز لباس کو بھی مستحب قرار دیا ہے۔

بندہ نے جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کیا ہے، تو اس سے یہ بات سمجھ آئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لباس کے الوان اور رنگوں کے انتخاب میں اہتمام وتکلف نہیں فرمایا، جب جس طرح کے رنگ کا لباس بلاتکلف میسر آ گیا، اس کو استعمال فرمالیا، خواہ وہ سفید رنگ کا ہو، یا سبز رنگ کا ہو، یا سیاہ رنگ کا ہو، یا کسی اور رنگ کا، جس طرح کھانے پینے اور سونے لیٹنے کی چیزوں میں بھی تکلف وتصنع کا اہتمام نہیں فرمایا۔

لہٰذا یہ سادگی اور بے تکلفی ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل سنت ہے، اور اس کے بجائے ہمیشہ کسی ایک رنگ کا اہتمام، بلکہ التزام ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک میں نہیں ملا۔

بندہ محمد رضوان کا بھی لباس وغیرہ کے سلسلہ میں الحمد للہ تعالیٰ یہی بے تکلفانہ طرزِ عمل ہے، اگرچہ بعض اصحابِ علم بندہ کے اس طرزِ عمل کو پسند نہیں فرماتے، بلکہ بعض اوقات اس طرزِ عمل کو عالمِ دین کی شان کے خلاف بھی قرار دیتے ہیں، اور سفید لباس پہننے کا اہتمام کرنے پر زور دیتے ہیں، لیکن کسی کے کہنے، یا سمجھنے سے تو کچھ نہیں ہوتا، اصل مقصود تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور اس کی رضا ہے۔

لہٰذا سفید لباس کا التزام کرنا، اور دوسرے رنگ کے لباس پر نکیر کرنا، اور اس کو معیوب سمجھنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔

بندہ نے جن مشائخ کی صحبت اٹھائی، اور ان سے باقاعدہ اصلاحی تعلق قائم رکھا، اور ان سے بندہ کو مناسبت قائم ہوئی، ان کے یہاں الحمد للہ تعالیٰ اس طرح غیر منکر پر نکیر، التزام مالا یلزم، تشدد وسختی اور اس طرح کی افراط وتفریط بندہ نے نہیں دیکھی، جن میں حضرت مسیح الامت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی، حضرت نواب عشرت علی خان قیصر

صاحب رحمہما اللہ اور ان کے بعد حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی سرفہرست ہیں کہ بندہ نے ان حضرات کے یہاں مذکورہ اور دیگر امور میں بہت اعتدال دیکھا، اور موجودہ دور کے رسمی مشائخ وصوفیاء میں رائج مختلف روایتی اور رسمی امور اور دین میں تشدد وغلو سے ان حضرات کو محفوظ پایا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔ آمین۔

3 رجب المرجب 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 02، نومبر 2018ء - صفر المظفر 1440ھ)

---

(109)

معاملات میں مشکلات کا حل اور مذہبِ غیر پر فتویٰ

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ لین دین وغیرہ میں آج کل نئی نئی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں، اور اکثر احکامِ شرعیہ کے خلاف عملدرآمد ہو رہا ہے، اور ان سے اجتناب کرنے کو لوگ دشوار سمجھتے ہیں۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ نے اس کے متعلق فرمایا کہ:

اگر تجارت پیشہ، زراعت پیشہ، ملازمت پیشہ، اہلِ صنعت وحرفت یہ سب ان چیزوں کے متعلق واقعات بصورتِ استفتاء جمع کر کے (مجھے) دے دیتے، تو میں سوال و جواب کی صورت میں ان کے احکام جمع کر دیتا، اگر کسی مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے مذہب پر جواز نہ نکلتا، تو میں نے یہ طے کیا تھا کہ امام شافعی کے مذہب پر فتویٰ دے دوں گا، امام مالک کے مذہب پر فتویٰ دے دوں گا، امام احمد بن حنبل کے مذہب پر فتویٰ دے دوں گا، اور اگر ان سے بھی کوئی صورت نہ نکلے گی، تو ان کی سہل تدابیر بتلاؤں گا کہ یوں کر لیا کرو، جس صورت سے جواز نکل آتا، اور اگر کوئی بات سمجھ سے باہر ہوتی، تو اس کا کوئی علاج نہیں، معذوری ہے، اب اتنے

بڑے کام کی ہمت نہیں رہی (''الافاضات الیومیہ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۶،ص ۲۱۵، ملفوظ نمبر: ۲۲۶، بعنوان ''ایک ضروری رسالہ کی تصنیف کی ضرورت'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: محرم 1424ہجری)

مذکورہ ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے زراعت، ملازمت، صنعت اور حرفت کے تمام شعبوں سے متعلق اپنے زمانہ میں مبتلا حضرات کی مشکل کے لیے حنفیہ کے علاوہ دیگر تینوں فقہاء سے جواز کی صورتوں پر فتویٰ دینا طے کیا تھا، اور متبادل سہل تدابیر بتلانے کی بھی تجویز دی تھی، لیکن ایسے تمام نئے مسائل مرتب کر کے حضرت تھانوی کے پاس لانے والے نہ لا سکے، بعد میں بھی آپ کو اس کا داعیہ رہا، جیسا کہ اس ملفوظ میں ہے، لیکن اب خود اس کا بار اٹھانے سے ہمت کمزور ہو جانے کی وجہ سے عذر کیا۔

اور آج ہر شعبہ میں نئی نئی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں، اور دشواریاں مزید بڑھ گئی ہیں، جس کی ضرورت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے زمانہ کے مقابلہ میں آج کے دور میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، لیکن افسوس کہ اولاً تو حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے اس منشاء کے مطابق کوئی عمل کرنے کے لیے تیار نہیں، اور اگر کوئی اللہ کا بندہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کی اس تجویز کے مطابق عمل کرتا ہے، اور کچھ تھوڑا بہت کام کرتا، یا کرنا چاہتا ہے، تو اس کے کام میں ٹانگ اڑائی جاتی ہے، اس کو طرح طرح کی آزادی اور غیر مقلدیت اور اباحیت پرستی کا الزام دیا جاتا ہے۔

چنانچہ موجودہ زمانہ میں بینکاری کی ضرورت انٹرنیشنل سطح پر پیش آ گئی ہے، اور اس نظام میں عوام وخواص کا ابتلا ہو گیا ہے، کوئی حج یا عمرہ کرنا چاہے، ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرنا چاہے، بجلی یا گیس وغیرہ کا میٹر لگوانا چاہے، یا اس کا بل جمع کرنا چاہے، اور اس طرح کے بے شمار کام کرنا چاہے، تو اسے بینکوں کا سہارا لینا پڑتا ہے، لیکن علمائے کرام کا ایک طبقہ نہ تو بینکاری کے نظام کو جائز قرار دیتا، نہ ہی عملی طور پر اس کی متبادل سہل صورتیں تجویز کرتا، اور نہ ہی دوسرے حضرات کی تجاویز اور متبادل پیش کردہ صورتوں سے اتفاق کرتا، چنانچہ حضرت

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی اور دیگر متعدد اہلِ علم حضرات نے جو بعض فقہائے کرام کے اقوال کی روشنی میں مختلف صورتوں کا حل نکالا ہے، ان کو بعض حضرات کی طرف سے ہدفِ ملامت وتنقید بنایا جاتا ہے، اور خود سے بھی قابلِ عمل صورتوں کی شکل میں حل پیش نہیں کیا جاتا، جو قابلِ ستائش طرزِ عمل معلوم نہیں ہوتا۔

اللہ اس جمود وتشدد سے حفاظت عطاء فرمائے، اور امتِ مسلمہ کی مشکلات کو حل کرنے کی جدوجہد کی توفیق عطاء فرمائے۔آمین۔6 رجب المرجب 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 03، دسمبر 2018ء - ربیع الاول 1440ھ)

---

(110)

حدیث اور فتوے کا رنگ غالب ہونے والے کا فتویٰ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ نے ایک مقام پر فرمایا کہ:

جس شخص پر فقہ اور فتویٰ کا رنگ غالب ہوتا ہے، اس کے فتویٰ کا رنگ اور ہوتا ہے کہ جزئیات میں تشدد کی عادت ہوتی ہے، اور جس پر حدیث کا رنگ غالب ہوتا ہے، اس کے فتویٰ کا رنگ اس سے مختلف ہوتا ہے کہ اس میں کچھ توسع ہوتا ہے

(آدابِ افتاء واستفتاء، الباب الثانی: آداب المفتی، بعنوان ''فقیہ اور محدث کے فتوے میں فرق'' بحوالہ: مجالسِ حکیم الامت ص۲۳۶، مشمولہ: تحفۃ العلماء، ج۲ص۲۴۹، ناشر: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، سنِ طباعت: ۱۴۱۵ھ)

اس سے معلوم ہوا کہ فتویٰ دینے کا حق صرف نِرے فقیہ کو ہی حاصل نہیں، بلکہ اس عالم کو بھی حاصل ہے، جس پر حدیث کا رنگ غالب ہو، اور اس کے فتوے پر عمل کر لینا بھی جائز ہے۔

چنانچہ ہر دور میں ایسے محدثین بھی فتویٰ دیتے رہے ہیں۔

دیوبند کے اکابر ومشائخ میں علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ بہت بڑے محدث گزرے

ہیں، اور ہم نے آپ کے مآثرِ علمیہ کی مراجعت سے آپ کو اپنے تمام اکابر ومشائخِ دیوبند میں خاص امتیازی شان کا حامل عظیم محدث پایا ہے، جن کی فقہ پر بھی نظر ہے، مگران پر حدیث کا رنگ غالب ہے، اور متعدد فقہی مسائل میں ان کی آراء بڑی اہمیت کی حامل معلوم ہوتی ہیں۔

انہوں نے صحیح بخاری کی شرح میں قربانی کے گوشت کے مسئلہ میں فرمایا کہ اگر قربانی کے بڑے جانور کے شرکاء، باہمی رضامندی سے اندازاً تولے بغیر گوشت تقسیم کرلیں، تو جائز ہے، اور ضرورت کے وقت باہمی رضامندی سے اس پر عمل کرلینا جائز ہے۔

بندہ کو ان کی رائے اور دلیل میں قوتِ نظر آئی، جس کا بندہ نے ایک مرتبہ کچھ اصحابِ علم سے تذکرہ کیا، جس پر ایک مولوی صاحب نے فرمایا کہ علامہ کشمیری کی بخاری کی یہ شرح کوئی فتوے کی کتاب نہیں، اس لیے اس رائے پرعمل کرنے کی گنجائش نہیں دی جاسکتی۔

میں نے کہا کہ اگر بخاری کی شرح میں مذکور کسی بات پرعمل کی اس وجہ سے گنجائش نہ ہو کہ فتاویٰ کے نام والی کتابوں میں اس کے خلاف لکھا ہے، تو پھر بخاری کی ان شروحات کو پڑھنے پڑھانے کی کیا ضرورت ہے، کیا یہ شروحات تفریح اور کھیل تماشہ کے طور پر لکھی گئی ہیں۔

ملاحظہ فرمایئے کہ بعض حضرات کس قدر جمود کا شکار ہیں کہ فقہائے محدثین کے فتوے پرعمل کی کسی صورت اجازت دینے کے لیے تیار نہیں، جبکہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی کتابوں میں نِرے فقہاء، یا نِرے محدثین کے بجائے فقہائے محدثین کے فتوے اور رائے کو اختیار کرنے کو ترجیح دی ہے۔

اور ہم نے جب دیکھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے فقہی امور میں بہت افراط وتفریط ہورہی ہے، تو ہم نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فقہی افکار پر تفصیلی وتحقیقی کام کرنے کی ضرورت محسوس کی، اور اس پر مفصل مواد جمع کیا۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا ارشاد پر غور کرنے سے اس قسم کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

پھر بعد میں بندہ نے ”قربانی کا گوشت تولے بغیر تقسیم کرنے کا حکم“ کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ بھی تحریر کردیا ہے، جس میں اس مسئلہ کے متعلق مختلف فقہائے کرام کے اقوال اوران کے دلائل سمیت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے قول کی تفصیل اوراس کے دلائل بھی وضاحت کے ساتھ ذکر کردیئے ہیں۔ 19 رجب المرجب 1439 ہجری

(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد 16 شمارہ 03، دسمبر 2018ء - ربیع الاول 1440ھ)

---

(111)

انتظامی معاملات میں مروّجہ عیسوی تاریخوں کا استعمال

قمری اور چاند کے مہینوں کے ساتھ اسلامی احکام وابستہ ہیں، بالغ ہونے کا حکم، زکاۃ کی فرضیت، مخصوص مہینہ کے روزوں کا فرض ہونا، مخصوص مہینوں کی مخصوص تاریخوں میں روزوں کا سنت، مستحب، یا ممنوع ومکروہ ہونا، حج کا مخصوص مہینوں اور تاریخوں میں اداء ہونا عیدُ الفطر، عیدُ الاضحیٰ وغیرہ وغیرہ، اس طرح کے سب احکام کا تعلق قمری اور چاند کے مہینوں کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔

اس لیے اس طرح کے احکام اور عبادات کے لیے اسلامی وقمری مہینوں اور تاریخوں کو یادرکھنا اور حساب وکتاب رکھنا ضروری ہے، اوران عبادات کو قمری واسلامی مہینوں وتاریخوں کو نظر انداز کرکے کسی دوسری تقویم کے ساتھ وابستہ کرنا جائز نہیں۔

البتہ انتظامی امور میں حسبِ ضرورت وحسبِ سہولت دوسری تقویم کا حدودِ شریعت کا لحاظ کرتے ہوئے استعمال کرنا جائز اور مباح ہے، جس طرح اس قسم کے امور میں قمری واسلامی تاریخوں کا استعمال بھی جائز، بلکہ مستحب ہے۔

لہٰذا اگر انتظامی ضرورت کی وجہ سے اور مشکل وتکلیف سے بچنے کے لیے کسی دوسری تقویم کا استعمال کیا جائے، مثلاً آج کل عیسوی تقویم کا استعمال عام ہے، سرکاری سطح پر بھی اور مختلف

نجی زندگی کے شعبوں میں بھی، اور بینکوں وغیرہ میں بھی۔

ایسے حالات میں اگر مدرسہ وغیرہ میں تنخواہ اور حاضری وغیرہ کے نظام کو انتظامی سہولت کے لیے عیسوی تقویم کے مطابق اختیار کیا جائے، تو گناہ نہیں۔ 23 رجب المرجب 1439ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 03، دسمبر 2018ء - ربیع الاول 1440ھ)

---

(112)

اکابر کے ادب وتعلق کا ایک غلط مطلب

ایک عالمِ دین نے مجھ سے کہا کہ آپ کا حضرت حکیم الامت تھانوی اور مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی اور حضرت نواب عشرت علی خان قیصر صاحب رحمہم اللہ سے تعلق ہے، اس نسبت اور تعلق کا تقاضا یہ ہے کہ آپ تمام اجتہادی اور فقہی مسائل میں ان حضرات کے مطابق موقف رکھیں، اور کسی مسئلہ میں ان حضرات سے مختلف رائے اختیار نہ کریں، ہم تو اپنے لیے اکابر کے نقشِ قدم ہی پر چلنے کا طرز اختیار کرتے ہیں، اور اس کو تصلُّب سمجھتے ہیں، اپنے بزرگوں کی رائے میں تصلُّب ہونا چاہئے، اور اس سے ذرہ برابر نہیں ہٹنا چاہئے۔

بندہ کو ان کی مذکورہ باتیں سن کر بڑی حیرت ہوئی، وہ چونکہ بندہ کے بزرگ تھے، اور اس وقت زیادہ گفت وشنید کا موقع بھی نہیں تھا، اس لیے بندہ نے ادب کے تقاضہ کی وجہ سے خاموشی کے ساتھ ان کی بات سن لی۔

لیکن محسوس ہوا کہ آج کے دور میں اچھے اچھے اصحابِ علم حضرات فقہ وتفقہ کی نعمت سے محروم ہیں، بلکہ یہ حضرات فقہ وتفقہ کے بنیادی اصول وقواعد کی خلاف ورزی کو ہی اُلٹا فقہ اور تفقہ سمجھے ہوئے ہیں۔

بھلا کسی بزرگ اور اللہ والے کے استاذ، یا شیخ ہونے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ انسان، ہر

فقہی واجتہادی مسئلہ میں اس کی رائے کا شرعاً پابند ہو، خاص طور پر جب وہ خود کسی مسئلہ میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، یہ مسئلہ تو خود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے فقہ وتفقہ سے واضح ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی زندگی میں ان کے براہِ راست تلامذہ اور شاگردوں نے بہت سے مسائل میں ان سے اختلاف کیا، لیکن اس کو نہ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بزرگ ماننے کے خلاف سمجھا گیا، اور نہ ہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شیخ، یا استاذ ہونے کے منصب کے خلاف سمجھا گیا، اور خود حضرت حکیمُ الامت تھانوی رحمہ اللہ نے بھی اپنے اصحابِ علم وفقہ تلامذہ ومریدین سے فقہی واجتہادی مسائل میں اختلاف ہونے پر ان سے ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا، جس کی تفصیل باحوالہ انداز میں بندہ نے فقہ واجتہاد سے متعلق اپنے بعض رسائل وتالیفات میں ذکر کردی ہے، اس کے ساتھ ہی تصلُّب اور تعصُّب وتحزب میں فرق کی بھی شرعی وفقہی اصولوں اور واضح تصریحات سے نشاندہی کردی گئی ہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

بعض متاخرین، متقدمین سے زیادہ کامل ہوئے ہیں، یہ واقعہ ہے(''الافاضات الیومیہ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۰، ص ۳۲۵، ملفوظ نمبر ۲۲۱، بعنوان ''بعض متاخرین، متقدمین سے زیادہ کامل ہوتے ہیں'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

اس سے معلوم ہوا کہ متاخرین کی رائے، اگر متقدمین کے خلاف ہو، لیکن وہ شرعی اصول وقواعد کے مطابق ہو، تو اس کو صرف متقدمین کے خلاف ہونے کی وجہ سے رَد کرنا درست نہیں۔

مگر آج بعض اہلِ علم حضرات اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے اولاً تو ایسی باتوں کا مطالعہ نہیں کرتے، اور کرتے بھی ہیں، تو ان چیزوں کو استثنائی اور شاذ باتیں سمجھ کر نظر انداز کردیتے ہیں۔

24 رجب المرجب 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 03، دسمبر 2018ء - ربیع الاول 1440ھ)

---

(113)

علامہ عبدالحئ لکھنوی کا علمی کمال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ نے اپنی ملفوظات میں علامہ عبدالحئ لکھنوی رحمہ اللہ کی خدمات کی بڑی تعریف وتوصیف کی ہے کہ تقریباً چالیس سال کی محدود عمر میں انہوں نے دین کی بڑی خدمت کی، حضرت تھانوی رحمہ اللہ اپنے ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

علامہ عبدالحئ لکھنوی نے اس تھوڑی سی عمر میں بہت کام کیا، سمجھ میں نہیں آتا، وقت میں بہت ہی برکت تھی، ہر فن سے مناسبت تھی، اور ہر فن کی خدمت کی (''الافاضات الیومیہ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱، ص۳۵۳، ملفوظ نمبر ۴۷۹، بعنوان ''حضرت مولانا عبدالحیئ لکھنوی کا کمال'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳)

ہم نے بھی علامہ لکھنوی رحمہ اللہ کے علمی کمالات کا ان کی بلند مرتبت تصنیفات ومقالات میں خوب مشاہدہ کیا، اور اپنی مختلف تصنیفات وتالیفات میں علامہ عبدالحئ لکھنوی رحمہ اللہ کے کلام اور عبارات سے استفادہ کیا، لیکن آج ہمارے بہت سے اہلِ علم حضرات علامہ لکھنوی کی علمی خدمات کی قدر وقیمت کا اندازہ کرنے سے قاصر ومحروم ہیں، بلکہ بعض حضرات کے جمود وعصبیت کا تو یہ حال ہے کہ ان کی متعدد تحقیقات پر تفرُّدات وغیرہ کا الزام لگا کر ان کی تحقیقات کی زَد سے اپنے جمود کو بچانا اور چھپانا چاہتے ہیں۔

بندہ نے ''تفرُّد کی حقیقت'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جس میں اس قسم کے الزامات کا مفصلاً ذکر ہے۔

25 رجب المرجب 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 03، دسمبر 2018ء - ربیع الاول 1440ھ)

---

www.idaraghufran.org

(114)

اپنے دشمن کے صحیح قول کو قبول کرنا حق پرستی ہے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار مولوی یحییٰ صاحب سے فرمایا کہ بریلی سے جو رسائل آئے ہیں، وہ مجھ کو سنانا، تاکہ جو بات ہمارے اندر غلطی کی ہے، اس سے ہم رجوع کرلیں، انہوں نے کہا کہ ان میں گالیوں کے سوا اور کیا ہے۔

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے، ہمارے اکابر کی حق پرستی کا کہ اپنے دشمن کے صحیح قول کو قبول کرنے کو تیار ہیں (''فیض الخالق وکلمۃ الحق'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۴، ص۱۴۶، ملفوظ نمبر ۱۳۳، بعنوان ''اکابر کی حق پرستی'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: 2000ء)

ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے اکابر جن کے ہم نام لیوا ہیں، وہ کس قدر حق پرست تھے کہ عقائد ونظریات وغیرہ میں بھی اپنی مخالفت کرنے والوں کے صحیح قول کو قبول کرنے اور اپنی اصلاح کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے، حق پرستی کی دلیل یہی ہے۔ [1]

اور ایک موجودہ دور کے وہ حضرات ہیں، جو اِن حضراتِ اکابر کے نام لیوا ہیں، ہر وقت ان کی زبانیں ان اکابر کے نام اور ذکر سے تر رہتی ہیں، لیکن وہ اس طرح اپنے اہلِ حق مخالفین کی کسی صحیح بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، جو اہلِ باطل ہیں، ان کی صحیح بات کو تو کیا قبول کریں گے، یہی وجہ ہے کہ اہلِ حق فقہائے کرام ومحدثینِ عظام میں سے اگر اپنے موقف کے خلاف کوئی صحیح بات سامنے آتی ہے، اور اس کی دلیل بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، تب بھی اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ اور تیار نہیں ہوتے، بلکہ طرح طرح کی تاویلات کرکے اس کو رَد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

---

[1] والقول الحق الذی یقوم علیه الدلیل یقبل من کل من قاله(منهاج السنة النبویة لابنِ تیمیة، ج ۱ ص ۵۶، کلام عام عن الرافضة)

اور اگر ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص، جو مذکورہ اکابر کا متبع ہو، وہ صحیح طرزِ عمل اختیار کرتا ہے، تو اس پر طرح طرح کے اعتراضات شروع کردیتے ہیں، مثلاً یہ اپنے اکابر کا متبع نہیں، اس میں تصلُّب نہیں، اس میں آزادی ہے، جو دوسروں کے حوالہ جات پیش کرتا ہے، یا ان کی بعض باتوں سے متاثر ہوجاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اللہ اس طرح برائے نام اکابر کا متبع ہونے سے ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین۔

27 رجب المرجب 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 03، دسمبر 2018ء - ربیع الاول 1440ھ)

---

(115)

اہلِ علم میں پیٹھ پیچھے برائی کا مرض

آج کل پیٹھ پیچھے بُرائی کرنے کی عادت میں کئی علماء وصلحاء کہلائے جانے والے حضرات بھی مبتلا ہیں، جن میں بعض حضرات وہ بھی ہیں، جو دین اور علمِ دین کے عنوان سے اس عادت میں مبتلا ہوتے ہیں، اور کسی کی پیٹھ پیچھے ایسی برائی بیان کرنا، یا ایسا عیب بیان کرنا، جو اس میں موجود ہو، اور وہ سنے تو اس کو اس سے ایذا پہنچے، یہ غیبت ہے، اور غیبت گناہ ہے، خواہ دین کے عنوان سے ہو، یا دنیا کے عنوان سے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اجتہادی وفقہی مسائل میں دوسرے سے اختلاف ہونے کی صورت میں دوسری رائے کے حامل شخص کی شان میں اس انداز میں زبان درازی کی جاتی ہے کہ جس کی شرعاً اجازت نہیں کہ دوسرے کے ذاتی عیوب کو بھی درمیان میں لایا جاتا ہے، اور دوسرے کی تذلیل وتحقیر کی جاتی ہے، جبکہ یہ طرزِ عمل تو عام مسلمان کی شان میں بھی جائز نہیں، چہ جائیکہ کسی فقیہ وعالم کی شان میں اس کو اختیار کیا جائے گا، اور اس کو گناہ کے زمرہ میں بھی داخل نہ مانا جائے، یہ نفس وشیطان کی تلبیس ہے کہ وہ بعض گناہوں کو نیکیوں کا رنگ چڑھا کر اور تلبیس کرکے حملہ کرتا ہے، اسی وجہ سے شیطان کا ایک نام ابلیس ہے۔

اہلِ علم حضرات کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے، اور انہیں اس سلسلہ میں سلف سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے کہ ان کا اجتہادی اور فقہی اختلافات میں ایک دوسرے کے متعلق کیا طرزِ عمل تھا، کیا ان میں ایک دوسرے سے اجتہادی وفقہی مسائل میں اختلاف ہونے پر اس طرح پیٹھ پیچھے بُرے انداز میں تبصروں کا رواج تھا، جو آج بعض علمی دنیا میں پایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں تھا، ہمیں بھی ان حضرات کے نقشِ قدم پر چلنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

28 رجب المرجب 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 03، دسمبر 2018ء - ربیع الاول 1440ھ)

---

(116)

میز کرسی پر کھانے کا حکم

کسی زمانے میں میز کرسی پر کھانا کھانا، غیر مسلموں کے ساتھ تشبہ میں داخل ہو کر حرام وناجائز قرار دیا گیا تھا، کیونکہ اس کا مسلمانوں میں رواج نہیں تھا، مگر اب یہ عام ہوگیا ہے، جگہ جگہ ہوٹلوں، بازاروں، دوکانوں، دفتروں اور گھروں میں مسلم اور غیر مسلم کے امتیاز کے بغیر اس کا عموم ہوگیا ہے، اس لیے اب عرف بدل جانے کی وجہ سے حرام وناجائز نہیں ہوگا، اور تشبہ کے مسئلہ میں عرف کا بڑا دخل ہے۔

چنانچہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

میز کرسی پر کھانے کی قبح (اور برائی) میں بعض جگہ تامل ہوتا ہے، کیونکہ اب ان مقامات پر عام طور سے مشہور اور عام ہوگیا ہے، اور عموم وشہرت کی وجہ سے تَشَبُّہ سے نکل جائے گا، مگر پورا عام نہیں ہوا، اس لیے کچھ دل میں کھٹک سی رہتی ہے

(''الکلام الحسن'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۶، ص۱۰۴، بعنوان ''میز کرسی پر افطاری کا حکم'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول 1425 ہجری)

www.idaraghufran.org

میز کرسی پر کھانے سے متعلق یہ حالت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے زمانہ میں بیان کی تھی، جب اس میں موجودہ دور کی طرح زیادہ عموم نہیں تھا، لیکن اب بہت زیادہ عموم ہوگیا ہے، لہٰذا اب اس میں وہ کھٹک باقی نہیں رہنی چاہئے، اور اس سلسلہ میں تشدد وسختی مناسب نہیں ہونی چاہئے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ علم حضرات کا ایک طبقہ عرف بدل جانے کے باوجود اب تک اس کے جواز میں تأمّل کرتا ہے، جبکہ اس قسم کے مسائل میں عرف کو نظرانداز کرنا درست نہیں ہوا کرتا۔25 رجب المرجب 1439ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد16 شمارہ03، دسمبر 2018ء - ربیع الاول 1440ھ)

---

(117)

علماء کو غلطی کے اعتراف میں عار نہیں کرنی چاہیے

آج کل بعض علماء کے پاس نہ صحیح علم ہوتا، اور نہ ہی ان کی صحیح تربیت ہوتی، اس وجہ سے وہ غلط بات کرنے کے باوجود اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے، بلکہ اگر کبھی غلطی ہوجائے، اور بعد میں انہیں خود سے بھی اپنی غلطی کا احساس وادراک ہوجائے، تب بھی اپنی غلطی کی اصلاح اور دوسروں کو اس کی اطلاع کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اپنی غلطی کے معلوم ہوجانے کے باوجود اگر کہیں پھنس جائیں، تو اپنی غلطی کو زبردستی درست باور کرانے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ ہمارا مطلب یہ نہیں تھا، بلکہ یہ مطلب تھا، اور لوگوں کو ہمارا مطلب سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی، اور اس طرح وہ اپنی غلطی کو بھی دوسروں پر تھونپ دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمی کا مطلب یہی ہے کہ کہنے والے نے تو صحیح کہا، مگر سمجھنے والے نے صحیح نہیں سمجھا، بلکہ غلط سمجھا، اگر اتنا ہی کہہ دیتے کہ مجھ سے فلاں بات کو سمجھانے میں غلطی ہوئی، تب بھی غنیمت تھا، مگر ان سے یہ بھی نہ ہوسکا۔

ایسے حضرات کو بزرگوں اور اسلاف کے واقعات وارشادات میں غور کرنا چاہیے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک وعظ میں فرماتے ہیں:

ہماری اصل سادگی اور بے تکلفی (جو کہ سنت ہے) یہ ہے کہ اگر کوئی بات ہم کو معلوم نہ ہو، یا کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آوے، تو پچاس آدمیوں کے سامنے کہہ دے کہ ہم کو معلوم نہیں، یا ہماری سمجھ میں نہیں آیا، مدرس (یعنی تدریس کرنے والے استاذ) کی بے تکلفی یہ ہے کہ اگر اس سے کسی مقام کی تقریر میں غلطی ہوجائے، اور شاگرد متنبہ کرے، تو فوراً اپنی غلطی کا اقرار کرلے، آج ہم اس صفت کو مفقود (اور غیر موجود) پاتے ہیں، مگر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب (نانوتوی) رحمۃ اللہ کی دس مرتبہ کی حکایت ہے کہ جہاں آپ سے تقریر میں کچھ فروگزاشت ہوا، اور کسی طالبِ علم نے عرض کردیا، تو فوراً فرمادیتے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی، اور صحیح تقریر یہی ہے، جو تم نے کی، اور مولانا پر اس حالت کا ایسا غلبہ ہوتا تھا کہ اس کو ایک ہی مجلس میں بار بار فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، تم ٹھیک کہتے ہو۔

اور (اس کے برعکس) ہم میں یہ مرض ہے کہ طلبہ کے سامنے اپنی غلطی کا اقرار کبھی نہیں کریں گے، اگر وہ صحیح بھی کہتا ہوگا، تو گھونٹ گھونٹ کر اسے بند کردیں گے، پھر یہ مرض متعدی ہوا (اور آگے بڑھا) کہ ان طالبِ علموں نے اپنے شاگردوں کو گھونٹنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سب میں تکلف اور تصنع کا مرض اچھی طرح سرایت کرگیا، اور جہلِ مرکب میں مبتلا رہے، سوا لگ۔

میں نے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت اپنے دو بزرگوں سے سنی ہے کہ مکہ معظّمہ میں ایک بزرگ عالم، قرآن کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے، اس طرح کہ پہلے آیت پڑھتے، اس کے متعلقات ہر فن کے مسائل بیان کرتے، حضرت شاہ صاحب بھی ان کے حلقہ میں کبھی کبھی جا بیٹھتے تھے، ایک

دن شیخ نے کسی مقام پر ایک فقہی مسئلہ میں غلطی کی، اس وقت تو شاہ صاحب خاموش رہے، جب درس ختم ہو چکا، اس وقت پاس جا کر چپکے سے متنبہ (اور آگاہ) کیا کہ یہ مسئلہ مجھ کو اس طرح یاد ہے، ان بزرگ نے فوراً تمام طلبہ کو واپس بلایا، سب جمع ہو گئے، تو کہا:

قد غلطنا فی هذه المسئلة ونبهنا علیه هذا الشیخ ، والصحیح هٰکذا.

یعنی ہم نے اس مسئلہ میں غلطی کی، جس پر ہم کو اس شیخ (ہندی یعنی شاہ صاحب) نے متنبہ کیا، اور صحیح تقریر اس کی یوں ہے۔

پھر شاہ صاحب کی بیان کردہ تقریر کا اعادہ کیا۔

دیکھیے علماء یہ حضرات ہیں کہ ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا بھی رکاوٹ نہیں ہوئی کہ ہم سے یہاں غلطی ہوگئی ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ یوں بھی کہہ دیا کہ اس شیخ نے ہم کو متنبہ کیا، حالانکہ حضرت شاہ صاحب نے خفیہ اس لیے متنبہ کیا تھا کہ اگلے دن یہ اس مقام کی صحیح تقریر اپنی طرف سے کر دیں، مگر ان کو اتنا صبر کہاں تھا، اسی وقت سب کو بلا کر صاف اپنی غلطی کا اقرار کیا، اور اپنے محسن کو بھی ظاہر کر دیا، جس نے غلطی پر متنبہ کیا تھا۔

اگر ہم سِوال (یعنی ہم جیسے لوگ) ہوتے، تو اول تو اپنی غلطی ہی کو تسلیم نہ کرتے، اسی میں بحث شروع کر دیتے، اور جو تسلیم بھی کرتے، تو اس طرح صاف صاف اقرار نہ کرتے، اور جو کرتے بھی، تو یہ ظاہر نہ کرتے کہ اس غلطی پر ہم کو کسی دوسرے نے متنبہ کیا ہے، بلکہ اگلے دن اس طرح تقریر کرتے کہ طلبہ پر یہ ظاہر ہوتا کہ شیخ کو خود ہی تنبہ ہوا ہے۔

آخر یہ تکبر اور تصنع نہیں ہے، تو پھر کیا ہے؟

صاحبو! کسی بات کے متعلق لاعلمی ظاہر کردینا، کوئی نقص نہیں، نہ کوئی عیب ہے، ہم اور آپ تو کیا چیز ہیں؟ بعض دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سوال پر''لاادری'' (میں نہیں جانتا) فرمایا ہے، چنانچہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ سب سے اچھی جگہ کون سی ہے، اور سب سے بری جگہ کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں، حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھ کر بتلاؤں گا، چنانچہ حضرت جبریل سے پوچھا، انہوں نے کہا مجھے بھی معلوم نہیں، حق تعالیٰ سے پوچھ کر بتلاؤں گا، حق تعالیٰ سے پوچھا، تو ارشاد ہوا:

''خیر البقاع المسجد، وشر البقاع السوق''

''سب سے اچھی جگہ مسجد ہے، اور سب سے بدتر بازار ہے''

دیکھیے بعض دفعہ انبیاء اور ملائکہ نے بھی''لاادری'' (مجھے معلوم نہیں) فرمایا ہے، تو پھر آپ کی اس میں کیا شان گھٹتی ہے، مگر افسوس ہم سے کبھی یہ نہیں ہوسکا۔

پس اگر کسی عالم میں یہ وصف موجود ہو، تو بے شک فخر کی بات ہے، اور واقعی اس میں تصنع وتکلف نہیں ہے، اور اگر یہ بات نہیں ہے، تو اس کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے (خطباتِ حکیم الامت، ج ۲۸''اصلاحِ ظاہر'' صفحہ ۶۳، ۶۴، وعظ''اسباب الفتنہ'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، صفر: ۱۴۲۷ھ)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی مذکورہ تقریر پر موجودہ دور کے اہلِ علم حضرات کو غور کرکے اپنی حالت کا جائزہ لینا چاہئے کہ ان کا اس سلسلہ میں طرزِ عمل کیا ہے، آیا سنت اور سلف کے مطابق ہے، یا ان کے خلاف ہے؟ اگر خلاف ہو، تو اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔

03 شعبان المعظم 1439 ہجری

(ماہنامہ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 04، جنوری 2019ء - ربیع الآخر 1440ھ)

www.idaraghufran.org

(118)

لالچی، غریب و متکبر لوگوں کے عالم بننے کا نقصان

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت آج کل اکثر مولوی لالچی کیوں زیادہ ہونے لگے؟ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ:

اس کی خاص وجہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ عربی اور دین کا علم پڑھنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہیں، جو پہلے طماع (لالچی) اور مفلس (وغریب) ہیں، بعد پڑھ لینے کے بھی ان کی وہی عادت رہتی ہے، طبیعت میں سے وہ بات جاتی نہیں ("الافاضات الیومیہ" مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱،ص ۳۷۱، ملفوظ نمبر ۵۰۸، بعنوان "آج کل کے مولوی طماع کیوں ہونے لگے" مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ)

حضرت کا مطلب یہ ہے کہ علمِ دین اکثر و بیشتر مال کے لالچی اور مفلس وغریب لوگ حاصل کر کے مولوی اور مولانا بن جاتے ہیں، اور مولوی بننے کے بعد بھی طبیعت میں مال کی حرص اور لالچ رہتا ہے، اس لیے مالدار اور امیر اور بڑے خاندان کے لوگوں کو علمِ دین، زیادہ سے زیادہ پڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

آج کے دور میں اس کی ہمارے یہاں بہت زیادہ ضرورت ہے، لالچی اور مفلس علماء نے تو دین کو بہت نقصان پہنچادیا ہے، اور انہوں نے علماء کی سخت بدنامی کرادی ہے، ان کی حرکات وسکنات دیکھ کر عالمِ دین کے فضائل کو ان پر منطبق کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ایک اور موقع پر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

پہلے اکابر علماء، جس میں حبِ جاہ (یعنی جاہ و منصب کی محبت) کا مرض دیکھتے تھے، اس کو اپنے حلقۂ درس سے نکال دیتے تھے، اب اس کا کوئی اہتمام ہی نہیں ("الکلام الحسن" مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۲۶، ص ۸۱، بعنوان "پہلے اکابر علماء، حبِ جاہ والوں کو درس سے نکال دیتے تھے" مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخ اشاعت: جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ ہجری)

اس سے معلوم ہوا کہ متکبر لوگوں کو پہلے عالم نہیں بنایا جاتا تھا، مگر آج مدارس میں عموماً اس کا اہتمام نہیں رہا، اسی وجہ سے علماء کے ہاتھوں طرح طرح کے مفاسد رونما ہو رہے ہیں۔

03 شعبان المعظم 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 04، جنوری 2019ء - ربیع الآخر 1440ھ)

---

(119)

بعض مشائخ خود اصلاح طلب ہیں

ہم نے موجودہ دور میں کئی ایسے مشائخ اور مصلحین کا مشاہدہ کیا کہ انہوں نے باقاعدہ خانقاہی نظام قائم کر رکھا ہے، ان کے مریدین، بلکہ خلفاء ومجازین کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، دور دراز سے مریدین اصلاح اور بیعت کا سلسلہ قائم کرنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، لیکن خود شیخ صاحب کا حال یہ ہے کہ تصوف کا جو اصل موضوع ہے، یعنی اخلاق، تو ان کے اپنے بنیادی اخلاق کی بھی اصلاح نہیں ہوئی، مال کی محبت اور جاہ کی محبت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ قدم قدم پر عامۃ الناس اور مریدین کی طرف سے مال و منصب اور عقیدت کے متلاشی ہیں، اپنے ہم عصر وہم منصب حضرات سے تحاسد وتباغض کی آگ میں جل رہے ہیں۔

مریدین پر بے جا غصہ اور ان کی تذلیل وتحقیر ان کے نزدیک گناہ نہیں، غیبت، بہتان اور الزام تراشی، ان کی مجالس کی زینت ہے، اور ہر طرف سے مال بٹورنے کی فکر اور دھن ان کے اوپر سوار ہے، یہاں تک کہ ان کا مال دار طبقہ سے زیادہ لگاؤ اس وجہ سے ہے کہ اس طبقہ کی طرف سے ان کو مال کا چڑھاوا چڑھتا ہے، بلکہ اس طبقہ کو خلافت بھی بڑی جلدی دے دی جاتی ہے، تاکہ یہ طبقہ ان کے ساتھ ہی وابستہ رہے، اور دائیں بائیں نہ نکل جائے، ایسے میں جب ان مشائخ کی اپنی اصلاح نہیں ہوئی، اور بنیادی بداخلاقیوں کا یہ خود شکار ہیں، تو یہ

دوسروں کی کیا خاک اصلاح کریں گے۔

ایسے ہی دنیادار ور مال کے پجاری ایک پیر کا واقعہ ہے کہ اس کے مرید نے خواب دیکھا، اور اس نے اپنے پیر کو یہ خواب سنا کر تعبیر حاصل کرنا چاہی، مرید نے کہا کہ پیر صاحب میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ کی انگلی میں تو پاخانہ لگا ہوا ہے، اور آپ کے ہاتھ کی انگلی میں شہد لگا ہوا ہے، یہ سنتے ہی پیر صاحب فوراً بولے کہ خواب بالکل سچا ہے، اور اس خواب کی تعبیر صاف ظاہر ہے، وہ یہ کہ تم دنیا کے کتے ہو، اس کو تم نے انگلی میں پاخانہ لگے ہوئے ہونے کی حالت میں دیکھا، اور ہم دین دار اور آخرت کے طلب گار ہیں، جس کو تم نے ہماری انگلی میں شہد لگے ہوئے ہونے کی حالت میں دیکھا، مرید نے کہا کہ پیر صاحب ابھی میرا خواب پورا نہیں ہوا، میں نے آگے یہ بھی دیکھا کہ میری انگلی آپ چاٹ رہے ہیں، اور آپ کی انگلی میں چاٹ رہا ہوں۔

یہ سن کر پیر صاحب نے کہا کہ کمبخت دفع ہوجا، تیرا خواب جھوٹا اور شیطانی ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، شیطان نے پیر صاحب سے بدظن کرنے کے لیے یہ خواب دکھایا۔

حالانکہ یہ خواب سچا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ پیر صاحب تو اپنے مرید سے دنیا لے رہا ہے، اور مرید، دین لے رہا ہے، پیر دنیا کا کتا اور مرید دیندار ہے۔

اسی طرح آج کل کے بعض پیروں کا حال یہ ہے کہ وہ مریدین سے دنیا کے لیے تعلق قائم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ آمین۔ 05 شعبان المعظم 1439 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 04، جنوری 2019ء - ربیع الآخر 1440ھ)

---

(120)

محرم کے بغیر سفر پر علامہ انور شاہ کشمیری کا موقف

بندہ محمد رضوان کا ایک فقہی رسالہ ''محرم کے بغیر سفر کا حکم'' کے نام سے ہے، جو علمی و تحقیقی

رسائل کی تیسری جلد میں شائع ہو چکا ہے، اس رسالہ میں موجودہ دور کے اندر ضرورت کے وقت محرم کے بغیر سفر کے حکم پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور فتنہ لازم نہ آنے کی صورت میں مخصوص شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں نصوص کے ساتھ مختلف فقہائے کرام اور اہلِ علم حضرات کے اقوال کو بھی ذکر کیا گیا ہے، اور مشائخِ دیوبند میں سے بطورِ خاص علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی ''فیض الباری'' اور ''العرف الشذی'' کی عبارات اور ان کی ضروری توضیح وتشریح کو بھی نقل کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اس موضوع پر علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ملفوظات میں بھی مولانا سید احمد رضا بجنوری کا تحریر کردہ کلام دستیاب ہوا، جس سے علامہ کشمیری کے اس موقف کی مزید تائید اور توضیح ہوتی ہے، جو ''فیض الباری'' اور ''العرف الشذی'' میں بیان کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی رسالہ میں بیان کردہ موقف کی بھی مزید تائید ہوتی ہے۔

اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس کو قارئین اور اہلِ علم کے سامنے پیش کیا جائے، تاکہ جو حضرات تحقیق کے متلاشی ہیں، ان کی تحقیق کا مزید سامان ہو، جہاں تک معترضین ومعاندین کا تعلق ہے، تو ان کا مقصد نہ تو تحقیق ہوتا ہے، نہ ہی ان کو مطالعہ کی ضرورت ہوتی، بلکہ ان کا اصل مقصد اعتراض برائے اعتراض ہوتا ہے، اس طرح کی ضد وعناد پر مبنی صفات والوں کو تو نبیوں کی پیش کردہ دعوت وہدایت سے بھی تسلی نہ ہوئی، پھر بندہ کی کیا حیثیت ہے؟

مولانا سید احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ، علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ''ملفوظات'' میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت (علامہ انور) شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ممانعت سفر بلا محرم کی تمام احادیث عام اسفارِ حاجات سے متعلق ہیں، سفرِ حج فرض سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا اگر فتنہ کا گمان نہ ہو اور دوسری حج کو جانے والی ثقہ عورتوں کا بھی ساتھ ہونے سے اطمینان ہو، تو بغیر محرم کے بھی فریضۂ حج اداء کرسکتی ہے، اور دوسرے اسفار میں بھی فتنہ پر مدار ہے۔ اگر تین دن سے کم کے سفر میں خوفِ فتنہ ہو، تو وہ بھی

بغیر محرم کے جائز نہ ہوگا۔ میرے نزدیک حنفی مذہب کی بھی یہی تحقیق ہے، اگرچہ کسی نے اس کی صراحت نہیں کی۔

حضرت رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ علماء نے مسئلہ سفرِ حج کو بھی احادیثِ ممانعتِ سفر بغیر محرم کے تحت ذکر کر دیا ہے، اور امام طحاوی وغیرہ نے بھی ایسا ہی کیا ہے، میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے (واضح ہو کہ امام ترمذی رحمہ اللہ ممانعتِ سفر کی حدیث **لا تسافر الخ** کو آخر کتاب میں **ابواب الرضاع** میں لائے ہیں، **کتاب الحج** میں بھی نہیں لائے اور امام بخاری رحمہ اللہ ابوابِ سفر میں لائے (ص ۱۴۸) پھر **کتاب الحج** میں بھی لائے ہیں (ص ۲۵۰)

جہاں ترغیب ہے، حج نفل کی بھی اور امام مالک رحمہ اللہ نے بھی امام احمد کی طرح حدیثِ ممانعت کو سفرِ حج پر اثر انداز نہیں سمجھا ہے، اور غالباً دوسرے محدثین نے بھی جو کتاب الحج میں لائے ہیں، اس حدیث ممانعت کو (امام مالک و امام احمد و شافعی رحمہم اللہ کی طرح سے) حجِ تطوع اور دوسرے عام اسفار پر محمول کیا ہے۔

ایسی صورت میں امام اعظم رحمہ اللہ کا مسلک بھی ضرور دیگر ائمہ مجتہدین کے موافق ہی ہوگا، اور یہی رائے ہمارے حضرت شاہ صاحب کی بھی ہے، بلکہ حضرت رحمہ اللہ نے نہ صرف یہ کہ دوسرے ائمہ مجتہدین واکابر امت کی طرح حج فرض کو نصِ قرآنی کے تحت مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے صرف استطاعت سبیل اور زادِ راہ پر مساوی طور سے محمول کیا اور دوسری قیود محرم وغیرہ کو ثانوی درجہ میں رکھا، یا حج نفل وغیرہ سے متعلق کیا، حضرت رحمہ اللہ نے سرے سے ہی احادیث ممانعتِ سفر بلا محرم کو حج فرض سے غیر متعلق قرار دیا، اور ابوابِ حج کے تحت ان کے ذکر کو بھی بے محل فرمایا۔ **واللہ تعالیٰ أعلم**۔

احقر نے اس مسئلہ کی زیادہ تحقیق وتفصیل اس لیے بھی کی ہے، تاکہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تحقیق مذکور کو اجنبی خیال نہ کیا جائے، خاص طور سے جبکہ

حضرت رحمہ اللہ کو بکثرت احادیث سے اس فیصلے کے لیے شرح صدر حاصل ہوگیا تھا، اور حضرت رحمہ اللہ نے خود ہی درسِ بخاری میں دونوں جگہ اور دوسرے وقت بھی یہ ہی فرمایا کہ ''میرے نزدیک ''مذہب'' کی بھی یہی تحقیق ہے، یعنی فقہاء حنفیہ کے تشدد پر خیال نہ کیا جائے کہ انہوں نے حج فرض کو بھی حدیث ممانعت کے تحت کردیا ہے، جبکہ امام اعظم کا خود یہ مسلک نہیں ہوسکتا۔ وللّٰہ درہ (العرف الشذی ص۴۱۰)

فیض الباری ۱۴۱/۳ میں بھی اجمالی طور سے یہی فرمایا۔

اور فیض الباری ص ۳/۳۹۷ میں تفصیل سے فرمایا کہ بشرطِ اعتماد اور فتنہ سے مامون ہونے کی صورت میں سفرِ حج فرض بغیر معیت محرم بھی درست ہے اور میرے پاس اس کے لیے احادیثِ کثیرہ کا ذخیرہ ہے اور فقہ حنفی میں مسائل بہ صورتِ فتنہ ذکر ہوئے ہیں (بعض احادیث کی طرف حاشیۂ فیض الباری میں اشارہ بھی کیا گیا ہے) مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابو العاص رضی اللہ عنہ کو مکہ معظّمہ پیغام بھیجا کہ وہ کسی کے ساتھ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ منورہ بھیج دیں، اور انہوں نے غیر محرم کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ [1]

احقر بجنوری عرض کرتا ہے کہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک بھی ثقہ و مامونہ ایک، یا چند عورتوں کے ساتھ سفر حج جائز ہے، اور امام احمد رحمہ اللہ سے جو ممانعت منقول ہے، وہ نفلی حج کے لیے ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ ممانعتِ سفر بغیر محرم کی احادیث غیر سفر فرض کے ساتھ خاص ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں: بدایۃ المجتہد لابن رشد، انوار المحمود، اوجز المسالک واعلاء السنن وغیرہ)

---

[1] بندہ محمد رضوان نے ''فیض الباری'' اور ''العرف الشذی'' کی عبارات اردو ترجمہ سمیت اپنے رسالہ میں نقل کردی ہیں، وہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے واضح ہوا کہ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی احادیثِ ممانعت کو سفرِ حج فرض سے غیر متعلق فرمایا اور وہ بعینہٖ وہی رائے ہے جو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اختیار فرمائی ہے، اور امام مالک نے بھی موطأ میں ''والتخرج في جماعة من النساء'' فرمایا کہ جس عورت نے حج فرض ادا نہ کیا ہو اور محرم میسر نہ ہو، تو اس کو چاہیے کہ وہ ثقہ عورتوں کے ساتھ حج اداء کرے اور خدا کا فرض ترک نہ کرے۔

امام شافعی رحمہ اللہ بھی ثقہ عورت، رفیقِ سفر ہو، تو بغیر محرم، یا زوج کے حج فرض کا جواز فرماتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ حج فرض کے لیے سب کی رائیں متفقہ ہیں، اور حج نفل، یا دوسرے غیر مفروض سفروں کے لیے عدمِ جواز پر بھی سب کا اتفاق ہے۔

حضرات مفتیانِ دورِ حاضر کو اس دور کی مشکلاتِ حج کو بھی سامنے رکھنا چاہیے، اس لیے کہ نہایت غیر معمولی مساعی کے بعد تو کہیں حج پر جانے کی منظوری حاصل ہوتی ہے اور حکومتِ سعودیہ کو بھی حج کے مصارف بڑھانے سے کام ہے، حجاج کے مالی اخراجات وغیرہ مجبوریوں کا کچھ بھی خیال نہیں، پابندیاں بھی برابر بڑھائی جا رہی ہیں، اگر کسی عورت کے پاس ایک حج کی رقم ہو، تو محرم کو ساتھ لے جانے کے لیے بھی اتنی ہی رقم اور چاہیے، یعنی پچیس ہزار کی جگہ مثلاً پچاس ہزار روپے ہوں، کیونکہ ساتھ جانے والے کے تمام مصارف بھی حج کو جانے والی کے ذمہ ہیں، اس لیے ائمہ اربعہ کے متفقہ فیصلہ مذکورہ پر ہی عمل ''شرعاً وعقلاً'' بھی مناسب ہو گا۔ **واللّٰہ تعالٰی اعلم و علمہٗ اتم و احکم** (بجنوری) (ملفوظاتِ محدث کشمیری، ص:۳۷۱ تا ۳۷۳، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول ۱۴۳۱ھ)

فائدہ: مولانا سید احمد رضا بجنوری صاحب نے جن مشکلات کا اوپر کی عبارت میں ذکر کیا

www.idaraghufran.org

ہے، آج کے دور میں اس طرح کی بعض دوسری مشکلات میں اضافہ ہوگیا ہے، اوراب موجودہ زمانے میں اس پرغوروفکر کرنا، اوربعض حضرات کی طرف سے جمود کی روش پرنظرِ ثانی کرنا اہم ہوگیا ہے، اس سلسلہ میں فقہائے کرام کے اقوال کی توضیح وتشریح بندہ نے اپنے رسالہ ''محرم کے بغیر سفر کا حکم'' میں بیان کردی ہے۔

جس میں حج کے علاوہ دیگر ضرورت پر مشتمل اسفار کا حکم بھی بیان کردیا ہے، تاکہ ضرورت مند اورمجبورلوگوں کے لیے مشکلات سے بچنے اور تیسیر کے حصول کا راستہ نکل آئے۔

رہا مخالفین ومعاندین اور جامدین کا معاملہ، تو ان کے متعلق پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، اور ایسے لوگوں کا ہر دور میں وجود رہا ہے، ان کی خاطر احقاق وتحقیقِ حق اور جمودِ مفرط کے مقابلے میں شریعت کی عطاء کردہ تیسیر، توسع اوراعتدال کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد16 شمارہ06، مارچ2019ء - جمادی الاخریٰ1440ھ)

---

(121)

احادیث کی اسنادی تحقیق کی ضرورت

ہمارے یہاں ایک عرصہ سے احادیث وروایات کی اسنادی تحقیق کا مزاج بہت کم پایا جاتا ہے، حدیث کے نام سے جو بات بھی اچھی محسوس ہوتی ہے، اس کو اسنادی تحقیق کے بغیر جزم ویقین کے ساتھ دوسروں کے سامنے نقل کردیا جاتا ہے، اور جب اس حدیث کی خوب تشہیر واشاعت ہوجاتی ہے، اورعام لوگوں کا اس پر عقیدہ پختہ ہوجاتا ہے، اوروہ حدیث بڑی بڑی کتابوں اورمقررین کی تقریروں کی زینت اورحصہ بن جاتی ہے۔

اورپھر کسی کی طرف سے تحقیق کے نتیجہ میں اس حدیث کا غیر مستند اور ناقابلِ اعتبار ہونا معلوم ہوتا ہے، تو اس کو قبول کرنے کے لیے آمادگی کا اظہار نہیں کیا جاتا، پھر اپنے اوپر اوراس طرح کی کتابوں پرعوام کے اعتبار کو برقرار رکھنے کو بہانہ بنا کر دور دراز کی تاویلات کرکے اس

حدیث کے مستند ومعتبر ہونے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن ایسے موقع پر جھوٹی اور غیر مستند بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے پر وارد شدہ وعیدوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

حالانکہ اولاً تو غیر مستند اور جھوٹی بات کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی وعیدیں اتنی سخت ہیں کہ ہر مسلمان کو ان سے ڈرنا چاہیے، اور اپنے آپ کو ان وعیدوں کا مستحق ہونے سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف جھوٹ منسوب کرنے کے بارے میں فرمایا کہ وہ تم میں سے کسی اور کی طرف جھوٹ باندھنے کی طرح کا گناہ نہیں ہے، بلکہ اس کا گناہ بہت زیادہ سخت ہے، اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ’’جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا، تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے‘‘ اس طرح کی احادیث بندہ نے اپنی بعض تحریرات میں جمع کی ہیں۔

دوسرے جن مستند اور معتبر بزرگوں کی طرف سے اس طرح کی احادیث کو نقل وبیان کیا گیا، ان کو اسناد کی تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے معذور خیال کرنا چاہئے، اور اصل حقیقت کو تسلیم کرنا چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر مستند ومعتبر بزرگوں کو اپنی زندگی میں خود اپنی نقل وبیان کردہ کسی حدیث کے غیر مستند وغیر معتبر ہونے کا علم ہو جاتا، تو وہ بھی اس کو قبول کرنے اور رجوع کرنے میں عار محسوس نہ کرتے، پھر ان کا حوالہ دینے والوں کے نام لینے والوں اور ان کی عقیدت کا دم بھرنے والوں کے لیے ہٹ دھرمی کرنا کیسے زیب دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس طرح کے تعصب وتحزب سے نجات عطاء فرمائے، جس میں کسی کی بے جا حمایت اور معصومیت پر مبنی عقیدت کی خاطر حقائق کو رد کر دیا جائے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیان کردہ سخت ترین وعیدوں کا بھی اپنے ہاتھوں مستحق ہوا جائے، کیونکہ احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کی سخت وعید وارد ہوئی ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیق وتحقیق کے بغیر ہر سنی اور پڑھی ہوئی بات کو آگے بیان کرنے سے منع فرمایا ہے، اور اس کو جھوٹ سے تعبیر فرمایا ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ ’’آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے

کہ وہ سنی یا پڑھی ہوئی بات کو بیان کر دے“یعنی جھوٹا ہونے کے لیے اتنا کافی ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ اس جھوٹ سے بچنے کے لیے تحقیق کا اہتمام نہ کیا جائے۔

اللہ اس سے حفاظت عطاء فرمائے۔آمین۔

15 محرم الحرام 1440 ہجری

(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد 16 شمارہ 07، اپریل 2019ء - رجب المرجب 1440ھ)

---

(122)

”فیضُ الباری“ شرح بخاری کا مقام

حضراتِ علمائے دیوبند میں علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا علمی مقام بہت اعلیٰ اور بلند ہے، خاص طور پر علمِ حدیث میں ان کو آخری زمانہ کے محدثین میں امتیازی شان حاصل ہے، ان کے علمی مقام کا اندازہ ان کی بطورِ خاص صحیح بخاری کی شرح ”فیض الباری“ بغور ملاحظہ کرنے سے ہوتا ہے، اوران کی دوسری کتاب ”سنن الترمذی“ کی شرح ”العرف الشذی“ کو ملاحظہ کرنے سے ہوتا ہے۔

”فیض الباری“ میں علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے علوم وافکار جس طرح جمع ہیں، ان کے متعلق دوسری کتابوں میں اس طرح جمع نہیں ملتے، اسی وجہ سے ”فیض الباری“ کو موجودہ دور کے اصحابِ علم اور خاص کر حنفیہ کو مطالعہ میں رکھنا چاہئے۔

لیکن افسوس کہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے علوم وافکار کو وہ اہمیت نہیں دی جاسکی، جس کی ضرورت تھی، بلکہ اس کے بجائے ان کی محققانہ آراء کو بہت سے حضرات نے تفرد وغیرہ کا عنوان دے کر نظر انداز کر دیا، جبکہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے جو رائے اختیار کی، ساتھ ہی اس کے دلائل و نظائر اور اس سلسلہ میں محدثین وفقہائے کرام کے اقوال بھی پیش کیے ہیں، جس کی وجہ سے ان پر تفرد کا الزام عائد کرنا بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا۔

مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمہ اللہ، علامہ کشمیری اور ان کی تصانیف کے تعارف کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ:

"فیض الباری بشرح صحیح البخاری"

یہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے درسِ صحیح بخاری کی املائی شرح ہے، جس کو حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدینہ رحمہ اللہ نے کئی سال کی محنت وعرق ریزی کے بعد فصیح وبلیغ عربی زبان میں مرتب کیا ہے، یہ حضرت امام العصر رحمہ اللہ کے علوم وکمالات کی سچی تصویر پیش کرتی ہے، جہاں حافظ شیخ الاسلام بدر الدین عینی اور قاضی القضاۃ حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ، جیسے بلند پایہ محقق شارحین عاجز آ گئے ہیں، وہاں شیخ کے خصائص وکمالات جلوہ آراء نظر آئیں گے، زیادہ تر اعتناء انہی معارفِ حدیث کا کیا گیا، جہاں شارحین ساکت نظر آتے ہیں، حضرت شیخ کے آخری عمر کے مجرب علوم واذواق، خصوصی احساسات وعلمی خصوصیات، دقتِ نظر وتحقیقی معیار کے نمونے اہل علم ویارانِ نکتہ داں کے لیے صدائے عام دے رہے ہیں، یہ چار ضخیم جلد کا بحرِ بے کراں مصر میں آب وتاب سے شائع ہوا ہے، قرآن وحدیث، فلسفہ وکلام ومعانی وبلاغت وغیرہ کے نہایت بیش بہا ابحاث سے مالا مال ہے، اس پر راقم الحروف اور حضرت جامع ومرتب کے قلم سے دو مبسوط مقدمے ہیں، ۸۰/صفحات پر مشتمل ہیں، عام عبارت نہایت شگفتہ وسلیس ہے، بعض بعض مقامات میں خاصی ادبی لطافت ہے۔

"العرف الشذی بشرح جامع الترمذی"

یہ حضرت شاہ صاحب کی درسِ جامع ترمذی کی املائی شرح ہے، جس کو جناب مولانا محمد چراغ صاحب ساکن ضلع گجرات نے بوقتِ درس قلم بند کیا ہے، اور زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے، اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے، جامع

www.idaraghufran.org

ترمذی کے مشکلاتِ احادیثِ احکام پر محققانہ کلام، ہر موضوع پر عمدہ ترین کبار اُمت کے نقول اور حضرت کی خصوصی تحقیقات کا ذخیرہ ہے، طلبۂ حدیث اور اساتذۂ حدیث پر عموماً اور جامع ترمذی کے پڑھانے والوں پر خصوصاً اس کتاب کا بڑا احسان ہے (ماہنامہ بینات، صفحہ۲۲، ربیع الثانی، 1439ہجری، مضمون: ''حضرت امام العصر علامہ انورشاہ کشمیری رحمہ اللہ اور اُن کی تصانیف'')

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم ''فیض الباری'' کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''فیض الباری'' یہ حضرت مولانا انورشاہ کشمیری رحمہ اللہ کی بخاری کی تقریر ہے، جو ان کے شاگرد حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب مہاجر مدنی رحمہ اللہ نے قلم بند فرمائی، اور عربی زبان میں اس کو مرتب کیا، اور چار جلدوں میں شائع ہوئی، علامہ یوسف بنوری رحمہ اللہ نے اس کی اشاعت کا انتظام کیا، اور اس پر حواشی کا بھی انتظام فرمایا۔

علامہ بدرِ عالم صاحب رحمہ اللہ، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے، انہوں نے ان کی تقریر کو قلم بند کرنے کے ساتھ اس پر اپنی تعلیقات کا بھی اضافہ کیا، جس کا نام ''البدر الساری'' ہے۔

یہ سارا مجموعہ بھی بڑا قیمتی ہے، اس لیے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ جلّ جلالہٗ نے جو تبحرِ علمی عطاء فرمایا تھا، وہ ایک دریائے ناپید کنارہ تھا، جب بات شروع کرتے، تو علوم کے دریا بہنا شروع ہوجاتے، اللہ جلّ جلالہٗ نے انہیں وسعتِ مطالعہ اور عمیق فہم دونوں سے نوازا تھا، اس کے نتیجہ میں حضرت شاہ صاحب کے اپنے علوم و معارف جو بہت ساری کتابوں کے چھاننے کے بعد خلاصہ اور عطر ہے، وہ ''فیض الباری'' میں دستیاب ہوتا ہے، جو دنیا میں کہیں اور آپ کو نہیں ملے گا، اگرچہ وہ ایسی کتاب تو نہیں، جس میں ایک ایک لفظ کی

شرح ہو، لیکن بہت سے ایسے مباحث جن میں لوگ سالہا سال سرگرداں رہے، حضرت شاہ صاحب کے ایک جملہ، یا فقرہ سے اس کی گتھی سلجھ جاتی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب بڑی قابلِ قدر ہے (انعام الباری، ج۱ص ۱۴۴ و ۱۴۵، مشہور شروحِ بخاری کا تعارف، مکتبۃ الحراء، کراچی)

اس لیے علمائے کرام کو علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی فیض الباری کے مطالعہ کا بطور خاص اہتمام کرنا چاہئے، جس سے ان شاء اللہ تعالیٰ علم میں وسعت و گہرائی پیدا ہوگی، اور تفقہ کی نعمت بھی حاصل ہوگی۔

بندہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ''**فیض الباری**'' اور ''**العرف الشذی**'' کو وقتاً فوقتاً ملاحظہ کر کے بڑا فائدہ محسوس کرتا ہے، اور اپنی تحریرات میں ان کے حوالہ سے قیمتی آراء جمع کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قدر کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد16 شمارہ 07، اپریل 2019ء - رجب المرجب 1440ھ)

---

(123)

علمِ دین کے عنوان سے غیبت اور عیب جوئی

غیبت، عیب جوئی، بدگمانی، بدزبانی، تحاسد و تباغض اور بے جا غصہ اور اسی طرح دوسرے کی تحقیر و تذلیل وغیرہ جیسی بداخلاقیوں کا ارتکاب، دین، یا علمِ دین کا عنوان لگا کر جائز نہیں ہوجاتا، مگر افسوس ہے کہ موجود دور میں بعض حضرات، دین، یا علمِ دین کے عنوان سے اس قسم کی بداخلاقیوں کا تحریر و تقریر اور اپنی تدریس وغیرہ کے دوران ارتکاب کرتے ہیں، اور یہ ارتکاب بسا اوقات بڑے بڑے اصحابِ علم اور اولیائے کرام کی شان میں بھی لاشعوری طور پر ہوجاتا ہے، مثلاً امام شافعی، یا دیگر فقہائے کرام، یا دیگر اہلِ علم حضرات کی شان میں، جن سے کوئی علمی وفقہی اختلاف ہوجاتا ہے، خاص طور پر اگر کوئی صاحبِ علم، اپنا ہم عصر ہو، اس کی

شان میں لب کشائی کرتے وقت شریعت کے اہم اصولوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اور زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اس کو گناہ، یا فعلِ منکر بھی نہیں سمجھا جاتا۔

موجودہ زمانے میں اس طرح کی بداخلاقیوں کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

17 محرم الحرام 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 08، مئی 2019ء - شعبان المعظم 1440ھ)

---

(124)

اختلافِ مسلک ومشرب کے باوجود باہمی محبت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

پہلے بزرگوں میں اختلافِ مشرب ومسلک کے ساتھ بھی باہمی تعلقات خوشگوار ہوتے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرتے تھے، اور ایک آج کل کے لوگ ہیں کہ اتحادِ مشرب ومسلک کے باوجود بھی آپس میں محبت نہیں، تعلقات میں شگفتگی نہیں (''اسعد الابرار'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۵، ص۱۷۰، ملفوظ نمبر ۶۸، بعنوان ''اختلافِ مسلک، منافیِ محبت نہیں، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: شعبان۱۴۲۲ھ)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جو نقشہ کھینچا، وہ واقعہ کے مطابق ہے، واقعی پہلے زمانے میں سلف کے اختلاف کا طریقہ یہی تھا کہ وہ مسلکی ومشربی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے خوشگوار تعلقات رکھتے تھے، اور ایک دوسرے سے محبت والفت کا رشتہ رکھتے تھے، ان کے ظرف اور دل بڑے وسیع تھے، اور اس کی وجہ ایمانی اخوت تھی، قرآن وسنت میں تمام مسلمانوں کو خواہ اس کا تعلق مسلمانوں کے کسی بھی فرقہ ومسلک سے ہو، یہاں تک کہ وہ اہلُ السنۃ والجماعۃ سے خارج کیوں نہ ہو، بشرطیکہ مومن ہو، ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا گیا ہے، اور ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کو ایذاء رسانی سے بچنے کا حکم فرمایا گیا ہے، اسی طرح ایک

دوسرے کا تمسخر کرنے، عیب جوئی وعیب گوئی کرنے اور غیبت وتجسس اور بدگمانی وغیرہ کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

لیکن اب بہت سے لوگوں کے دل بڑے تنگ ہوگئے ہیں، ذرا ذرا سے اختلاف کی وجہ سے آپس میں عداوتیں اور دشمنیاں قائم کرلی جاتی ہیں، جبکہ بہت سے اختلافات اجتہادی نوعیت کے ہوتے ہیں، اور بعض اختلافات تو اس نوعیت کے بھی نہیں ہوتے، بلکہ صرف طبیعتوں اور مزاجوں کے اختلاف پر مبنی ہوتے ہیں، جو کہ محمود اختلاف ہے، اسی کو کسی نے کہا ہے کہ:

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے کاش اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

افسوس کہ اب بہت سے حضرات کی طرف سے دینِ اسلام کے نام پر تحریر وتقریر کی صلاحیتوں کو ایک دوسرے کو دبانے، نیچا دکھانے اور ایک دوسرے سے تحزب وتعصب اختیار کرنے بلکہ ایک دوسرے کی تذلیل وتحقیر میں صرف کیا جاتا ہے۔

ایسے حالات میں حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی اس دعاء کے کرنے کا اہتما کرنا چاہئے۔

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ . وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ . وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ. يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ (سورة طٰه، رقم الآيات ۲۵ الٰی ۲۸)

19 محرم الحرام 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 08، مئی 2019ء - شعبان المعظم 1440ھ)

---

(125)

تحزب اور گروہ بندی کا مرض

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ:

www.idaraghufran.org

آج کل تحزب (جماعت بندی) کا مرض بڑھ گیا ہے، کوئی اپنے کو خلیلی، کوئی رشیدی، کوئی قاسمی کوئی محمدی، یہاں تک کہ کوئی اشرفی لکھتا ہے، فرمایا کہ کوڑی کا تو ہے نہیں، بنتا ہے اشرفی (’’الکلام الحسن‘‘ ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۶ ص۲۱۲، بعنوان ’’آج کل گروہ بندی کا مرض بڑھ گیا ہے‘‘ مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول 1425ھ ہجری)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے سچ فرمایا، آج کل تحزب اور گروہ بندی کا مرض بہت سے اہلِ علم حضرات میں بھی بہت بڑھ گیا ہے، چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنا کر ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں۔

یہاں تک کہ ذرا ذرا سی باتوں پر جن میں تاویل بہت آسان ہے، ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتاویٰ واحکام صادر کیے جاتے ہیں، اور بہت سی باتیں تو سراسر خلافِ حقیقت اور بدگمانی پر مبنی ہوتی ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

دراصل بات یہ ہے کہ ہر مسلک والا یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ طاقت ورفوج تیار ہو، جو دوسرے مسلک والوں کے خلاف صف آراء ہو، اور بعض لوگوں نے تو دین کو ایک پیشہ سمجھ کر اختیار کر لیا ہے، اور عوام کو اپنا گاہک سمجھ لیا ہے، ان کی ہمہ دَم یہ کوشش رہتی ہے کہ یہ گاہک کسی طرح دوسرے کے یہاں نہ چلے جائیں، ہمارے کاروبار اور پیشہ کے ساتھ ہی وابستہ رہیں، اس لیے وہ دوسرے مسلک والوں کی عیب جوئی کرتے ہیں، اور اپنے مسلک واہلِ مسلک کی خوبیاں بیان کرتے ہیں، جس طرح مختلف تاجر اپنی مصنوعات کی خوبیاں اور دوسروں کی مصنوعات کی برائیاں بیان کرتے ہیں، استغفر اللہ! کہ ان لوگوں نے دین کو بھی دنیا کمانے کا ذریعہ بنالیا۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ.

25 محرم الحرام 1440 ہجری

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 16 شمارہ 08، مئی 2019ء - شعبان المعظم 1440ھ)

(126)

نجدیوں کے مقلد، یا غیر مقلد ہونے کا حکم

آج کل عرب میں نجدیوں کی کثرت ہے، یورپ کے بہت سے ممالک میں بھی ان کا اثرورسوخ غیر معمولی ہے، ان میں سے بعض حضرات اپنے آپ کو سلفی بھی کہتے ہیں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ، ایک ملفوظ میں نجدیوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ مجھ سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ نجدی مقلد ہیں، یا غیر مقلد؟ میں نے کہا کہ نہ یہاں کے مقلدوں کی طرح، مقلد ہیں، اور نہ یہاں کے غیر مقلدوں کی طرح، غیر مقلد ہیں، بین بین (یعنی درمیانی) حالت ہے (''اسعد الابرار'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۲۵، ص ۱۳۰، بعنوان ''نجدیوں کے متعلق فیصلہ'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: شعبان ۱۴۲۲ھ)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ''نجدیوں'' کے متعلق بڑا عجیب اور صحیح فیصلہ فرمایا کہ ان کو نہ تو اپنے یہاں کے غیر مقلدوں کی طرح قرار دیا، اور نہ اپنے یہاں کے مقلدوں کی طرح قرار دیا، بلکہ بین بین حالت قرار دی، یعنی کہ وہ کچھ مقلد ہیں اور کچھ غیر مقلد، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرات نہ تو ائمہ کی تقلید کو شرک وحرام قرار دیتے ہیں، اور نہ ہی تقلیدِ شخصی کو اختیار کرتے۔

آج کل عرب میں جو معتدل ''سلفی'' حضرات کہلاتے ہیں، وہ اسی نوعیت کے ہیں، البتہ متشدد افراد ہر طبقہ میں ہوا کرتے ہیں، مقلدوں، حنفیوں اور دیوبندیوں میں بھی ہیں، ہم بھی مختلف نجدیوں اور سلفیوں کی تحریرات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، ان میں بہت سے اہلِ علم نہ عام مقلدوں کی طرح تقلیدِ شخصی میں جمود کرتے ہیں، اور نہ ہی عام غیر مقلدوں کی طرح ہر طرح کی تقلید کو حرام قرار دیتے ہیں، اور نہ ہی فقہاء اور مقلدین کی شان میں زبان درازی کرتے ہیں۔

ان میں جو محقق اہلِ علم ہیں، وہ تحقیق کے بعد فقہاء میں سے جس قول کو راجح سمجھتے ہیں، اس کا

اظہار کر دیتے ہیں، بعض جگہ جمہور سے الگ موقف بھی مناقشہ وغیرہ کے بعد اختیار کر لیتے ہیں، لیکن ہمارے یہاں کے بعض غیر مقلدوں کی طرح، دوسروں کے خلاف زبان درازیاں نہیں کرتے، البتہ بعض افراد تشدد کریں، تو ان کا معاملہ الگ ہے، جن کے متعلق پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔04 صفر المظفر 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 09، جون 2019ء - رمضان المبارک 1440ھ)

---

(127)

تقلید اور غیر مقلدین

آج کے زمانہ میں فقہاء و مجتہدین کی تقلید کرنے نہ کرنے کے معاملہ میں طرفین سے بہت زیادہ تشدد اور افراط و تفریط کا طرزِ عمل سامنے آتا ہے، کسی کی طرف سے کم اور کسی کی طرف سے زیادہ۔ اس مسئلہ میں اعتدال کو ملحوظ رکھنے والے بہت کم ہیں، اوپر سے اکثر لوگ اپنے تشدد کو تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں، ہر ایک اپنے آپ کو معتدل اور دوسرے کو متشدد قرار دیتا ہے، پھر تشدد کی اصلاح کیونکر ہوگی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ:

''اگر کوئی غیر مقلد ہمارے پاس جماعت میں کھڑا ہو، اور ''رفعِ یدین'' اور ''آمین بالجہر'' کرتا ہو، تو اس کے پاس کھڑے ہونے سے ہماری نماز میں تو کچھ خرابی نہ آئے گی، یا ہماری نماز میں بھی کچھ فساد واقع ہوگا؟''

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس کا درجِ ذیل جواب تحریر فرمایا:

''کچھ خرابی نہ آئے گی، ایسا تعصب اچھا نہیں، وہ بھی عامل بالحدیث ہیں، اگرچہ نفسانیت سے کرتا ہو، فعل تو فی حدِ ذاتہٖ درست ہے (فتاویٰ رشیدیہ، مبوب بطرزِ جدید، صفحہ ۹۳، کتاب التقلید والاجتہاد، تقلید واجتہاد کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

فوقِ ناف وزیرِ ناف دونوں طرح ہاتھ باندھنا، اگر از روئے دیانت ہے، تو جائز ہے، اور اگر ہوائے نفسانی سے کرے گا، تو ناجائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ رشیدیہ، مبوب بطرزِ جدید، صفحہ ۳۱۹، کتاب الصلاۃ، نماز کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، ایک اور سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا مستحب ہے، اور اس مسئلے میں خلاف، شافعی صاحب کا ہے، وہ ناف کے اوپر مستحب فرماتے ہیں، اگر کسی نے ناف کے اوپر ہاتھ باندھ لیے، تو اتنی حرکت سے غیر مقلد نہیں ہوتا (فتاویٰ رشیدیہ، مبوب بطرزِ جدید، صفحہ ۳۲۰، کتاب الصلاۃ، نماز کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

نیز حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، ایک اور سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

جو شخص فاتحہ پڑھتا ہو، آمین بالجہر کہتا ہو، اس کو ملامت نہ کرنا چاہیے، بشرطیکہ وہ شخص نہ پڑھنے والوں کو برا نہ کہے، اور نہ برا سمجھتا ہو، ورنہ وہ شخص عاصی ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ رشیدیہ، مبوب بطرزِ جدید، صفحہ ۳۲۰، کتاب الصلاۃ، نماز کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

نیز حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، نماز میں ''رفعِ یدین'' کرنے کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

میرا مسلک ''عدمِ رفع'' کا ہے کہ ''عدمِ رفع'' میرے نزدیک مرجح ہے، جیسا کہ قدمائے حنفیہ نے فرمایا ہے، اور ''طعن'' بندہ کے نزدیک دونوں پر روا نہیں کہ مسئلہ مختلف فیہا ہے، اور احادیث دونوں طرف موجود ہیں، اور عملِ صحابہ بھی، اور قوت وضعف مختلف ہوتے ہیں، بالآخر دونوں معمول بہا ہیں (فتاویٰ رشیدیہ، مبوب بطرزِ جدید، صفحہ ۳۲۱، کتاب الصلاۃ، نماز کے مسائل، مطبوعہ: عالمی مجلس تحفظِ اسلام، کراچی)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ:

اس زمانہ کے اکثر غیر مقلدین کی بے شک ہم کو شکایت ہے، ان میں عموماً الا ماشاء اللہ دو خصلتیں بہت بری ہیں، ایک ائمہ کے ساتھ بدگمانی، دوسرے ان کی شان میں بدزبانی، باقی ہم نفسِ غیر مقلدی کو حرام نہیں کرتے۔

غیر مقلدی بھی ایک مسلک ہے، لیکن اس وقت کے مفاسد کو دیکھ ہم کو پسند نہیں، بہت سی چیزیں جائز ہوتی ہیں، مگر بعض طبائع کے نزدیک ناپسند ہوتی ہیں، مثلاً اوجھڑی شرعاً جائز ہے، مگر نفیس مزاج ولطیف الطبع لوگ اس کو پسند نہیں کرتے

(''اسعد الابرار'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۲۵، ص ۱۸۸، ملفوظ نمبر ۱۰۰، بعنوان ''آج کل کے غیر مقلدین سے شکایت ہے'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: شعبان ۱۴۲۲ھ)

حضرت موصوف ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

ترکِ تقلید پر قیامت میں مؤاخذہ تو نہ ہوگا، کیونکہ کسی قطعی کی مخالفت نہیں، مگر بے برکتی اس میں یقینی ہے (''الکلام الحسن'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۲۶، الکلام الحسن، ص ۹۵، بعنوان ''ترکِ تقلید میں بے برکتی یقینی ہے'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: ربیع الاول 1425 ہجری)

ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے غیر مقلدوں اور تقلید کے مسئلہ کو کتنے اعتدال کے ساتھ صاف فرمادیا۔

لیکن آج کل اس سلسلہ میں افراط وتفریط دیکھنے میں آتی ہے، کوئی نفسِ تقلید، بلکہ تقلیدِ شخصی کے ترک کو بہر حال حرام قرار دیتا ہے، تو کوئی تقلید، یا تقلیدِ شخصی کو حرام بلکہ شرک قرار دیتا ہے۔

اس قسم کے تشدد سے باز آنا چاہئے، اور سلف کے طریقہ کو اختیار کرنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

05 صفر المظفر 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 09، جون 2019ء - رمضان المبارک 1440ھ)

(128)

سائنسی بنیاد پر رؤیتِ ہلال کے فیصلے کا حکم

یوں تو ہمارے وطن میں بعض لوگوں کی طرف سے ہر سال ہی رمضان وعید الفطر کے موقع پر انتشار سامنے آتا ہے، اور جب سے مادر پدر آزاد میڈیا کا دور شروع ہوا، اس وقت سے اس انتشار میں مزید اضافہ ہوگیا۔

لیکن اس سال 1440 ہجری- 2019 عیسوی کو رمضان اور عید کے موقع پر عجیب وغریب قسم کی انتشاری صورتِ حال سامنے آئی۔

جس کی وجہ یہ بنی کہ پہلے تو تحریکِ انصاف اور وزیر اعظم عمران خان صاحب کی موجودہ حکمران جماعت کے ایک وزیر صاحب نے یہ بیان دیا کہ چاند کا اعلان اور فیصلہ کرنے کے لیے رؤیتِ ہلال کمیٹی کو چاند دیکھنے، اور اس کا فیصلہ واعلان کرنے، اور اس پر قوم کا پیسہ خرچ کرنے کی خاطر خواہ ضرورت نہیں، بلکہ اس کا فیصلہ بآسانی پہلے سے ہی سائنسی بنیادوں پر کیا جاسکتا ہے، لہٰذا سائنسی بنیادوں پر چاند کے فیصلے کی کوشش کی جائے، جس کی بناء پر ملک میں مختلف ایام میں منائی جانے والی عید کا انتشار ختم ہوجائے گا، اور پورے ملک میں ایک ہی دن عید ہوگی، اور انہوں نے پہلے سے ہی عید کے دن کا بھی اعلان کر دیا، اور بتلایا کہ وہ پانچ سال کے لیے قمری کلینڈر تیار کر چکے ہیں۔

پھر اس کے بعد اسی حکومت کی خیبر پختونخوا کی صوبائی حکومت کے گورنر اور وزیرِ اعلیٰ نے مرکزی حکومت اور مذکورہ وزیر کے برعکس ایک دن قبل ہی عید الفطر منائی۔

یہ طرزِ عمل شرعی اصول وقواعد سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اس موضوع پر تفصیلی روشنی تو کسی فرصت کے موقع پر ڈالی جاسکے گی، اس وقت مختصر انداز میں یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ احادیث میں اس بات کی پوری طرح صراحت اور وضاحت

کردی گئی ہے کہ قمری مہینہ، کبھی انتیس دن کا اور کبھی تیس دن کا ہوتا ہے، جب تم انتیس دن کے بعد چاند کو دیکھ لو، تو رمضان کا روزہ رکھو، اور عید الفطر مناؤ، اور اگر تم پر ابر آلود ہو جائے، تو تم تیس دن پورے کرو۔ [1]

اور یہ بات ممکن ہے کہ کسی وقت سائنسی اعتبار سے چاند کا دیکھا جانا ممکن، اور بہت زیادہ ممکن ہو، لیکن موسم کے ابر آلود ہونے کی وجہ سے وہ دکھائی نہ دے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ موسم کے ابر آلود ہونے کا تعلق، خود چاند کے سیارے سے نہیں، بلکہ زمین کے سیارے سے ہے، لیکن سائنسی بنیاد پر چاند کے اپنی جگہ اُفق پر موجود ہونے اور ابر آلود نہ ہونے کی صورت میں نظر آنے کے پورے امکان کے باوجود، شریعت نے انتیس دن ہونے پر رمضان کا روزہ رکھنے، یا عید الفطر منانے، یا بالفاظِ دیگر قمری مہینے کی ابتداء کرنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ اس صورت میں تیس دن پورے کرنے کا حکم دیا۔

لہٰذا انتیس دن پورے ہونے پر سائنسی اعتبار سے رؤیتِ ہلال کے پوری طرح امکان ہونے، لیکن موسم کے ابر آلود ہونے کی وجہ سے اس کے نظر نہ آنے کی صورت میں قمری مہینے کے آغاز کردینے کی رائے درست نہیں۔

اسی لیے جمہور فقہائے کرام نے انتیس تاریخ کو چاند نظر نہ آنے کی صورت میں تیس دن پورے کرنے کا حکم دیا ہے۔

---

[1] حدثنا سعید بن عمرو : أنه سمع ابن عمر رضی اللہ عنہما، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنہ قال: إنا أمة أمية، لا نكتب ولا نحسب، الشهر هكذا وهكذا، يعنى مرة تسعة وعشرين، ومرة ثلاثين(صحيح البخارى، رقم الحديث ۱۹۱۳)

عن عبد الله بن عمر رضى الله عنهما: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الشهر تسع وعشرون ليلة، فلا تصوموا حتى تروه، فإن غم عليكم فأكملوا العدة ثلاثين (صحيح البخارى، رقم الحديث ۱۹۰۷)

عن أبى هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فإن غم عليكم فاقدروا ثلاثين(سنن النسائى،رقم الحديث ۲۱۱۸)

عن أبى هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فأفطروا، فإن غم عليكم فصوموا ثلاثين يوما(سنن النسائى،رقم الحديث ۲۱۱۹)

جبکہ بعض اوقات ایسا بھی ممکن ہے کہ انتیس تاریخ کو سائنسی اعتبار سے چاند نظر آنے نہ آنے کا امکان برابر ہو، اور کوئی ایک صورت بھی غالب وراجح نہ ہو، اس صورت میں سائنسی اعتبار سے چاند نظر آنے یا نہ آنے کا فیصلہ کرنا، سائنسی اعتبار سے بھی ممکن نہیں ہوتا۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ رمضان اور عیدین کا تعلق، مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے ہے کہ رمضان کے روزے، ہر عاقل وبالغ اور قادر مسلمان پر فرضِ عین ہیں، اور اس کے بعد عید کے تہوار کا تعلق بھی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے ہے، اسی وجہ سے عید کے موقع پر اجتماعی طور پر نمازِ عید کو اداء کرنے کا حکم ہے۔

لہٰذا اس اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لیے رؤیتِ ہلال کے فیصلے کو منظّم کرنے کی ضرورت ہے، جس کے لیے شریعت نے رؤیتِ ہلال کی گواہی اور شہادت کے نظام کو مقرر کیا ہے۔

پھر عام گواہی، جس کی حیثیت ''خبر'' کی ہوتی ہے، اس کے لیے تو ''مجلسِ قضاء'' ضروری نہیں، لیکن جس کو شریعت ''شہادت'' کا درجہ دیتی ہے، اس کے لیے ''مجلسِ قضاء'' ضروری ہے، جو کہ ''قاضی'' کے سامنے ہی اس کی ''مجلسِ قضاء'' میں ممکن ہے، اور فقہائے کرام نے رمضان کے چاند کے لیے تو عام ''گواہی'' یا ''خبر'' کو ایک درجے میں معتبر قرار دیا ہے، لیکن عید کے چاند کے لیے عام ''گواہی'' کے بجائے ''شہادت'' کو ضروری قرار دیا ہے۔

اور ہمارے یہاں ''مرکزی رؤیتِ ہلال کمیٹی'' کے چیئرمین کو قانونی طور پر رؤیتِ ہلال کے اعتبار سے ''قاضی'' کا درجہ حاصل ہے، جس کی تفصیل ہم نے دوسرے مضامین میں تحریر کر دی ہے، لہٰذا اس بناء پر اگر کسی نے انتیس شعبان کے بعد، رمضان کا چاند دیکھنے کا دعویٰ کیا، لیکن قاضی نے اس کی گواہی کو قبول نہیں کیا، تو اس دعویٰ کرنے والے کو خود اور جو اِس کی خبر پر اعتماد کرے، اس کو رمضان کا روزہ رکھنے کا حکم ہوگا، لیکن اس کی ''خبر'' دوسروں پر ''حجتِ ملزمہ'' نہیں ہوگی، اور اگر کوئی عید کے چاند کو دیکھنے کا دعویٰ کرے، تو خود اس کو اور اس کے دعویٰ پر اعتماد کرنے والے کو بھی اس وقت تک عید منانا جائز نہیں، جب تک کہ اس کی گواہی کو قاضی

قبول نہ کرلے، ایسی صورت میں رؤیتِ ہلال کا دعویٰ کرنے اوراس پر اعتماد کرنے والے لوگوں کو عید منانے کے بجائے روزہ رکھنے کا حکم ہوگا، اگرچہ ان کے اکتیس روزے کیوں نہ ہوجائیں، اورایسی صورت میں ان کا اکتیسواں روزہ، نفلی اورشعبان کے مہینے کا کہلائے گا۔

اس کے علاوہ احادیث میں شعبان کے چاند کو رمضان کے لیے محفوظ رکھنے کا حکم آیا ہے، اور اس بات کا بھی ذکر آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، شعبان کے مہینے کے چاند کو دیکھنے کا اتنا زیادہ اہتمام کیا کرتے تھے کہ جتنا زیادہ اہتمام کسی اور چاند کو دیکھنے کا نہیں کیا کرتے تھے۔

لیکن ہمارے یہاں کے بعض علاقوں میں شعبان کے چاند کو دیکھنے کا اہتمام نہیں کیا جاتا، اور اس موقع پر رؤیتِ ہلال کمیٹی کے فیصلے سے اختلاف بھی سامنے نہیں آتا، یہاں تک کہ ’’شبِ برأت‘‘ کے موقع پر بھی ان لوگوں کی طرف سے کوئی اختلاف سامنے نہیں آتا، اور نہ ہی دوسرے مہینوں میں رؤیتِ ہلال کے متعلق ان کی طرف سے اختلاف سامنے آتا، لیکن یکا یک شعبان کی آخری تاریخوں میں ان کی طرف سے اختلاف رونما ہوجاتا ہے، اور یہ اختلاف بھی عام طور پر ہمیشہ ماہِ شعبان کو انتیس کا مہینہ قرار دینے کی صورت میں سامنے آتا ہے، جو کہ شرعی اصول وقواعد کے خلاف ہے، اس لیے ان حضرات کو اپنے اس طرزِ عمل کا شرعی اصول وقواعد کی روشنی میں سنجیدہ طریقے پر جائزہ لے کر اصلاح کرنے اوراس مسئلہ کو اَنا کی بھینٹ چڑھانے سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد16 شمارہ10، جولائی 2019ء - شوال المکرّم 1440ھ)

---

(129)

آج کل کے رسمی جلسوں کی حالت

آج کل کے عام جلسے جلوسوں کی حالت دیکھ کر سخت دکھ ہوتا ہے کہ ان کی حالت کس قدر بگڑ گئی ہے، اصلاح اور خیر خواہی اوراصل دین کی تبلیغ کا جذبہ بہت کمزور پڑ گیا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ:

میں تو آج کل کے جلسوں کو جھلسا کہا کرتا ہوں، اکثر میں تفاخر وشہرت ہی مقصود ہے (''حسن العزیز''، مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۱۹، ص۳۹۲، بعنوان ''آج کل کے جلسے''مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر1425 ہجری)

حضرت رحمہ اللہ نے جو کچھ مروّجہ جلسوں کے بارے میں فرمایا، وہ حقیقت کے مطابق ہے، آج کے زمانہ میں تو پہلے زمانہ کے مقابلہ میں مروّجہ جلسوں میں زیادہ بگاڑ اور فساد آ گیا ہے، جس کا مشاہدہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے، اخلاص پر مبنی جلسوں کا وجود بہت کم رہ گیا ہے، زیادہ تر نام ونمود اور فخر وتفاخر اور شہرت و نام آوری پیشِ نظر ہوگئی ہے، اسی لیے عام طور پر مروّجہ جلسوں میں ایسے افراد واشخاص کو بیان کے لیے مدعو کیا جاتا ہے، جن کی وجہ سے مجمع زیادہ، اور بلکہ چندہ زیادہ اکٹھا ہو اور ''لوگوں میں نام ہو کہ بڑا جلسہ ہوا، کامیاب جلسہ ہوا''۔

جلسوں کی کامیابی کی بنیاد بھی مجمع وچندہ کے زیادہ ہونے پر رکھی جانے لگی ہے، خواہ لوگوں کی اصلاح سے متعلق کوئی خاطر خواہ بات نہ ہو، ایسے جلسوں کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ''جھلسا'' قرار دیا۔

''جھلسا'' اس کو کہا جاتا ہے، جو آگ سے جھلس گیا ہو، اور اس کا حلیہ بگڑ گیا ہو، جیسا کہ کوئی آدمی، یا گاڑی، یا کوئی مکان وغیرہ آگ میں جھلس جانے کی وجہ سے بے رونق اور خراب ہو جاتا، اور بگڑ جاتا ہے، اسی طرح آج کل کے اکثر جلسے جھلس گئے، اور بگڑ گئے ہیں، اس طرح کے جلسوں میں شرکت کرنے والوں کی اصلاح بھی مشکل ہوتی ہے، سن کر ویسے کے ویسے ہی واپس لوٹ آتے ہیں، زیادہ سے زیادہ نعرے لگا لیے، کچھ کھا پی لیا، سیر وتفریح ہوگئی، نشستن، گفتن اور برخاستن سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا، اگر اس سے زیادہ کچھ ہوتا بھی ہے، تو ''خوردن'' یعنی کھانا پینا ہوتا ہے۔10 صفر المظفر 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد16 شمارہ10، جولائی 2019ء - شوال المکرّم 1440ھ)

(130)

فقیہ کے لیے محدث ہونے کی ضرورت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ:

فقہ بڑی مشکل چیز ہے، فقیہ کو بڑا جامع ہونا چاہئے، فقیہ بھی ہو، اور محدث بھی ہو، متکلم بھی ہو، سیاسی دماغ بھی رکھتا ہو، بلکہ کہیں کہیں طب کی بھی ضرورت ہے، فقہ بڑی مشکل چیز ہے (''حسن العزیز'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۰، ص۱۰۱، بعنوان ''فقہ جامع ہونا چاہیے'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر1425ہجری)

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بڑی عجیب بات فرمائی، واقعی سچ فرمایا کہ فقیہ کو محدث بھی ہونا چاہیے، اور بقدرِ ضرورت دوسرے علوم کا جامع بھی ہونا چاہئے، جس میں ہر زمانے کے علوم کا بقدرِ ضرورت ہونا بھی داخل ہے۔

مگر آج کل عجیب حالت ہے، بہت سے مفتی حضرات ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کرتے، اسی وجہ سے وہ، اپنی تحریرات میں ایسی ایسی چیزیں اور باتیں، بلکہ حدیثیں لکھ دیتے ہیں کہ جن کا سر پیر بھی نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات وہ من گھڑت ہوتی ہیں، اسی طرح جس فن کی کسی چیز پر حکم لگاتے ہیں، اس فن کے مبادی اور بنیادی چیزوں کا بھی علم نہیں ہوتا۔

چنانچہ آج کل کئی سائنسی اور میڈیکل سے متعلق ایسی چیزوں پر ان کا علم حاصل کیے بغیر حکم صادر کر دیا جاتا ہے، جو اس علم وفن کے اصولوں کے صریح خلاف ہوتے ہیں، اس طرزِ عمل کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

03 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 10، جولائی 2019ء - شوال المکرّم 1440ھ)

---

(131)

ہم عصری کمالات پر پردہ ڈال دیتی ہے

ہر زمانہ کے صاحبِ علم اور صاحبِ فن کے ہم عصروں میں قدر کرنے والے لوگ بہت کم ہوئے ہیں، کیونکہ کسی کا ہم عصر ہونا، اس کے کمالات پر پردہ ڈال دیتا ہے، اور اصل قدر اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے پاس اس بات کا ذکر ہوا کہ ہم عصری ایسی چیز ہے، جو انسان کے کمالات پر پردہ ڈال دیتی ہے، کوئی کیسا ہی صاحبِ کمال ہو، مگر ہم عصروں کی نظر اس پر وقعت کے ساتھ نہیں پڑتی۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے اس پر فرمایا کہ:

جی ہاں، اور ماموں صاحب فرمایا کرتے تھے کہ موت عجیب چیز ہے کہ مرتے ہی آدمی ''رحمۃ اللہ علیہ'' ہو جاتا ہے، اور پچاس برس کے بعد ''قدس سرہٗ'' ہو جاتا ہے

(''حسن العزیز'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۲۰، ص۱۲۶، بعنوان ''ہم عصری کمالات پر پردہ ڈال دیتی ہے'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر 1425 ہجری)

یہ صورتِ حال جو حضرت کے ملفوظ میں بیان کی گئی، واقعہ کے مطابق ہے، جس کا رات دن مشاہدہ ہوتا ہے، زندگی میں کسی کے کام اور مقام کی اکثر ہم عصروں کو قدر نہیں ہوتی، اور فوت ہونے کے بعد، یا فوت شدہ حضرات کی قدر زیادہ ہوتی ہے، خواہ فوت شدہ کا مقام اور کام اس درجہ اور نوعیت کا نہ ہو، جس نوعیت اور درجہ کا زندہ اور ہم عصر شخص کا ہے، یہ شیطان کی طرف سے محروم کرنے کی تلبیس ہے۔

ایک اور مقام پر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

ظاہر میں ہے تو بے ادبی، مگر بعضے متاخرین، بعضے متقدمین سے افضل ہیں، کمال کسی

پر ختم نہیں، یہ نبوت تھوڑا ہی ہے، جو ختم ہو جائے (''حسن العزیز'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۲۰، ص ۲۰۰، بعنوان ''بعض متاخرین، متقدمین سے افضل ہیں'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر 1425 ہجری)

مگر حیرت ہے کہ آج بعض اہلِ علم بھی کمالات کو بعض بزرگوں پر ختم کر کے بیٹھ گئے، کسی کو ''خاتم المحققین'' بنالیا، کسی کو اور کچھ۔

اوران کے مقابلہ میں بعد کے حضرات اور خاص طور پر اپنے ہم عصر حضرات کو نظر انداز کر دیا، جس کی وجہ سے وہ بڑے بڑے فوائد سے محروم ہو گئے، اصل طریقہ اور مومن کی شان یہ ہے کہ کام کی بات، جس سے بھی حاصل ہو، اس کی قدر کرے، اور خود بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔ 05 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 10، جولائی 2019ء - شوال المکرّم 1440ھ)

---

(132)

سلف مجتہدین کا اختلاف اور موجودہ گروہ بندی

موجودہ زمانہ میں بہت سے اہلِ علم اور دین دار حضرات میں بھی فقہی واجتہادی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے باہم اتحاد واتفاق نہیں، ذرا ذرا سی فقہی وفروعی اختلافی باتوں پر ایک دوسرے کو گمراہ وغیرہ کہا جاتا ہے، پھر عوام میں کیا خاک اتحاد واتفاق ہوگا؟

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک وعظ میں ائمہ ومجتہدین کے اختلاف کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

ایسا (یعنی فقہی واجتہادی) اختلاف تو اختلافِ رحمت ہے، اس اختلاف سے فتنے اور فساد کی نوبت نہیں آیا کرتی، دیکھیے ائمۂ اربعہ میں سمجھ ہی کا اختلاف ہے، مگر اس کے ساتھ پھر سب متفق ہیں، کوئی ایک دوسرے پر ملامت وطعن نہیں کرتا، بلکہ ہر

ایک سب کو حق پر سمجھتا ہے (آج بھی) ایسا اختلاف ہوتا، تو مسلمانوں کو آج یہ پریشانی نہ ہوتی، جو آنکھوں سے نظر آرہی ہے، بلکہ (آج کل کا) یہ اختلاف تو روٹیوں کا ہے (خطباتِ حکیم الامت، ج ۲۷ ''اصلاحِ ظاہر'' صفحہ ۸۲، وعظ ''اسباب الفتنہ'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر ۱۴۲۷ھ)

مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانوں میں علماء وفقہاء کا اختلاف دلائل کی بنیاد پر تھا، اس لیے باہم بغض وعداوت نہیں تھی، اور آج کل دلائل کے بجائے، مال ودولت وغیرہ کی بنیاد پر اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی خاطر ہے، اس لیے پریشانی کا سامنا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

افسوس ہے کہ باہم اہلِ حق کے اندر الگ الگ پارٹیاں ہوگئیں، جدا جدا طبقے ہوگئے، ہماری یہ حالت افسوس ناک ہے، میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اختلاف حدِ شرع سے متجاوز (یعنی آگے بڑھا ہوا) ہے، تو جس نے تجاوز کیا ہو، وہ اپنی اصلاح کرے، اور اگر حدودِ شرعیہ کے اندر ہے، تو یہ پارٹی بندی کیسی؟ سب کو یہ تفریق قطع (اور ختم) کر کے حدودِ شرعیہ کے اندر ایک ہونا چاہیے۔

آخر اختلافِ مذاق، حدِ شریعت کے اندر اندر تو سلف میں بھی ہوا ہے، مگر وہاں یہ تفریق نہ تھی، کوئی ایک دوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا، مگر اب یہ حالت ہے کہ ہر ایک دوسرے پر اعتراض کرتا ہے، نہ اِدھر تہذیب رہی، نہ اُدھر، ہم کو اپنے سلف کے حالات میں غور کرنا چاہیے (خطباتِ حکیم الامت، ج ۲۸ ''اصلاحِ ظاہر'' صفحہ ۶۱، وعظ ''اسباب الفتنہ'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: صفر ۱۴۲۷ھ)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے مذکورہ ارشادات سے معلوم ہوا کہ فقہائے مجتہدین کا اختلاف رحمت ہے، اس طرح کے اختلاف سے فتنے اور فساد کی نوبت نہیں آتی، اختلاف کے باوجود ایک دوسرے پر ملامت اور طعن نہیں کیا جاتا، اور سب کو حق پر سمجھا جاتا ہے، اور باہم سب ایک دوسرے سے متفق ہو کر محبت واحترام کے ساتھ

رہتے ہیں، لیکن آج کے دور میں حرص وطمع، اور حبِ جاہ وکبر وغیرہ کی وجہ سے گروہ بندیاں ہوگئی ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل جن جدید فقہی واجتہادی مسائل میں علماء وفقہاء کا دلائلِ شرعیہ کی رُو سے اختلاف ہے، ان میں حدودِ شریعت کا لحاظ بہت کم لوگوں میں باقی رہ گیا ہے، ایک دوسرے پر طعن وتشنیع کا مادہ زیادہ ہوگیا ہے، جو بہت سے اہلِ علم حضرات کی زبان اور ان کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح سے ایک دوسرے کے خلاف زبان درازی کی جاتی ہے، اور دوسرے کے دلائل کی کس طرح کی زبان استعمال کرکے دھجیاں اڑائی جاتی ہیں، ان حالات میں مسلمانوں اور خاص کر علماء کو سلف کے طور وطریقہ پر غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

07 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 11، اگست 2019ء - ذوالقعدۃ/ ذوالحجہ 1440ھ)

---

(133)

مال کی حرص اور پارٹی بندی کا نقصان

آج کل عوام تو درکنار بہت سے علماء کے اندر بھی مال کی حرص وطمع اور منصب وجاہ وغیرہ کی بے جا محبت پیدا ہوگئی ہے، اور پھر اس کے نتیجہ میں پارٹی بندی اور گروہ بندی نے جنم لے لیا ہے، ہر شخص منصب اور عہدہ کی تلاش اور جستجو میں مبتلا نظر آتا ہے، اور اس طرح کے عہدوں کی خاطر مختلف جماعتیں اور تنظیمیں بنائی جاتی ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ اپنے ایک وعظ میں علماء کے اندر طمع، یعنی حبِ مال اور حبِ جاہ کے مرض کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

علماء کو ان ہی دو باتوں نے زیادہ تباہ کیا ہے، مدرسین کی یہ حالت ہے، یہ تنخواہ پر جھک جھک کرتے ہیں، یہ نہایت واہیات ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ:

یہ نہایت نازیبا حرکت ہے کہ عالمِ دین ہو کر مال پر رال ٹپکاتے پھریں، اور دوسرا مرض ان (علماء) میں حبِ جاہ کا ہے، جس کی وجہ سے علماء کے اندر پارٹی بندی ہوگئی ہے، ہر شخص اپنی ایک جدا جماعت بنانے کی فکر میں ہے (خطباتِ حکیم الامت، ج ۲ ''علم وعمل'' صفحہ ۸۰ و ۹۱، وعظ ''الفاظِ قرآن'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: 1417ہجری)

پھر آگے فرماتے ہیں کہ:

لوگوں نے علماء کی طمع اور پارٹی بندی کی وجہ سے علمِ دین کو ذلیل سمجھ رکھا ہے، تم نے ہی قوم کو ڈبویا ہے، تم نے ہی ان کے اعمال کو خراب اور ستیاناس کیا ہے، جب عوام، علماء کو پارٹی بندی کرتے دیکھیں گے، تو بتلاؤ کیا وہ پارٹی بندی نہیں کریں گے، ضرور کریں گے، پھر ان کی اصلاح کے لیے ہمارا کیا منہ رہے گا (خطباتِ حکیم الامت، ج ۲ ''علم وعمل'' صفحہ ۸۳، وعظ ''الفاظِ قرآن'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: 1417ہجری)

معلوم ہوا کہ علماء کی حبِ مال وحبِ جاہ کی حرص وطمع اور پارٹی بندی کی وجہ سے عوام میں ان کی ذلت اور رسوائی پیدا ہو رہی ہے، جس سے علماء کو بچنے کی ضرورت ہے۔ 10 ربیع الاول 1440ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 16 شمارہ 11، اگست 2019ء - ذوالقعدۃ/ ذوالحجہ 1440ھ)

---

(134)

فقہی مسائل میں مشاورت

بندہ فقہی واجتہادی مسائل میں غور وفکر کر کے اپنی بساط بھر جدوجہد کے بعد، جس قول کو راجح سمجھتا ہے، اس کو راجح قرار دیتا ہے، اور بعض اہلِ علم حضرات سے ضرورت کے موقع پر

مشاورت بھی کرلیتا ہے، اس مقصد کے لیے بندہ نے اپنے یہاں مقامی سطح پر فقہی مجلس بھی قائم کررکھی ہے، بلکہ بندہ کی کوشش ہوتی ہے کہ بندہ کے تحریر کردہ تمام فقہی مسائل وابحاث کو کم ازکم فقہی مجلس کے ارکان ملاحظہ کرلیں، اوراپنے آزادانہ مشورے بھی ذکرکردیں، الحمدللہ تعالیٰ ایک عرصہ سے اس کے مطابق عمل ہورہا ہے، بعض اوقات بذریعہ فون، یابذریعہ ڈاک دیگر اہلِ علم حضرات سے مشاورت کی کوشش کرتا ہوں، وہ الگ بات ہے کہ دیگر اہلِ علم حضرات کی طرف سے رائے کم، بلکہ بہت کم ہی آتی ہے، اوراگرآتی بھی ہے، تو بہت بعد میں، جب اس مسئلہ پرغوروفکرکرکے عمل درآمد اورکوئی نتیجہ اخذ کرلیا جاتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ مستفتی اورکوئی ضرورت منداگرکسی مسئلہ میں بندہ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہے، اوراس کوعملی طورپرکوئی مسئلہ درپیش ہے، تو اس کوایک حدتک ہی انتظار کی زحمت دی جاسکتی ہے۔

پھرموصول ہونے والی بعض آراء قابلِ ذکراہمیت کی حامل نہیں ہوتیں، ایسے حالات میں بندہ نے اپنے بعض اکابرومشائخ کی ہدایت کے مطابق خود سے حسبِ توفیق، غوروفکرکرکے اپنی رائے کے اظہار کے عمل کا اہتمام کررکھا ہے۔

اوران سب امور کی تائید فقہائے کرام کے اقوال سے بھی ہوتی ہے، جس کی باحوالہ طریقہ پر بندہ نے ایک تالیف میں تفصیل بھی ذکرکردی ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود بعض معاصر اہلِ علم حضرات کو یہ شکایت رہتی ہے کہ بندہ بعض مسائل میں مشورہ کے بغیراپنی رائے جاری کردیتا ہے۔

حالانکہ اولاً تو یہ کہنا ہی محلِّ نظر ہے کہ بندہ نے اس مسئلہ میں مشاورت نہیں کی، دوسرے ہر مسئلہ میں مشاورت ضروری بھی نہیں، تیسرے مشاورت کی بھی کوئی حدہونی چاہئے، اب اگر بندہ کچھ حضرات سے مشاورت کرچکا ہے، اورکچھ سے نہیں کی، تو جس سے نہیں کی، اس طرح کے سب حضرات کو ہی شکایت ہوگی، اوراہلِ علم حضرات کی مقدار بے شمار ہے، ان سب سے مشاورت ممکن نہیں، پھرشکایت کا ازالہ کیونکر ہوگا، بالخصوص جب شکایت کرنے والے کی

اصل شکایت کا محور یہ ہو کہ اس سے مشاورت کیوں نہیں کی گئی، حالانکہ یہ حق مشورہ لینے والے کا ہے کہ وہ کس سے مشورہ لینا مناسب سمجھتا ہے، اور کس سے نہیں۔

زیادہ حیرت ان حضرات پر ہے کہ جو شکایت تو بڑی آسانی سے کر دیتے ہیں، لیکن جب ان سے مشورہ کے لیے کوئی مسئلہ ان کے پاس ارسال کیا جاتا ہے، تو ان کے پاس غور وفکر کرنے، اس کو مطالعہ وملاحظہ کرنے اور مشورہ دینے کا وقت بھی نہیں ہوتا، اور نہ ہی وہ خود بندہ سے اپنے پیش آمدہ مسائل میں مشاورت کی ضرورت سمجھتے، اور بندہ کو ان سے شکایت بھی نہیں ہوتی، یہ پہلے سے زیادہ حیران کن بات ہے۔

پھر بندہ، بحمداللہ تعالیٰ، ہمہ وقت اپنے موقف ورائے پر نظرِ ثانی اور غور وفکر کرنے اور ضرورت پڑنے پر اپنے سابق موقف ورائے سے رجوع کرنے کے لیے آمادہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اسی موقف پر تادمِ حیات قائم ودائم رکھے، اور نفس وشیطان کے مکر وفریب اور اس کی مکاریوں اور چالبازیوں اور تلبیسات سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

اصل بات یہ ہے کہ بعض حضرات سے خود تو تحقیق وغیرہ کا کام ہوتا نہیں، اور نہ ہی دوسرے کے تحقیقی کام میں ہاتھ بٹانے کی ان کو توفیق ہوتی، اور اگر کچھ ان سے کام ہوتا ہے، تو وہ اعتراض کا کام ہے، اعتراض کونسا مشکل کام ہے، یہ تو بہت آسان ہے، اسی لیے نبیوں تک پر بھی جہلاء وحمقاء اعتراض کرتے آئے ہیں، مشکل چیز کام کو کرنا ہے، جس کو کرنے کی توفیق کم ہی حضرات وافراد کو ہوتی ہے۔ 12 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ "التبلیغ"، جلد 17 شمارہ 01، ستمبر 2019ء - محرم الحرام 1441ھ)

---

(135)

علماء ومشائخ کا غیبت میں مبتلا ہونا

آج کل بڑی حیرت ہے کہ بعض علماء ومشائخ، جو دوسروں کے مصلح ومقتدا شمار ہوتے ہیں، وہ

خود غیبت میں مبتلا ہیں، اوپر سے اس پر دین کا خول بھی چڑھا دیتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

آج کل اس سے بڑھ کر یہ تماشا ہے کہ غیبت کے لیے بھی صلحاء واتقیاء ہی تجویز کیے جاتے ہیں، چنانچہ مشائخ کی مجلسوں میں اکثر، دوسرے مشائخ وعلماء کی ہی غیبتیں ہوا کرتی ہیں، جہاں فساق کی بھی پردہ دری جائز نہیں تھی (خطباتِ حکیم الامت، ج ۷ "حقیقتِ عبادت" صفحہ ۱۳۷، وعظ، مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: 1416 ہجری)

ملاحظہ فرمایئے! کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ غیبت کا مرض اور گناہ ایسا پھیل گیا، اور عام ہو گیا کہ اس میں علماء وصلحاء اور مشائخ بھی مبتلا ہو گئے، اور اس کا ہدف بھی علماء ومشائخ کو بنالیا گیا۔

اور اگر اس طرح کی غیبت پر دین کا پردہ اور خول بھی چڑھا دیا جائے، تو پھر کیا کہنے، ایسی صورت میں تو کھل کر اور جی بھر کر غیبت ہوتی ہے، مثلاً بعض علماء ومشائخ کہا کرتے ہیں کہ ہم تو فلاں کی برائی اس لیے بیان کرتے ہیں، تاکہ دوسرے لوگ ان کی گمراہی سے بچ جائیں، حالانکہ اولاً تو اس طرح کی نیت نہیں ہوتی، بلکہ لوگوں کو صرف دوسرے کی عقیدت سے روکنا مقصد ہوتا ہے، دوسرے اگر کسی کو نقصان سے بچانا ہے، تو اس میں نام لینے کی کیا ضرورت ہے، بلکہ نام لیے بغیر بھی اس فعل، یا فاعل کی مذمت اور برائی بیان کی جاسکتی ہے۔

کوئی گناہ کر کے اس پر عبادت کا خول چڑھانا سخت نقصان دہ ہے، اور ایسی صورت میں اصلاح بہت مشکل ہے۔

اللہ تعالیٰ اصلاح کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

15 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ "التبلیغ" جلد 17 شمارہ 01، ستمبر 2019ء - محرم الحرام 1441ھ)

---

www.idaraghufran.org

(136)

واقعات کی روایت میں علماء کا غیر محتاط طرزِ عمل

آج کل بعض ناواقف لوگ تو دین کی اصل بات سمجھتے ہی نہیں، اور بعض سمجھتے ہیں، لیکن جس سے تحاسد وتباغض وغیرہ ہو، اس کو بدنام کرنے کے لیے غلط سلط انداز میں روایت کرکے، بلکہ جھوٹ کا ارتکاب کرکے، دوسرے سے بدظن کرنے اور فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور بعض لوگ واقعات کے نقل کرنے اور سننے میں بہت بے احتیاطی کرتے ہیں، جس میں آج کل کے بعض علماء بھی شامل ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ:

> میں روایت کے اس معاملہ میں بہت محتاط ہوں، میں تو واقعات میں علماء تک کی روایت کا بھی اعتبار نہیں کرتا، میرا اعتقاد یہ ہے کہ یہ فتویٰ تو صحیح دیں گے، مگر واقعات میں اکثر ان کا بھی معمول احتیاط کا نہیں۔
>
> اس پر چاہے کوئی برا مانے، یا بھلا، جو بات تھی صاف عرض کردی (''الافاضات الیومیہ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج ۳ ص ۱۰۲، ملفوظ نمبر ۱۳۸، بعنوان ''روایتِ واقعہ میں علماء تک بے احتیاطی کرتے ہیں'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: جمادی الاولیٰ 1423 ہجری)

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے ملفوظات میں اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ ان سے بعض لوگ اس لیے خفا ہیں کہ وہ حق بات کے اظہار میں خِفا نہیں رکھتے۔

بندہ محمد رضوان عرض کرتا ہے کہ ایک عالم کے سامنے کسی نے ایک روایت بندہ کے متعلق نقل کی کہ میں ایک وقت کی تین طلاقوں کے ایک ہونے کا قائل ہوں، جس پر انہوں نے بندہ سے شکایت کی، حالانکہ یہ سراسر غلط روایت تھی، بندہ کا ایک وقت کی تین طلاقوں کے متعلق اصل موقف وہی ہے، جو جمہور صحابہ اور جمہور فقہائے کرام کا ہے کہ ایک وقت کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی ہیں، اور ایک وقت کی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینا بندہ کے نزدیک

جمہور کے خلاف مرجوح اور ضعیف قول ہے۔

البتہ بندہ اس سلسلہ میں چند علمی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی ضرورت سمجھتا ہے، مثلاً ایک مسئلہ تو ایک وقت کی تین طلاقوں کے تین ہونے کا ہے، یہ الگ مسئلہ ہے، اور اس طرح کی طلاقوں کے تین ہونے کا موقف جمہور صحابہ وفقہائے کرام کا ہے، اور راجح ہے۔

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کن الفاظ سے اور کس طرح کی نیت سے ایک، یا دو طلاقیں ہوتی ہیں، اور کن الفاظ سے اور کس طرح کی نیت سے تین طلاقیں ہوتی ہیں؟

یہ مسئلہ پہلے مسئلہ سے جدا ہے، اور اس دوسرے مسئلہ کو پہلے مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کرنا اور اس طرح کے ہر مسئلہ کو بھی جمہور صحابہ وتابعین اور فقہائے جمہور کا قول سمجھنا غلطی ہے۔

چنانچہ بعض صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں دیانتاً ایک طلاق واقع ہوتی ہے، اور ان صورتوں میں قضاءً ایک، یا تین طلاقیں واقع ہونے میں فقہاء کا اختلاف ہے، مثلاً کسی نے ایک طلاق کی نیت سے کئی مرتبہ ''طلاق، طلاق، طلاق'' کے الفاظ بولے، تو اس صورت میں حنفیہ کے نزدیک قضاءً تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، البتہ دیانتاً ایک طلاق واقع ہوتی ہے، اور اگرچہ فتویٰ دیانت کے مطابق دیا جاتا ہے، لیکن بعض مشائخِ حنفیہ نے عورت کو قاضی کی طرح قرار دے کر یہ فرمایا کہ اگر عورت تین مرتبہ طلاق کے الفاظ سن لے، یا کسی معتبر ذریعہ سے اسے معلوم ہوجائے کہ شوہر نے تین، یا زیادہ مرتبہ طلاق طلاق کے الفاظ اداء کیے ہیں، اور شوہر یہ دعویٰ کررہا ہو کہ اس کی ایک طلاق کی نیت تھی، تو عورت کو شوہر کی بات کا اعتبار کرنا جائز نہیں، اور اسے تین طلاق ہی سمجھنا چاہیے، اور قاضی کو بھی تین طلاق ہی کا فیصلہ کرنا چاہیے، اگرچہ شوہر اپنے دعوے پر حلف کیوں نہ اٹھائے۔

لیکن اولاً تو اگر'' **المرأة كالقاضي** '' کے اصول کو اختیار کیا جائے، تو'' **قضاء القاضي بعلمہٖ** ''میں بھی یہ تفصیل ہے کہ خالص حدود اللہ میں جائز نہیں، اور غیر حدود میں متقدمین حنفیہ کے نزدیک جائز ہے، متأخرین نے فسادِ زمان کی بناء پر مظنۂ تہمت کی وجہ سے، اس کو

ناجائز قرار دیا ہے، اس علت کا اثر صرف غیر کے لیے قضاء پر پڑتا ہے، خود اپنے نفس کے لیے حکم معلوم کرنے پر اس کا کوئی اثر نہیں، لہٰذا اپنے لیے اپنے علم کے مطابق عمل کرنا جائز ہے

(ملاحظہ ہو: احسن الفتاویٰ، ج:۵ص:۱۶۱، کتاب الطلاق، بعنوان ''طلاق کی جھوٹی خبر کا حکم''، مطبوعہ: ایچ۔ایم سعید کمپنی، کراچی، طبع چہارم: ۱۴۱۴ ہجری)

لہٰذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر عورت کا دل شوہر کے دعوے پر مطمئن ہو، تو اس کو شوہر کی بات پر عمل کر لینا جائز ہے۔

دوسرے حنفیہ کے علاوہ بعض دیگر فقہائے کرام، مذکورہ مخصوص صورت میں دیانتاً کے ساتھ ساتھ قضاءً بھی ایک طلاق واقع ہونے کا حکم لگاتے ہیں، مذکورہ صورت میں ان کے نزدیک عورت کو شوہر کی بات کا اعتبار کرنا اور قاضی کو شوہر کے بیان کے مطابق ایک طلاق کا فیصلہ کرنا جائز ہے۔

اب ایسی صورت میں سوال سامنے آجانے کے بعد بھی ہمارے بعض علماء ومفتیانِ کرام یہ فرماتے اور فتویٰ دیتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں جمہور صحابہ وتابعین اور چاروں فقہاء کے نزدیک قضاءً تین طلاقیں واقع ہوگئیں۔

جبکہ یہ بات درست نہیں، اور یہ مسئلہ جمہور کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہونے سے جدا ہے۔

ایسی صورت میں اگر کوئی حاکم، یا حَکَم، یا مفتی ''قضاء القاضی بعلمہٖ'' کے مطابق عورت کے لیے شوہر کے بیان کے مطابق عمل کی گنجائش دیتا ہے، یا حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہائے کرام کے قول کے مطابق ضرورتاً، یا دلیل کا رجحان محسوس کرتے ہوئے، قضاءً ایک طلاق کا حکم لگاتا ہے، یا فیصلہ کر دیتا ہے، تو مستفتی، یا محکوم کو اس پر عمل کر لینا جائز ہے۔

بالخصوص جبکہ اس طرح کے مسائل میں بعض اوقات گنجائش نہ دینے سے طرح طرح کی مشکلات پیدا ہوتی ہیں، بعض لوگ مشکلات کی وجہ سے اہلِ حق سے وابستگی ترک کر دیتے ہیں، ہمیں ایسی صورت میں تشدد کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا، اور بندہ اس طرح کے مسائل واحوال میں شوہر کے قول کے مطابق اس سے حلف لے کر گنجائش وتوسع کا قائل ہے، جس

میں نہ قرآن وسنت اور اجماعِ امت کی مخالفت ہے، اور نہ ہی اس پر کوئی گناہ ہے۔

اب اس پر یہ الزام عائد کرنا کہ جمہور کے موقف کو ترک کر دیا، اور غیر مقلدین وغیرہ کے مسلک کو اختیار کر لیا، درست نہیں، اس طرح کی باتیں، یا تو کم علمی سے ناشی ہوتی ہیں، یا پھر بدگمانی اور غلط فہمی وغیرہ کی وجہ سے صادر ہوتی ہیں، جبکہ بعض لوگ محض تحاسد وتباغض کی بناء پر اس طرح کی بے سروپا باتیں اڑاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کے شر سے سب کو اور خود ان کو محفوظ رکھے، کیونکہ بغض وحسد کے گناہ کا شر، سب سے زیادہ اس فعل کے مرتکب کو ہی پہنچتا ہے۔18 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد17 شمارہ02، اکتوبر2019ء - صفر المظفر 1441ھ)

---

(137)

قبر پر پھول ڈالنے میں عدمِ تشدد

قبروں پر چراغ اور اگر بتی وغیرہ جلانا اور قبروں پر چادریں وغیرہ چڑھانا ممنوع ہے، اس کے بجائے یہی روپیہ پیسہ کسی غریب ومستحق کو صدقہ کر کے اس کا مومن میت کو ثواب پہنچا دینا چاہئے، البتہ قبر پر کوئی شاخ گاڑنا، یا پودا اُگانا جائز ہے۔

اور قبر پر سبز، یا تازہ ہرے خوشبودار پھول، مثلاً گلاب وغیرہ کے تازہ پھول، یا گلاب وغیرہ کی تازہ پتیاں ڈالنا، حنفیہ کے مشہور قول کے مطابق، مکروہ ہے۔ [1]

---

[1] يوضع على القبر حصى، وعند رأسه حجر أو خشبة :أما وضع الحصى فلما رواه الشافعي مرسلا أنه وضعه على قبر ابنه إبراهيم وروى أنه رأى على قبره فرجة فأمر بها فسدت، وقال :إنها لا تضر ولا تنفع، وإن العبد إذا عمل شيئا، أحب الله منه أن يتقنه .وأما وضع الحجر ونحوه لتعليم القبر، فللحديث المتقدم :أنه صلى الله عليه وسلم وضع عند رأس عثمان بن مظعون صخرة، وقال: أتعلم بها قبر أخي، وأدفن إليه من مات من أهلي.

لا يجوز اتخاذ السرج على القبور، لقول النبي صلى الله عليه وسلم :لعن الله زوارات القبور،

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

لیکن بعض فقہاء کے نزدیک مکروہ نہیں، جن میں بعض مشائخِ حنفیہ بھی داخل ہیں۔ [1]

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾ والمتخذين عليها السرج (الفقه الاسلامى و ادلتهٔ للزحيلى، ج۲، ص ۱۵۵۴، القسم الاول، الباب الثانى، الفصل العاشر، المبحث الثامن، المطلب الثانى، الفرض الرابع)

قال الشافعية : لا بأس بتطييب القبر، وقالوا أيضا مع الحنابلة والحنفية :ويندب أن يرش القبر بماء، ويسن وضع الجريد الأخضر والريحان ونحوه من الشىء الرطب على القبر حفظا لترابه من الاندراس، ولا يجوز للغير أخذه من على القبر قبل يبسه؛ لأن صاحبه لم يعرض عنه إلا عند يبسه، لزوال نفعه الذى كان فيه وقت رطوبته، وهو الاستغفار.

ودليلهم على رش الماء :أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رش على قبر ابنه إبراهيم ووضع عليه حصباء.

وكذلك قال الحنفية : يكره قطع النبات الرطب والحشيش من المقبرة، دون اليابس؛ لأنه مادام رطبا يسبح الله تعالى، فيؤنس الميت، وتنزل بذكره الرحمة .ويندب وضع الجريد والآس ونحوهما على القبور .والدليل :ما ورد فى الحديث الصحيح من وضعه عليه الصلاة والسلام الجريدة الخضراء، بعد شقها نصفين على القبرين اللذين يعذبان، وتعليله بالتخفيف عنهما ما لم ييبسا أى يخفف عنهما ببركة تسبيحهما؛ إذ هو أكمل من تسبيح اليابس، لما فى الأخضر من نوع حياة. فكراهة قطع ذلك وإن نبت بنفسه، لما فيه من تفويت حق الميت (الفقه الاسلامى و ادلتهٔ للزحيلى، ج۲، ص ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، القسم الاول، الباب الثانى، الفصل العاشر، المبحث الثامن، المطلب الثانى، الفرض الرابع)

[1] (تتمة) يكره أيضا قطع النبات الرطب والحشيش من المقبرة دون اليابس كما فى البحر والدرر وشرح المنية وعلله فى الإمداد بأنه ما دام رطبا يسبح الله -تعالى -فيؤنس الميت وتنزل بذكره الرحمة اهـ ونحوه فى الخانية.

أقول :ودليله ما ورد فى الحديث من وضعه -عليه الصلاة والسلام -الجريدة الخضراء بعد شقها نصفين على القبرين اللذين يعذبان .وتعليله بالتخفيف عنهما ما لم ييبسا :أى يخفف عنهما ببركة تسبيحهما؛ إذ هو أكمل من تسبيح اليابس لما فى الأخضر من نوع حياة؛ وعليه فكراهة قطع ذلك، وإن نبت بنفسه ولم يملك لأن فيه تفويت حق الميت .ويؤخذ من ذلك ومن الحديث ندب وضع ذلك للاتباع ويقاس عليه ما اعتيد فى زماننا من وضع أغصان الآس ونحوه، وصرح بذلك أيضا جماعة من الشافعية، وهذا أولى مما قال بعض المالكية من أن التخفيف عن القبرين إنما حصل ببركة يده الشريفة -صلى الله عليه وسلم -أو دعائه لهما فلا يقاس عليه غيره .وقد ذكر البخارى فى صحيحه أن بريدة بن الحصيب -رضى الله عنه -أوصى بأن يجعل فى قبره جريدتان، والله تعالى أعلم (رد المحتار، ج۲، ص ۲۴۵، كتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة، مطلب فى وضع الجريد ونحو الآس على القبور)

وأما إنكار الخطابى وقوله: " لا أصل له "ففيه بحث واضح، إذ هذا الحديث يصلح أن يكون أصلا له، ثم رأيت ابن حجر صرح به وقال قوله: " لا أصل له "ممنوع، بل هذا الحديث أصل أصيل له، ومن ثم أفتى بعض الأئمة من متأخرى أصحابنا بأن ما اعتيد من وضع الريحان والجريد سنة لهذا الحديث اهـ.(مرقاة المفاتيح، ج ۱ ص ۳۷۶، كتاب الطهارة، باب آداب الخلاء)

www.idaraghufran.org

اور شافعیہ وغیرہ کے نزدیک قبر پر ہری شاخ، یا تازہ قدرتی پھول ڈالنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ مستحب ہے۔ [1]

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ہے کہ:

حدیث شریف میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ دو قبروں کے پاس سے گزرے، اور ان دونوں قبر کی میت پر عذاب کیا جاتا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان دونوں میت پر عذاب کیا جاتا ہے، اس چیز کی وجہ سے کہ ان پر شاخ نہ تھی، پھر خرمے کے درخت کی ایک شاخ طلب فرمائی، اور اس کو درمیان سے شق فرمایا، اور آدھا آدھا دونوں قبروں پر رکھ کر فرمایا کہ:

"يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ مَا لَمْ يَيْبَسَا"

"یعنی تخفیف کیا جائے گا ان دونوں میت کا عذاب، جب تک یہ دو حصے شاخ کے خشک نہ ہوں گے"۔

اس حدیث کی مراد میں علماء میں باہم اختلاف ہے، بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ امر، وقت کی تعیین کے لیے وقوع میں آیا ہے کہ اس وقت تک عذاب میں تخفیف کی جائے گی، یعنی یہ حکم خاص ان ہی دونوں میت کے حق میں تھا، عام نہیں ہے۔

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ عام ہے، جب کوئی شخص ایسا کرے گا، تو جب تک

---

[1] ويسن وضع الجريد الأخضر على القبر وكذا الريحان ونحوه من الشىء الرطب، ولا يجوز للغير أخذه من على القبر قبل يبسه لأن صاحبه لم يعرض عنه إلا عند يبسه لزوال نفعه الذى كان فيه وقت رطوبته وهو الاستغفار، وأن يضع عند رأسه حجرا أو خشبة أو نحو ذلك لأنه -صلى الله عليه وسلم -وضع عند رأس عثمان بن مظعون صخرة وقال :أتعلم بها قبر أخى لأدفن إليه من مات من أهلى ويندب جمع أقارب الميت فى موضع واحد من المقبرة لأنه أسهل على الزائر، والدفن فى المقبرة أفضل منه بغيرها لينال الميت دعاء المارين والزائرين، ويكره المبيت بها لما فيها من الوحشة(تحفة الحبيب على شرح الخطيب، ج٢،ص ٣٠٠، كتاب الصلاة،فصل فى الجنازة)

قوله :(من الشىء الرطب) عمومه شامل لنحو عروق الجزر كورق الخس بالسين المهملة واللفت؛ لأنه يخفف عن الميت ببركة تسبيحه(حاشية البجيرمى على الخطيب، ج٢، ص ٣٠٠، كتاب الصلاة، فصل فى الجنازة)

www.idaraghufran.org

شاخ خشک نہ ہوگی، عذاب میں تخفیف ہوگی، اس واسطے کہ سبز شاخ تسبیح کرتی ہے، اور تسبیح کی مقاربت، تخفیفِ عذاب کا باعث ہوتی ہے، چنانچہ کانٹا اور گھاس وغیرہ جو قبر پر جم جائے، اگر وہ سبز ہو، یعنی تازہ ہو، تو اس کو وہاں سے نکالنا ممنوع ہے، اس واسطے کہ یہ چیزیں جب تک تر رہتی ہیں، تسبیح کرتی ہیں، اور اس تسبیح سے عذاب میں تخفیف ہوتی ہے، اور میت کو انس ہوتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خرمے کے درخت کی تازہ دو شاخیں قبر پر سرہانے کی جانب رکھ کر فرمایا کہ امید ہے کہ جب تک یہ دونوں شاخیں خشک نہ ہوں گی، ان کی تسبیح کی برکت سے، اس میت کے عذاب میں تخفیف رہے گی، اسی وجہ سے بعض علماء نے بہتر جانا کہ پھول قبر پر رکھا جائے، لیکن یہ بھی کہا ہے کہ اگر اس پھول کی قیمت بطور صدقہ کے دیویں، اور اس کا ثواب اس میت کو پہنچادیں، اس سے زیادہ بہتر ہوگا کہ پھول قبر پر رہیں، اور پھر وہ خشک ہوجاویں، اور ان کا نکال دینا مکروہ نہیں

(فتاویٰ عزیزی، ص۱۹۰، باب التصوف، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، طبع جدید: 1412 ہجری)

پس اگر کوئی قبر پر تازہ پھول، یا پھول کی تازہ پتیاں ڈالے، تو اس پر نکیر مناسب معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ یہ اجتہادی واختلافی مسئلہ ہے، جس پر نکیر مناسب نہیں ہوا کرتی۔ [1]

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 02، اکتوبر 2019ء - صفر المظفر 1441ھ)

---

[1] وأما وضعه صلى الله عليه وسلم الجريدتين على القبر فقال العلماء محمول على أنه صلى الله عليه وسلم سأل الشفاعة لهما فأجيبت شفاعته صلى الله عليه وسلم بالتخفيف عنهما إلى أن ييبسا وقد ذكر مسلم رحمه الله تعالى فى آخر الكتاب فى الحديث الطويل حديث جابر فى صاحبى القبرين فأجيبت شفاعتى أن يرفع ذلك عنهما ما دام القضيبان رطبان وقيل يحتمل أنه صلى الله عليه وسلم كان يدعو لهما تلك المدة وقيل لكونهما يسبحان ما داما رطبين وليس لليابس تسبيح وهذا مذهب كثيرين أو الأكثرين من المفسرين فى قوله تعالى وإن من شىء الا يسبح بحمده قالوا معناه وان من شىء حى ثم قالوا حياة كل شىء بحسبه فحياة الخشب مالم ييبس والحجر مالم يقطع وذهب المحققون من المفسرين وغيرهم إلى أنه على عمومه(شرح النووى علىٰ مسلم، ج۳ص ۲۰۱، ۲۰۲، كتاب الطهارة، باب الدليل على نجاسة البول ووجوب الاستبراء منه)

www.idaraghufran.org

(138)

علماء کے چندہ کرنے کا نقصان

مدرسہ اور دینی کام کے لیے علماء کو از خود چندہ کرنا، پسندیدہ عمل نہیں، خاص طور پر بعض اہلِ مدارس کی طرف سے جس طرح آج کل چندہ کیا جاتا ہے کہ مالداروں کے پاس جا کر اور ان کے سامنے ہاتھ اور کپڑے پھیلا کر، یہ علماء چندہ حاصل کرنے کی ذلت اٹھاتے ہیں، اس سے اہلِ علم کی بڑی ناقدری ہوتی ہے۔

جبکہ علماء کی عوام کی نظروں میں ناقدری بہت نقصان دہ ہے، جب علماء کا عوام کے دلوں میں احترام نہیں رہے گا، تو عوام نہ تو اپنی اولاد کو علمِ دین سکھلائیں گے، اور نہ ہی علماء کی بات کی ان کے دلوں میں قدر و قیمت رہے گی، جیسا کہ آج کل ہمارے معاشرہ میں حالت ہے، اور اس کا اہم سبب علماء کا عوام سے مذکورہ طریقے پر چندہ کرنا اور مانگنا ہے، جن میں بعض نام نہاد علماء کا طرزِ عمل تو بڑا ہی شرمناک ہے کہ وہ دوسرے کے پیچھے پڑ کر اس طرح چندہ مانگتے ہیں، جیسا کہ کوئی بھکاری ہو، اور اس طرزِ عمل کی وجہ سے عوام اور مالدار لوگ، ان سے دور بھاگنے اور چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ.

ہمیں تو اس چیز سے بھی بڑی شرم آتی ہے کہ مساجد میں نماز سے فارغ ہو کر قبلہ رُو ہو کر سب لوگ اللہ سے مانگ رہے، اور دعاء کر رہے ہوں، اور عین اس حالت میں عوام کی طرف رُخ کر کے ان سے چندہ مانگنا شروع کر دیا جائے، پھر جس عاجزی اور لجاجت کے ساتھ وہ عوام سے چندہ کی اپیل کرتے ہیں، اور پھر مسجد کے دروازہ پر جا کر کپڑا بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں، یہ سخت ذلت کی بات ہے، اگر اسی عاجزی کے انداز میں اللہ کے حضور تنہائی میں مانگیں، تو معلوم نہیں کہ اللہ، کتنا نوازے، مگر اس پر یقین و ایمان کی پختگی چاہیے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں کہ:

علماء کو تو کسی کام کے لیے چندہ بھی نہ کرنا چاہیے، اے علماء! اللہ کے لیے تم چندہ کرنا چھوڑ دو، تمہارے منہ سے تو چندہ کا لفظ اچھا لگتا ہی نہیں، بس تمہاری زبان سے یہ اچھا لگتا ہے:

" لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا "

"وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ "

میں تم سے اس تبلیغ پر مال نہیں مانگتا ہوں، اور نہ اس پر تم سے اجرت طلب کرتا ہوں، میری اجرت تو اللہ ربُّ العالمین ہی کے ذمہ ہے۔

اس چندہ کی بدولت لوگ، علماء سے بھاگنے لگے، ان کی صورت سے بھی ڈرنے لگے۔

چنانچہ ایک سب جج صاحب جن کا لباس مولویانہ ہوتا تھا، کسی نئی جگہ بدل کر گئے، اور محض خوش اخلاقی کے سبب کسی رئیس (ومالدار) سے ملنے گئے، تو وہ ان کو دیکھ کر گھر میں گھس گئے، بعد میں نوکر نے اطلاع دی کہ سب جج صاحب آپ سے ملنے کو آئے ہیں، تب وہ باہر آئے، اور کہا معاف فرمایئے گا، میں آپ کے لباس سے یہ سمجھا تھا کہ کوئی مولوی صاحب چندہ مانگنے آئے ہیں۔

واقعی آج کل کوئی مولوی کسی رئیس (یعنی مالدار) سے ملنے جاتا ہے، تو اس کو اول یہ خیال آتا ہے کہ شاید چندہ کا سوال ہوگا، اس لیے میں کہتا ہوں کہ علماء یہ کام ہرگز نہ کریں، بلکہ رؤساء وعوام خود چندہ کریں، اور مولویوں سے دین کا کام لیں۔

مگر آج کل تو علماء کی مثال ڈوم (یعنی گانے بجانے والے) کے ہاتھی جیسی ہورہی ہے کہ اکبر (بادشاہ) نے ایک ڈوم کو انعام میں ہاتھی دے دیا تھا، وہ بڑا گھبرایا کہ اس کا خرچ میں کہاں سے لاؤں گا، آخر ایک دن اکبر کی سواری نکلنے والی تھی، آپ

نے ہاتھی کے گلے میں ڈھول ڈال کر راستہ میں چھوڑ دیا، اکبر نے دیکھا کہ شاہی ہاتھی، گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے پھر رہا ہے، پوچھا، یہ کیا قصہ ہے؟ ڈوم کو بلایا گیا، کہ تم نے اس ہاتھی کے گلے میں ڈھول کیوں ڈالا ہے؟ کہا حضور! آپ نے مجھے ہاتھی تو دے دیا، اب میں اسے کھاتا پلاتا کہاں سے، میں نے اس سے کہا کہ بھائی میں تو گا بجا کر کھاتا ہوں، تو بھی گلے میں ڈھول ڈال کر گا بجا کر اپنا پیٹ بھر لے، اکبر (بادشاہ) ہنس پڑا، اور ڈوم کو اس کی امداد کے لیے بھی عطاء کیا۔

یہی حال آج کل مولویوں کا ہے کہ لوگوں نے ان کے گلے میں (چندہ کرنے کا) ڈھول ڈال دیا ہے کہ جاؤ گاؤ بجاؤ، اور روپیہ جمع کر کے خود ہی سب کام کرو۔

یادرکھو! ایک جماعت سے دو کام نہیں ہو سکتے، کام کا طریقہ یہی ہے کہ روپیہ تم خود جمع کرو، اور مولویوں سے صرف دین کا کام لو، بلکہ روپیہ جمع کر کے اپنے ہی پاس رکھو، علماء کو روپیہ دو بھی نہیں، کیونکہ آج کل بہت لوگ ایسے بھی ہیں، جو واقع میں مولوی نہیں تھے، مگر مولویوں میں جا گھسے تھے، انہوں نے مسلمانوں کے چندوں میں بہت خیانتیں کی ہیں، جس سے مولوی بدنام ہو گئے۔

اس لیے میری رائے یہ ہے کہ رؤسا اور مالدار لوگ چندہ کر کے اپنے ہی پاس رکھیں، مولویوں کو نہ دیں، کیونکہ اس سے علماء پر دھبہ آتا ہے، تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ آپ کے علماء بدنام ہوں، ہرگز نہیں، آپ کو تو چاہیے کہ اگر علماء چندہ کرنا بھی چاہیں، تو آپ ان کو خود روکیں کہ یہ کام آپ کے مناسب نہیں، یہ کام ہم خود کریں گے (خطباتِ حکیم الامت، ج ۲ ''علم وعمل'' صفحہ ۲۷۴، ۲۷۵، وعظ ''العلم والخشیۃ'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت، رمضان ۱۴۲۷ھ)

ایک اور مقام پر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

میں مولویوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ روپیہ کا نام زبان پر نہ لاویں، اور روپیہ مانگنے

سے قطعی احتراز (اور اجتناب) رکھیں، امراء، روپیہ خود دیں گے، اور علماء اس سے دین کی خدمت کریں گے، جس قدر روپیہ سے بیزاری کی جائے گی، اسی قدر روپیہ ہمارے لیے موجود ہوگا (خطباتِ حکیم الامت، ج ۳۰ ''خیر الاعمال'' صفحہ ۱۶۸، وعظ ''دعاء'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، ناشر: رجب ۱۴۳۰ھ)

حکیمُ الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے علماء کے لیے چندہ سے متعلق بڑی قیمتی بات فرمائی ہے، واقعی اب مالدار لوگ علماء کے حلیہ سے بھی گھبرانے لگے ہیں، اگر کوئی علماء کے حلیہ میں ان کے پاس کسی دوسرے کام سے بھی جائے، تو بھی یہی سمجھ کر اس سے گھبرا جاتے ہیں کہ کوئی چندہ لینے والا آ گیا ہے، ظاہر ہے کہ علماء سے اس قدر وحشت اور گھبراہٹ کہ ان کی صورت سے بھی بھاگنے لگیں، یہ بڑی ذلت اور رسوائی کی بات ہے۔

علماء کو چاہئے کہ وہ استغناء اختیار کریں، استغناء کے ساتھ جتنا کام خلوص سے ہو جائے، اس کو کریں، اور جتنے کام کے لیے ذلت ہو، اس کو ترک کر دیں، عزت اور استغناء کے ساتھ تھوڑا کام بھی بڑی اہمیت اور وقعت رکھتا ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

ملے خشک روٹی جو آزادہ کر — وہ ہے خوف وذلت کے حلوے سے بہتر

20 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 03، نومبر 2019ء - ربیع الاول 1441ھ)

---

(139)

''خصیتین'' کا مکروہ تحریمی، یا تنزیہی ہونا

بعض حنفیہ نے حلال ذبح شدہ جانور کی چھ چیزوں کے حرام، یا مکروہ تحریمی ہونے کو راجح قرار دیا ہے، جو کہ درجِ ذیل ہیں:

www.idaraghufran.org

(1)......خون (جس سے مراد بہتا خون ہے، اوراس کا حرام ہونا، قرآن مجید سے بھی ثابت ہے)(2)......نر جانور کی پیشاب گاہ (یعنی ذَکر)(3)......نر جانور کے خصیتین (یعنی کپورے)(4)...... مادہ جانور کی پیشاب گاہ (یعنی فَرج)(5)......نر و مادہ جانور کا مثانہ (یعنی پیشاب کی وہ تھیلی، جس میں پیشاب جمع رہتا ہے)(6)......غدود (یعنی جسم کے مختلف اعضاء میں پائی جانے والی گلٹی، یا گانٹھ)(7)...... پِتّہ (یعنی صفراوی خلط کا مقام، جوکہ جگر کے نیچے ایک چھوٹی تھیلی کا نام ہے، جس میں پِت جمع رہتی ہے) [1]

مندرجہ بالا اشیاء میں سے خون تو بالاتفاق حرام ہے، باقی چیزوں کے متعلق اختلاف ہے، بعض نے ان کو مکروہ تحریمی قرار دیا، اور بعض نے مکروہ تنزیہی قرار دیا۔

علامہ شامی وغیرہ نے ان اشیاء کے مکروہ تحریمی ہونے کو ترجیح دی ہے، اور بہت سے اردو فتاویٰ اور کتب میں بھی اسی کے مطابق حکم ذکر کیا گیا ہے، اوراسی قول کو شہرت بھی حاصل ہے، اور ہم نے بھی پہلے اپنی بعض کتب میں اسی ایک قول کے مطابق حکم تحریر کیا تھا۔ [2]

---

[1] (قوله من الشاة) ذكر الشاة اتفاقى لأن الحكم لا يختلف فى غيرها من المأكولات ط (قوله الحياء) هو الفرج من ذوات الخف والظلف والسباع ، وقد يقصر قاموس (قوله والغدة) بضم الغين المعجمة كل عقدة فى الجسد أطاف بها شحم ، وكل قطعة صلبة بين العصب ولا تكون فى البطن كما فى القاموس (قوله والدم المسفوح) أما الباقى فى العروق بعد الذبح فإنه لا يكره (ردالمحتار، ج٦ص ٧٤٩، كتاب الخنثى، مسائل شتى)

[2] (كره تحريما) وقيل تنزيها والأول أوجه (من الشاة سبع الحياء والخصية والغدة والمثانة والمرارة والدم المسفوح والذكر) للأثر الوارد فى كراهة ذلك وجمعها بعضهم فى بيت واحد فقال:

فقل ذكر والأنثيان مثانة كذاك دم ثم المرارة والغدد

وقال غيره:

إذا ما ذكيت شاة فكلها سوى سبع ففيهن الوبال

فحاء ثم خاء ثم غين ودال ثم ميمان وذال (الدر المختار)

(قوله كره تحريما) لما روى الأوزاعى عن واصل بن أبى جميلة عن مجاهد قال :كره رسول الله - صلى الله عليه وسلم -من الشاة الذكر والأنثيين والقبل والغدة والمرارة والمثانة والدم ، قال أبو حنيفة :الدم حرام وأكره الستة، وذلك لقوله عز وجل -(حرمت عليكم الميتة والدم) الآية فلما

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

لیکن اب مزید تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ بعض حنفیہ نے ان اشیاء کے مکروہ تنزیہی ہونے کو ترجیح دی ہے۔ ؎

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

تناوله النص قطع بتحريمه وكره ما سواه، لأنه مما تستخبثه الأنفس، وتكرهه وهذا المعنى سبب الكراهية -لقوله تعالى -(ويحرم عليهم الخبائث) -زيلعي.

وقال فى البدائع آخر كتاب الذبائح :وما روى عن مجاهد فالمراد منه كراهة التحريم بدليل أنه جمع بين الستة وبين الدم فى الكراهة والدم المسفوح محرم والمروى عن أبى حنيفة أنه قال :الدم حرام وأكره الستة فأطلق الحرام على الدم، وسمى ما سواه مكروها لأن الحرام المطلق ما ثبتت حرمته بدليل مقطوع به وهو المفسر من الكتاب قال الله تعالى -(أو دما مسفوحا)وانعقد الإجماع على حرمته، وأما حرمة ما سواه من الستة فما ثبت بدليل مقطوع به، بل بالاجتهاد أو بظاهر الكتاب المحتمل للتأويل أو الحديث، فلذا فصل فسمى الدم حراما وذا مكروها اهـ .أقول :وظاهر إطلاق المتون هو الكراهة (قوله وقيل تنزيها) قائله صاحب القنية فإنه ذكر أن الذكر أو الغدة لو طبخ فى المرقة لا تكره المرقة وكراهة هذه الأشياء كراهة تنزيه لا تحريم اهـ .واختار فى الوهبانية ما فى القنية وقال :إن فيه فائدتين إحداهما أن الكراهة تنزيهية، والأخرى أنه لا يكره أكل المرقة واللحم اهـ نقله عنه ابن الشحنة فى شرحه، وأقره (قوله والأول أوجه) لما قدمناه من استدلال الإمام بالآية وأيضا فكلام صاحب القنية لا يعارض ظاهر المتون وكلام البدائع (قوله من الشاة) ذكر الشاة اتفاقى لأن الحكم لا يختلف فى غيرها من المأكولات ط.

(قوله الحياء) هو الفرج من ذوات الخف والظلف والسباع، وقد يقصر قاموس (قوله والغدة) بضم الغين المعجمة كل عقدة فى الجسد أطاف بها شحم، وكل قطعة صلبة بين العصب ولا تكون فى البطن كما فى القاموس (قوله والدم المسفوح) أما الباقى فى العروق بعد الذبح فإنه لا يكره (قوله فى بيت) وقبله بيت آخر ذكره فى المنح وهو.

ويكره أجزاء من الشاة سبعة ...فخذها فقد أوضحتها لك بالعدد

(قوله فقل ذكر إلخ) كذا فى النسخ وعليه فالمعدود ستة والظاهر أن أصل البيت حيا ذكر إلخ (قوله وقال غيره) أى بطريق الرمز ومثله قولى:

إن الذى من المذكاة رمى ...يجمعه حروف فخذ مدغم (قوله إذا ما ذكيت) بالبناء للمجهول والتاء علامة التأنيث(ردالمحتار، ج٦ص ٧٤٩، ٧٥٠، كتاب الخنثىٰ، مسائل شتى)

؎ چنانچہ شیخ محمد کامل بن مصطفیٰ طرابلسی حنفی (المتوفیٰ: 1315ہجری) ’’الفتاویٰ الکاملیۃ‘‘ میں فرماتے ہیں:

سئلت عن أكل الانثيين من نحو الشاة ، ماحكمه؟

فالجواب: ان حكمه :الكراهة التنزيهية ، كالغدة ، والحيا، والذكر، والمرارة ، والمثانة ، فالستة حكمها: الكراهة التنزيهية فى الراجح، وقيل انها حرام، وقد نظم هذه الستة ابن وهبان بقوله:

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

نیز حنفیہ کے علاوہ بعض دیگر فقہائے کرام نے بھی ان اشیاء کو حرام، یا مکروہ تحریمی قرار نہیں دیا، بلکہ زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی، یا جائز قرار دیا ہے، جس کا ارتکاب، گناہ نہیں ہوتا۔ [1]

اس لیے مذکورہ تحقیق کے بعد اب راجح یہ معلوم ہوا کہ عوام الناس کو ان اشیاء کے کھانے پینے سے بچنے کی ترغیب دینے میں تو حرج نہیں، لیکن عوام کی طرف سے ان چیزوں کے استعمال کرنے پر نکیر، اور زیادہ سختی کرنا، یا قطعی حرام اشیاء جیسے استعمال کے حکم والا انداز اختیار کرنا، مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

محمد رضوان خان

21/صفر المظفر/1441ہجری۔ بمطابق 21/اکتوبر/2019ء بروز منگل

(ماہنامہ "التبلیغ" جلد 17 شمارہ 03، نومبر 2019ء - ربیع الاول 1441ھ)

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

وفی غدد والانثیین مثانة حیا ،ذکر ، ثم المرارة تدبر

کراهة تنزیه ،وقیل بحرمة لان دم المفسوح معها مقرر

والمثانة محل اجتماع البول فی الجوف ، والحیا اسم للفرج، والجمع احیية ، وقوله لان الدم المفسوح معها مقرر ، یعنی ان وجه الحرمة ذکر الدم معها فی المروی عن مجاهد انه قال کره رسول الله صلی الله علیه وسلم من الشاة ، فذکر السبعة ، والدم ، محرم بالقطعی ، والامام ابی حنیفة اطلق اسم الحرام علی الدم المفسوح،وسمی ما سواه مکروها ، کذا فی شرح المنظومة للشیخ حسن الشرنبلالی،والله تعالیٰ اعلم(الفتاویٰ الکاملیة، صفحة ۲۶۷، کتاب الحظر والاباحة ، مطبوعة: المکتبة الحقانیة، بشاور)

[1] قال ابن حبیب :ومما روی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه کان یستثقل أکله من الشاة من غیر تحریم الطحال والعروق والغدة والمرارة، والأنثیان والکلیتان والحما والمثانة وأذنا القلب فذلک عشرة.

وسأل عبد الله بن إبراهیم ابن الأیتانی فی خصیتی الشاة الخصی ترد إلی داخل ویربطان فیطل فعلهما أو یتغیر خلقهما هل یؤکل ذلک؟ وإذا طبخ ذلک فی قدر هل یؤکل؟ فقال لا بأس بذلک .

والذی قال الأیتانی من هذا صواب وهو بمنزلة الغدة والغرا یصل إلیها ویجدها فی لبن الأتن(النَّوادر والزِّیادات علی مَا فی المدَوَّنة من غیرها من الأُمهاتِ،لعبد الله بن عبد الرحمن النفزی، القیروانی، المالکی، ج۴،ص ۳۷۴، کتاب الذبائح، باب ما یجوز أکله من الحیوان وذکر لحوم الجلالة)

(140)

عوام کی سستی کی وجہ سے فقہی مسائل میں رعایت

عوام کی طرف سے دین میں سستی اور کاہلی کی وجہ سے فقہائے کرام نے اپنے سلسلہ کے علاوہ بعض دوسرے فقہائے کرام کے قول پر عمل کر لینے کو بھی گوارا کیا ہے، چنانچہ اگر عوام الناس سستی کا مظاہرہ کریں، اور طلوع ہوتے وقت ان کو فجر کی نماز پڑھنے سے منع کیا جائے، تو وہ بعد میں نماز نہ پڑھیں، تو ایسے لوگوں کو متعدد حنفیہ نے طلوع کے وقت نماز پڑھنے سے منع نہ کرنے کا حکم فرمایا ہے، تاکہ نماز کے بالکلیہ تارک ہونے کے بجائے بعض فقہائے کرام کے نزدیک نماز کو اداء کرنے والے شمار ہوں۔ [1]

اور یہ بات ظاہر ہے کہ اگر کوئی امام شافعی، یا کسی دوسرے مجتہد کے مسلک کے مطابق نماز اداء کر لے، تو وہ نماز اداء کرنے والا شمار ہوگا، اور آخرت میں اس سے نماز کے رکن کے ترک پر مؤاخذہ نہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عام مسلمانوں کے دین میں سستی اور طبیعتوں میں آزادی ہو، اور وہ ایک مسلک کی پابندی کر کے کسی مسئلے پر عمل نہ کریں، بلکہ اس کی پابندیوں کی وجہ سے عمل کو ترک ہی کر بیٹھیں، تو ان کو دوسرے فقہائے کرام کے مسلک کے مطابق عمل پیرا قرار دینا اہون ہے۔

اسی وجہ سے متعدد فقہائے کرام نے عوام کے لیے تقلیدِ شخصی کو واجب اور لازم نہیں کیا، جبکہ

---

[1] وفی القنية كسالى العوام إذا صلوا الفجر وقت الطلوع لا ينكر عليهم؛ لأنهم لو منعوا يتركونها أصلا ظاهرا ولو صلوها تجوز عند أصحاب الحديث والأداء الجائز عند البعض أولى من الترک أصلا (البحر الرائق، ج ا ص ۲۶۴، کتاب الصلاة، باب الاوقات المنهى عن الصلاة فيها)

ولا ننهى كسالى العوام عن صلاة الفجر وقت الطلوع لأنهم قد يتركونها بالمرة والصحة على قول مجتهد أولى من الترک (مراقى الفلاح شرح نور الايضاح، ص ۷۶، كتاب الصلاة، فصل فى الأوقات المكروهة)

www.idaraghufran.org

بعض نے تو مسلکِ اخف پر عمل کرنے کا جواز بھی بیان فرمایا ہے، حنفیہ میں علامہ ابنِ ہمام اور بہت سے دیگر حضرات اس کے پرزور حامی ہیں، اور انہوں نے ''**العامی لا مذھب لهٗ**'' کا اصول جابجا بیان فرمایا ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے بھی ''**ردالمحتار**'' میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔

جبکہ موجودہ دور کے بعض حضرات، عوام کی سستی اور آزادی کی بنیاد پر تقلیدِ شخصی کے وجوب کے قائل ہیں، ان دونوں قسم کے اقوال میں دلائل سے ترجیح دینے کی گنجائش پائی جاتی ہے، کیونکہ یہ ایک فقہی واجتہادی مسئلہ ہے۔

اور اس سلسلہ میں اتنی زیادہ سختی وتشدد مناسب نہیں کہ اگر عوام کسی ایک مسلک کے مطابق عمل کرنے کے لیے تیار نہ ہوں،، تو انہیں دوسرے مسلک کے مطابق عمل کی گنجائش نہ دی جائے، اور بالکلیہ عمل کا تارک رہنے کو گوارا کیا جائے، اس پر علماء کو توجہ دینے کی ضرورت ہے، کیونکہ بہت سے عوام کی حالت یہ ہے کہ ان کو جب کسی ایک مسلک کے مطابق پابندی کے ساتھ عمل کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، تو وہ اصل عمل سے ہی راہِ فرار اختیار کرلیتے ہیں، ایسے میں اگر ان کو دوسرے مسلک کے مطابق عمل کی گنجائش دی جائے، تو وہ بآسانی عمل کر کے اصل فرض اور واجب کی ادائیگی کرسکتے ہیں، اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے اصل حکم کو پورا کرنے کی اہمیت ''جو کہ شریعت کا اصل مطمحِ نظر ہے'' کسی خاص مسلک کی فروعی پابندیوں سے زیادہ اہم ہے۔

اس نکتے کی طرف موجودہ دور کے اہلِ علم واہلِ فقہ حضرات کو خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

22 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 04، دسمبر 2019ء - ربیع الآخر 1441ھ)

---

(141)

علمی اختلاف میں ایک بے اعتدالی

بندہ کو معلوم ہوا کہ فلاں عالم صاحب، جو بندہ سے قریبی اور دیرینہ تعلق رکھتے ہیں، وہ مختلف مجالس میں بندہ کے فقہی وتحقیقی کام پر اعتراضات وشبہات کرتے رہتے ہیں، پہلے تو بندہ کو اس بات کا یقین نہیں آیا، کیونکہ عام طور پر لوگ روایات کرنے میں غلطی کرتے ہیں، جس میں بعض علماء بھی مبتلا ہیں، لیکن جب مختلف مرتبہ اس قسم کی خبروں کا بندہ کو علم ہوا، تو بندہ نے صفائی کے لیے ان عالم صاحب کو براہِ راست جوابی خط تحریر کردیا، اور اس میں بندہ نے لکھا کہ مجھے مختلف ذرائع سے اس طرح کی باتیں معلوم ہوئی ہیں، اگر یہ روایات واقع کے مطابق ہیں، تو پھر پیٹھ پیچھے ذکر کرنے کے بجائے، بندکو براہِ راست آگاہ کردیا جائے، بندہ ان امور پر غور کرلے گا، اگر کوئی قابلِ اصلاح وقابلِ رجوع بات ہوئی، تو اصلاح ورجوع کرے گا، ورنہ نظرِ ثانی اور وضاحت کا موقع حاصل ہوجائے گا۔

حدیث ''المومن مرآۃ المومن'' کا تقاضا بھی یہی ہے، اور بندہ نے یہ بھی عرض کردیا کہ یہ بات بلاتکلف اس لیے تحریر کردی کہ جناب سے دیرینہ قلبی تعلق ہے، اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو، بندہ نے جوابی لفافہ بھی ساتھ منسلک کردیا۔

اب دیکھیے کہ ان کی طرف سے کیا جواب آتا ہے۔

الحمدللہ تعالیٰ، اللہ کے فضل وکرم اور اپنے مشائخ کی ہدایات کی برکت سے بندہ قابلِ رجوع محسوس ہونے والی بات کے لیے ہمہ دم تیار ہے، اور اس میں اپنی شان کے خلاف کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا، بشرطیکہ رجوع پر اطمینان ہوجائے، لیکن کسی دوسرے کا اطمینان بندہ کے لیے کافی نہیں، اس کا تعلق بندہ کے اطمینان سے ہے۔

بعض لوگوں کو اپنی رائے پر اطمینان ہوتا ہے، لیکن دوسرے کو اس رائے پر اطمینان نہیں ہوتا،

اس لیے وہ اپنے اطمینان کو دوسرے پر حجت سمجھ لیتے ہیں، جو کہ درست نہیں، ورنہ تو دوسرے کا اطمینان بھی ان کے اوپر حجت ہونا چاہئے، جس کے وہ قائل نہیں، پھر دوسرے کے لیے اس چیز کو کیوں پسند کرتے ہیں، جس کو وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔

مومن کی شان تو یہ ہے کہ وہ دوسرے کے لیے وہی چیز پسند کرے، جو اپنے لیے پسند کرے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ل

بندہ تو اسی طرزِ عمل کو پسند کرتا ہے، اور دین وفقہ کے کسی اجتہادی مسئلے میں جو رائے ''فیما بيني وبين الله'' صواب وراجح محسوس ہو، خواہ اول وہلہ میں خود سے تحقیق کرنے پر، یا کسی دوسرے کے آگاہ کرنے پر، اور خواہ دوسرے کی، یا اپنی سابق رائے اس کے موافق ہو، یا اس کے خلاف؟ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے، اسی کو اختیار کرتا ہے، اور اس طرزِ عمل کو ہی شریعت میں مطلوب ومحمود سمجھتا ہے، اور اس کو اپنی، یا کسی کی ذاتی اونچ نیچ کا مسئلہ نہیں بناتا۔

اللہ تعالیٰ بندہ کو اسی پر قائم رکھے۔ آمین۔

24 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 04، دسمبر 2019ء - ربیع الآخر 1441ھ)

---

(142)

علماء کے انبیاء کا وارث ہونے کی بنیاد

حدیث شریف میں عالم کی عابد پر ایسی فضیلت بتلائی گئی ہے، جیسی فضیلت چودھویں رات کے چاند کی تمام ستاروں پر ہوتی ہے، پھر اس حدیث میں اس کے بعد علماء کو انبیاء کا وارث

ل عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله – صلى الله عليه وسلم –: " يا أبا هريرة، كن ورعا تكن أعبد الناس، وكن قنعا تكن أشكر الناس، وأحب للناس ما تحب لنفسك تكن مؤمنا، وأحسن جوار من جاورك تكن مسلما، وأقل الضحك، فإن كثرة الضحك تميت القلب (سنن ابنِ ماجه، رقم الحديث ٤٢١٧)

قال شعيب الارنؤوط: حديث حسن (حاشية سنن ابنِ ماجه)

www.idaraghufran.org

قرار دیا گیا ہے، جس کی وضاحت کرتے ہوئے آگے حدیث میں فرمایا گیا کہ انبیاء دراہم و دنانیر اور سونے وچاندی کی میراث چھوڑ کر نہیں جاتے، بلکہ علم کو وراثت میں چھوڑ کر جاتے ہیں، پس جس نے انبیاء کے علم کو لیا، اس نے بہت بڑا حصہ میراث کا لیا۔ [1]

سونا اور چاندی چونکہ دنیا کے ہر مال ودولت کی اصل بنیاد ہے، اس لیے دراہم اور دنانیر کا ذکر کر کے دنیا کے ہر مادی مال و دولت کو اس میں شامل کرلیا گیا ہے، جس میں کرنسی، ڈالر، پاؤنڈ، کوٹھی، بنگلہ، سواری وغیرہ سب چیزیں شامل ہوگئیں، اوران چیزوں کے مقابلے میں انبیاء کی اصل وراثت، علم کو قرار دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس علم سے مراد، وہی علم ہے، جو اللہ کی طرف سے انبیائے کرام کو دیا جاتا ہے، جو کہ دین کا علم ہے، اور وہ انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کو وحی کے ذریعہ سے عطاء کیا جاتا ہے۔

پھر حدیث میں علم کا تو ذکر کیا گیا، لیکن عمل کا ذکر نہیں کیا گیا، جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس کے پاس انبیائے کرام کا علم ہے، وہ عالم ہے، اور وہ انبیاء کا وارث ہے، اس کے علم کی بہرحال قدر کرنی چاہئے کہ عظیم الشان ہستیوں کا وارث ہے۔

رہا عمل کا معاملہ، تو عمل دراصل اس علمِ میراث کی قدردانی ہے، پس جس کو انبیاء کا نفسِ علم

---

[1] عن كثير بن قيس، قال: كنت جالسا مع أبي الدرداء في مسجد دمشق، فجائه رجل، فقال: يا أبا الدرداء، إني جئتك من مدينة الرسول –صلى الله عليه وسلم– لحديث بلغني أنك تحدثه، عن رسول الله – صلى الله عليه وسلم –، ما جئت لحاجة. قال: فإني سمعت رسول الله –صلى الله عليه وسلم– يقول: " من سلك طريقا يطلب فيه علما سلك الله عز وجل به طريقا من طرق الجنة، وإن الملائكة لتضع أجنحتها رضا لطالب العلم، وإن العالم ليستغفر له من في السماوات ومن في الأرض والحيتان في جوف الماء، وإن فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر على سائر الكواكب، وإن العلماء ورثة الأنبياء، وإن الأنبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما، ورثوا العلم، فمن أخذه أخذ بحظ وافر (سنن ابی داود، رقم الحديث ۳۶۴۱، كتاب العلم، باب الحث على طلب العلم)

قال شعيب الارنؤوط: حسن بشواهده (حاشية سنن ابی داود)

www.idaraghufran.org

حاصل ہوگیا، اس کو انبیاء کی نفسِ میراث حاصل ہوگئی، اور جتنا علم حاصل ہوا، اسے اتنی ہی میراث حاصل ہوئی، جس طرح دنیا کے مال میں قریب اور دور کے رشتہ داروں کی حیثیت سے، کم، یا زیادہ میراث کی مقدار حاصل ہوتی ہے، پھر جس نے اس علم پر عمل کیا، اس نے اس وراثت والے مال کی قدر کی، اور جس نے اس پر عمل نہیں کیا، اس نے اس وراثت والے مال کی ناقدری کی، جس طرح مادی مال کا کوئی وارث، میراث کے مال کی قدر کرتا ہے، اس کو صحیح جگہ اور کارِ خیر میں استعمال کرتا ہے، اس کا غلط استعمال نہیں کرتا، اور کوئی دوسرا وارث، میراث کے مال کو صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا، اور اس کی قدر نہیں کرتا، اسی طرح نفسِ عالم اور عالم باعمل کی حیثیت ہے۔

جس کی تائید اسی حدیث کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے، جن میں عالم کی عابد پر عظیم فضیلت بیان کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ عبادت کا تعلق بھی عمل سے ہے، اور جس میں علم وعبادت دونوں جمع ہوں گی، اس کی حیثیت چاند اور ستاروں کے مجموعہ کی ہوگی، کہ یہ بڑی روشنی ہے، اور عبادت کی شکل میں مختلف اعمال، اس کے اردگرد ستاروں کی مانند ہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے کہ:

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلٰى أَدْنَاكُمْ (سنن الترمذی، رقم الحديث ۲۶۸۵) [1]

یعنی "عالم کی فضیلت، عبادت گزار پر ایسی ہے، جیسا کہ میری فضیلت، تمہارے ادنیٰ درجے کے شخص پر"

اس حدیث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کی فضیلت، عابد پر، ہونے کو اپنی مثال کے ساتھ بیان فرمایا، اس کی وجہ بھی وہی وراثتِ علم ہے، جس کا ذکر کیا گیا۔

---

[1] عن أبی أمامة الباهلی، قال: ذكر لرسول الله صلى الله عليه وسلم رجلان أحدهما عابد والآخر عالم، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فضل العالم على العابد كفضلی علی أدناكم (سنن الترمذی، رقم الحديث ۲۶۸۵)

www.idaraghufran.org

اسی طرح ایک اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

”مجھے علم کی فضیلت، عبادت سے زیادہ محبوب ہے“ [1]

اس طرح کی احادیث سے علم اور عالم کی فضیلت، عبادت اور عابد پر بالکل ظاہر و باہر ہے۔

اور ابتدائی حدیث کے آخر میں علم کے لینے کو ”بڑا حصہ“ بتلا کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ سونے اور چاندی وغیرہ جیسے دنیا کی مادی مال و دولت کی میراث، انبیاء کی میراث کے مقابلہ میں بہت چھوٹی، ادنیٰ اور حقیر چیز ہے، لہٰذا عظیم میراث کو حاصل کرنے کی فکر و اہتمام نہ کرنا اور غیر عظیم، بلکہ حقیر میراث کی فکر و اہتمام کرنا عقلمندی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ علمِ نبوی، دراصل میراثِ نبوی ہے، اسی علمِ نبوی کے حصول پر نبوی میراث کا دارومدار ہے، لہٰذا علمِ نبوی کو حاصل کرنے کا اہتمام اور جستجو کرنی چاہیے، جس کا اصل خزانہ اور جوہر، یا سرچشمہ ”قرآن وسنت“ میں ہے، اور باقی شرعی و دینی علوم کے چشمے اسی سے پھوٹے ہیں۔ اللہ فہمِ سلیم عطاء فرمائے۔ آمین۔ 25 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد 17 شمارہ 04، دسمبر 2019ء - ربیع الآخر 1441ھ)

---

(143)

اکابر پرستی، اور اس میں غلو

آج کل بعض حضرات، اکابر پرستی میں بڑا غلو اور تشدد کرتے ہیں، کسی فقہی مسئلہ میں اگر کوئی دوسرا قول دلائل کی رُو سے قوی اور راجح معلوم ہو، بلکہ اس دوسرے قول کی صریح حدیث بھی دلیل بن رہی ہو، تب بھی وہ حضرات اس قول کو اختیار کرنے کے لیے محض اس لیے آمادہ نہیں

---

[1] عن الحكم، عن مصعب بن سعد بن أبي وقاص، عن أبيه، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: فضل العلم أحب إلي من فضل العبادة، وخير دينكم الورع (مستدرك حاكم، رقم الحديث ٣١٤)

قال الذهبي في التلخيص: على شرطهما.

www.idaraghufran.org

ہوتے کہ وہ قول ان کے مخصوص اکابر کے قول کے موافق نہیں ہوتا، اور ایسی صورت میں ان کی طرف سے یہ جواب ہوتا ہے کہ یہ ہمارے اکابر کا قول نہیں۔

حالانکہ کسی قول کے محض اکابر کا قول ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاتباع نہیں ہوجاتا، بلکہ اگر دوسرے قول کے حاملین بھی اہلُ السنۃ والجماعۃ میں سے ہوں، اور فی نفسہٖ اکابر ہوں، تو ان کا قول بھی اکابر کا قول ہی کہلاتا ہے۔

دین اور فقہ میں تعصب اور تحزب کی گنجائش نہیں کہ دلائل کو نظر انداز کر کے محض اپنے مخصوص اکابر کے خلاف، یا موافق ہونے پر کسی قول کے قبول ورَد ہونے یا قوی وضعیف ہونے یا راجح، مرجوح ہونے کی بنیاد رکھی جائے، اور ایسی صورت میں اندیشہ ہے کہ یہ طرزِ عمل ''قالوا وجدنا آباء نا علی امۃ'' کا مصداق نہ بن جائے، یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے تقلید میں جمود اور تشدد کی مذمت میں مذکورہ آیت سے استدلال کیا ہے۔

اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر دلائل کی رُو سے اپنے مخصوص اکابر کے خلاف قول کر ترجیح دی جائے، تو یہ نہ تو اکابر کی شان میں گستاخی و بے ادبی میں داخل ہے، اور نہ ہی ان کی ناراضگی کا سبب ہے، بلکہ حق کی اتباع ہے، اور راجح ومرجوح اور افضل ومفضول قول کا فرق ہے، وہ بھی صرف اجتہادی نوعیت کا، جس میں جانبِ مخالف شخص، خطاء پر ہونے کے باوجود ایک اجر کا مستحق ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر خود ان اکابر کو اس صورتِ حال کا سامنا ہوتا، اور ان کو اپنی تحقیق میں کوئی دوسرا قول راجح محسوس ہوتا، تو وہ بھی اپنے نزدیک راجح قول کو اختیار کرتے، اور انہوں نے اپنے تئیں، جس قول کو اختیار کیا، وہ راجح سمجھنے کی بنیاد پر ہی کیا، لہٰذا راجح سمجھے جانے والے قول کی اتباع کرنا ہی درحقیقت اکابر کی اتباع ہے، جبکہ ہم اس کو ان کی مخالفت پر محمول کر کے بلاوجہ پریشان ہوتے پھرتے ہیں، یہ پریشانی دراصل ہماری اپنی اختیار کردہ ہے، اہلِ حق محقق اکابر نے اس طرح کی قیود اور شرائط لگا کر ہمارے لیے پریشانی کی بنیاد قائم نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ فہمِ صحیح عطاء فرمائے۔ آمین۔

www.idaraghufran.org

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حق کا ساتھ دینے کا حکم فرمایا ہے، خواہ وہ اپنی ذات کے خلاف ہو، یا اپنے آباء واجداد کے خلاف ہو، احادیث میں بھی اس کی تاکید آئی ہے۔

اور حق کبھی تو باطل کے مقابلہ میں ہوتا ہے، وہاں تو حق کا ساتھ دینے کا حکم واضح ہے، لیکن کبھی اختلاف، حق وباطل کے بجائے اجتہادی صواب وخطا کے درجہ کا ہوتا ہے، وہاں بھی ہر صاحبِ استعداد اور ذی فہم کو اجتہادی صواب کی اتباع کا حکم ہوتا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں اجتہادی خطاء کے قول کو باطل قرار دینے، یا اس کے ساتھ باطل جیسا سلوک اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔

اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے، تاکہ مختلف قسم کی غلط فہمیوں اور افراط وتفریط کے پہلوؤں سے بچا جاسکے۔ 27 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 05، جنوری 2020ء - جمادی الاولیٰ 1441ھ)

---

(144)

ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا

کئی احادیث میں کبر وعجب کی نیت سے مرد کو ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے کی ممانعت اور اس پر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں، اور کئی روایات میں کبر وعجب کی نیت کے بغیر بھی ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے کی ممانعت اور اس پر وعید بیان کی گئی ہے۔

جس کی وجہ سے اہلِ علم حضرات کا بھی اس بارے میں اختلاف ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کبر وعجب کے قصد وارادہ سے مرد کو ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا حرام اور سخت گناہ کا باعث ہے اور اس کے گناہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

اور اگر کوئی کبر وعجب کے قصد وارادہ کے بغیر لٹکائے، تو بعض اہلِ علم حضرات اس کو حرام قرار

نہیں دیتے، البتہ مکروہ، یا خلافِ سنت وغیرہ قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض اہلِ علم حضرات کے نزدیک یہ صورت بھی حرام اور گناہ میں داخل ہے، البتہ اِس صورت کا گناہ، اُس صورت کے مقابلہ میں کچھ کم ہے کہ جس صورت میں کبر وعجب کا قصد وارادہ ہوتا ہے، بلکہ ان میں سے بعض حضرات کا فرمانا یہ ہے کہ جب کبر وعجب کے قصد وارادہ سے یہ گناہ کیا جائے، تو دو گناہوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اور جب کبر وعجب کے قصد وارادہ کے بغیر کیا جائے، تو ایک گناہ ہوتا ہے، اور احتیاط بھی اسی میں ہے کہ کبر وعجب کا ارادہ ہو، یا نہ ہو، بہر حال مرد کو اس عمل سے بچنا ہی چاہئے۔

لیکن اس موقع پر یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ کبر وعجب کی نیت کے بغیر گناہ ہونے کا پہلو اجتہادی واختلافی ہے، جس میں دلائل کی رُو سے ایک پہلو کو ترجیح دینے میں تو حرج نہیں، لیکن دوسرے پہلو، یا دوسرے موقف پر بے جا نکیر کرنا مناسب نہیں، اس مسئلہ کی تفصیل بندہ کی کتاب ’’ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے کا حکم‘‘ کے جدید ایڈیشن میں بیان کر دی گئی ہے۔

اور اس کی وجہ یہ بنی کہ پہلے بندہ نے اس مسئلے کو صرف ایک پہلو کے اعتبار سے تحریر کیا تھا، بعد میں اس مسئلے پر دوسرا پہلو بھی سامنے آیا، جس کے بعد اس مسئلے میں دوسرے پہلو کو بھی شامل کر لیا گیا، اور اب یہ مسئلہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ مفصل ومدلل ہو کر شائع ہوا ہے، جس میں پہلے یکطرفہ سخت موقف میں لچک اور اس میں اعتدال کو ملحوظ رکھنے کا اظہار کیا گیا ہے۔

26 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 17 شمارہ 05، جنوری 2020ء - جمادی الاولیٰ 1441ھ)

---

(145)

مسئلہ حیات وممات

ہر انسان، مرنے کے بعد عالمِ برزخ میں پہنچ جاتا ہے، جہاں وہ زندہ ہوتا ہے، اور یہ برزخی زندگی کہلاتی ہے، جس کا ایک حیثیت سے تعلق عالمِ دنیا سے بھی ہوتا ہے، کیونکہ برزخ

www.idaraghufran.org

دراصل دنیا وآخرت کے درمیان آڑ اور حدّ فاصل ہے، البتہ عالمِ برزخ کا زیادہ تعلق عالمِ دنیا کے بجائے عالمِ آخرت کے ساتھ ہے، مردہ کے ساتھ اصل احوال عالمِ برزخ میں ہی حقیقی معنیٰ میں پیش آتے ہیں، اور اس دنیا میں رہنے والے انسانوں کے سامنے عموماً وہ احوال ظاہر اور محسوس نہیں ہوتے، الا ماشاء اللہ، البتہ انسان اور جن کے علاوہ دوسری مخلوقات کے سامنے، جتنا اللہ کو منظور ہوتا ہے، اس کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔

پھر عالمِ برزخ کا جو تعلق عالمِ دنیا کے ساتھ ہے، وہ کسی میت کے ساتھ ضعیف ہوتا ہے، اور کسی میت کے ساتھ قوی ہوتا ہے، یہ تعلق دراصل ہر شخص کے ایمان اور اعمال کی حیثیت اور اللہ کے حکم ومشیئت کے مطابق ہوتا ہے۔

انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی برزخی حیات سب انسانوں سے زیادہ قوی ہوتی ہے، اس لیے ان کا عالمِ دنیا سے تعلق بھی زیادہ قوی ہوتا ہے، اسی لیے ان کے اجسامِ عنصری گلتے سڑتے نہیں، اور ان کے کل جسمِ عنصری کے ساتھ روح کا تعلق قائم کیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اصل میں وہ عالمِ برزخ میں ہی ہوتے ہیں، اس تعلقِ قوی اور تعلقِ خاص کی وجہ سے اس مسئلہ کو حیاتِ انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا عنوان دیا جاتا ہے، جبکہ بعض حضرات ان کی برزخی زندگی کے پہلو پر زور دیتے ہوئے اس تعلقِ قوی، یا تعلقِ خاص کی نفی کرتے ہیں، اور اس طرح پھر اس مسئلہ میں طرفین سے شدت پیدا ہوتی ہے۔

برزخی زندگی اور بالخصوص انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی برزخی زندگی پر زیادہ بحث و تمحیص کرنے سے بعض اوقات نصوص کا انکار بھی لازم آجاتا ہے، جس کے لیے برزخی زندگی کی اصل حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے، جس کی اجمالی حقیقت پر بندہ نے روشنی ڈال دی ہے۔

اس مسئلے کا اصل تعلق چونکہ عالمِ دنیا کے علاوہ ایک دوسرے عالَم سے ہے، جس کو عالمِ برزخ کہا جاتا ہے، اس لیے اس عالمِ برزخ کی تمام کیفیات کو عالمِ دنیا کی کیفیات پر قیاس کرنا درست نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ احادیث میں موت کو نیند کی بہن قرار دیا گیا ہے، اور نیند اور اس حالت میں خواب کی شکل میں پیش آنے والے بہت سے احوال، ایسے ہوتے ہیں، جن کا عالمِ بیداری کے اندر تصور مشکل ہوتا ہے، مثلاً ایک انسان اپنے آپ کو بغیر کسی واسطہ کے ہواؤں میں اڑتے ہوئے دیکھتا ہے، اور بھی بہت سی ایسی حالتوں میں اپنے آپ کو اور دوسرے کو مبتلا دیکھتا ہے کہ جس کا حالتِ بیداری میں عملی طور پر تصور بھی نہیں ہو پاتا، اس لیے عالمِ برزخ کی تمام کیفیات کو عالمِ دنیا پر قیاس کرنا غلط فہمی کا باعث بنتا ہے، ایسے حالات میں عافیت اسی چیز میں ہے کہ جن چیزوں کا قرآن وسنت میں ذکر آ گیا، ان پر ایمان لایا جائے، اور جن چیزوں کی پوری کیفیت سمجھ نہ آسکے، ان میں زیادہ کھود کرید کرنے کے بجائے، ان کی اصل حقیقت پر ایمان لایا جائے، البتہ جو باتیں مستند احادیث وروایات سے ثابت نہیں، اور دیگر شرعی دلائل سے بھی ان کی تائید نہیں ہوتی، ان کی تصدیق کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ اعتدال کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور بے جا تشدد سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔ 26 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 05، جنوری 2020ء - جمادی الاولیٰ 1441ھ)

---

(146)

نمازی کے سامنے کتنے فاصلہ سے گزرنا جائز ہے؟

نماز پڑھنے والے کے سامنے اگر کوئی حائل اور سترہ نہ ہو، تو پھر بغیر مجبوری کے نمازی کے سامنے سے گزرنا منع ہے، بشرطیکہ اس کے سامنے قریب سے گزرے۔

اور اگر نمازی سے دور اور فاصلہ سے بغیر حائل کے گزرے، تو پھر جائز ہے، جس کی حد وانتہاء میں فقہائے کرام کی آراء میں کچھ اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

بعض حضرات کے نزدیک نمازی کے پیروں سے تین ذراع (یعنی ساڑھے چار فٹ) کی

جگہ چھوڑ کر آگے سے گزرنا جائز ہے، اور بعض حضرات کے نزدیک نمازی کے سجدہ والی جگہ سے ہٹ کر گزرنا، جائز ہے، خواہ مسجد بڑی ہو، یا چھوٹی، یا کوئی کھلی جگہ نماز پڑھ رہا ہو، اور حرج سے بچنے کے لئے اور دین میں یُسر کے زیادہ موافق یہی قول ہے، خصوصاً شہروں میں جہاں جگہ کی تنگی اور ہجوم کے زیادہ ہونے کے باعث گزرنے والوں کو دوسری جگہ میسر نہیں آتی، اسی طرح آج کل شہروں کے تنگ گھروں میں بھی، اسی طرح کی صورتِ حال پیش آتی ہے، ایسی صورتوں میں اس قول پر عمل کر لینا جائز ہے، اگرچہ اس سلسلہ میں اور بھی اقوال ہیں۔

یہ حکم اس وقت ہے، جبکہ نمازی کے سامنے سے گزرنے والا مجبور نہ ہو، اور اگر گزرنے والا مجبور ہو، مثلاً اسے ضروری کام سے کہیں جانا ہے، اور نمازی کے سامنے قریب کے علاوہ گزرنے کی کوئی اور جگہ میسر نہ ہو، تو ایسی صورت میں نمازی کے سامنے قریب سے گزرنے والا گناہ گار نہیں ہوتا، اور اگر کسی شخص نے راستہ میں نماز کی نیت باندھی ہوئی ہو، جو لوگوں کی گزرگاہ ہو، تو وہاں بھی گزرنے والا گناہ گار نہیں ہوتا، اور ایسی صورت میں گزرنے والے کا گناہ، نمازی کی ایسی جگہ نیت باندھنے والے کے سر پر ہوتا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں ایک طبقہ ہمیشہ اور ہر حال میں دور اور قریب سے نماز کے سامنے سے گزرنے کو گناہ اور سخت گناہ قرار دیتا ہے، یہ کم علمی اور کوتاہ نظری پر مبنی ہے۔

اس مسئلہ کی تفصیل بندہ نے اپنے ایک مستقل رسالہ میں ذکر کر دی ہے۔

27 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 05، جنوری 2020ء - جمادی الاولیٰ 1441ھ)

---

(147)

سماعِ موتیٰ

ایک مرتبہ میرا کسی جگہ بیان کرنے کے لیے جانا ہوا، بیان کے بعد بعض حضرات نے مختلف

www.idaraghufran.org

مسائل معلوم کیے، جب میں واپسی کے لیے روانہ ہونے لگا، تو ایک صاحب میری دائیں طرف کھڑے ہوگئے، اور دوسرے صاحب بائیں طرف کھڑے ہوگئے، اور دونوں بیک زبان ہوکر کہنے لگے کہ مُردے سنتے ہیں، یا نہیں، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ سوال کرنے والوں کے انداز سے معلوم ہوا کہ شاید اس مسئلہ میں ان دونوں حضرات کا اختلاف ہورہا ہے۔

میں نے کہا کہ نہ تو مُردے اس طرح سے سنتے ہیں، جس طرح سے آپ اور ہم ایک دوسرے کی بات کو سن رہے ہیں کہ میں جو بھی بات کر رہا ہوں، میری ہر ہر بات آپ کو سنائی دے رہی ہے، اور نہ ہی مردے اس طرح سے گونگے بہرے ہیں کہ کسی کی بھی آواز کو نہ سن سکتے ہوں۔ بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ مُردے سن بھی سکتے ہیں، اور نہیں بھی سن سکتے، یعنی بعض باتوں کو سن سکتے ہیں، اور بعض باتوں کو نہیں سن سکتے۔

اب رہا یہ کہ وہ کون سی باتوں کو سن سکتے ہیں، اور کون سی باتوں کو نہیں سن سکتے؟ تو اس کے متعلق ہمارے نزدیک سب سے مضبوط اور معتبر اصول یہ ہے کہ جن باتوں کو اللہ کسی مُردہ کو سنانا چاہے، وہ باتیں نہ صرف یہ کہ وہ سن سکتا ہے، بلکہ بالیقین سن لیتا ہے، اور جن باتوں کو اللہ سنانا نہ چاہے، ان باتوں کو وہ سننا بھی چاہے، تو نہیں سن سکتا، اب یہ اللہ اور مردہ ہی جانے کہ کون سی باتیں اللہ، کس مُردہ کو سنا رہا ہے، اور وہ اللہ کے حکم سے سن رہا ہے، اور کون سی باتیں اللہ اس کو نہیں سنا رہا، اور وہ اللہ کا حکم نہ ہونے کی وجہ سے سن نہیں رہا۔

اور اس طرح مُردہ کے سننے اور نہ سننے کے دونوں طرح کے دلائل جمع ہوجاتے ہیں، جن میں سننے کا ذکر ہے، وہ بھی حکمِ الٰہی کے ساتھ مقید ہیں، اور جن میں نہ سننے کا ذکر ہے، وہ بھی حکمِ الٰہی کے ساتھ مقید ہیں، دونوں طرح کے دلائل کو جمع کرکے حکم لگانا چاہیے، کسی ایک طرف کے دلائل کو لے کر بیٹھ جانا اور دوسری طرف کے دلائل کو نظر انداز کردینا، خرابی اور فتنہ وفساد اور اختلاف وانتشار کا سبب ہے۔

اور اگر ابھی بھی پوری تسلی نہ ہوئی ہو، تو موت کا انتظار کرنا چاہیے، جس کے بعد خود سے پتہ چلنا شروع ہوجائے گا کہ آپ کو کون سی باتیں بحکمِ الٰہی سنائی دے رہی ہیں، اور کون سی باتیں بحکمِ الٰہی سنائی نہیں دے رہی، جس کا کام اسی کو ساجھے، اور قبر کا حال مردہ ہی جانے۔

میری اس بات کو سن کر دونوں حضرات بڑے خوش ہوئے کہ آپ نے تو مسئلہ ہی حل کر دیا، اور جھگڑا ہی ختم کر دیا، ہم تو بہت عرصہ سے ایک دوسرے کے ساتھ لڑ جھگڑ رہے تھے، اور اس سلسلہ میں مختلف کتابیں اور مضامین پڑھ رہے تھے، مگر جھگڑا ختم نہیں ہو رہا تھا، اور ایک دوسرے کے خلاف تعصب اور تشدد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

میں نے کہا کہ اس سلسلہ میں زیادہ بحث ومباحثہ میں پڑنے سے نقصان ہوتا ہے، اصولی باتوں پر ایمان لا کر جس بات کی حقیقت اور پوری کیفیت سمجھ نہ آئے، اس کو اللہ کے حوالہ کرنا چاہئے، اور اپنے کام میں لگنا چاہئے، اگر بندہ کا عمل صحیح ہوا، تو مرنے کے بعد اچھی حالت ہوگی، خواہ کسی زندہ کی آواز سنائی دے، یا سنائی نہ دے، اور اگر عمل خراب ہوا، تو بری حالت ہوگی، خواہ زندہ کی آواز سنائی، یا نہ سنائی نہ دے۔

لیکن حیرت ہے کہ آج کل لوگ اپنی عملی زندگی کی حالت تو درست کرنے کی فکر کرتے نہیں، اور اگلی اور اپنے سے غیر متعلقہ چیزوں کے درپے ہوجاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس طرزِ عمل سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

27 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 05، جنوری 2020ء - جمادی الاولیٰ 1441ھ)

---

(148)

''فتحُ الباری'' شرح بخاری کی اہمیت

صحیح بخاری کی مختلف مطول ومفصل شروحات میں، جو امتیازی شان اور مقام علامہ ابنِ حجر

عسقلانی رحمہ اللہ کی ''فتح الباری'' کو حاصل ہوا، وہ کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہوسکا۔

بندہ نے مختلف احادیث کی شروحات میں علمِ حدیث کے اعتبار سے جو مفصل ومعقول اور مختصر و جامع تشریح ''فتح الباری'' میں ملاحظہ کی، وہ کسی اور شرح میں دستیاب نہیں ہوسکی، اس لیے بندہ کے دل میں اس شرح کی بڑی وقعت اور قدر ہے۔

اس کے ایک ایک جملہ میں بڑی دقیق اور مشکل ابحاث کو حل کیا گیا ہے، تاہم بعض ابحاث سے اختلاف، اس شرح کی مجموعی وامتیازی افادیت میں رکاوٹ کا باعث نہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہٗ، اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

''فتح الباری'' میں بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ آدمی بادی النظر میں گزر جاتا ہے کہ یہاں یہ بات کہی گئی ہوگی، لیکن جب کسی مسئلہ کی تحقیق وتنقید اور گہرائی میں جاتا ہے، اور حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ کا کلام دیکھتا ہے، تب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے، یوں دیکھتے جاؤ تو کچھ پتہ نہیں چلے گا، لیکن دسیوں صفحات کی ورق گردانی اور چھان بین کے بعد پتہ لگتا ہے کہ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کیا کام انجام دیا ہے (انعام الباری، ج ۱ص ۱۳۶، مشہور شروحِ بخاری کا تعارف، ناشر: مکتبۃ الحراء، کراچی)

حضرت مفتی صاحب موصوف نے جو بات فرمائی، اس کا بندہ نے بھی بارہا مشاہدہ کیا، اور اس کو اسی طرح سے پایا، علامہ ابنِ حجر رحمہ اللہ دراصل بہت سے ایسے ایسے تعارضات وشبہات چھوٹے چھوٹے جملوں میں حل فرمادیتے ہیں کہ جن کو حل کرنے کے لیے لمبی چوڑی تقریروں اور بحثوں کی ضرورت پیش آتی ہے، اور آج سینکڑوں سال گزرنے اور بہت سی شروحاتِ بخاری منظرِ عام پر آجانے کے بعد بھی ''فتح الباری'' کی ضرورت وافادیت اپنی جگہ محسوس ہوتی ہے۔

اس شرح میں بندہ نے دوسری شروحات کے مقابلہ میں فقہی مسائل میں راجح ومرجوح ہونے

کے سلسلہ میں بھی کافی حد تک اعتدال کو محسوس کیا ہے، اور مختلف فقہی و عملی مسائل میں بے جا تشدد کم ہی محسوس ہوا۔

جب کہ اس کے مقابلہ میں بعض دوسری شروحات میں اس طرح کا اعتدال کم نظر آیا۔

چنانچہ کئی دوسری عربی و اردو شروحات میں مصنف ومؤلف، یا مقرر کا زیادہ زور، اپنے مسلک کی فقہی ابحاث کو صحیح اور مضبوط ثابت کرنے اور دوسرے مسلک کی فقہی ابحاث کو غلط اور کمزور ثابت کرنے اور بعض بزرگوں کے بقول ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ کو حنفی وغیرہ بنانے'' پر ہوتا ہے، اور بسا اوقات، اس طرح کا انداز ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے دوسرے مسلک کے موقف کی تحقیر اور اس پر نکیر، بلکہ احادیث کی بے جا تاویل اور اس سے بڑھ کر تردید کا ذہن بن جاتا ہے، اور پھر اگر قاری وسامع کا فقہی وعلمی ظرف تنگ ہو، اور اوپر سے وہ تعصب وتحزب کا بھی شکار ہو، تو اس کا طرزِ عمل ''کریلا اور نیم چڑھا'' کا مصداق اختیار کر لیتا ہے، اور اس طرح فقہی واجتہادی مسائل میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، اور کئی مفاسد ومنکرات کا ارتکاب لازم آتا ہے۔

مثلاً اگر کوئی اس مسلک کی طرف منتسب عالمِ دین تحقیق کے نتیجہ میں دوسرے مسلک کے موقف کو دلائل کی رو سے ترجیح دے، تو اس پر طرح طرح کے الزامات عائد کرنا شروع کر دیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس کو اکابر کا گستاخ وغیرہ بھی کہا جانے لگتا ہے۔

آج کل بہت سے مدارسِ دینیہ کے فضلاء کی یہی حالت ہے۔

اللہ تعالیٰ اعتدال کو اختیار کرنے کی توفیق عطاء فرمائے اور سلف علمائے محققین اور فقہائے مجتہدین کو جزائے خیر عطاء فرمائے، اور ان کے کام کی تعصب سے بالاتر ہو کر قدر دانی اور ان کے معتدل وغیر متعصب طرزِ عمل کو اختیار کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 06، فروری 2020ء - جمادی الاخریٰ 1441ھ)

www.idaraghufran.org

(149)

جذباتی علماء کا عوام میں غم، غصہ و مایوسی پیدا کرنا

آج کل ہمارے بعض مقتداء و علماء حضرات نے عوام میں غم وغصہ پیدا کرنے اور جوش ابھارنے کو بڑا کمال سمجھ لیا ہے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے یہاں رمضان المبارک میں تراویح کی نماز کے بعد صبر وتحمل کی اہمیت اور غصہ کے بے جا استعمال کی مذمت پر بیان کیا، بیان کے بعد ایک نوجوان نے کہا کہ آپ نے تو ہمارا سارا جوش ہی ٹھنڈا کر دیا، اور سینہ میں لگی ہوئی آگ کو بجھا دیا، میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگے کہ میں کل فلاں مولوی صاحب کے بیان میں شریک ہوا تھا، انہوں نے معاشرہ میں پیدا ہونے والی برائیوں اور بے حیائیوں پر اتنا جوش دلایا اور اتنا غصہ بھڑکایا کہ میرا دل چاہنے لگا کہ میں بازار میں بے پردہ پھرنے والی عورتوں میں گھس کر خود کش حملہ کر دوں، لیکن آپ کے بیان سے یہ جوش ٹھنڈا ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ انسان کو جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا چاہئے، اور صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکمت وبصیرت اور موعظتِ حسنۃ کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کرنا چاہئے۔

میں نے اس نوجوان کی گفتگو سن کر کہا کہ ہمارا تعلق فائر بریگیڈ (Fire Brigade) کے ادارہ سے ہے، اور اس ادارہ کا کام لگی ہوئی آگ کو بجھانا ہے، آگ لگانا نہیں ہے، اس لیے ہم نے آپ کے سینہ میں لگی ہوئی آگ کو بجھا دیا، یہ سن کر وہ ہنس پڑے اور بڑے خوش ہوئے۔

واقعی بعض مقتداء حضرات کا طرزِ عمل اسی نوعیت کا ہے کہ وہ عوام کی اصلاح کرنے کے بجائے ان میں بے جا غصہ، بے صبری، رنج وغم، حزن اور مایوسی پیدا کرتے ہیں، جس کے نتیجہ میں غیر تربیت یافتہ عوام کئی قسم کی آزمائشوں اور فتنوں میں مبتلا ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں،

یا پھر زندگی بھر کے لیے شرمندگی والے عمل کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔آمین۔28ربیع الاول 1440ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد17 شمارہ06،فروری2020ء - جمادی الاخریٰ 1441ھ)

---

(150)

فروع میں مخالف امام کی اقتداء کا حکم

بہت سے حنفی مشائخ نے اس کو راجح قرار دیا ہے کہ اگر نماز پڑھانے والا امام اہل السنۃ و الجماعۃ کے کسی ایسے امام ومجتہد کے موقف پر عمل پیرا ہو،جس کی وجہ سے مقتدی کے مسلک اور گمان کے مطابق نماز درست نہیں ہوتی، اور ایسے عمل کا ارتکاب امام کی طرف سے ظاہر ہوجائے،تو مقتدی کی نماز درست نہیں ہوتی۔

مثلاً امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک بہتا ہوا خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا،اب اگر کوئی امام شافعی ،یا امام مالک کے موقف کے مطابق نماز پڑھائے، اور وضو کرنے کے بعد اس کے جسم سے خون نکل گیا ہو،جس کا حنفی مقتدی کو علم بھی ہوگیا ہو،تو حنفی مقتدی کی نماز درست نہیں ہوگی۔

اور بندہ کا رجحان بھی شروع میں اسی طرف تھا،لیکن بعد میں دلائل پر نظرِ ثانی کرنے کے نتیجہ میں بندہ کا اس قول کی طرف رجحان نہیں رہا، بلکہ مجتہد فیہا مسائل میں امام کے گمان کے مطابق نماز درست ہونے کی صورت میں اس کے مقتدیوں کی نماز درست ہونے کی طرف رجحان ہوگیا،جس کی رُو سے مذکورہ صورت میں نماز درست قرار پاتی ہے۔

بندہ نے اس موضوع پر اپنے ایک مستقل رسالہ ''غیر حنفی کی اقتداء میں نماز کا حکم'' کے جدید ایڈیشن میں اس کی وضاحت ورجوع شائع کردیا ہے، یہ رسالہ بحمد اللہ تعالیٰ علمی وتحقیقی رسائل کی جلد کا حصہ بن کر شائع ہو چکا ہے۔28ربیع الاول 1440ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد17 شمارہ06،فروری2020ء - جمادی الاخریٰ 1441ھ)

---

(151)

جلسوں کے متعلق سنتِ نبوی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے والے کے لیے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، دین کی بات سنانے کے لیے بڑے بڑے مجامع اور جلسوں کا اہتمام نہیں فرماتے تھے، البتہ عموماً عباداتِ مقصودہ کے لیے بڑے اجتماعات کا اہتمام ہوتا تھا، اور اسی ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ اور وعظ بھی فرمادیا کرتے تھے، صرف وعظ اور خطبہ کے لیے لوگوں کے بڑے بڑے اجتماعات کا اہتمام نہیں فرماتے تھے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہفتہ وار، یا سالانہ یا کسی اور موقع پر جو بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوئے، ان میں لوگوں کی اصل حاضری عباداتِ مقصودہ کے لیے ہوا کرتی تھی۔

مثلاً ہفتہ بھر میں جمعہ کے دن ایک بڑا اجتماع ہوتا، جس کا اصل مقصود نمازِ جمعہ کی ادائیگی ہوتا تھا، پھر اس کے ساتھ خطبہ بھی ہوتا تھا، اسی طرح سالانہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر نمازِ عید کے لیے اجتماع ہوتا تھا، پھر اس ضمن میں خطبہ بھی ہوجاتا تھا، اسی طرح نمازِ استسقاء وغیرہ کے موقع پر توبہ ورجوع الی اللہ، اور بارش کے حصول کی دعاء کرنے اور نماز پڑھنے کے لیے اجتماع ہوتا، تو اس کے ضمن میں خطبہ بھی ہوتا تھا، اسی طرح حج کے موقع پر مکہ مکرمہ، منیٰ اور عرفات وغیرہ میں بھی بڑے اجتماعات کا اصل مقصد مناسکِ حج کی ادائیگی تھا، پھر اس کے ضمن میں خطبہ بھی دیا گیا۔

اس کے علاوہ جب مسجد میں نماز کے لیے لوگ حاضر ہوتے، اس ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم حاضرین کو شرعی احکامات وایمانیات وغیرہ کی تدریجاً اور مختصراً تعلیم دے دیا کرتے تھے، اور کبھی کسی خاص حکم کے بیان کی ضرورت ہوتی، تو بروقت بلا تکلف لوگوں کو جمع کرلیا جاتا۔

ورنہ عام طور پر صحابۂ کرام کے مخصوص افراد اور ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر مختلف احادیث بیان کی جاتی تھیں۔

موجودہ دور کے مروجہ جلسے جلوسوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اہتمام نہیں تھا، جس میں بہت سی حکمتیں تھیں۔

مثلاً جب بڑا اجتماع ہوتا ہے، تو اس میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور اس وقت ہر بات کھل کر بیان کرنا، مخاطبین اور حاضرین کے شایانِ شان نہیں ہوتا، بڑے مجمع میں عام وخاص لوگوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جن میں بات پوری طرح سمجھنے اور اسی طرح آگے پہنچانے کی صلاحیت نہیں ہوتی، باوجودیکہ وہ عادل اور متقی وپرہیزگار ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے اکثر احادیث مخصوص اور مشہور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی سندوں سے ہی مروی ہیں، دیگر غیر معروف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے کم ہی احادیث مروی ہیں۔

اور شریعت کا حکم یہ ہے کہ لوگوں کی عقل وفہم کے مطابق کلام کیا جائے، کیونکہ اس کی خلاف ورزی میں خود مخاطب اور اس کے واسطہ سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہوتا ہے۔

نیز جب جلسہ برائے جلسہ مقصود ہو جائے، تو اس میں اعتدال وشرائط کا لحاظ کم ہوتا ہے، حاضرین ومخاطبین کو خوش کرنا اور دین وشریعت کے مقابلہ میں ان کی رعایت کا پہلو غالب آنے لگتا ہے، جیسا کہ آج کل کے بہت سے مروجہ جلسے جلوسوں کا معاملہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دینی تعلیم وتعلم اور تبلیغ وتدریس کے لیے بڑے بڑے اجتماعات کا منعقد کرنا گناہ ہے، بلکہ اصل مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور اس میں چھپی ہوئی بعض حکمتوں کو بتلانا ہے، اور یہ بھی کہ اگر کوئی مقتداء اور عالمِ دین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے مطابق عمل پر اکتفاء کرے، اور اس میں مصلحت سمجھے، تو یہ بھی سنت کے موافق ہے۔

اور اس طرزِ عمل کو فضول سمجھنا اور اس طرح کی باتیں کرنا کہ اجتماع بہت چھوٹا اور مختصر ہوتا ہے اور باتیں بڑی اہم اور قیمتی ہوتی ہیں، مجمع بڑا ہونا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کی باتیں کرنا، سنتِ مبارکہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل اور حقیقی سیرتِ طیبہ سے پوری طرح واقف نہ ہونے پر مبنی ہے۔ 28 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 06، فروری 2020ء - جمادی الاخریٰ 1441ھ)

(152)

عید کے دن قبرستان جانا

آج کل بعض لوگ عید کے دن قبرستان جانے کا بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں غیر معمولی تکلف اور غلو کرتے ہیں، اور مختلف بدعات و منکرات کا ارتکاب کرتے ہیں، مثلاً قبروں پر چادریں چڑھاتے ہیں، مختلف قسم کے غلہ جات قبروں پر ڈالتے ہیں، وہاں جا کر اگربتیاں اور مصنوعی پھول پتیاں ڈالتے ہیں، جس کی وجہ سے اہلِ علم حضرات نے ان چیزوں پر نکیر کی ہے، اور ان سے بچنے کی تلقین کی ہے، اور عید کے دن، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے قبرستان جانے کا ثبوت نہ ہونے کی بناء پر اس کا انکار کیا ہے۔

ہم نے بھی اپنے بعض مضامین میں اسی کے مطابق حکم تحریر کیا ہے، اور عیدین کے دنوں میں مذکورہ چیزوں کے ساتھ ساتھ قبرستان جانے کو بھی عدمِ ثبوت کی وجہ سے بدعت قرار دیا ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ فی نفسہٖ عید کے دن قبرستان جانے کو بعض حنفی و غیر حنفی فقہائے کرام نے جمعہ کے دن پر قیاس کرتے ہوئے مستحب قرار دیا ہے کہ خوشی کا دن ہوتا ہے، کہیں لوگ خوشی کی غفلت میں مبتلا ہو کر موت کو نہ بھول جائیں، خوشی میں اعتدال رکھیں، اس لیے اب عید کے دن قبرستان جانے کو فی نفسہٖ بدعت قرار دینے کی طرف تو رجحان نہ رہا، الّا یہ کہ کوئی عید کے دن کی خاص سنت، یا اس کو لازم و ضروری سمجھے، اور جو کوئی عید کے دن قبرستان نہ جائے، تو اس پر نکیر و ملامت کرے، جیسا کہ عرض کیا گیا کہ آج کل اس سلسلہ میں بہت سے لوگ غلو کرتے ہیں، اور اس کا بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کوئی اس دن قبرستان نہ جائے، تو اس پر نکیر کرتے ہیں، اس لیے اس اہتمام اور غلو کی وجہ سے تو منع کیا ہی جانا چاہئے، ورنہ اگر کوئی بدعات و منکرات اور غلو سے بچتے ہوئے عید کے دن قبرستان جائے، تو بعض فقہائے کرام کے نزدیک اس میں حرج نہیں، بلکہ مستحب ہے۔

بہر حال تحقیقی بات یہی ثابت ہوئی کہ اگر عید کے دن کوئی شخص قبرستان جائے، اور کسی قسم کی بدعت اور غلو ومنکرات کا ارتکاب نہ کرے، اور اس کو فرض، واجب اور بذاتِ خود سنت بھی نہ سمجھے، تو اس کو ممنوع قرار نہیں دیا جائے گا، اور اس پر نکیر نہیں کی جائے گی۔

چنانچہ ''الفتاویٰ الھندیۃ'' میں ''الغرائب'' کے حوالے سے عیدین کے دنوں میں، زیارتِ قبور کا مستحب ہونا نقل کیا گیا ہے۔ [1]

اور ''الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ'' میں بھی عید کے دن زیارتِ قبور کو مستحب قرار دیا گیا ہے۔ [2]

اور علامہ ابنِ حاج مالکی نے ''المدخل'' میں فرمایا کہ:

''عید کے دن اپنے اعزہ واقرباء کی قبروں کی زیارت کرنا، نیکی کے باب اور ان سے محبت میں اضافے کے باب سے تعلق رکھتا ہے۔

لیکن آج کل زیارتِ قبور میں جو بدعات اور محرمات کا ارتکاب عام دنوں میں ہوتا ہے، ان کی اس دن میں کیونکر اجازت ہوسکتی ہے، مثلاً عورتوں کا بن سنور کر اور زیب وزینت اختیار کر کے اور زیور پہن کر قبرستان میں جانا اور وہاں جا کر چادریں، اور مصنوعی پھول پتیاں چڑھانا، اگر بتیاں لگانا، غلہ جات قبر پر بکھیرنا وغیرہ وغیرہ، ظاہر ہے کہ اگر کوئی اس قسم کے منکرات کا ارتکاب کرے، تو پھر عید

---

[1] وأفضل أيام الزيارة أربعة يوم الاثنين والخميس والجمعة والسبت والزيارة يوم الجمعة بعد الصلاة حسن ويوم السبت إلى طلوع الشمس ويوم الخميس فى أول النهار وقيل فى آخر النهار وكذا فى الليالى المتبركة لا سيما ليلة براء ة وكذلك فى الأزمنة المتبركة كعشر ذى الحجة والعيدين وعاشوراء وسائر المواسم كذا فى الغرائب (الفتاوىٰ الهندية، ج۵، ص ۳۵۰، كتاب الكراهية، الباب السادس عشر)

[2] زيارة المقابر فى العيد:

تستحب فى العيد زيارة القبور والسلام على أهلها والدعاء لهم، لحديث: نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها وفى رواية "فإنها تذكر الآخرة وحديث أبى هريرة مرفوعا: زوروا القبور فإنها تذكر الموت .وكره زيارتها ابن سيرين وإبراهيم النخعى والشعبى (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ۳۱، ص ۱۱۸، مادة "عيد" حرف العين)

www.idaraghufran.org

کے دن زیارتِ قبور سے منع کیا جائے گا“۔انتہٰی۔ [1]

وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ

26/محرم الحرام/1441ھ 26/ستمبر/2019 بروز جمعرات

(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد17 شمارہ07، مارچ2020ء - رجب المرجب1441ھ)

(153)

محقق علماء، امام وخطیب اور مدرس اہلِ علم

یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ ”لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ“ کہ ”ہر فن کے رجال ہوتے ہیں“ یہ اصول علم وتحقیق کے میدان میں بھی کارفرما ہے، اور آج کل اہلِ علم کہلائے جانے والے حضرات کا ایک بڑا طبقہ تو وہ ہے کہ جس نے درسِ نظامی بھی نہیں کیا، یا اس نے کسی طرح سے درسِ نظامی کرلیا، لیکن تعلیم وتعلم میں مستقل طور پر اور باقاعدہ مشغولی اور علمِ دین سے باضابطہ وابستگی نہیں رہی، خواہ وہ کوئی تاجر ہو، یا ملازم، یا پھر کسی مسجد کا امام وخطیب ہو۔

جبکہ ایک طبقہ دینی مدارس میں درس وتدریس کرنے والے حضرات کا وہ ہے کہ جس کی محنت و جدوجہد کا محور درسِ نظامی اور اس سے متعلقہ کتابوں اور ان کی شروحات تک محدود ہے، اور

[1] عوض (أى الشيطان)لهم عن سرعة الأوبة زيارة القبور قبل أن يرجعوا إلى أهليهم يوم العيد وزين لهم ذلك وأراهم أن زيارة الأقارب من الموتى فى ذلك اليوم من باب البر وزيادة الود لهم وأنه من قوة التفجع عليهم، إذ فقدهم فى مثل هذا العيد، وفى زيارة القبور فى غير هذا اليوم من البدع، والمحرمات ما تقدم ذكره فى زيارة القبور فكيف به فى هذا اليوم الذى فيه النساء يلبسن ويتحلين ابتداء، ويتجملن فيه بغاية الزينة مع عدم الخروج فكيف بهن فى الخروج فى هذا اليوم فتراهن يوم العيد على القبور متكشفات قد خلعن جلباب الحياء عنهن، فبدل لهم موضع السنة محرما ومكروها، فالمكروه فى كونه أخرهم عن سرعة الأوبة إلى الأهل؛ لأنها السنة كما تقدم، والمحرم ما يشاهد الزائر من أحوالهن فى المقابر على الصفة المذمومة المتقدمة(المدخل لابن الحاج، ج ۱ ص ۲۸۶ ،فصل من العوائد الرديئة ما يفعله النساء فى المواسم،المرتبة الأولى المواسم الشرعية وهى ثلاثة،الموسم الاول عيد الاضحى)

ان میں بعض مشاہیر مدرسین اور بعض شیخ الحدیث حضرات بھی داخل ہیں، جو ہمارے نزدیک بڑے قابلِ قدر اور قابلِ احترام ہیں، لیکن علمِ دین میں تحقیق کا دائرہ، درسِ نظامی وغیرہ کی درس وتدریس اور اس کی مہارت تک محدود نہیں، بلکہ اس کا دائرہ بڑا وسیع ہے، اور بہت سے علمی وتحقیقی مسائل وہ ہیں، جن کے لیے خالص درسِ نظامی اور اس سے متعلقہ شروح اور ان میں مہارت، نا کافی ہے، نیز تحقیقی وفقہی ذوق کا ہر مدرسہ کے مدرس عالم کو حاصل ہونا بھی ضروری نہیں، خواہ وہ اپنی جگہ بڑے سے بڑا اور مشہور شیخ الحدیث کیوں نہ ہو، اور یہ کسی عالم کی شان کے گھٹنے، یا کم ہونے کو مستلزم نہیں، کیونکہ مسلمہ اصول ہے کہ ''لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ''۔

لہٰذا اگر درسِ نظامی اور اس سے متعلقہ شروح میں کوئی مسئلہ کسی خاص جہت سے مذکور ہے، لیکن کسی تحقیق، یا ضرورت، یا مخصوص حالت کی وجہ سے اس کے برخلاف قول کو ترجیح دی جائے، تو خالص درسِ نظامی سے وابستہ اصحابِ علم کو اس کی تردید کے درپے ہونا، بطورِ خاص جب تک دوسرے کے تفصیلی موقف کو بھی ملاحظہ نہ کیا جائے، اس طرزِ عمل کو ہم راجح وصواب نہیں سمجھتے۔

یہ بات اس لیے ذکر کردی گئی کہ آج کل جب کسی عالمِ دین کی طرف سے کوئی ایسی تحقیق سامنے آتی ہے، جو درسِ نظامی سے فارغ شدہ، یا درسِ نظامی کے ماہر علمائے کرام کی درسی کتب اور ان کی شروحات کے خلاف ہوتی ہے، تو یہ حضرات اس پر طرح طرح سے نکیر اور اس کی تردید کرنے کے درپے ہوجاتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان کو ایسا کرنا، حق بجانب بھی ہے، یا نہیں؟ 29 ربیع الاول 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 07، مارچ 2020ء - رجب المرجب 1441ھ)

---

(154)

ضعفِ حدیث کو بیان کرنے کی ضرورت وافادیت

آج کل ہمارے یہاں تحریرات اور تقریرات میں ضعیف، بلکہ شدید ضعیف اور اس سے بڑھ

کر موضوع و منگھڑت احادیث بیان کرنے کا بہت رواج ہے، اور احادیث کی اسناد کی تحقیق کی طرف خاطر وخواہ توجہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کے مستند و معتبر سمجھے جانے والے متعدد فقہاء و علماء کی تحریرات اور تقریرات بھی اس طرح کی احادیث وروایات سے محفوظ نہیں ہیں، اور پھر اس کے نتیجہ میں بہت سی ضعیف، شدید ضعیف اور موضوع احادیث، مسلمانوں کے معاشرہ میں پھیل گئی ہیں، اور بعض لوگوں کا ان پر عقیدہ بھی اتنا پختہ ہوگیا ہے کہ اگر ان احادیث کی اسناد کی اصل حقیقت کو ظاہر کیا جائے، تو اس پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے، اور اس کی اصل سند کی حقیقت ظاہر کرنے اور بتلانے والے پر طرح طرح کے الزامات قائم کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس کو احادیث کا دشمن، اکابر کا گستاخ اور نہ جانے کیا کچھ کہا جاتا ہے۔

ردِّعمل کی یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک اور پریشان کن ہے، جس کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ کسی پر اس طرح کے الزامات قائم کرنے سے پہلے اس حقیقت کا جائزہ لینا، انتہائی ضروری ہے کہ دوسرے نے جو بات کی، وہ کیا اس نے اپنی طرف سے بنائی ہے، یا صرف بتائی ہے، اور بنانے اور بتاتے میں صرف ایک نقطہ کا فرق ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ احادیث کی اسناد کے موضوع پر تحقیق کی صلاحیت اور ذوق رکھنے والے اہلِ علم حضرات کو اس موضوع پر غیر معمولی کام کرنے کی بہت ضرورت ہے، کیونکہ جھوٹی احادیث، بلکہ ہر سنی ہوئی حدیث کو بیان کرنے پر مستند و معتبر احادیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں، جن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، لیکن افسوس کہ بغیر تحقیق احادیث کو نقل کرنے والوں کو ان وعیدوں سے ڈر نہیں لگتا، اور نہ ہی جھوٹی وغیر معتبر احادیث بیان کرنے سے متعلق اس طرح کی وعیدیں سن کر اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کا تقاضا ہوتا، بلکہ بعض لوگوں کی طرف سے ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' یا ''چوری اور سینہ زوری'' والے طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

البتہ کسی بزرگ اور مخلص عالم نے صحیح اور معتبر حدیث ہونے کے اعتماد پر کسی حدیث کو بیان کردیا ہو، یا تحقیق کے اسباب اس وقت میسر نہ ہوں، یا اس کو اس کی قدرت نہ ہو، تو وہ معذور کہلائے جانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔

اوراسی وجہ سے اس بزرگ، یاعالمِ دین کی شان میں بے ادبی وگستاخی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی، جب تک کسی کے متعلق معتبر ذریعہ سے جان بوجھ کر، حدیث کو گھڑنے والا ہونا، ثابت نہ ہوجائے۔

لیکن بعد والے لوگوں کو دلائل کے مقابلے میں، اس بزرگ، یاعالم کی اندھی عقیدت کو اہمیت دینا، اور صرف اس بزرگ، یاعالم کے بغیر دلیل اور ثبوت کے بیان ونقل کردینے کو ہی دلیل و حجت سمجھ بیٹھنا، اور ان سابق حضرات کے مقام ومرتبہ سے تحقیق کرنے والے کے مقام و مرتبہ کا تقابل پیش کر کے خلافِ واقعہ موقف کو سہارا فراہم کرنا، سخت خطرناک طرزِ عمل ہے۔

فقہائے کرام اور سلف کا تو ضعیف احادیث کے بیان ونقل کرنے اور ان سے استناد کرنے اور دلیل پکڑنے میں بھی اختلاف ہوا ہے، بعض حضرات نے تو ضعیف احادیث کو کسی حیثیت سے معتبر ہی نہیں مانا، اور انہوں نے ضعیف احادیث کو کسی درجہ میں شمار نہیں کیا، انہوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غیر مضبوط اور غیر پختہ سند والی بات کو منسوب کرنے میں احتیاط کا تقاضا یہی ہے، رہا دین کے احکام کے ثبوت کا معاملہ، تو ان کا ثبوت اس طرح کی احادیث پر موقوف نہیں، بلکہ ان کا ثبوت قرآن وسنت اور معتبر احادیث، اجماعِ امت اور قیاس کے ذریعہ سے ہوجاتا ہے، لیکن اہلِ علم حضرات کے ایک بڑے طبقہ نے ضعیف احادیث کی بعض شرائط کے ساتھ فضائلِ اعمال کے باب میں گنجائش دی ہے، پھر بعض نے اس شرط کو بھی ملحوظ رکھا کہ ضعیف احادیث کے ضعف کو بھی ساتھ میں بیان کرنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر دیگر شرائط پر بھی عمل ممکن نہیں، علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کی شرح میں ضعیف احادیث کے ضعف کو بیان نہ کرنے پر عظیم نقصان کے پھیلنے کا اظہار فرمایا ہے۔ [1]

---

[1] قد نشأ من رواية الاحاديث الضعيفة من غير بيان لضعفها: ضرر عظيم عرفهٔ من عرفه، و جهلهٔ من جهله، و قد شدد النكير مسلم رحمه الله فى مقدمة صحيحة على من فعل ذلک، و أما من رواها مع بيان ضعفها فلم ينكروا عليه (فتح الملهم، ج ا ، ص ۱۵۸ ، مقدمة ، تنبيهات تتعلق بالحديث الضعيف،الناشر: دار احياء التراث العربى، بيروت، الطبعة الأولىٰ: ۱۴۲۶ھ ، ۲۰۰۶م)

www.idaraghufran.org

اور ہمارے سامنے بھی موجودہ حالات نے اس قول کے رجحان کو ظاہر کردیا ہے۔

اس لیے جب کسی حدیث کے ضعیف ہونے کی تحقیق ہوجائے، تو اس کے ضعف کو بیان کرنا ہی عافیت وسلامتی کا ذریعہ ہے، اور اس پر یہ کہنا کہ ضعف کو بیان کرنے سے اس حدیث پر اعتماد واعتقاد ضعیف ہوجاتا ہے، اس لیے ضعف کو بیان کرنا درست نہیں۔

ہمیں اس شبہ سے بھی اتفاق نہیں، کیونکہ ضعیف حدیث کی حقیقت یہی ہے کہ اس پر صحیح اور قوی حدیث کی طرح کا اعتماد واعتقاد نہ ہو، جس کی خود فقہائے کرام نے تصریح فرمائی ہے۔

لہٰذا ضعیف حدیث کے ضعف کو بیان کرنا، درحقیقت اس کے درجہ پر رکھنے اور دوسری شرائط کو ملحوظ رکھنے کا ہی ذریعہ ہوا، کچھ اور نہیں۔ 29 ربیع الاول 1440ھجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 07، مارچ 2020ء - رجب المرجب 1441ھ)

---

(155)

موزوں وجرابوں پر مسح

بعض فقہائے کرام، مثلاً امام مالک کے نزدیک تو مسح ''خفین''، یعنی چمڑے کے موزوں پر ہی جائز ہے، اور ان کے علاوہ کپڑوں وغیرہ کی جرابوں پر مسح کرنا جائز نہیں، اور جمہور فقہائے کرام کے نزدیک خفین کے علاوہ مخصوص جرابوں پر بھی مسح جائز ہے۔

اس موضوع پر بعض مستقل عربی واردو رسائل بھی تصنیف ہوئے ہیں، جن میں خفین اور مخصوص جرابوں پر مسح کو جائز قرار دیا گیا ہے، لیکن ہمارے یہاں کچھ عرصہ سے جرابوں پر مسح کو جس طرح ناجائز قرار دیا جاتا رہا ہے، اور جو سخت شرائط اس میں بیان کی جاتی رہیں، ان پر کلام کی گنجائش ہے۔

بندہ نے بھی ایک عرصہ ہوا، اس موضوع پر ایک رسالہ تالیف کیا تھا، جس میں مذکورہ تفصیل کے مطابق ہی حکم بیان کیا گیا تھا، جس کا حاصل یہ تھا کہ جب تک جرابیں اتنی موٹی، مضبوط، سخت

اور ٹھوس نہ ہوں کہ وہ خود سے بغیر کسی سہارے کے کھڑی ہوسکیں، اور پاؤں میں ٹھہر سکیں، اور ان میں پانی جذب نہ ہوسکے اور وہ کم از کم تین میل پہن کر چلنے سے پھٹیں نہیں، صرف ان پر ہی مسح جائز ہے، اور اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے، تو مسح جائز نہیں۔

لیکن کچھ عرصہ سے عرب اور یورپ وغیرہ ممالک اور خود ہمارے بہت سے علاقوں سے بڑے پیمانے پر یہ خبریں ملتی رہیں کہ بہت سے عوام اور ائمہ حضرات جرابوں پر مسح کر کے، نماز پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، اور وہاں ائمہ کی اقتداء میں ان لوگوں کو بھی نماز پڑھنا پڑتی ہے، جو عام جرابوں پر مسح نہیں کرتے۔

اور اگر ان کی نمازوں کو ناجائز قرار دیا جائے، تو بے شمار لوگوں کے ذمہ میں نماز کا فریضہ باقی رہ جاتا ہے، پھر عوام میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں کہ جو اس سلسلے میں دوسرے علماء وفقہاء کے مخصوص موقف سے بھی واقف نہیں۔

ایسے لوگوں کو اگر بعد میں یہ کہا جائے کہ آپ کی برس ہا برس کی نمازیں درست نہیں ہوئیں، تو جہاں ایک طرف ان نمازوں کا اعادہ مشکل ہے، اسی طرح ان لوگوں کو اس بات کا قائل کرنا بھی نہایت مشکل ہے کہ ان کی بلکہ ان کے ائمہ کی نمازیں درست نہیں ہوئیں۔

ان جیسے حالات کی بناء پر ضرورت محسوس ہوئی کہ اس مسئلہ کے مجتہد فیہا ہونے نہ ہونے پر غور کیا جائے اور اگر اس سلسلہ میں فقہاء ومجتہدین میں سے کسی کے قول کے مطابق گنجائش نکلتی ہو، تو اس پر غور کیا جائے۔

اسی درمیان اتفاق سے مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب (رحمہ اللہ، دارالافتاء والتحقیق، لاہور) سے ملاقات ہوئی، اور وہ ادارہ غفران، راولپنڈی میں تشریف لائے۔

بندہ کا ان سے بھی الحمدللہ تعالیٰ نیاز مندانہ تعلق رہا ہے، ملاقات پر معلوم ہوا کہ ان کا رجحان بھی اس مسئلہ میں گنجائش کی طرف ہے، جس سے بندہ کو اس پہلو پر گنجائش ہونے کی تائید حاصل ہوئی۔

اس کے بعد بندہ نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور اس کے نتیجہ میں بندہ کو اس

مسئلہ میں بعض متاخرین کی طرف سے بیان کردہ سخت شرائط سے اتفاق نہیں رہا۔

اور یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ موزوں پر مسح جائز ہونے کی ان سخت شرائط پر فقہائے اربعہ کا اجماع ہے اور یہ اس درجہ کا اجماع ہے کہ اس کی خلاف ورزی کسی مجتہد ومقلد کو بھی جائز نہیں، تحقیق کرنے سے اس کی تائید نہیں ہوئی۔

اور ہمیں جرابوں پر مسح جائز ہونے کی جو بنیادی شرط ظاہر ہوئی، وہ مخصوص جرابوں سے پاؤں کا مستور ہونا ہے، جن کو پہن کر مسلسل چلنا ممکن ہو، یہی متفق علیہ ''وصفِ مؤثر'' ہے۔

اور بندہ کا اس موضوع پر مفصل ومحقق مضمون بحمداللہ تعالیٰ تیار ہو گیا ہے، جو پانچ چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اہلِ علم اور خاص ذوق رکھنے والے عوام کے لیے قابلِ ملاحظہ ہے۔

مگر المیہ یہ ہے کہ آج کل بعض اہلِ علم حضرات کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ اس طرح کی تحریرات و تحقیقات کو ملاحظہ ومطالعہ کیے بغیر ہی بدگمانی وبدزبانی کا ارتکاب شروع کر دیتے ہیں۔

حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے خالی الذہن ہو کر دوسرے کے دعوے اور دلائل کو ملاحظہ کریں، اور پھر کوئی شبہ، یا اختلاف ہو، تو بندے کے سامنے اس کا اظہار کریں اور بندہ سے اس کے جواب کا مطالبہ کریں، اس سے ممکن ہے کہ ان کو اپنے موقف میں ہی نظرِ ثانی کی ضرورت پیش آئے، اس کے بجائے دوسرے سے بدگمانی وبدزبانی، دوسرے کا نقصان کا باعث نہیں، بلکہ ان کا اپنا ہی نقصان ہے۔

کیونکہ اس صورت میں ان کی تقوے وطہارت والی نیکیاں دوسرے کی طرف جاسکتی ہیں، یا دوسرے کے گناہوں کا وبال ان کے سر پڑ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ آمین۔

فقط وَاللہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ

محمد رضوان خان۔ 25/ رجب المرجب/ 1441ھ 21/ مارچ/ 2020 بروز ہفتہ

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 08، اپریل 2020ء - شعبان المعظم 1441ھ)

(156)

تقلید اور تحقیق

بندہ پہلے بہت سی باتیں صرف اپنے بزرگوں کی اتباع میں نقل کر دیا کرتا تھا اور اس زمانے میں تحقیق کا مزاج نہیں تھا، تحقیق کے بجائے تقلید کا غلبہ زیادہ تھا۔

بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی وجوہات کی بناء پر الحمد للہ تعالیٰ، اصل مراجع تک پہنچنے کی ممکنہ جستجو اور تحقیق کرنے کا ذوق پیدا ہوتا گیا، اور اس کے نتیجہ میں بہت سی تقلیدی اور غیر تحقیقی باتوں سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

الحمد للہ تعالیٰ پہلے بھی بندہ کا اصل مقصود رضائے الٰہی تھا، اگرچہ اس کا رنگ دوسرا تھا، اور اب بھی اصل مقصد رضائے الٰہی ہے، جس کا رنگ پہلے سے مختلف ہے، لیکن رنگ بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

ظاہر ہے کہ جس طرح اہلِ حق کی تقلید کرنا جائز ہے، اسی طرح تحقیق کرنے کی صلاحیت اور وسائل ہونے پر تحقیق کرنا بھی جائز ہے، بلکہ محققین کے نزدیک عام حالات میں بھی تقلید کے بجائے، تحقیق ہی اصل ہے، اور قدرت ہوتے ہوئے تحقیق ترک کرکے، تقلید کرنا جائز نہیں، اگرچہ موجودہ زمانے کے بعض اصحابِ علم قدرت ہوئے بھی ،تقلید کو واجب اور تحقیق کو معیوب خیال کرنے لگے ہیں، جس کی محققین نے تردید کی ہے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ رضائے الٰہی کا مدار اس پر ہے کہ جو موقف اختیار کیا جائے، اس کو اپنے اور اللہ کے درمیان صواب وراجح سمجھ کر اختیار کیا جائے ،اگرچہ اس کے علاوہ دوسرا شخص، اپنے اور اللہ کے درمیان کسی دوسرے موقف کو صواب وراجح سمجھتا ہو۔

لہٰذا کسی مسئلہ میں اگر بزرگوں نے دوسرا موقف اختیار کیا، تو وہ بھی رضائے الٰہی پر مبنی تھا اور بندہ نے اس مسئلہ میں جو دوسرا موقف اختیار کیا، اس کا مبنیٰ بھی **الحمد للہ تعالیٰ**

یہی ہے، اس لحاظ سے یہ بزرگوں کی ہی اتباع وموافقت ہے، اس کو بزرگوں کی مخالفت پر محمول کرنا، حقیقت ناشناسی ہے۔

بزرگوں کے متعلق یہ گمان کرنا تو درست نہیں کہ انہوں نے جو بات اپنے اور اللہ کے درمیان صواب وراجح سمجھی، انہوں نے اس کے بجائے دوسری رائے کو مخلوق کے سامنے پیش کیا، بلکہ ہمارا گمان یہی ہے کہ انہوں نے جو موقف اختیار کیا، وہ وہی موقف تھا، جو انہوں نے اللہ کے اور اپنے درمیان حق وصواب اور راجح سمجھا، اب اگر ان بزرگوں کے سامنے، ان کی حیات میں، اسی موقف کا ان کے اور اللہ کے درمیان صواب وراجح ہونا آتا، جو بندہ کے سامنے آیا، تو وہ اسی موقف کو اختیار وظاہر فرماتے، اور بندہ کے سامنے اس کے برعکس آتا، تو بندہ اسی کو اختیار وظاہر کرتا، بلکہ اگر بزرگوں کو پہلا موقف اختیار فرمانے کے بعد، دوسرے موقف کی طرف رجحان ہو جاتا، تو وہ اس دوسرے موقف کی طرف رجوع فرمالیتے، اور اس کے اظہار میں بھی کوئی شرم محسوس نہ فرماتے، جیسا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کئی مسائل سے رجوع فرمایا۔

اس اعتبار سے بزرگوں کی حقیقی اتباع، یا موافقت اس میں نہیں ہے کہ دلیل کے لحاظ سے جو موقف راجح معلوم نہ ہو، اس کو اختیار کیا جائے، بلکہ حقیقی اتباع اس میں ہے کہ دلیل سے جو موقف راجح معلوم ہو، اس کو اختیار کیا جائے، یہ صورت اگرچہ ظاہری شکل میں تو بزرگوں کی اتباع نہیں، لیکن حقیقت میں ان کی اتباع ہے، جس کی حقیقت کو ظاہر بین نہیں سمجھتے۔

افسوس کہ اعتراض کرنے والے، خود ہی حقیقت سے بے خبر ہیں اور وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے، دوسروں پر اعتراض کرتے پھرتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں، وہ بزرگوں کی حقیقی موافقت کو مخالفت، اور مخالفت کو موافقت پر محمول کرتے ہیں۔

01 جمادی الاخریٰ 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 08,09,10، اپریل/مئی/جون 2020ء)

www.idaraghufran.org

(157)

بلا دلیل ''تفرد'' کا الزام

آج کل کے بعض جدید مفتیوں کا بندے کے متعلق دعویٰ ہے کہ بندہ کے کئی مسائل میں تفردات ہیں، لیکن یہ حضرات آج تک ہمارے سامنے نہ تو ''تفرد'' کی کوئی جامع مانع تعریف پیش کر سکے، نہ ہی اس تعریف پر منطبق کر کے بندہ کے تفردات کو ثابت کر سکے، بلکہ نہ ہی تفردات کی کچھ مثالیں پیش کر سکے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مذکورہ دعویٰ، جب دلیل سے خالی ہے، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اور یہ حضرات دلیل کی طرف جانے کے لیے آمادہ بھی نظر نہیں آتے، تاکہ تحقیق ہو کہ جس بنیاد پر تفرد کا تو دوسرے پر الزام عائد کیا جا رہا ہے، کہیں وہ خود ہی تو اس کی زَد میں نہیں آ رہے۔

ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ جن مسائل میں موجودہ دور کے بہت سے اہلِ علم حضرات اور مفتیانِ کرام کسی تسامح، یا خطاء کی بناء پر کوئی موقف اختیار کیے ہوئے ہیں اور ہمارے سامنے نا قابلِ تردید دلائل سے اس موقف کا تسامح، یا خطاء پر مبنی ہونا واضح ہو گیا، یہ حضرات اس کے باجود بھی دوسرے پر تفرد کا الزام عائد کرتے ہیں، اسی طرح بعض مسائل وہ ہیں، جن کو مضبوط دلائلِ شرعیہ وفقہیہ کی بناء پر بندہ نے راجح سمجھا، لیکن اس کے برخلاف موقف کی بنیاد، اس طرح کے مضبوط دلائل پر نہیں، اور بعض مسائل وہ ہیں، جن میں موجودہ زمانے کے اقتضاء کی وجہ سے، دوسری رائے اختیار کی۔

اور اس طرح کے تمام مسائل کی بنیاد، کتابُ اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماعِ امت اور قیاسِ شرعی کے اصولوں پر مبنی ہے، نیز صحابۂ کرام، تابعینِ عظام، مجتہدینِ عظام، فقہائے کرام اور سلف میں سے ایک بڑے طبقہ کی بھی یہی رائے ہے۔

ایسی صورت میں اس پر تفرد کا الزام عائد کرنا، کیسے درست قرار پا سکتا ہے۔

اس طرح کی باتیں مطالعہ اور تحقیق کے بغیر کردی جاتی ہیں، حالانکہ شرعاً اس طرح کی باتیں الزام و بہتان اور گناہ کے زمرے میں آتی ہیں۔28 جمادی الاخریٰ 1440ہجری

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد17 شمارہ 08,09,10، اپریل/مئی/ جون2020ء)

---

(158)

اکابر ومشائخ کی اصطلاح کی حیثیت

آج کل جب کوئی عالمِ دین شرعی وفقہی دلائل کی بنیاد پر کسی ایسے قول کو ترجیح دیتا اور اختیار کرتا ہے، جو کسی مخصوص مسلک ومکتبِ فکر کے مشائخ وبزرگوں کے مطابق نہیں ہوتا، تو بعض لوگوں کی طرف سے اسے اکابر کے مخالف ہونے کا الزام دے کر طرح طرح سے طعن وتشنیع کا بازار گرم کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارا دوٹوک اور واضح موقف یہ ہے کہ ہمارے اساتذۂ کرام، مشائخِ دیوبند، امام ابوحنیفہ، امام محمد، امام ابویوسف، امام زفر، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور دوسرے مجتہدین وفقہائے کرام علیہم الرحمۃ، نیز امام بخاری، امام ترمذی اور دوسرے محدثینِ عظام، اور جلیل القدر مفسرین وصوفیائے محققین، یہاں تک کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور بالخصوص خلفائے راشدین، سب کے سب ہی درجہ بدرجہ اکابرینِ عظام کی فہرست اور جماعتِ اکابر میں شامل ہیں۔

البتہ مختلف سلسلوں کے بھی مخصوص اکابر ومشائخ ہوتے ہیں، فقہائے کرام کے سلسلوں میں بھی اس طرح کے اکابر ومشائخ ہوئے ہیں، وہ بھی اکابر کے زمرے اور فہرست میں داخل ہیں، اس لیے مخصوص مشائخ کو اکابر کے مفہوم میں منحصر سمجھنا درست نہیں۔

پس جس طرح مشائخِ سمرقند، مشائخِ بخاریٰ، مشائخِ ماوراء النہر وغیرہ بھی اکابر کی اس فہرست اور زمرہ کا حصہ ہیں، اسی طرح مشائخِ دیوبند بھی ہمارے اکابر کا حصہ ہیں، لیکن اکابر کے

مفہوم کو مشائخِ دیوبند کے ساتھ منحصر نہیں کیا جا سکتا، یعنی مشائخِ دیوبند وغیرہ، دراصل عظیم جماعتِ اکابر کا ایک حصہ ہیں، ان کو جملہ اکابر سے تعبیر کرنے کے بجائے، اکابر کی ایک جماعت، یا مخصوص مشائخ، یا بالفاظِ دیگر مشائخِ دیوبند سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔

اب اگر کسی فروعی وفقہی مسئلہ میں کسی کی رائے مشائخِ دیوبند کے تو موافق نہ ہو، لیکن دوسرے اکابر ومشائخ کے موافق ہو، تو اس پر اکابر کے موافق نہ ہونے کا الزام عائد نہیں کرنا چاہئے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ رائے مشائخِ دیوبند کے تو موافق نہیں، لیکن فلاں مشائخ، یا فلاں اکابر کے موافق ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اکابر کی مخصوص اصطلاح اور مشائخ کے درمیان، عام خاص مطلق کی نسبت ہے، یعنی اکابر عام مطلق ہے، اور مشائخ خاص ہے، یا اس مطلق کا فرد ہے۔

مگر آج بعض لوگوں کی طرف سے کسی خاص فرد کی مخالفت کو عام مطلق کے خلاف قرار دیا جاتا ہے۔

اسی لیے میں اکابرِ دیوبند کے بجائے، مشائخِ دیوبند کی اصطلاح کو زیادہ پسند کرتا ہوں، اور یہ کوئی میری خود ساختہ ایجاد نہیں ہے، بلکہ مختلف زمانوں میں حنفیہ اور دوسرے مجتہد فقہائے کرام کے سلسلوں میں مختلف مشائخ ہوئے ہیں، اور ان کی مخصوص مشائخ کے ساتھ تعبیر کی جاتی رہی ہے۔

کوئی دوسرا میری اس بات سے متفق نہ ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میرے ذمہ اس موقف کو اختیار و بیان کرنا ہے، جسے میں اللہ کے اور اپنے درمیان راجح سمجھتا ہوں، جس طرح دوسروں کو اپنے نزدیک راجح موقف کو اختیار و بیان کرنے کا حق ہے۔ لیکن کسی دوسرے کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے موقف کا دوسرے کو پابند سمجھے، یا اپنے موقف کو دوسروں پر مسلط کرے۔

آج کل اپنے موقف کو دوسروں پر مسلط کرنے، یا دوسروں کو اپنے موقف کا پابند سمجھنے کی وجہ سے طرح طرح کے فتنے لازم آ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اعتدال کو اختیار کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

اور تشدد و تعصب سے امتِ مسلمہ اور خاص کر مقتداء حضرات کی حفاظت فرمائے۔

15 رجب 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 08,09,10، اپریل/مئی/جون 2020ء)

---

(159)

بلا دلیل کا الزام

ایک صاحب نے بندہ سے فرمایا کہ فلاں عالم صاحب نے آپ کے متعلق یہ بات کہی ہے کہ مفتی رضوان صاحب دراصل غیر مقلد ہیں، اور وہ غیر مقلدوں کے اشاروں پر کام کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ اگر میں غیر مقلد ہوں، تو میں خود ہی غیر مقلدوں والا کام کروں گا، مجھے غیر مقلدوں کے اشاروں پر کام کرنے کی کیا ضرورت ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ کہنے والے کے پاس اس کی کوئی دلیل ایسی نہیں کہ جس کو وہ بروز قیامت اللہ کے رُوبرو پیش کر سکے کہ میں غیر مقلدوں کے اشاروں پر کام کر رہا ہوں، اس کے بجائے سیدھا سیدھا ہی کہہ دیتے کہ ہمیں یہ صاحب غیر مقلد محسوس ہوتے ہیں، اس سے کم از کم آخرت میں زیادہ قوی دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، اور آخرت کا حساب آسان ہو جاتا۔

اب اس سلسلہ میں بندہ کا موقف بھی ملاحظہ کر لینا چاہئے، وہ یہ ہے کہ الحمدللہ تعالیٰ بندہ کو نہ کسی غیر مقلد کے اشارہ کی ضرورت ہے، اور نہ ہی کسی اور کے، بلکہ الحمدللہ تعالیٰ ہمارے لیے ''أطيعوا الله و أطيعوا الرسول وأولى الأمر منكم'' کا حکم کافی ہے۔

اتنے بڑے اور واضح حکم کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی ایرا غیرا کے اشارہ کی کیا ضرورت ہے۔

پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اجتہادی مسائل میں غور و فکر کرنا اور اس کے نتیجہ میں دلائل کی

رُو سے جو رائے راجح معلوم ہو، اس کو ترجیح دینا، شریعت کا حکم ہے، اس کو کچھ بھی نام دے دیا جائے، اس سے فرق نہیں پڑتا، اور جس مسئلہ میں اللہ نے غور وفکر کی صلاحیت عطاء فرمائی ہو، اللہ کی عطاء کردہ اس صلاحیت کو استعمال کرنا ذمہ داری ہے، اور کسی کی تقلید کی وجہ سے اپنے نزدیک راجح دلیل کو رَد کر دینا، اور مرجوح دلیل کو اختیار کر لینا جائز نہیں، خواہ کسی کو یہ طرزِ عمل غیر مقلدانہ محسوس ہوتا ہو، یا کچھ اور، اس سے فرق نہیں پڑتا، کیونکہ تحقیق کا مقصد اپنے نزدیک اللہ کی رضا کو پالینا ہے، جو غور وفکر کرنے والے کے حق میں اس کے نزدیک دلیل کے راجح ہونے سے حاصل ہوتی ہے، اور اللہ کی رضا کے مقابلہ میں ہزار نہیں، لاکھوں معترضین آ جائیں، ان کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے، پھر کسی ایک آدھ معترض سے، جو بے چارہ خود حقیقت سے نابلد ہو، کیا فرق پڑتا ہے۔

حیرت ہے کہ معترضین کو جو کام کرنا چاہیئے، وہ کام تو کرتے نہیں، اور بلاوجہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے پھرتے ہیں۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ بندہ، یا کسی کے بھی کام میں اگر قابلِ اصلاح بات نظر آئے، دلائل کے ذریعہ سے اس کی نشاندہی کی جائے، تاکہ دوسرے کی اصلاح ہو، یا کم از کم اس پر حجت تمام ہو، اور وہ بقول ان کے غیر مقلد ہونے، یا غیروں کے اشارہ پر کام کرنے کے جرم سے باز آئے، یا کم از کم اس پر حجت تمام ہو جائے، اور اس کو بروزِ قیامت کوئی عذر نہ رہے، یا پھر آخری درجہ میں نقد ونظر کے بعد معترض کا شبہ دور ہو جائے، یا اس پر حجت پوری ہو جائے۔

کام کا یہ طریقہ ہے، جو سلف اور بزرگوں میں تھا، اور اب بھی جو کچھ بچے کھچے حضرات، ان کے طرز پر ہیں، ان کا بھی یہی طریقہ ہے کہ وہ ہمیشہ اصلاح اور حق کے متلاشی رہتے ہیں، سلف کے اس بابرکت طریقہ کے ذریعے سے بغض وعناد اور حسد وتحاسد ختم ہو کر اتفاق اور اصلاح کا سلسلہ ترقی پکڑتا ہے، لیکن اگر کسی کا مقصود ہی حسد وتحاسد کی بھڑاس نکالنا ہو، اس کا کیا علاج؟

اس میں خود حاسد کا نقصان ہے کہ وہ حسد کی آگ میں جلتا رہے گا، اور بدگمانی و بدزبانی کا ارتکاب کرکے، اپنی نیکیاں دوسرے کو دینے، یا دوسرے کے گناہ اپنے سرمنڈھنے کا انتظام کرتا رہے گا، اور دوسرا اپنا کام کرتا رہے گا۔15 شعبان 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 08,09,10، اپریل/مئی/جون 2020ء)

---

(160)

استنجاء واستبراء میں تشدّد وسختی کی ممانعت

حضرت ابو وائل سے روایت ہے کہ:

كَانَ أَبُوْ مُوْسٰى، يُشَدِّدُ فِي الْبَوْلِ، وَيَبُوْلُ فِيْ قَارُوْرَةٍ وَيَقُوْلُ: إِنَّ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ كَانَ إِذَا أَصَابَ جِلْدَ أَحَدِهِمْ بَوْلٌ قَرَضَهُ بِالْمَقَارِيْضِ، فَقَالَ حُذَيْفَةُ: لَوَدِدْتُ أَنَّ صَاحِبَكُمْ لَا يُشَدِّدُ هٰذَا التَّشْدِيْدَ، فَلَقَدْ رَأَيْتُنِيْ أَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَتَمَاشٰى، فَأَتٰى سُبَاطَةً خَلْفَ حَائِطٍ، فَقَامَ كَمَا يَقُوْمُ أَحَدُكُمْ، فَبَالَ، فَانْتَبَذْتُ مِنْهُ، فَأَشَارَ إِلَيَّ فَجِئْتُ، فَقُمْتُ عِنْدَ عَقِبِهِ حَتّٰى فَرَغَ (مسلم، رقم الحديث ٢٧٣ "٧٤" كتاب الطهاة، باب المسح على الخفين)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پیشاب کے متعلق تشدید اور سختی سے کام لیتے تھے، اور بوتل میں پیشاب کرتے تھے (تاکہ پیشاب کی چھینٹوں سے حفاظت رہے) اور فرماتے تھے کہ بنی اسرائیل کے جسم پر اگر پیشاب لگ جاتا تھا، تو وہ اس کو قینچی سے کاٹ دیا کرتے تھے۔

اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھی (یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعری) اتنی تشدید اور سختی نہ کریں، میں نے تو خود اپنی

www.idaraghufran.org

آنکھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (قضائے حاجت کے لیے) جاتے ہوئے دیکھا، آپ دیوار کی اوٹ میں ایک کُوڑا پھینکنے کی جگہ پر آئے، پھر کھڑے ہوئے، جس طرح تم میں سے کوئی کھڑا ہوتا ہے (یعنی عام انداز میں کھڑے ہوئے) پھر (کھڑے ہونے کی حالت میں) پیشاب کیا، میں دُور ہٹنے لگا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (قریب آنے کا) اشارہ کیا، تو میں آپ کے قریب آ گیا، اور میں آپ کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا ہوگیا، یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فراغت حاصل کی (مسلم)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو پیشاب کرتے وقت چھینٹوں سے بچنے اور ان سے احتیاط کرنے میں غلو تھا، جس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان کو تنبیہ فرمائی۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا مقصود یہ تھا کہ پیشاب سے حفاظت میں اتنا غلو اور مبالغہ کرنا ٹھیک نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کھڑے ہوکر بھی پیشاب کیا ہے، اور کھڑے ہوکر پیشاب کرنے میں چھینٹیں پڑنے کا خدشہ زیادہ ہوتا ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدشہ کی طرف توجہ نہیں فرمائی، اور اس سلسلے میں اس طرح کا تکلف اختیار نہیں فرمایا۔ [1]

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''طریقۂ مروّجہ استبراء کے تارک (یعنی ڈِھیلے سے مروجہ طریقے پر استنجاء نہ کرنے والے) کو جو لوگ بدعتی کہتے ہیں، تو صرف یہ اس فرقہ ظاہرین کے مبالغات میں

---

[1] مقصود حذيفة أن هذا التشديد خلاف السنة فإن النبى صلى الله عليه وسلم بال قائما ولا شك فى كون القائم معرضا للرشيش ولم يلتفت النبى صلى الله عليه وسلم إلى هذا الاحتمال ولم يتكلف البول فى قارورة كما فعل أبو موسى رضى الله عنه والله أعلم (شرح النووى على مسلم، ج٣، ص ١٦٧، كتاب الطهارة، باب المسح على الخفين)

وإنما احتج حذيفة بهذا الحديث ;لأن البائل عن قيام قد يتعرض للرشاش، ولم يلتفت النبى صلى الله عليه وسلم إلى هذا الاحتمال فدل على أن التشديد مخالف للسنة (فتح البارى، ج ١، ص ٣٣٠، كتاب الوضوء، باب البول عند سباطة قوم)

www.idaraghufran.org

سے ہے، اور یہ قابلِ اعتبار نہیں، بخاری شریف اوراس کی شروح میں مذکور ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے عذابِ قبر کی حدیث سنی، تواس وجہ سے وہ پیشاب سے نہایت احتیاط کرتے تھے، حتیٰ کہ جب پیشاب کی حاجت ہوتی تھی، تو وہ پیشاب کا مقام شیشی کے اندر داخل کرتے تھے، اوراس کے اندر پیشاب کرتے تھے، اس خوف سے کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں بدن ،یا کپڑے پر چھینٹ پڑ جائے، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بطورانکار کے ان سے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ،ایک قوم کی سباط یعنی کوڑا پھینکنے کی جگہ میں گئے ،اور کھڑے ہوکر پیشاب کیا۔

اوراس میں شبہ نہیں کہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنے میں چھینٹ پڑنے کا گمان ہے۔

تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب استبراء کرنے میں مبالغہ کیا جاتا ہے، تو مثانہ سے پیشاب ٹپکتا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ جب دودھ دوہا جاتا ہے، تو دودھ جانور کے تھن میں آجاتا ہے، اور جب دوھنا موقوف کردیا جاتا ہے، تو دودھ بھی موقوف ہوجاتا ہے'' (فتاویٰ عزیزی، ص۴۶۲، باب الفقہ ، مسائلِ نماز، ناشر: ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، سنِ طباعت:1412ہجری)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے واقعتاً گہری بات فرمائی، جولوگ اس سلسلہ میں غلو ومبالغہ سے کام لیتے ہیں، ان کا مرض بڑھتا ہی جاتا ہے، اور ختم نہیں ہوتا، اور بعض اوقات ترقی کرتے کرتے، بہت شدت اور خطرناک صورتِ حال اختیار کرلیتا ہے۔

ہم نے ایسے کئی لوگ دیکھے، جو بعض متشدد علماء، یا صوفیاء کی سخت باتیں سُن کر بہت ڈر گئے، اور سہم کر رہ گئے، اورانہوں نے استنجاء واستبراء کے سلسلے میں سختی وتشدد کرنا شروع کردیا، اور بس اس کے بعد وہ قطرے برآمد ہونے کے اچھے خاصے مریض بن گئے، حالانکہ وہ اس سے پہلے بالکل صحیح تھے، اور بعض لوگوں کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نماز توڑ کر دوبارہ اور سہ بارہ

وضو کرنے لگے، پھر بعض نے تنگ آ کر نماز پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔

علماء اور خاص کر صوفیاء کو اتنی سختی وتشدد کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے، اور اپنے مخاطبین و مریدین کی حالت پر رحم کھانا چاہئے۔

قرآن وسنت میں یُسر وسہولت اور آسانی پیدا کرنے اور سختی وتشدد اور غلو ومبالغہ سے بچنے کی بہت تاکید آئی ہے۔

بندہ کا اس موضوع پر ایک مستقل مضمون بھی ہے، جو''پانی وڈھیلے سے استنجاء کی تحقیق'' کے نام سے''علمی وتحقیقی رسائل'' میں شائع ہو چکا ہے۔

(ماہنامہ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 11، جولائی 2020ء - ذوالقعدة 1441ھ)

---

(161)

تشدد پسندی کی انتہاء کا ایک واقعہ

آج کل علماء کے روپ میں بعض ایسے افراد داخل ہو گئے ہیں، جن کو قرآن وسنت کا صحیح اور پختہ علم نہیں اور وہ سنجیدہ محققینِ سلف کے طریقہ پر نہیں، اوپر سے وہ اپنے آپ کو ہی صحیح دین کا والی اور وارث بھی سمجھتے ہیں اور کوئی ان کے مزاج ومذاق کے مطابق بات نہ کرے، تو اس پر فوراً گمراہی اور ضلالت وغیرہ کا فتویٰ بھی لگا دیتے ہیں۔

مجھے ایک قاری صاحب نے واقعہ سنایا کہ انہوں نے اپنی مسجد کے خطیب صاحب کے سامنے عرض کیا کہ آپ دنیا بھر کے تمام اہلِ تشیع کو کافر کہتے ہو، حالانکہ ان میں تفضیلی شیعہ بھی تو ہوتے ہیں، جن کو کافر قرار دینا درست نہیں، ابھی ان قاری صاحب نے اپنی بات مکمل بھی نہ کی تھی کہ ان خطیب صاحب نے فوراً غصہ میں جھلا کر کہا کہ ہاں، جیسا کہ فلاں مولانا صاحب اور فلاں مولانا صاحب، تفضیلی شیعہ ہیں۔

ان خطیب صاحب نے اہلُ السنۃ والجماعۃ اور اہلِ دیوبند کے دو بڑے علمائے کرام کا صاف

www.idaraghufran.org

نام لے کر یہ بات کہی، یعنی ان علمائے کرام کو تفضیلی شیعہ قرار دے دیا، حالانکہ وہ دونوں علمائے کرام، اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مشہور اور مستند علماء ہیں، جن کے مقابلے میں، ان پر فتویٰ لگانے والے یہ خطیب کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

اندازہ لگائیے کہ ہمارے علمائے کرام کے روپ میں کیسے کیسے جذباتی اور انتہاء پسند آ گئے ہیں، جو اہلُ السنۃ والجماعۃ کے بڑے بڑے اصحابِ علم پر بھی گمراہی وضلالت کا فتویٰ لگانے سے نہیں ڈرتے۔

حالانکہ احادیث میں تو عام مسلمان کے متعلق بھی احتیاط وحسنِ ظن کا حکم آیا ہے۔

اس قسم کے متشددین پر اگر خارجیوں کی پوری صفات صادق نہ آئیں، تو کچھ صفات تو صادق آ ہی جاتی ہیں۔

بہت پُرفتن دور آ گیا ہے، ایسے حالات میں تو میں اپنے دوستوں کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ قرآن وسنت اور سنجیدہ اور محقق سلفِ صالحین کے طریقہ پر مضبوطی سے ثابت قدم رہیں، ہر طرح کے اسٹیجی مولویوں اور جذباتی قسم کے نوجوانوں سے متاثر نہ ہوں، اور نہ ہی ان سے الجھیں، اور اگر کسی کے ماننے کی امید نہ ہو، اس کو چھیڑیں بھی نہیں، اور ایسی صورت میں ’’اپنے موقف کو چھوڑو نہیں، اور دوسرے کے موقف کو چھیڑو نہیں‘‘ کے اصول پر عمل کریں۔

ایسے فتنوں کے زمانے میں احادیثِ مبارکہ میں اپنی ذات اور اپنے خواص تک اپنے آپ کو محدود رکھنے، بلکہ اپنے گھروں میں رہنے اور زبان کو قابو میں رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور میرے خیال میں اس زمانے کا آغاز ہو چکا ہے، اور اس کی تمہید قائم ہو چکی ہے، حق بات کو سننے والے کم ہیں اور اس کی تردید کرنے والے زیادہ ہیں۔

ایک مخصوص متشدد، جذباتی طبقہ نے دین کو ہائی جیک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اور حیرت اس بات پر ہے کہ یہ طبقہ آج کھلے عام منبر ومحراب پر بیٹھ کر مسلمانوں اور علمائے دین کی شان میں بدکلامی اور فحش گوئی کا ارتکاب کرتا ہے، اور کوئی اس کے طرزِ عمل پر نکیر

کرے، تو اس کو بزرگوں اور علماء کا گستاخ اور بے ادب سمجھتا ہے۔

میں ایسے متشددین سے برائت کا اعلان کرتا ہوں، خواہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی مسلک کی طرف منسوب کرتے ہوں، اور کتنا صوفیانہ حلیہ، نورانی چہرہ اور کوئی دینی عہدہ کیوں نہ رکھتے ہوں۔

اور اپنے دوستوں کو بھی ایسے متشددین سے بچنے اور دور رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس متشدد طبقہ سے امتِ مسلمہ کی حفاظت فرمائے۔

اور اعتدال کو اختیار کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

یکم رمضان 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 11، جولائی 2020ء - ذوالقعدۃ 1441ھ)

---

(162)

صرف ونحو کی کمزوری کا الزام

ایک مولوی صاحب نے مجھے کہا کہ فلاں مفتی صاحب معلوم نہیں کہ آپ کے اتنے مخالف کیوں ہیں؟

میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ کہنے لگے کہ مجھے ایک مولوی صاحب نے بتلایا کہ فلاں مفتی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ مفتی رضوان کو تو نحو، صرف کی ابتدائی کتابیں بھی نہیں آتیں۔

میں نے اس کے جواب میں کہا کہ اولاً تو آپ کے سامنے تحدیث بالنعمۃ کے طور پر کہتا ہوں کہ بحمداللہ تعالیٰ مجھے بقدرِ ضرورت نحو وصرف آتی ہے۔

تاہم کسی فن سے واقف ہونے کے لیے اس کے اصطلاحی اصول وقواعد پر عبور ہونا، اور ان کا مستحضر ہونا ضروری نہیں، بلکہ اس سے عملی طور پر اتنی مناسبت کافی ہے کہ بوقتِ ضرورت اس سے مقصد حاصل ہو جائے۔

اگر کسی شیخ الحدیث کو نماز کے اصطلاحی طور پر فرائض یاد نہ ہوں، لیکن وہ ان فرائض کے مطابق

نماز پڑھتا ہو اور بوقتِ ضرورت اس کو نماز کے فاسد ہونے نہ ہونے سے بھی آگاہی ہو جاتی ہو، یا جہاں کسی مسئلہ کی ضرورت پیش آئے اور مسئلہ مستحضر نہ ہو، وہاں کسی انسان، یا کتاب سے استفادہ کر لیتا ہو، تو مقصود حاصل ہے۔

اسی طرح مثلاً اگر ایک عالمِ دین، نحو وصرف کی کتابیں پڑھاتا ہے، تمرین اور مشق کراتا ہے، تو اس کو نحو صرف کے قواعد اور اصطلاحات سے جو مناسبت اور آگاہی ہوگی، ضروری نہیں کہ اس سے بڑے، یا اس کے استاذ کو جو شیخُ الحدیث، یا استاذ الحدیث والتفسیر وغیرہ کے لقب سے کیوں نہ موسوم ہو، اس کو بھی نحو وصرف وغیرہ سے، اسی طرح سے مناسبت وآگاہی ہو۔

الحمدللہ تعالیٰ بندہ کسی زمانے میں ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح مائۃِ عامل، میزان، منشعب وغیرہ کی تدریس کرتا تھا، اس وقت مجھے نحو وصرف کی اصطلاحات وقواعد مستحضر تھے، مگر اب عرصہ ہو گیا کہ ان کتابوں کی تدریس سے دور ہوں، اس لیے وہ اس درجہ میں مستحضر نہیں، تو اس سے کون سا کام رُک گیا؟

جیسا کہ ڈاکٹر وغیرہ، جب تک عملی طور پر اس شعبہ سے وابستہ ہوتا ہے، اس وقت تک اس کے سامنے اس شعبے کے قواعد واصول مستحضر ہوتے ہیں، اور جب وہ عملی طور پر اس شعبہ کو ترک کر دیتا ہے، اگرچہ وہ بعد میں کسی اونچے شعبے سے وابستہ ہو جائے، تو اس کو اس طرح کے قواعد واصول مستحضر نہیں رہتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نحو، یا صرف، یہ علومِ آلیہ میں سے ہیں، علومِ عالیہ میں سے نہیں، اگر کسی کو نحو وصرف میں کمزوری ہو، لیکن وہ قرآن وسنت اور فقہ سے متعلق مفسرین، محدثین ومجتہدین کی تحقیقات سے مستفید ہو کر قرآن وسنت اور فقہ کے اس مسئلہ کا صحیح نتیجہ اخذ کر لیتا ہو، تو اس کے نحو وصرف میں کمزور رہنے سے مقصود پر فرق نہیں پڑتا۔

عربی، نحو اور صرف ایک فن ہے، جو انسانوں نے ترتیب دیا ہے، اس کے اصول وقواعد، وحی کے درجہ میں اور قرآن وسنت سے ثابت نہیں، بلکہ بہت سے مسائل اپنے فن کے اعتبار سے

بھی قطعی نہیں، اسی وجہ سے بہت مسائل میں نحویوں اور صرفیوں کا اختلاف بھی ہے، پس ان سے ناواقفیت بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اعرابی اور دیہاتی حضرات بھی ہوتے تھے، جن کی زبان کا معیار کمزور ہوتا ہے، اور وہ عربی گرائمر کے قواعد واصول سے بھی واقف نہیں ہوتے، جیسا کہ ہمارے یہاں کے بہت سے دیہاتیوں کا حال ہوتا ہے کہ ان کی زبان کمزور ہوتی ہے، لیکن دیہاتی واعرابی لوگوں نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن وسنت کا علم حاصل کیا اور اس کو آگے پہنچایا جو کہ ہم تک بھی پہنچا اور وہ صحابیت کے شرف سے بھی مشرف ہوئے، تو کیا ان کی زبان کے عربی گرائمر کے اصول وقواعد کے مطابق نہ ہونے، یا ان کے نحو وصرف کے قواعد سے ناواقف ہونے سے کوئی گناہ، یا عیب لازم آگیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔

جیسا کہ آج کل بہت سے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کی مادری زبان پشتو ہے، اور وہ اردو زبان کے گرائمر اور اس کے اصول وقواعد سے واقف نہیں اور نہ ہی وہ صحیح طرح اردو زبان کو اپنے اصول وقواعد کے مطابق اداء کرنے پر قادر ہیں، کئی شیخ الحدیث اصحابِ علم ایسے بھی ہیں، جو مذکر ومونث کا فرق نہیں کر پاتے، بلکہ وہ اردو زبان پر قادر ہی نہیں۔

اس کے باوجود بہر حال وہ حضرات، اصحابِ علم ہیں، اور عربی نحو وصرف کے اصول وقواعد پر بھی ان کو عبور نہیں، لیکن ان کو عاصی وگناہ گار تو کیا قرار دیا جاتا، ان کے نہ شیخ القرآن ہونے میں عیب سمجھا جاتا، نہ شیخ الحدیث ہونے میں، اور نہ ان کے نحو وصرف پر عبور رکھنے والے علماء کے استاذ وشیخ ہونے میں کوئی عیب سمجھا جاتا۔

اور بہت سے مشائخِ طریقت وغیرہ بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو نحو وصرف تو کیا عربی بھی نہیں آتی، لیکن وہ بڑے بڑے اصحابِ علم کے شیخ اور پیر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی رحمہ اللہ، باضابطہ عالمِ دین نہیں تھے، لیکن عارف باللہ کے لقب سے موسوم ہوئے، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی

www.idaraghufran.org

عثمانی صاحبان وغیرہ جیسے جید علمائے کرام ومفتیانِ عظام کے مربی اور شیخ ورہبر شمار ہوئے۔

سلسلۂ دیوبند کے مشائخِ اعظم شیخ المشائخ میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمہ اللہ، فارغ التحصیل عالِم دین نہ تھے، لیکن حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حافظ ضامن شہید اور شیخ محمد تھانوی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ، جیسے اکابر کے شیخ شمار ہوئے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ بھی اصطلاحی عالِم دین نہ تھے، لیکن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، شاہ عبدالرحیم رائے پوری، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ، جیسے جبالِ علم آپ کے مرید ہوئے۔

اور آخری بات یہ ہے کہ بندہ نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میں عربی نحو اور صرف میں کامل ہوں، یا مجھے ان فنون پر عبور حاصل ہے، یا مجھے نحو اور صرف پر مذکورہ مفتی صاحب سے زیادہ عبور حاصل ہے، بلکہ میں تو خود ان مفتی صاحب کے نحو وصرف کے علم کو اپنے سے زیادہ پختہ سمجھتا ہوں اور وقتاً فوقتاً اپنی مجالس میں ان مفتی صاحب کے نحو وصرف کی پختگی کا اعتراف واظہار بھی کرتا رہتا ہوں اور مجھے خود بھی ایک آدھ مرتبہ کسی صرف ونحو کے مسئلہ میں ان سے استفادہ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے، اور انہوں نے بندہ کی کسی عبارت میں بھی ایک آدھ مرتبہ اس کی نشاندہی کی تھی، اس حیثیت سے میں ان کی عمر اپنے سے کم ہونے کے باجود، ان کو اپنا استاذ شمار کرتا ہوں، پس اگر استاذ نے اپنے شاگرد کے، علم کی کوئی کمزوری ظاہر کردی، تو اس سے میری شان میں کون سا فرق پڑ گیا۔

بلکہ میرا معمول تو کافی حد تک یہ رہا ہے اور اب بھی ہے کہ بوقتِ ضرورت مختلف علوم وفنون کے ماہرین سے استفادہ کرتا رہتا ہوں۔

چنانچہ مجھے اگر کسی سائنس، یا میڈیکل سائنس کے کسی معاملہ میں، یا فلکیات وغیرہ کے مسئلہ میں، یا انگلش زبان کے متعلق کوئی رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو اس شعبہ اور اس فن سے منسلک اہلِ سائنس، ڈاکٹروں، اہلِ زبان، اور اپنے بعض شاگردوں

سے بھی مشورہ واستفادہ کرتا ہوں، اوران شاء اللہ تعالیٰ کرتا رہوں گا۔

چنانچہ میں نے روزہ کے مفسدات وغیرہ سے متعلق کئی مسائل میں ڈاکٹروں سے انسانی جسم کے بعض اعضاء کے متعلق مختلف تحقیقات کیں۔

صبح صادق اور صبح کاذب وغیرہ کے مسئلہ میں بھی بعض انجینئر حضرات سے بعض پہلوؤں کی تحقیق کی، بلکہ بعض تحقیقات میں غیر مسلم ماہرین کی طرف بھی رجوع کیا، جس سے شریعت نے منع نہیں کیا، اور یہی طرزِ عمل ''لکل فن رجال'' کے اصول کے موافق ہے۔

اور اصل بات تو یہ ہے کہ انسان کو ساری زندگی علم حاصل کرنا چاہئے، اور اس کو حاصل کرنے میں اپنے، پرائے اور چھوٹے بڑے کی تقسیم وتفریق کو حائل نہیں بنانا چاہئے۔

بندہ کا تو یہ ذوق ہے، اور بندہ مرتے دم تک اسی ذوق پر کاربند رہنا چاہتا، اور اللہ سے اس کی دعاء کرتا ہے۔

اگر کسی دوسرے بحرِ ذخّار کو اس کی ضرورت نہ ہو، تو وہ اس کا کمال ہے، بندہ کو تو یہ کمال حاصل نہیں، اب اپنی حالت کے متعلق بندہ نے اتنا صاف صاف عرض کردیا کہ کسی دوسرے کو بھی بندہ کے متعلق شاید حقیقت کے مطابق معاملہ اتنا صاف کرنے کی قدرت حاصل نہ ہوتی۔

ایک مرتبہ کسی نے میری بزرگی اور تقوے میں کوئی کمزوری ظاہر کی، تو میں نے جمعہ کے دن برسرِ عام یہ اعلان کردیا کہ میں نے آج تک اپنے آپ کے بزرگ، یا متقی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، اور نہ ہی میں کوئی بزرگ، یا متقی ہوں، اگر کوئی مجھے بزرگ، یا متقی سمجھتا ہے، تو وہ اس کی اپنی سوچ اور اپنا خیال ہے، نہ تو یہ میرا دعویٰ اور عقیدہ ہے اور نہ مجھے دوسروں سے اپنے متعلق اس خیال کے پیدا کرنے اور باقی رکھنے کی خواہش ہے، اس لیے میرے متعلق کوئی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے، کہیں اللہ نہ کرے، آخرت میں میری بزرگی اور تقوے کا سارا پول کھل جائے، اور دوسروں کو تعجب ہو، اس لیے آج ہی یہ غلط فہمی دور فرمالیں، اور اگر اس کے باوجود کوئی میرے متعلق بزرگ یا متقی ہونے کا حسنِ ظن رکھتا ہے، تو میں یہی دعاء کرتا ہوں کہ اللہ

تعالیٰ مجھے اس حسنِ ظن کا مصداق بنادے، اور لوگوں کے حسنِ ظن کی برکت اور اپنے خاص فضل وکرم سے مجھے اس درجہ پر فائز فرمادے۔آمین۔

اور میں لوگوں کے حسنِ ظن اور اللہ کے خاص فضل وکرم سے یہی امید رکھتا ہوں، اگرچہ اپنے آپ کو اپنی نظر میں اس کا مصداق نہیں پاتا۔

ہم نے تو اپنے بزرگ ومشائخ سے بھی یہی سبق پڑھا ہے، کسی نے دوسرا سبق پڑھا ہو، تو وہ جانے اور اللہ جانے، ہمیں نہ دوسرے سے اس کے برخلاف علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس پر کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی کے متعلق تجسس اور ٹوہ ہے، بلکہ ہم غریبوں کو تو اپنی ذمہ داریوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ زید وبکر وغیرہ کے قصے اور جھگڑے لے کر بیٹھ جائیں، اور اپنے فرائضِ منصبی کو نظر انداز کردیں۔15 رمضان 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 11، جولائی 2020ء - ذوالقعدۃ 1441ھ)

---

(163)

حنفی کا غیر حنفی کی اقتداء میں نماز پڑھنا

آج کل بعض اہلِ علم واہلِ افتاء حضرات کی طرف سے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے ائمہ کی اقتداء میں نماز درست ہونے کے مسئلہ میں سختی سے کام لیا جاتا ہے، اس طرح کی غلط فہمی پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض غیر مجتہد حضرات کی طرف سے، اس قسم کے مسائل میں سخت باتیں صادر ہوگئی ہیں، بعض نے تو یہاں تک بھی فرمادیا کہ حنفی کو نماز میں ''رفعِ یدین'' کرنے والے امام کی اقتداء میں نماز پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ ''رفعِ یدین'' دراصل ''عملِ کثیر'' کے زمرہ میں آیا تا ہے، اور ''عملِ کثیر'' سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، حالانکہ اس مسئلہ میں محققین فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کے نزدیک کافی توسع موجود ہے، جس سے آگاہی ضروری ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''حنفی مذہب کی نماز شافعی اور مالکی اور حنبلی سب کے پیچھے جائز ہے، اس واسطے کہ اصول میں ان چاروں مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں، اور یہ حکم احادیث اور فقہ کی کتبِ معتبرہ سے ثابت ہے، لیکن فی زمانہٖ بعض علمائے ماوراء النہر اپنی کم فہمی کے سبب سے تعصب رکھتے ہیں، اور اس بارہ میں گفتگو کرتے ہیں، ان کا قول، قابلِ رَد ہے، اور فقہ وحدیث کے خلاف ہے، یہ صرف ان کا مسئلہ اجتہادیہ ہے، ہرگز قابلِ سماعت اور لائقِ اعتبار نہیں، اور مکہ معظّمہ میں اب تک یہی طریقہ جاری ہے کہ ان چار مذاہب کے لوگ دوسرے مذہب والے کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، اگر ایسا حکم نہ ہو، تو پھر مذہب اہلِ سنت اور فرقۂ خلافیہ میں کیا فرق رہے گا، اہلِ سنن اور سب فقہائے کرام کے محققین کے نزدیک چاروں مذاہب میں حق دائر ہے، اور یہ مسئلہ اصول کی کتبِ معتبرہ میں دیکھنا چاہیے، تاکہ اطمینانِ کلی حاصل ہوجائے۔ **کتبہٗ فقیر عبدالعزیز عفی عنہ و کفّر عنہ سیآتہٖ۔**'' (فتاویٰ عزیزی، ص ۲۶۳، باب الفقہ، مسائلِ نماز، ناشر: ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، سنِ طباعت: 1412ہجری)

علامہ عبدالحیئ لکھنوی رحمہ اللہ کے ''مجموعہ فتاویٰ عبدالحیئ'' میں اس مسئلے کے متعلق، ایک سوال اور جواب درجِ ذیل ہے:

سوال: ...... ایک شخص کا عمل اور برتاؤ، ہراَمر میں حنفی مذہب کے موافق ہے، اور تحقیقِ مسائل میں وہ اگر اس طرح لکھے کہ ''زمانۂ سلف میں صحابہ اور تابعین اور تبعِ تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین کا مسائلِ جزئیہ میں اختلاف ہوتا گیا ہے، اور باوجود اس کے، ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، کسی کو اس میں انکار نہ تھا، اور کوئی شخص اس کا التزام کرلے کہ ایک ہی شخص کے قول وفعل کو مانے، اگرچہ حق اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، تو یہ بات اب تک ثابت نہیں ہوئی، اور کسی اہلِ علم کا یہ قول نہیں ہے''

تو ایسا شخص اس لکھنے سے حنفیت سے خارج ہوگیا، یا نہیں؟

جواب:...... حنفیت سے خارج نہ ہوگا، کیونکہ کتمانِ حق کا نام، حنفیت نہیں ہے (بلکہ حق واضح کرنا ہی حنفیت کا تقاضا ہے، اور اس شخص نے حق بات ہی کہی ہے) اکثر حنفیہ نے اپنی کتب میں یہی لکھا ہے۔

مفتیٔ مکہ معظّمہ، یعنی مفتی عظیم، جن کا انتقال 1061ھ میں ہوا ہے ''**القول السدید فی مسائل التقلید**'' میں لکھتے ہیں کہ:

وقد كان الصحابة رضى الله عنهم يقتدى بعضهم ببعض وكذا التابعون لهم وفيهم المجتهدون ولم ينقل عن أحد من السلف رحمهم الله تعالى أنه كان لا يرى الاقتداء بمن يخالف قوله فى بعض المسائل ولو فى خصوص الطهارة والصلاة بل كان يقتدى بعضهم ببعض.

''صحابہ رضی اللہ عنہم، ایک دوسرے کی اقتداء کرتے تھے، اور اسی طرح تابعین رحمہم اللہ، ایک دوسرے کی اقتداء کرتے تھے، حالانکہ ان میں بہت سے مجتہد تھے، اور سلف میں کسی سے منقول نہیں ہے کہ وہ مخالف کی اقتداء کو ناجائز سمجھتا ہو، اگرچہ مخالفت، خاص طہارت (اور حدث وغیرہ) ہی میں کیوں نہ ہو، بلکہ (ان میں سے ہر) ایک دوسرے کی اقتداء کرتا تھا''

اور بھی اسی کتاب میں ہے:

فلا علينا ألا نأخذ بما ظهر لنا صواب خلافه إن أنعم الله علينا بحصول ضرب من النظر يمكن الوقف به على الصواب هذا ونحن مع ذلک بحمد الله تعالیٰ لا نخرج عن درجة التقليد لإمامنا الأعظم أبى حنيفة رحمة الله عليه.

''ہم کو یہ نہ چاہیے کہ اس سے اخذ کریں، جس کے خلاف کی درستی ہم کو ظاہر

Idara Ghufran

ہوجائے، کیونکہ اللہ نے ہم کو غور کرنے کی ایک نعمت مرحمت فرمائی ہے، جس کی بدولت ہم صواب کا پتہ چلا سکتے ہیں، لیکن باوجود اس کے، ہم امام اعظم ابوحنیفہ کوفی رحمہ اللہ کی تقلید سے باہر نہیں ہوں گے'' (مجموعہ فتاویٰ عبدالحیؒ، ج ۳ ص ۲۰۴، ۲۰۵، کتاب التقلید، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی)

صحابۂ کرام وتابعینِ عظام اور سلف کے زمانے میں جو طریقہ تھا، اسی کے مطابق حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے زمانے میں بھی بلانکیر تمام دنیا کے مسلمان، ائمۂ حرمین شریفین کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتے تھے، اور آج بھی پڑھتے ہیں، وہاں کبھی ایک دوسرے کے پیچھے نماز ہونے نہ ہونے کے جھگڑے نظر نہیں آتے۔

لیکن ہمارے یہاں فروعی مسائل کے سلسلے میں ان بحثوں سے جان ہی نہیں چھوٹتی، ہمارے یہاں اجتہادی اختلاف کو حق وباطل کی طرح کا اختلاف سمجھا جاتا ہے۔

ہم حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور علامہ عبدالحیؒ لکھنوی رحمہما اللہ کے مذکورہ فتاویٰ سے اتفاق کرتے ہیں، اور اسی بنیاد پر حرمین شریفین وغیرہ میں دو رکعت پر سلام پھیرنے والے امام کی اقتداء میں وتر کی نماز کو بھی جائز قرار دیتے ہیں، اور اس موضوع پر ہمارا ایک رسالہ ''غیر حنفی کی اقتداء میں نماز کا حکم'' کے نام سے شائع بھی ہوچکا ہے۔

اہلِ علم وفقہ حضرات کو اس قسم کے مسائل میں اب توسع سے کام لینے کی زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ موجودہ زمانے میں دنیا بھر کے مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی ایک دوسرے سے ضرورتیں اور قربتیں بڑھ گئی ہیں، اور اس قسم کے مسائل میں دشواری پیش آنے لگی ہے، جو پہلے زمانے میں پیش نہ آتی تھی۔

اللہ تعالیٰ اعتدال کو اختیار کرنے کی توفیق عطاء فرمائے، اور تشدد وتعصب سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 12، اگست 2020ء - ذوالحجہ 1441ھ)

---

www.idaraghufran.org

(164)

بزرگی کا معیار قبر سے خوشبو وغیرہ کا آنا نہیں

آج کل عجیب صورتِ حال ہے، دین کی اہم اور موٹی موٹی باتوں سے بھی لوگوں کی توجہ ہٹ گئی ہے، اور بہت سے اہلِ علم واصحابِ علم، کہلائے جانے والے حضرات بھی مختلف قسم کی غلط فہمیوں اور بے اعتدالیوں میں مبتلا ہو چکے ہیں، اوران میں اتنا زیادہ ابتلائے عام ہو چکا ہے کہ اب ''اغلاطُ العوام'' کے ساتھ ساتھ ''اغلاطُ العلماء'' کو بھی واضح کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔

پھر بہت سی اغلاط تو ایسی ہیں کہ جو عوام الناس سے شروع ہوئیں، اور وہ رفتہ رفتہ اتنی مشہور ہوگئیں کہ بہت سے علماء بھی ان سے متاثر ہو گئے، خاص طور پر وہ علماء، جن کے علم کی رسائی، دین کے اصل مراجع تک بہت کم ہے۔

اور بعض اغلاط ایسی ہیں، جو علماء کے طبقہ میں ہی شروع ہوئیں، اوران کے ذریعہ سے ہی عوامُ الناس میں پھیلیں، جو یا تو اسی قسم کے علماء سے شروع ہوئیں، جن کا پہلے ذکر ہوا، یا پھر ان غلطیوں کا سبب، کچھ معتبر ومستند حوالہ جات بھی ہیں، جن کا اصحابِ علم سے آغاز موجودہ نوعیت جیسا نہ تھا، بلکہ وہ اپنی حد پر ایک طرح سے درست اور جائز درجہ میں تھا، لیکن بعد کے حضرات کی طرف سے ان چیزوں کو اپنی حدود پر قائم نہ رکھا جا سکا، اوران میں بے اعتدالیوں اور افراط، یا تفریط کا ارتکاب ہوا۔

ایسی اغلاط کو مستند علمائے سلف کی طرف منسوب کرنا درست نہیں، بلکہ ان غلطیوں کو بعد کے حضرات کی طرف ہی منسوب کرنا چاہیے۔

مثلاً آج کل بزرگی اور ولایت کے اصل معیار کو چھوڑ کر کئی دوسری چیزوں کو معیار بنایا جانے لگا ہے۔

www.idaraghufran.org

چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ فلاں بزرگ اتنے بڑے ولی تھے کہ انہوں نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔

کوئی کہتا ہے کہ فلاں صاحب اتنے بڑے بزرگ تھے کہ انہوں نے چالیس سال تک کسی سے بات تک نہ کی۔

کوئی کہتا ہے کہ فلاں اتنے بڑے بزرگ تھے کہ انہوں نے زندگی کا اتنا بڑا حصہ سب لوگوں سے الگ تھلگ فلاں جنگل، یا پہاڑ کی چوٹی پر گزار دیا۔

اور کوئی کہتا ہے کہ فلاں اتنے بڑے ولی اللہ اور اللہ کے مقرب بزرگ تھے کہ ان کی قبر سے خوشبو پھوٹ پڑی۔

حالانکہ بزرگیت اور ولایت کا اصل معیار، شریعت اور نبوت کی اتباع ہے۔

اگر کوئی اس اصل معیار پر پورا اترے، تو اس کو کسی دوسرے معیار کی ضرورت نہیں، اور اگر کوئی اس معیار پر پورا نہ اترے، تو اس کی بزرگی اور ولایت کے عنوان سے دوسری سینکڑوں علامات قائم کردی جائیں، مگر اس کو حقیقی ولایت سے تعبیر کرنا درست نہیں۔

اب جب ہم شریعتِ مطہرہ اور سنتِ نبویہ کو ملاحظہ کرتے ہیں، تو اس میں نکاح کا بھی ذکر ملتا ہے، اور بیوی بچوں، پڑوسیوں اور رشتہ داروں وغیرہ کے حقوق کا بھی ذکر ملتا ہے اور مسجد اور جامع مسجد وعید گاہ جانے اور مسجد میں اعتکاف کرنے اور لوگوں سے سلام وکلام کرنے اور دوسروں کو امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔

پھر ان کی خلاف ورزی پر مشتمل چیزوں کو کیسے بزرگی اور ولایت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید اور صحیح حدیث میں کسی کی قبر سے خوشبو آنے کو ولایت اور بزرگی کی دلیل نہیں بتلایا گیا۔

اب اگر کسی متبعِ شریعت ومتبعِ سنت ولی اللہ کی قبر سے خوشبو نہیں آتی، تو اس کو بزرگی، یا ولایت کے خلاف نہ کہا جائے گا۔

اسی طرح اگر کسی بدعتی اور غیر متبعِ سنت کی قبر سے خوشبو محسوس کی گئی، تو اس کو ولایت اور

بزرگیت کی دلیل نہیں سمجھا جائے گا، ممکن ہے کہ کسی نے معتقد بنانے کے لیے قبر پر خوشبو ڈال دی ہو، یا مٹی میں خوشبو ملا دی ہو، یا چھڑک دی ہو، جیسا کہ آج کل عرقِ گلاب چھڑکا جاتا ہے، یا قبر پر گلاب وغیرہ کے پھول چڑھا دیے جاتے ہیں اور وہاں پر موجود لوگوں کو اس کی خوشبو محسوس ہونے لگتی ہے، اسی طرح کوئی خفیہ انداز میں بھی خوشبو کا انتظام کر سکتا ہے، ایسی صورت میں خوشبو کی وجہ، وہ مادی سبب ہی ہوگا، البتہ اتنا فرق ہوگا کہ ایک صورت میں وہ سبب ظاہر اور معلوم ہے، اور دوسری صورت میں ظاہر اور معلوم نہیں۔

آج کل ایسے غالی معتقدین، بلکہ ڈھونگی اور مکار لوگوں کی کمی نہیں، جو دوسروں کو معتقد بنانے کے لیے ایسی حرکتیں کرتے ہیں، اور بعض دنیا پرست لوگ تو اس قسم کے کاموں کے لیے مزدوری اور ملازمت پر لوگوں کو مقرر کر دیتے ہیں، جو عوام کے سامنے دوسرے کی بزرگیت کا اظہار کرنے اور عقیدت مند بنانے کے لیے مختلف قسم کی مصنوعی حرکات کرتے ہیں۔

جیسا کہ آج کل بزرگوں کو ہدیہ ونذرانہ دینے کی ابتداء ان کے مخصوص لوگ کرتے ہیں، پھر دیکھا دیکھی دوسرے حاضرین بھی مقتدی بن کر نذرانے پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

البتہ اللہ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ اپنے کسی مقرب بندے کی قبر سے خوشبو مہکا دے، لیکن اس میں افراط وتفریط کرنا، یا اس کی تشہیر وتبلیغ میں ایسا غلو کرنا کہ جس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو گمراہی پھیلانے کا موقع ملے، درست طریقہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام اور تابعین وتبع تابعینِ عظام کے زمانے میں بزرگیت کے لیے ان چیزوں کو اہمیت نہ دی جاتی تھی۔

مگر تعجب ہے کہ ان چیزوں کو آج کل کے کم علم اور کم فہم اہلِ علم حضرات بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

اور زیادہ افسوس اس بات پر ہے کہ پہلے زمانوں میں جو چیزیں اہلِ بدعت وغیرہ میں رائج تھیں، اب آہستہ آہستہ وہ باتیں ایسے سلسلوں کے لوگوں میں بھی داخل ہونا شروع ہوگئی ہیں، جو اپنے آپ کو اہلُ السنۃ والجماعۃ اور متبعِ سنت بزرگوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ابتدائے عشق ہے، روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

اللہ تعالیٰ ہر قسم کی بے اعتدالیوں سے امتِ مسلمہ کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

15 شوال 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 17 شمارہ 12، اگست 2020ء - ذوالحجہ 1441ھ)

---

(165)

علاقوں اور زمانوں کے حالات مختلف ہوسکتے ہیں

موجودہ دور کے ہمارے بہت سے اصحابِ علم اور اصحابِ افتاء وفقہ میں اقتضائے زمانہ وعلاقہ کی رعایت بہت کم ہے، اور ان پر اپنے زمانہ وعلاقہ کے عرف اور حالات سے زیادہ سابق زمانوں میں تحریر کردہ کتابی چیزوں کا اثر غالب ہے۔

جبکہ سابق زمانوں کے حالات کے مطابق تالیف کردہ فقہی کتابوں سے ہٹ کر موجودہ زمانے کے معاشرہ میں جو کچھ عملاً ہو رہا ہے، اس کی حیثیت امرِ واقع کی ہے، اور سابق زمانوں کی فقہی کتابوں میں جو کچھ بہت سے مسائل کے متعلق لکھا ہوا ہے، اس کی حیثیت مخصوص واقعہ، یا فرضی واقعات وحالات کی ہے، سابق زمانے کی فقہی کتابوں میں ہر زمانہ، یا دوسرے علاقہ کے مخصوص واقعہ کے حکم کا بیان ضروری نہیں ہوتا، اور بہت سے مسائل میں حالات اور عرف کے تبدیل ہوجانے کی وجہ سے بھی حکم میں بھی فرق پڑجاتا ہے، بالخصوص جن مسائل کا تعلق عرف پر ہو، جیسا کہ طلاق وغیرہ سے متعلق بعض الفاظ کا صریح ہونا، یا کنائی ہونا، وغیرہ وغیرہ۔

پہلے زمانے میں جب موجودہ دور کے نقل وحمل اور ابلاغ کے ذرائع پیدا نہیں ہوئے تھے، اس وقت عام دیہات اور گاؤں، بلکہ قصبہ کے لوگوں کو نہ تو بڑے بڑے شہروں کے حالات معلوم ہوتے تھے، اور نہ ہی شہروں کی معاشرتی چیزوں سے واقفیت ہوتی تھی، آج بھی اکثر دیہات اور گاؤں کی معاشرت شہروں سے کافی مختلف ہوتی ہے، اور وہ دوسرے علاقوں کو بھی اپنی

طرح کا سمجھ رہے ہوتے ہیں، لیکن موجودہ دور میں نقل وحمل اور ابلاغ کے ذرائع سے گاؤں، دیہات والوں کو بھی شہروں کی بہت سی خبریں معلوم ہوجاتی ہیں، اور وہاں بھی شہروں کے اثرات پہنچ جاتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا، تو آج بھی گاؤں دیہات کے لوگ اپنے مخصوص ماحول اور معاشرت کو ہی سب علاقوں کے لیے اپنے جیسا سمجھ رہے ہوتے، جیسا کہ کنویں کا وہ مینڈک، جس کی پیدائش کنویں میں ہوئی ہو، اور وہ رات دن کنویں میں ہی رہتا ہو، وہ کنویں کے اندر سالہا سال رہنے کے باوجود یہی خیال کرتا ہے کہ شاید پوری دنیا کی حدودِ اربعہ وہی ہیں، جو کنویں کی چہار دیواری کے اندر ہیں، اور یہ کہ وہ کنویں کی ایک حد سے دوسری حد پر پہنچ کر پوری دنیا کا سفر طے کرلیتا ہے۔

حالانکہ کنویں کے اندر رہنے والے مینڈک کا یہ خیال واقع کے مطابق نہیں، وہ باہر نکلے تو اسے پتہ چلے کہ کنواں تو اس دنیا کا ایک ادنیٰ حصہ اور ذرۂ بے مقدار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سابق فقہائے کرام نے اپنے زمانے کے حالات وعرف کا تتبع اور جستجو کرنے کا اہتمام کیا، بازاروں، شہروں اور لوگوں کے عرف ورواج سے واقفیت حاصل کی، اور پھر اپنے اپنے زمانے اور اس کے عرف کے مطابق بہت سے فقہی احکام کو بیان فرمایا۔

پس ہر زمانے کے اصحابِ فقہ وافتاء اور اہلِ علم حضرات کو اپنے مخصوص ماحول اور کتاب اور مدرسہ ومسجد کی چہار دیواری سے باہر اس زمانہ اور علاقہ کے حالات سے باخبر ہونا ضروری ہے، ورنہ ان کی طرف سے بہت سی چیزوں پر جو حکم لگایا جائے گا، وہ چہار دیواری سے باہر، یا دوسرے علاقہ کے مخصوص عرف ورواج میں قابلِ قبول وقابلِ عمل نہیں ہوگا۔

موجودہ زمانے کے وہ اہلِ علم اور اہلِ فقہ حضرات، جو سابق زمانے کی مخصوص کتابوں سے ہر ہر مسئلے کا اس جیسا حکم نکالتے ہیں، وہ موجودہ عرف ورواج کے بجائے اس سابق زمانہ یا علاقہ کے مخصوص عرف پر مبنی ہوتا ہے، اگرچہ ان مصنفین کی عظمتِ شان بہت بلند ہوتی ہے۔

اسی طرح مثلاً دیوبند اور تھانہ بھون جیسے علاقے، دین کے بڑے مراکز ہیں، ان علاقوں میں بڑے بڑے اصحابِ علم ورجالِ کار اور اولیائے دین گزرے ہیں، اور اب بھی ہیں۔

لیکن پہلے زمانے میں چونکہ نقل وحمل اور ابلاغ کے ذرائع اس نوعیت کے نہیں تھے، جس نوعیت کے آج ہیں، اس لیے اس زمانے میں وہاں پر موجود بڑے بڑے اصحابِ علم واہلِ علم حضرات نے جو مخصوص عرف کے تناظر میں بعض شرعی مسائل بیان کیے اور ان کے مطابق فتاویٰ جاری کیے، ان کا موجودہ دور کے عرف ورواج، یا بڑے بڑے شہری، ماحول پر منطبق ہونا ضروری نہیں، اور ایسی صورت میں ان حضرات کے فتاویٰ اور کتابوں میں مذکور کسی مخصوص عرف ورواج کی بات کو موجودہ دور کے تمام علاقوں پر منطبق کرنے کی کوشش کرنا اور موجودہ دور کے بدلے ہوئے عرف، یا اس علاقہ کے مخصوص عرف کو نظر انداز کردینا درست نہیں۔

اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

”من لم یعرف اهل زمانهٖ فهو جاهل“

ہم نے بھی دیوبند، سہارنپور، تھانہ بھون اور جلال آباد وغیرہ سے جاری سابق زمانوں کے کئی فتاویٰ کو ملاحظہ کیا، اور اپنے علاقہ وزمانہ کے حالات اور عرف سے موازنہ کیا، تو ان میں بہت فرق پایا۔

اور جب اس قسم کے مسائل میں ہم نے اپنے علاقہ اور اپنے زمانہ کے عرف کے مطابق کسی مسئلہ کا حکم بیان کیا، تو اس پر بعض اہلِ افتاء حضرات نے تعجب کا اظہار کیا، اور کہا کہ یہ فتویٰ تو ”امداد الفتاویٰ، امداد الاحکام، یا فتاویٰ دار العلوم دیوبند“ وغیرہ کے خلاف ہے، اور اکابرِ دیوبند کی تحقیق سے متصادم ہے، اس لیے ہم اس کو نہیں مانتے۔

حالانکہ عرف وزمانے کا اختلاف، حقیقی اختلاف نہیں کہلاتا، اگر سابق زمانے کے وہ اکابر موجودہ زمانے میں ہوتے، تو وہ موجودہ زمانے کے عرف کو ملحوظ رکھ کر ہی حکم بیان فرماتے، کیونکہ اپنے زمانے کے عرف سے ناواقف شخص، جاہل کہلاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ان اکابر کی طرف اس طرح کی نسبت کرنا، درست نہیں۔

اور اس کے برعکس اگر آج کے زمانے کے علماء وفقہاء سابق زمانے میں ہوتے، تو وہ اس کے

مطابق حکم بیان فرماتے، اور یہ ظاہری وصوری اختلاف پھر بھی موجود ہوتا۔

ہمارے شیخ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہٗ کا ایک مضمون ''یادیں'' کے عنوان سے قسط وار، ان کے دارالعلوم کراچی کے ماہنامہ ''البلاغ'' میں شائع ہوتا رہا ہے، جس میں حضرت مولانا مفتی صاحب موصوف نے اپنے بچپن کے کئی واقعات وحالات کا بڑا عمدہ نقشہ پیش کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے حضرت والا کو اپنا مافی الضمیر، قلم وزبان کے ذریعہ سلیقہ کے ساتھ ظاہر کرنے کی جو نعمت عطاء فرمائی ہے، وہ بہت ہی کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے، واقعی یہ ان کے حق میں بڑی نعمت ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی صاحب موصوف کے قلم سے جوان کی زندگی کے سفرناموں کے بہت سے احوال شائع ہوئے ہیں، جن میں سے بعض کا مجموعہ ''جہانِ دیدہ'' اور بعض کا مجموعہ ''دنیا میرے آگے'' اور بعض کا مجموعہ ''سفر در سفر'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، ان اسفار میں حضرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، یا پڑھے اور کانوں سے سنے ہوئے تاثرات کا جس انداز میں سلیقہ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، وہ انداز اور سلیقہ شاید موجودہ دور میں بہت کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہو۔ **اللّٰھم زد فزد۔**

بہر حال حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہٗ کے قلم سے تحریر فرمودہ بچپن کی یادیں ماہنامہ البلاغ کراچی میں قسط وار شائع ہوئیں، اس سلسلہ کی تیرہویں قسط (جو ماہنامہ البلاغ کے صفر 1440ھ، نومبر 2018ء میں شائع ہوئی) اس میں حضرت مفتی صاحب موصوف کی طرف سے، بچپن میں پاکستان ہجرت کرنے کے بعد 1955ء عیسوی میں اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ دیوبند کے سفر کے کچھ واقعات بیان ہوئے ہیں، جن میں حضرت مفتی صاحب موصوف نے کراچی جیسے بڑے شہر میں ایک عرصہ گزارنے کے بعد دیوبند اور اس کے مقامات کو مشاہدہ کر کے جو نقشہ کھینچا ہے، وہ بڑا عبرت آمیز ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی صاحب موصوف اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:

”میرے بچپن کے ذہن میں دیوبند کی جگہوں کا جو تصور تھا، اب چھ سال میں کراچی اور لاہور کی شہری زندگی کا عادی ہو جانے کے بعد وہ ساری جگہیں بہت چھوٹی نظر آرہی تھیں، میرے ذہن میں دیوبند کے اسٹیشن اور پلیٹ فارم وغیرہ کی جو تصویر بیٹھی ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُس تصویر کو یکا یک چھوٹا کر دیا ہے، پلیٹ فارم پر رشتہ داروں کا بڑا مجمع تھا، اور والدہ صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ کے اُن سے ملنے اور سب کے چہروں سے پھوٹتی ہوئی خوشی کا منظر قابلِ دید تھا۔

ہمارا قیام اپنے ماموں جناب انوار کریم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں ہوا۔ اگلے دن میں نے اپنی بچپن کی گلیوں اور اپنے مکان کا چکر لگایا، ہمارا مکان اب شرنارتھیوں کے قبضے میں تھا، مگر انہوں نے اندر آنے کی اجازت دے دی، اور اُس میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لگایا ہوا یہ کتبہ درسِ عبرت دے رہا تھا:

دنیا کا کچھ قیام نہ سمجھو، کرو خیال
اس گھر میں تم سے پہلے بھی کوئی مقیم تھا

یہ شعر تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گھر کی تعمیر کے وقت کندہ کرایا تھا جب اس گھر کو چھوڑنے کا کوئی تصور بھی نہیں تھا، لیکن آج یہ شعر اُس کے نئے مکینوں کو عبرت دلا رہا تھا، اس کے علاوہ میرے بڑے بھائی جناب محمد رضی عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس گھر کو چھوڑتے وقت اُس کی بالائی منزل کے ایک چھجے کے نیچے کوئلے سے ایک شعر لکھ آئے تھے، یہ کوئلے سے لکھا ہوا شعر بھی اُس وقت پڑھا جاتا تھا:

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

بہر حال! اپنے گھر میں دوسروں کی اجازت سے داخل ہونے اور ان کا ممنون ہونے کے بعد ہم اپنے محلے میں نکلے، اُس کی ایک ایک چیز اپنی جگہ موجود تھی،

www.idaraghufran.org

لیکن چھوٹی نظر آرہی تھی، یہاں تک کہ وہ چوک، جس کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں کہ وہ ہمارے لیے ایک بڑے میدان، یا اسٹیڈیم کی حیثیت رکھتا تھا، اب یوں محسوس ہورہا تھا، جیسے وہ سمٹ کر ایک چھوٹا سا صحن بن گیا ہے۔

زندگی کے مختلف مراحل میں انسان مختلف چیزوں کو بڑا سمجھتا ہے، لیکن بعد میں جب ان کی حقیقت واضح ہوتی ہے، تو انسان اس بات پر ہنستا ہے کہ میں نے کس چیز کو بڑا سمجھا تھا، یہ دنیا بھی آج ہمیں بہت بڑی نظر آتی ہے، لیکن آخرت میں پہنچ کر جب اس کی حقیقت کھلے گی، تو یقیناً اپنی اس کوتاہ نظری پر ہنسی آئے گی'' (ماہنامہ البلاغ، ص: ۱۶ و ۱۷، جلد ۵۴ شمارہ ۲، صفر المظفر ۱۴۴۰ھ نومبر ۲۰۱۸ء)

اس سفر کے دوران مفتی صاحب موصوف نے دیوبند کے کچھ فاصلہ پر کھتولی کے ایک گاؤں سرائے رسول پور کا ایک واقعہ بھی ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

''اسی (سرائے رسول پور گاؤں) میں یہ دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا کہ ہماری خالہ کی ایک پڑوسن کو جب پتہ چلا کہ ہم لوگ کراچی سے آئے ہیں، تو انہوں نے مجھے اپنے گھر بلا بھیجا، یہ ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں، اور میں چونکہ بارہ سال کا بچہ تھا، اس لیے انہوں نے مجھ سے پردہ بھی نہیں کیا، گھر میں بٹھا کر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم کراچی سے آئے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، تو اُنہوں نے کہا کہ: ''تم میرے بیٹے حسین کو تو جانتے ہوگے، اُس کا کیا حال ہے؟'' میں نے کہا: ''میں تو ان کو نہیں جانتا'' اس پر خاتون کی حیرانی قابلِ دید تھی، انتہائی تعجب کے لہجے میں وہ بولیں: ''ہائے! تم کراچی میں رہتے ہو، اور حسین کو نہیں جانتے؟'' میں نے کہا: ''وہ کہاں رہتے ہیں؟'' کہنے لگیں: ''ارے وہ اُسی کراچی میں رہتا ہے، جس میں تم رہتے ہو'' اب میں سمجھا کہ یہ خاتون کراچی کو بھی سرائے رسول پور پر قیاس فرمارہی ہیں کہ جیسے یہاں رہنے والا ہر شخص ایک دوسرے کو جانتا ہے، اسی

طرح کراچی کا ہر باشندہ بھی ایک دوسرے کو جانتا ہوگا، اس پر میں نے اُن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کراچی اتنا بڑا شہر ہے کہ اُس کا ایک سرا، اگر یہاں سمجھا جائے تو دوسرا میرٹھ میں ہوگا، یہ سن کر وہ اس قدر حیران ہوئیں، جیسے میں انہیں الف لیلہ کی کوئی کہانی سُنا رہا ہوں۔

اب خیال آتا ہے کہ جب قرآن کریم جنت کے بارے میں یہ فرماتا ہے کہ اُس کی چوڑائی تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، یا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک ادنیٰ جنتی کو اتنا بڑا رقبہ دیا جائے گا، جو پوری دنیا سے دوگنا زیادہ ہوگا، تو اُس پر ہماری حیرت اُس دیہاتی خاتون کی سی ہوتی ہے، جو کراچی شہر کے بارے میں یہ تصور کرنے کو تیار نہیں تھی کہ وہ سرائے رسول پور سے اتنا زیادہ بڑا ہوگا کہ اُس میں ایک باشندہ دوسرے کو پہچانتا نہیں ہوگا، اور جس کی سادگی پر ہمیں ہنسی آجاتی ہے، لیکن وہ انبیائے کرام جو، یا تو اپنی آنکھوں سے عالمِ بالا کی سیر کر آئے ہیں، یا عالمِ بالا کے پیدا کرنے والے نے براہِ راست ان کو وہاں کی خبر پہنچادی ہے، وہ ہم دنیا کے دیہاتیوں کو حیرت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، پھر بھی ان کو ہم پر ہنسی نہیں، ترس آتا ہے'' (ماہنامہ البلاغ، ص: ۱۸و۱۹، جلد ۵۴ شمارہ ۲، صفر المظفر ۱۴۴۰ھ نومبر ۲۰۱۸ء)

یہ حضرت مفتی صاحب موصوف نے دیوبند کے اس علاقہ کا نقشہ کھینچا ہے، جو علمی وعملی اعتبار سے برصغیر میں امتیازی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن چونکہ وہ خود ایک قصبہ تھا، اور اس زمانہ میں لاہور اور کراچی جیسے شہروں کی معاشرت، دیوبند کے قصبہ سے مختلف تھی۔

تو اگر اس زمانے کے دیوبند، تھانہ بھون، سہارنپور وغیرہ کے کسی بڑے بزرگ، یا مفتی صاحب نے کوئی بات وہاں کے مخصوص ماحول ومعاشرت کے پیشِ نظر بیان، یا تحریر کردی ہو، تو اس کو تمام شہروں اور علاقوں وزمانوں کے لیے حجت قرار دینا کیسے مناسب ہوگا۔

ان چیزوں پر تعصب وغیرہ سے بالاتر ہوکر، موجودہ زمانے کے اصحابِ علم وفقہ کو ٹھنڈے دل و دماغ سے غور وفکر کرنا بہت ضروری ہے۔

ورنہ اس کے بھیانک نتائج جو نکلیں گے، وہ ہمارے سامنے ہیں، جو تعصب سے بالاتر ہوکر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور وتدبر کرنے سے سمجھ آسکتے ہیں۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 01، ستمبر 2020ء - محرم الحرام 1442ھ)

---

(166)

تفقہ فی الدین، اللہ کی طرف سے خیر کی دلیل ہے

ایک حدیثِ مبارکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَیْرًا یُّفَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ'' (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۷۱، کتاب العلم، باب: من یرد اللہ بہ خیرا یفقهه فی الدین)

''یعنی جس بندۂ مومن کے ساتھ اللہ، خیر کا ارادہ فرماتا ہے، اس کو دین کا فہم اور دین کی سمجھ بوجھ عطاء فرمادیتا ہے''۔

اس طرح کی احادیث وروایات کئی سندوں سے مروی ہیں، جن میں دین کی فہم اور دین کی سمجھ کو اللہ کی طرف سے ''خیر'' کا ارادہ ہونے کی دلیل بتلایا گیا ہے۔ [1]

---

[1] عن حمید بن عبد الرحمن، أنه سمع معاویة یقول: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: من یرد اللہ بہ خیرا یفقهه فی الدین، واللہ المعطی وأنا القاسم، ولا تزال هذه الأمة ظاهرین علی من خالفهم حتی یأتی أمر اللہ، وهم ظاهرون(صحیح البخاری، رقم الحدیث ۳۱۱۶)

عن یونس بن میسرة بن حلبس، أنه حدثه قال:سمعت معاویة بن أبی سفیان یحدث، عن رسول اللہ – صلی اللہ علیه وسلم –، أنه قال: " الخیر عادة، والشر لجاجة، ومن یرد اللہ بہ خیرا یفقهه فی الدین "(سنن ابنِ ماجه، رقم الحدیث ۲۲۱، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم)

قال شعیب الارنؤوط:إسناده جید(حاشیة سنن ابنِ ماجه)

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

اس قسم کی احادیث وروایات میں دین کی فہم اور دین کی سمجھ کو اللہ کی طرف سے خیر کے ارادہ کی دلیل بتلایا گیا ہے، دین کے محض علم کو اللہ طرف سے ''خیر'' کی دلیل نہیں بتلایا گیا، جس کی وجہ یہ ہے کہ دین کا علم تو بہت سے لوگوں کو حاصل ہو جاتا ہے، اور ''عالمِ دین'' بھی بہت سے لوگ بن جاتے ہیں، جو کہ اپنی جگہ بڑی فضیلت والا عمل ہے، لیکن دین کی سمجھ بوجھ، جس کو ''**تفقه فی الدین**'' کہا جاتا ہے، یہ نعمت بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے۔ ۲ے

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

عن محمد بن كعب القرظى، عن معاوية، قال يعلى، فى حديثه: سمعت معاوية، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول على هذه الأعواد: " اللهم لا مانع لما أعطيت، ولا معطى لما منعت، من يرد الله به خيرا يفقهه فى الدين "(مسند احمد، رقم الحديث ١٦٨٦٠)

قال شعيب الارنؤوط:إسناده صحيح على شرط مسلم(حاشية مسند احمد)

عن معبد الجهنى، قال: كان معاوية، قلما يحدث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم شيئا، ويقول هؤلاء الكلمات قلما يدعهن، أو يحدث بهن فى الجمع، عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: " من يرد الله به خيرا يفقه فى الدين، وإن هذا المال حلو خضر، فمن يأخذه بحقه يبارك له فيه، وإياكم والتمادح، فإنه الذبح "(مسند احمد، رقم الحديث ١٦٨٣٧)

قال شعيب الارنؤوط:إسناده صحيح(حاشية مسند احمد)

عن أبى هريرة، قال: قال رسول الله – صلى الله عليه وسلم –:" من يرد الله به خيرا يفقهه فى الدين "(سنن ابنِ ماجه، رقم الحديث ٢٢٠، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم)

قال شعيب الارنؤوط:إسناده صحيح(حاشية سنن ابنِ ماجه)

عن ابن عباس، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: من يرد الله به خيرا يفقهه فى الدين(سنن الترمذى، رقم الحديث ٢٦٤٥)

قال الترمذى: وفى الباب عن عمر، وأبى هريرة، ومعاوية هذا حديث حسن صحيح.

۲ے عن معاوية :قوله :(يفقهه)الفقه فى العلم :الفهم، يقال :فقه الرجل يفقه فقها إذا علم .وفقه-بالضمر -يفقه إذا صار فقيها عالما .وجعله العرف خاصا بعلم الشريعة، وتخصيصا بعلم الفروق . وإنما خص علم الشريعة بالفقه؛ لأنه علم مستنبط بالقوانين والأدلة، والأقيسة، والنظر الدقيق بخلاف اللغة، والنحو، والصرف(شرح المشكاة للطيبى، ج٢ص ٦٦٠، كتاب العلم)

(من يرد الله به خيرا) بالتنكير فى سياق الشرط فيعم أى من يرد الله به جميع الخيرات (يفقهه) بسكون الهاء لأنها جواب الشرط (فى الدين) أى يفهمه علم الشريعة بالفقه لأنه علم مستنبط

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

دین کی سمجھ بوجھ کو اللہ کی طرف سے خیر کے ارادہ کی دلیل کئی وجوہات کی بناء پر قرار دیا گیا۔

مثلاً علمِ دین سے یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں موقع پر کھڑے ہو کر پیشاب کیا ہے، لیکن ایسا کیوں کیا؟ اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا درجہ وحیثیت کیا ہے؟ یہ مسئلہ دین کی صحیح فہم اور ''**تفقه فی الدین**'' سے معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح مثلاً دین کے علم سے یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عبادت ہے، لیکن اب کس موقع پر اور کس انداز میں کس کو کون سی بات کا، امر بالمعروف، یا نہی عن المنکر کرنا، فرض ہے، یا واجب ہے، یا سنت ومستحب ہے؟ یا فرض تو درکنار، سنت ومستحب بھی نہیں، بلکہ بعض اوقات جائز بھی نہیں، یہ دین کی صحیح فہم اور ''**تفقه فی الدین**'' سے پتہ چلتا ہے۔

اسی طرح مثلاً علمِ دین سے یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ امام کے پیچھے قرائت کرنا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مشہور ومعروف قول کے مطابق منع ہے، لیکن یہ ممانعت قطعی ہے، یا اجتہادی وظنی درجہ کی ہے، جس کے خلاف فقہائے کرام کے دوسرے اقوال بھی ہیں، اس لیے قرائت خلف الامام کرنے والے پر بھی نکیر نہیں کی جاسکتی، کیونکہ وہ فعل ''امرِ منکر'' میں داخل نہیں، جب تک اپنی حدود میں ہو، یہ بات ''**تفقه فی الدین**'' سے حاصل ہوتی ہے۔

اور اسی طرح سے مثلاً نماز میں رکوع، یا قیام کے وقت رفعِ یدین کرنے کا ثبوت بھی ہے، اور نہ کرنے کا ثبوت بھی ہے، بعض فقہائے کرام اس کے قائل ہیں، بعض قائل نہیں، اب جو شخص

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

بالقوانين والأدلة والأقيسة والنظر الدقيق بخلاف علم اللغة والنحو والصرف .روى أن سلمان نزل على نبطية بالعراق فقال: هنا مكان نظيف نصلى فيه قالت: طهر قلبك وصل حيث شئت فقال: فقهت أى فهمت فمفهوم الحديث أنه من لم يتفقه فى الدين أى يتعلم قواعد الإسلام لم يرد الله به خيرا (ويلهمه برشده) بباء موحدة أوله بخط المصنف وفيه كالذى قبله شرف العلم وفضل العلماء وأن التفقه فى الدين علامة على حسن الخاتمة وروى البخارى فى الصحيح معلقا من يرد الله به خيرا يفقهه فى الدين وإنما العلم بالتعلم هكذا ذكره معلقا بهاتين الجملتين ووصله ابن أبى عاصم من حديث معاوية(فيض القدير للمناوى، تحت رقم الحديث ۹۱۰۴)

www.idaraghufran.org

مذکورہ مواقع پر رفعِ یدین نہیں کرتا، وہ بھی فعلِ منکر نہیں، اور جو کرتا ہے، وہ بھی فعلِ منکر نہیں، لہٰذا رفعِ یدین نہ کرنے، یا رفعِ یدین کرنے پر نکیر کرنا، درست نہیں، اور ایسا کرنا، خود ''فعلِ منکر'' میں داخل ہے، اور اس فعلِ منکر کے دونوں طرف کے حضرات مرتکب ہو رہے ہیں، جو ایک دوسرے پر نکیر کرتے ہیں، اور ایسی صورت میں دونوں طرف کے ''امرِ منکر'' کا ارتکاب کرنے والے، نکیر کے مستحق ہیں، یہ بات ''تفقه فی الدین'' سے معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح مثلاً بعض اوقات دین کی سمجھ بوجھ نہ ہونے سے انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنوان سے مسلمان کی تحقیر وتذلیل، اور عیب جوئی وعیب گوئی، تجسس، غیبت وغیرہ جیسے کئی گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، جیسا کہ آج کل برسرِ منبر اور برسرِ بازار، دوسرے مسلمان کا نام لے کر، اس کی تذلیل وتحقیر اور تضلیل وتفسیق کی جاتی ہے، اور دوسروں کی خفیہ باتوں کا تجسس کر کے تشہیر وتبلیغ کی جاتی ہے، اور اس کو نہی عن المنکر خیال کیا جاتا ہے، اور اسی طرح مثلاً کسی مسلمان عورت، یا فرد کی عزت لٹنے پر اس کی ذرائعِ ابلاغ پر خوب نشر واشاعت کی جاتی ہے، حالانکہ مسلمان کی عزت کو نقصان پہنچانے میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کا پردہ فاش کیا جائے۔

اسی طرح کسی فرد کی طرف سے محض ایک گستاخانہ واقعہ اور بات سرزد ہونے پر اس کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے، جبکہ معزز ہستیوں کی شان میں کی جانے والی گستاخیوں کو زبان پر لانا، اور گا گا کر دنیا کو سنانا، کون سی تبلیغ ہے؟

اس قسم کی خرابیوں کی وجہ سے اب ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے شعبے میں کافی بگاڑ آچکا ہے، یہ سب ''تفقه فی الدین'' کی کمی کی وجہ سے ہے۔

اس لیے ''تفقه فی الدین'' کی نعمت کو حاصل کرنے کی دعاء اور کوشش کرنی چاہیے۔

آج دینی مدارس وجامعات تو بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں، جہاں سے علماء کی بڑی تعداد تیار ہوتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، لیکن علم کے ساتھ ساتھ ''تفقه فی الدین''

پیدا کرنے کی کوشش کرنا بہت ضروری ہے، جس کے نتیجے میں ان شاء اللہ تعالیٰ افراط وتفریط سے نجات ملے گی، فقہ واجتہاد کے ابواب میں ترقی حاصل ہوگی اور امتِ مسلمہ کے الجھے ہوئے اور مشکل مسائل کے حل ہونے میں مدد حاصل ہوگی۔

مگر حیرت ہے کہ آج کل علماء کا ایک طبقہ، فقہ واجتہاد کے ذوق کو پیدا کرنے اور ترقی دینے کی کوشش تو کیا کرتا، اُلٹا اس باب کو بند کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

حالانکہ احادیث میں ''تفقہ فی الدین'' کو عظیم خیر، نعمت ورحمتِ الٰہی قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اس کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور یہ کام دینی مدارس وجامعات کے ذریعہ سے احسن طریقہ پر انجام پاسکتا ہے، ورنہ تو پھر اس خالی میدان میں ''تفقہ فی الدین'' اور فقہ واجتہاد کے اصول ومبادی سے ناواقف اور نااہل لوگ آکر ہی طرح طرح کے گُل کھلائیں گے، جیسا کہ آج کل عام طور پر ایسا ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ''تفقہ فی الدین'' کی نعمت حاصل کرنے، اور اس میں ترقی کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔ 10 ذوالقعدۃ 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 01، ستمبر 2020ء - محرم الحرام 1442ھ)

---

(167)

موجودہ دور کے مروَّجہ بحث ومباحثوں سے بچنے کا حکم

آج کل بہت پرفتن دور آگیا ہے، حق بات کو ماننے اور اس کو قبول کرنے کا مادہ کمزور تر پڑ گیا ہے، ضد اور ہٹ دھرمی میں اضافہ ہوگیا ہے، دین کے معاملہ میں بھی اپنی بات پر ڈٹے رہنا اور رجوع نہ کرنا، قدم قدم پر نظر آتا ہے، اگرچہ کسی کے سامنے اپنی بات کا کمزور وناحق ہونا، کیوں نہ واضح ہوجائے، تب بھی اپنی سابقہ بات پر قائم اور ڈٹے رہنے کو کمال، بہادری اور فخر کا ذریعہ خیال کیا جانے لگا ہے۔

حالانکہ حق بات کو ہر حال میں قبول کرنا چاہیے، خواہ شروع سے وہ حق بات سامنے آئے، یا کسی دوسرے موقف کو اختیار کرنے کے بعد خود سے غور وفکر کرنے کے بعد اس کے خلاف کا حق ہونا معلوم ہو جائے، یا پھر کسی دوسرے کے بتانے سے اس کا علم ہو جائے، ان چیزوں کو کسی بات کے قبول کرنے نہ کرنے میں حائل وفاصل نہیں سمجھنا چاہیے۔

حق بات جب بھی اور جہاں سے بھی ملے، اس کو قبول کرنا ہی حق پرستی کی نشانی ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ زندگی بھر مناظرے کرتے رہتے ہیں، اور بعض اوقات اپنے مقابل کی بات کا دلیل سے حق، یا راجح ہونا بھی معلوم ہو جاتا ہے، مگر اس کے باجود، وہ اپنے سابق موقف پر ہی قائم رہتے ہیں، اس میں ذرہ برابر لچک پیدا نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات تو ضد وعناد اور کبر وتعلّی کی وجہ سے اپنے سابق موقف پر مزید سختی اور تشدد پیدا ہو جاتا ہے، اور اس کو سہارا دینے کے لیے مدِ مقابل کی ذرا ذرا سی کمزوریوں کو اچھالا جاتا ہے اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے دور دراز کی تاویلات کو تلاش کیا جاتا ہے۔

اس قسم کے بحث ومباحثہ سے موجودہ دور میں اجتناب کرنے میں ہی سلامتی وعافیت ہے۔

اور اس قسم کے بحث ومباحثہ کو حقیقی مناظرہ کہنا بھی مبنی برانصاف معلوم نہیں ہوتا، جس میں اظہارِ حق اور قبولِ حق پیشِ نظر نہ ہو، بلکہ اس کو ''**مجادلة**'' یا ''**معاندة**'' اور ''**مكابرة**'' وغیرہ کہنا چاہیے۔

محققین نے ''**مناظرة**'' اور ''**مجادلة**'' وغیرہ میں فرق بیان فرمایا ہے۔[1]

---

[1] المناظرة لغة: يقال: ناظر فلانا: صار نظيرا له، وناظر فلانا: باحثه وباراه فى المجادلة، وناظر الشىء بالشىء: جعله نظيرا له .فالمناظرة مأخوذة من النظير أو من النظر بالبصيرة .

والمناظرة اصطلاحا: عرفها الآمدى بأنها تردد الكلام بين الشخصين يقصد كل منهما تصحيح قوله وإبطال قول صاحبه ليظهر الحق ، وعرفها الجرجانى بأنها: النظر بالبصيرة من الجانبين فى النسبة بين الشيئين إظهارا للصواب .

الألفاظ ذات الصلة:

أ – المجادلة:

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں﴾

www.idaraghufran.org

اہلِ حق کا یہ طریقہ نہیں، چنانچہ فقہائے کرام اور مجتہدینِ عظام، ہمیشہ حق وصواب کی تلاش میں رہے، جب بھی حق وصواب، جس کے قول میں نظر آیا، خواہ وہ اپنے سے چھوٹے، یا اپنے شاگرد کا قول کیوں نہ ہو، یا اپنے مقابلے میں کسی دوسرے مستقل مجتہد کا قول کیوں نہ ہو، اور

﴿گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ﴾

المجادلة لغة: المناظرة والمخاصمة، يقال: جدل الرجل جدلا فهو جدل من باب تعب: إذا اشتدت خصومته، وجادل جدالا ومجادلة: إذا خاصم بما يشغل عن ظهور الحق ووضوح الصواب .

والمجادلة اصطلاحا: قال الآمدى: هى المدافعة لإسكات الخصم .

والصلة بينهما أن كلا من المجادلين يريد حفظ مقاله وهدم مقال صاحبه، سواء كان حقا أو باطلا. أما المناظران فكل منهما يريد إظهار الحق .

ب – المناقشة:

المناقشة لغة: يقال: نقش الشىء نقشا: بحث عنه واستخرجه، ويقال: نقش الشوكة بالمنقاش، ونقش الحق من فلان، وناقشه مناقشة ونقاشا استقصى فى حسابه.

ولا يخرج المعنى الاصطلاحى عن المعنى اللغوى .

والصلة بين المناقشة والمناظرة أن كلا منهما يهدف إلى بيان وجه الحق.

ج – المكابرة:

المكابرة لغة: المغالبة .يقال: كابرته مكابرة، غالبته وعاندته .

والمكابرة اصطلاحا: المنازعة فى المسائل العلمية مع علم المتكلم بفساد كلامه وصحة كلام خصمه .

والصلة بين المناظرة والمكابرة التضاد من حيث الغاية والثمرة.

د – المعاندة:

المعاندة لغة: من باب ضرب، يقال: عاند فلان عنادا: إذا ركب الخلاف والعصيان، وعانده معاندة: عارضه، قال الأزهرى: المعاند المعارض بالخلاف لا بالوفاق .

والمعاندة اصطلاحا: المنازعة فى المسائل العلمية مع عدم علمه بكلامه هو وكلام صاحبه .

والصلة بين المناظرة والمعاندة التباين.

هـ – المحاورة:

المحاورة لغة: يقال: حاوره محاورة وحوارا: جاوبه، وحاوره: جادله، قال تعالى:(قال له صاحبه وهو يحاوره)ويقال: تحاوروا: تراجعوا الكلام بينهم وتجادلوا ، قال تعالى: (والله يسمع تحاوركما)

ولا يخرج المعنى الاصطلاحى عن المعنى اللغوى.

والصلة بين المحاورة والمناظرة أن كلا منهما يراجع صاحبه فى قوله(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٣٩ص ٧٢ الى ٧٤، مادة "مناظرة"حرف الميم)

اس دوسرے سے فقہی واجتہادی اختلاف کسی بھی درجے کا ہو، ان حضراتِ گرامی نے فوراً اپنے سابق موقف سے رجوع کرلیا، بعض مسائل میں تو ان حضراتِ گرامی نے فوت ہونے سے کچھ وقت پہلے، بسترِ مرگ پر رجوع کیا، اور ان کی اس حق پرستی کی وجہ سے ان کو فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کا منصب ومقام حاصل ہوا، مگر آج اس طرزِ عمل کو اپنی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے، اور اوپر سے اپنے آپ کی اِن فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کی طرف نسبت بھی کی جاتی ہے، اور اس طرح جلیلُ القدر فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کے بدنام کنندہ بننے کا سہرا بھی اپنے سر پر سجایا جاتا ہے۔

یہ کہاں کی عقل مندی ہے، اور اس میں کتنی نیکیوں کا ثواب ملتا ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ فہمِ سلیم عطاء فرمائے۔ آمین۔ 20 ذوالقعدۃ 1440ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 01، ستمبر 2020ء - محرم الحرام 1442ھ)

---

(168)

''معتقد و منتقد'' کی نظر اور طرزِ عمل میں فرق

یہ بات علماء وحکماء اور عقلاء سے مخفی نہیں کہ جو شخص کسی کا معتقد، یعنی عقیدت رکھنے والا، اور کسی کا محبّ، یعنی کسی سے محبت کرنے والا ہوتا ہے، عادتاً وعموماً اس کی نظر اپنی عقیدت مند شخصیت کے عیوب ونقائص پر نہیں پڑتی، اور وہ اس کے نتیجے میں اپنے معتقد علیہ اور محبوب کی شان میں تعریف کے قصیدے پڑھنے سے نہیں تھکتا۔

اور اس کے برعکس جو شخص کسی سے بغض وعداوت رکھتا ہے، یا کسی سے بدگمان ہوتا ہے، اس کی نظر اس کے نقائص اور عیوب سے نہیں ہٹتی، اور وہ اس کے نتیجے میں بدگمانی وبدزبانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا، اور رفتہ رفتہ تعصب وبغض میں اندھا ہوجاتا ہے، اور تنقید در تنقید میں حظ ولذت محسوس کرتا ہے، اور بعض اوقات اس کو دین کی بڑی خدمت تصور کرتا ہے۔

عربی کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ:

”فعين الرضا عن كل عيب كليلة“

”ولٰكن عين السخط تبدى المتساويا“

”یعنی رضا مندی کی آنکھ، ہر عیب کے مشاہدہ سے قاصر رہتی ہے، لیکن ناراضی اور خفگی کی آنکھ برائیوں کو ظاہر کرتی ہے“۔

مگر شریعت کا حکم رضا اور ناراضگی میں عدل وانصاف کرنے کا ہے، خواہ کوئی اپنا محبوب ومعتقد علیہ ہو، یا نہ ہو، شریعت کا حکم ہر شخص کے ساتھ عدل وانصاف کا ہے۔

سلفِ صالحین کا اسی کے مطابق عمل تھا، اسی لیے انہوں نے اپنی، یا اپنے محبوب ومعتقد علیہ بزرگوں کی شان میں مبالغہ وغلو سے کام نہیں لیا، اور اپنے مخالفین پر بے جا الزام تراشیوں کا ارتکاب بھی نہیں کیا۔

سلفِ صالحین کو تو دوسروں سے زیادہ اپنی اصلاح کی فکر دامن گیر رہتی تھی، ان کی اگر کبھی اپنے مخالفین ومعاندین پر نظر پڑتی تھی، تو اس کی بنیاد بھی ان کی اصلاح اور خیر خواہی ہوتی تھی، اسی لیے وہ اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کا اعتراف بھی کرتے تھے، اور اپنی سابقہ باتوں سے رجوع بھی کرتے رہتے تھے، اور مخالفین ومعاندین کی اچھی باتوں کا اعتراف واظہار بھی کرتے تھے۔

قریب زمانے کے اکابرِ دیوبند ومشائخ میں بھی اس طرح کے بے نظیر نمونے ملتے ہیں کہ انہوں نے سر سید احمد خان، مولانا احمد رضا خان بریلوی صاحب وغیرہ جیسے حضرات کے ساتھ بھی عدل وانصاف کا اہتمام کیا، جہاں ان کی خوبیاں نظر آئیں، ان کا اعتراف واظہار کیا، اور جہاں قابلِ اصلاح باتیں سامنے آئیں، ان کی حسبِ ضرورت وحسبِ حیثیت بغرضِ اصلاح تردید اور ان پر نکیر کی، کیونکہ احادیث میں اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے عداوت رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

مگراس کے باوجود، مذکورہ حضراتِ گرامی نے بلاوجہ کسی کے درپے ہونے، اور محض عیب جوئی وعیب گوئی کرنے، یا کسی کی تحقیر وتذلیل کرنے کا مشغلہ اختیار نہیں کیا۔

لیکن اب اس طرح کے حضراتِ علماء وصلحاء بھی بہت کم رہ گئے ہیں، موجودہ دور کے علماء و صلحاء کا بڑا طبقہ اس کے برعکس طرزِ عمل کو اختیار کیے ہوئے ہے۔

چنانچہ آج اگر اپنے معاشرے پر نظر ڈالی جائے، تو اکثریت ایسے لوگوں کی ملے گی، جو اپنے مخالف کی کسی خوبی کا اعتراف واظہار کرنے کے لیے تیار نہیں، اور اپنے گروہ اور اپنے مخصوص بزرگوں کی شان میں قصیدے پڑھنے سے کبھی وہ تھکتے نہیں۔

اس طرح کی صورتِ حال اب تمام مسالک ومذاہب اور مشارب کے بہت سے لوگوں میں ہوگئی ہے۔

چنانچہ دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے بہت سے حضرات، اپنے بزرگوں اور اکابر کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں، اوراسی طرح بریلوی اور اہلِ حدیث وغیرہ حضرات، اپنے بزرگوں کی شان بیان کرتے ہیں، اور اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی قابلِ جرح واختلاف بات سامنے آجائے، تو اولاً تو اس کو قابلِ جرح وقابلِ اختلاف سمجھتے ہی نہیں، اور ان میں بے جا تاویلات کا سہارا حاصل کر کے ان بزرگوں کو مقدس وپاکیزہ ثابت کرنے کے درپے رہتے ہیں، جس میں بعض اوقات بہت زیادہ غلو دیکھنے میں آتا ہے، اور اگر کسی وقت اختلاف وجرح کی ضرورت سمجھیں، تو ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے اس کا اظہار کرتے ہیں، جبکہ اپنے سلسلے سے ہٹ کر دوسرے حضرات کی قابلِ جرح وقابلِ اختلاف باتوں پر، ان کی مناسب تاویل توجیہ کرنے کے بجائے، طرح طرح سے الزام تراشیاں کرنے اور خوب مرچ مصالحہ شامل کرنے، اور بالآخر، ان حضرات کی طرف فسق وفجور اور کفر وارتداد اور گستاخ وغیرہ ہونے کی نسبت میں مشغول ہوکر، اور ان کی مٹی پلید کر کے دَم لیتے ہیں۔

چنانچہ عرب کے علاقہ میں علمِ حدیث پر کام کرنے والی ایک علمی شخصیت ''ناصر الدین البانی'' کے نام سے گزری ہے، اب جو لوگ ناصر الدین البانی صاحب سے اختلاف کرتے ہیں، تو وہ ان کی خدماتِ جلیلہ کا اعتراف واظہار کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں، اور ان کی صرف کمزوریوں اور تسامحات کو پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اور اس کے برعکس، جو حضرات ان سے عقیدت رکھتے ہیں، وہ ان کی علمی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے اور ان کو پاکیزہ ومقدس ہستی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا رضا احمد خان بریلوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور موجودہ دور کے ڈاکٹر ذاکر نائیک اور جاوید احمد غامدی صاحبان وغیرہ سے عقیدت ومحبت رکھنے اور نہ رکھنے والے طبقات کا بھی یہی حال ہے۔

لیکن عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اختلاف اپنی حدود میں رہنا چاہئے، کسی سے اختلاف کی بناء پر اس کی خدمات اور اچھے اوصاف کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے، بلکہ اچھے اوصاف کا اعتراف کرنا چاہیے اور عقیدت ومحبت کی بناء پر کسی کو نبیوں کی طرح پاکیزہ ومقدس ہستی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، بغض وعناد سے بچنے اور اپنی اصلاح وترقی کے درجات کو حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات، اس قسم کی کمزوریوں اور افراط وتفریط سے پاک ہے، اس لیے قیامت کے دن، اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا وسزا عطاء فرمائے گا، جہاں سب انسانوں کے باہمی اختلافات کی حقیقت اور پول کھل جائے گا، اور حق، پوری طرح واضح ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ عدل وانصاف کے دائرہ میں رہتے ہوئے عمل کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

29 ذوالقعدۃ 1440 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 01، ستمبر 2020ء - محرم الحرام 1442ھ)

www.idaraghufran.org

(169)

علماء کا غیر ضروری مسائل کے درپے ہونا

بعض علماء غیر ضروری اور غیر اہم مسائل کے درپے ہو کر اپنا اور دوسروں کا قیمتی وقت اور عمدہ صلاحیتوں کو ضائع کرتے ہیں، مثلاً بعض علماء اس چیز پر بہت زور دیتے ہیں کہ پائجامہ اور لنگی بیٹھ کر پہننا سنت ہے، اور کھڑے ہو کر پہننا مکروہ ہے، حالانکہ کسی مستند ومرفوع حدیث میں اس کے سنت، یا مکروہ ہونے کا ذکر نہیں آیا، محدثین نے اس کی وضاحت کی ہے، البتہ بعض مشائخ سے اس طرح کا مضمون منقول ہے، لیکن اولاً تو جب تک کوئی بات سنت سے ثابت نہ ہو، اس کو بلاتحقیق سنت قرار دینا درست نہیں، کیونکہ سنت کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف بلاتحقیق کسی بات کے منسوب کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر پائجامہ کھڑے ہو کر پہننے کو مکروہ بھی قرار دیا جائے، تو یہ خاص صورت پر محمول ہوگا، جہاں مثلاً کھڑے ہو کر پہننے میں بے پردگی لازم آتی ہو، یا کھڑے ہو کر پہننے سے گرنے وغیرہ کا اندیشہ ہو، جیسا کہ احادیث میں جوتے کھڑے ہو کر پہننے سے بھی اسی قسم کی وجوہات کی بناء پر منع کیا گیا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ قمیض، یا کُرتے کو ہر حال میں پائجامہ سے پہلے پہننے کے سنت ہونے پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں، اور اس کی خلاف ورزی کرنے پر سخت نکیر کرتے ہیں۔

اہلِ علم کو اس قسم کی چیزوں کے درپے ہونا، اور اوپر سے اس قسم کے مسائل میں تشدد اور سختی برتنا درست نہیں، بندہ نے اپنے بعض مضامین میں ان مسائل کی تحقیق کی ہے۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی چیزیں معاشرہ میں عام ہوگئی ہیں، بلکہ کئی فضولیات ولغویات کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ ان سے دینداروں اور مولویوں کا ایک بڑا طبقہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

آج کل مختلف حضرات کی تحریروں اور تقریروں میں اس طرح کی افراط، یا تفریط پر مبنی باتوں کا بکثرت مشاہدہ ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔آمین۔05 محرم 1441ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد18 شمارہ01، ستمبر2020ء - محرم الحرام 1442ھ)

---

(170)

علماء کی اصلاح وتنبیہ، ان کی خیر خواہی پر مبنی ہے

الحمدللہ تعالیٰ میرے دل میں اہلِ حق علمائے کرام کی بڑی قدر ومنزلت ہے، اور الحمدللہ تعالیٰ خود میرا تعلق، اور میری نسبت بھی اسی جماعت سے ہے۔

اور اسی نسبت وتعلق اور قدر ومنزلت کی وجہ سے میری علمائے کرام کے طبقہ کی طرف خاص توجہ ہے، تاکہ یہ انبیائے کرام صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے اور پکے جانشین بنیں، ایسا طرزِ عمل اختیار کریں، جس سے ان کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہو، اور ایسے طرزِ عمل سے اجتناب فرمائیں، جو اِن کی بے قدری ونا قدری کا ذریعہ ہو، اور اس سے بڑھ کر وراثتِ انبیاء کے عظیم منصب سے محرومی مقدر بنے۔

اسی وجہ سے میں وقتاً فوقتاً علمائے کرام کو توجہ دلاتا رہا ہوں، اور ''جاگو اور جگاؤ'' کی منادی کرتا رہتا ہوں۔

کسی بھی عالمِ دین کی دل میں قدر ومنزلت کی اصل بنیاد یہی انبیائے کرام کے وارث ہونے کی ہونی چاہئے، اگر کسی میں یہ نسبت نہیں ہوگی، تو اس کی یہ مخصوص قدر ومنزلت بھی دل میں نہ ہوگی، خواہ کوئی دوسری نسبت اس میں موجود ہو، اور اگر اس عظیم نسبت کے عنوان سے کچھ لوگ ایسے ہوں، جو درحقیقت اس نسبت سے محروم ہوں، اور صرف ظاہری طور پر نسبت کا نام لگا کر، اپنے آپ کے وارثِ انبیاء ہونے کے دعویدار ہوں، تو اس کی وضاحت وتوضیح بھی ضروری ہوگی، تاکہ غیر وارث کو وارث سمجھنے کی غلط فہمی نہ ہو، اور اگر کسی کا طرزِ عمل نبی کے

وارث ہونے کے خلاف ہوگا، اس کی نشاندہی بھی ضروری ہوگی۔

لیکن بعض لوگ میرے اس طریق کو غلط فہمی کی وجہ سے علمائے کرام کی مخالفت وعداوت، یا اِن کی تحقیر وتذلیل پر محمول کرتے ہیں۔

ایک صاحب نے مجھے بتلایا کہ بعض علماء آپ (یعنی بندہ محمد رضوان) پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ علماء کے حق میں تو سخت ہیں اور عوام کے حق میں نرم ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

میں نے کہا کہ اصل بات یہ نہیں، جو انہوں نے کہی، یا سمجھی، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ شریعت اور فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کی طرف سے جو سہولتیں اور آسانیاں لوگوں کو فراہم کی گئی ہیں، بندہ محمد رضوان ان کو بیان وذکر کرتا رہتا ہے، جو شرعاً مطلوب، یا محمود ہے، پھر بجائے اس کے کہ دوسرے اصحابِ علم، خود سے تحقیق کریں، یا دوسرے کی تحقیق کا علمی جائزہ لیں، اس کے برعکس بعض کم علم، یا متعصب علماء ہی، اس کی مخالفت کرتے ہیں، اور تیسیر وتسہیل پر اور اس کی وجہ سے بندہ پر طرح طرح کے اعتراض کر کے لوگوں کو متنفر کرتے اور ان کے لیے تیسیر وتسہیل کے راستہ کی رکاوٹ بنتے ہیں، جس کی وجہ سے بندہ کو ان اہلِ علم کے اعتراضات وشبہات کے جوابات دینے پڑتے ہیں، جبکہ علمی دلائل تو ان حضرات کی طرف سے بہت کم ہی پیش کیے جاتے ہیں، زیادہ تر وہ حضرات بندہ کی ذات اور نفسِ مسئلہ میں عیوب نکالتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ میں غیر مقلد ہوں، اکابر کا گستاخ ونافرمان ہوں، اور یہ مسئلہ گمراہی وغیرہ پر مبنی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اور بندہ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ بندہ میں بہت سے عیوب وذنوب ہیں، لیکن جس طرح کے یہ لوگ بندہ اور دینی مسئلہ کی طرف عیوب منسوب کرتے ہیں، وہ اس نوعیت کے ہیں کہ ان کی وجہ سے بندہ پر علمی خیانت کا الزام عائد ہوتا ہے اور لوگوں کا علمی ودینی تحقیق سے اعتماد اٹھتا ہے، اس لیے بندہ اس قسم کے اعتراضات کے جوابات کو اجمالی طور پر بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہ بھی اس لیے تاکہ سادہ لوح مسلمانوں کی دینی تحقیقات سے متعلق غلط

www.idaraghufran.org

فہمیاں دور ہوں، حاسدین ومعاندین کا علاج بندہ کے پاس نہیں۔

اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ بندہ کا عقیدہ وایمان یہ ہے کہ علمائے کرام، وارثینِ انبیاء اور عامۃُ المسلمین کے مقتداء اور رہبر ہیں، اور ان کے اوپر امتِ مسلمہ کی دینی رہنمائی ورہبری کرنے، یعنی قوم کی ڈرائیونگ کرنے کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ علمائے کرام، انبیائے عظام صلی اللہ علیہم وسلم کے سچے اور پکے وارث بنیں، اور اس نسبت کی لاج رکھیں، پس میری اس طبقہ کی صلاح وفلاح کی طرف خاص توجہ کا ہونا، اس طبقہ سے عداوت کے بجائے، محبت کی دلیل ہے۔

اور اس کی مثال ایسی ہے، جیسا کہ کوئی خاص اور عظیم شخص بیمار پڑ جائے، تو اس کی طرف معالجین اور ان کے معاونین کی زیادہ توجہ ہوتی ہے، اس کی ہمہ وقت دیکھ بھال کی جاتی ہے، اور دوسرے عام مریضوں کے مقابلے میں ایسے شخص کی دیکھ بھال اور بیماری سے حفاظت و نجات کی زیادہ جدوجہد اور کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ اس کے ساتھ بہت سے دوسرے لوگوں کی ضرورت واحتیاج وابستہ ہوتی ہے، یا ایسا شخص قوم کا قیمتی سرمایہ اور اثاثہ شمار ہوتا ہے۔

یا مثلاً کوئی گاڑی کا ڈرائیور ہو، اور اس کی گاڑی میں بہت سے لوگ سوار ہوں، تو ڈرائیور کی سلامتی کے ساتھ اس کی گاڑی میں سوار تمام مسافروں کی سلامتی وابستہ ہوتی ہے۔

بعینہٖ اسی طرح میرا عقیدہ اور ایمان ہے کہ علمائے کرام اور اصحابِ فقہ وافتاء حضرات، امتِ مسلمہ کا قیمتی سرمایہ اور اثاثہ اور وہ امتِ مسلمہ کے ڈرائیور ہیں، لہٰذا ان کو نفس وشیطان کے بہکاوے اور غلطیوں ولغزشوں سے محفوظ رکھنا، دوسروں کی بنسبت زیادہ ضروری ہے۔

علامہ ابنِ جوزی نے اپنی تصنیف ’’تلبیسِ ابلیس‘‘ میں شیطان اور ابلیس کی مختلف تلبیسات کا ذکر کیا ہے، جن میں علماء، صوفیاء اور قراء وغیرہ کے لیے شیطانی تلبیسات کا بھی ذکر ہے۔

اسی طرح اگر کچھ لوگ اس علماء کے طبقہ میں نااہل اور غیر وارثِ انبیاء داخل ہوگئے ہوں، تو دوسروں کی دینی حفاظت وسلامتی کے لیے ان سے آگاہی بھی ضروری ہے۔

چنانچہ آج کل اس طرح کے نام نہاد بہت سے لوگ، علماء کا روپ دھار کر اس شعبے اور میدان میں داخل ہوگئے ہیں، اگر ان سے عامۃ المسلمین کو آگاہ نہ کیا جائے گا، تو اس کا نتیجہ، ان کے دین میں بگاڑ وفساد اور الغرض روحانی موت کی شکل میں برآمد ہوگا، جو ایک طرح سے جسمانی موت سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہے۔

ظاہر ہے کہ چور، ڈاکو وغیرہ کو چوکیدار سے زیادہ عداوت ہوتی ہے، اس لیے میں اگر اس چوکیداری کی ذمہ داری کو اداء کروں گا، تو نااہل اور غیر حقیقی وارثِ انبیاء مجھ سے کیسے خوش ہوسکیں گے۔

اللہ تعالیٰ وارثینِ انبیاء کو سچا پکا وارث بننے اور ان کی قدر کرنے کی توفیق، اور نااہل لوگوں سے حفاظت عطاء فرمائے۔ آمین۔

15 محرم 1441 ہجری

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 18 شمارہ 01، ستمبر 2020ء - محرم الحرام 1442ھ)

---

(171)

محمد بن عبدالوہاب کے متعلق حضرت مدنی کا رجوع

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے پہلے عرب کی ایک مشہور شخصیت ’’محمد بن عبد الوہاب نجدی‘‘ کے خلاف سخت موقف اختیار کیا تھا، جو اِن کی بعض کتابوں میں شائع ہوا ہے، اور اس سے بہت سے حضرات واقف ہیں، لیکن حضرت موصوف نے تحقیق ہونے کے بعد اپنے اس موقف سے رجوع فرمالیا تھا اور اس کا اظہار واعلان بھی فرمادیا تھا، مگر یہ رجوع بہت سے لوگوں کی نظروں سے مخفی رہا، ہم بھی پہلے اس سے لاعلم تھے، بعد میں اس کا علم ہوا، اب اس کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری صاحب ’’فتاویٰ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی‘‘ میں لکھتے ہیں کہ:

اولاً حضرت مدنی کی (محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متعلق) وہی تحقیق تھی، جو مذکورہ تحریر میں ارشاد فرمائی گئی، لیکن بعد میں جب اہلِ نجد کے صحیح عقائد، ان کی معتبر کتابوں کے حوالوں سے آپ کے سامنے آئے، تو آپ نے اپنی سابقہ رائے سے رجوع فرمالیا، اور اس بارے میں ایک مفصل وضاحتی تحریر اخبار ''خلافت، بمبئی'' میں شائع کرائی، اس کے آخری الفاظ، بحوالہ ہفتہ روزہ ''سچ لکھنؤ'' درجِ ذیل ہیں:

''بہت سی باتیں، جو اہلِ نجد کی جانب منسوب کی جاتی ہیں، بالکل بے اصل ہیں، اور بعض باتیں کچھ اصل بھی رکھتی ہیں، مگر نہ ایسی کہ جن کی وجہ سے ان کو فرقۂ ناجیہ سے نکالنا جائز ہوسکے، یا جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کا مخالف قرار دے کر ان پر تبرّا کیا جائے، اور عامۂ اہلِ اسلام کو ان سے بہکایا جائے۔

لہٰذا مجھ کو اس امر کے اعلان کرنے میں ذرہ پس وپیش نہیں ہوسکتا کہ میری وہ تحقیق جس کو میں (برخلاف اہلِ نجد) رسالہ ''رجوم المدنیین'' اور ''الشہاب الثاقب'' (نقشِ حیات) میں لکھ چکا ہوں، اس کی بنیاد، کسی اُن کی تالیف وتصنیف پر نہ تھی، بلکہ محض افواہوں، یا ان کے مخالفین کے اقوال پر تھی، اب ان کی معتبر تالیفات بتا رہی ہیں کہ ان کا خلاف جمہور اہلِ سنت وجماعت سے اس قدر ہرگز نہیں، جیسا کہ ان کی نسبت مشہور کیا گیا ہے، بلکہ صرف چند جزوی امور میں صرف اس درجہ تک ہے، جس کی وجہ سے ان کی تکفیر، تفسیق، یا تضلیل نہیں کی جاسکتی (ہفتہ وار ''سچ، لکھنؤ'' 22 مئی 1925ء، شمارہ 20، صفحہ 2) (فتاویٰ شیخ الاسلام، صفحہ ۹۴، جمعیۃ پبلیکیشنز، لاہور، اشاعتِ دوم: جولائی 2015ء)

اس مسئلہ کی مزید تفصیل ہم نے اپنے دوسرے مضمون ''محمد بن عبدالوھاب نجدی کے عقائد وافکار'' میں ذکر کردی ہے، جو تحقیق وتفصیل کے متلاشی ومتمنی لوگوں کے لیے مفید ہے۔ 05 صفر 1441ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 02، اکتوبر 2020ء - صفر المظفر 1442ھ)

www.idaraghufran.org

(172)

ذمہ داریوں اور اعمال میں فرقِ مراتب کی ضرورت

آج کل اپنی ذمہ داریوں اور اعمال کے درجات میں فرق کا بہت کم لحاظ کیا جاتا ہے، اور کئی ایسی چیزوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، جو اگرچہ فی نفسہٖ عبادت اور باعثِ فضیلت شمار ہوتی ہیں، لیکن ان کا درجہ دوسری منصبی ذمہ داریوں سے کم ہوتا ہے۔

مثلاً کسی شخص کے ذمہ کوئی کام، فرضِ عین، یا واجب علی العین، یا سنتِ موکدہ علی العین ہے، لیکن وہ اس کام کو ترک کر کے، ایسے کاموں میں اپنے آپ کو مشغول کرتا ہے کہ ان کاموں کو انجام دینا، اس پر متعین طریقہ پر فرض، واجب، یا سنتِ موکدہ نہیں۔

مثلاً آج کل بعض لوگ نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے دور دراز کا مہنگا ترین سفر کر کے جاتے ہیں، اور بعض لوگ صرف تعزیت کے لیے اس طرح کے اسفار کرتے ہیں۔

اگرچہ مذکورہ مقاصد کے لیے سفر کرنا جائز اور باعثِ ثواب ہے، لیکن نمازِ جنازہ فرض علی الکفایہ ہے، اگر کچھ لوگ اس کو ادا کر لیں، تو دوسرے لوگ گناہ گار نہیں ہوتے، خواہ وہ کسی بزرگ کا نمازِ جنازہ کیوں نہ ہو۔

اسی طرح تعزیت بھی سنت ومستحب ہے، اگر کوئی سرے سے اس سنت کو ادا نہ کرے، تو گناہ گار نہیں۔

اور جس شخص کے ذمہ، مثلاً کسی کا قرض ہے اور وہ اس کو ادا نہیں کرتا، اور اس کے بجائے مذکورہ مقاصد میں پیسے خرچ کر دیتا ہے، یا اس طرح کے اسفار میں مشغول ہونے سے اس کے بیوی بچوں کے واجب نان ونفقہ میں کوتاہی لازم آتی ہے، تو اس شخص کو فرائض اور واجبات کے بجائے، ان امور میں مال اور وقت خرچ کرنا درست نہیں۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے دین کا علم رکھنے والے لوگوں کی طرف سے بھی ان اعمال میں

درجات کالحاظ نہیں کیا جاتا، اور غیر فرض علی العین، یا غیر واجب علی العین والے اعمال کو فرض علی العین، یا واجب علی العین اعمال پر ترجیح دی جاتی ہے۔

یہ سب دین کی صحیح سمجھ اور فہم کے کمزور ہونے کی نشانی ہے، دین کی صحیح فہم اور سمجھ بہت بڑی نعمت ہے، جس کو''**تفقه فی الدین**'' کہا جاتا ہے۔22 ربیع الاول 1441ھ

(ماہنامہ''التبلیغ'' جلد18 شمارہ02، اکتوبر2020ء - صفر المظفر 1442ھ)

---

(173)

یزید کو جانشین بنانے کی وجہ

آج کل اس مسئلہ پر بہت بحث کی جاتی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، اگر جلیلُ القدر صحابی تھے، تو انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ وغیرہ جیسی جلیلُ القدر اور بابرکت شخصیت کے ہوتے ہوئے، اپنے بیٹے''یزید'' کو، اپنا جانشین کیوں مقرر کیا۔

بعض لوگ اس مسئلہ پر اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ اس کی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی و بے ادبی کے بھی مرتکب ہو جاتے ہیں، حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر سب وشتم کرنا، سخت گناہ ہے۔

اس نازک مسئلہ پر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب رحمہ اللہ نے مفید مضمون تحریر فرمایا ہے، جس میں بہت سے شبہات کے جوابات ہیں، اس کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب رحمہ اللہ، ایک تفصیلی مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نظریہ ہے کہ خلافت اور نظامِ اسلامی برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لیے مادی طاقت اولین شرط ہے، اور اس میں آج صرف بنی امیہ تمام قریش میں واحد مرکز ہیں، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور بنی ہاشم اور دیگر مسلمانوں کا نظریہ، یہ ہے کہ اس کے، یعنی خلافتِ اسلامیہ کے

لیے اولین شرط تقویٰ اور خدا ترسی ہے، اور اس کے واحد مرکز بنی ہاشم اور بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

یہ دونوں اجتہادی نظریے اپنا پھل پھول لاتے ہیں، یقیناً ہمارے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نظریہ صحیح ہے، اور جمہور اسلام بھی یہی رائے رکھتے تھے، مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نظریہ کو بالکل غلط بھی نہیں کہا جا سکتا۔

بہرحال صفین کا ناگوار واقعہ پیش آیا، اور آخر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی صلح اور شرائط کی نوبت آئی، جس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد امام حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے۔

اب اس کے بعد بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دیا گیا، جس میں اندرونی سازش حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تھی، مگر اس کے لیے کوئی مستند ثبوت نہیں ہے، اور نہ یہ امر ان نصوص کے موافق ہے، جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق قرآن اور احادیثِ صحیحہ میں وارد ہیں، یا خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق وارد ہیں، اس لیے اگر زہر کا واقعہ ثابت بھی ہو جائے، تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سازش، یقیناً غلط اور بے بنیاد ہے۔

دوسرا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یزید کی خلافت کے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کوشش فرمائی، اور اس کو نامزد کیا، اور لوگوں سے بیعت کا سامان کیا، اور اسی امر کو آپ پوچھ رہے ہیں، تو اس میں مندرجہ ذیل امور قابلِ لحاظ ہیں۔

(الف)......اس کے متعلق آیا ایسی مستند تاریخی روایات موجود ہیں، جن کو ان روایاتِ صحیحہ اور نصوصِ قرآنیہ کے مقابل لایا جا سکے، جو کہ علوِ شانِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر دلالت کرتی ہیں؟ یقیناً ایسی روایات نہیں ہیں۔

اس لیے کیوں نہ کہا جائے کہ خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ خود یزید اور اس کے اعوان نے اس کے لیے کوشش کی (یہ لوگ متقی نہ تھے، اور مملوکیت پسند تھے) عام مسلمان اور بالخصوص اہلِ حجاز، اس کے خلاف تھے۔

(ب)......اگر بالفرض تسلیم بھی کرلیا جائے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خواہش، یا سعی اس کے لیے ہوئی تھی، تو جب کہ حسبِ شروطِ صلح حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ ان کی وفات ہوچکی تھی، تو پھر اب ان عہود ومواثیق کی رعایت باقی ہی نہیں رہی تھی، جو کہ بحیثیتِ صلح ضروری تھیں۔

اب اپنے اجتہاد اور رائے پر عمل کرنا رہ گیا تھا، ان کی وہ رائے کہ مستحقِ خلافت وہ قریشی شخص ہوسکتا ہے، جس میں مادی قوت اور حسنِ تدبیر ہو، اور یہ امر بنی امیہ میں عموماً اور یزید میں خصوصاً موجود ہے، یزید کو متعدد معارکِ جہاد میں بھیجنے اور جزائرِ بحرِ ابیض اور بلاد ہائے ایشیائے کوچک کے فتح کرنے، حتیٰ کہ خود استنبول (قسطنطنیہ) پر بڑی بڑی افواج سے حملہ کرنے وغیرہ میں آزمایا جاچکا تھا، تاریخ شاہد ہے کہ معارکِ عظیمہ میں یزید نے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔

اس کے فسق وفجور کا علانیہ ظہور ان (حضرت معاویہ) کے سامنے نہ ہوا تھا، اور خفیہ جو بداعمالیاں وہ کرتا تھا، اس کی ان کو اطلاع نہ تھی، ایک وہ شخص جو کہ فقیہ فی الاسلام ہے، اور حسبِ دعواتِ مستجابہ ہادی اور مہدی ہے ’’**والذین معهٗ اشداء علی الکفار رحماء بینهم تراهم رکعاً سجداً یبتغون فضلا من اللّٰه ورضوانا**‘‘ کا مصداق، اور ’’**ولکن اللّٰه حبب الیکم الایمان وزینهٗ فی قلوبکم و کرّه الیکم الکفر والفسوق و العصیان**‘‘ کا مظہر ’’**کنتم خیر امة اخرجت للناس**‘‘ اور ’’**أصحابی کالنجوم**‘‘ اور ’’**اللّٰه اللّٰه فی اصحابی لا تتخذوهم غرضاً من بعدی**‘‘ (مشکاۃ شریف،۲/۵۵۴)

www.idaraghufran.org

وغیرہ احادیث وآیات کا مورد ہے، کیا وہ کسی **مجاھر بالفسق و العصیان** کو عالمِ اسلامی کی رقاب اور اموال وغیرہ کا ذمہ دار کرسکتا ہے؟

بخاری شریف کی بعض روایات سے کچھ اس نامزدگی کے اشارات معلوم ہوتے ہیں، مگر ان میں تصریح نہیں ہے، صرف رغبت اور پروپیگنڈا مفہوم ہوتا ہے، پھر یہ بھی تصریح نہیں ہے کہ یہ پروپیگنڈا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے امر اور اطلاع سے ہو رہا ہے۔

(ج)......اگر بالفرض یہ امور تسلیم بھی کر لیے جائیں، تو غایت ما فی الباب ایک خطاء کا ارتکاب معلوم ہوتا ہے، جو کہ انسانی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری ہے، جس سے کوئی مقرب، یا ولی خالی نہیں ہوسکتا، نہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ان سے معصوم ہیں۔

اس کمزوری کا مرکز نہ صرف محبتِ اولاد ہے، بلکہ یہ تجربہ اور ظنِ قوی بھی ہے کہ امتِ مسلمہ کے اس وسیع احاطے کو بجز ایسی قاہر ہستی اور ایسے منتظم اور مادی قوت والے شخص کے، موجودہ قریش میں سے کوئی سنبھال نہیں سکتا تھا۔

بنی ہاشم اور دیگر اشخاص میں اگرچہ ایسی بے مثال ہستیاں موجود ہیں، جو کہ تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کے آفتاب ہیں، مگر یہ امر اتنے بڑے مہم امر کے لیے کافی نہیں، ورنہ **سفکِ دماء** اور اضاعتِ اموال، اور **فساد فی الارض** پیدا ہوگا، اس لیے **اھونُ البلیتین** کو اختیار کرنا لازم ہے، ادھر تنافسِ خانگی بھی رنگ لاتا ہے۔

بہرحال صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے متعلق حسنِ ظن، جس کے لیے نصوصِ متعددہ وارِد ہیں، کسی حال میں چھوڑا نہیں جاسکتا، خود یزید کے متعلق بھی تاریخی روایات، مبالغہ اور آپس کے تخالف سے خالی نہیں ہیں۔ **واللہ اعلم بالسرائر**......

والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ۔23 جنوری 1944ء

(مکتوباتِ شیخ الاسلام، ج ا ص ۲۶۶ تا ص ۲۶۸، مکتوب نمبر: ۸۸، بعنوان ''''حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو کیوں ولی عہد بنایا؟'' مرتبہ: نجم الدین اصلاحی، مطبوعہ: مطبع معارف، اعظم گڑھ، انڈیا، سنِ طباعت: 1952ء)

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 02، اکتوبر 2020ء - صفر المظفر 1442ھ)

---

(174)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کی حیثیت

آج کل المیہ یہ ہے کہ اَن پڑھ اور جاہل عوام کے سامنے، بعض علماء ایسے ایسے مسائل چھیڑنے لگے ہیں، جن کی نہ عوام کو ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی ان سے عوام کا کوئی فائدہ وابستہ ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات تو کم فہمی کی وجہ سے نقصان ہوتا ہے، پھر دوسرا المیہ یہ ہے کہ قوتِ برداشت اور تحمل و بردباری میں کمی کی وجہ سے، اپنے مقابلہ میں دوسرے کی بات کو سننا اور قبول کرنا بھی گوارا نہیں۔

افسوس کہ دیندار طبقہ اور خاص طور پر بہت سے علمائے کرام اور مقررینِ عظام بھی اس قسم کے مسائل، ایک دوسرے کے خلاف خوب چاٹ مصالحہ اور نمک مرچ لگا کر چھیڑتے ہیں، اور ماحول کو خوب گرم کرتے ہیں، اور بالفاظِ دیگر اپنی دوکان خوب چمکاتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف صفوں میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں، اس وقت نفس وشیطان نے یہ کھیل خوب ڈھول بجا کر کھیلا ہوا ہے۔

اور اس کی زَد میں علماء وصلحاء کا بڑا طبقہ آیا ہوا ہے۔

اس قسم کے مسائل میں سے ایک مسئلہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے یزید کے خلاف خروج کا

www.idaraghufran.org

ہے، جس پر طرح طرح کے تبصرے اور تجزیے کیے جاتے ہیں اور مسلمانوں کے جذبات کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر طعن وتشنیع اور نہ جانے، کتنے گناہ برپا کیے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جو بہت معتدل اور مفید ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافتِ راشدہ کا دعویٰ نہ تھا، اور اس غرض سے نہیں نکلے تھے کہ خلافت کا دعویٰ کریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیس برس گزر جانے سے خلافت کا زمانہ گزر گیا تھا، بلکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی غرض یہ تھی کہ ظالم کے ہاتھ سے رعایا کی رہائی ہو جائے، اور مظلوم کی مدد کرنا واجب ہے۔

مشکاۃ شریف میں جو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہِ وقت کی بغاوت اور اس کے ساتھ مقابلہ کرنے سے منع فرمایا، اگرچہ وہ بادشاہ ظالم ہو۔[1] تو یہ حکم اس وقت میں ہے کہ بادشاہِ ظالم کا کامل تسلط ہو گیا ہو، اور اس کے تسلط میں کسی کو نزاع نہ ہو، کوئی اس کا مزاحم نہ ہو۔

ابھی مدینہ منورہ اور مکہ معظّمہ اور کوفہ کے لوگ یزید پلید کے تسلط پر راضی نہ تھے، اور حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن عباس، اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابہ نے یزید کی بیعت قبول نہیں کی تھی۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس غرض سے نکلے تھے کہ یزید کا

---

[1] وعن عبادة بن الصامت قال: بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة فى العسر واليسر والمنشط والمكره وعلى أثرة علينا وعلى أن لا ننازع الأمر أهله وعلى أن نقول بالحق أينما كنا لا نخاف فى الله لومة لائم .وفى رواية: وعلى أن لا ننازع الأمر أهله إلا أن تروا كفرا بواحا عندكم من الله فيه برهان .متفق عليه(مشكاة المصابيح، كتاب الامارة والقضاء، الفصل الاول)

www.idaraghufran.org

تسلط دفع کریں، یعنی اس کا تسلط نہ ہونے پائے، یہ غرض نہ تھی کہ اس کا تسلط رفع کریں، یعنی یہ امر نہ تھا کہ یزید کا تسلط ہوگیا تھا، اور آپ کا مقصود یہ تھا کہ اس کا تسلط اٹھادیں۔

مسائلِ فقہیہ میں ''دفع و رفع ''میں فرق ظاہر مشہور ہے'' (فتاویٰ عزیزی، ص۲۵۲، بابُ الخلافت، ناشر: ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، سنِ طباعت: 1412 ہجری)

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ''دفع'' اور ''رفع'' کے درمیان جو فرق بیان فرمایا، وہ انتہائی مفید ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سے حضرات کو کئی قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگ نعوذ باللہ تعالیٰ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف بغاوت کا الزام بھی عائد کردیتے ہیں، اور اس کے برعکس بعض لوگ اس واقعہ سے، مسلم، فاسق حکمرانوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی دلیل پکڑتے ہیں، اور اس سلسلہ میں مذکورہ بالا معتدل موقف کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ 28 محرم 1441 ہجری

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 02، اکتوبر 2020ء - صفر المظفر 1442ھ)

---

(175)

خواتین کے مساجد میں آنے میں عدمِ تشدد

کئی احادیث میں صراحتاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم موجود ہے کہ تم اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد میں آنے سے منع نہ کرو، اور ان کو مساجد میں آنے کی اجازت دے دو۔

اسی کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو خوشبو لگا کر مساجد میں آنے، بلکہ خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلنے سے منع فرمایا ہے، اور عورت کو اجنبی و نامحرم کے لیے خوشبو لگانے پر سخت ناراضگی و ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔

حضرت نافع سے روایت ہے کہ:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : لَا تَمْنَعُوْا إِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ (صحيح مسلم، رقم الحديث ۴۴۲ "۱۳۶" كتاب الصلاة، باب خروج النساء إلى المساجد إذا لم يترتب عليه فتنة، وأنها لا تخرج مطيبة)

ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ کی بندیوں (یعنی عورتوں) کو اللہ کی مساجد میں آنے سے منع نہ کرو (مسلم)

حضرت سالم سے روایت ہے کہ:

سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ، يَقُوْلُ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: إِذَا اسْتَأْذَنَكُمْ نِسَاؤُكُمْ إِلَى الْمَسَاجِدِ فَأْذَنُوْا لَهُنَّ (صحيح مسلم، رقم الحديث ۴۴۲ "۱۳۷" كتاب الصلاة)

ترجمہ: میں نے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تمہاری عورتیں مساجد میں جانے کی اجازت طلب کریں، تو تم انہیں اجازت دے دو (مسلم)

حضرت حبیب بن ابی ثابت سے روایت ہے کہ:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَمْنَعُوْا نِسَائَكُمُ الْمَسَاجِدَ، وَبُيُوْتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ (سنن أبى داود، رقم الحديث ۵۶۷، كتاب الصلاة، باب فى خروج النساء إلى المسجد) [1]

ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم اپنی عورتوں کو مساجد سے نہ روکو، البتہ ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں (ابوداود)

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: إسناده صحيح فقد سمع حبيب بن أبى ثابت من ابن عمر نص على ذلک يحيى بن معين فى "تاريخه "برواية الدورى ص 373 قال البجلى فى "ثقاته :"سمع من ابن عمر غير شىء ومن ابن عباس .وصححه ابن دقيق العيد فى "الاقتراح "ص.430 (حاشية سنن ابى داود)

www.idaraghufran.org

حضرت نافع سے روایت ہے کہ:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا تَمْنَعُوْا إِمَاءَ اللّٰہِ مَسَاجِدَ اللّٰہِ، وَلْیَخْرُجْنَ تَفِلَاتٍ (المعجم الأوسط للطبرانی، رقم الحدیث ۳۴۱۱، مسند البزار، رقم الحدیث ۵۸۱۰) [1]

ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ کی بندیوں کو، اللہ کی مساجد میں آنے سے نہ روکو، لیکن وہ بن سنور کر (اور خوشبو لگا کر) نہ نکلیں (طبرانی، بزار)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَمْنَعُوْا إِمَاءَ اللّٰہِ مَسَاجِدَ اللّٰہِ، وَلٰکِنْ لِیَخْرُجْنَ وَہُنَّ تَفِلَاتٌ (سنن أبی داود، رقم الحدیث ۵۶۵، کتاب الصلاۃ، باب فی خروج النساء إلی المسجد) [2]

---

[1] قال أبو حذیفۃ، نبیل بن منصور البصارۃ:
وقال: لم یَرو ہذا الحدیث عن ابن عجلان إلا یحیی بن أیوب، تفرد بہ عمرو بن الربیع بن طارق"
قلت: وہو ثقۃ کما قال العجلی وغیرہ، ویحیی بن أیوب صدوق، وابن عجلان ونافع ثقتان، وابن زولاق ذکرہ بن الأثیر فی "اللباب (81 /2) "ولم یذکر فیہ جرحًا ولا تعدیلا.
وللحدیث طریق أخری ستأتی فی الحدیث الذی بعدہ (انیس الساری تخریج احادیث فتح الباری، ج۹، ص ۶۲۲۷، تحت رقم الحدیث ۴۳۸۴، حرف اللام الف)
وقال الحوینی:
قال الطبرانیُّ: "لم یرو ہذا الحدیث عن محمد بن عجلان، إلَّا یحیی ابن أیوب، تفرَّد بہ: عمرو بن الربیع بن طارق."
قُلْتُ: رضی اللہ عنک! فلم یتفرَّد بہ عمرو بن الربیع، بل تابعہ معاذ بن فضالۃ، ثنا یحیی بن أیوب المصری بسندہ سواء. أخرجہ السراج فی "مسندہ "(ج / 2ق1 / 23) قال: حدثنا حامد بن سہل، ثنا معاذ بن فضالۃ (تنبیہ الہاجد إلی ما وقع من النظر فی کتب الأماجد، لابی إسحاق الحوینی، ج ۱، ص ۲۳۶، تحت رقم الحدیث ۱۸۶)

[2] قال شعیب الارنؤوط: صحیح لغیرہ، وہذا إسناد حسن من أجل محمَّد بن عمرو -وہو ابن علقمۃ اللیثی- وباقی رجالہ ثقات. حماد: ہو ابن سلمۃ (حاشیۃ، سنن ابی داود)

www.idaraghufran.org

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ کی بندیوں کو، اللہ کی مساجد میں آنے سے نہ روکو، لیکن وہ بن سنور کر (اور خوشبو لگا کر) نہ نکلیں (ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا شَهِدَتْ إِحْدَاكُنَّ الْمَسْجِدَ فَلَا تَمَسَّ طِيْبًا (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۴۴۳ "۱۴۲" کتاب الصلاۃ)

ترجمہ: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں آئے، تو وہ خوشبو نہ لگائے (مسلم)

حضرت نافع سے روایت ہے کہ:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: كَانَتِ امْرَأَةٌ لِعُمَرَ تَشْهَدُ صَلَاةَ الصُّبْحِ وَالْعِشَاءِ فِي الْجَمَاعَةِ فِي الْمَسْجِدِ، فَقِيْلَ لَهَا: لِمَ تَخْرُجِيْنَ وَقَدْ تَعْلَمِيْنَ أَنَّ عُمَرَ يَكْرَهُ ذٰلِكَ وَيَغَارُ؟ قَالَتْ: وَمَا يَمْنَعُهُ أَنْ يَّنْهَانِيَ؟ قَالَ: يَمْنَعُهُ قَوْلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَمْنَعُوْا إِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ (صحیح البخاری، رقم الحدیث ۹۰۰، کتاب الجمعۃ، باب ھل علی من لم یشھد الجمعۃ غسل من النساء والصبیان وغیرھم؟)

ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ (اُن کے والد) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ صبح اور عشاء کی نماز کے لئے مسجد کی جماعت میں حاضر ہوتی تھیں، اُن سے کہا گیا کہ آپ (نماز کے لئے گھر سے) کیوں نکلتی ہیں؟ دراں حالیکہ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت عمر اس کو ناپسند سمجھتے ہیں، اور انہیں اس پر غیرت آتی ہے، تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ پھر حضرت عمر کو کون سی چیز اس بات سے

www.idaraghufran.org

روکتی ہے کہ وہ مجھے اس سے منع کریں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان منع کرتا ہے کہ تم اللہ کی بندیوں (یعنی عورتوں) کو اللہ کی مساجد میں آنے سے منع نہ کرو (بخاری)

اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا تقاضا یہ ہے کہ خواتین کو مساجد میں آنے سے مطلقاً منع کرنے اور اس کو حرام قرار دینے کے بجائے ان کو زیب وزینت کر کے، اور خوشبو وغیرہ لگا کر آنے سے منع کرنا چاہیے، جیسا کہ احادیث میں خواتین کو مساجد میں آنے سے منع کرنے اور خوشبو وغیرہ لگا کر آنے کی ممانعت آئی ہے۔

خواتین کے فی نفسہٖ مساجد میں آنے کے جواز کی مخصوص احادیث وروایات کے علاوہ ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ تمام مساجد میں اعظم مسجد، مسجدِ حرام اور اس کے بعد مسجدِ نبوی ہے، لیکن ان دونوں مساجد میں عہدِ رسالت سے لے کر آج تک خواتین کی آمد ورفت پر تعامل چلا آتا ہے، حرمین شریفین میں نماز کے علاوہ نفلی طواف اور زیارتِ قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی خواتین کی آمد ورفت کا تعامل پایا جاتا ہے، جہاں پر ہمہ وقت دنیا بھر کے مرد حضرات کی آمد ورفت کا بھی سلسلہ جاری ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ اور طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کو مساجد میں آنے سے مطلقاً منع کرنے کے بجائے، ان کو شرائط کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے، مثلاً یہ کہ وہ زیب وزینت کا اظہار کر کے اور خوشبو لگا کر مساجد میں نہ آئیں۔

پس اگر کسی مسجد، یا بعض مساجد میں خواتین کے لیے باپردہ طریقہ پر نماز کا معقول انتظام کر دیا جائے اور ساتھ ہی خواتین کو خوشبو لگا کر آنے اور اپنی زیب وزینت کے اظہار سے بھی منع کیا جائے تو پھر بھی بعض حضرات کی طرف سے اس پر نکیر کرنا، درست طرزِ عمل معلوم نہ ہوا۔

بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس طرح کی نکیر پر سخت ناراضگی وبرہمی منقول ہے۔

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ:

أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ : لَا تَمْنَعُوْا نِسَاءَ كُمُ الْمَسَاجِدَ إِذَا اسْتَأْذَنَكُمْ إِلَيْهَا قَالَ : فَقَالَ بِلَالُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ : وَاللّٰهِ لَنَمْنَعُهُنَّ، قَالَ : فَأَقْبَلَ عَلَيْهِ عَبْدُ اللّٰهِ : فَسَبَّهُ سَبًّا سَيِّئًا مَا سَمِعْتُهُ سَبَّهُ مِثْلَهُ قَطُّ وَقَالَ: أُخْبِرُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَقُوْلُ: وَاللّٰهِ لَنَمْنَعُهُنَّ (صحیح مسلم،رقم الحدیث ۴۴۲"۱۳۵" کتاب الصلاۃ، باب خروج النساء إلى المساجد إذا لم يترتب عليه فتنة، وأنها لا تخرج مطيبة)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم اپنی عورتوں کو مساجد میں آنے سے نہ روکو، جب وہ تم سے اس کی اجازت طلب کریں، حضرت سالم کہتے ہیں کہ (ان کے بھائی) بلال بن عبداللہ نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم ان (عورتوں) کو (مساجد سے) ضرور منع کریں گے، جس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اتنا بُرا بھلا کہا کہ میں نے اس طرح کا بُرا بھلا کہنا آپ سے کبھی نہیں سُنا، اور حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خبر دیتا ہوں (کہ تم عورتوں کو مساجد سے منع نہ کرو) اور آپ (اس کے مقابلہ میں) کہتے ہیں کہ ہم ان کو ضرور منع کریں گے (مسلم)

اس طرح کی اور بھی کئی روایات مروی ہیں۔

بہرحال خواتین کو مساجد میں آنے کے علی الاطلاق عدمِ جواز پر زور دینا اور اس انداز میں اس مسئلہ کی تبلیغ و تشہیر کرنا، جیسا کہ بذاتِ خود خواتین کا مساجد میں آنا ہی ناجائز و گناہ ہے، خواہ کوئی شرعی اصولوں کی پابندی بھی کرے، یہ درست طریقہ معلوم نہیں ہوتا۔

اس موضوع پر بندہ نے چند دن پہلے ایک مدلل و مفصل تالیف بھی کی ہے، جس میں اس مسئلہ

کے متعلق احادیث وروایات اور آثار کا غیر معمولی ذخیرہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ساتھ ہی مختلف فقہائے کرام ومحدثینِ عظام کی تصریحات بھی نقل کی گئی ہیں، جو امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہی شائع ہو جائے۔

اگر کسی صاحبِ علم کو بندہ کے موقف سے اختلاف ہو، تو اس میں فی نفسہٖ کوئی برائی نہیں، لیکن اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ پہلے بندہ کی طرف سے پیش کردہ مفصل موقف کو ملاحظہ کر لیا جائے، اور اگر اس کے باوجود اختلاف ہو، تو اس کا علمی وتحقیقی انداز میں دلائل کے ساتھ اظہار کیا جائے، جیسا کہ الحمد للہ بندہ بھی ایک مدت سے اسی طرز پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

دین کے مسائل میں اختلاف، برائے اختلاف، یا غیر تحقیقی وغیر سنجیدہ اختلاف کا طرزِ عمل سخت نقصان دہ ہے، جس کے نتائجِ بد سے آج امتِ مسلمہ دوچار ہے۔

اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ آمین۔

27 ربیع الاول 1441ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 03، نومبر 2020ء - ربیع الاول 1442ھ)

---

(176)

داؤد ظاہری وغیرہ کا اختلاف، اجتہادی ہے

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ائمہ اربعہ کا عام طور پر اختلاف، اجتہادی ہوتا ہے، یعنی جس مسئلہ میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہو، وہ مسئلہ ''مجتہد فیہ'' کہلاتا ہے۔

لیکن اس بات سے بہت سے اہلِ علم حضرات واقف نہیں کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ جو مجتہدینِ عظام ہوئے ہیں، اور ان کو مجتہدِ مطلق کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے، ان کا کسی مسئلہ میں اختلاف بھی ''اجماع'' میں مُخِل ہے، جس کی وجہ سے مسئلہ ''مجتہد فیہ'' کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے گمراہی اور فسق کا حکم لگانا درست نہیں ہوتا، بلکہ اگر کوئی مسئلہ

غیر مقبول ہو، تب بھی اس طرح کا حکم لگانا درست نہیں ہوتا۔

شمس الدین محمد بن ابی العباس شہاب الدین رملی شافعی (المتوفی: 1004ھ) فرماتے ہیں:

(والشافعی) أمام الأئمة (ومالک) بن انس إمام دار الهجرة (والنعمان) الإمام أبو حنيفة المنعوت بالخشية والخيفة وأحمد بن حنبل المتعمق فی التقوی وسفيان الثوری (وغيرهم من سائر الأئمة) كابن عيينة والليث بن سعد والاوزاعی وإسحاق بن راهويه وداود الظاهری (علی هدی من ربهم) فی العقائد وغيرها ولا أعتبار بمن تكلم فيهم بما هم بريئون منه ومناقبهم مأثورة وفضائلهم مشهورة ويكفی فيها أنتشار علمهم وتقرر جلالتهم علی مدی الأزمان وذلک لايقدر أحد علی أن يضعه لنفسه ولا لغيره ومناقبهم أكثر من أن تحصی رضی الله عنهم (والاختلاف بينهم فيما طريقه الاجتهاد (رحمة) لقوله صلی الله عليه وسلم اختلاف أصحابی رحمة والمراد بهم المجتهدون قيس بهم غيرهم (غاية البيان شرح زبد ابن رسلان، ص ۱۴، المقدمة)

ترجمہ: اور امام شافعی جو ائمہ کے امام ہیں، اور امام مالک بن انس جو دارُ الھجرۃ کے امام ہیں، اور نعمان امام ابوحنیفہ جو خشیت اور خوف کے ساتھ متصف ہیں، اور احمد بن حنبل جو تقویٰ میں حدِ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں، اور سفیان ثوری اور ان کے علاوہ دیگر تمام ائمہ، جیسا کہ ابنِ عیینہ اور لیث بن سعد اور اوزاعی اور اسحاق بن راہویہ اور داؤد ظاہری، عقائد وغیرہ میں اپنے رب کی ہدایت پر قائم ہیں، اور ان لوگوں کا اعتبار نہیں، جنہوں نے ان کی شان میں ان چیزوں پر کلام کیا ہے، جس سے یہ حضرات بریٔ ہیں، اور ان کے مناقب منقول ہیں، اور ان کے فضائل مشہور

www.idaraghufran.org

ہیں، جن کے بارے میں یہ کافی ہے کہ ان کا علم اور ان کی جلالتِ شان زمانہ دراز گزرنے کے باوجود عالم میں پھیلی ہوئی ہے، اور کوئی شخص اس بات پر قادر نہیں کہ وہ اپنے اور دوسرے کے لیے اس مقام کو حاصل کر سکے، اور ان کے مناقب احاطۂ شمار سے زیادہ ہیں، اور ان ائمہ کے درمیان اجتہاد کے طریقے پر اختلاف، رحمت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے کہ میرے اصحاب کا اختلاف، رحمت ہے، جس سے مراد مجتہدین ہیں، جن پر دوسروں کو قیاس کیا گیا ہے (غایۃ البیان)

اور علامہ عبدالحیئ لکھنوی رحمہ اللہ، ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

اگر چہ صحیح اس باب میں، جمہور کا قول ہے، مگر داؤد ظاہری کو، اس کے خلاف سے، گمراہ کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ مسائلِ شرعیہ کا اختلاف، تفسیق وتضلیل کا باعث نہیں ہے۔

''تذکرۃُ الحفاظ''میں ہے:

قال یحییٰ بن سعید الانصاری: أهل العلم أهل توسعة, وما برح المفتون يختلفون فيحلل هذا ويحرم هذا فلا يعيب هذا على هذا ولا هذا على هذا (تذكرة الحفاظ للذهبی، ج ۱ ص ۱۰۵ ، الطبقة الرابعة من الكتاب)

''یعنی یحییٰ بن سعید انصاری کہتے ہیں کہ اہلِ علم، اہلِ وسعت ہیں، مفتی، ہمیشہ اختلاف کرتے ہیں، کوئی حلال کہتا ہے، کوئی حرام، لیکن اس اختلاف کی بدولت کسی کو دوسرے کی برائی نہ کرنا چاہیے''۔

اور''شرح مقاصد''میں ہے:

المحققون من الماتريدية والاشاعرة ، لاينسب احدهما الآخر الى البدعة والضلالة، خلافا للمبطلين المتعصبين ، حتى ربما جعلوا

الاختلاف فی الفروع ایضاً بدعة وضلالة .

’’یعنی محققین ماتریدیہ واشاعرہ میں سے کوئی دوسرے کی جانب، بدعت وضلالت کی نسبت نہیں کرتے، برخلاف مبطلین متعصبین کے کہ وہ بسااوقات فروعی اختلافات کو بھی بدعت وضلالت کہنے لگتے ہیں‘‘

اور کسی مجتہد کو، اور ایسا ہی داؤد ظاہری کو کسی مسئلے میں کہ انہوں نے جمہور، یا ائمۂ اربعہ کے خلاف کیا ہو، اگرچہ ان کا وہ مسئلہ غیر مقبول وباطل ہو، گمراہ کہنا درست نہیں ہے (مجموعہ فتاویٰ عبدالحی، ج۲، ص۲۶، ۲۷، کتاب النکاح، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی)

اور علامہ انور شاہ کشمیری ’’العرفُ الشذی‘‘ میں فرماتے ہیں:

قوله :(ما أنا عليه وأصحابى إلخ) مصداقه أهل السنة والجماعة.

واشتهر أن الظاهرية ينكرون القياس وأنهم لا ينكرون الجلى بل الخفى. والفرق والتميز بين الجلى والخفى أمر ذوقى لا يمكن ضبطه وتحديده.

ونسب إلى الظاهرية أنهم لا يحتجون بأقوال الصحابة، وأقول: هذه النسبة إليهم فى معرض الخفاء فإن ابن حزم الأندلسى من كبار الظاهرية وهو يتمسک فى كتابه المجلى والمحلى بأقوال الصحابة كما نتمسک بأقوالهم.

وفى قول من الشافعى أيضا عدم الاحتجاج بأقوال الصحابة. ولا ريب فى أنه يتمسک بها فى تصانيفه.

فالحاصل أن الكلية مدخولة وبالجملة الآن مصداق الحديث اتباع المذاهب الأربعة والظاهرى، وطريق معرفة ما أنا عليه وأصحابى توارث السلف وتعاملهم وإذا اختلفوا فى شىء فالحق

www.idaraghufran.org

إلى الطرفين. والله أعلم (العرف الشذی شرح سنن الترمذی، ج۴، ص ۱۲۶، کتاب الإیمان، باب ما جاء فی افتراق ھذہ الأمة)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''جس طریقہ پر میں اور میرے صحابہ ہیں'' اس کا مصداق ''اہل السنۃ والجماعۃ'' ہیں، اور مشہور یہ ہے کہ ''ظاہریہ'' قیاس کے منکر ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ''قیاسِ جلی'' کے منکر نہیں، بلکہ ''قیاسِ خفی'' کے منکر ہیں، اور ''قیاسِ جلی وخفی'' کے مابین فرق وتمیز امرِ ذوقی ہے، جس کا ضبط وتحدید ممکن نہیں۔

اور ظاہریہ کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ وہ اقوالِ صحابہ سے حجت نہیں پکڑتے، لیکن میں کہتا ہوں کہ ان کی طرف یہ نسبت معرضِ خفاء میں ہے، کیونکہ ابنِ حزم اندلسی ''کبارِ ظاہریہ'' میں سے ہیں، اور وہ اپنی کتاب ''المجلّٰی'' اور ''المحلّٰی'' میں صحابہ کے اقوال سے اسی طرح تمسک کرتے ہیں، جس طرح ہم تمسک کرتے ہیں، اور امام شافعی کے ایک قول کے مطابق بھی صحابہ کے اقوال سے حجت نہیں پکڑی جاتی، اور اس میں شک نہیں کہ ان کی تصانیف میں صحابہ کے اقوال سے تمسک کا ذکر موجود ہے۔

پس خلاصہ یہ نکلا کہ مذکورہ تمام حضرات ''اہل السنۃ والجماعۃ'' میں داخل ہیں، اور بہرحال آج کے زمانے میں مذکورہ حدیث کا مصداق ''مذاہبِ اربعہ اور ظاہری'' ہیں، اور ''ما انا علیہ واصحابی'' کی پہچان کا راستہ سلف کا توارث اور ان کا تعامل ہے، اور جب سلف کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو، تو حق دونوں جانب ہوتا ہے۔ **واللہ أعلم** (العرف الشذی) [1]

17 ربیع الآخر 1441ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 03، نومبر 2020ء - ربیع الاول 1442ھ)

---

[1] اس کی مزید تفصیل ہماری تالیف ''شاہ ولی اللہ کے فقہی افکار'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

(177)

تکرارِ طلاق کی متعدد صورتیں اجتہادی ہیں

ایک وقت میں تین طلاقیں واقع ہونے کا جو حکم، جمہور کے نزدیک ہے، وہ اس صورت میں ہے، جبکہ ایک وقت میں باضابطہ تین طلاقیں دی جائیں، مثلاً یہ کہا جائے کہ ''تجھے تین طلاقیں ہیں'' یا ''میں تجھے پہلی، دوسری اور تیسری طلاق دیتا ہوں'' وغیرہ وغیرہ۔

اور اگر کوئی شخص تین الفاظ میں طلاق کی صراحت تو نہ کرے، البتہ ''طلاق ہے، طلاق ہے'' وغیرہ جیسے الفاظ تین مرتبہ دہرائے، تو اگر اس کی نیت ان الفاظ کو تین مرتبہ دہرانے سے تین طلاقوں کی ہی ہو، تو ائمہ اربعہ کے نزدیک اور جمہور کے نزدیک تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔ [1]

اور اگر مذکورہ صورت میں تین طلاقوں کی نیت نہ ہو، بلکہ ایک ہی طلاق کو بار بار دہرانے، یا دوسرے کو ایک طلاق واقع کرنے کے سمجھانے کی نیت ہو، اور طلاق دینے والا اس نیت کے ہونے کا دعویٰ کرے، تو حنفیہ کے نزدیک اس کی یہ نیت ''دیانۃً'' قبول کرلی جائے گی، لیکن

---

[1] البتہ علامہ ابن تیمیہ اور بعض اہلِ ظاہر کے نزدیک مذکورہ صورت میں ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔

تكرار الطلاق فی المجلس الواحد:

لو قال لمدخول بها ومن فی حكمها: أنت طالق أنت طالق أنت طالق، فی مجلس واحد، ونوى تكرار الوقوع، فإنه يقع ثلاثا عند الأئمة الأربعة، ولا تحل له حتى تنكح زوجا غيره.وهو قول ابن حزم،لما روى عن محمود بن لبيد، قال: أخبر رسول الله صلى الله عليه وسلم عن رجل طلق امرأته ثلاث تطليقات جميعا، فغضب رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم قال: أيلعب بكتاب الله عز وجل وأنا بين أظهركم؟ حتى قام رجل فقال: يا رسول الله ألا أقتله؟

وعند بعض أهل الظاهر تقع طلقة واحدة .وهو قول ابن عباس، وبه قال إسحاق وطاوس وعكرمة، لما فی صحيح مسلم أن ابن عباس قال: كان الطلاق على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبی بكر وسنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة، فقال عمر: إن الناس قد استعجلوا فی أمر كان لهم فيه أناة، فلو أمضيناه عليهم، فأمضاه عليهم(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ١ ص ٢١٠، ٢١١، مادة "اتحاد"حرف الألف)

www.idaraghufran.org

’’قضاءً‘‘ قبول نہیں کی جائے گی، بلکہ حنفیہ کے نزدیک اس کی بیوی کو بھی ایسی نیت کا اعتبار کرنا جائز نہ ہوگا ’’لان المرأۃ کالقاضی‘‘

جبکہ دیگر فقہائے کرام کے نزدیک مذکورصورت میں شوہر کی نیت، ’’قضاءً‘‘ اور ’’دیانۃً‘‘ دونوں طریقوں سے قبول کرلی جاتی ہے، اوراس صورت میں ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ شوہر کی ایک سے زیادہ مرتبہ طلاق کے الفاظ سے کچھ نیت نہ ہو، یعنی نہ تو ایک طلاق کی نیت ہو، اور نہ ہی دو، یا تین طلاق کی نیت ہو، تو پھر اکثر فقہائے کرام کے نزدیک تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی، البتہ بعض فقہاء اور علامہ ابنِ حزم کے نزدیک اس صورت میں بھی ایک طلاق واقع ہوتی ہے، کیونکہ یہاں تاکید کا احتمال پایا جاتا ہے، لہٰذا یقینی صورت کو ترجیح حاصل ہوگی۔

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ مرتبہ الفاظِ طلاق دہرانے اور کوئی نیت نہ ہونے کا مسئلہ، صراحتاً تین طلاقیں دینے سے اھون ہے۔

آج کل جہالت، کم علمی، دینی مسائل سے ناواقفیت اور دینی احکام کی اہمیت نہ ہونے کی وجہ سے اکثر عوام کا حال یہ ہے کہ انہیں طلاق کے احکام اور اس کی مختلف صورتوں میں فرق کا بھی علم نہیں، اور وہ غصہ میں آ کر سوچے سمجھے بغیر، متعدد مرتبہ طلاق کے الفاظ بول دیتے ہیں، اور بعض فقہائے کرام نے مجتہد فیہ مسائل میں جہالت کو عذر تسلیم کیا ہے۔

اس لیے موجودہ حالات میں اگر کوئی شخص تین مرتبہ طلاق کے الفاظ دہرا کر یہ دعویٰ کرے کہ اس نے ایک طلاق کی نیت کی تھی، تو بندہ کے نزدیک ’’فیما بینی وبین اللہ‘‘ بعض دوسرے فقہاء کے قول پر عمل کرتے ہوئے، اس کی نیت کو ’’قضاءً‘‘ و ’’دیانۃً‘‘ قبول کیے جانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، مزید احتیاط کے لیے اس سے حلف لیا جاسکتا ہے۔

اور اگر شوہر نے کوئی بھی نیت نہ کی ہو، یعنی نہ تو ایک طلاق کی اور نہ ہی تین طلاق کی، جیسا کہ لاعلم عوام کا حال ہے، تو اس صورت میں بھی بندہ کا ذاتی رجحان بعض فقہاء اور ابنِ حزم کے

قول پر ایک طلاق قرار دینے کی گنجائش کی طرف ہے، اگرچہ شافعیہ وغیرہ نے اس کو مرجوح قول قرار دیا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مرجوح ہونا اس صورت میں ہونا چاہئے، جبکہ ایک اور تین کے احکام میں متکلم کو فرق معلوم ہو، اور جہاں ایسا نہ ہو، جیسا کہ آج کل کے بیشتر عوام کی حالت ہے، اور متکلم خود بھی اس کا اعتراف کر رہا ہو، تو اگر متکلم کی بات پر اطمینان ہو، تو پھر حکم مختلف ہونا چاہیے۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔** [1]

''مجموعۂ فتاویٰ عبدالحیؒ'' میں ہے کہ:

سوال...... زید نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین مرتبہ کہہ دیا کہ ''تجھ پر طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے'' لیکن اس نے غصے میں بلانیتِ ایقاعِ ثلاثہ اور بے معنیٰ اور حکم سمجھے ہوئے کہا ہے۔

---

[1] وإن أراد التأكيد أو الإفهام فإنه تقع واحدة .
وتقبل نية التأكيد ديانة لا قضاء عند الحنفية والشافعية، وتقبل قضاء وإفتاء عند المالكية والحنابلة.
وإن أطلق فيقع ثلاثا عند الحنفية والمالكية والحنابلة، وهو الأظهر عند الشافعية؛ لأن الأصل عدم التأكيد .
والقول الثانى عند الشافعية أنه تقع طلقة واحدة؛ لأن التأكيد محتمل، فيؤخذ باليقين .وهو قول ابن حزم .
ومثل: أنت طالق أنت طالق أنت طالق، قوله: أنت طالق طالق طالق، عند الحنفية والمالكية والشافعية وكذلك الحنابلة، فى وقوع الطلاق وتعدده عند نيته، وفى إرادة التأكيد والإفهام .أما عند الإطلاق فإنه يقع الطلاق ثلاثا فى الأولى، وتقع واحدة فى الثانية (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ا ص ١١٢، مادة "اتحاد" حرف الألف)
فإن لم ينو عددا من الطلاق فهى واحدة، لأنها أقل الطلاق فهى اليقين الذى لا شك فيه أن يلزمه، ولا يجوز أن يلزم زيادة بلا يقين.......
فلو قال لموطوءة :أنت طالق أنت طالق أنت طالق -فإن نوى التكرير لكلمته الأولى وإعلامها فهى واحدة، وكذلك إن لم ينو بتكراره شيئا -فإن نوى بذلك أن كل طلقة غير الأخرى فهى ثلاث إن كررها ثلاثا، ولا اثنتان إن كررها مرتين بلا شكفلو قال لغير موطوءة منه :أنت طالق أنت طالق فهى طلقة واحدة فقط، لأن تكراره للطلاق وقع -وهى فى غير عدة منه -إذ لا عدة على غير موطوءة بنص القرآن وهى أجنبية بعد، وطلاق الأجنبية باطل.
واختلف الناس فى هذا :-فقالت طائفة كما قلنا(المحلى بالاثار لابن حزم،ج٩ ١،ص ٤٠٥، ٤٠٦، كتاب الطلاق،مسألة قال أنت طالق ونوى اثنتين أو ثلاثا)

www.idaraghufran.org

پس تین طلاق واقع ہوں گی، یا نہیں؟

یہاں بعض کہتے ہیں کہ حکم ظاہرِ احادیث کے واقع نہ ہوں گی، اور بعض کہتے ہیں کہ فقہائے محدثین کی تحقیق کے موافق واقع ہوں گی۔

پس آپ فرمائیں کہ اس بارے میں چاروں مذہب کا اختلاف ہے، یا اتفاق؟ اور کون حدیث سند ہے، اور نہ واقع ہونے پر کون حدیث دلالت کرتی ہے، اور پھر اس حدیث میں کیا علت تھی، اور کون حدیث اس کے معارض ہوئی، جو اہلِ مذہب نے چھوڑ دیا؟

جواب......: جو شخص، تین طلاق دے، اور اس کا مقصد، اخیر سے تاکید نہ ہو، تو اس صورت میں جمہور صحابہؓ وتابعین وائمہؒ اربعہ، واکثر مجتہدین وبخاری، وجمہور محدثین کے مذہب کے موافق، تین طلاق واقع ہوں گی، البتہ بوجہ ارتکاب، خلاف طریقۂ شرعیہ کے گناہ لازم ہوگا (بیک وقت تین طلاق واقع ہونے کے دلائل تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں) باقی وہ حدیث، جو صحیح مسلم وغیرہ میں مروی ہے:

كان الطلاق على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأبى بكر، وسنتين من خلافة عمر، طلاق الثلاث واحدة، فقال عمر بن الخطاب: إن الناس قد استعجلوا فى أمر قد كانت لهم فيه أناة، فلو أمضيناه عليهم، فأمضاه عليهم.

''کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دو برس تک، تین طلاقوں سے ایک طلاق واقع ہوا کرتی تھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ اس بات میں جلدی کرنے لگے ہیں، جس میں ان کو تاخیر کا حکم تھا (یعنی حکم تو الگ الگ وقتوں میں تین طلاق دینے کا تھا، اور وہ ایک ہی وقت میں تین کی نیت کے ساتھ طلاقیں دینے لگے ہیں، اور پہلے اس طرح تین کی نیت نہ کیا کرتے تھے) پس اگر ہم تین

ہی نافذ کر دیں تو مناسب ہوگا، چنانچہ انہوں نے تین طلاق ہی واقع ہو جانے کا حکم دے دیا''

تو جمہور فقہاء ومحدثین کے نزدیک، اس کی تاویل یہ ہے کہ اوائل میں تین مرتبہ طلاق کے الفاظ اگر کہتے تھے، تواس سے تاکید منظور ہوتی تھی، اس وجہ سے وہ ایک ہی طلاق مانی جاتی تھی، نہ یہ کہ تین الفاظ سے تین طلاق بھی مقصود ہو، اور پھر وہ ایک ہی طلاق مانی جائے۔اس کو نووی اور ابنِ ہمام وغیرھما نے ذکر کیا ہے

(مجموعہ فتاویٰ عبدالحی، ج۲،ص ۷۴، ۷۵، کتاب النکاح، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی)

مذکورہ فتویٰ میں، تاکید کی نیت نہ ہونے کی صورت میں ہی، جمہور کے نزدیک تین طلاق واقع ہونے کا حکم بیان کیا گیا ہے۔

اور موجودہ دور میں، جبکہ عام طور پر عامۃ الناس کی نیت، تین طلاق دینے کی نہیں ہوتی، تو اس کو تین طلاق دینے کی نیت، یعنی''قد استعجلوا''میں داخل کرنا مناسب نہیں۔

اور آج کل، جو بعض فتاویٰ میں تاکید کی نیت ہونے کی صورت میں بھی تین طلاق کے حکم کو جمہور اور ائمہ اربعہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یہ خلافِ واقعہ ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں''مجموعہ فتاویٰ عبدالحیٔ''میں ہے کہ:

اس صورت میں حنفیہ کے نزدیک، تین طلاقیں واقع ہوں گی، اور بغیر تحلیل کے نکاح، نہ درست ہوگا۔مگر بوقتِ ضرورت کہ اس عورت کا علیحدہ ہونا، اس سے دشوار ہو، اور احتمال مفاسدِ زائدہ کا ہو، اگر تقلید کسی اور امام کی کرے گا، تو کچھ مضائقہ نہ ہوگا (مجموعہ فتاویٰ عبدالحی، ج۲، ص۶۹، کتاب النکاح، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی)

آج کل تین طلاق کا حکم لگانے کے بعد جو معاشرتی مفاسد عام طور پر لازم آتے ہیں، اور اکثر وبیشتر عوام کا حال یہ ہے کہ جب ان کو فقہ حنفی میں گنجائش نہیں ملتی، تو وہ غیر مقلد حضرات سے فتویٰ لے کر اپنے مسئلہ کو حل کر لیتے ہیں، اور اس طرح جمہور فقہائے کرام اور ائمہ اربعہ کے

متبعین سے آزاد ہوکر، زندگی گزارتے ہیں، اور اس کے اثرات، زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑتے ہیں، ایسے حالات میں جمہور فقہائے کرام کے مقابلے میں، ائمۂ اربعہ، یا ان کے متبعین میں سے کسی قول پر گنجائش پیدا کرنا، بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

یہ بات یاد رہے کہ مذکورہ حکم اس صورت میں ہے، جبکہ شوہر اپنی بیوی کو اس وقت طلاق دے، جبکہ نکاح کے بعد وہ کم از کم ایک مرتبہ صحبت و جماع کر چکا ہو، لیکن اگر نکاح ہونے کے بعد ابھی شوہر نے ایک مرتبہ بھی صحبت نہیں کی، اور اس سے پہلے ہی طلاق دے دی، تو اگر شوہر نے تین طلاقیں آگے پیچھے الفاظ میں دی ہوں، مثلاً یہ کہا ہو کہ ''تجھے ایک طلاق، دوسری طلاق، تیسری طلاق'' یا مثلاً یہ کہا ہو کہ ''طلاق، طلاق، طلاق'' یا اسی طرح کا کوئی جملہ کہا ہو، جس میں تینوں طلاقیں آگے پیچھے دی ہوں، تو اس صورت میں حنفیہ و شافعیہ کے نزدیک بھی صرف ایک طلاق ہی واقع ہوتی ہے، دوسری اور تیسری طلاق واقع نہیں ہوتی، کیونکہ صحبت و جماع سے پہلے طلاق دینے کی صورت میں عورت پر عدت واجب نہیں ہوتی، اور وہ پہلی طلاق ہوتے ہی فوراً اجنبی ہو جاتی ہے، اور مزید طلاق کا محل نہیں رہتی، اسی وجہ سے ایسی عورت کو طلاق ملتے ہی فوراً دوسرے شخص سے نکاح کرنا بھی جائز ہو جاتا ہے۔ [1]

25 ربیع الآخر 1441ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 03، نومبر 2020ء - ربیع الاول 1442ھ)

---

[1] للعلماء فی تكرير الطلاق لغير مدخول بها فی مجلس واحد ثلاثة آراء:
أ – الأول: وقوع الطلاق واحدة، اتحد المجلس أم تعدد.
وهو قول الحنفية والشافعية وابن حزم؛ لأنها بانت بالأولى وصارت أجنبية عنه، وطلاق الأجنبية باطل.
الثانی: وقوع الطلاق ثلاثا إن نسقه، وهو قول المالكية والحنابلة، فإن فرق بين كلامه فهی طلقة واحدة.
الثالث: وقوع الطلاق ثلاثا إن كان فی مجلس واحد، فإن كان فی مجالس شتى وقع ما كان فی المجلس الأول فقط .وهو مروی عن إبراهيم النخعی (الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ١ ص ٢١٢، مادة "اتحاد"حرف الألف)

www.idaraghufran.org

(178)

پندرہ شعبان کا روزہ

قریبی دور کے بعض مشائخ نے پندرہ شعبان کے روزہ کو ایک حدیث کی وجہ سے مستحب قرار دے دیا ہے، اور ہمارے علاقہ کے بہت سے لوگوں میں آج کل یہی بات زیادہ مشہور ہے، جبکہ بعض اہلِ علم حضرات، خاص پندرہ شعبان کے روزہ کے سنت ومستحب ہونے کا انکار کرتے ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ خاص پندرہ شعبان کے روزے کا ذکر صرف ایک مرفوع حدیث میں آیا ہے، جس کے متعلق بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ حدیث ''ضعیف'' ہے، اور ضعیف حدیث فضیلت کے باب میں بعض شرائط کے ساتھ معتبر ہو جاتی ہے، لیکن بہت سے اہلِ علم حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ حدیث ''شدید ضعیف'' ہے، جس سے خاص پندرہ شعبان کے روزہ کے مستحب ہونے کا ثبوت مشکل ہے، اور اس حدیث کے علاوہ کسی اور مستند ومعتبر مرفوع حدیث میں بھی خاص پندرہ شعبان کے روزہ کی فضیلت وثبوت کا حکم نہیں ملتا، جبکہ پندرہویں شعبان کی رات کے فضائل کا ثبوت مختلف احادیث وروایات سے ملتا ہے، جو مجموعی طور پر صحیح لغیرہٖ، یا حسن لغیرہٖ تک پہنچ جاتی ہیں، اور ان سے پندرہویں شعبان کی رات کی فضیلت کا ثبوت ہونے میں شبہ نہیں رہ جاتا۔

البتہ جن حضرات کو پندرہویں شعبان کی رات کی فضیلت سے متعلق ان مجموعی روایات کی اسناد پر غور کرنے کا موقعہ حاصل نہ ہوا، انہوں نے اس سے اختلاف کیا، لیکن دلیل کے لحاظ سے اس رات کی فضیلت کا ثابت ہونا راجح معلوم ہوا۔

مگر پندرہویں شعبان سے متعلق ان سب روایات میں پندرہویں شعبان کی رات کی فضیلت کے ساتھ پندرہ شعبان کے روزہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا، اسی وجہ سے جمہور فقہائے کرام نے بھی مسنون اور مستحب روزوں کے ساتھ خاص پندرہویں شعبان کے روزے کا ذکر نہیں کیا، البتہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماہِ شعبان میں کثرت سے روزے رکھنے کی وجہ سے مطلق ماہِ شعبان میں روزہ رکھنے، یا کثرت سے روزے رکھنے کو مستحب قرار دیا ہے، سوائے بعض مخصوص صورتوں کے۔

اور ماہِ شعبان میں روزوں کا استحباب، خاص پندرہویں شعبان کے روزہ کے استحباب سے الگ چیز ہے، اور ماہِ شعبان کے روزوں کی اصولی فضیلت واستحباب سے خاص پندرہ شعبان کے روزہ کے استحباب کے ثبوت کا دعویٰ مشکل ہے۔

کچھ دن پہلے ایک ماہنامہ میں ایک سوال اور جواب شائع ہوا تھا، جس میں سوال کیا گیا تھا کہ دو افراد کا پندرہ شعبان کے روزہ کے مستحب ہونے، نہ ہونے میں اختلاف ہے، ان میں سے کس کا قول صحیح ہے اور کس کا قول غلط ہے؟ مجیب صاحب نے اپنے جواب میں پندرہ شعبان کے روزہ کے مستحب ہونے پر بہت زور دیا، اور اس کے دلائل دیتے ہوئے ایسی عبارات کو بھی پیش کیا، جو خاص پندرہ شعبان کے بجائے، مطلق ماہِ شعبان کے روزوں، کے استحباب سے متعلق ہیں، اور ان مجیب صاحب نے پندرہ شعبان کے روزہ کے مستحب ہونے کا قول جمہور کا بتلایا، اور پندرہ شعبان کے روزہ کے مستحب ہونے کا انکار کرنے والے پر سخت نکیر کی۔

حالانکہ اس پر نکیر کے کوئی معنیٰ نہیں، کیونکہ دوسرا موقف بھی بلا دلیل نہیں ہے، جیسا کہ ذکر کیا گیا۔

آج کل زیادہ خرابی اس وجہ سے لازم آتی ہے کہ اپنے، یا اپنے بزرگوں کے بیان کردہ کسی موقف پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے، اور اس سلسلے میں دوسرے موقف کو یکطرفہ طور پر رَد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور یہ نہیں سوچا جاتا کہ اس قسم کے فروعی اور اجتہادی مسائل میں زیادہ سختی اور تشدد والا طریقہ فی نفسہٖ بھی جائز نہیں، اور اس کی وجہ سے امتِ مسلمہ میں جو خواہ مخواہ کا فتنہ وانتشار لازم آتا ہے، وہ الگ گناہ ہے، اس لیے اس قسم کے مسائل میں لچک کا مظاہر کرنا مناسب ہے۔25 رجب 1441ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 04، دسمبر 2020ء - ربیع الآخر 1442ھ)

(179)

یک طرفہ جذباتی فیصلوں کا نقصان

ہماری قوم میں ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ عام طور پر یکطرفہ جذباتی فیصلے اور احکام صادر کر دیے جاتے ہیں، اور ان کے درجات اور حد بندیوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے کئی دینی اور دنیاوی نقصانات اور فسادات لازم آتے ہیں۔

چنانچہ بہت سے علماء اور دینی ذہن رکھنے والے عوام یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص بھی اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کر بیٹھے، تو اس کو عامی شخص کا خود سے موقع پر قتل کر دینا، بہت بڑی عبادت اور ہمت، جرائت وشجاعت والا کام ہے، جس کو بڑی جلدی ''غازی'' ہونے کے تمغہ سے نواز دیا جاتا ہے، خواہ ایسے فعل کا مرتکب فاسق وفاجر اور بے نمازی، اور شرابی وغیرہ کیوں نہ ہو، اور اوپر سے جج وقاضی، بلکہ مفتی بھی ایک طرح سے عامی شخص کو قرار دے دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے علم اور فیصلے کے مطابق، جس کو گستاخِ رسول سمجھے، اس کو خود سے ہی مرتد سمجھ کر قتل کر دے، اب ظاہر ہے کہ عوام الناس کے پاس اتنا علم نہیں ہوتا، جو کسی مسلمان کو کافر قرار دینے کے لیے ضروری ہے، اور عوام الناس کا حال یہ کہ وہ جس طرح کے عالم، یا جس ملک کے عالم سے بات سنتا ہے، اس کو صحیح سمجھتا ہے، جبکہ ہمارے یہاں ایک مسلک کے شخص کا دوسرے مسلک کے شخص کو کافر، مرتد، گستاخ، بے ادب وغیرہ قرار دینے کی روایت بھی عام ہے، ایسی صورت میں اگر کوئی عامی شخص اپنے علم اور فہم کے مطابق کسی موحّد اور متقی عالمِ دین کو گستاخ سمجھ کر قتل کر دے، تو پھر کیا بنے گا؟

ظاہر ہے کہ اس طرح کی خرابیوں کی اصل وجہ یہی ہے کہ جج، قاضی اور مفتی کا منصب عوام کے ہاتھوں میں لینے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

اسی طرح مثلاً آج کل ''کورونا'' (Corona) کی بیماری چلی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے

ڈاکٹروں اور سرکاری عملے کی پوری توجہ اسی طرف ہوگئی ہے، اور بڑے بڑے ہسپتالوں کے پورے پورے وارڈ اس کام کے لیے مختص کردیے گئے ہیں، جہاں صرف چند ایک مریضوں پر ساری صلاحیتیں خرچ ہورہی ہیں، اور دوسرے اہم مریضوں کو جو روزانہ ہزاروں کی تعداد میں دوسری بیماریوں میں مبتلا، وہاں سے مستفید ہوتے تھے، ان کو محروم کیا جارہا ہے۔

اسی طرح مثلاً ’’کورونا‘‘ کی وجہ سے لوگوں کو’’ماسک‘‘ پہننے کی ترغیب دی جاتی ہے، اور تاکید بھی کی جاتی ہے، بعض لوگ خود بھی اس کا بہت اہتمام کرتے ہیں، لیکن وہ ماسک کے صاف ستھرا ہونے، ایک استعمالی ماسک دوسرے کے استعمال کرنے اور اس کو بار بار ہاتھ سے چھونے وغیرہ جیسی چیزوں کی طرف توجہ نہیں کرتے، جس کی وجہ سے ماسک پہن کر زیادہ بڑے نقصان کا شکار ہوجاتے ہیں۔

ایک چیز آج کل اور بھی چلی ہوئی ہے کہ مثلاً تنبیہ کی غرض سے کافروں کے کسی ملک کی مصنوعات سے بائیکاٹ کی مہم چلائی جاتی ہے، تو اولاً تو اس کو ایک فرض چیز سمجھ لیا جاتا ہے، اور جو کوئی اس میں مبتلا ہو، اس کو ناجائز وگناہ کے کام کا مرتکب سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اس بائیکاٹ کا مقصود دوسرے کو تنبیہ کرنا، اور کسی عمل سے باز رکھنا بتلایا جاتا ہے، نہ یہ کہ اس چیز کی خرید وفروخت، شراب وغیرہ کی طرح حرام ہوچکی ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود خود مسلمان، تجارت میں جن محرمات ومنکرات کے مرتکب ہیں، اور ان سے بچنا فرض ہے، ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، نیز اس بائیکاٹ کی وجہ سے اپنے مسلمان بھائیوں کو بھی نقصان اور طرح طرح سے تکالیف پہنچانا شروع کردیتے ہیں، جو کہ حرام اور کبیرہ گناہ ہوتے ہیں، اور ان سے بچنا فرض ہوتا ہے۔

05 ذوالقعدۃ 1441ھ

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 18 شمارہ 04، دسمبر 2020ء - ربیع الآخر 1442ھ)

---

(180)

تکفیرِ شیعہ کے متعلق معتدل اصولی موقف

اہلِ تشیع کے متعلق ہمارا اصولی موقف یہ ہے کہ ان میں جو لوگ، کوئی نا قابلِ تاویل کفریہ عقیدہ رکھتے ہوں، وہ تو کافر ہیں، اور جو لوگ اس طرح کا کوئی کفریہ عقیدہ نہ رکھتے ہوں، وہ کافر نہیں۔

کفریہ عقائد، نیز اہلُ السنۃ والجماعۃ سے ہٹ کر دوسرا کوئی گمراہ کن اور باطل عقیدہ ونظریہ رکھتے ہوں، یا حرام فعل کا ارتکاب کرتے ہوں، تو وہ اپنی اس گمراہی کی حیثیت اور درجہ کے مطابق گمراہ ہیں، کوئی زیادہ اور بڑا گمراہ، اور کوئی اس سے کم، یا چھوٹا گمراہ۔

کیونکہ جو عقائد ونظریات اہلُ السنۃ والجماعۃ کے نزدیک متفقہ ومسلمہ ہیں، ان کی خلاف ورزی سے انسان ''اہل السنۃ والجماعۃ'' سے خارج ہو جاتا ہے۔

اور اہلِ تشیع کی طرف منسوب فرقے، چونکہ بہت سارے ہیں، جن کے درمیان باہم کئی چیزوں میں اختلاف ہے، اس لیے عام حالات میں مطلق اور عام حکم یہی ہونا چاہیے کہ ''اہلِ تشیع'' دراصل ''اہلُ السنۃ'' سے خارج ہیں، ''اہلُ السنۃ'' سے تعلق رکھنے والا ''سنّی'' کہلاتا ہے اور ''اہلِ تشیع'' سے تعلق رکھنے والا ''شیعہ'' کہلاتا ہے، نہ تو کسی ''سنّی'' کو اپنے ''سنّی'' ہونے سے اختلاف ہے، اور نہ کسی ''شیعہ'' کو اپنے ''شیعہ'' ہونے سے اختلاف ہے، اور نہ ہی ایک کو دوسرے کے نام سے اختلاف ہے۔

یہی تقسیم شروع سے چلی آرہی ہے، جس میں نہ کسی کو شبہ ہونا چاہیے، اور نہ ہی اختلاف۔

اور یہ بات واضح ہے کہ مطلق ''شیعہ'' کا لفظ مطلق ''سنّی'' کے مقابلے میں استعمال ہوتا آیا ہے، مطلقاً ''شیعہ'' کا لفظ، مسلمان کے مقابلے میں استعمال نہیں ہوا۔

لیکن گزشتہ کچھ عشروں سے، اہل السنۃ والجماعۃ کے کچھ اہلِ علم حضرات نے، مختلف ''اہلِ تشیع

www.idaraghufran.org

’’کے سلسلے کی بعض کتابوں کومطالعہ کر کے، ان میں کفریہ باتوں کو ملاحظہ کیا، اوران باتوں کو جمع کر کے ان پر رَد کیا، اوراس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ عقائد، موجوددور کے تمام اہلِ تشیع میں پائے جاتے ہیں، اس لیے موجوددور کے تمام اہلِ تشیع دائرۂ اسلام سے خارج اورکافر ہیں۔

جبکہ اہلِ علم حضرات کاایک بڑاطبقہ اب بھی اس سابقہ اصولی موقف کے مطابق بیان کرتا ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، اہلِ تشیع کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

شیعوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے متعدد فرقے ہیں، جن کے عقائد بھی الگ الگ ہیں، اس لیے علمائے اہلِ سنت کے فتاویٰ، ان کے بارے میں مختلف رہے ہیں، زیادہ تر اسلافِ امت کا طریقہ یہ رہا ہے کہ ’’من حیث المجموع‘‘ تمام شیعوں پر کوئی حکم نہیں لگاتے، بلکہ ان کے عقائد پر حکم لگاتے ہیں کہ جو یہ عقیدہ رکھے گا، وہ کافر ہے، مثلاً جو یہ عقیدہ رکھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام سے وحی لانے میں غلطی ہوئی تھی، تو وہ کافر ہے، یا جو یہ عقیدہ رکھے کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے، وہ کافر ہے، یا جوصدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا انکار کرے، یا امُّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائے، تو یہ سب عقائد رکھنے والے کافر ہوں گے، اس لیے کہ یہ امور، قطعیت کے ساتھ قرآن کریم کے اندر آ گئے ہیں۔

چونکہ یہ شیعہ فرقے پہلی صدی میں پیدا ہو چکے تھے، پھر رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے زیادہ ہو گئے، تو ان کا یہ مسئلہ ہر دور میں رہا ہے، اور ہر دور میں علمائے امت کا یہ طریقۂ کار رہا ہے کہ بجائے بحیثیتِ مجموعی، پورے فرقہ پر فتویٰ لگانے کے، عقائد پر فتویٰ لگایا جائے کہ ان میں سے جو یہ عقیدہ رکھے گا، وہ کافر ہوگا، لیکن یہ نہیں کہا کہ سارے شیعہ کافر ہیں، اسی بناء پر بخاری شریف میں شیعہ راویوں کی تعداد بیسیوں ہیں، اور وہ بھی کٹر شیعہ ہیں، لیکن ان کے اوپر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا، اس واسطے کہ ان سے عقائدِ کفریہ ثابت نہیں ہوئے تھے۔

اور اصولِ حدیث کے اندر یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ جو مبتدع اپنی بدعت کی طرف دعوت دینے والا نہ ہو، اور اس سے کوئی جھوٹ بھی ثابت نہ ہو، تو اس کی روایت قابلِ قبول ہے۔ [1]

علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے ''منهاجُ السنة'' تالیف فرمائی، اور ردِ شیعہ میں اس سے بہتر شاید کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، لیکن ساری تردید اور سب کچھ کرنے کے بعد، بحیثیتِ مجموعی تمام شیعوں پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا، بلکہ یہ کہا کہ جو یہ عقیدہ رکھے، وہ کافر ہے۔

ہمارے حضرات اکابرِ علمائے دیوبند کا بھی یہی طریقہ کار رہا ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، ان سب کے فتاویٰ موجود ہیں، جن میں انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

بعض حضرات کا یہ موقف ہے کہ شیعہ اثنا عشری، لازمی تحریفِ قرآن کے قائل ہوتے ہیں، یعنی کوئی شیعہ اثنا عشری ایسا نہیں ہے، جو کہ تحریفِ قرآن کا قائل نہ ہو، اس لیے کہ ان کی کتابوں میں اس بات کی صراحت موجود ہے، اور ''اصولِ کافی'' میں تحریفِ قرآن کی روایتیں ہیں، اور ان کے جو دوسرے مآخذ ہیں، ان سب کے اندر تحریفِ قرآن کا عقیدہ موجود ہے، اور شیعہ اثنا عشری ان کتابوں کو مانتے ہیں، لہٰذا پھر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سب شیعہ اثنا عشری کافر ہیں۔

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمہ اللہ (المتولد: 1877ء، 1293ھ، المتوفی: 1962ء، 1381ھ) نے یہ بات سب سے پہلے تفصیل کے ساتھ تحریر

[1] اور تقیہ دراصل جھوٹ ہی کی ایک شکل ہے، اگر تقیہ کی نسبت تمام اہلِ تشیّع کی طرف کی جاتی، تو پھر شیعہ راوی کی روایت کو کیسے قبول کیا جاتا، تقیہ کا ہر شیعہ کی طرف الزام عائد کرنے سے احادیث پر اعتماد بھی متاثر ہو جائے گا۔ محمد رضوان خان۔

www.idaraghufran.org

فرمائی، اور پھر اسی بات کو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ نے چلایا، اور اس کے نتیجہ کے طور پر یہ کہا کہ اب ہمیں اس میں احتیاط کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم فرقے پر حکم نہ لگائیں، بلکہ عقائد پر حکم لگائیں، کیونکہ اب یہ بات مکمل طور پر ثابت ہوگئی ہے کہ تمام اثنا عشریہ، جن کتابوں کو مانتے ہیں، ان کتابوں میں تحریف موجود ہے، لہٰذا انہوں نے کہہ دیا کہ ہر شیعہ اثنا عشری کافر ہے۔

لیکن حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمہ اللہ نے جس زمانے کے اندر یہ بات تحریر فرمائی تھی، اور حضرات علمائے دیوبند کے پاس فتویٰ کے لیے بھیجی، تو بہت سے حضرات نے ان سے اتفاق کر کے اس فتویٰ پر دستخط فرما دیئے، لیکن بہت سے حضرات نے اس فتویٰ پر بعینہٖ دستخط نہیں فرمائے، بلکہ یہ بات لکھ دی کہ جو لوگ تحریف کے قائل ہیں، یا فلاں فلاں باتوں کے قائل ہیں، وہ کافر ہیں، گویا انہوں نے اسی موقف کو برقرار رکھا، جو شروع سے چلا آتا تھا، اور اپنے اوپر یہ ذمہ داری نہیں لی کہ ہم یہ کہیں کہ ہر شیعہ اثنا عشری ضرور، یہ عقائد رکھتا ہے (انعام الباری، ج۱ص۳۳۱تا۳۳۳، کتاب الایمان، مطبوعہ: مکتبۃ الحراء، کراچی)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی ''منہاجُ السنۃ'' کا جو حوالہ دیا ہے، تو اس کی تائید ''منہاجُ السنۃ'' کی مختلف عبارات سے ہوتی ہے، جو ہم نے ملاحظہ کی ہیں، اور ان کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

شیعہ اثنا عشری کے متعلق علی الاطلاق کافر نہ ہونے کے متعلق دارُالعلوم کے جملہ اساتذۂ کرام کا مصدقہ فتویٰ بھی موجود ہے، جس کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کی توضیح وتشریح بھی موجود ہے، اس زمانے کے جماعتِ دیوبند کا اجتماعی فتویٰ ہمارے نزدیک یہی ہے۔

موجودہ دور کے بعض اصحابِ علم کی رائے اگرچہ اس سے مختلف ہے، اور وہ محض اثنا عشری کی

نسبت ہونے پر کفر کا حکم لگاتے ہیں، یا یہ کہتے ہیں کہ خمینی کے بعد دنیا جہان کے تمام اہلِ تشیّع کے عقائد ''خمینی'' والے بن گئے ہیں، چونکہ وہ خمینی کو پیشوا اور رہبر قرار دیتے ہیں، جبکہ خمینی کے بعض عقائد، کفریہ تھے۔

لیکن ہمارا رجحان، اس طرف نہ ہوسکا، کیونکہ اولاً تو کسی کو پیشوا اور رہبر قرار دینے سے اس کے تمام عقائد وافکار سے متفق ہونا لازم نہیں آتا، دوسرے اہلِ تشیّع واہلِ روافض کے عوام کا خمینی کے اس طرح کے عقائد وافکار سے واقف اور متفق ہونا بھی لازم نہیں آتا۔

اور اس طرح کی مثالیں اور نظیریں اہل السنۃ والجماعۃ میں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً قیامِ پاکستان کی کوششوں کے اعتبار سے ''محمد علی جناح'' کو ''قائدِ اعظم'' کہا جاتا ہے، جس کے معنیٰ ہیں ''بڑا قائد'' اور ''قائد'' کے معنیٰ ''رہبر و پیشوا'' کے ہیں، ''محمد علی جناح'' کو بہت سے عوام کے علاوہ اہلِ علم حضرات بھی ''قائدِ اعظم'' کہتے ہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ''قائدِ اعظم'' کے جو جو عقائد وافکار اور نظریات تھے، ان سب سے اتفاق کرلیا گیا ہے۔

اسی طرح مثلاً ''علامہ اقبال مرحوم'' کو بہت سے عوام اور علماء ''علامہ'' کہتے ہیں، اور ان کو برِّ صغیر کے مسلمانوں کا عظیم رہنما شمار کرتے ہیں، لیکن اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ''علامہ اقبال مرحوم'' کے جو جو عقائد وافکار اور نظریات تھے، ان سب سے اتفاق کرلیا گیا ہے۔

بہت سے اہلِ تشیّع واہلِ روافض بھی ''امام'' کا لفظ اسی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں، جس کی بناء پر تمام اہلِ تشیّع اور اہلِ روافض عوام کی طرف اس طرح کے عقائد وافکار کی نسبت کرنا، مناسب نہیں۔

اس موقع پر بانیِ دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب رحمہ اللہ سے متعلق ''سوانح قاسمی'' کی مندرجہ ذیل عبارت کو ملاحظہ کرلینا چاہئے۔

''حضرت (مولانا رشید احمد) گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے (یعنی شیعوں کے):

''جہلا فاسق ہیں'' (تذکرۃ الرشید، ج۲ص۲۸۶)

اور یہ بڑے پتے کی بات ہیں کہ جاہل مسلمان، خواہ سنی ہو، یا شیعہ، مسلمان ہونے کی وجہ سے قرآن کو بہرحال، اللہ کی کتاب ہی مانتا ہے، اس غریب کو ان واہی تباہی قصوں سے کیا سروکار، جو شیعہ علماء کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں‘‘ (سوانحِ قاسمی، ج ۲ص ۶۳، بعنوان ’’اہلِ تشیع کے بارے میں اصلاحی اقدامات‘‘ شائع شدہ: دارالعلوم دیوبند ’’نیشنل پرنٹنگ پریس، دیوبند‘‘)

اس کے باوجود، اگر کسی کا رجحان، تمام اہلِ تشیع کے علی الاطلاق کافر ہونے کی طرف ہو، تو وہ اس کا فعل ہے، لیکن اس کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے کی طرف سے پیش کردہ ایسے موقف پر نکیر کرے، جو بڑے بڑے اصحابِ فقہ وعلم کا ہے۔

ایسے موقع پر مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا بیان کردہ یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ:

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بعض اوقات، تکفیر کے معاملہ میں علماء وفقہاء کے درمیان اختلافِ رائے ہوسکتا ہے، لیکن اس اختلاف کی وجہ سے کوئی بھی فریق قابلِ ملامت نہیں ہوتا، اور جو جس رائے کو بھی ’’مابینہٗ وبین اللہ ‘‘ درست سمجھے، اس کو اختیار کرسکتا ہے (انعامُ الباری، ج ا ص ۳۳۳، کتاب الایمان، مطبوعہ: مکتبۃُ الحراء، کراچی)

18 ذوالقعدۃ 1441ھ

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 18 شمارہ 04، دسمبر 2020ء - ربیع الآخر 1442ھ)

---

(181)

اجتہادی واختلافی باتوں میں افراط وتفریط

یہ بات بار بار اور وقتاً فوقتاً بتلائی جاتی رہتی ہے کہ دین کے اجتہادی واختلافی مسائل کو اپنے اپنے درجے پر رکھنا چاہیے، ان کو نہ تو اپنے درجہ سے گھٹانا چاہیے، نہ ہی اپنے درجہ سے بڑھانا چاہیے، آج کل علمی دنیا میں اس چیز کی بڑی کمی دکھائی دیتی ہے، اور جب علمی دنیا میں اس قسم

کے مسائل کے اندر اعتدال کا لحاظ بہت کم رہ گیا ہے، تو عوام کی کیا حالت ہوگی، اس کا اندازہ خود سے لگایا جاسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم آج کل دیکھتے ہیں کہ بہت سے علماء بھی ذرا ذرا سی باتوں پر دوسرے کو خطاوار قرار دیتے ہیں، اور بعض اوقات، اس سے بھی آگے بڑھ کر دوسرے کو فاسق قرار دینے میں جھجک محسوس نہیں کرتے، اور بعض لوگوں کی جرأت اس سے بھی آگے بڑھ گئی ہے کہ وہ تو کافر کے فتوے سے نیچے بات کرنے کو ہی تیار نہیں ہوتے، پھر وہ اس سے نیچے کی بات پر سمجھوتہ کرنے کے لیے کیسے آمادہ ہوں گے۔

اس طرزِ عمل کا نتیجہ ہے کہ اس طرح کے علمائے کرام خود ہی ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہیں، پھر ایسے میں عوام بے چاروں کا کیا بنے گا، جو ''کالانعام'' ہوتے ہیں۔

اگر جیسا کہ راستے کے اندر دو گاڑیوں والوں کا جھگڑا ہوجائے، اور وہ آپس میں گتھم گتھا ہوجائیں، جن میں سے ہر ایک کے ساتھ مسافروں کی بڑی تعداد بھی سوار ہو، تو ظاہر ہے کہ عوام کو اپنی منزل تک پہنچنا دشوار ہوجائے گا، اور بعض اوقات کسی ناگہانی حادثہ کا شکار ہوکر ''ہم تو ڈوبے ہیں، صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے'' والی بات ہی سامنے آئے گی۔

اسی قسم کی صورتِ حال آج کل دین کے اجتہادی واختلافی مسائل میں بہت زیادہ درپیش ہے، جس کی وجہ سے ہر طرف طوفانِ بدتمیزی نظر آتا ہے، ہر ایک دوسرے کے خلاف اپنے ہتھیار استعمال کرنے میں لگا ہوا ہے، جس میں عوام کی فوج بھی دوسرے کے خلاف تیار کرنے میں مصروف ہے، عجیب تماشا بنا ہوا ہے۔

دینی ومذہبی عنوان سے شائع ہونے والے رسائل ومجلّات پر جب نظر ڈالی جاتی ہے، تو اس قسم کی چیزوں کا اتنا بڑا مواد وانبار نظر آتا ہے کہ جس کی حد نہیں، انٹرنیٹ پر نشر ہونے والے مواد کی تو کوئی شمار وانتہاء ہی نہیں۔

دین کے عنوان، اور دین کے نام پر اس طرح کی حرکات کرنے والوں کو نہ تو اس سلسلے میں اللہ

تعالیٰ کے قرآن مجید میں اختیار کردہ انداز کو ملاحظہ کرنے کی توفیق ہوتی، نہ ہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا جائزہ لینے کی فرصت ملتی، اور نہ ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلفِ صالحین کے کردار کا مطالعہ کرنے کا موقع حاصل ہوتا، جس کی وجہ سے آج دینِ اسلام کے نام سے ہونے والی کوششوں سے وہ ثمرات حاصل نہیں ہو پاتے، جو خیرُ القرون اور سلف کے دور میں حاصل ہوتے تھے کہ سلف تو کفار کے مقابلے میں تھوڑے اور کم وسائل کے حامل ہونے کے باوجود بھی غالب شمار ہوتے تھے، لیکن آج جبکہ نہ تو مسلمانوں اور علمائے کرام کی تعداد کی دنیا میں کمی ہے، نہ وہی وسائل کی کمی ہے، اس سب کے باوجود، مسلمان ہر طرح سے کمزور اور مغلوب نظر آتے ہیں، اس کی اہم وجہ یہی ہے کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کی صلاحیتوں کا بڑا حصہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ان باتوں میں استعمال ہونے لگا ہے، جن باتوں میں سلف کا بھی اختلاف رہا، لیکن ان کی طرف سے ان کی تردید کے لیے موجودہ زمانے کی طرح صلاحیتوں کا بے دریغ استعمال نہیں کیا گیا، مگر آج کل اس قسم کی چیزوں پر ہی اپنی صلاحیتوں کو بڑے بھونڈے انداز میں استعمال کیا جاتا ہے، اور اہم مسائل کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

اس صورتِ حال کا ہی نتیجہ ہے کہ اکثر مسلمانوں میں دین کے بنیادی، اصولی اور متفق علیہ و مجمع علیہ احکام پر عمل نہیں، لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں میں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی جاری ہے۔ ع

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اس افراط وتفریط کی وجہ، علم کی کمی ہے، کیونکہ صرف ایک طرف کی بات، یا ایک طرح کے قول کو پڑھ کر اور پڑھا کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بس یہی شریعت کا واضح حکم ہے، اور اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ یہ صرف ایک قول ہے، اور اس میں علماء وفقہائے حق کے دوسرے اقوال بھی ہیں، اس لیے اس قول سے اختلاف کرنے والوں پر نکیر کی جاتی ہے، اور اس پر سخت ردِّعمل کا

اظہار کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس روش سے مسلمانوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

22 ذوالحجہ 1441ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 05، جنوری 2021ء - جمادی الاولیٰ 1442ھ)

(182)

حق کو قبول نہ کرنا

ہمارے یہاں ضد بازی، تعصب وتشدد وغیرہ جیسی بداخلاقیوں نے ایسا زور پکڑلیا ہے کہ وہ بی بی تمیزن کے وضو کی طرح، نہ عالمِ دین کے علم میں خلل پیدا کرتیں، نہ صوفی کے تصوف میں خلل واقع کرتیں، نہ دیندار کے دین کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتیں، نہ ہی کسی مفتی کے منصب کو متاثر کرتیں، کسی مناظر کے مناظرہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔

بس جو بات قلم، یا زبان سے ایک مرتبہ نکل گئی، اسے پتھر کی لکیر سمجھا جاتا ہے، جسے دوسرا تو درکنار، لکیر ڈالنے والا بھی مٹا نہیں سکتا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ کہاں امت کے اسلاف کا حال، اور کہاں ان کی طرف نسبت کرنے والے موجودہ ان لوگوں کا طرزِ عمل۔

حالانکہ جن اسلاف کا نام لے کر آج عوام کے سامنے اپنی نسبتوں کا اظہار اور فخر کیا جاتا ہے، ان کے ناموں کے عوام سے نعرے لگوائے جاتے ہیں، اور عوام کے سامنے اپنے آپ کو ان اسلاف کی فوج اور سپاہی بنا کر پیش کیا جاتا ہے، ان اسلاف کا لوگوں کے دلوں میں ادب واحترام اور ان کا دنیا میں نام، دراصل ان کے اپنے کردار کی وجہ سے قائم ہے، جو من جانب اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالا گیا ہے، اگر نعوذ باللہ تعالیٰ ان کا کردار، ان کی طرف ظاہری نسبت کرنے والے موجودہ حضرات جیسا ہوتا، تو آج ان کا شاید تاریخ میں نام بھی نہ ملتا۔

پھر جو یہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ سلف واسلاف کا ادب واحترام موجودہ لوگوں کے شور وغوغا کرنے

سے قائم ہے، یہ سخت غلط فہمی ہے۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر ان کی طرف ظاہری نسبت کرنے والوں کا موجودہ طرزِ عمل نہ ہوتا، بلکہ ان اسلاف کے مطابق ہوتا، تو سلف کی شہرت وقبولیت زیادہ ہوتی، کیونکہ جب عام لوگ، موجودہ نسبت کرنے والے حضرات کو دیکھتے کہ یہ حضرات کتنے بلند اخلاق واعمال کے حامل ہیں، تو اس کی وجہ سے ان کی نسبتوں کی مزید قدر وشہرت ہوتی۔

اب جب عوام ان اسلاف کے واقعات اور کردار کو ملاحظہ کر کے، موجودہ نسبت کرنے والوں کے طرزِ عمل کا تقابل کرتے ہیں، تو یا تو ان کو ان واقعات ہی میں شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ سچے بھی ہیں؟ اور یا پھر موجودہ حضرات کی نسبتوں کی ان کے سامنے قلعی کھل جاتی ہے۔

جن اسلاف کی طرف موجودہ حضرات اپنی نسبت کرتے ہیں، کیا ان کا طرزِ عمل بھی ایسا ہی تھا کہ وہ اپنی زبان، یا قلم سے نکلی ہوئی بات پر اَڑی کیا کرتے ہوں، یا دوسروں، بلکہ مخالفین کے ساتھ تعصب اور بے جا تشدد اختیار کرتے ہوں، اور اپنی کسی بھی بات پر ڈٹ جایا کرتے ہوں، اور غلطی معلوم ہو جانے کے باوجود، اس پر قائم ہی رہتے ہوں، ظاہر ہے کہ سلف کا یہ طرزِ عمل ہرگز نہ تھا، وہ تو ہمہ وقت اور ہر جگہ سے حق کے متلاشی رہتے تھے، ان کو اگر اچھی اور حق بات اپنے مخالفین سے بھی ملتی تھی، اس کو لینے اور قبول کرنے میں بھی کوئی شرم وعار محسوس نہیں کیا کرتے تھے۔

اور ایک آج کے زمانے کے یہ نام لینے والے حضرات ہیں، جن کو اسلاف سے تو درکنار، اگر قرآن وحدیث سے بھی کوئی دلیل اپنے کسی قول کے خلاف معلوم ہو جائے، تو اس کو قبول کرنے کے لیے آسانی سے آمادہ نہیں ہوتے، خواہ قرآن وسنت اور سلف کے اقوال میں دور دراز کی دسیوں تاویلیں کیوں نہ کرنی پڑیں، اپنے قول پر ڈٹے اور جمے رہتے ہیں، اور یہ سوچنے کی زحمت بھی نہیں کرتے کہ جن کی طرف رات، دن ہم اپنی نسبتیں کر کے نہیں تھکتے، اگر ہماری جگہ وہ اسلاف ہوتے، کیا وہ بھی اس طرح کی ہٹ دھرمی اور ضد بازی کا مظاہر

کرتے، اس پر یکسوئی اور توجہ کے ساتھ غور کرنے سے اپنی نسبتوں کی حقیقت اور اس کی گہرائی تک ہر شخص بآسانی پہنچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فہمِ سلیم عطاء فرمائے۔ آمین۔

28 ذوالحجہ 1441ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 05، جنوری 2021ء - جمادی الاولیٰ 1442ھ)

---

(183)

جوش وجذبہ سے متعلق حضرت شیخ الہند کا ایک اہم ارشاد

فاضل دارُ العلوم دیوبند، مولانا سید مناظر احسن گیلانی صاحب (المتوفیٰ: 1375ھ) ''احاطۂ دارُ العلوم میں بیتے ہوئے دن'' نامی اپنی تالیف میں، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ:

بخاری شریف کا سبق ہو رہا تھا، مشہور حدیث گزری کہ ''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کے مال اور بال بچے اور سارے انسانوں سے زیادہ میں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے لیے محبوب نہ ہو جاؤں'' ''لایؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ، وولدہ والناس اجمعین، او کما قال'' کا جو حاصل اور ترجمہ ہے۔

حدیث مشہور ہے، اور جانی پہچانی جاتی ہے۔

فقیر ہی نے عرض کیا کہ بحمد اللہ عام مسلمان بھی سرکارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق محبت کی اس دولت سے سرفراز ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ ماں باپ کی توہین کو تو ایک حد تک مسلمان برداشت کر لیتا ہے، زیادہ سے زیادہ گالیوں کے جواب میں وہ بھی گالیوں پر اتر آتا ہے، لیکن رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہلکی سی سُبکی بھی مسلمانوں کو اس حد تک مشتعل کر دیتی ہے کہ ہوش وحواس کھو بیٹھتے

ہیں، آئے دن اس کا مشاہدہ ہے کہ جان پر لوگ کھیل گئے۔

سن کر حضرت (شیخ الہند) نے فرمایا کہ ہوتا بے شک یہی ہے، جو تم نے کہا۔

لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تہہ (یعنی گہرائی) تک تمہاری نظر نہیں پہنچی۔

محبت کا اقتضاء یہ ہے کہ محبوب کی مرضی کے آگے ہر چیز قربان کی جائے۔

لیکن عام مسلمانوں کا جو برتاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی مبارک کے ساتھ ہے، وہ بھی ہمارے، تمہارے سامنے ہے۔

پیغمبر نے ہم سے کیا چاہا تھا، اور ہم کیا کر رہے ہیں، اس سے کون ناواقف ہے۔

پھر سُبکی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت بن جاتی ہے، اس کی وجہ محبت تو نہیں ہوسکتی۔

خاکسار نے عرض کیا، تو آپ ہی فرمائیں، اس کی وجہ کیا ہے؟

نفسیاتِ انسانی کے اس مبصر حاذق (یعنی شیخ الہند) نے فرمایا کہ:

سوچو گے تو درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُبکی میں اپنی سُبکی کا غیر شعوری احساس پوشیدہ ہوتا ہے، مسلمانوں کی خودی اور انانیت مجروح ہوتی ہے کہ ہم جسے اپنا پیغمبر اور رسول مانتے ہیں، تم اس کی اہانت نہیں کر سکتے، چوٹ دراصل اپنی اس ''ہم'' پر پڑتی ہے۔

لیکن مغالطہ ہوتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے ان کو انتقام پر آمادہ کیا ہے، نفس کا یہ دھوکا ہے۔

اپنی جگہ ٹھنڈے دل سے جو غور کرے گا، اپنے طرزِ عمل کے تناقض کے اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے، بہر حال محبوب کی مرضی کی جسے پروانہ ہو، اذان ہو رہی ہے، اور لایعنی اور لاحاصل، گپوں سے بھی جو اپنے آپ کو جدا کر کے، مؤذن کی پکار پر نہیں دوڑتا، اسے انصاف سے کام لینا چاہیے کہ محبت کا دعویٰ اس کے منہ پر

کس حد تک پھبتا ہے“۔
حضرت والا کی تقریر کا یہی خلاصہ تھا۔
ظاہر ہے ندامت اور شرمندگی کے ساتھ، سر جھکا لینے کے سوا، ان کی اس نفسیاتی تنبیہ کے بعد، میرے لیے کچھ اور پوچھنے کی گنجائش ہی کیا باقی رہی تھی (احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن، صفحہ ۱۲۷، ۱۲۸، باب نمبر ۱۰، بعنوان ”محبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نفسانیت“ مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان، تاریخِ اشاعت: محرم ۱۴۲۵ھ)

15 صفر 1442
(ماہنامہ ”التبلیغ“ جلد 18 شمارہ 06، فروری 2021ء - جمادی الاخریٰ 1442ھ)

---

(184)

قربِ قیامت میں علمائے حق کا اٹھ جانا

قربِ قیامت کے اس دور میں جہاں اور بہت سے فتنے رُونما ہوئے، اور تیزی سے رونما ہو رہے ہیں، وہاں ایک فتنہ ”علمائے حق وعلمائے ربانیین“ کے ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہوتے چلے جانے اور ان کے بعد ”جہلاء“ کو اپنے سردار و رہنما بنا لینے کا بھی ہے۔
چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی سند سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلٰكِنْ يَّقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَآءِ، حَتّٰى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُ وْسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا (صحيح البخارى، رقم الحديث ١٠٠، كتاب العلم، بابكيف يقبض العلم، صحيح مسلم رقم الحديث ٢٦٧٣ ”١٣“)

ترجمہ: بے شک اللہ، علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ بندوں (کے سینوں سے)

نکال لے، بلکہ علماء کو موت دے کر علم کو اٹھائے گا، یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہے گا، تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے اور ان سے (دینی مسائل) پوچھے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے، اور وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے (بخاری ومسلم)

واقعی اب یہ سلسلہ شروع ہو چکا ہے کہ علماء کی قلت اور جہلاء کی کثرت ہوتی چلی جارہی ہے۔ [1]

ہم نے دیکھا کہ علمائے حق اور علمائے ربانیین کا سایہ روز بروز اٹھتا جارہا ہے، اور ان کی جگہ جو بعد میں علماء مسند کو سنبھالتے ہیں، وہ عموماً پہلے علمائے حق وعلمائے ربانیین کی اعلیٰ صفات سے محروم ہوتے ہیں، بلکہ بہت سوں کی حالت تو علم وعمل میں بہت ناگفتہ بہ ہوتی ہے، اگرچہ وہ اپنی نسبت، اپنے سے پہلے علمائے حق وعلمائے ربانیین کی طرف کرتے ہیں، پھر لوگ ان ہی سے دینی مسائل پوچھتے ہیں، اور وہ بغیر علم کے عجیب وغریب فتوے صادر کرتے ہیں، اور اس کے اثرات معاشرہ پر بہت بُرے پڑ رہے ہیں۔

اسی کے نتیجہ میں آج یہ صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے کہ اس قسم کے نام نہاد علماء کی طرف سے قرآن وسنت پر مشتمل، سلفِ صالحین کی صاف ستھری تعلیمات کو اجنبیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، قرآن مجید کی صریح آیات اور صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے، ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، نہ ہی سلفِ صالحین کی تعلیمات وتشریحات کو زیادہ اہمیت دی جاتی، اور ان کے مقابلے میں چند بزرگوں کے حوالہ جات نقل کر کے قرآن وسنت اور سلفِ صالحین کی

---

[1] قوله :(لا تقوم الساعة) أراد بها يوم القيامة .قوله :(حتى يقبض العلم) ، وذلک بموت العلماء وكثرة الجهلاء ، وقال السفاقسي :يعني أكثرهم، لقوله صلى الله عليه وسلم :(لا تزال طائفة من أمتى ظاهرين على الحق حتى يأتى أمر الله)(عمدة القارى شرح صحيح البخارى، ج۷، ص۵۷، كتاب الوتر،باب ما قيل فى الزلازل والآيات)

ولينبه على أن المعنى بالعالم والمتعلم العلماء بالله الجامعون بين العلم والعمل، فيخرج منه الجهلاء والعالم الذى لم يعمل بعلمه، ومن تعلم علم الفضول وما لا يتعلق بالدين(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج ۱،ص ۳۲۴۱، كتاب الرقاق)

www.idaraghufran.org

تعلیمات سے اعراض وعدول کیا جاتا ہے۔

ایسی حالت پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد صادق آتا ہے کہ:

"اِتَّخَذُوٓا أَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ أَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ"

کہ جنہوں نے اپنے احبار ورہبان کو اللہ کے مقابلے میں اربابِ اختیار بنالیا تھا۔

اوراس طرح یہ جہلائے زمانہ، جو اپنے آپ کو علمائے زمانہ سمجھتے ہیں، ایک طرح سے نیا دین اختراع کر کے نہ جانے کیا کیا گُل کھلاتے ہیں، اور اپنی ان حرکات کی نسبت چند مشہور بزرگوں کی طرف کر کے، عامۃُ الناس کو دھوکہ میں مبتلاء کرتے ہیں۔

اولاً تو علمائے حق وعلمائے ربانیین کی طرف سے قرآن وسنت اور سلفِ صالحین سے معارضہ ومقابلہ ہوتا ہی نہیں، اور اگر کسی کو معارضہ ومقابلہ نظر آتا ہو، تو وہ اس کی اپنی غلط فہم اور فاسد سمجھ کی وجہ سے ہوتا ہے، ورنہ اگر فہم صحیح ہو، تو معارضہ ومقابلہ ہوتا ہی نہیں۔

اور اگر کسی عالمِ ربانی کی کسی بات میں اس طرح کا معارضہ ومقابلہ لازم آئے، تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اس میں ایسی توجیہ وتاویل کرنی چاہیے کہ قرآن وسنت اور سلفِ صالحین سے معارضہ ومقابلہ ختم ہوجائے، اور قرآن وسنت وسلفِ صالحین کا موقف اپنی جگہ درست رہے، نہ یہ کہ ایسی تاویل وتوجیہ کی جائے کہ جس کی وجہ سے قرآن وسنت کا اصل مقصود ومراد ہی فوت ہوجائے، اور سلفِ صالحین سے بھی معارضہ ومقابلہ لازم آئے، اور اگر بالفرض اس عالمِ ربانی کے کلام میں کوئی بھی ایسی مناسب تاویل وتوجیہ نہ ہوسکے کہ جس کی وجہ سے یہ معارضہ ومقابلہ ختم ہوسکتا ہو، تو پھر اس عالم کو اجتہادی خطاء پر سمجھنا چاہیے، اور اس کے متعلق یہی حسنِ ظن رکھنا چاہیے کہ اس نے قصداً وعمداً ایسا نہیں کیا ہوگا، بلکہ کسی خطاء کی وجہ سے ایسا کیا ہوگا، جس پر یا تو وہ عنداللہ ایک اجر وثواب کا مستحق ہے، یا پھر کم از کم وہ عنداللہ معذور ہے، اور قابلِ مؤاخذہ نہیں، اس کے بجائے، اس عالمِ ربانی کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہونا، جائز نہیں، جس طرح کہ اس کے کلام کو خطاء پر محمول کرنے کے

www.idaraghufran.org

بجائے، اس کو صواب قرار دینا، اور قرآن وسنت وسلفِ صالحین کی تعلیمات میں بے جا تاویلات کرنا، اور اس سے بڑھ کر ان کا تخطئہ کرنا، جائز نہیں۔

اب اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے کسی کو تحقیق کا ذوق اور اس کی توفیق عطاء فرمائی ہو، اور وہ قرآن وسنت کی تعلیمات اور سلفِ صالحین کے طرز وطریقہ کے موافق کسی مسئلہ میں کوئی موقف اختیار کرے، اور ترجیح دے، تو موجودہ دور کے اس طرح کے نام نہاد اور جاہل علماء، جن کا گزشتہ حدیث میں ذکر ہے، اس پر طرح طرح سے اعتراض اور الزام عائد کرتے ہیں، اور جب ان کو اس محقق کی طرف سے کوئی معقول جواب دیا جاتا ہے، اور ان کی جاہلانہ بات کو رَد کر دیا جاتا ہے، تو پھر اوپر سے یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ یہ صاحب بڑے مجتہد اور محقق بنے پھرتے ہیں اور علماء کی اتباع نہیں کرتے، یا علماء کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں، یا یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی باتیں دیگر علماء کے خلاف ہیں، اور ان سے علماء کو اختلاف ہے، اس لیے ان کی بات قابلِ قبول نہیں، یا یہ کہ یہ ان کی ذاتی وانفرادی رائے ہے۔

حالانکہ ان اختلاف کرنے والے علماء کا علم وتحقیق کے میدان میں وہ درجہ نہیں ہوتا، اور ان کی حیثیت مذکورہ حدیث میں مذکور حضراتِ جہلاء سے مختلف نہیں ہوتی۔

عجیب طرفہ تماشا ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات اور سلفِ صالحین کی توضیحات وتشریحات پر آج تفرد کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جو علماء، تحقیق کی نعمت سے محروم ہوں، ان کے اختلاف کا اعتبار نہیں ہوتا۔

اصل اختلاف مجتہدین ومحققین کا ہوتا ہے، اگر ان کے مقابلے میں ہزاروں غیر مجتہد وغیر محقق اکٹھے ہو جائیں، ان کی وہ حیثیت نہیں ہوتی، اور اس کو اجماع قرار دینا، یا ان کو جمہور سمجھنا بھی درست نہیں ہوتا۔

اس مسئلہ کی باحوالہ اور مدلل ومفصل تحقیق بندہ نے ''اجتہادی اختلاف اور باہمی تعصب'' اور

''تفرد کی حقیقت'' کے نام سے شائع شدہ تالیفات میں ذکر کردی ہے۔

مگر المیہ یہ ہے کہ ان نام نہاد علماء کو مطالعہ کا وقت بھی نہیں ملتا، البتہ ان کو چوں و چرا اور اعتراضات کرنے، اور غپ شپ لڑانے کا وقت خوب میسر ہے۔

لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ احادیث کی رو سے ایک جماعت تا قیامت حق پر ضرور قائم رہے گی، اگرچہ وہ تھوڑی اور قلیل کیوں نہ ہو، اور وہ شرعی وفقہی دلائل کے اعتبار سے اس قسم کے جہلاء اور نام نہاد علماء پر غالب بھی رہے گی، جس کا یہ نام نہاد علماء مقابلہ نہ کرسکیں گے، اگرچہ چہ میگوئیاں کیوں نہ کرتے پھریں۔ [1]

28 محرم 1442

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 06، فروری 2021ء - جمادی الاخریٰ 1442ھ)

---

(185)

مساجد اور اسلامک سنٹر

آج کل یورپ اور دوسرے غیر مسلم ممالک میں بھی الحمدللہ تعالیٰ، مساجد قائم ہیں، جہاں ان کو ''اسلامک سنٹر'' (Islamic centre) اور ''کمیونٹی سنٹر'' (Community centre) وغیرہ جیسے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس طرح کے کئی ممالک میں قائم موجودہ دور کی مساجد کا عوامی سطح پر مفہوم وتصور، ہمارے یہاں کی مساجد سے تھوڑا مختلف اور وسیع ہے۔

چنانچہ وہاں کی مساجد میں نمازوں کے علاوہ، مسلمان اپنے کئی دوسرے قسم کے مذہبی اجتماعات اور پروگرام بھی منعقد کرتے ہیں، اور مسلمان خواتین بھی نماز وعبادت کے لیے وہاں بلانکیر حاضر ہوتی ہیں، اور بہت سی مساجد میں ماہِ رمضانُ المبارک میں سحری وافطاری کا

---

[1] المراد بقوله ظاهرين على الحق أنهم غالبون له وأن الحق بين أيديهم (فتح البارى شرح صحيح البخارى، ج١٣، ص٢٩٥، كتاب الفتن، باب لا تزال طائفة من أمتى ظاهرين على الحق)

www.idaraghufran.org

بھی اس طرح اہتمام ہوتا ہے کہ بہت سی خواتین اپنے بچوں سمیت اپنی سحری وافطاری کا ساز وسامان لے کر آتی ہیں، اور اپنے چھوٹے بچوں کی ضروری اشیاء بھی ساتھ لاتی ہیں، وہاں بہت سی مساجد کے ساتھ، بچوں کے کھیلنے کودنے کے لیے پارک بھی ہوتے ہیں، اور روزہ مرہ کی ضروریات سے متعلق دوکانیں بھی ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے وہاں پر خواتین اور بچوں وغیرہ کو زیادہ وقت گزارنا، مشکل محسوس نہیں ہوتا، اور ایسی صورت میں بچے، بچپن سے ہی مساجد سے مانوس ہوجاتے ہیں، اور اس قسم کی مساجد کے راستوں اور شاہراہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے بہت سے مسافر، قیام وطعام کی ضروریات بھی یہیں رُک کر، اور سواریوں سے اتر کو پوری کرتے ہیں، ساتھ ہی نماز پڑھنے اور بچوں وغیرہ کی تفریح کی ضرورت بھی پوری ہوجاتی ہے، اور اس طرح طبیعت پر بار اور بوجھ بھی نہیں ہوتا، اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی بڑی تعداد، نمازوں کو اداء کرکے اپنے اہم فریضے سے سبکدوش ہوجاتی ہے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم بھی یہی ہے کہ مساجد کو مسلمانوں کا مرکز اور مرجع تصور کیا جائے، جس سے تمام مسلمان، کسی نہ کسی جہت سے وابستہ اور منسلک رہیں۔

لیکن ہمارے یہاں کے موجودہ ماحول میں عام طور پر، مساجد کا تصور بہت محدود ہوکر رہ گیا ہے، جہاں خواتین کی حاضری تو بہت بڑا فعلِ منکر شمار کیا جانے لگا ہے، خواہ حجاب وحیاء قائم رکھنے کے اسباب بھی کیوں نہ مہیاء کرلیے جائیں، تب بھی خواتین کے مساجد میں حاضر ہونے کو معیوب سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ سفر کی حالت میں اگر کسی خاتون کو مسجد میں نماز پڑھنے کی ضرورت پیش آجائے، تو اس کے لیے مساجد میں نماز وطہارت کے تقاضے پورے کرنا دشوار ہوجاتا ہے، اور اگر کسی ضرورت ومجبوری کے تحت، عورت مسجد میں داخل ہوجائے، تو اسے انکار ونکیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

دوسری طرف ہمارے یہاں مساجد میں عام طور پر بچوں کو ساتھ لانے کا عام معمول نہیں، اور اگر کوئی شخص مسجد میں اپنے ساتھ بچے کو لے آئے، تو اسے اجنبیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا

ہے، گویا کہ تمام حاضرین کی نظریں اس بچے پر مرکوز ہوکر رہ جاتی ہیں کہ یہ بچہ کس کے ساتھ مسجد میں آیا ہے، اوراس کے سرپرست کو اگر زبان سے کچھ نہ کہا جائے، تو اس کو ذہنی طور پر معیوب اور بے ادب وغیرہ سمجھنے میں تو بخل سے کام نہیں لیا جاتا، پھر جب نماز کھڑی ہونے کا وقت شروع ہوجاتا ہے، اور صفیں قائم کی جانے لگتی ہیں، تو امام صاحب سمیت اکثر نمازیوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بچے کو اس کے سرپرست سے جدا کرکے بالکل پیچھے، کسی ایک طرف کنارے پر، یا کونے میں کھڑا کیا جائے، اوراس مقصد کے لیے باقاعدہ اعلان بھی کیا جاتا ہے، اور بچے کو زوردار انداز اور گرج دار آواز میں تنبیہ اور وارننگ دی جاتی ہے کہ وہ بالغ لوگوں کی صفوں، بلکہ اپنے سرپرست سے بھی فوراً الگ اور جدا ہوجائے، جس کے نتیجے میں وہ بچہ سخت وحشت کا شکار ہوجاتا ہے، اوراس کے ذہن میں آئندہ کے لیے مساجد میں حاضر ہونے سے ایک وحشت اور خوف سا بیٹھ جاتا ہے۔

اس قسم کی حرکات وسکنات، دین کی بنیادی تعلیمات واحکامات سے ناواقفیت پر مبنی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خیرُ القرون کے زمانے میں، مساجد میں خواتین بھی حاضر ہوتی تھیں، اوران کے ساتھ بچے بھی حاضر ہوتے تھے، ساتھ ہی خواتین اور بچوں کے لیے بعض ہدایات بھی دی جاتی تھیں، اوران کو شرعی احکامات سے آگاہی بھی حاصل ہوتی تھی، جن میں مساجد کے احکام وآداب کا بھی ذکر ہوتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ چیزیں مساجد میں حاضر ہوکر بہتر طریقے پر معلوم کی جاسکتی ہیں، اور بہت سی چیزوں کا علم، دوسروں کے ساتھ رہ کر، اور دیکھ کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مساجد اور دینی مراکز سے دور بیٹھ کر، بطورِ خاص آج کے مادر پدر آزاد میڈیا کے سامنے بیٹھ کر، یہ چیزیں اور خود حجاب اور پردہ کے شرعی تقاضوں کا علم اوران کی اہمیت کیسے معلوم کی جاسکتی ہے، اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ باہر سے ہوکر تیار مال مساجد میں آئے، لیکن یہ موجودہ ماحول میں بظاہر ''خیال است وجنون است، محال است'' معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ دین کی تعلیم وتعلم کے لئے مساجد عمدہ ذریعہ ہیں، اوراس مقصد کے لئے مساجد میں آنے کے عظیم فضائل احادیث میں آئے ہیں۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ غَدَا إِلَى الْمَسْجِدِ لَا يُرِيْدُ إِلَّا أَنْ يَّتَعَلَّمَ خَيْرًا أَوْ يَعْلَمَهُ، كَانَ لَهُ كَأَجْرِ حَاجٍّ تَامًّا حِجَّتُهُ (المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث ٧٤٧٣، حلية الاولياء، ج٦، ص٩٧) [1]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صبح کے وقت مسجد کی طرف صرف خیر کا علم سیکھنے، یا سکھانے کے لئے گیا، تو وہ مکمل حاجی کے اجر کی طرح ثواب پانے والا ہے (طبرانی)

اورامام حاکم رحمہ اللہ نے حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں حدیث روایت کی ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ غَدَا إِلَى الْمَسْجِدِ لَا يُرِيْدُ إِلَّا لِيَتَعَلَّمَ خَيْرًا أَوْ يَعْلَمَهُ كَانَ لَهُ أَجْرُ مُعْتَمِرٍ تَامِّ الْعُمْرَةِ، فَمَنْ رَاحَ إِلَى الْمَسْجِدِ لَا يُرِيْدُ إِلَّا لِيَتَعَلَّمَ خَيْرًا أَوْ يُعَلِّمَهُ فَلَهُ أَجْرُ حَاجٍّ تَامِّ الْحِجَّةِ (مستدرک حاکم، رقم الحديث ٣١١، كتاب العلم) [2]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صبح کے وقت مسجد کی طرف صرف خیر کا علم سیکھنے، یا سکھانے کے لئے گیا، تو وہ مکمل عمرہ کرنے والے کے اجر کی طرح

---

[1] قال الهيثمي: رواه الطبراني في الكبير، ورجاله موثقون كلهم (مجمع الزوائد، تحت رقم الحديث ٤٩٩، باب في فضل العالم والمتعلم)

وقال المنذري: رواه الطبراني في الكبير بإسناد لا بأس به (الترغيب والترهيب، تحت رقم الحديث ١٤٥)

[2] قال الحاكم: قد احتج البخاري بثور بن يزيد في الأصول وخرجه مسلم في الشواهد، فأما ثور بن يزيد الديلي فإنه متفق عليه.

وقال الذهبي: على شرط البخاري.

ثواب پانے والا ہے، اور جو شخص شام کے وقت مسجد کی طرف صرف خیر کا علم سیکھنے، یا سکھانے کے لئے گیا، تو وہ مکمل حاجی کے اجر کی طرح ثواب پانے والا ہے (حاکم)

اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں احادیث میں آتا ہے کہ آپ بچوں کے رونے کی آواز سن کر، اس کی ماں کی وجہ سے، نماز کو ہلکی فرما دیا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنِّيْ لَأَقُوْمُ فِي الصَّلَاةِ أُرِيْدُ أَنْ أُطَوِّلَ فِيْهَا، فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ، فَأَتَجَوَّزُ فِيْ صَلَاتِيْ كَرَاهِيَةَ أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمِّهِ (صحيح البخاری، رقم الحديث ۷۰۷، كتاب الأذان،باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبی)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، اور لمبی نماز پڑھانا چاہتا ہوں، پھر میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں، تو میں اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، بچہ کی ماں پر شاق گزرنے کو ناپسند کرتے ہوئے (بخاری)

اور حضرت ربیع بنتِ معوذ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

أَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَدَاةَ عَاشُوْرَاءَ إِلٰى قُرَى الْأَنْصَارِ، الَّتِيْ حَوْلَ الْمَدِيْنَةِ: مَنْ كَانَ أَصْبَحَ صَائِمًا، فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، وَمَنْ كَانَ أَصْبَحَ مُفْطِرًا، فَلْيُتِمَّ بَقِيَّةَ يَوْمِهِ فَكُنَّا، بَعْدَ ذٰلِكَ نَصُوْمُهُ، وَنُصَوِّمُ صِبْيَانَنَا الصِّغَارَ مِنْهُمْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، وَنَذْهَبُ إِلَى الْمَسْجِدِ، فَنَجْعَلُ لَهُمُ اللُّعْبَةَ مِنَ الْعِهْنِ، فَإِذَا بَكٰى أَحَدُهُمْ عَلَى الطَّعَامِ أَعْطَيْنَاهَا إِيَّاهُ عِنْدَ الْإِفْطَارِ (صحيح مسلم، رقم الحديث ۱۱۳۶ "۱۳۶" كتاب الصيام،باب من أكل فی عاشوراء فليكف بقية يومه)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس محرم کے دن مدینہ کے اطراف میں

www.idaraghufran.org

انصار کی بستیوں کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ جس نے روزہ رکھنے کی حالت میں صبح کی، تو وہ روزہ پورا کرلے، اور جس نے روزہ نہیں رکھا، تو وہ باقی دن اسی حالت میں گزارے، پس اس کے بعد ہم دس محرم کا روزہ رکھا کرتے تھے، اور اپنے بعض چھوٹے بچوں کو بھی، اگر اللہ چاہتا، تو روزہ رکھواتے تھے، اور ہم بچوں کو مسجد میں لے کر چلی جاتی تھیں، اور بچوں کے لیے روئی، اون کے کھلونے لے جاتے تھے، پھر جب کھانے کے لیے بچوں میں سے کوئی روتا، تو ہم اسے وہ کھیلنے کی چیز دے دیتے تھے، یہاں تک کہ افطار کا وقت ہوجاتا تھا (مسلم)

اس قسم کی احادیث سے، جہاں خواتین کے نماز باجماعت میں شرکت کا ثبوت ملتا ہے، اسی کے ساتھ بچوں کی شرکت کا بھی ثبوت ملتا ہے، اور اتنے چھوٹے بچوں کی شرکت کا ثبوت ملتا ہے، جو عین نماز کی حالت میں رو پڑتے تھے، اور اس بات کا بھی ثبوت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں بھی نہ تو خواتین کو مساجد میں آنے سے منع فرمایا، اور نہ بچوں کو ساتھ لانے سے منع فرمایا، اور نہ ہی بچوں کے رونے پر تنبیہ فرمائی، بلکہ اس کے برعکس، نماز ہی میں تخفیف فرمائی۔

ہمیں مساجد کے احکام وآداب سے اختلاف نہیں، اور نہ ہی موجودہ دور میں خواتین کی طرف سے پیش آنے والے بے حجابی کے طرزِ عمل سے اختلاف ہے، بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے مقام اور درجے پر رکھنا ضروری ہے، جو چیز کسی دوسرے شریعت کے حکم کے تابع ہو، اس کو تابع ہی رکھنا چاہیے، اور جو چیز مستحب، یا آداب میں داخل ہو، اس کو مستحب، یا آداب کے درجے میں رکھنا چاہیے، اس کو فرض، یا واجب کا درجہ نہیں دینا چاہیے۔

اگر کسی کو اس مسئلے کی تفصیلی تحقیق اور دلائل مطلوب ہوں، تو اس کو ہماری مفصل ومدلل تالیف ''عورتوں کا مساجد میں آنا اور زیارتِ قبور'' کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ 27- صفر المظفر- 1442ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 07، مارچ 2021ء - رجب المرجب 1442ھ)

(186)

علم کے رنگ میں جہالت وزبان درازی

آج جہالت اپنے عروج پر ہے، ایک تو ہر دوسرے عالم نے اپنے آپ کو ''مفتی'' کہلوانا شروع کر دیا ہے، خواہ فتویٰ دینے کی اہلیت ہو، یا نہ ہو، اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ ''مفتی'' خواہ مخواہ کا کوئی لقب نہیں، بلکہ اس کا تعلق ''فعلِ افتاء'' سے ہے، پس جس میں فتویٰ دینے کی استعداد وصلاحیت ہو، وہ مفتی ہے، خواہ اس کو مفتی کہا جائے، یا کچھ اور، اور جس میں یہ استعداد و صلاحیت نہیں، وہ درحقیقت ''مفتی'' نہیں، خواہ اس کو کتنا بڑا مفتی کیوں نہ خیال کیا جائے۔

دوسرے بڑی بڑی پگڑی اور ٹوپی والے اور پیر ومرشد اور حضرت حضرت، کہلوائے جانے والے لوگوں کی بھی یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان کی باتیں سن کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کس طرح سے پیر ومرشد، حضرت، یہاں تک کہ کسی ادارہ کے مدیر اور شیخ الحدیث وغیرہ بن گئے ہیں۔

چنانچہ ملتان کے علاقہ کے ایک اسی طرح کے حضرت کے متعلق معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک کتاب کے متعلق فرمایا کہ اس کو جلا دینا چاہیے، حالانکہ اس کتاب میں جو موقف اختیار کیا گیا تھا، وہ قرآن وسنت اور جمہور اہلُ السنة کے مطابق تھا، اور وہ خود جو موقف اختیار کرتے تھے، وہ غیر معتبر، بلکہ جھوٹی اور خودساختہ روایات کے مطابق تھا۔

میں نے ایک معتبر عالم سے ان کی یہ روایت سنی، تو سخت تعجب ہوا، اور میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نعوذ باللہ تعالیٰ صحیح مسلم، اور بہت سی دیگر احادیث کی کتابوں اور قرآن مجید کی ان تفسیروں کو بھی جلا دینا چاہیے، جن میں یہ موقف مذکور ہے، اور اہلُ السنة والجماعة کی ان تمام کتابوں کو بھی جلا دینا چاہیے، اور اکابر کی ان کتابوں اور فتاویٰ کو بھی جلا دینا چاہیے، جن میں اس موقف کا ذکر ہے؟

آج کل اس طرح کے مفتیوں، پیروں اور علماء کی باتیں سن کر سخت تعجب اور حیرت ہوتی ہے کہ

جذبات اور غصہ میں آ کر کس قسم کے الفاظ وکلمات اپنی زبان سے نکال دیتے ہیں، اوران کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، اوراس کے دنیا وآخرت کے اعتبار سے نتائج ولوازمات کیا ہیں؟

افسوس کہ آج قوم کوبعض ایسے پیروں اور علماء سے واسطہ پڑ گیا ہے کہ جو مشائخ وعلماء کے روپ میں جہلاء ہیں، جبکہ محض پیری، مریدی، چرب لسانی، زبان درازی، قلم کی روانی اور درس وتدریس، کسی کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں۔

حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : إِنَّ أَحَبَّکُمْ إِلَیَّ، وَأَقْرَبَکُمْ مِنِّیْ فِی الْآخِرَۃِ مَحَاسِنُکُمْ أَخْلَاقًا، وَإِنَّ أَبْغَضَکُمْ إِلَیَّ وَأَبْعَدَکُمْ مِنِّیْ فِی الْآخِرَۃِ مَسَاوِئُکُمْ أَخْلَاقًا، اَلثَّرْثَارُوْنَ، اَلْمُتَفَیْہِقُوْنَ اَلْمُتَشَدِّقُوْنَ

(مسند احمد، رقم الحدیث ۱۷۷۳۲) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ اور آخرت میں مجھ سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں، جن کے اخلاق اچھے ہوں، اور مجھے تم میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور آخرت میں مجھ سے زیادہ دور وہ لوگ ہیں، جن کے اخلاق برے ہوں، جو کہ بہت زیادہ بولنے والے، منہ پھٹ اور چرب لسان (اورزبان دراز) ہوں (مسند احمد)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَلَا أُنَبِّئُکُمْ بِشِرَارِکُمْ؟ فَقَالَ ھُمُ الثَّرْثَارُوْنَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ، أَلَا أُنَبِّئُکُمْ بِخِیَارِکُمْ؟ أَحَاسِنُکُمْ أَخْلَاقًا

(مسند احمد،رقم الحدیث ۸۸۲۲) [2]

---

[1] قال شعیب الارنؤوط:حسن لغیرہ(حاشیۃ مسند احمد)

[2] قال شعیب الارنؤوط:حسن لغیرہ(حاشیۃ مسند احمد)

www.idaraghufran.org

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں تم میں شریر ترین لوگ نہ بتادوں، پھر فرمایا کہ جو لوگ خوب بولنے والے ہوں، اور چرب لسان (زبان دراز) ہوں، اور کیا میں تمہیں تم میں خیر والے لوگ نہ بتادوں، یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے اخلاق تم سب میں بہتر ہوں (مسند احمد)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنَكُمْ أَخْلَاقًا، وَإِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرْثَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ وَالْمُتَفَيْهِقُونَ (سنن الترمذی، رقم الحدیث ۲۰۱۸، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی معالی الاخلاق) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں مجھے سب سے زیادہ محبوب اور تم میں قیامت کے دن میری مجلس کے زیادہ قریب وہ ہوگا، جو تم میں سب سے اچھے اخلاق والا ہو، اور تم میں میرے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور قیامت کے دن میری مجلس سے سب سے زیادہ دُور، بہت زیادہ بولنے والے، اور چرب لسان (زبان دراز) اور تکبر کرنے والے ہوں گے (ترمذی)

18- ربیع الاول-1442ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 08، اپریل 2021ء - شعبان المعظم 1442ھ)

---

[1] قال الترمذی:

وفی الباب عن أبی هريرة وهذا حديث حسن غريب من هذا الوجه وروى بعضهم هذا الحديث، عن المبارك بن فضالة، عن محمد بن المنكدر، عن جابر، عن النبی صلى الله عليه وسلم ولم يذكر فيه عن عبد ربه بن سعيد وهذا أصح والثرثار :هو الكثير الكلام، والمتشدق الذی يتطاول على الناس فی الكلام ويبذو عليهم (سنن الترمذی، تحت رقم الحديث ۲۰۱۸، ابواب البر والصلة)

www.idaraghufran.org

(187)

اجتہادی وفقہی امور میں ''یُسر وتوسع'' کی اہمیت

قرآن وسنت میں ''یُسر وتوسع'' کی اہمیت وفضیلت اوراس کے مقابلے میں ''عُسر وحرج'' سے بچنے بچانے کی اتنی زیادہ تصریحات ہیں، جن کو مختصر وقت میں بیان کرنا مشکل ہے۔

شریعتِ مطہرہ کی وسعت وسہولت کا تقاضا یہ ہے کہ فقہی ومجتہد فیہ اقوال ومسائل میں عامۃ الناس کے لیے وسعت اور سہولت والے پہلوؤں کی گنجائش دی جائے، اور سختی وتنگی اور تشدد و جمود سے بچا جائے۔

اوراگر کسی زمانہ، یا علاقہ کے افراد، یا فرد کو فقہائے کرام میں سے کسی فقیہ کے مطابق فقہی مسئلہ پر عمل کرنے میں دشواری کا سامنا ہو، تو دوسرے فقہائے کرام کے اقوال سے اس دشواری کا حل پیش کیا جائے، خاص طور پر جب کسی ایک مجتہد کے قول پر عمل پیرا ہونے کے نتیجہ میں عوام کی طرف سے دین کے کسی حکم کا ترک کرنا لازم آتا ہو، تو دوسرے فقہائے کرام کے قول کے مطابق اس حکم کو بجالانے کا راستہ تلاش واختیار کرنے، اور دوسروں کو بتانے میں کوتاہی ہرگز اختیار نہ کی جائے، اسی صورت میں اختلافِ فقہاء کو رحمت قرار دیا جاسکتا ہے، ورنہ تو اس اختلاف کو ''رحمت'' کے بجائے ''زحمت'' سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔

اور آج کل جو بعض اہلِ علم حضرات کے نزدیک یہ خیال کیا جاتا ہے کہ معاملات اور بالخصوص تجارتی مجتہَد فیہ مسائل کے اندر تو مشکل کے وقت دوسرے فقہائے کرام کے قول پر فتوے وعمل اور وسعت وسہولت کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن عبادات کے سلسلہ میں اس طرح کی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔

تو اس انحصار وحصر سے ہمیں اتفاق نہیں، بلکہ اس سلسلہ میں غالب گمان کے درجہ میں شرح صدر کے ساتھ فیما بیننا وبین اللہ ہماری رائے یہ ہے کہ عبادات کے سلسلہ میں بھی فروعی ومجتہَد

فیہ مسائل میں بدرجۂ اولیٰ گنجائش ہونی چاہئے، کیونکہ اولاً تو یُسر وسہولت کو اختیار کرنے کا حکم عام ہے، اور وہ حکم عبادات کو بھی شامل ہے، اور اس کی متعدد احادیث وروایات میں تصریح بھی آئی ہے، نیز سفر میں نماز کے قصر، فرض روزہ کے ترک وغیرہ کی تصریحات بھی عبادات کے باب میں ''یُسر وسہولت'' کی متقاضی ہیں، دوسرے متعدد جہات سے عبادات کا دائرہ، معاملات وتجارت سے بھی زیادہ وسیع ہے، بالخصوص ایسی عبادات کہ جن سے ہمہ وقت اور تجارت وغیرہ کے مقابلہ میں ہر مسلمان کو زیادہ کثرت کے ساتھ سابقہ پڑتا ہو، مثلاً نماز اور اس کے لئے طہارت کے مسائل کہ ان سے ہر مسلمان کو دن، رات میں کم ازکم پانچ مرتبہ سابقہ پیش آتا ہے، تجارت کرنے والوں کو بھی، ملازمت کرنے والوں کو بھی، زراعت کرنے والوں کو بھی، مقیم حضرات کو بھی، مسافروں کو بھی، مریضوں کو بھی اور دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کو بھی۔

کیونکہ نماز، فرضِ عین ہے، برخلاف تجارت اور دیگر معاملات کے، اسی وجہ سے نماز اداء کرنے اور اس کے لئے طہارت حاصل کرنے والے شہر میں بھی ہوسکتے ہیں، گاؤں اور جنگل میں بھی، سفر میں بھی، حضر میں بھی، گھروں میں بھی، بازاروں میں بھی، مسجدوں میں بھی، ہسپتالوں میں بھی، اور اسلامی ملکوں میں بھی اور غیر مسلم ممالک میں بھی۔

پھر ایک علاقہ اور اس جگہ کی تمدنی زندگی دوسری جگہ اور دوسرے علاقہ سے مختلف ہوسکتی ہے، اور یہ بات ممکن ہے کہ ایک شخص، یا ایک علاقہ کے لوگوں کو مخصوص ماحول، یا ان کی مخصوص معاشرت وتمدنی زندگی، اور خاص مزاج کے باعث فقہائے کرام میں سے کسی ایک کے قول پر عمل ممکن وسہل ہو، اور اس کے مقابلہ میں دوسرے شخص اور دوسرے علاقہ کے لوگوں کی تمدنی زندگی اور ماحول ومزاج مختلف ہونے کے باعث اس پر عمل مشکل ہو، تو عبادات اور نماز جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کی خاطر اگر دوسرے امام، یا فقیہ کے قول پر عمل کرنے سے اس فریضہ سے سبکدوش ہوا جاسکتا ہو، تو اس کی گنجائش نہ دینا اور اس کی خاطر نماز جیسے فریضہ کی ادائیگی

سے محروم کرادینا اور ہر حال میں ایک قول پر مُصِر رہنا، اعتدال پسندی پر مبنی نہیں قرار نہیں دیا جاسکتا، اور نہ ہی اس کوتقوے واحتیاط کا عنوان دینا درست قرار پاسکتا ہے۔

ایسی صورت میں گنجائش دینے سے امید ہے کہ بہت سے مریض ومعذور، یا کم ہمت لوگ جو عبادت اور نماز اداء نہیں کرتے، وہ بھی اس کا اہتمام شروع کردیں گے، جوکہ مشاہدہ سے ثابت ہے، کیونکہ نصوصِ کثیرہ صریحہ اور صحیحہ کی رُو سے سہولت ونرمی کی وجہ سے دین کے ساتھ قرب وانس اور اس کے برعکس سختی وتشدد کرنے سے بعد وتنفر پیدا ہوتا ہے۔

مگر ایک عرصہ سے علمی دنیا کے بعض حلقوں میں مجتہَد فیہ فقہی مسائل کو فقہائے کرام کے وسیع تر اقوال کے تناظر میں ملاحظہ وپیش نہ کرنے سے آج بہت سے مجتہَد فیہ مسائل میں دیگر مذاہب ومسالک کے اقوال، اجنبی ہوگئے ہیں، اور ان کو باطلین کا موقف، یا نظریہ خیال کیا جانے لگا ہے۔

جبکہ آج کل دنیا کے حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہورہے ہیں، بلاشبہ اس وقت امتِ مسلمہ کو اس طرح کے احوال کا سامنا ہے کہ جن احوال کا گزشتہ زمانوں میں سامنا نہیں کرنا پڑا، دنیا کے مختلف حصوں کی تمدنی ومعاشرتی زندگی، ایک دوسرے پر اثر انداز ہورہی ہے، اور لوگوں کی ایک دوسرے کے ساتھ قُربت بڑھ رہی ہے، اور دنیا ایک شہر کی شکل اختیار کررہی ہے، جس کو گلوبلائزیشن (Globalization) کہا جاتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں بعض اوقات کسی ایک قول، یا مذہب پر عمل کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور پہلے زمانوں کے مقابلہ میں اس ایک قول ومذہب کی پابندی میں غیر معمولی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔

پس موجودہ زمانہ، جوکہ مختلف جہات سے انقلاب کا زمانہ ہے، اور اس زمانہ میں بڑی تیزی کے ساتھ لوگوں کی معاشرتی وتمدنی زندگی اور مزاج میں تبدیلی رونما ہورہی ہے، اور شریعتِ مطہرہ کے پیروکار دنیا جہان میں بکھرے ہوئے اور پھیلے ہوئے ہیں، اور بہت بڑی تعداد میں غیر مسلم ممالک میں بھی ہیں، جہاں کا ماحول اسلامی ملکوں سے یکسر مختلف ہے، ان حالات

میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اہلِ علم حضرات، فقہائے کرام کے وسیع تر اقوال کے تناظر میں فقہی مسائل کو ذکر فرمائیں اور مشکلات کا حل نکالیں۔

لیکن ہمارے یہاں تا حال معتدبہ طریقہ پر یہ کام سامنے نہیں آسکا، جس کی وجہ سے بہت بڑا طبقہ اہلِ علم سے بددل اور دین سے دور ہوا، اور اس کے برعکس غیر مستند، بلکہ تجدد پسند لوگوں نے اس کام کی باگ ڈور سنبھال لی، جس کے متعدد نقصانات ظاہر ہوئے۔

اور غالب گمان یہ ہے کہ موجودہ دور میں اگر سابق فقہائے کرام موجود ہوتے، اور وہ حالاتِ حاضرہ کا مشاہدہ ومعائنہ فرماتے، تو وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے اور جمود اختیار کرنے کے بجائے موجودہ مسائل ومشکلات کا حل نکالتے اور امتِ مسلمہ کو دین کے ساتھ جوڑنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل اہلِ علم حضرات کا ایسا طبقہ موجود ہے کہ وہ خود تو فقہی واجتہادی مسائل میں آسانی ''یُسر وتیسیر'' کی شکل میں حل نکالنے پر آمادہ نہیں، اور اگر کوئی دوسرا شرعی وفقہی اصول وقواعد کی روشنی میں حل نکالے، تو اس کو اس علمی دنیا میں ایک اجنبی چیز سمجھا جاتا ہے، اوپر سے ''یُسر وتیسیر'' کے لیے اتنی شرائط وقیود لگا دی جاتی ہیں، جن کے پیشِ نظر اس ''یُسر وتیسیر'' کا پیدا کرنا، اگر ناممکن نہیں، تو غیر معمولی مشکل ضرور ہو جاتا ہے، اور بالآخر انجام ''عسُر'' ہی کی شکل میں نکلتا ہے۔

پھر ان شرائط میں سے متعدد شرائط خود ساختہ معلوم ہوتی ہیں، جن کی مستند فقہائے کرام کے نزدیک کوئی اہمیت ووقعت نہیں، اور نہ ہی فقہائے کرام نے ان شرائط کو ضروری قرار دیا، اور موجودہ دور کے بعض اہلِ علم حضرات جو اپنے بزرگوں کی طرف سے پیش کردہ مختلف ہدایات کو اپنے درجہ پر رکھنے کے بجائے، شرائط کا درجہ دے کر ان پر مصر رہتے ہیں، اور اجتہادی وتحقیقی شان رکھنے والے فقہاء کو اس قسم کی ہدایات کی پابندی کا مکلّف سمجھتے ہیں، یہ غلو وتشدد پر مبنی ہے۔

فقہائے کرام کے مابین اختلافی مسائل میں اگر کوئی صاحبِ تقویٰ احتیاط پر مبنی قول کو اختیار

کرتا ہے، تو یہ بہت اچھی بات ہے، لیکن جب اس کے بالمقابل دوسرے قول میں بھی عمل کی گنجائش پائی جاتی ہے، تو اگر کسی ضرورت مند، مشکل میں گھِرے ہوئے، یا کمزور ایمان شخص کے لیے اس پر عمل کی گنجائش دی جائے، تو اس میں اعتراض نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ اولاً تو فقہائے کرام کے مابین اکثر اختلافی مسائل میں افضل وغیر افضل وغیرہ کا اختلاف ہے، دوسرے بیشتر فقہاء کے اصح قول کے مطابق ہر کس وناکس پر علی الاطلاق مذہبِ معین وشخصِ معین کی ایسی تقلید واجب نہیں کہ اس کو ہر مسئلہ میں ایک ہی فقہی امام یا مذہب پر عمل کرنا ضروری ہو، تیسرے فقہائے کرام کے معتبر اقوال میں سے اختیارِ اخف کی بھی گنجائش پائی جاتی ہے، اگرچہ بعض حضرات اس میں کچھ شرائط کے بھی قائل ہیں، چوتھے آج کے دور میں بیشتر عوام کی حالت یہ ہے کہ اگر انہیں گنجائش والے پہلو کی اجازت نہیں دی جاتی، تو وہ سرے سے اس عمل سے محروم ہو کر اور تمام فقہائے کرام کی مخالفت کر کے مجرم شمار ہوتے ہیں، اور جب اس کے برعکس ان کو دوسرے فقہائے کرام کے قول، یا سہل پہلو کی اجازت دی جاتی ہے، تو وہ اس پر عمل پیرا ہو کر متفق علیہ گناہ سے بچ جاتے ہیں، جبکہ فقہائے کرام نے متعدد مسائل میں اس طرح کے مواقع پر گنجائش والے قول پر عمل کی اجازت دی ہے۔

پانچویں دین کے فروعی اور مجتہد فیہ مسائل میں جن میں کہ اہلُ السنۃ والجماعۃ کے مشہور فقہائے کرام کی آراء مختلف ہیں، ان میں سے کسی قول کے بارے میں بے جا سختی اور تشدد مناسب نہیں، نہ تو اس کی تبلیغ کرتے وقت اس میں سختی وتشدد اور نکیر کا انداز مناسب ہے، اور نہ ہی عوام میں سے کسی شخص کے دوسرے قول پر عمل کرنے کی صورت میں اس پر بے جا تشدد ونکیر مناسب ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ دوسرے قول کو راجح سمجھ کر اس پر عمل کر رہا ہو، اور اگر کوئی محقق عالمِ دین تحقیق کے دوران کسی دوسرے فقیہ وامام کے قول کو راجح سمجھے، اور اس پر فتویٰ دے، تو اس پر بھی نکیر نہیں کی جا سکتی، اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے فروعی وفقہی اختلافی امور، مجتہَد فیہ مسائل کے زمرہ میں آتے ہیں، جن میں کوئی جانب فی نفسہٖ منکر نہیں

کہلاتی، فقہائے کرام کی عبارات وکلام میں ان چیزوں کی صراحت ملتی ہے۔

مگر افسوس کہ آج بہت سے حضرات اس سلسلہ میں کئی طرح کی بے اعتدالیوں کا قولاً، یا فعلاً ارتکاب کرتے ہیں، اور فروعی مسائل میں جانبِ مخالف قول کی اس طرح تردید کے درپے ہوتے ہیں، جیسا کہ وہ کسی فاسق وفاجر اور گمراہ شخص، بلکہ دین کے دشمن کا قول ہو، اور اس پر عمل کرنے والا بھی اس کے نتیجہ میں فاسق اور گناہ گار ٹھہرتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں درپردہ بڑے بڑے فقہاء وصلحاء بھی زد میں آجاتے ہیں۔

چنانچہ مشاہدہ سے ثابت ہے کہ آج کل علماء کا ایک بڑا طبقہ اس طرح کے فروعی مسائل میں جانبِ مخالف اقوال کی تردید کی تبلیغ میں اپنی صلاحیتوں کو خرچ کررہا ہے۔

ہمارے زمانہ میں فقہی ومجتہَد فیہ امور میں ایک نقطۂ نظر تو جمودِ محض کا ہے، کہ ایک خاص فقہی مذہب اور مجتہَد فیہ موقف کے برخلاف ابتلائے عام اور اس موقف پر عمل کرنے میں عوام الناس کو کتنی بھی مشکلات کیوں نہ پیدا ہوجائیں، اور اس مخصوص فقہی قول کے بالمقابل دوسرے موقف سے متعلق کتنے ہی مضبوط دلائل کیوں نہ سامنے آجائیں، جن پر دل کا اطمینان ومیلان ہو، اور ان دلائل کے مقابلہ میں اپنے موقف کو مضبوط ثابت کرنے کے لئے خواہ کتنی ہی بے تکی اور دور دراز کی تاویلات کا سہارا کیوں نہ حاصل کرنا پڑے، لیکن اپنے سلسلہ کے مشہور ومعروف اور اس خطہ میں پہلے سے رائج موقف سے ہٹنے کی کوئی گنجائش نہیں دی جاتی، اور گنجائش تو دور کی بات ہے، اگر کوئی صاحبِ علم غور وفکر اور تحقیق کے نتیجہ میں اس معروف اور مروج موقف کے علاوہ، مدلل انداز میں اپنی دیانت دارانہ رائے ہی کیوں نہ پیش کرے، جو کہ علمی وفقہی اُصول وقواعد کے مطابق اس کی ذمہ داری ہے، اور اس کو اپنی اس دیانت دارانہ رائے میں خیانت کرنا جائز نہیں، مگر وہ ان کے نزدیک متفرد، غیر مقلد، سلف کا گستاخ، اور نہ جانے کن کن الزامات کا مورَد اور القابات کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

جبکہ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کا جمود اور اس سے بڑھ کر خمود، ایک ایسا فقہی ومسلکی تعصّب

وتشدد ہے کہ جس کی نظیر موجودہ عہد سے قبل گزشتہ کسی دور میں نہیں ملتی، بلکہ گزشتہ صدیوں میں سے تقریباً ہر صدی اور ہر دور میں اہلِ حق علماء وفقہاء، فقہی ومجتہد فیہ فروعی مسائل میں نہ صرف یہ کہ بتقاضائے زمانہ وعرف اور حاجت، یا دلائل کے پیشِ نظر اپنی آراء کا اظہار کرتے رہے ہیں، بلکہ اپنی تحقیق کے مطابق فتاویٰ بھی دیتے رہے ہیں، خواہ وہ رائے، یا فتویٰ ان کے سلسلہ ومسلک کے سابق معروف ومروج قول کے خلاف کیوں نہ ہو، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول، یا حنفیہ کی ظاہرُ الروایۃ کے خلاف، اور غیر ظاہرُ الروایۃ کے مطابق اور اس سے بڑھ کر امام ابو یوسف، امام محمد، بلکہ امام زفر، یا امام حسن وغیرہ کے قول کے مطابق کیوں نہ ہو، اور بعض اوقات دوسرے مسالکِ حقہ کے قول اور موقف کو بھی اختیار، یا ان کے موقف کی طرف، دلائل کے راجح ہونے کی بناء پر، اپنا میلان ورجحان ظاہر کرتے رہے ہیں، ایسے مسائل اور شخصیات کی فہرست اور دائرہ بڑا وسیع ہے، جن کو احاطۂ شمار میں لانا مشکل ہے۔

مگر موجودہ صدی میں برصغیر کے ایک علمی طبقہ پر ایسا جمود، بلکہ خمود طاری ہوا ہے کہ جو رائے یا فتویٰ گزشتہ صدی میں کسی نے دے دیا، یا جس قول کو راجح وغیرہ قرار دے دیا، تو بس وہی رائے اور فتویٰ حرفِ آخر بن کر رہ گیا، یا اس کو ایسا بنا دیا گیا، گویا کہ یہ شارع کا محکم، منصوص ومصرح حکم ہے، خواہ وہ فتویٰ اور رائے دلائلِ شرعیہ کے تناظر میں کمزور اور حالتِ حاضرہ میں عرف ومعاشرت اور تعاملات بدل جانے کی وجہ سے مشکل اور نا قابلِ عمل کیوں نہ ہو، اور اس سے ذرا بھی اِدھر اُدھر انحراف کرنا بڑا عیب وجرم خیال کیا جانے لگا، اور کسی پہلو سے متعلق پائے جانے والے مختلف اقوال میں سے کسی ایک قول کو لے کر اس کے ساتھ شریعت کے اہم اصول، اور نصِ قطعی اور فرض وواجب جیسا سلوک کیا جانے لگا۔

یہ نقطۂ نظر اگرچہ بعض علمی حلقوں میں کتنا ہی مقبول ومانوس کیوں نہ سمجھا جاتا ہو، اور اس پر کتنا ہی زور کیوں نہ دیا جاتا ہو، اور اس کو سہارا دینے اور تقویت پہنچانے کے لیے کتنی ہی تاویلات کیوں نہ پیش کی جاتی ہوں، لیکن اعتدال کی کسوٹی پر پرکھنے سے انتہا وتشدد پسندی اور تعصب

پسندانہ اور غلو پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

افسوس کہ ہمارے بعض علمی حلقوں میں اس طرح کے مختلف اقوال میں سے بعض اقوال کو اُصولِ اجتہاد وتحقیق اور افتاء کے عنوان سے اصول بنا کر اس انداز میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے کہ تحقیق واجتہاد کی صلاحیت رکھنے والے اہلِ علم حضرات کی تمام تر صلاحیتوں پر ہر طرح کی پابندیاں عائد کردی جاتی ہیں، اور ایک باصلاحیت محقق عالِمِ دین کو تقلیدِ جمود کا پختہ سبق پڑھا کر اور ایک طرح سے تحقیق واجتہاد سے اپاہج بنا کر چھوڑ دیا جاتا ہے، جو کہ غیر معتدل طریقہ معلوم ہوا۔

اس غیر معتدل نقطۂ نظر کے مدِّ مقابل، دوسرا نقطۂ نظر موجودہ دور میں یہ سامنے آرہا ہے کہ فقہی اور مجتہد فیہ مسائل کو نااہل، غیر محتاط، ناتجربہ کار اور پختہ علم سے محروم حضرات، ایسا تختۂ مشق بناتے ہیں کہ اپنی تحقیق میں کمزور نظر آنے والے موقف پر ایسے نشتر چلاتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں دینِ اسلام کی اصولی تعلیمات کا بھی حلیہ مسخ ہو کر رہ جاتا ہے، اور فقہائے کرام کے علمی وفقہی منصب پر بھی ان کی طرف سے لب کشائی میں زورِ قلم وزبان اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ سامنے آنے والی ہر چیز کو کاٹتا چلا جاتا ہے، جبکہ یہ نقطۂ نظر بھی پہلے نقطۂ نظر کے مقابلے میں دوسری جہت سے انتہاء وتعصب پسندی پر مبنی معلوم ہوا۔

اور بنظرِ غائر دیکھا جائے تو دراصل یہ پہلے نقطۂ نظر وطرزِ عمل کا ردِّ عمل ہے، جمودِ محض کے ردِّ عمل میں بھرپور خود رائی وخود ستائی شاید نظامِ کائنات میں اصولِ فطرت کی رُو سے عمل وردِ عمل کا حصہ ہے، عمل جب منفی اور غیر معتدل ہوگا، تو ردِ عمل کے مثبت ومعتدل آنے کی کیونکر توقع رکھی جاسکتی ہے۔

اس طرح سے ہماری دیانت دارانہ رائے کے مطابق نہ پہلا نقطۂ نظر اعتدال پر مبنی کہلائے جانے کے قابل ہے، اور نہ ہی دوسرا نقطۂ نظر، بلکہ ایک اگر افراط پر مبنی ہے، تو دوسرا تفریط پر مبنی ہے، اور حق ومعتدل نقطۂ نظر ان دونوں کے درمیان ہے، جس میں نہ پہلے کی طرح ایسا جمود و

خمود ہے کہ فقہی ومجتہد فیہ فروعی مسائل کا اختلاف، امت کے لئے رحمت کے بجائے زحمت ٹھہرے، اور تحقیق واجتہاد ونظرِ ثانی اور راجح ومرجوح قرار دینے کے تمام کلّی وجزوی دروازے بند اور مسدود ہو جائیں، اور کسی بھی باصلاحیت صاحبِ علم کی فیمابینہٗ وبین اللہ، دیانت دارانہ رائے کے اظہار پر قفل پڑ جائیں، اور امت کو درپیش مشکلات کے حل کا بھی کوئی راستہ نہ ہو۔

اور نہ ہی اس میں ایسی آزادی ہے کہ اس میں ہر اہل ونا اہل، کس وناکس کو تحقیق واجتہاد کے نام پر اباحیت پرستی اور کلی آزادی کی کھلی چھوٹ مل جائے۔

اس افراط وتفریط پر مبنی حالات پر ماضی قریب میں برصغیر کے اندر اللہ تعالیٰ نے حضرتُ الامام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ (المتوفیٰ: 1176ہجری) سے عظیم فقہی خدمات کا فریضہ اداء کرایا ہے، حضرت شاہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کی شخصیت مذکورہ افراط وتفریط پر مبنی جملہ طبقات کے لیے ایک مرجع ومجمع الامر کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے محسوس کیا کہ امتِ مسلمہ کا ایک طبقہ تقلید کے بارے میں غلو کا شکار ہے اور وہ خاص مسلک کی تقلید و پابندی میں جمود کی حد تک پہنچ گیا ہے، اور اس کی ساری توانائیاں مخصوص فقہ واصولِ فقہ اور اس کی مخصوص جزئیات تک محدود ہیں، کتاب وسنت کے بارے میں ان کا مطالعہ وتحقیق نہ ہونے کے برابر ہے، جس کے نتیجہ میں قرآن وسنت اور اس سے مسائلِ فقہیہ کے استنباط کے طریقوں سے ناواقفیت بڑھتی جارہی ہے، اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کسی امام، یا فقہ کے مقابلہ میں قرآن وسنت کی نصوص کو بھی رَد کیا جانے لگا ہے۔

اور اس کے ردِعمل میں ایک طبقہ ایسا بھی پایا جاتا ہے کہ جو سرے سے ائمہ مجتہدین کی مطلق تقلید کا انکار کرتا ہے، جبکہ وہ خود قرآن وسنت سے فقہی مسائل کے استنباط کی قدرت بھی نہیں رکھتا، مگر اس کے باوجود وہ جلیلُ القدر فقہائے کرام اور ائمۂ مجتہدین کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ان دونوں قسم کے طبقات کی افراط وتفریط کی

نشاندہی فرمائی اور فقہی امور، نیز اجتہاد وتقلید میں اعتدال وتوسع کا راستہ دکھلایا۔

مگر افسوس کہ دونوں قسم کے طبقات نے افراط وتفریط سے اپنی اصلاح کرنے کے بجائے اپنے مخصوص مزاج ومزاق کے مطابق حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی فکر کو اپنی فکر قرار دینے پر اپنی صلاحیتیں صرف کیں، اور افراط وتفریط میں وقت کے ساتھ مزید اضافہ ہوتا چلا گیا، اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی طرف سے افراط وتفریط سے بچنے بچانے اور اعتدال وتوسع کو ملحوظ رکھنے کا اصل مقصد فوت کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ اعتدال، حق جوئی وحق گوئی اور اصلاحِ عمل کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد18 شمارہ10، جون 2021ء - شوال المکرّم 1442ھ)

---

(188)

جذباتیت اور سطحیت سے اجتناب

ایک زمانے سے دیکھنے میں آ تا رہا ہے کہ ''بھیڑ چال'' کی روایت کی وجہ سے عموماً ہمارے معاشرہ اور بطورِ خاص ہمارے ملک میں جذباتیت اور سطحیت پر عمل کا پہلو روز بروز پروان چڑھ رہا ہے، جب کسی چیز کے ردِعمل کا معاملہ پیش آتا ہے، تو عام طور پر اس میں ہوش سے زیادہ، جوش، اور حقیقت وگہرائیت سے زیادہ سطحیت وجذباتیت کو ترجیح دی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں جہاں ہمیں اپنی کاوشوں، کوششوں اور جدوجہد کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو پاتے، اسی کے ساتھ ہماری اجتماعی صلاحیت اور انرجی (Energy) کا بڑا حصہ بھی کسی مفید مصرف کے بجائے، اور نتیجہ خیز ہوئے بغیر ویسے ہی ضائع اور ویسٹ (Waste) ہو کر رہ جاتا ہے، اور ہماری وہ صلاحیت وانرجی جو دوسرے ضروری، مفید اور اہم کاموں میں خرچ کی جاسکتی تھی، اس سے محرومی مقدر بن جاتی ہے، اور اس طرح ہم دین ودنیا کے مختلف شعبوں میں روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔

www.idaraghufran.org

اس بھیڑ چال والی صورتِ حال کی ذمہ داری، جہاں عوامی حلقوں پر عائد ہوتی ہے، اسی کے ساتھ ان علمی ودینی حلقوں پر بھی عائد ہوتی ہے، جو تحقیق سے زیادہ تقلید، بھیڑ چال اور رضائے خالق کے مقابلے میں، رضائے مخلوق کو پیشِ نظر رکھ کرآگے بڑھتے ہیں۔

اور اللہ کے جس بندہ کی طرف سے اس جذباتی طبقہ کو جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے، اور سطحیت وجذباتیت کے بجائے، حقیقت وگہرائیت پر نظر کرنے کی دعوت دی جاتی ہے، تو غور وفکر کیے بغیر فوراً اس کے خلاف سخت ردِّعمل کا اظہار کیا جاتا ہے۔

جب جذباتیت وسطحیت، اس درجہ غلو تک پہنچ جائے کہ اس میں اعتدال واصلاحِ احوال کی دعوت دینے والے کی بات کو سننا تک گوارا نہ کیا جائے، اور محض اپنے جذباتی وسطحی موقف کے خلاف ہونے پر اس کی تردید اور اس پر نکیر شروع کردی جائے، تو معاملہ اور زیادہ سنگین صورتِ حال اختیار کرلیتا اور بربادی کی طرف چلا جاتا ہے، جس کا بدقسمتی سے اب ہم نے سامنا کرنا شروع کردیا ہے۔

اس جذباتی وسطحی سوچ اور مزاج کے آثارِ بد، دنیا کے معاملات سے زیادہ، ہمارے دینی ماحول پر پڑ رہے ہیں، جس کی وجہ سے ہماری کئی دینی واجتماعی کوششوں میں بھی اب وہ حقیقت، اور وہ قوت دکھائی نہیں دیتی، جو پہلے کسی زمانے میں دکھائی دیتی تھی۔

اس لیے مختلف واقعات وحالات کے تناظر میں بسا اوقات محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم حقیقت کی منزل سے بھٹک چکے اور راستے سے بہت دور نکل چکے ہیں۔

ہمارے یہاں ایک عرصہ سے دنیا کے معاملات میں تو ذرا ذرا سی بات پر مارکوٹ، گالم گلوچ، اور مرنا، مارنا، ایک کھیل بنتا دکھائی دے ہی رہا تھا، لیکن اب دینی معاملات میں بھی ذرا ذرا سی بات پر فاسق وفاجر اور یہاں تک کہ کافر قرار دینے کی جذباتی وسطحی صورتِ حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

کسی کی طرف سے گستاخِ رسول ہونے کا کوئی شوشہ چھیڑا جاتا ہے، تو متعلقہ شخص اور واقعہ کی

تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، اوراس کے خلاف بلاتحقیق ایک ٹرینڈ (Trend) چلا دیا جاتا ہے، بعض اوقات دنیا کے کسی ایک کونے کھدرے کے اندر گمنام انداز میں وقوع پذیر ہونے والے محتمل ومجمل واقعہ کو ہوا دے دے کراوراس کوقومی وبین الاقوامی واقعہ کی حیثیت دے کراپنی اجتماعی صلاحیتوں کواس پر قربان کیا جانے لگتا ہے، اور برسرِ منبرومحراب اور برسرِ بازار، محبوب رب العالمین کی ناموس کے خلاف ہونے والے واقعات واشخاص کا بار بار چرچا کیا جاتا ہے، جبکہ کوئی باحیاء شخص، اپنے والدین یا استاذ کے خلاف ہونے والی گستاخی کا اس طرح برملا چرچا واظہار کرنا گوارا نہیں کرسکتا۔

بعض اوقات کسی ایک گستاخ کافر کوتنبیہ کی جدوجہد کرنے کے لیے اپنے ہزاروں، لاکھوں مسلمان بھائیوں کومختلف قسم کے مصائب وآلام سے دوچار کیا جاتا ہے، سینکڑوں قیمتی جانوں کوقتل اورفساد کی بھینٹ چڑھوادیا جاتا ہے، اوراس گستاخِ رسول کافر کوسزا وتنبیہ تو کیا ہوتی، بسا اوقات اس کوعالمی طاقتوں کے محفوظ ہاتھوں میں پہنچوا کر ''ہیرو'' اورانٹرنیشنل درجہ کا مشہور فرد بنوادیا جاتا ہے، اس طرح کے واقعات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔

اللہ حفاظت فرمائے۔آمین۔

20-ربیع الآخر-1442ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ''، جلد18 شمارہ10، جون 2021ء - شوال المکرّم 1442ھ)

---

(189)

انفرادی واقعات پراجتماعی صلاحیتوں کی قربانی

ہمارے معاشرہ میں ایک عرصہ سے دیکھنے میں آرہا ہے کہ دنیا کے کسی کونے میں کوئی قابلِ نکیر انفرادی اوراکا دکّا واقعہ رونما ہوجاتا ہے، جس سے دنیا کے بیشتر لوگ ناواقف ہوتے ہیں، لیکن ہمارا دینی ومذہبی جذبہ رکھنے والا بڑا طبقہ اس نوعیت کے واقعات کے اس طرح درپے

ہو جاتا ہے کہ جب تک دنیا کے کونے کونے میں اس کی خود اپنے طور پر تشہیر و تبلیغ نہیں کر دیتا، اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھتا، اوپر سے اس طرزِ عمل میں اپنی زبانی، کلامی، تحریری و تقریری اجتماعی صلاحیتوں کے استعمال کو بہت بڑی دین کی خدمت بھی تصور کرتا ہے، لیکن عموماً اس کا نتیجہ کوئی مفید و معنیٰ خیز برآمد نہیں ہوتا، اور آہستہ آہستہ پھر اس واقعہ سے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔

پھر جب کوئی اس نوعیت کا دوسرا واقعہ رونما ہوتا ہے، اس کے متعلق بھی سابقہ طرزِ عمل اختیار کیا جاتا ہے، اور سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

اس طرزِ عمل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دینی و مذہبی اس طبقہ کی جو صلاحیتیں، اپنی اور اپنے متعلقین و مخاطبین کی اصلاح اور اپنی قوم کی تعمیر و ترقی میں خرچ ہو سکتی تھیں، وہ اس طرح کے انفرادی واقعات کی تبلیغ و تشہیر اور تردید کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔

ہم نے جہاں تک اس طرزِ عمل کے متعلق غور کیا، تو ہمیں یہ طرزِ عمل، تبلیغِ دین اور دعوتِ نبوت کے موافق محسوس نہ ہوا، اگر روئے زمین پر آنے والے انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور ان کے صحیح وارثین بھی اس طرزِ عمل میں مصروف ہوتے، تو شاید آج بظاہر ہم بھی مسلمان نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ اصلاحِ احوال کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔ 03- ذوالحجہ- 1442ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 18 شمارہ 12، اگست 2021ء - ذوالحجہ 1442ھ)

---

(190)

ایک صاحبِ علم و مصلح کے تبصرہ پر کلام

بندہ کے پاس مچھر مارنے کے برقی آلہ (Electric Insect Killer) کے متعلق ایک استفتاء آیا، جس میں ایک مفتی صاحب کے طرزِ عمل کا بھی ذکر تھا کہ وہ اس کے استعمال کو حدیث میں آگ سے عذاب دیے جانے کی ممانعت کے خلاف سمجھتے ہیں، اور وہ اس طرح

کے آلہ کے استعمال سے لوگوں کو منع کرتے، اور اس پر نکیر کرتے ہیں۔

بندہ نے اس استفتاء کا اپنی حسبِ عادت کچھ تفصیل سے جواب تحریر کر دیا، اور مفید ہونے کی وجہ سے، ماہنامہ ''التبلیغ'' میں اس کی اشاعت بھی کر دی۔

اس استفتاء اور اس کے جواب میں کسی مفتی کا نام مذکور نہ تھا، ویسے بھی اگر کسی استفتاء میں کسی شخص کا نام مذکور ہو، تو اشاعتِ عام میں اس کا نام حذف کر دینا مناسب ہوا کرتا ہے، جیسا کہ عام طور پر شائع ہونے والے بہت سے فتاویٰ میں معمول ہے، دیگر بہت سے اکابر کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے مواعظ وملفوظات اور فتاویٰ جات میں اس چیز کا بطورِ خاص اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے۔

مذکورہ فتوے کے شائع ہونے کے بعد ایک مولانا صاحب جو مصلح بھی شمار ہوتے ہیں، نے اپنے زیرِ ادارت رسالہ میں اس پر کچھ مفصل تبصرہ اور تنقید کی، اور لکھا کہ:

> ''مفتی صاحب نے اپنے دینی رسالہ میں اس مسئلہ کا دلائل کی بوچھاڑ کے ساتھ گیارہ صفحوں میں مجھے جواب دیا کہ یہ جائز ہے''

حالانکہ یہ ان مولانا صاحب کا اپنا دعویٰ اور ان کی اپنی سوچ ہے، جس کی انہوں نے کوئی معقول دلیل بھی ذکر نہیں کی۔

البتہ انہوں نے اپنا ایک واقعہ ذکر کر دیا، جو بندہ کے ساتھ پیش آیا تھا کہ وہ ایک مرتبہ میرے پاس دارالافتاء میں تشریف لائے اور وہاں اس طرح کے برقی آلہ کو نصب دیکھ کر اس کو بند کرنے کی تجویز دی، میں نے مہمان کے اکرام کی خاطر اس کو بند کر دیا، پھر انہوں نے اس کے عدمِ جواز پر بات کی کہ اس کا استعمال، ان احادیث کے خلاف ہے، جن میں آگ سے عذاب دینے کی ممانعت آئی ہے۔

بندہ نے عرض کیا کہ فلاں فلاں اصحابِ علم وافتاء کی طرف سے اس کے استعمال کے جائز ہونے کے فتاویٰ موجود ہیں، لیکن انہوں نے فرمایا کہ جس چیز کی احادیث میں ممانعت آ گئی،

اس کے برخلاف کسی کے فتوے کی کیا حیثیت ہے، بندہ نے اس وقت اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کو طول دینا مناسب نہ سمجھا، اور بات آئی گئی ہوگئی۔

پھر کچھ عرصہ بعد اس سلسلے میں بندہ کو ایک استفتاء موصول ہوا، تو بندہ کو فکر لاحق ہوئی کہ اس آلہ کا استعمال، ہوٹلوں، دفتروں، اداروں، اور مدارس ومساجد وغیرہ میں بلانکیر عام ہے، اور اس کے جواز پر اصحابِ افتاء کے فتاویٰ بھی موجود ہیں، اس لیے اس کے متعلق ان فتاویٰ کو جمع کر کے شائع کر دیا جائے، تاکہ کسی کو غلط فہمی ہو، تو دور ہو جائے۔

لیکن مولانا موصوف مذکور نے اس سیدھے سادے فتوے کو مذکورہ واقعہ کی وجہ سے اپنے حق میں متعین سمجھ لیا، اور اس پر تبصرہ کرنے کو ضروری سمجھا، اور اپنے دفاع کی کوشش کی کہ میں اس کے استعمال کے ناجائز ہونے کا نہ تو فتویٰ دیتا ہوں اور نہ ہی اس کے استعمال پر سختی کرتا ہوں، البتہ اس کے استعمال کے مناسب نہ ہونے اور احتیاط کے خلاف ہونے کی وجہ سے بچنے کا اکثر اپنی نجی مجالس میں ذکر کرتا رہتا ہوں، اور بھی نہ جانے کیا کیا باتیں تحریر کیں، بلکہ اس تحریر میں اپنے موقف سے متعلق کچھ متضاد باتیں شائع کر دیں۔

جب موصوف نے ایک دینی رسالہ میں اس کی اشاعت کر دی، تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس فتوے کے پسِ منظر اور ان کے تبصرہ کی روشنی میں، دینی وشرعی مسئلہ کی مکمل وضاحت کر دی جائے، اس مقصد کے لیے بندہ نے قدرے تفصیل کے ساتھ ایک تحریر مرتب کر کے مولانا موصوف کی خدمت میں ارسال کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

بندہ دینی وفقہی مسائل میں ذاتی انا پرستی اور اونچ نیچ کا تو قائل اور عادی نہیں، البتہ دینی مسائل میں حتی الامکان تحقیق وتوضیح کا قائل اور اس کے مطابق عامل ہے، کیونکہ اس طرح کے دینی مسائل میں ابہام واجمال اور اس طرح کی مبہم ومجمل باتیں، عوام الناس کے لیے تشویش واضطراب کا باعث بنتی ہیں، اس تحقیق وتوضیح کے طرزِ عمل کی وجہ سے بعض اصحابِ علم، بندہ سے خفاء ہوتے ہیں، لیکن بندہ پر ان کے اس طرزِ عمل سے فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اس

موقع پر الحمدللہ اصل مقصود رضائے خالق ہوتا ہے، نہ کہ رضائے مخلوق۔

اور ہر عالمِ دین، بلکہ ہر مسلمان کے پیشِ نظر یہی مقصود ہونا چاہیے، اور رضائے خلق کی خاطر، رضائے خالق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس مقصد کو سامنے رکھ کر عمل کی توفیق عطاء فرمائے۔آمین۔

03-ذوالحجہ-1442ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد18 شمارہ12، اگست 2021ء - ذوالحجہ 1442ھ)

---

(191)

متنازع روایتی اختلافات میں غلو سے اجتناب

آج کل بہت سے مسلمان ایسے گناہوں میں کثرت کے ساتھ مبتلاء ہوگئے ہیں، جن کے گناہ ہونے میں، نہ تو امتِ مسلمہ کے درمیان کوئی قابلِ ذکر اختلاف ہے، اور نہ کسی مسلمان کو ان کے گناہ ہونے میں شک ہوسکتا ہے، اوپر سے غضب یہ ہوا کہ ان گناہوں کی طرف گناہ کرنے والوں کی توجہ بھی نہیں رہی، جس کی وجہ سے اپنے آپ کو دین دار سمجھنے والے مسلمانوں کا بڑا طبقہ بھی ان گناہوں میں مبتلا ہوگیا ہے، پھر اس پر ظلم یہ کہ مقتدائے دین سمجھے جانے والے حضرات، ان گناہوں پر نکیر نہیں کرتے اور ان کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے، چنانچہ بطورِ خاص میڈیا کے ذریعے کئی سنگین گناہ عام ہوتے جارہے ہیں، اسی طرح معاشرہ میں اور بھی کبیرہ گناہوں کا دوردورہ اور کثرت ہے، دوسری طرف یہ المیہ ہے کہ دین دار اور مقتدائے دین حضرات ، مذکورہ گناہوں کی اصلاح وجدوجہد کے بجائے، ایسے باریک ،نظری، اجتہادی، اختلافی اور فروعی وروایتی مسائل میں ایک دوسرے کے خلاف اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے میں مصروفِ عمل ہیں کہ جن کے متعلق قیامت کے دن سوال ہونے کا بھی خطرہ نہیں، بشرطیکہ ان میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے۔

مثلاً آج کل ایک ہی مسلک سے تعلق رکھنے والے بہت سے علماء میں حیات وممات، اور سماعِ موتی وعدمِ سماعِ موتی اور قبر وبرزخ وغیرہ کی کیفیات، نوعیات اور مقامات وغیرہ کے حوالہ سے اس قدر فضول اور لایعنی گفتگو اور بحث ومباحثہ کا طویل سلسلہ جاری ہے کہ جس کی کوئی حد وانتہاء نہیں، اور حال یہ ہے کہ اس موضوع پر تحقیق سے زیادہ تبلیغ اور ایک دوسرے کے خلاف بڑھ چڑھ کر تردید، اور ایک دوسرے کی تذلیل وتحقیر اور فتوے بازی کا بازار گرم ہے۔

یہاں تک کہ اپنے مخالف علمائے دین کو کافر اور زندیق وغیرہ نہ جانے کیا کچھ کہا جارہا ہے۔

اگر صورتِ حال یہی برقرار رہی، تو اندیشہ ہے کہ آپس میں خونریزی کی بھی نوبت نہ آجائے، جو بدقسمتی سے بہت سے مقامات پر پیش بھی آچکی ہے، اللہ تعالیٰ اس قسم کی بے اعتدالیوں سے امتِ مسلمہ کی حفاظت فرمائے۔

خیرُ القرون اور متقدمین کے مبارک ادوار میں اس قسم کے مسائل میں، یا تو علمائے امت نے عوام کے سامنے سکوت رکھا، یا اتنے اجمال پر اکتفاء کیا، جو اِن کی عقل وفہم کے دائرہ میں تھا، جس کی وجہ سے عوامُ الناس میں فتنہ رونما نہ ہوا، اور معاملہ حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہوا۔

لیکن آج اس قسم کے مسائل میں، کم علم اور کم عقل عوام کے سامنے ایسی ایسی نازک اور بے سروپا بحثیں اور قیاس مع الفارق والی مثالیں چھیڑی جاتی ہیں، جو ان کی فہم وعقل سے بالاتر ہوتی ہیں، اور ''یک من علم رادہ من عقل باید'' کا اصول ملحوظ نہ ہونے کی بناء پر بہت سے علماء وصلحاء کو جہلائے زمانہ کے ہاتھوں تختۂ مشق بنوادیا جاتا ہے ''العیاذ باللہ من ذالک''

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کو صریح محرمات اور گناہوں سے بچانے اور دینِ اسلام کے مسلمہ احکام کی بجاآوری کی تبلیغ واصلاح میں اپنی صلاحیتوں کو مصروف کیا جائے، اور اس قسم کے علمی، تحقیقی اور نظری مسائل کو سنجیدہ اور محقق ومعتدل اصحابِ علم کے سپرد کیا جائے، اور طرفین سے مسلمہ ومتفقہ اصولوں کی پاسداری کا اہتمام کیا جائے، اور متنازع کیفیات ونوعیات وغیرہ میں زیادہ کدوکاوش اور کھود کرید سے کام نہ لیا جائے۔

لیکن یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک طرفین کے سنجیدہ اصحابِ علم اپنے اپنے حلقوں میں اس قسم کے مسائل میں پیدا ہونے والی بے اعتدالیوں و بدعنوانیوں کی اصلاح کی کوشش نہیں فرمائیں گے، اور صرف اپنے مخالفین کی بے اعتدالیوں و بدعنوانیوں پر چرچا کرنے اور فتوے بازی کی روایت کو ترک نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

18- رمضان-1442ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد19 شمارہ01، ستمبر 2021ء - محرم الحرام 1443ھ)

---

(192)

''مکتبہ شاملہ لائبریری'' کے استعمال پر شبہات کا ازالہ

آج کل بہت سی دینی کتب کا ذخیرہ اور علمی مواد کمپیوٹر پر منتقل ہو چکا ہے، جس طرح بہت سی دوسری چیزوں کا ذخیرہ کمپیوٹر کے پروگرام میں منتقل ہو چکا ہے، حکومتی، اور عوامی سطح پر مختلف اداروں کے کاروباری مشاغل اور ضروریاتِ زندگی میں اپنی اپنی ضرورت کی حد تک کمپیوٹر کا استعمال بلاتردد ہو رہا ہے، جو مواد پہلے کاغذوں، کاپیوں اور رجسٹروں وغیرہ میں پایا جاتا تھا، جس کو مینول (Manual) کام کہا جاتا تھا، وہ رفتہ رفتہ ڈیجیٹل (Digital) بنتا جا رہا ہے۔

شرعی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے، کمپیوٹر اور ڈیجیٹل پروگرام کو جائز اور مباح طریقہ پر استعمال کرنے، اور اسی ضمن میں مطالعہ اور علم و تحقیق کے لیے بھی استعمال کرنے میں گناہ نہیں، جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں مختلف جدید ذرائع اور وسائل کو شرعی حدود کا لحاظ کرتے ہوئے استعمال کرنا گناہ نہیں۔

چنانچہ آج کل بہت سے اصحابِ علم کمپیوٹر کے ''مکتبہ شاملہ'' پروگرام سے استفادہ کرتے ہیں، اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف علمی و تحقیقی کام سرانجام دیتے ہیں۔

لیکن موجودہ زمانہ میں جامد علماء کا ایک طبقہ وہ ہے، جو مکتبہ شاملہ کے استعمال پر طرح طرح

کے شبہات واعتراضات کرتا ہے، اوراس پروگرام کے استعمال کرنے والوں کو ''لکیر کا فقیر'' وغیرہ قرار دیتا ہے، جیسا کہ مکتبہ شاملہ کا استعمال بذاتِ خود کسی فعلِ منکر میں داخل ہو۔

ان حضرات کی طرف سے بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ مکتبہ شاملہ والے دینی کتابوں اور دینی مواد میں ردوبدل اور تحریف وترمیم کرتے ہیں، اس لیے مکتبہ شاملہ میں موجود کتابوں اور علمی مواد پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، جب تک خارجی طریقہ پر عبارات کو کاغذ پر طبع شدہ نسخوں سے ملا کر تصدیق نہ کرلی جائے۔

حالانکہ مکتبہ شاملہ میں جو کتب شامل کی جاتی ہیں، وہ مختلف مکتبوں کی شائع شدہ ہوتی ہیں، مکتبہ شاملہ کے منتظمین کو جن مکتبوں کی طرف سے کتب وغیرہ کا مواد فراہم کیا جاتا ہے، وہ حسبِ منشاء اس کو مکتبہ شاملہ کا حصہ بنادیتے ہیں، اور اپنی حسبِ حیثیت خود بھی کمپوزنگ اور کتابت کے بعد ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، مواد کو مکتبہ شاملہ میں شامل کردیتے ہیں۔

بعض اوقات مختلف مکتبوں اور مطبعوں سے شائع شدہ نسخوں میں کسی جگہ عبارت میں فرق ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جس مکتبہ اور مطبع کا نسخہ ''مکتبہ شاملہ'' والوں کو حاصل ہوگا، وہ اسی کے مطابق مکتبہ شاملہ میں شامل کریں گے، ایسی صورت میں کسی عبارت کے اندر فرق کو مکتبہ شاملہ کے منتظمین کی طرف منسوب کرنا درست نہ ہوگا۔

کیونکہ اس طرح کے کاغذ پر طبع شدہ نسخے ہندوستان وپاکستان وغیرہ کے بہت سے مدارس وجامعات اور کتب خانوں میں بھی موجود ہوتے ہیں، جن سے اہلِ علم حضرات استفادہ کرتے ہیں۔

جہاں تک بعض جگہ عبارات میں اغلاط کا تعلق ہے، تو نسخوں میں اس طرح کی اغلاط تو بہت سی کاغذ پر طبع شدہ ایسی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں، جو ہندوستان وپاکستان اور دوسرے ممالک میں طبع ہوتی ہیں، اور وہ مستند علماء کے زیرِ مطالعہ، یا ان کے زیرِ نگرانی مدارس وجامعات اور ان کے کتب خانوں اور لائبریریوں میں موجود ہوتی ہیں۔

لہٰذا بعض جامد ومتعصب حضرات کا دوسرے مکتبوں اور لائبریریوں کو نظر انداز کر کے، محض مکتبہ شاملہ پر اس طرح کے اعتراضات وشبہات کرنا، اور مکتبہ شاملہ سے استفادہ کرنے والوں کی طرف ''لکیر کا فقیر'' وغیرہ ہونے کی نسبت کرنا، درست نہیں، اور یہ پہلے بتلایا جا چکا کہ کمپیوٹر، یا اس سے متعلق پروگراموں میں موجود کتب سے استفادہ کرنا، شرعی اعتبار سے بذاتِ خود ممنوع نہیں، مکتبہ شاملہ وغیرہ جیسے پروگرام بھی جدید دور کے مکتبے اور لائبریریاں ہیں، جس طرح جہاز اور دوسری بے شمار جدید مشینریاں، جدید دور کے مختلف تیز اور سہل ذرائع ہیں۔

پس جس طرح جہاز اور دوسری جدید مشینریوں کے استعمال پر محض اس وجہ سے نکیر کرنا درست نہیں کہ وہ گزشتہ دور کے ذرائع اور وسائل سے مختلف ہیں، اسی طرح کمپیوٹر کے جائز پروگراموں اور لائبریریوں پر بھی محض اس کے جدید ذریعہ اور وسیلہ ہونے کی وجہ سے نکیر کرنا درست نہیں۔

اور جہاں تک بعض حضرات کی طرف سے اس بات کا تعلق ہے کہ جب تک کاغذ پر طبع شدہ کتابوں کے دوسرے نسخوں سے عبارت کو ملا کر نظرِ ثانی نہ کر لی جائے، اس وقت تک محض مکتبہ شاملہ پر اعتماد کرنا درست نہیں، تو اس کے متعلق عرض ہے کہ تحقیق کا دائرہ محدود نہیں، جس طرح خارجی اور کاغذ پر طبع شدہ کتابوں اور لائبریریوں میں مطالعہ کرنے اور ان سے استفادہ کرنے والوں کے لیے بھی تحقیق کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ عبارت کو ان کتابوں کے دوسرے مطبوعہ نسخوں سے ملا کر تائید حاصل کریں، اسی طرح مکتبہ شاملہ کی لائبریری میں مطالعہ کرنے اور اس سے استفادہ کرنے والوں کے لیے بھی تحقیق کا یہ ایک طریقہ ہے، لیکن جس طرح کاغذ پر طبع شدہ کتابوں میں مطالعہ کرنے اور ان سے استفادہ کرنے والوں کو اس چیز کا مکلّف کرنا درست نہیں کہ وہ ہر ہر عبارت کی تائید وتصدیق دوسروں نسخوں سے نظرِ ثانی کر کے اور ملا کر حاصل کیا کریں، اسی طرح مکتبہ شاملہ کی عبارت کا بھی معاملہ ہے، البتہ

جہاں کسی عبارت میں اشتباہ واقع ہو، یا دوسرے نسخے سے تعارض محسوس ہو، وہاں اس طرزِ عمل کو اختیار کرنے میں حرج نہیں، لیکن کاغذ پر طبع شدہ کتابوں اور لائبریریوں سے استفادہ کرنے کی صورت میں اس چیز کا مکلّف نہ کرنا، اور محض مکتبہ شاملہ کی لائبریری سے استفادہ کرنے والوں کو اس بات کا مکلّف کرنا درست نہیں، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ مکتبہ شاملہ کے پروگرام میں کچھ ایسا مواد، یا بعض ایسی کتب، یا ایسے مضامین پائے جاتے ہیں، جو مستند و معتمد نہیں، یا اُن میں کتابت اور کمپوزنگ وغیرہ کی اغلاط پائی جاتی ہیں، لیکن یہ بات مکتبہ شاملہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ عام معاشرے میں کاغذ پر شائع ہونے والی کتب ومضامین اور لائبریریوں میں موجود مواد میں بھی کم وبیش یہ بات پائی جاتی ہے۔

مزید براں یہ کہ مکتبہ شاملہ لائبریری کے منتظمین کی طرف سے اس پروگرام میں ''موافق للمطبوع'' اور ''غیر موافق للمطبوع'' کی نشاندہی کی جاتی ہے، اور مطبوعہ نسخے کا مکمل حوالہ بھی ذکر کیا جاتا ہے، اور مکتبہ شاملہ پروگرام کے انٹرنیٹ سے وابستہ ہونے کی صورت میں اس کے مطبوعہ نسخے کی طرف رجوع اور لنک (Link) کا آپشن بھی موجود ہوتا ہے، اور جو مواد مکتبہ شاملہ کے منتظمین اپنی ذمہ داری پر شامل کرتے ہیں، اس کی ''من کتب الموقع الرسمی'' لکھ کر نشاندہی کی جاتی ہے، اور یہ مواد ''مقفّل'' ہوتا ہے، جس میں مکتبہ شاملہ کے منتظمین کے علاوہ، کسی دوسرے کی طرف سے ترمیم وتحریف کا امکان نہیں ہوتا۔

مکتبہ شاملہ لائبریری سے استفادہ کرنے والے جو حضرات اس قسم کے امور سے ناواقف ہوتے ہیں، وہ ان چیزوں کو ملحوظ نہیں رکھتے، لیکن اس میں ان کی اپنی کوتاہی اور لاعلمی شامل ہوتی ہے، اس کوتاہی کی مکتبہ شاملہ لائبریری کے منتظمین کی طرف نسبت کرنا درست نہیں۔

جو اہلِ علم حضرات مکتبہ شاملہ لائبریری کے پروگرام اور اس کے مختلف آپشنز (Options) سے پوری طرح واقف نہیں، وہ اس پر خوامخواہ طرح کے اعتراضات وشبہات کرتے رہتے ہیں۔

علاوہ ازیں مکتبہ شاملہ لائبریری میں کتب اور مواد شامل کرنے، یا مواد فراہم کرنے والے حضرات میں ہمارے یہاں کے بیشتر حضرات سست روی کا شکار ہیں، اور اس طرف متوجہ نہیں، وہ عربی زبان میں تحریر شدہ مواد کو مکتبہ شاملہ میں شامل کرنے کرانے کا اہتمام نہیں کرتے، اور دوسرے سلسلوں کے حضرات، بالخصوص سلفی اور اہلِ حدیث کہلائے جانے والے افراد، اس معاملہ میں مستعد ہیں، وہ اپنے سلسلے کی کتابوں، نسخوں اور مواد کو مکتبہ شاملہ نام کی لائبریری کے پروگرام میں شامل کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں، اس لیے ان کے مقابلے میں سست روی کا شکار رہنے والے جامد حضرات اپنی کام چوری کا الزام دوسروں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مکتبہ شاملہ لائبریری کے ذریعے علماء ومحققین کے لیے بڑی سہولت پیدا ہوگئی ہے، اور جن کتب کو وہ بیش بہا سرمایہ خرچ کرکے، اور وسیع ترین جگہ مہیا کرکے ہی استفادہ کرسکتے تھے، ان کو اس مکتبہ کے ذریعے اس طرح کی مشکلات سے کافی حد تک نجات حاصل ہوگئی ہے۔

افسوس کہ جو حضرات خود تو کوئی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق علمی وتحقیقی کام کرنے کے لیے تیار نہیں، وہ حضرات اس مکتبہ شاملہ لائبریری کے استعمال کرنے پر طرح طرح کے بے سروپا اعتراضات وشبہات کرتے ہیں، جو ''نہائیں، نہ نہانے دیں'' والی بات ہے۔

اور دوسری طرف ان معترض حضرات کی حالت یہ ہے کہ دینی مقاصد اور دنیاوی ضروریات کے لیے دیگر جدید ذرائع اور وسائل کو بلا کھٹک وتردد استعمال کرتے ہیں۔

چنانچہ پہلے دور میں پائی جانے والی سواریوں، مثلاً اونٹ، بیل، گھوڑوں، وغیرہ کے مقابلے میں، جدید دور کی تیز اور آسان سواریوں، مثلاً موٹر سائیکل، گاڑی، ٹرین، جہاز وغیرہ کا استعمال بلا تردد کیا جاتا ہے، دینی اور دنیاوی ضروریات کے لیے، ان جدید ذرائع کے استعمال پر نکیر نہیں کی جاتی، یہاں تک کہ تعلیمی وتبلیغی دورے اور دینی سفر واسفار اور حج وعمرہ کو

www.idaraghufran.org

انجام دینے کے لیے بھی ان چیزوں کو بلاتأمل استعمال کیا جاتا ہے، اور اگر کوئی ان جدید وسائل کے بجائے قدیم ادوار کی سواریوں کے استعمال پر زور دے، تو اس کی بات کو اہمیت نہ دی جائے، بلکہ اسے احمق، بے وقوف اور لکیر کا فقیر، اور نہ جانے کیا کچھ قرار دیا جائے۔ یہی حال بجلی، پٹرول وغیرہ کے ذریعے اور ڈیجیٹل طریقہ پر چلنے والی دوسری چیزوں کے استعمال کا بھی ہے، مثلاً پنکھے، ائرکولر، لاؤڈ سپیکر، ٹیلی فون، موبائل، ڈیوائس وغیرہ کا۔

پس جب معاشرتی زندگی میں دوسرے جدید مباح وسائل اور ذرائع کے استعمال پر نکیر نہیں کی جاتی، تو علم وتحقیق کے لیے کمپیوٹر کی مکتبہ شاملہ لائبریری کے استعمال پر نکیر کرنے کا کیا مطلب؟ جہاں تک اس سلسلے میں مختلف کوتاہیوں کی شکایت کا معاملہ ہے، تو اس طرح کی کوتاہیاں دوسرے جدید وسائل اور ذرائع کے استعمال میں بھی پیش آسکتی ہیں، اور آتی ہیں، ایسی صورت میں خاص ان کوتاہیوں سے بچنے بچانے کی ضرورت ہوگی، اور اس کے بجائے بذاتِ خود اس مباح اور جائز چیز کے استعمال پر نکیر کرنا، اور اس کے لیے الگ اصول مقرر کرنا درست نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اصلاح کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

28- شوال- 1442ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 19 شمارہ 01، ستمبر 2021ء - محرم الحرام 1443ھ)

---

(193)

اجتماعی قربانی کا عمل

آج کل بڑے شہروں اور خاص کر گھنی آبادی والے علاقوں میں عامۃُ الناس کے لیے عیدُ الاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کی قربانی کا عمل انجام دینا مشکل ہوتا جارہا ہے، جس کی کئی وجوہات ہیں۔

مثلاً شہروں میں جگہیں تنگ ہوچکی ہیں، جہاں قربانی کے جانوروں کو رکھنا اور پھر قربانی کرنا مشکل ہوتا ہے۔

رہائشی مکانوں میں جانوروں کو کھڑا کرنا، اور جانوروں کو وہاں اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوتا ہے، صاف وشفاف اور چکنے فرش پر بعض اوقات جانور پھسل کر، گر پڑتا ہے، اور زخمی ہو جاتا ہے، یا ٹانگ وغیرہ ٹوٹ جاتی ہے۔

آبادی والے علاقے میں بعض اوقات جانور، بدک جاتا ہے، یا غصہ میں آکر بے قابو ہو جاتا ہے، اور عمارت، مکان، گاڑی، بلکہ انسانی جان کو بھی نقصان پہنچا دیتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں جانور خود بھی تکلیف اٹھاتا ہے۔

پھر جس جگہ جانور کو رکھا جاتا ہے، وہاں اس کے چارہ، پانی، اور بول و براز کی بناء پر بدبو اور گندگی پھیلتی ہے، جس کی وجہ سے وہاں پر رہائش پذیر لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

جبکہ بہت سے جانور کھلی اور الگ تھلگ جگہ کے پلے ہوئے ہوتے ہیں، وہ جب آبادی کے شور وہجوم وغیرہ کو دیکھتے ہیں، تو سخت متوحش ہو کر بے قابو ہو جاتے ہیں، بعض اوقات بھاگ کر گم ہو جاتے ہیں، یا کسی بڑے حادثہ کا سبب بن جاتے ہیں، اور بعض اوقات جانور ہی جان سے چلا جاتا ہے، اسی طرح جانور کی خریداری اور اس کو رکھنا اور اس کی ضروریات کو پورا کرنا، اور پھر قربانی کا عمل انجام دینا، محنت ومشقت اور جفاکشی کا کام ہے، اور آج کل عام طور پر شہری لوگ، ان چیزوں کے عادی نہیں رہے۔

اس کے علاوہ آج کے دور میں صحیح قصابوں کی دستیابی مشکل اور مہنگی ہوگئی ہے، اولاً تو عیدِ قربان کے موقع پر قصاب ہی مشکل سے میسر آتے ہیں، اور اگر میسر بھی آتے ہیں، تو وعدے، معاہدے کے مطابق صحیح وقت پر کام مشکل سے کرتے ہیں، اور ہر شخص کو الگ سے جانور کی قربانی کرانے کے لیے اجرت بھی مہنگی دینی پڑتی ہے، اور بہت سے قصاب صرف نام کے ہوتے ہیں، وہ ذبح کرنے اور گوشت بنانے کے فن سے ناواقف اور اناڑی ہوتے ہیں، اناڑی قصاب گوشت خراب کر دیتے ہیں، جبکہ بعض اوقات اناڑی قصابوں کی طرف سے جانور کو ذبح کرنے کے لیے گراتے وقت کوئی جانی، یا مالی بڑا حادثہ پیش آجاتا ہے، جس

کی بناء پر قربانی کا عمل خود سے کسی قصاب سے کرانا مشکل ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں آج کل بہت سے لوگوں کی زندگی بہت مصروف ہوگئی ہے، ان کے پاس جانور کی خریداری، اس کو رکھنے اور ذبح کرنے اور گوشت بنوانے کا وقت ہی نہیں۔

اور بعض لوگوں کو الگ الگ جانور کی قربانی کرنا، مہنگائی کی وجہ سے مشکل ہوتا ہے، اور اس کے برعکس اجتماعی قربانی میں کچھ کم خرچ میں قربانی کا عمل انجام پا جاتا ہے۔

ان جیسی وجوہات کی بناء پر شہری ماحول میں خود ہر ایک کے قربانی کرنے کے بجائے، کسی ادارہ کی طرف سے کی جانے والی قربانی میں حصہ ڈال لیا جاتا ہے، اور بعض اوقات اس طرح اداروں کے واسطہ سے بکرے وغیرہ کی قربانی کرالی جاتی ہے، اور اس کے نتیجہ میں لوگ مذکورہ چیزوں کی زحمت اور آزمائشوں سے محفوظ رہ جاتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف اجتماعی قربانی کا عمل انجام دینے والے اداروں اور افراد پر بھی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ شرعی تقاضوں کے مطابق پوری امانت و دیانت کے ساتھ اس طرح اجتماعی قربانی کے عمل کو انجام دیں کہ جس کی وجہ سے شرعی قربانی میں خلل واقع نہ ہو۔

مگر ہم نے دیکھا کہ بعض لوگوں نے اجتماعی قربانی کے عمل کو عبادت اور خدمتِ خلق سے زیادہ کاروبار، پیشہ اور اپنی خدمتِ حلق کا ذریعہ بنالیا ہے، جس میں شرعی تقاضوں کی رعایت کا پورا لحاظ نہیں کیا جاتا۔

چنانچہ بعض لوگ پیسے بچانے کے لیے ایسے ایسے سستے اور عیب دار جانوروں کی قربانی کر دیتے ہیں، جن کی قربانی یا تو جائز ہی نہیں ہوتی، یا مکروہ وغیرہ ہو جاتی ہے۔

اور اگر قربانی کا گوشت شرکاء لینا نہ چاہیں، تو پھر یہ ظالم سِرے سے قربانی کرتے ہی نہیں، پیسے لے کر جیب میں رکھ لیتے ہیں، اور خود ہی کھا پی جاتے ہیں۔

آج کل اجتماعی قربانی کے عنوان سے ایک اور طبقہ سننے میں آیا، جس کی طرف سے اجتماعی قربانی، گوشت کے وزن کی قیمت کے اعتبار سے انجام دی جانے لگی ہے، جس میں صافی

گوشت کی مقدار طے کردی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ اتنے وزن کا صافی گوشت اتنے روپیہ میں ملے گا، اور اتنے وزن کا صافی گوشت اتنے روپیہ میں ملے گا، یا جو بھی الفاظ بولیں جائیں، مقصد یہی ہوتا ہے۔

شرعی اعتبار سے مذکورہ طریقہ جائز معلوم نہ ہوسکا، کیونکہ قربانی کا اصل عمل تو مخصوص جانور کے ذبح کرنے سے اداء ہوجاتا ہے، باقی گوشت پوست اور اس کی مقدار اور وزن، یہ ثانوی درجہ کی اور اضافی چیزیں ہیں۔

جب قربانی کے عمل میں صافی گوشت کی قیمت طے کر کے معاہدہ ومعاملہ انجام دیا گیا، تو یہ در حقیقت گوشت کی خرید وفروخت کا معاملہ ہوا، قربانی کا جس عمل سے تعلق تھا، یعنی ذبح ہونا، اس سے خاطر خواہ تعلق باقی نہ رہا۔

اب اگر کسی جانور کا گوشت زیادہ نکلا، تو وہ قربانی کرانے والے کی ملکیت ہونی چاہیے، جبکہ مذکورہ صورت میں اس کو اس کا حقدار نہیں سمجھا جائے گا۔

اور اس کے برعکس اگر کسی جانور کا گوشت کم نکلا، تو وہ اتنی مقدار میں ہی قربانی کرانے والے کی ملکیت ہوگا، اور ''یا مقدر یا نصیب'' والی بات ہوگی، اور ایسی صورت میں گوشت کی مقدار پوری کرنے کے لیے دوسرے ایسے جانور کا گوشت شامل کرنا پڑے گا، جس سے دوسرے شخص کا حق اور اس کی ملکیت وابستہ ہے، کیونکہ قربانی کے گوشت کے ساتھ قربانی کرنے والے کا حق وابستہ ہوجاتا ہے، خواہ اس کا گوشت کم ہو، یا زیادہ۔

اس طرح کے مفاسد کی وجہ سے مذکورہ طریقہ شریعت کے مطابق معلوم نہ ہوسکا۔

بعض جگہ اجتماعی قربانی کے نام پر اتنی زیادہ بے اعتدالی ہوچکی ہے کہ اجتماعی قربانی کے شرکاء کو جو گوشت فراہم کیا جاتا ہے، وہ سرے سے قربانی کے جانوروں کا ہوتا ہی نہیں، بلکہ یا تو عام جانور کا گوشت ہوتا ہے، جو کہیں سے خرید لیا جاتا ہے، یا اپنی سہولت کی خاطر قربانی کے جانوروں کو قربانی کا وقت شروع ہونے سے پہلے ذبح کردیا جاتا ہے۔

چنانچہ بعض واقعات ایسے سننے میں آئے کہ اجتماعی قربانی کرنے والے اداروں کی طرف سے اجتماعی قربانی میں شرکت کرنے والے بعض افراد کو عیدالاضحیٰ کے دن فریز شدہ گوشت فراہم کیا گیا، اور بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ گوشت، عیدالاضحیٰ کا دن شروع ہونے سے پہلے کا فریز کیا ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس طرح سے بھی اجتماعی قربانی کا عمل انجام دینا درست نہیں، کیونکہ قربانی کے لیے جس طرح شریعت کی طرف سے مخصوص جانور اور ان کی شرائط متعین کردی گئی ہیں، اسی طرح سے قربانی کے ایام اور اوقات بھی متعین کردیئے گئے ہیں، قربانی کا وقت شروع ہونے سے پہلے، قربانی کا عمل انجام دینا درست نہیں، اور اگر کوئی ایسا کرے، تو اس طرح کا گوشت کھانے پینے کی ضرورت تو پوری کرسکتا ہے، لیکن اس سے قربانی کا عمل درست قرار نہیں پاتا۔

اس کے علاوہ بھی اجتماعی قربانی کے انتظامات میں بعض جگہ دوسری کوتاہیاں لازم آتی ہیں۔

مثلاً بعض جگہ قربانی کے جانوروں کو دوسرے جانوروں کے سامنے ذبح کیا جاتا ہے، جس سے زندہ جانور کو تکلیف پہنچتی ہے، اور وہ ذبح ہونے سے پہلے ہی جان چھوڑ بیٹھتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ شہری علاقوں میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے ایسی نوبت آجایا کرتی ہے، لیکن اپنی طرف سے ممکنہ حجاب کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہمارے یہاں ادارہ غفران میں بھی اجتماعی قربانی کا ایک عرصہ سے نظم قائم ہے، اور ادارہ کی عمارت بھی تنگ جگہ میں واقع ہے، جس کی وجہ سے چند سالوں سے، جب سے اجتماعی قربانی کے سلسلے میں وسعت پیدا ہوئی، اس عمل میں سخت دشواری تھی، اور جانوروں کو کھڑا کرنے اور ذبح کرنے کی الگ الگ اور فاصلہ کی جگہ میسر نہ تھی۔

اور وسیع جگہ حاصل کرنے، بصورتِ دیگر اجتماعی قربانی کے نظم کو ختم، یا محدود کرنے کی تجویز زیرِ غور تھی۔

بالآخر اس سال وسیع جگہ حاصل کر کے، زندہ جانوروں کے کھڑے ہونے اور ذبح کرنے کی جگہ میں فاصلہ رکھا گیا، لیکن ایک چیز کی طرف نہ تو خاطر خواہ توجہ ہو سکی، اور نہ ہی بروقت اس کا انتظام ہو سکا کہ ذبح شدہ جانوروں کا گوشت بنانے کا عمل زندہ کھڑے ہوئے جانوروں کی نظر سے پوشیدہ رکھا جائے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریب میں موجود زندہ جانوروں نے گوشت دیکھ کر کھانا پینا سب کچھ چھوڑ دیا، اور قربانی کرنے کے بعد بہت سے جانوروں کا گوشت توقع سے بہت کم نکلا، جس کے بعد اندازہ ہوا کہ جانور کی نظر کے سامنے گوشت بنانے سے بھی اس پر اثر پڑتا ہے کہ زندہ جانور وحشت اور خوف کی وجہ سے جیتے جی، جان چھوڑ جاتا ہے۔

اس کے بعد جانوروں کو زندہ جانوروں کے سامنے ذبح کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے سامنے گوشت بنانے کے مفسدہ کا بھی اندازہ ہوا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے مفاسد ومکروہات سننے میں آتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ موجودہ زمانے میں شہری ماحول میں الگ الگ ہر شخص کے لیے قربانی کا عمل انجام دینا مشکل ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے اجتماعی قربانی میں حصہ ڈالنے کا رجحان روز بروز بڑھ رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ بعض پیشہ ور، لالچی اور کم علم لوگوں نے اس عمل کو عبادت سے زیادہ کاروبار اور پیشہ کی جہت سے انجام دینا شروع کر دیا ہے، اور اس میں مختلف مفاسد ومکروہات کا ارتکاب ہو رہا ہے، جن سے بچنے بچانے کی ضرورت ہے۔

اجتماعی قربانی میں حصہ لینے والے شرکاء کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی قربانی کے عمل کو ہر کس وناکس کے حوالہ نہ کریں، اور صرف بعض ظاہری انتظامات پر نظر نہ کریں، جب تک پورا اطمینان حاصل نہ کر لیں، اور گوشت کی مقدار وغیرہ کو ذبح کے شرعی عمل کے تابع نہ سمجھیں۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 19 شمارہ 01، ستمبر 2021ء - محرم الحرام 1443ھ)

---

www.idaraghufran.org

(194)

عادات اور عبادات میں ’’رسم وبدعت‘‘ کا فرق

بعض کام ایسے ہیں، جو لوگ عبادت کے طور پر بھی کرتے ہیں، اور عادت کے طور پر بھی کرتے ہیں، اور جب لوگ اس طرح کے کسی فعل کو بطور عادت کے اختیار کریں، اور کسی دوسرے گناہ کا ارتکاب بھی نہ کریں، تو صرف اس وجہ سے اس پر بدعت کا حکم لگانا درست نہیں کہ وہ فعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام وخیرُ القرون کے زمانے میں موجود نہیں تھا۔

چنانچہ ایسے بہت سے کام ہیں کہ جن کو ہر زمانے اور ہر علاقے والے لوگ بطور عادت کے کرتے ہیں، اور بلانکیر ان کاموں پر تعامل وعمل جاری ہے، کوئی بھی مسلمان، ان کو بدعت قرار نہیں دیتا، البتہ اگر ان کاموں کو عبادت کے طور پر انجام دیا جائے، تو پھر بدعت کا حکم لگانے کی گنجائش ہوتی ہے، پھر اس طرح کے بعض کاموں کے متعلق اہلِ علم کا اختلاف اس طور پر رونما ہو جاتا ہے کہ بعض اہلِ علم حضرات، لوگوں کے اس طرح کے فعل پر ’’عبادت‘‘ ہونے کی جہت سے بدعتِ محدثہ کا حکم لگا دیتے ہیں، اور بعض اہلِ علم حضرات اس فعل پر ’’بطور عادت‘‘ رائج ہونے کے ’’بدعتِ محدثہ‘‘ کا حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ اس کو فعلِ مباح میں داخل مانتے ہیں، اور اس کی بہت ساری مثالیں معاشرہ میں پائی جاتی ہیں۔

مثلاً ہر علاقہ وقوم کی ایک زبان ہوتی ہے، جیسا کہ فارسی زبان، اردو زبان، پنجابی زبان، پشتو زبان، اور اس زبان کو ہر علاقہ وقوم کے لوگ بطور عادت کے اختیار واستعمال کرتے ہیں، اس لیے اس پر بدعتِ محدثہ کا حکم نہیں لگایا جاتا۔

اسی طرح مثلاً ہمارے پاکستان کا مخصوص قومی لباس ’’شلوار، قمیص‘‘ ہے، بعض صوبوں وعلاقوں میں مَردوں، یا عورتوں کے اعتبار سے اس لباس کی وضع قطع الگ ہے، ہندوستان میں مخصوص کرتہ وپائجامہ کا رواج ہے، اور بعض دوسرے ممالک کا لباس دوسری نوعیت کا ہے،

تو اس قسم کے مختلف اقسام وانوع کے لباس بھی ''عادات'' کے قبیل سے ہیں ''عبادات'' کے قبیل سے نہیں، اس لیے جب تک ان میں کوئی گناہ، مثلاً بے پردگی وغیرہ لازم نہ آئے، ان تمام انواع کے لباسوں کو، فعلِ مباح وجائز کاموں کے زمرہ میں داخل مانا جائے گا۔

اسی طرح مثلاً شادی بیاہ وغیرہ کے مواقع پر ولیمہ کی تقریب میں ہر علاقہ میں کھانے پینے کی چیزوں کا رواج مختلف ہے، کسی علاقہ میں چاول، کسی میں روٹی، کسی میں نمکین ذائقہ والا کھانا، کسی میں میٹھے ذائقہ والا کھانا، اوران میں بھی مخصوص طریقہ کی ڈِشوں کا رواج ہے، جن کا قرآن وسنت سے ثبوت نہیں ملتا، لیکن ان چیزوں کو بطورِ عادت رائج ہونے کی وجہ سے ''بدعتِ محدثہ'' اور گناہ قرار دیا جانا درست نہیں ہوتا۔

اسی طرح مثلاً رمضانُ المبارک کے مہینے میں سحری وافطاری میں مخصوص قسم کے کھانوں کا رواج علاقوں کے اعتبار سے مختلف ہے، کسی علاقہ میں پکوڑے، چاٹ، سموسے، سویّاں، وغیرہ پسند کی جاتی ہیں، اور کسی علاقہ میں دوسری طرح کی چیزیں پسند کی جاتی ہیں، اور روزمرہ کے کھانے پینے کی چیزوں میں بھی مختلف علاقوں کا رواج ایک دوسرے سے جدا ہے۔

یہی معاملہ عید کے دن مخصوص سویّوں، اور چاٹ، دہی بھلوں وغیرہ کا بھی ہے کہ یہ سب چیزیں، لوگ اپنی اپنی عادات اور پسند کے طور پر اختیار کرتے ہیں، ان کا ''عبادات'' کے قبیل سے تعلق نہیں۔

لہٰذا جب تک ان کاموں کو عادات کے طور پر استعمال کیا جائے، اور مخصوص عبادت نہ سمجھا جائے، اور کسی دوسرے گناہ ومنکر کا بھی ارتکاب نہ کیا جائے، اس وقت تک ان چیزوں پر ''بدعتِ محدثہ'' اور گناہ وناجائز ہونے کا حکم لگانا درست نہ ہوگا۔

اور تحقیق کے بعد اب ہمارا رجحان اس طرف ہوا کہ عید کی نماز کے بعد جو لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے مصافحہ کرتے ہیں، یا عیدین اور نکاح وغیرہ کے مواقع پر بطورِ اظہارِ سرور وبشاشت کے، اور فوتگی وغیرہ کے موقع پر جو اظہارِ ہمدردی کے طور پر معانقہ کیا جاتا ہے،

یہ بھی عادات کے قبیل سے ہے، عبادات کے قبیل سے نہیں، اس لیے مذکورہ تحقیق کے بعد بندہ کا اس پر ''بدعتِ محدثہ'' کا حکم لگانے کی طرف رجحان نہ رہا، اور جو ہمارے ہندوستان وپاکستان کے بہت سے علماء کی طرف سے اس پر بطورِ عبادت کے ''بدعتِ محدثہ'' وناجائز ہونے کا حکم لگایا گیا ہے، جس کی بندہ نے پہلے اتباع کی تھی، اب تحقیق کے بعد بندہ نے اس سے رجوع کرلیا ہے، البتہ کوئی عبادت سمجھے، یا خاص ان مواقع کی سنت سمجھے، تو اس سے منع کیا جائے گا، اس مسئلہ کی تفصیل بندہ نے اپنے رسالہ ''عید کے دن مصافحہ ومعانقہ کا حکم'' میں بیان کردی ہے، جس میں تعصب وتحزّب سے متاثر ہوئے بغیر راجح رائے کے اظہار اور سابق موقف سے رجوع میں بحمداللہ تعالیٰ، بخل اور شرم وعار سے کام نہیں لیا گیا، اگرچہ موجودہ زمانے کے بعض متعصبین کو یہ طرزِ عمل سخت ناپسند ہے۔26-ذوالحجہ-1442ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 19 شمارہ 02، اکتوبر 2021ء - صفرالمظفر 1443ھ)

---

(195)

تحقیق وتقلید میں اختلاط والتباس

آج کل کے بعض تعصب پرستوں کا حال یہ ہے کہ کسی صاحبِ علم کی دیانت دارانہ ومنصفانہ تحقیق، خواہ کتنے ہی مضبوط دلائل پر مبنی کیوں نہ ہو، لیکن اگر وہ ان کے مخصوص ذوق، اور مخصوص مسلک ومشرب، یا مخصوص اکابر وبزرگوں کے موقف کے خلاف ہو، تو یہ متعصب حضرات اس کو تحقیق کا نام دینا بھی گوارا نہیں کرتے، اور اگر اس کے برعکس کسی مضمون میں ان متعصبین کے مخصوص ذوق، اور مخصوص مسلک ومشرب، یا ان کے مخصوص اکابر وبزرگوں کے موقف کی تقلید پر مبنی مواد کو اکٹھا کردیا جائے، تو اس کو ''تحقیق'' اور ''نہایت عمدہ تحقیق'' وغیرہ کا عنوان دیتے ہیں، خواہ وہ مواد، کتنے کمزور اور مرجوح دلائل پر مبنی کیوں نہ ہو، اور اس میں ''تحقیق'' کے بجائے ''تقلید'' کو رہنما ورہبر بنایا گیا ہو۔

یہ سخت ناانصافی اور ظلم پر مبنی طریقہ ہے، جس میں ''تحقیق'' اور ''تقلید'' کے مابین اصولی اور بنیادی فرق کو نہ صرف یہ کہ ملحوظ نہیں رکھا جاتا، بلکہ اس کو پامال کیا جاتا ہے۔

محقق عالمِ دین کے علمی منصب اور دیانت داری و ذمہ داری کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ تحقیق کرتے وقت تحقیقی اصولوں کو پیشِ نظر رکھے، پھر اگر تحقیق کی رُو سے کسی خاص مسلک ومشرب کے برخلاف موقف کا راجح ہونا ظاہر ومعلوم ہوجائے، تو احقاقِ حق کے اظہار میں کوئی شرم وعار محسوس نہ کرے، اور اگر تحقیق کے نتیجے میں کسی خاص مسلک ومشرب کے مطابق وموافق موقف کا راجح ہونا ظاہر ومعلوم ہوجائے، تو اس کا بھی اظہار کردے۔

الحمدللہ تعالیٰ ہمیں جب سے اللہ تعالیٰ نے تعصب کے مرض کو سمجھنے اور اس سے بچنے کی اپنے خاص فضل وکرم سے توفیق عطاء فرمائی، اس وقت سے کسی مسئلے کی تحقیق کرتے وقت تحقیق وتقلید کے مابین مذکورہ فرق کا احساس رہتا ہے، اور اس کے مطابق اپنی علمی وتحقیقی ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اور پھر اس طرح کی تحقیقات کو وقتاً فوقتاً شائع کرنے کا اہتمام بھی حسبِ موقع وحسبِ ضرورت ہوتا رہتا ہے۔

جس کے بعد مختلف ذوق کے قارئین کی طرف سے مختلف طرح کی آراء، تبصروں اور تجزیوں وغیرہ کا بھی سلسلہ جاری رہتا ہے۔

جس طرح بہت سے قارئین کی طرف سے تشجیع وتصویب اور تصدیق وغیرہ پر مشتمل آراء موصول ہوتی ہیں، اسی طرح بعض متعصبین کی طرف سے بے جا تنقید وجرح پر مشتمل آراء بھی موصول ہوتی ہیں۔

چنانچہ بندہ کے علمی وتحقیقی رسائل میں اب تک الحمدللہ تعالیٰ بہت سے علمی وتحقیقی مضامین شائع ہوچکے ہیں، جن میں حتی الامکان تحقیق کے عدل وانصاف پر مبنی اصولوں کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک مرتبہ اسی طرح کے ایک صاحبِ علم نے بندہ کو خط لکھا، جس میں انہوں نے بندہ کی ابتداء سے لے کر اب تک اکثر کتب اور تحقیقی رسائل کی تمام مطبوعہ مجلدات اپنے پاس موجود ہونے، اوران سے استفادہ کرنے کا ذکر کیا تھا، جس کے ضمن میں انہوں نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ تحقیقی رسائل کی جلد نمبر ۵ پڑھ کر بے ساختہ آپ کے لیے دعائیں نکلیں، پھر کئی اور نسخے منگوا کر اپنے دوستوں کو متوجہ کیا، الحمد للّٰہ ثم الحمد للّٰہ، آپ نے حق اداء کر دیا، اور اپنے اکابر کا خوب دفاع کیا، نیز ان ہی کی تقلیدی رائے پر مضبوط دلائل فراہم کیے، جو یقیناً بڑے خاصے کی چیز ہے۔

ساتھ ہی مذکورہ صاحبِ علم نے علمی وتحقیقی رسائل کی جلد نمبر ۱۲ پر سخت جرح وتنقید بھی کی تھی۔

بندہ نے مذکورہ صاحبِ علم کی تحریر کا بالاستیعاب مفصل جواب تحریر کر دیا، جس میں مذکورہ صاحبِ علم کی تحریر میں مذکور تمام ''مالھا، وما علیھا'' پر محقق کلام کر دیا گیا ہے، لیکن وہ مفصل ومحقق جواب ابھی تک مذکورہ صاحبِ علم کو ارسال نہیں کیا گیا تھا، اور ابھی نظرِ ثانی کے مراحل سے گزر رہا تھا کہ اسی دوران مذکورہ صاحبِ علم نے ایک خط کے ذریعے بندہ کو تحریر کیا کہ:

> 5 جمادی الاولیٰ 1442ھ/ 20 دسمبر 2020ء آپ کو ایک مکتوب لکھا تھا، جس میں آپ کی ''تحقیقی رسائل'' کی جلد 12 پر گزارشات پیش کی گئی تھیں۔
>
> اس مکتوب میں ایک مقام پر آپ کی ایک کتاب کی تعریف لکھی تھی ''تحقیقی رسائل کی جلد نمبر 5 پڑھ کر بے ساختہ آپ کے لیے دعائیں نکلیں''
>
> جلد لکھنے میں مجھ سے سہو ہوا، میری مراد جلد نمبر 2 تھی، جس میں ''صبح صادق وکاذب اور وقتِ عشاء کی تحقیق'' تھی، جلد نمبر 5 کا ابھی تک میں نے مطالعہ نہیں کیا، لہٰذا اطلاعاً عرض ہے۔

مذکورہ صاحبِ علم نے جو دوسرا خط ارسال کیا، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ پانچویں جلد میں مذکور بعض مضامین ایسے تھے، جو مذکورہ صاحبِ علم کے مخصوص مسلک ومشرب، اوران کے مخصوص

اکابر و بزرگوں کے موقف کے سے مطابقت وموافقت نہ رکھتے تھے، اگرچہ وہ علمی و تحقیقی اصولوں پر مبنی کیوں نہ ہوں، اور دوسری جلد میں مذکور موقف، ان کے موافق ومطابق تھا۔

اسی لیے انہوں نے اکابر کا خوب دفاع کرنے، اور ان کی تقلیدی رائے پر مضبوط دلائل فراہم کرنے پر اس کو ''خاصے کی چیز'' قرار دیا، اور جو علمی و تحقیقی مضامین اکابر کے دفاع، اور ان کی تقلیدی رائے کے مضبوط دلائل پر مبنی نہ تھے، ان کو بے جا جرح وتنقید کی نذر کر دیا۔

اس طرزِ عمل سے تحقیق وتقلید کے مابین متعصبین کی طرف سے پیدا کیے گئے اختلاط والتباس کو سمجھا جاسکتا ہے۔

افسوس کہ اس طرح کے متعصبین نے ''تحقیق'' کو ''تقلید'' کی بھینٹ چڑھا کر تحقیق کے اصولوں کو پامال کرنے میں کوئی لمحہ فروگزاشت نہ ہونے دیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حق وباطل ہر گروہ، اپنے مخصوص بزرگوں کے راجح ومرجوح، اور رطب ویابس ہر طرح کے موقف پر مضبوطی کے ساتھ قائم اور مُصِر ہے، اور تحقیق ونظرِ ثانی کے لیے تیار نہیں، اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے مختلف مسالک کے مابین روز بروز بُعد بڑھتا جارہا ہے، اور فرقہ واریت میں اضافہ ہورہا ہے۔

پھر جب بندہ کی طرف سے اس قسم کے متعصبین کے طرزِ عمل کی نشاندہی کی جاتی ہے، اور حقیقت سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، تو یہ طبقہ سخت ناراض اور برہم ہوجاتا ہے، اور اس پر چہ میگوئیاں کرتا ہے کہ اس بات کو شائع کیوں کیا گیا۔

حالانکہ بندہ نے کس بات کو شائع کرنا ہے، اور کس بات کو شائع کرنا نہیں ہے؟ اس کی ذمہ داری بندہ کے اوپر ہے، اعتراض کرنے والا ''نہ تین میں، نہ تیرہ میں'' وہ خود اپنے تئیں ''مان نہ مان، میں تیرا مہمان'' کا مصداق بن کر دوسرے کے کاموں میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرتا ہے۔

متعصبین کا یہ طبقہ چونکہ نہایت ہٹ دھرم ہے، اس لیے بندہ اس طبقہ کی کسی لاگ لپیٹ کے

بغیر واضح الفاظ میں قلعی کھولنا ضروری سمجھتا ہے، جس سے اس طبقہ کو سخت وحشت محسوس ہوتی ہے، اور وہ طبقہ اس کو اپنی شان میں بے ادبی تصور کرتا ہے، چنانچہ مذکورہ نوعیت کے ایک اور ہم نوا نے بھی مجھے خط لکھا کہ میں کسی فاضل دوست سے آپ کی تعریف سن کر متاثر ہو گیا تھا، جس کے بعد آپ کی کتب ورسائل کو خرید کر ملاحظہ کیا، لیکن آپ کی فلاں کتاب پڑھ کر آپ کی عقیدت ومحبت ختم ہوگئی، جس میں اسی مندرجہ بالا کتاب کا حوالہ دیا گیا تھا۔

حالانکہ ان صاحب کو میں نے خود اپنی عقیدت ومحبت کی دعوت نہ دی تھی، وہ خود بلا تحقیق محض کسی کے کہنے پر کیوں متاثر ہوئے، اس میں ان کا اپنا قصور تھا، اور مجھے ان کی عقیدت ومحبت ختم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑا، بے شک وہ بندہ کی تالیفات ملاحظہ نہ کریں، بلکہ دوسروں کو بھی ان سے روکیں، اہلِ حق کے متعلق یہ کوئی نیا طریقہ نہیں، یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔

بندہ کا اس کتاب سے مقصود کسی خاص شخص کی عقیدت ومحبت کا بٹورنا نہیں تھا، بلکہ الحمدللہ تعالیٰ، اللہ اور اس کے رسول کا صحیح پیغام پہنچا کر رضائے الٰہی مقصود تھا، اور بحمداللہ تعالیٰ اس کتاب میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بیان کردہ صحیح پیغام پہنچایا گیا، جس کی وضاحت خود اسی کتاب میں بھی کردی گئی تھی، اور ماہنامہ ''التبلیغ'' کے ذریعے سے بھی الحمدللہ تعالیٰ اسی مقصود کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو اس کے نام سے واضح ہے۔

اور ان شاء اللہ تعالیٰ سلف وخلف اہلِ حق کی اتباع کرتے ہوئے اس طرح کے متعصبین کے تعاقب کا دلائلِ قویہ کے ساتھ سلسلہ جاری رہے گا، اور ان کی گیدڑ بھبکیوں ان شاء اللہ تعالیٰ سے یہ سلسلہ نہ رکے گا۔

حیرت ہے کہ اس طبقہ کی طرف سے کسی موقف کے متعلق مؤثر دلائل تو پیش کیے جاتے نہیں، اوپر سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے، دوسرے پر اثر انداز ہونے کی بے سود کوشش کی جاتی ہے۔

10- صفر المظفر -1443ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 19 شمارہ 02، اکتوبر 2021ء - صفر المظفر 1443ھ)

www.idaraghufran.org

(196)

عمر رسیدہ بزرگوں کو مقتداء ومتبوع بنانے میں غلو

عام طور پر انسان کے بڑھاپے میں عمر کا ایک حصہ ایسا آتا ہے کہ وہ بہت سے کام کاج کرنے کے قابل نہیں رہتا، بلکہ وہ اپنے بہت سے کاموں میں بچہ کی طرح دوسروں کا محتاج بن کر رہ جاتا ہے، عمر کے اس حصہ میں مقتداء بننے، اور اس کی بات کے حجت ہونے کی صلاحیت کمزور پڑ جاتی ہے، قوتِ حافظہ کے ساتھ ساتھ قوتِ فیصلہ بھی ڈھیلی پڑ جاتی ہے، معاملہ فہمی کے ادراک میں بھی کمی واقع ہوجاتی ہے، اور وہ بہت سی عادات، حرکات وسکنات میں بچوں جیسا ہوجاتا ہے، جس طرح بچہ دوسروں کے بہکانے پھسلانے میں جلدی سے آجاتا ہے، اسی طرح بڑھاپے میں بھی انسان کا مزاج بن جاتا ہے، اسی وجہ سے بعض افراد بوڑھے لوگوں کے مصنوعی ہمدرد اور خیر خواہ بن کر ان سے اپنے مفادات حاصل کر لیتے ہیں، اور وہ بوڑھے اور معمّر شخص کو دوسروں سے بدگمان ومتنفر کرنے میں بھی کامیاب ہوجاتے ہیں۔

ان جیسی وجوہات کی بناء پر عمر کے مخصوص حصہ کے بعد سرکاری ملازمت سے انسان کو ریٹائرمنٹ دے دی جاتی ہے، اور اس سے وہ کام نہیں لیے جاتے، جو اس عمر سے پہلے لیے جاتے ہیں۔

اسی لئے اردو زبان میں مثل مشہور ہے کہ ’’بوڑھا، بچہ برابر‘‘ یا ’’بوڑھا، بالا برابر‘‘ جس کو انگریزی زبان میں ’’An OLD man is twice a child‘‘ کہا جاتا ہے۔

اور اسی بناء پر یہ کہاوت بھی مشہور ہے کہ ’’بوڑھاپا اور بچپنا ایک جیسا ہوتا ہے‘‘ گویا کہ انسان بڑھاپے میں دوبارہ بچہ بن جاتا ہے۔

محدثینِ عظام نے احادیث کی اسناد کے متعلق اس طرح کے بوڑھے اور عمر رسیدہ راویوں کی پوری چھان پھٹک کی ہے، اور راویوں کی ابتدائی عمر کے ساتھ ساتھ اُن کی آخری عمر کے

حالات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے، اور زندگی کے دونوں ادوار کی روایت کردہ احادیث کو الگ الگ درجے میں رکھا ہے، اور بڑھاپے کی عمر میں حافظہ خراب ہوجانے، اور راوی کے دوسرے کی طرف سے حدیث، یا اس کی سند میں کی گئی تلقین کو قبول کرنے کو احادیث کے باب میں عیب سمجھا ہے، جس کے نتیجے میں احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، جھوٹ کی آمیزش سے محفوظ رہیں، اور ان میں خطاء، غلطی اور سہو ونسیان کی نشاندہی ہونے کی بناء پر دینِ اسلام کی تعلیمات خطاء اور سہو وغیرہ سے بھی محفوظ رہیں۔

چنانچہ بعض محدثینِ عظام پر عمر رسیدہ ہونے پر یہ حالت طاری ہوئی، اور ان کی اس زمانے کی روایت کردہ احادیث کی اسناد پر کلام ہوا، حالانکہ ان کی اس حالت سے پہلے کی احادیث کو معتبر اور عمدہ سند پر مشتمل قرار دیا گیا۔

چنانچہ علامہ ذہبی نے ''ہشام بن عروہ'' کے بارے میں فرمایا کہ:

الحافظ قد يتغير حفظه إذا كبر، وتنقص حدة ذهنه، فليس هو فى شيخوخته كهو فى شبيبته (سير أعلام النبلاء، ج٦،ص٣٦،تحت ترجمة:هشام بن عروة بن الزبير بن العوام الأسدى)

ترجمہ: یہ حافظُ الحدیث ہیں، جب یہ عمر رسیدہ ہوگئے، تو ان کا حافظہ بدل گیا تھا، اور ان کی ذہنی قوت کمزور ہوگئی تھی، پس وہ اپنے بڑھاپے کی حالت میں ایسے نہیں رہے تھے، جیسے اپنی جوانی کی حالت میں تھے (سیر اعلام النبلاء)

اور علامہ ذہبی نے ''ہشام بن عمار بن نصیر'' کے بارے میں ''ابوحاتم'' کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

لما كبر هشام تغير، فكان كلما لقن تلقن، وهو صدوق (تاريخ الاسلام للذهبى، ج۵ص۱۲۷۶، تحت رقم الترجمة ۵۷۵)

ترجمہ: ہشام جب بوڑھے ہوگئے تھے، تو ان کا حافظہ بدل گیا تھا، پس جب ان کو تلقین کی جاتی تھی، تو وہ اس کو قبول کرلیتے تھے، اور یہ ''سچے'' ہیں (تاریخ الاسلام)

www.idaraghufran.org

اورعلامہ مزی نے ''ہشام بن عمار بن نصیر'' کے بارے میں ''ابوحاتم'' کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ:

هشام ابن عمار لما كبر تغير فكل ما دفع إليه قرأه، وكلما لقن تلقن، وكان قديما أصح، كان يقرأ من كتابه وسئل أبي عنه، فقال: صدوق(تهذيب الكمال للمزى، ج٣٠ص٢٤٨، تحت رقم الترجمة ٦٥٨٦)

ترجمہ: ہشام بن عمار جب بوڑھے ہوگئے تھے، توان کا حافظہ بدل گیا تھا، جو کچھ ان کو دیا جاتا تھا، وہ اسی کو پڑھ دیا کرتے تھے، اور جب بھی ان کو تلقین کی جاتی تھی، تو وہ اس کو قبول کر لیتے تھے، اور پہلے یہ بہت صحیح تھے، اپنی کتاب سے پڑھا کرتے تھے، اور میرے والد سے ان کے متعلق سوال کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سچے ہیں (تہذیب الکمال)

علامہ ذہبی ''حافظ عارم، یعنی محمد بن الفضل، سدوسی بصری'' کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

وقال أبو حاتم أيضا :اختلط عارم فى آخر عمره وزال عقله، فمن سمع منه قبل سنة عشرين ومائتين فسماعه جيد (تاريخ الإسلام وَوَفيات المشاهير وَالأعلام، ج٥،ص٦٨٥، تحت ترجمة "حمد بن الفضل، أبو النعمان السدوسى البصرى")

ترجمہ: اور ابوحاتم نے بھی یہ بات فرمائی کہ ''عارم'' کو آخری عمر میں اختلاط ہو گیا تھا، اور ان کی عقل زائل ہو گئی تھی، پس جس نے ان سے دوسو بیس ہجری سے پہلے سنا، تو اس کی سماعت عمدہ ہے (تاریخ الاسلام)

اور ابوالبرکات، زین الدین ابنِ کیال ''یزید بن ابی زیاد قرشی'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

وقال ابن حبان :كان صدوقا إلا أنه لما كبر ساء حفظه وتغير، فكان يتلقن ما لقن فوقع المناكير فى حديثه من تلقن غيره إياه

وإجابته فيما ليس من حديثه لسوء حفظه فسماع من سمع منه قبل دخوله الكوفة فى أول عمره سماع صحيح وسماع من سمع منه فى آخر قدومه الكوفة بعد تغير حفظه وتلقنه ما يلقن سماع ليس بشىء .وقال ابن حجر :ضعيف كبر فتغير صار يتلقن (الكواكب النيرات فى معرفة من الرواة الثقات،ص ۵۱۰، تحت ترجمة "زيد بن أبى زياد القرشى الهاشمى أبو عبد الله الكوفى")

ترجمہ: اورابنِ حبان نے فرمایا کہ یہ سچے ہیں،لیکن جب یہ عمر رسیدہ ہوگئے،تو ان کا حافظہ خراب ہوگیا،اور متغیر ہوگیا، پس ان کو جس بات کی تلقین کی جاتی تھی،تو وہ قبول کرلیا کرتے تھے،لہٰذاان کی حدیث میں دوسروں کی تلقین کرنے اوران کے ان چیزوں کوقبول کرنے کی وجہ سے مناکیر پیداہوگئیں، جواِن کی حدیث میں نہیں تھیں، کیونکہ ان کا حافظہ خراب ہوگیا تھا، پس جس نے ان سے کوفہ میں داخل ہونے سے پہلے عمر کے اول حصے میں سنا،اس کا سماع تو صحیح ہے،اور جس نے ان کے آخر میں کوفہ داخل ہونے کے بعد سنا، جب ان کا حافظہ متغیر ہوگیا تھا،اور یہ دوسرے کی تلقین کوقبول کرلیا کرتے تھے،تو وہ صحیح نہیں۔

اورابنِ حجر نے فرمایا کہ یہ ضعیف ہیں، بڑھاپے کی عمر میں متغیر ہوگئے تھے،اور یہ دوسرے کی بات کوقبول کرنے لگے تھے(الکواکبُ النیرات)

اورعلامہ ابنِ حجر''ابوبکربن عیاش'' کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

ثقة عابد إلا أنه لما كبر ساء حفظه وكتابه صحيح(تقريب التهذيب،ص ۶۲۴، تحت رقم الترجمة ۷۹۸۵،باب الكناء،حرف الباء الموحدة)

ترجمہ: یہ ثقہ، عابد ہیں،لیکن جب یہ بوڑھے ہوگئے تھے،تو ان کا حافظہ خراب ہوگیا تھا،اوران کی کتاب صحیح ہے(تقریبُ التھذیب)

www.idaraghufran.org

لیکن ایک عرصہ سے ہمارے یہاں دینی ماحول میں اس پہلو کو نظر انداز کرنے کا معمول ہوتا جارہا ہے، کوئی عالم اور اللہ والا جتنی زیادہ عمر کو پہنچ جاتا ہے، وہ اتنا بڑا ہی مقتداء اور قابلِ حجت سمجھا جانے لگتا ہے، اور اس کی ہر رطب ویابس اور خلطِ مبحث پر مشتمل بات کو بڑی اہمیت دی جانے لگتی ہے۔

ہم نے کئی دینی اداروں، تنظیموں وجماعتوں کے سربراہوں اور مقتداؤں کا عمر رسیدہ ہونے کی حالت میں مشاہدہ کیا، جو دوسروں کی تلقین کے سہارے پر چلتے رہے اور ان کو بعض لوگ بہکا پھسلا کر اپنے مفادات حاصل کرتے رہے، یہاں تک کہ بعض بزرگوں سے اپنے من پسند لوگوں کو خلافتیں بھی دلواتے رہے، جس کے نتیجے میں ان اداروں اور تنظیموں، یا جماعتوں کے کاموں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا، اور لوگ مختلف قسم کی چہ میگوئیوں میں مصروف رہے، مثلاً یہ کہ ان بزرگ پر فلاں شخص نے جادو وغیرہ کر کے مسخّر کرلیا، اور اپنا تابع بنالیا ہے۔

آج بھی بعض دینی اداروں کے سربراہوں کی طرف سے عمر رسیدہ ہوجانے کے بعد کچھ ایسے اقدامات سامنے آجاتے ہیں، جوان بزرگوں کے اپنی جوانی وشباب میں بیان واختیار کردہ افکار ونظریات سے مَیل نہیں کھاتے، بلکہ بعض حضرات تو ایسے بھی ہیں کہ ان کے زمانۂ شباب وصحت کی حالت میں تحریر کردہ کتب ومضامین میں عمر رسیدہ ہونے کے بعد کی خلطِ مبحث والی حالت کے برعکس افکار طبع شدہ شکل میں موجود ہیں۔

ایسی صورتِ حال میں سامعین ومخاطبین کو خبردار رہنا چاہیے، اور کسی بزرگ کے عمر رسیدہ ہو جانے کے بعد اس کی ہر بات کو حجت سمجھنے سے پہلے اچھی طرح غور وفکر کرلینا چاہیے، اور اس کو تلقین کرنے والے حاشیہ بردار لوگوں سے باخبر رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

28- صفر المظفر- 1443ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 19 شمارہ 03، نومبر 2021ء - ربیع الاول 1443ھ)

www.idaraghufran.org

(197)

سٹیجی اور فیس بُکی فتووں کی حیثیت

آج کل کے مروّجہ جلسے، جلوسوں میں ایسے مقررین کثرت سے موجود ہوتے ہیں، جو اپنے مخاطبین کو ابھارنے اور جوش دلانے اور ان کو خوش کرنے کے لیے اپنے مخالفین کے متعلق سخت زبان استعمال کرتے ہیں، یہاں تک کہ ذرا ذرا سی باتوں پر وہ کفروشرک اور ضلالت و گمراہی وغیرہ کے فتوے دوسروں پر لگا دیتے ہیں، اپنے مخاطبین کو خوش کرنے کے لیے وہ اور بھی کئی قسم کی خلافِ واقعہ اور افراط وتفریط پر مشتمل، غیر معتدل باتیں بیان کرتے ہیں، جس کی وجہ سے لوگوں کے عقائد میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے، اور ایک دوسرے کے برخلاف شدت اور بھڑک پیدا ہوجاتی ہے، گویا کہ اس قسم کے حضرات، مختلف لوگوں کو ایک جگہ جمع کرکے آگ سلگانے اور بھڑکانے کا کام کرتے ہیں۔

اور عام طور پر اسٹیج پر کی جانے والی تقریروں میں حوالہ جات بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، حاضرین ومخاطبین کے سامنے پروگرام منعقد ہونے، یا تقریر شروع ہونے سے پہلے ہی مختلف طریقوں سے تقریر کرنے والے سے اتنا عقیدت مند بنا دیا جاتا ہے کہ لوگوں کو مقرر کی بات کے غلط ہونے کا شائبہ تک بھی نہیں ہوتا، اس لیے اسٹیج پر ہر قسم کی رطب ویابس باتوں کا رگڑا چل جاتا ہے۔

اور آج کل اسٹیج کے متبادل فیس بک (Facebook) وغیرہ کا سلسلہ چل پڑا ہے۔

فیس بک کا سلسلہ بھی بڑا عجیب ہے، اس میں ایک تو ''فیس'' کا لفظ ہے، جس کے معنیٰ چہرہ کے آتے ہیں اور چہرہ سے خطاب حاضرین کو ہوتا ہے۔

اور دوسرا لفظ ''بک'' کا ہے، جس کے معنیٰ کتاب کے آتے ہیں، کتاب میں تحریر غائب کے لیے ہوتی ہے، اس میں دونوں ہی غیر جنس چیزیں جمع ہیں، اس لیے اس سے کئی قسم کے نقصانات اور

خرابیاں بھی لازم آ رہی ہیں، جو کہ ’’اثمهما اکبر من نفعهما ‘‘ کا مصداق ہیں۔
چنانچہ انسان کسی مخصوص ماحول، اور مخصوص مخاطبین سے کوئی گفتگو کرتا ہے، یا کوئی بات تحریر کرتا ہے، اور وہ سوشل میڈیا کے ذریعہ سے غیر متعلقہ لوگوں تک پہنچ جاتی ہے، جن کو اس پر چہ میگوئیوں کا موقع حاصل ہو جاتا ہے، اور سلسلہ آگے بڑھتا ہے، ایک دوسرے پر گمراہی، ضلالت، اور کفر وشرک کے تمام فتوے ہی ’’فیس بک‘‘ کے ذریعے ہر کس وناکس اپنی جگہ بیٹھ کر جاری کرتا ہے، گویا کہ ہر ایک نے اپنی جگہ ایک مستقل ’’دارالافتاء‘‘ قائم کر رکھا ہوتا ہے، جہاں سے ہر قسم کے فتوے جاری ہوتے ہیں، اور جنتی، جہنمی وغیرہ ہونے کے پروانے جاری اور فیصلے کیے جاتے ہیں، اور اپنے فالورز بڑھانے اور ان کو مطمئن کرنے کے لیے خلافِ واقعہ اور مبالغہ آمیزی پر مشتمل باتوں اور دعوؤں، یا الزاموں کا سہارا لیا جاتا ہے۔
اس تماشہ کے نتیجے میں اب سوشل میڈیا، ایک ایسا بے لگام اکھاڑا اور میدانِ جنگ بن کر رہ گیا ہے کہ جس کی کوئی حد وانتہاء نظر نہیں آتی۔
سوشل میڈیا سے پہلے اس طرح کا تماشا کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا، جس نے تمام حدوں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ آمین۔ 05- ربیع الاول- 1443ھ

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 19 شمارہ 03، نومبر 2021ء - ربیع الاول 1443ھ)

---

(198)

غیر اختیاری عمل پر اللہ کی طرف سے مؤاخذہ نہیں

آج کل سوشل میڈیا پر بیٹھ کر بہت سے لوگ، جو منہ میں آتا ہے، کہہ دیتے ہیں، اس بات کی گہرائی میں بھی جانے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ بعض لوگوں کا تو علم ہی ناقص وکمزور ہوتا ہے، لیکن چونکہ بہت سے عوام کالانعام، ان کو پیشوا اور رہبر سمجھنے لگتے ہیں، اس لیے ان کی مثال ’’اندھوں میں کانا راجا‘‘ والی بن جاتی ہے۔

چنانچہ آج کل اسی قسم کے بعض لوگوں نے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ایک عقیدت مند کا ایک واقعہ مشہور کر رکھا ہے کہ انہوں نے اپنے عقیدت مند سے اپنے نام کا کلمہ پڑھوایا تھا۔

ایسے لوگوں کو بڑے بڑے علماء کی شان میں اس طرح کی الزام و بہتان تراشی کرتے ہوئے، ذرا بھی آخرت کا خوف لاحق نہیں ہوتا۔

کسی عام انسان اور مسلمان کی طرف بھی اس طرح کی کفریہ بات کو منسوب کرنا سخت گناہ ہے، چہ جائیکہ کسی عالمِ دین اور اللہ والے کی طرف ایسی کفریہ بات منسوب کی جائے، جس کی زندگی اللہ اور اس کے رسول کی اتباع کرنے کرانے کی کوششوں میں گزری ہو، اس کی طرف ایسی کفریہ باتوں کی نسبت کیسے درست ہوسکتی ہے؟

اس واقعہ کی حقیقت کچھ یوں ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک عقیدت مند نے مولانا اشرف علی تھانوی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنے کے لئے لکھا تھا کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ''لاالٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ'' پڑھنا چاہتا ہے، لیکن زبان سے غیر اختیاری طور پر ''محمد رسول اللّٰہ'' کی جگہ اشرف علی کا نام نکل جاتا ہے، اور خواب ہی میں احساس ہوتا ہے کہ تجھ سے کلمہ پڑھنے میں غلطی ہوئی، دل میں ''لاالٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ'' پڑھنے کا ہی ارادہ ہوتا ہے، اور وہ اس دل کے ارادہ کے ساتھ خواب ہی میں کلمہ کو صحیح پڑھنا چاہتا ہے، لیکن زبان سے بے ساختہ اور غیر ارادی طور پر پھر اشرف علی نکل جاتا ہے، اور اس شخص نے یہ بھی لکھا کہ مجھ کو اس بات کا علم ہے کہ اس طرح کلمہ درست نہیں، لیکن بے اختیار زبان سے یہی کلمہ نکلتا ہے، پھر وہ گھبرا کر بیدار ہو جاتا ہے، لیکن بدن میں بدستور نیند والی بے حسی اور ناطاقتی کا اثر برقرار ہے، پھر وہ شخص اس احساس کو دل سے نکالنے، اور غلطی سے بچنے کی غرض سے بیٹھ جاتا ہے، اور پھر دُوسری کروٹ لے کر کلمہ کی غلطی کے تدارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہے، آنکھیں کھلی ہیں، خواب نہیں، لیکن بے اختیار، مجبور اور زبان پر اپنا قابو نہیں، پھر یہ الفاظ زبان سے بے اختیار نکلتے

www.idaraghufran.org

ہیں کہ ’’ اللّٰھم صل علیٰ سیدنا ونبینا ومولانا اشرف علی ‘‘ پھر یہ شخص اگلے دن بیداری میں اپنی اس غلطی پر خوب روتا ہے، رقت طاری ہوتی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے جواب میں اس عقیدت مند کو تسلی دی، اور خواب کی تعبیر میں لکھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جس بزرگ سے تعلق رکھتے ہو، وہ سنت کی اتباع کرنے والا ہے۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ نبوت کا سلسلہ تو ختم ہوگیا، اب نبی کے وارث آتے رہیں گے، اور متبعِ سنت شخص نبی کا وارث ہوتا ہے، لہٰذا تم کو گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

اب وہ عقیدت مند بھی اپنا عقیدہ صحیح بتلا رہا ہے، اور جواب میں بھی اس کو یہ نہیں کہا جارہا کہ کلمہ، یا درود شریف اسی طرح ہے جس طرح تم نے پڑھا تھا، بلکہ اس کی صحیح تعبیر بتلائی گئی ہے۔

اور خواب کی تعبیر جاگتی ہوئی حالت سے بالکل مختلف ہوسکتی ہے۔

رہا معاملہ اس شخص کی بیداری کا، تو وہ حالت بھی دراصل نیند ہی کی تھی، جس میں گھبراہٹ سے آنکھ کھل گئی تھی، لیکن درحقیقت وہ نیند ہی تھی، جس میں اسے اپنے اوپر اختیار نہیں تھا۔

نیند میں انسان کا اعصابی نظام جامد ہوجاتا ہے، اور حواس وحرکت اور بعض دماغی افعال ساکن ہوجاتے ہیں، اور جب نیند فطری اور معتدل حالت سے گہری ہوجائے، تو اس کو ’’کوما‘‘ (COMA) کہا جاتا ہے، اور عربی زبان میں اس کو ’’غیبوبت‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یونانی زبان میں اس کو ’’گہری نیند‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بہت سے لوگ نیند ہی میں چلنے پھرنے بھی لگتے ہیں، اور گھبرا کر آنکھ کھلنے پر اختیار نہیں ہوتا۔

علامہ ابن تیمیہ کے شاگرد، علامہ ابنِ قیم فرماتے ہیں:

أنک تری النائم یقوم فی نومه ویضرب ویبطش ویدافع کأنه یقظان وھو نائم لا شعور له بشیء من ذلک وذلک أن الحکم لما جری علی الروح استعانت بالبدن من خارجه ولو دخلت فیه لاستیقظ وأحس (الروح فی الکلام علی أرواح الأموات والأحیاء بالدلائل من الکتاب

www.idaraghufran.org

والسنة، ص ۶۴، المسألة السابعة وهى قول للسائل ما جوابنا للملاحدة والزنادقة المنكرين، فصل الأمر الثانى أن يفهم عن الرسول مراد من غير غلو ولا تقصير)

ترجمہ: آپ دیکھتے ہیں کہ سونے والا، اپنی نیند کی حالت میں کھڑا ہو جاتا ہے، اور پکڑ دھکڑ کرتا ہے، اور دفاع کی کوشش کرتا ہے، گویا کہ وہ جاگا ہوا ہو، حالانکہ وہ سویا ہوا ہوتا ہے، جس کو کسی چیز کا شعور نہیں ہوتا، جس کی وجہ یہی ہے کہ جب حکم روح پر جاری ہوتا ہے، تو روح، دراصل بدن کے ذریعہ خارج سے مدد حاصل کرتی ہے، اور اگر روح، بدن میں داخل ہو جائے، تو وہ بیدار ہو جاتا ہے، اور محسوس کرتا ہے (الروح)

اور اگر کفریہ بات زبان سے جاگتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر نکل جائے، اس سے بھی کفر لازم نہیں آیا کرتا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَلّٰهُ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ حِيْنَ يَتُوْبُ إِلَيْهِ، مِنْ أَحَدِكُمْ كَانَ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ بِأَرْضِ فَلَاةٍ، فَانْفَلَتَتْ مِنْهُ وَعَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ، فَأَيِسَ مِنْهَا، فَأَتٰى شَجَرَةً، فَاضْطَجَعَ فِيْ ظِلِّهَا، قَدْ أَيِسَ مِنْ رَاحِلَتِهٖ، فَبَيْنَا هُوَ كَذٰلِكَ إِذَا هُوَ بِهَا، قَائِمَةً عِنْدَهُ، فَأَخَذَ بِخِطَامِهَا، ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ: اَللّٰهُمَّ أَنْتَ عَبْدِيْ وَأَنَا رَبُّكَ، أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ (صحيح مسلم، رقم الحديث ۲۷۴۷ "۷" كتاب التوبة، باب فى الحض على التوبة والفرح بها)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ اللہ سے توبہ کرتا ہے، تو اللہ کو تمہارے اس آدمی سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے، جو بیابان زمین میں اپنی سواری پر ہو، اور وہ سواری اس سے گم ہو جائے، اور اس کا کھانا پینا بھی اسی سواری پر ہو، پھر وہ اس سواری سے ناامید ہو کر ایک درخت کے سایہ میں آ کر لیٹ جائے، اور وہ اسی حالت پر ہو کہ اچانک اس کی سواری اس کے پاس آ موجود ہو،

پھر وہ شخص اس سواری کی لگام پکڑ لے، اور پھر خوشی کی شدت کی وجہ سے یہ کہے کہ اے اللہ! تو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں، یعنی وہ خوشی کی شدت کی وجہ سے الفاظ اداء کرنے میں خطاء کر جائے (مسلم)

اپنے آپ کو رب اور اللہ کو اپنا بندہ کہنا، کفر ہے، لیکن چونکہ یہ الفاظ غیر ارادی طور پر زبان سے نکلے، اس لیے اس کو کفر قرار نہ دیا گیا، جس طرح نیند کی حالت میں اگر کفریہ الفاظ سرزد ہو جائیں، تو اس سے مسلمان کافر نہیں ہو جاتا۔ [1]

قاضی عیاض مذکورہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے صحیح مسلم کی شرح ''إکمالُ المعلم'' میں فرماتے ہیں:

فیہ أن ما قالہ الإنسان من مثل ھذا -من دھش، وذھول -غیر مؤاخذ بہ إن شاء اللہ، وکذلک حکایتہ عنہ علی طریق علمی وفائدۃ شرعیۃ، لا علی الھز والمحاکاۃ والعبث لحکایۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) إیاہ، ولو کان منکرا لما حکاہ (إکمال المعلم شرح صحیح مسلم، للقاضی عیاض، ج۸، ص ۲۴۵، کتاب التوبۃ فی الحض علی التوبۃ)

ترجمہ: اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان دہشت وگھبراہٹ اور ذہول کی وجہ سے، ان جیسے الفاظ کہہ دے، تو اس کا ان شاء اللہ مؤاخذہ نہیں ہوگا، اور اسی طریقہ سے اس طرح کی بات کو علمی غرض اور کسی شرعی فائدہ کی وجہ سے نقل کرنے پر بھی مؤاخذہ نہیں ہوگا، جب کہ اس کو مذاق اور صرف قصے کے طریقہ پر، اور فضول وبے کار میں نقل نہ کرے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو نقل فرمایا ہے، اور اگر اس واقعہ کو نقل کرنے میں برائی ہوتی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نقل نہ فرماتے (اکمال المعلم)

---

[1] فالنوم ینافی أصل العمل بالعقل لأن النوم مانع عن استعمال نور العقل فکانت أھلیۃ القصد معدومۃ بیقین فافھم (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، ج ۱، ص ۳۴، کتاب الإیمان)

www.idaraghufran.org

اورعلامہ ابنِ حجر صحیح بخاری کی شرح ''فتحُ الباری ''میں فرماتے ہیں:

قال عياض: فيه أن ما قاله الإنسان من مثل هذا فى حال دهشته وذهوله لا يؤاخذ به، وكذا حكايته عنه على طريق علمى وفائدة شرعية لا على الهزل والمحاكاة والعبث، ويدل على ذلك حكاية النبى صلى الله عليه وسلم ذلك ولو كان منكرا ما حكاه (فتح البارى شرح صحيح البخارى، ج ١١، ص ١٠٨، كتاب الدعوات، باب التوبة)

ترجمہ: قاضی عیاض نے فرمایا کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان دہشت وگھبراہٹ اورذہول کی وجہ سے، ان جیسے الفاظ کہہ دے، تو اس کا ان شاء اللہ مؤاخذہ نہیں ہوگا، اوراسی طریقہ سے اس طرح کی بات کوعلمی غرض اور کسی شرعی فائدہ کی وجہ سے نقل کرنے پر بھی مؤاخذہ نہیں ہوگا، جب کہ اس کومزاق اورصرف قصے کے طریقہ پر، اورفضول وبے کار میں نقل نہ کرے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کونقل فرمایا ہے، اوراگر اس قصہ کونقل کرنے میں برائی ہوتی، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کونقل نہ فرماتے (فتح الباری)

اورملاعلی قاری مشکاۃ کی شرح میں فرماتے ہیں:

ثم قال من شدة الفرح :اللهم أنت عبدى وأنا ربك، أخطا ،أى: بسبق اللسان عن نهج الصواب وهو :أنا عبدك وأنت ربى (من شدة الفرح) كرره لبيان عذره وسبب صدوره، فإن شدة الفرح والحزن ربما يقتل صاحبه ويدهش عقله، حتى منع صاحبه من إدراك البديهيات (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، ج۴، ص ١٦١٧، كتاب اسماء الله تعالىٰ، باب الاستغفار والتوبة)

ترجمہ: پھر وہ خوشی کی شدت کی وجہ سے یہ کہے کہ اے اللہ! تو میرا بندہ ہے، اور

میں تیرا رب ہوں، وہ خطاء کے طور پر یہ الفاظ کہہ دے، یعنی اس کی زبان درست الفاظ کہنے سے پھر جائے، یعنی یہ کہنا چاہیے تھا کہ ''میں تیرا بندہ ہوں، اور تو میرا رب ہے'' اور وہ یہ الفاظ خوشی کی شدت کی وجہ سے کہے، اس سے اس کے عذر کو، اور اُس سے غلط الفاظ صادر ہونے کے سبب کو بیان کرنا مقصود ہے، کیونکہ خوشی اور غم کی شدت سے بعض اوقات انسان ہلاک ہوجاتا ہے، یا اس کی عقل مدہوش ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ بدیہی چیزوں کو سمجھنے سے بھی قاصر ہوجاتا ہے (مرقاۃ)

اور علامہ مبارک پوری مشکاۃ کی شرح میں فرماتے ہیں:

وفی الحدیث من قواعد العلم إن اللفظ الذی یجری علی لسان العبد خطأ من فرح شدید أو غیظ شدید، ونحوه لا یؤاخذ به ولهذا لم یکن هذا کافرا بقوله أنت عبدی وأنا ربک (مرعاة المفاتیح شرح مشکاة المصابیح، ج۸، ص ٦، کتاب الدعوات، باب الاستغفار والتوبة)

ترجمہ: اور اس حدیث سے علمی یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ بندہ کی زبان سے جو لفظ خوشی کی شدت، یا شدید غصہ وغم وغیرہ کی وجہ سے غلط نکل جائیں، تو اس پر اس کا مؤاخذہ نہیں کیا جاتا، اور اسی وجہ سے وہ شخص کافر نہیں ہوا، جس نے یہ کہا کہ ''تو میرا بندہ ہے، اور میں تیرا رب ہوں'' (مرعاۃ)

افسوس کہ جن لوگوں کو نہ تو نیند اور خواب کی حقیقت اور اختیاری وغیر اختیاری حالت سے آگاہی ہوتی، اور نہ ہی بزرگوں کے علم اور عمل اور خدمات کی قدر ہوتی، اور وہ دین میں جمعہ جمعہ آٹھ دن کے نو وارد ہوتے ہیں، وہ عوام میں بدظنی و بے چینی پیدا کرنے، دوسروں کو بدنام کرنے اور نیچا دکھانے، اور اپنے آپ کو پاک وصاف ثابت کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ جن کی طرف کفریہ باتوں کی نسبت کررہے ہیں، اس کا وبال کتنا سخت ہے۔

ایسے لوگوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا چاہیے۔اللہ حفاظت فرمائے۔آمین۔

28-ربیع الاول-1443ھ

(ماہنامہ''التبلیغ'' جلد19 شمارہ04، دسمبر2021ء - ربیع الآخر1443ھ)

---

(199)

امام رازی اور سائنس وفلکیات کی اہمیت

پوری کائنات کے علم کو''علمُ الکائنات''(Cosmology) کہا جاتا ہے۔

اور موجودہ سائنسی دنیا میں فلکیات، یعنی سِتاروں کا قانون (Astronomy) قُدرتی علوم کی ایک ایسی شاخ ہے، جس میں اجرامِ فلکی (مثلاً، چاند، سیارے، ستارے، سحابیے، کہکشاں، وغیرہ) اور زمینی کرۂ ہوا کے باہر رُونما ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، جس میں آسمان پر نظر آنے والے اجسام کے آغاز، ارتقاء اور طبعی وکیمیائی خصوصیات کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔

آج کل فلکیات میں''نظامِ شمسی''(Solar System) کو بڑی اہمیت حاصل ہے''نظامِ شمسی'' دراصل سورج اور ان تمام اجرامِ فلکی کے مجموعے کو کہا جاتا ہے، جو براہ راست، یا بالواسطہ طور پر سورج کی ثقلی گرفت میں ہیں، سورج کو''نظامِ شمسی'' کا مرکزی ستارہ اور اس کا سب سے اہم حصہ شمار کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں فلکیات کے علم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت وپہچان کا اہم ذریعہ بتلایا گیا ہے۔

سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِىۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ يُغۡشِى الَّيۡلَ النَّهَارَ يَطۡلُبُهٗ حَثِيۡثًا ۙ وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ وَالنُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمۡرِهٖ ؕ اَلَا لَـهُ الۡخَـلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ

الْعٰلَمِيْنَ (سورة الاعراف، رقم الآية ۵۴)

ترجمہ: بے شک تمہارا رب اللہ ہے، جس نے پیدا کیا آسمانوں کو، اور زمین کو، چھ دنوں میں، پھر مستوی ہوا وہ عرش پر، ڈھانپ دیتا ہے وہ رات کو دن پر، دن، رات کے پیچھے آتا ہے دوڑتا ہوا، اور (تمہارے رب نے پیدا کیا) سورج اور چاند اور ستاروں کو، جو مسخر ہیں، اللہ کے حکم سے، خبردار! اُسی (اللہ) کے لیے ہے مخلوق، اور حکم، بابرکت ہے اللہ، جو تمام عالموں کا رب ہے (سورہ اعراف)

امام فخرُ الدین رازی (المتوفیٰ: 606 ہجری) نے سورہ اعراف کی مذکورہ آیت کے ذیل میں آج سے آٹھ سو سال پہلے، جو کچھ فرمایا تھا، اس کا اگر ہمیں پہلے سے ادراک ہوجاتا، تو موجودہ سائنس اور فلکیات، کفار کے ہاتھوں کا تختۂ مشق نہ ہوتے، اور اس سلسلہ میں مسلمان، کائنات اور فلکیات کے خالق ومالک کے دلائل وبراہین کو اس ذریعہ سے مبرہن کرچکے ہوتے۔

چنانچہ امام رازی نے مذکورہ آیت کے ضمن میں فرمایا کہ:

وربما جاء بعض الجهال والحمقى وقال إنك أكثرت فى تفسير كتاب الله من عليم الهيئة والنجوم، وذلك على خلاف المعتاد! فيقال لهذا المسكين :إنك لو تأملت فى كتاب الله حق التأمل لعرفت فساد ما ذكرته.

وتقريره من وجوه :الأول :أن الله تعالى ملأ كتابه من الاستدلال على العلم والقدرة والحكمة بأحوال السموات والأرض، وتعاقب الليل والنهار، وكيفية أحوال الضياء والظلام، وأحوال الشمس والقمر والنجوم، وذكر هذه الأمور فى أكثر السور وكررها وأعادها مرة بعد أخرى، فلو لم يكن البحث عنها،

www.idaraghufran.org

والتأمل فی أحوالها جائزا لما ملأ الله كتابه منها .

والثانی :أنه تعالى قال"أفلم ينظروا إلى السماء فوقهم كيف بنيناها وزيناها وما لها من فروج" فهو تعالى حث على التأمل فی أنه كيف بناها ولا معنى لعلم الهيئة إلا التأمل فی أنه كيف بناها وكيف خلق كل واحد منها .

والثالث :أنه تعالى قال"لخلق السماوات والأرض أكبر من خلق الناس ولكن أكثر الناس لا يعلمون " فبين أن عجائب الخلقة وبدائع الفطرة فی اجرام السموات أكثر وأعظم وأكمل مما فی أبدان الناس، ثم إنه تعالى رغب فی التأمل فی أبدان الناس بقوله" وفی أنفسكم أفلا تبصرون" فما كان أعلى شأنا وأعظم برهانا منها أولى بأن يجب التأمل فی أحوالها ومعرفة ما أودع الله فيها من العجائب والغرائب .

والرابع :أنه تعالى مدح المتفكرين فی خلق السموات والأرض فقال" ويتفكرون فی خلق السماوات والأرض ربنا ما خلقت هذا باطلا " ولو كان ذلک ممنوعا منه لما فعل .

والخامس:أن من صنف كتابا شريفا مشتملا على دقائق العلوم العقلية والنقلية بحيث لا يساويه كتاب فی تلک الدقائق، فالمعتقدون فی شرفه وفضيلته فريقان :منهم من يعتقد كونه كذلک على سبيل الجملة من غير أن يقف على ما فيه من الدقائق واللطائف على سبيل التفصيل والتعيين، ومنهم من وقف على

www.idaraghufran.org

تلک الدقائق على سبيل التفصيل والتعيين، واعتقاد الطائفة الأولى وإن بلغ إلى أقصى الدرجات فى القوة والكمال إلا أن اعتقاد الطائفة الثانية يكون أكمل وأقوى وأوفى .وأيضا فكل من كان وقوفه على دقائق ذلك الكتاب ولطائفه أكثر كان اعتقاده فى عظمة ذلك المصنف وجلالته أكمل.

إذا ثبت هذا فنقول :من الناس من اعتقد أن جملة هذا العالم محدث وكل محدث فله محدث، فحصل له بهذا الطريق إثبات الصانع تعالى وصار من زمرة المستدلين، ومنهم من ضم إلى تلك الدرجة البحث عن أحوال العالم العلوى والعالم السفلى على سبيل التفصيل فيظهر له فى كل نوع من أنواع هذا العالم حكمة بالغة وأسرار عجيبة، فيصير ذلك جاريا مجرى البراهين المتواترة والدلائل المتوالية على عقله، فلا يزال ينتقل كل لحظة ولمحة من برهان إلى برهان آخر، ومن دليل إلى دليل آخر، فلكثرة الدلائل وتواليها أثر عظيم فى تقوية اليقين وإزالة الشبهات .

فإذا كان الأمر كذلك ظهر أنه تعالى إنما أنزل هذا الكتاب لهذه الفوائد والأسرار لا لتكثير النحو الغريب والاشتقاقات الخالية عن الفوائد والحكايات الفاسدة، ونسأل الله العون والعصمة.

المسألة الرابعة :الأمر المذكور فى قوله :مسخرات بأمره قد فسرناه بما سبق ذكره، وأما المفسرون فلهم فيه وجوه :أحدها:

www.idaraghufran.org

المراد نفاذ إرادته لأن الغرض من هذه الآية تبيين عظمته وقدرته، وليس المراد من هذا الأمر الكلام، ونظيره فى قوله تعالى"فقال لها وللأرض ائتيا طوعا أو كرها قالتا أتينا طائعين"

وقوله"إنما قولنا لشيء إذا أردناه أن نقول له كن فيكون"ومنهم من حمل هذا الأمر على الأمر الثانى الذى هو الكلام، وقال :إنه تعالى أمر هذه الأجرام بالسير الدائم والحركة المستمرة.

المسألة الخامسة :أن الشمس والقمر من النجوم فذكرهما ثم عطف على ذكر هما ذكر النجوم والسبب فى إفرادهما بالذكر أنه تعالى جعلهما سببا لعمارة هذا العالم، والاستقصاء فى تقريره لا يليق بهذا الموضع، فالشمس سلطان النهار، والقمر سلطان الليل، والشمس تأثيرها فى التسخين والقمر تأثيره فى الترطيب، وتولد المواليد الثلاثة (أعنى المعادن والنبات والحيوان) لا يتم ولا يكمل إلا بتأثير الحرارة فى الرطوبة .ثم إنه تعالى خص كل كوكب بخاصة عجيبة وتدبير غريب لا يعرفه بتمامه إلا الله تعالى، وجعله معينا لهما فى تلك التأثيرات والمباحث المستقصاة فى علم الهيئة تدل على أن الشمس كالسلطان، والقمر كالنائب وسائر الكواكب كالخدم، فلهذا السبب بدأ الله سبحانه بذكر الشمس وثنى القمر ثم أتبعه بذكر سائر النجوم

(التفسير الكبير،لفخر الدين الرازى، ج۱۴، ص۲۷۴، ۲۷۵،سورة الاعراف)

ترجمہ: اور بعض جہلاء اور احمق لوگ آ کر یہ کہتے ہیں کہ آپ نے اللہ کی کتاب کی

www.idaraghufran.org

تفسیر میں علمِ ہیئت اور علمِ فلکیات کو بہت کثرت سے بیان کیا ہے، جو کہ دوسرے مفسرین کی عادت کے خلاف ہے؟

تو اس مسکین کو جواب میں کہا جائے گا کہ اگر تم اللہ کی کتاب (یعنی قرآن مجید) میں اس طرح غور کر لیتے، جس طرح غور کرنے کا حق ہے، تو آپ نے جو کچھ ذکر کیا، یقیناً اس کے غلط ہونے کو پہچان لیتے۔

اور اس کی تقریر چند طریقوں سے ہے۔

پہلی تقریر یہ ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو علم اور قدرت اور حکمت پر آسمانوں اور زمین کے احوال اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے تعاقب اور روشنی اور اندھیروں کے احوال کی کیفیت اور سورج اور چاند اور ستاروں کے احوال کے استدلال سے بھر دیا ہے، اور ان چیزوں کو اکثر ذکر فرمایا ہے، اور بار بار اور یکے بعد دیگرے ان کا ذکر فرمایا ہے، تو اگر ان کے متعلق بحث کرنا، اور ان کے احوال میں غور وفکر کرنا، جائز نہ ہوتا، تو اللہ اپنی کتاب کو ان چیزوں سے نہ بھرتا۔

اور دوسری تقریر یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے (سورہ قٓ میں) یہ فرمایا کہ ''کیا نہیں دیکھا ان لوگوں نے آسمان کی طرف، جو اُن کے اوپر ہے کہ کیسے بنایا ہم نے اس کو، اور کیسے مزین کیا ہم نے اس کو (ستاروں سے) اور نہیں ہے آسمان میں کوئی دراڑ'' پس اللہ تعالیٰ نے اس چیز پر ابھارا ہے کہ وہ آسمان کے بنانے کی کیفیت میں غور وفکر کریں، اور علمِ ہیئت (وعلمُ الفلک) کا مطلب صرف یہی ہے کہ آسمان کی بناء کی کیفیت اور ان میں سے ہر ایک کی پیدائش کی کیفیت میں غور وفکر کیا جائے۔

اور تیسری تقریر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ غافر میں) فرمایا کہ ''یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش زیادہ بڑی ہے، لوگوں کی پیدائش سے، اور لیکن اکثر لوگ

جانتے نہیں“ پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کے اجرام میں پیدائش کے عجائب، اور فطرت کے غرائب کے متعلق یہ واضح فرمادیا کہ یہ زیادہ اور عظیم اور زیادہ کامل ہیں، اُن عجائب اور غرائب سے، جو لوگوں کے ابدان میں پائے جاتے ہیں (یعنی علم الفلک کی اہمیت، اس جہت سے، اس میڈیکل سائنس کے مقابلہ میں زیادہ ہے، جس کا تعلق انسانوں وغیرہ کے جسم سے ہے) پھر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ابدان میں غور وفکر کی (سورہ ذاریات میں) ان الفاظ میں ترغیب دی ہے کہ ”اور اپنے آپ میں (غور کرو) کیا پس تم بصیرت حاصل نہیں کرتے“ تو جو چیز انسانوں کے ابدان سے زیادہ عالی شان ہو، اور زیادہ بڑی ہو، برہان اور دلیل کے اعتبار سے، وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ اس کے احوال میں غور وفکر واجب ہو، اور ان چیزوں کی معرفت واجب ہو، جو اللہ تعالیٰ نے ان میں عجائب اور غرائب، ودیعت فرمائے ہیں (تاکہ عالمِ اکبر کی پیدائش سے عالمِ اصغر کی پیدائش کے مقصود پر استدلال کرنا، آسان ہوجائے)

اور چوتھی تقریر یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں غور وفکر کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ آلِ عمران میں) فرمایا کہ ”اور غو وفکر کرتے ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور کہتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! نہیں پیدا کیا تو نے اس کو بے کار“ اور اگر یہ چیز ممنوع ہوتی، تو اللہ تعالیٰ اس میں غور وفکر کرنے والوں کی تعریف نہ فرماتا۔

اور پانچویں تقریر یہ ہے کہ جس نے ایسی کتاب تصنیف کی، جو علومِ عقلیہ اور نقلیہ کے دقائق پر مشتمل ہو، اس طور پر کہ کوئی کتاب ان دقائق میں اس کے مقابلہ کی نہ ہو، تو اس کتاب کے شرف اور فضیلت میں اعتقاد رکھنے والوں کے دو فریق ہیں۔

ایک فریق تو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کی شرافت اور فضیلت مکمل طریقہ پر ہے،

لیکن وہ اس میں موجود دقائق اور لطائف سے تفصیل اور تعیین کے ساتھ واقف نہیں ہوا۔

اور دوسرا فریق وہ ہے، جو ان دقائق پر تفصیل اور تعیین کے ساتھ واقف ہوجاتا ہے۔ اور پہلے فریق کا اعتقاد اگرچہ قوت اور کمال میں انتہائی درجہ کو پہنچا ہوا ہے، مگر دوسرے فریق کا اعتقاد زیادہ کامل اور زیادہ قوی اور زیادہ بھرپور ہوتا ہے، نیز ہر وہ شخص کہ جو اس کتاب کے دقائق اور اس کے لطائف پر زیادہ مطلع ہو، تو اس مصنف کی عظمت اور اس کی جلالتِ شان کے متعلق اس کا اعتقاد زیادہ ہوتا ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی، تو ہم کہتے ہیں کہ بعض لوگ وہ ہیں، جو اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ پورا عالم حادث ہے، اور ہر حادث چیز کو حادث کرنے (یعنی وجود عطاء کرنے اور فناء کرنے) والا ہوتا ہے، پس اس طریقہ سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اس کائنات کا بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے، اور یہ شخص (عقلی وسائنسی اعتبار سے) استدلال کرنے والوں کے زمرہ میں داخل ہوجاتا ہے، اور بعض لوگ وہ ہیں، جو اس درجہ کی طرف عالمِ علوی اور عالمِ سفلی کے احوال کو تفصیلی طریقہ پر شامل کرلیتے ہیں، جس کے نتیجہ میں ان کے لیے اس عالم کی انواع میں سے ہر نوع میں حکمتِ بالغہ اور اسرارِ عجیبہ ظاہر ہوجاتے ہیں، پھر یہ انتہائی مضبوط متواتر دلائل اور پے در پے عقلی دلائل کے قائم مقام ہوجاتا ہے، پھر ہر لحظہ اور ہر لمحہ ایک برہان اور دلیل سے، دوسرے برہان اور دلیل کی طرف انتقال ہوتا رہتا ہے، پس دلائل کی کثرت اور ان کے پے در پے ہونے کی وجہ سے (اللہ کی وجود و وجوب اور اس کی صفاتِ عالیہ سے متعلق) یقین کو تقویت حاصل ہوتی رہتی ہے، اور شبہات کا ازالہ ہوتا رہتا ہے۔

پس جب صورتِ حال یہ ہے، تو اس سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

www.idaraghufran.org

اس کتاب کو ان فوائد اور اسرار کے لیے نازل کیا ہے، نحو کے عجیب وغریب، اور صرف کے ان قواعد کے لیے نازل نہیں کیا، جو اِن فوائد سے خالی ہیں، اور فاسد حکایات کے لیے بھی نازل نہیں کیا، ہم اللہ سے مدد اور حفاظت کا سوال کرتے ہیں۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ''مسخرات بأمره ''میں جس حکم کا ذکر کیا گیا ہے، تو ہم پہلے اس کی تفسیر کر چکے ہیں، اور مفسرین کی اس کے متعلق چند وجوہات ہیں۔

پہلی یہ کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے ارادہ کا نفاذ ہے، کیونکہ اس آیت کی غرض اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قدرت کو بیان کرنا ہے، اور اس امر سے مراد، کلام کرنا نہیں ہے، جس کی نظیر (سورہ فصلت میں) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ''فقال لها وللأرض ائتيا طوعا أو كرها قالتا أتينا طائعين ''اور (سورہ نحل میں) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ''إنما قولنا لشيء إذا أردناه أن نقول له كن فيكون '' بھی اس کی نظیر ہے۔

اور بعض نے اس امر کو دوسرے حکم پر محمول کیا ہے، جس سے مراد کلام ہے، اور ان کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اجرام (یعنی ستاروں وسیاروں) کو یہ حکم فرمایا کہ وہ (تا حکمِ ثانی) ہمیشہ چلتے رہیں، اور برابر حرکت میں رہیں۔

پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ ستاروں میں سے سورج اور چاند کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے، پہلے ان دونوں کا ذکر کیا، پھر ان دونوں کے ذکر پر ستاروں کا عطف کر کے ذکر فرمایا، سورج اور چاند کو الگ سے ذکر کرنے کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو اس عالم کی عمارت وآبادی کا سبب بنایا ہے، جس کی تقریر کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، پس سورج، دن کا بادشاہ ہے، اور چاند، رات کا بادشاہ ہے، اور سورج کی تاثیر گرم کرنے اور پکانے کی ہے، اور چاند کی تاثیر تر کرنے کی

ہے، اور تینوں موالید (یعنی معادن، اور نبات اور حیوان) کی ولادت، رطوبت میں حرارت کی تاثیر سے ہی مکمل اور پوری ہوتی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ہر ستارے کی عجیب وغریب خاصیت اور تدبیر کو مختص کر دیا ہے، جس کو مکمل طریقہ پر اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کا ان تاثیرات میں اور علمِ ہیئت کی تفصیلی مباحث میں معین ومددگار بنا دیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ سورج بادشاہ کی طرح ہے، اور چاند اس کے نائب (اور وزیر) کی طرح ہے، اور تمام ستارے خادموں کی طرح ہیں، پس اس وجہ سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے پہلے سورج کا ذکر فرمایا، اور پھر چاند کا ذکر فرمایا، پھر اس کے بعد تمام ستاروں کا ذکر فرمایا (تفسیرِ کبیر)

امام فخرُالدین رازی کا یہ کلام اس زمانے سے متعلق ہے، جب سائنسی دنیا نے اتنی ترقی اور تحقیق نہیں کی تھی، جو موجودہ زمانے میں ہو چکی ہے، لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اس کائنات کے عجائبِ قدرت کی تحقیق اور اس میں غور وفکر سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اور ان کی جگہ غیر مسلم سائنس دانوں نے قبضہ جما لیا، اور اب موجودہ دور کے مسلمان، سائنس سے بہت دور ہو گئے، جبکہ سائنسی عجائب، اللہ کی قدرت اور اسلام کی حقانیت کا بہت بڑا ذریعہ بن کر اسلام کی نشر واشاعت کا بڑا سبب بن سکتے تھے۔

اور مسلمانوں کی عبادات، نماز، روزہ وغیرہ کے اوقات کو جانچنے، اور اس پر دنیا بھر کے مسلمانوں کے مجتمع ہونے کا ذریعہ بن سکتے تھے، جس پر آج مسلمانوں کا دنیا میں طرزِ عمل جگ ہنسائی سے کم نہیں، جو سائنس دانوں کو فطرت سے دور محسوس ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں ان کو شریعت کی طرف کشش نہیں ہو پاتی۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے ورثہ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

10-ربیعُ الآخر-1443ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 19 شمارہ 05، جنوری 2022ء - جمادی الاولیٰ 1443ھ)

---

(200)

حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے متعلق معتدل موقف

آج کل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خروج، اور ان کے موقف، اور ان کی شہادت کے متعلق مختلف آراء سامنے آتی ہیں، اور ان پر ایک دوسرے سے بحث ومباحثہ کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں اہلُ السنۃ والجماعۃ کا معتدل موقف اور افراط وتفریط والے موقف کا معلوم ہونا ضروری ہے، تاکہ افراط وتفریط سے بچ کر اہلُ السنۃ والجماعۃ کے اعتدال والے موقف کو اختیار کیا جاسکے۔

اس موضوع پر کئی محققین اہلُ السنۃ والجماعۃ نے کلام کیا ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ (المتوفیٰ:728ھ) اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

وكان ما كان، إلى أن ظهرت الحرورية المارقة، مع كثرة صلاتهم وصيامهم وقرائتهم، فقاتلوا أمير المؤمنين عليا ومن معه، فقتلهم بأمر الله ورسوله، طاعة لقول النبى صلى الله عليه وسلم لما وصفهم بقوله: يحقر أحدكم صلاته مع صلاتهم، وصيامه مع صيامهم، وقرائته مع قرائتهم، يقرئون القرآن لا يجاوز حناجرهم، يمرقون من الإسلام كما يمرق السهم من الرمية، أينما لقيتموهم فاقتلوهم فإن فى قتلهم أجرا عند الله لمن قتلهم يوم القيامة .

وقوله: تمرق مارقة على حين فرقة من المسلمين، يقتلهم أدنى الطائفتين إلى الحق أخرجاه فى الصحيحين.

فكانت هذه الحرورية هى المارقة، وكان بين المؤمنين فرقة، والقتال بين المؤمنين لا يخرجهم من الإيمان، كما قال تعالى :

”وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما فإن بغت إحداهما على الأخرى فقاتلوا التى تبغى حتى تفىء إلى أمر الله فإن فائت فأصلحوا بينهما بالعدل وأقسطوا إن الله يحب المقسطين. إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم“

فبين سبحانه وتعالى أنهم مع الاقتتال وبغى بعضهم على بعض مؤمنون إخوة، وأمر بإصلاح بينهم، فإن بغت إحداهما بعد ذلك قوتلت الباغية، ولم يأمر بالاقتتال ابتداء.

وأخبر النبى صلى الله عليه وسلم أن الطائفة المارقة يقتلها أدنى الطائفتين إلى الحق، فكان على بن أبى طالب ومن معه هم الذين قاتلوهم.

فدل كلام النبى صلى الله عليه وسلم على أنهم أدنى إلى الحق من معاوية ومن معه مع إيمان الطائفتين .ثم إن عبد الرحمن بن ملجم من هؤلاء المارقين، قتل أمير المؤمنين عليا فصار إلى كرامة الله ورضوانه شهيدا، وبايع الصحابة للحسن ابنه، فظهرت فضيلته التى أخبر بها رسول الله صلى الله عليه وسلم فى الحديث الصحيح حيث قال: إن ابنى هذا سيد وسيصلح الله به بين فئتين عظيمتين من المسلمين فنزل عن الولاية وأصلح الله به بين الطائفتين، وكان هذا مما مدحه به النبى صلى الله عليه وسلم وأثنى عليه، ودل ذلک على أن الإصلاح بينهما مما يحبه الله ورسوله ويحمده الله ورسوله.

ثم إنه مات وصار إلى كرامة الله ورضوانه، وقامت طوائف كاتبوا

Idara Ghufran

الحسين ووعدوه بالنصر والمعاونة إذا قام بالأمر، ولم يكونوا من أهل ذلک، بل لما أرسل إليهم ابن عمه أخلفوا وعده، ونقضوا عهده، وأعانوا عليه من وعدوه أن يدفعوه عنه، ويقاتلوه معه. وكان أهل الرأى والمحبة للحسين كابن عباس وابن عمر وغيرهما أشاروا عليه بأن لا يذهب إليهم، ولا يقبل منهم، ورأوا أن خروجه إليهم ليس بمصلحة، ولا يترتب عليه ما يسر، وكان الأمر كما قالوا، وكان أمر الله قدرا مقدورا.

فلما خرج الحسين رضى الله عنه ورأى أن الأمور قد تغيرت، طلب منهم أن يدعوه يرجع، أو يلحق ببعض الثغور، أو يلحق بابن عمه يزيد، فمنعوه هذا وهذا. حتى يستأسر، وقاتلوه فقاتلهم فقتلوه. وطائفة ممن معه، مظلوما شهيدا شهادة أكرمه الله بها وألحقه بأهل بيته الطيبين الطاهرين. وأهان بها من ظلمه واعتدى عليه، وأوجب ذلک شرا بين الناس (الفتاویٰ الکبریٰ لابنِ تیمیة، ج ا ص١٩٨ الیٰ ٢٠٠، کتاب السنة والبدعة،مسألة ما یفعله الناس فی یوم عاشوراء من الکحل والاغتسال)

ترجمہ: اور (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد) اسی طرح (اختلاف وانتشار کا) معاملہ جاری رہا، یہاں تک کہ ''حروریہ'' خوارج فرقہ کی جماعت ظاہر ہوگئی، باوجودیکہ وہ لوگ کثرت سے نماز اور روزوں اور قرائت کا اہتمام کیا کرتے تھے، ان لوگوں نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے ہمراہیوں کے ساتھ قتال کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو بجالاتے ہوئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی اطاعت

www.idaraghufran.org

کے مطابق قتل کیا، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کا یہ وصف بیان کیا کہ ’’تم میں سے کوئی ان کی نمازوں کے مقابلہ میں اپنی نمازوں کو اور ان کے روزوں کے مقابلہ میں اپنے روزوں کو، اور ان کی قرائت کے مقابلہ میں اپنی قرائت کو حقیر وکمتر سمجھے گا (کیونکہ وہ بظاہر بکثرت نماز پڑھیں گے، اور روزے رکھیں گے، اور قرائت کریں گے) وہ قرآن کو پڑھیں گے، لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، یہ لوگ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے، جیسے تیر شکار سے آر پار ہوکر نکل جاتا ہے، تم ان سے جہاں بھی ملاقات کرو، تو ان کو قتل کردو، کیونکہ ان کے قتل کرنے میں اللہ کے نزدیک، قیامت کے دن اس شخص کو اجر حاصل ہوگا، جو ان کو قتل کرے گا‘‘

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ ’’(خوارج کی) وہ جماعت نکلنے والی ہوگی، یعنی مسلمانوں میں تفریق کے وقت وہ جماعت ان سے الگ ہونے والی ہوگی، ان کو دو جماعتوں میں سے، حق کے زیادہ قریب والی جماعت قتل کرے گی‘‘ یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہے۔

پس یہ ’’حروریہ‘‘ کی خوارج والی جماعت تھی، اور مومنوں کے درمیان اس وقت افتراق پیدا ہوگیا تھا، اور مومنوں کے درمیان قتال کرنا، ان کو ایمان سے خارج کرنے والا نہیں تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا (سورہ حجرات میں) ارشاد ہے کہ ’’وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوْا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ فَإِنْ فَائَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوْا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ‘‘

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مذکورہ آیات میں یہ بات واضح فرمادی کہ ان کے ایک

دوسرے کے ساتھ قتال کرنے، اور ایک دوسرے کے خلاف بغاوت کرنے کے باوجود وہ سب مومن اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں، اور ان کے درمیان اصلاح کا حکم بھی فرمایا، پھر اگر اس کے بعد ان دونوں میں سے کوئی ایک جماعت دوسرے پر بغاوت کرے، تو باغی جماعت سے قتال کیا جائے گا، ابتدائی طور پر ان سے بھی قتال کا حکم نہیں فرمایا۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی خبر دی کہ اس الگ ہونے والی خوارج کی جماعت کو دو جماعتوں میں سے حق کے زیادہ قریب والی جماعت قتل کرے گی، اور حضرت علی بن ابی طالب کے ہمراہیوں نے اس ''حروریہ'' جماعت کے ساتھ قتال کیا۔

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمراہیوں کے مقابلہ میں حق کے زیادہ قریب ہے، باوجودیکہ دونوں جماعتیں ایمان رکھنے والی ہیں۔

پھر ''عبدالرحمٰن بن ملجم'' کا ان الگ ہونے والے لوگوں کی جماعت سے تعلق تھا، جس نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ، اللہ کے ہاں عزت وتکریم اور اللہ کی رضا کے ساتھ شہید ہوگئے، اور صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، جس کے نتیجہ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وہ فضیلت ظاہر ہوگئی، جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح حدیث میں خبر دی تھی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''میرا یہ بیٹا سردار ہے، اور عنقریب اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا'' حضرت حسن نے اس کے بعد امارت چھوڑ دی، اور اللہ نے دو

جماعتوں کے درمیان اس طرح صلح فرمادی، اوراس عمل کا تعلق ان فضائل سے تھا، جن کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدح وتعریف فرمائی تھی، اور یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ مذکورہ دونوں جماعتوں کے درمیان صلح کرانے کا عمل ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے، جس کو اللہ اوراس کا رسول پسند فرماتا ہے، اور اس پر اللہ اوراس کے رسول نے تعریف کی ہے۔

پھر جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی، اوروہ اللہ کی طرف سے شرافت وکرامت اوراللہ کی رضا کو حاصل کر چکے، تو مختلف جماعتیں کھڑی ہوگئیں، جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کولکھا، اوران کے ساتھ نصرت اور معاونت کا وعدہ کیا، جبکہ وہ حکومت کی باگ دوڑ سنبھالیں گے، لیکن وہ وعدہ کرنے والے لوگ اس بات کے اہل نہیں تھے، بلکہ جب ان کی طرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے چچازاد بھائی (حضرت مسلم بن عقیل) کو بھیجا، تو ان لوگوں نے وعدہ خلافی کا ارتکاب کیا، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کیے گئے عہد کو توڑ دیا، اور جن لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے اس چیز کا وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی طرف سے دفاع کریں گے، اوران کے ساتھ مل کر قتال کریں گے، انہوں نے اس کے برخلاف طرزِ عمل اختیار کیا، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے محبت کرنے، اور زیادہ بہتر رائے رکھنے والے حضرات، جیسا کہ ابنِ عباس وابنِ عمر وغیرہ رضی اللہ عنہم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ان کی طرف نہ جائیں، اوران کی بات کو تسلیم نہ کریں، ان کی رائے یہ تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ان لوگوں کی طرف جانا مصلحت کے مطابق نہیں، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ان لوگوں کی طرف جانے پر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوگا، جس کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ پسند کرتے ہیں، اور حقیقتِ حال بھی مذکورہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی

www.idaraghufran.org

رائے کے مطابق تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کا مقررہ فیصلہ پورا ہو کر رہا۔

پس جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نکلے، اور آپ نے (آگے پہنچ کر) دیکھا کہ معاملات بدل چکے ہیں، تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے اس بات کا مطالبہ کیا کہ وہ ان کو واپس جانے کے لیے چھوڑ دیں، یا بعض سرحدوں پر جانے دیں، یا اپنے چچازاد بھائی ''یزید'' سے ملاقات کریں، تو ان لوگوں نے اس کو قبول نہیں کیا، یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو ان کا قیدی نہ بنادیں، اور ان لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے قتال کیا، جس کے بدلہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی ان سے قتال کیا، اور ان لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کردیا، اور آپ کے ساتھ ایک جماعت کو بھی قتل کردیا، اور اس طرح حضرت حسین اور آپ کے رفقاء، مظلوم ہو کر شہید ہوئے، اور انہوں نے ایسی شہادت کو پایا، جس کو اللہ نے عزت وشرف بخشا، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو (اللہ تعالیٰ نے) اہلِ بیتِ طیبین طاہرین کے ساتھ ملحق فرمادیا، اور جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر ظلم وزیادتی کی تھی، اللہ نے اس کی اہانت وتذلیل فرمائی، اور یہ طرزِ عمل لوگوں کے درمیان شر پیدا کرنے کا ذریعہ بنا (الفتاویٰ الکبریٰ)

اور علامہ ابنِ تیمیہ اپنی تالیف ''منهاجُ السنة'' میں فرماتے ہیں:

وصار الناس فى قتل الحسين -رضى الله عنه -(ثلاثة أصناف) : طرفين ووسطا .

أحد الطرفين يقول :إنه قتل بحق ;فإنه أراد أن يشق عصا (المسلمين) ويفرق الجماعة.

وقد ثبت فى الصحيح عن النبى -صلى الله عليه وسلم -أنه قال: "من جاء كم وأمركم على رجل واحد يريد أن يفرق جماعتكم فاقتلوه

www.idaraghufran.org

قالوا :والحسين جاء وأمر المسلمين على رجل واحد، فأراد أن يفرق جماعتهم .وقال بعض هؤلاء :هو أول خارج خرج فی الإسلام على ولاة الأمر.

والطرف الآخر قالوا :بل (كان) هو الإمام الواجب طاعته، الذى لا ينفذ أمر من أمور الإيمان إلا به، ولا تصلى جماعة ولا جمعة إلا خلف من يوليه ، ولا يجاهد عدو إلا بإذنه، ونحو ذلك.

وأما الوسط فهم أهل السنة، الذين لا يقولون لا هذا ولا هذا، بل يقولون :قتل مظلوما شهيدا، ولم يكن متوليا لأمر الأمة. والحديث المذكور لا يتناوله، فإنه لما بلغه ما فعل بابن عمه مسلم بن عقيل ترك طلب الأمر، وطلب أن يذهب إلى يزيد ابن عمه ، أو إلى الثغر، أو إلى بلده، فلم يمكنوه، وطلبوا منه أن يستأسر لهم، وهذا لم يكن واجبا عليه (منهاج السنة النبوية فی نقض کلام الشيعة القدرية، ج۴، ص ۵۵۳، ۵۵۴، الفصل الثانی،فصل الناس فی قتل الحسين رضی الله عنه طرفان ووسط)

ترجمہ: اورحضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کے متعلق لوگوں کی تین جماعتیں ہوگئی ہیں، دو جماعتیں تو افراط وتفریط میں مبتلا ہیں، اورایک جماعت اعتدال پر قائم ہے۔

دو جماعتوں میں سے ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ ان (حضرت حسین رضی اللہ عنہ) کا قتل برحق تھا، کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے درمیان انتشاراور جماعت میں تفریق کا ارادہ کیا تھا، اور صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ ”جو شخص تمہارے پاس آئے، اورتم کسی ایک آدمی پر متفق ہو، اوروہ آنے والاتمہاری جماعت کے درمیان تفریق پیدا کرنا چاہے، توتم اس کوقتل کردو“۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ اس حالت میں آئے تھے کہ مسلمان ایک شخص (یعنی یزید) پر متفق تھے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کے درمیان تفریق پیدا کرنا چاہی، اور ان لوگوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ اسلام میں حکمرانوں پر سب سے پہلا خروج اختیار کرنے والے حضرت حسین ہیں۔

اور دوسری جماعت کا کہنا یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہی برحق امام تھے، جن کی اطاعت واجب تھی، ایمان کے معاملات میں سے کوئی امر، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حکم کے بغیر نافذ نہیں ہوسکتا تھا، اور نماز باجماعت اور جمعہ صرف اسی شخص کی اقتداء میں پڑھنا جائز تھا، جس کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ ذمہ داری سپرد کریں، اور کسی دشمن سے جہاد کرنا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حکم کے بغیر جائز نہیں تھا، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن معتدل جماعت اہلُ السنۃ کی ہے، جو نہ تو پہلی جماعت والا قول کرتے، اور نہ دوسری جماعت والا قول کرتے، بلکہ ان حضراتِ اہلُ السنۃ کا کہنا یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مظلوم اور شہید ہونے کی حالت میں قتل ہوئے، اور وہ امت کے حکمران مقرر نہیں ہوئے تھے، اور جو حدیث ذکر کی گئی، یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شامل نہیں ہے، کیونکہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو وہ خبر پہنچی، جس میں ان کے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کے ساتھ سلوک اختیار کیا گیا تھا، تو انہوں نے اس امر کی طلب کو ترک فرمادیا تھا، اور آپ نے اس چیز کا مطالبہ کیا تھا کہ وہ ان کے چچازاد بھائی ''یزید'' کے پاس جانے دیں، یا سرحد پر جانے دیں، یا ان کے شہر میں واپس جانے دیں، لیکن ان لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس پر قدرت نہیں دی، اور ان کے قید کرنے کو طلب کیا، جو کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ذمہ واجب نہیں تھا (اس لیے جواباً قتال کرنا پڑا) (منہاجُ السنۃ)

www.idaraghufran.org

اس سے معلوم ہوا کہ اہلُ السنۃ والجماعۃ کے نزدیک، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خروج، نہ تو بغاوت کے طور پر تھا، اور نہ ہی وہ باضابطہ امیر المومنین منتخب ہوئے تھے، اور وہ ظلماً قتل ہو کر شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔25-ربیع الآخر-1443ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد19 شمارہ06، فروری2022ء - جمادی الاخریٰ1443ھ)

---

(201)

یزید بن معاویہ کے متعلق افراط وتفریط اور اعتدال

علامہ ابنِ تیمیہ(المتوفیٰ:728ھ) اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

كان المقتصدون من أئمة السلف يقولون فى يزيد وأمثاله :إنا لا نسبهم ولا نحبهم أى لا نحب ما صدر منهم من ظلم .والشخص الواحد يجتمع فيه حسنات وسيئات وطاعات ومعاص وبر وفجور وشر فيثيبه الله على حسناته ويعاقبه على سيئاته إن شاء أو يغفر له ويحب ما فعله من الخير ويبغض ما فعله من الشر .فأما من كانت سيئاته صغائر فقد وافقت المعتزلة على أن الله يغفرها. وأما صاحب الكبيرة فسلف الأمة وأئمتها وسائر أهل السنة والجماعة لا يشهدون له بالنار بل يجوزون أن الله يغفر له كما قال تعالى :(إن الله لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء) فهذه فى حق من لم يشرك فإنه قيدها بالمشيئة وأما قوله تعالى (قل يا عبادى الذين أسرفوا على أنفسهم لا تقنطوا من رحمة الله إن الله يغفر الذنوب جميعا) فهذا فى حق من تاب ولذلك أطلق وعم (مجموع الفتاوى،لا بن تيمية ،ج۴،ص۴۷۵،الجزء الرابع، كتاب مفصل الاعتقاد،فصل:فى أن الطريق التى بها يعلم إيمان الواحد من الصحابة)

www.idaraghufran.org

ترجمہ: ائمۂ سلف میں سے معتدل حضرات کا ''یزید'' اوراس جیسے لوگوں کے بارے میں یہ قول ہے کہ بے شک ہم نہ تو اُن کو سب وشتم کرتے، اور نہ ان سے محبت رکھتے، محبت نہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اِن لوگوں سے، جو ظلم وغیرہ کا صدور ہوا، اُن افعال سے محبت نہیں رکھتے، اور ایک شخص میں اچھائیاں اور برائیاں اور نیکیاں اور گناہ اور بھلائیاں اور فسق وفجور اور شر کی باتیں جمع ہوسکتی ہیں، پس اللہ اُس شخص کو اس کی اچھائیوں پر ثواب عطاء فرماتا ہے، اور اس کی برائیوں پر اگر چاہے، تو سزا دیتا ہے، یا اُس کی مغفرت فرمادیتا ہے، اور جو اُس نے خیر کے کام کیے، اس کو اللہ پسند فرماتا ہے، اور جو شر کے کام کیے، اس کو ناپسند فرماتا ہے، پس جس شخص کی برائیاں صغیرہ درجہ کی ہوں، تو (اہلُ السنۃ والجماعۃ کے ساتھ) معتزلہ کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ اُن برائیوں کو معاف فرمادے گا، اور جہاں تک کبیرہ گناہوں کے مرتکب کا تعلق ہے، تو سلف امت اور ائمۂ امت اور تمام اہلُ السنۃ والجماعۃ اُس شخص کے لیے جہنم کی گواہی نہیں دیتے، بلکہ اس بات کو جائز قرار دیتے ہیں کہ اللہ اُس کی مغفرت فرمادے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''**إن اللہ لا یغفر أن یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء**'' (یعنی ''بے شک اللہ نہیں مغفرت فرمائے گا، اس بات کی اس کے ساتھ شرک کیا جائے، اور مغفرت فرمادے گا اس کے علاوہ کی، جس کے لیے چاہے'') پس یہ حکم اس شخص کے حق میں ہے، جو شرک نہ کرے، کیونکہ اللہ نے اس کی مغفرت کو اپنی مشیّت کے ساتھ مقید فرمایا ہے، اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا تعلق ہے کہ ''**قل یا عبادی الذین أسرفوا علی أنفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ. إن اللہ یغفر الذنوب جمیعا**'' (یعنی ''آپ فرمادیجیے کہ اے میرے وہ بندو! جنہوں نے زیادتی کی اپنی جانوں پر، تم مایوس نہ ہو، اللہ کی رحمت سے، بے

شک اللہ مغفرت فرمادے گا تمام گناہوں کی‘‘) تو یہ حکم اس شخص کے حق میں ہے، جوتوبہ کرلے، اوراسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام گناہوں کی مغفرت کومطلق اورعام بیان فرمایاہے (جس میں صغیرہ وکبیرہ گناہ کی قیدنہیں لگائی) (مجموع الفتاویٰ)

علامہ ابنِ تیمیہ اسی سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:

افترق الناس فی "یزید" بن معاویة بن أبی سفیان ثلاث فرق : طرفان ووسط.

فأحد الطرفين قالوا :إنه كان كافرا منافقا وأنه سعى فی قتل سبط رسول الله تشفيا من رسول الله صلى الله عليه وسلم وانتقاما منه وأخذا بثأر جده عتبة وأخی جده شيبة وخاله الوليد بن عتبة وغيرهم ممن قتلهم أصحاب النبی صلى الله عليه وسلم بيد علی بن أبی طالب وغيره يوم بدر وغيرها.......

وهذا القول سهل على الرافضة الذين يكفرون أبا بكر وعمر وعثمان؛ فتكفير يزيد أسهل بكثير.

والطرف الثانی يظنون أنه كان رجلا صالحا وإمام عدل وأنه كان من "الصحابة" الذين ولدوا على عهد النبی صلى الله عليه وسلم وحمله على يديه وبرک عليه وربما فضله بعضهم على أبی بكر وعمر .وربما جعله بعضهم نبيا ويقولون عن "الشيخ عدی" أو حسن المقتول -كذبا عليه -إن سبعين وليا صرفت وجوههم عن القبلة لتوقفهم فی يزيد .

وهذا قول غالية العدوية والأكراد ونحوهم من الضلال .فإن الشيخ عديا كان من بنی أمية وكان رجلا صالحا عابدا فاضلا ولم

يحفظ عنه أنه دعاهم إلا إلى السنة التى يقولها غيره كالشيخ "أبى الفرج "المقدسى فإن عقيدته موافقة لعقيدته؛ لكن زادوا فى السنة أشياء كذب وضلال من الأحاديث الموضوعة والتشبيه الباطل والغلو فى الشيخ عدى وفى يزيد والغلو فى ذم الرافضة بأنه لا تقبل لهم توبة وأشياء أخر .

وكلا القولين ظاهر البطلان عند من له أدنى عقل وعلم بالأمور وسير المتقدمين؛ ولهذا لا ينسب إلى أحد من أهل العلم المعروفين بالسنة ولا إلى ذى عقل من العقلاء الذين لهم رأى وخبرة.

والقول الثالث :أنه كان ملكا من ملوك المسلمين له حسنات وسيئات ولم يولد إلا فى خلافة عثمان ولم يكن كافرا؛ ولكن جرى بسببه ما جرى من مصرع "الحسين "وفعل ما فعل بأهل الحرة ولم يكن صاحبا ولا من أولياء الله الصالحين .

وهذا قول عامة أهل العقل والعلم والسنة والجماعة .

ثم افترقوا ثلاث فرق :فرقة لعنته وفرقة أحبته وفرقة لا تسبه ولا تحبه وهذا هو المنصوص عن الإمام أحمد وعليه المقتصدون من أصحابه وغيرهم من جميع المسلمين (مجموع الفتاوى،لا بن تيمية ،ج۴،ص ۴۸۱،الٰی ص ۴۸۳،الجزء الرابع،كتاب مفصل الاعتقاد، فصل :افترق الناس فى "يزيد "بن معاوية بن أبى سفيان)

ترجمہ: ''یزید بن معاویہ بن ابی سفیان'' کے متعلق لوگوں کے تین فرقے ہیں، دو فرقے افراط، یا تفریط میں مبتلا ہیں، اور ایک فرقہ اعتدال پر قائم ہے۔

پس دو فرقوں میں سے ایک فرقے کا قول تو یہ ہے کہ ’’یزید‘‘ کافر، منافق تھا، اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کے قتل کرنے کی کوشش، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھڑاس نکالنے کے لیے، اور اُن سے انتقام لینے کے لیے، اور اپنے دادا ’’عتبہ‘‘ اور اپنے دادا کے بھائی ’’شیبہ‘‘ اور اپنے ماموں ’’ولید بن عتبہ‘‘ وغیرہ کا بدلہ لینے لیے کی، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے علی بن ابی طالب وغیرہ کے ہاتھوں، بدر وغیرہ کے موقع پر قتل ہوئے تھے۔......

اور یہ قول رافضیوں کے اُن لوگوں کو کرنا آسان ہے، جو حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی تکفیر کرتے ہیں، تو یزید کی تکفیر اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ سہل ہے۔

اور دوسرے فرقے کا گمان یہ ہے کہ ’’یزید‘‘ نیک شخص اور عادل امام تھا، اور وہ ان صحابۂ کرام میں سے تھا، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے، اور اس کو (پیدائش کے بعد) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا، اور اس کے لیے برکت کی دعاء کی، اور ان میں سے بعض لوگ بسا اوقات یزید کو ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر بھی فضیلت دیتے ہیں، اور ان میں سے بعض تو کسی وقت یزید کو نبی کا درجہ بھی دے دیتے ہیں، اور وہ ’’شیخ عدی‘‘ یا ’’حسن مقتول‘‘ کے حوالہ سے اُن کی طرف جھوٹ کی نسبت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ستر (70) ولیوں کا چہرہ قبلہ سے اس بناء پر پھر گیا کہ انہوں نے یزید کے بارے میں توقف اختیار کیا تھا۔

اور یہ ’’عدویة‘‘ اور ’’أکراد‘‘ وغیرہ گمراہ فرقوں کے غالی لوگوں کا قول ہے، کیونکہ ’’شیخ عدی‘‘ بنوامیہ میں سے تھے، اور وہ نیک، صالح، عابد، فاضل شخص تھے، اور ان کے متعلق یہ بات معتبر طریقے سے ثابت نہیں کہ انہوں نے لوگوں کو دعوت دی ہو، مگر اسی سنت کی طرف، جس کی طرف اُن کے علاوہ حضرات نے دعوت دی، جیسا کہ ’’شیخ ابوالفرج مقدسی‘‘ پس اُن کا عقیدہ، ان کے موافق ہے،

لیکن لوگوں نے سنت میں جھوٹی باتوں کو اور گمراہ کن موضوع احادیث کو زیادہ کردیا، اور باطل تشبیہ اور شیخ عدی کے متعلق غلو کو، اور یزید کے متعلق بھی غلو کو داخل کردیا، اور رافضیوں کی مذمت میں بھی غلو کو داخل کردیا کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جاسکتی، اور بعض دوسری چیزوں کو بھی داخل کردیا۔

اور مذکورہ دونوں قولوں کا اُس شخص کے سامنے باطل ہونا، بالکل ظاہر ہے، جس کو ادنیٰ عقل اور معاملات کا ادنیٰ علم اور متقدمین کی سیرت سے واقفیت حاصل ہو، اور اسی وجہ سے یہ قول سنت کے ساتھ معروف اہلِ علم میں سے کسی کی طرف بھی منسوب نہیں، اور نہ ان عقلاء میں سے کسی صاحبِ عقل کی طرف منسوب ہے، جن کی رائے اور خبر کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ ''یزید'' مسلمانوں کے حکمرانوں میں سے ایک حکمران تھا، جس کی نیکیاں بھی تھیں، اور برائیاں بھی تھیں، اور اس کی ولادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ہی ہوئی، اور وہ کافر نہیں تھا، لیکن اس کے سبب سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف مہم جاری ہوئی، اور اس کے سبب اہلِ حرۃ کے ساتھ جو کچھ کیا گیا، وہ ہوا، اور وہ نہ تو صحابی تھا، اور نہ اللہ کے اولیائے صالحین میں سے تھا۔

اور یہی قول اکثر اہلِ عقل واہلِ علم اور اہلُ السنۃ والجماعۃ کا ہے۔

پھر اس کے بعد تین فرقے ہوگئے، ایک فرقہ یزید پر لعنت کرتا ہے، اور ایک فرقہ اس سے محبت رکھتا ہے، اور ایک فرقہ نہ اس پر سب وشتم کرتا، اور نہ اس سے محبت رکھتا، امام احمد سے بھی اسی بات کی تصریح منقول ہے، اور امام احمد اور دیگر تمام مسلمین کے اصحاب میں سے معتدل حضرات کا یہی طرزِ عمل ہے (مجموع الفتاویٰ)

03-جمادی الاولیٰ-1443ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 19 شمارہ 07، مارچ 2022ء - رجب المرجب 1443ھ)

www.idaraghufran.org

(202)

بنوامیہ اور اہلِ شام سے بغض

آج کل سوشل میڈیا پر بعض لوگ ''بنو امیہ'' اور اہلِ شام کے خلاف زبان درازی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور وہ اس سلسلہ میں کسی کی تخصیص کے بغیر مطلق بنوامیہ واہلِ شام سے اس لیے بغض رکھتے ہیں کہ بنوامیہ اور شام کے بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے۔

حالانکہ اس بنیاد پر تمام بنوامیہ اور اہلِ شام سے بغض رکھنا، دراصل روافض کا طرزِ عمل تھا، اسلام میں اس طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔

علامہ ابنِ تیمیہ (المتوفیٰ: 728ھ) ''منهاجُ السنة النبوية'' میں فرماتے ہیں کہ:

ومن تعصبهم وجهلهم أنهم يبغضون بنى أمية كلهم لكون بعضهم كان ممن يبغض عليا.

وقد كان فى بنى أمية قوم صالحون ماتوا قبل الفتنة، وكان بنو أمية أكثر القبائل عمالا للنبى صلى الله عليه وسلم -، فإنه لما فتح مكة استعمل عليها عتاب بن أسيد بن أبى العيص بن أمية ، واستعمل خالد بن سعيد بن العاص بن أمية، وأخويه أبان بن سعيد وسعيد بن سعيد على أعمال أخر، واستعمل أبا سفيان بن حرب بن أمية على نجران أو ابنه يزيد، ومات وهو عليها ، وصاهر (نبى الله -صلى الله عليه وسلم -) بناته الثلاثة لبنى أمية، فزوج أكبر بناته زينب بأبى العاص بن الربيع بن أمية بن عبد شمس ، وحمد صهره لما أراد على أن يتزوج ببنت أبى جهل، فذكر صهرا له من بنى (أمية) بن عبد شمس فأثنى عليه فى

مصاهرته، وقال " :حدثنى فصدقنى ، ووعدنى فوفى لى "وزوج ابـنـتيـه لـعثـمـان بن عفان، واحدة بعد واحدة، وقال " :لـو كانت عندنا ثالثة لزوجناها عثمان "

وكـذلك من جهلهم وتعصبهم أنهم يبغضون أهل الشام؛ لكونهم كان فيهم أولا من يبغض عليا.

ومـعـلوم أن مكة كان فيها كفار ومؤمنون، وكذلك المدينة كان فيهـا مؤمنون ومنافقون ، والشـام فى هذه الأعصار لم يبق فيه من يتظاهر ببغض على، ولكن لفرط جهلهم يسحبون ذيل البغض .

وكـذلك مـن جهـلهـم أنهـم يـذمون من ينتفع بشىء من آثار بنى أمية، كـالشـرب مـن نهر يـزيـد، ويـزيـد لـم يـحـفـره (ولـكـن وسعه)وكالصلاة فى جامع بناه بنو أمية .

ومـن المعلوم أن النبى -صـلـى الله عليه وسلم -كـان يصلى إلى الـكـعبة التـى بـنـاهـا المشركون، وكان يسكن فى المساكن التى بـنوها، وكان يشرب من (ماء) الآبـار التى حفروها، ويلبس (من) الثيـاب التـى نسـجوها، ويعامل بالدراهم التى ضربوها .فإذا كان يـنـتـفـع بمساكنهم وملابسهم، والمياه التى أنبطوها ، والمساجد التى بنوها، فكيف بأهل القبلة؟ . !

فـلـو فـرض أن يـزيـد كان كافرا وحفر نهرا، لم يكره الشرب منه بإجماع المسلمين، ولكن لفرط تعصبهم كرهوا ما يضاف إلى من يـبـغـضـونـه (مـنـهـاج السـنـة الـنـبـويـة فـى نقض كلام الشيعة القدرية،ج۴،ص ۱۴۴،الٰی ص۱۴۷، الـفـصـل الـثـانـى،كـلام الرافضى على وجوب اتباع مذهب الإمامية لأنهم لم يذهبوا إلى التعصب فى غير الحق بخلاف غيرهم)

ترجمہ: اور ان (روافض) کے تعصب اور جہالت میں سے یہ چیز بھی ہے کہ وہ تمام بنوامیہ سے بغض رکھتے ہیں، کیونکہ بنوامیہ میں سے بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے۔

حالانکہ بنوامیہ میں نیک صالح لوگ بھی تھے، جو فتنہ سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے، اور بنوامیہ کے اکثر قبائل، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عاملین (وگورنرز) تھے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ کو فتح کیا، تو اس پر ''عتاب بن اسید بن ابی العیص بن امیۃ'' کو عامل (وگورنر) مقرر کیا، اور ''خالد بن سعید بن العاص بن امیۃ'' اور ان کے دو بھائیوں ''ابان بن سعید'' اور ''سعید بن سعید'' کو دوسرے علاقوں میں عامل مقرر کیا، اور ''ابوسفیان بن حرب بن امیۃ'' یا ان کے بیٹے ''یزید'' کو مقامِ ''نجران'' پر عامل مقرر کیا، اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، تو وہ اسی علاقے پر عامل تھے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تین بیٹیوں کا نکاح بنوامیہ سے کیا، چنانچہ اپنی سب سے بڑی بیٹی ''زینب رضی اللہ عنہا'' کا نکاح ''ابوالعاص بن ربیع بن امیۃ بن عبدِ شمس'' سے کیا، اور ان کے سسرالی رشتہ کی تعریف فرمائی، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا، تو بنوامیہ بن عبدِ شمس سے سسرالی رشتہ کا ذکر کیا، اور اس رشتہ کی تعریف فرمائی، اور فرمایا کہ اس نے مجھ سے جو بات کی، تو سچی بات کی، اور مجھ سے جو وعدہ کیا، تو اس کو پورا کیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو بیٹیوں کا نکاح، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے یکے بعد دیگرے کیا، اور فرمایا کہ اگر میری تیسری بیٹی ہوتی، تو میں اس کا نکاح بھی عثمان سے کر دیتا۔

اور اسی طریقے سے اہلِ روافض کے جہل اور تعصب میں سے یہ چیز بھی ہے کہ وہ اہلِ شام سے بغض رکھتے ہیں، کیونکہ اہلِ شام میں پہلے ایسے لوگ تھے، جو حضرت

علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے۔

حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ مکہ مکرمہ میں کافر، اور مومن سب ہی تھے، اور اسی طرح سے مدینہ منورہ میں مومن اور منافق دونوں قسم کے لوگ تھے، اور بعد کے زمانوں میں ''شام'' کے اندر کوئی بھی ایسا شخص باقی نہیں رہا تھا، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کا اظہار کرتا ہو، لیکن روافض اپنی شدتِ جہالت کی وجہ سے بغض کے دامن کو گھسیٹتے ہیں۔

اور اسی طرح ان روافض کی جہالت میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ اس شخص کو مذموم اور برا سمجھتے ہیں، جو بنو امیہ کے آثار و باقیات میں سے کسی چیز کے ذریعے انتفاع کرتا ہے، جیسا کہ ''یزید'' کی نہر سے پانی پینا، حالانکہ یزید نے اس نہر کو نہیں کھدوایا تھا، بلکہ اس نے تو اس نہر کی صرف توسیع کی تھی، اور جیسا کہ روافض، بنو امیہ کی تعمیر کردہ جامع مسجد میں نماز پڑھنے کو مذموم اور برا سمجھتے ہیں۔

اور یہ بات معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کعبہ کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے، جس کی تعمیر مشرکین نے کی تھی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن مکانوں میں سکونت اختیار کیا کرتے تھے، جن کو مشرکین نے تعمیر کیا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن چشموں اور تالابوں کا پانی پیا کرتے تھے، جن کو مشرکین نے کھودا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کپڑوں کو پہنا کرتے تھے، جن کو مشرکین نے بُنا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان دراہم (اور سکّوں) کے ساتھ معاملات کیا کرتے تھے، جن کو مشرکین نے تیار کیا تھا، پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے مکانوں اور لباسوں اور اُن کے تیار شدہ چشموں و تالابوں، اور ان کی تعمیر کردہ مسجدوں سے انتفاع حاصل کیا کرتے تھے، تو اہلِ قبلہ (اور مسلمانوں) کی اشیاء سے کیونکر انتفاع جائز نہ ہوگا؟

www.idaraghufran.org

پس اگر یہ بات فرض کرلی جائے کہ یزید کافر تھا، تو بھی اس نہر سے پینا، مسلمانوں کے اجماع کی رُو سے مکروہ نہیں ہوگا، لیکن روافض کے شدتِ تعصب کی وجہ سے، وہ لوگ اُن چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں، جن کی نسبت اُن لوگوں کی طرف ہو، جن سے یہ بغض رکھتے ہیں (جیسا کہ حضرت معاویہ، یزید اور اہلِ شام وبنوامیہ) (منہاج السنۃ)

علامہ ابنِ تیمیہ مذکورہ تالیف میں ہی ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

والخلفاء الثلاثة فتحوا الأمصار، وأظهروا الدين فى مشارق الأرض ومغاربها، ولم يكن معهم رافضى.

بل بنو أمية بعدهم، مع انحراف كثير منهم عن على وسب بعضهم له، غلبوا على مدائن الإسلام كلها، من مشرق الأرض إلى مغربها، وكان الإسلام فى زمنهم أعز منه فيما بعد ذلک بكثير، ولم ينتظم بعد انقراض دولتهم العامة لما جاء تهم الدولة العباسية، صار إلى الغرب عبد الرحمن بن هشام الداخل إلى المغرب، الذى يسمى صقر قريش، واستولى هو -ومن بعده -على بلاد الغرب، وأظهروا الإسلام فيها وأقاموه وقمعوا من يليهم من الكفار، وكانت لهم من السياسة فى الدين والدنيا ما هو معروف عند الناس (منهاج السنة النبوية فى نقض كلام الشيعة القدرية، ج٦، ص ٤١٩، ٤٢٠، الفصل الثالث، المنهج الاول، الرد على المقدمة الأولى وهى قوله لا بد من إمام معصوم)

ترجمہ: اور خلفائے ثلاثہ نے مختلف شہروں کو فتح کیا، اور دین کو زمین کے مشرق اور مغرب تک غالب کردیا، لیکن ان کے ساتھ کوئی رافضی نہیں تھا۔

بلکہ خلفائے ثلاثہ کے بعد بنوامیہ نے ''باوجویکہ اُن میں سے بہت سے لوگوں نے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے انحراف کرلیا تھا، اور بعض تو حضرت علی رضی اللہ

www.idaraghufran.org

عنہ کو سب وشتم بھی کرتے تھے'' بنوامیہ نے تمام اسلام کے شہروں پر، زمین کے مشرق سے مغرب تک، غلبہ حاصل کرلیا تھا، اوران کے زمانہ میں اسلام مابعد کے زمانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ عزت وشرافت والا شمار ہوتا تھا، اور بنوامیہ کی عام حکومت ختم ہونے کے بعد وہ نظم وضبط قائم نہیں رہ سکا، جب ''دولتِ عباسیہ'' کا زمانہ آیا، تو ''عبدالرحمٰن بن ہشام الداخل'' مغرب کے علاقہ کی طرف چلے گئے، اس مغرب کو 'صقرِ قریش' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، اور وہ اوران کے بعد کے حضرات ''مغرب'' کے شہروں پر غالب رہے، اوران میں اسلام کو غالب اور قائم کیا، اور اپنے قریب کے کفار کا قلع قمع کیا، اور بنوامیہ کی دین اور دنیا میں سیاست، لوگوں کے نزدیک معروف ومشہور تھی (منہاج السنۃ)

18-جمادی الاولیٰ-1443ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد19 شمارہ08، اپریل2022ء - شعبان المعظم1443ھ)

---

(203)

علامہ ابنِ تیمیہ کے متعلق بدگمانی وغلط فہمی کا ازالہ

بعض اہلِ علم کے یہاں صفاتِ الٰہی کے بارے میں، علامہ ابنِ تیمیہ کے موقف سے متعلق مختلف غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اس سلسلہ میں بعض اہلِ علم حضرات نے مستقل مضامین ورسائل بھی تحریر کردیئے ہیں۔

چنانچہ سعید عبداللطیف فودۃ نام کے ایک صاحبِ علم نے'' **الكاشف الصغير عن عقائد ابـنِ تيمية** '' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے، جس میں انہوں نے صفاتِ باری تعالیٰ سے متعلق علامہ ابنِ تیمیہ کے افکار پر شدید تنقید کی ہے۔

ہمارے یہاں کے بعض اہلِ علم اس کتاب سے متاثر ہوکر علامہ ابنِ تیمیہ سے بدگمانی، اوران

کی شان میں بدزبانی کرتے ہیں۔

حالانکہ علامہ ابنِ تیمیہ کی اصل اور مکمل عبارات کو بنظرِ انصاف وتحقیق ملاحظہ ومطالعہ کرنے سے ان تنقیدات واعتراضات کی تصدیق نہیں ہوتی، جن کو مذکورہ تالیف میں ذکر کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان تنقیدات واعتراضات، اور مذکورہ تالیف کا متعدد اہلِ علم نے مدلل جواب تحریر کیا ہے۔

چنانچہ مذکورہ تالیف کا ایک مفصل ومدلل جواب رمضان بن عبدالکریم مصری (المدرس بجمعية تحفيظ القرآن الكريم ببيشة، السعودية) نے ”فتح العلى الكبير فى الرد على صاحب الكاشف الصغير“ کے نام سے ایک مستقل تالیف کی شکل میں تحریر کیا ہے۔

اس تالیف میں رمضان بن عبدالکریم مصری فرماتے ہیں کہ:

والقارئ لكتابه هذا يقف على التالى:

(۱)...... تبديع ابن تيمية وتكفيره تلميحاً وتصريحاً.

(۲)...... تحريف معانى كلام شيخ الإسلام لتناسب قواعد ولوازم وضعها فودة من عنده، ومن ثم ينزل كلام شيخ الإسلام عليها كما يقول ص ۴۹، ۵۰ ”وكلام ابن تيمية إذا قال: (إن الله يُرى) يعنى أنه يُرى كما يُرى أى جسم آخر فيجب أن يكون مقابلاً ومحدوداً، ويجب اتصال شعاع العين، وغير ذلك من شرائط الرؤية العادية“

(۳)......عدم نقل الرد الكامل لشيخ الإسلام على المخالفين، فإذا كان رده على الرازى ــ مثلا ــ من ثمانية عشر وجهاً فى مسألة يكتفى بذكر وجه أو اثنين وهذا يدل على عدم الأمانة العلمية فإن الوجوه يكمل بعضها بعضاً.

(۴)...... ينتزع بعض عبارات شيخ الإسلام غير مكتملة ، ويعزلها

عن سياقها الذى يوضحها، ثم يقوم بالتعليق والطعن القبيح.

أما عملى فى هذا الكتاب فهو كالتالى:

١/: نعرض الشبه والمزاعم والدعاوى تحت كل مبحث عرضاً مجملاً باختصار، حيث ننقل بعض العبارات التى ذهب فيها إلى أن ابن تيمية يقول بهذا القول، أو يعتقد هذا الاعتقاد.

٢/: ننقل بعض العبارات التى نقلها هو من كلام شيخ الإسلام، ثم ننقل تعليقاته عليها.

٣/: نلخص كلامه فى نقاط قبل الرد عليه.

٤/: ننقل عبارات الشيخ التى علق عليها كاملة، وبيان سبب ذكر الشيخ لهذه الفقرة، أو تلك الجملة.

٥/: ثم ننقل مذهب واعتقاد الشيخ من كتبه فى تلك الصفة التى حاول هذا الدعى إثارة الغبار عليها بكل قواه، بل بكل مهاتراته وضعفه، ونعززه بكلام أهل العلم قديماً وحديثاً، وربما يكون بكلام الإمام الأشعرى نفسه، والباقلانى ، والإمام البيهقى رحم الله الجميع، وتجاوز عنا وعنهم (فتح العلى الكبير فى الرد على صاحب الكاشف الصغير، ص٣٠، ٣١، مقدمة المؤلف، الناشر: دار العاصمة ، الرياض، السعودية، الطبعةُ الاولیٰ: ١٤٣٣ھ ، ٢٠١٢م)

ترجمہ: اور اُن (سعيد فودة) کی اس کتاب کو پڑھنے والا شخص درجِ ذیل امور پر واقف ہوتا ہے:

(۱)......ابنِ تیمیہ کو بدعتی قرار دینا، اور اُن کی تکفیر کرنا، اشارتاً اور صراحتاً۔

(۲)......شیخ الاسلام (ابنِ تیمیہ) کے کلام کے معانی کی تحریف، اُن قواعد اور

لوازم کی مناسبت سے جن کو ''سعید فودۃ'' نے اپنی طرف سے وضع کیا ہے، اور اس کے نتیجہ میں شیخ الاسلام (ابنِ تیمیہ) کا کلام ان قواعد اور لوازم ہی کے خلاف نازل ہوجاتا ہے، جیسا کہ ''سعید فودۃ'' ص ۴۹ اور ۵۰ پر لکھتے ہیں کہ ''ابنِ تیمیہ کا کلام، جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''ان اللّٰــہ یُـری '' تو اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ کی رؤیت، اس طرح ہوگی، جس طرح دوسرے جسم کی رؤیت ہوتی ہے، اس لیے ضروری ہوگا کہ وہ مقابل اور محدود ہو، اور آنکھوں کی شعاع کا اتصال بھی واجب ہوگا، اور دوسری وہ شرائط بھی واجب ہوں گی، جو رؤیتِ عادیہ کے لیے ہوا کرتی ہیں۔

(۳)......شیخ الاسلام (ابنِ تیمیہ) کا کامل رَد، مخالفین پر نقل نہ کرنا، پس جب مثلاً شیخ الاسلام (ابنِ تیمیہ) رازی پر کسی مسئلے میں اٹھارہ جہات سے رَد کرتے ہیں، تو ''سعید فودۃ'' ایک، یا دو وجہ کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں، اور یہ طرزِ عمل، علمی امانت کے خلاف ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ بعض وجوہ، بعض کی تکمیل کیا کرتی ہیں۔

(۴)......شیخ الاسلام (ابنِ تیمیہ) کی بعض عبارات کو (سعید فودۃ) نامکمل طور پر کانٹ چھانٹ کر پیش کرتے ہیں، اور ان کو اس سیاق سے الگ کردیتے ہیں، جو ان عبارات کی توضیح کرنے والا ہوتا ہے، پھر قبیح طعن کو اس پر مرتب کردیتے ہیں۔

جہاں تک میرے اس کتاب کے طرزِ عمل کا تعلق ہے، تو وہ درجِ ذیل ہے:

۱/: ہم شبہ اور گمانوں اور دعاوی کو ہر بحث کے تحت اختصار کے ساتھ اجمالی طور پر پیش کرتے ہیں، اس طور پر کہ سعید فودۃ کی بعض عبارات کو نقل کرتے ہیں، جن میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ابنِ تیمیہ اس قول کے قائل ہیں، یا یہ اعتقاد رکھتے ہیں۔

۲/: ہم بعض عبارات کو نقل کرتے ہیں، جن کو سعید فودۃ نے شیخ الاسلام (ابنِ تیمیہ) کے کلام کے طور پر نقل کیا ہے، پھر ہم اُن عبارات پر ان (سعید فودۃ) کی

تعلیقات کو نقل کرتے ہیں۔

۳/: سعید فودۃ پر رَد کرنے سے پہلے، ہم ان کے کلام کے چند نقاط میں تلخیص کرتے ہیں۔

۴/: شیخ الاسلام (ابنِ تیمیہ) کی اُن عبارات کو ہم مکمل طور پر نقل کرتے ہیں، جن پر سعید فودۃ نے تعلیق کی ہے، اور شیخ الاسلام کے اس فقرہ، یا اس جملہ کو ذکر کرنے کے سبب (اور وجہ) کو بھی نقل کرتے ہیں۔

۵/: پھر ہم شیخ الاسلام (ابنِ تیمیہ) کے مذہب اور اعتقاد کو اُن کی کتب سے، اس صفت کے متعلق نقل کرتے ہیں، جس کے متعلق یہ دعویٰ ہوتا ہے، تا کہ پوری قوت کے ساتھ غبار کے اثرات ختم ہو جائیں، بلکہ ہر طرح کی مہارت اور ضعف کے ساتھ وضاحت ہو جائے، اور پھر ہم اس کی تائید، قدیم اور جدید اہلِ علم کے کلام سے کرتے ہیں، اور بسا اوقات اس کی تائید امام اشعری کے اپنے کلام سے ہوتی ہے، اور باقلانی اور امام بیہقی رحمہم اللہ کے کلام سے بھی ہوتی ہے (فتح العلی الکبیر)

رمضان بن عبدالکریم مصری نے مذکورہ تالیف میں ''سعید فودۃ'' کی طرف سے علامہ ابنِ تیمیہ پر وارد کیے گئے مختلف اعتراضات وشبہات کا فرداً فرداً مفصل جائزہ لیا ہے، اور علامہ ابنِ تیمیہ کے موقف کا سلف کے مطابق ہونا ثابت کیا ہے، اسی کے ساتھ علامہ ابنِ تیمیہ کی مخالفت وعداوت کے اسباب پر بھی کلام کیا ہے۔

چنانچہ اپنی مذکورہ تالیف میں رمضان بن عبدالکریم مصری نے پہلی فصل ''**موقف أهل المذاهب الأربعة من الأشاعرة**'' کے عنوان سے قائم کی ہے، جس کے ضمن میں ''صفاتِ باری تعالیٰ'' سے متعلق مالکیہ، شافعیہ، حنفیہ اور حنابلہ کے موقف کو بحوالہ ذکر کیا ہے۔

اور موصوف نے دوسری فصل ''**منهج شيخ الاسلام فی الرد علی الخصوم**'' کے عنوان سے قائم کی ہے، جس کے ضمن میں علامہ ابنِ تیمیہ کے ''خصوم'' پر رَد کے طریقۂ کار اور انداز پر کلام کیا ہے۔

اور تیسری فصل ''اسباب العداوۃ لشیخ الاسلام ابنِ تیمیۃ'' کے عنوان سے قائم کی ہے، جس کے پہلے مرحلے میں فقہاء، قضاۃ، اہلِ کلام، شیعہ اور صوفیاء کی، علامہ ابنِ تیمیہ کے ساتھ عداوت ومخالفت کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

اور تیسری فصل ہی کے دوسرے مرحلے میں ''اعترافات خصومہ بعلو قدرہ'' اور تیسرے مرحلے میں ''کلام أهل العلم فيمن عادى شيخ الإسلام ونسبه إلى الكفر'' کے عنوانات پر کلام کیا ہے۔

اور رمضان بن عبدالکریم مصری نے اپنی مذکورہ تالیف میں چوتھی فصل ''سعید فودۃ'' کی طرف سے علامہ ابنِ تیمیہ پر وارِد اعتراضات وشبہات کی تردید کے لیے ''الرد على افتراء ات فودة'' کے عنوان سے قائم کی ہے، جس کے ضمن میں مندرجہ ذیل ابحاث پر فرداً فرداً ''سعید فودۃ'' کے اعتراضات وشبہات کو نقل کر کے تفصیلی واجمالی طور پر کلام کیا ہے:

المبحث الأول: فى صفة كلام الله تعالٰى.

المبحث الثاني: فى صفة رؤية الله تعالٰى يوم القيامة.

المبحث الثالث: فى صفة الإستواء.

المبحث الرابع: صفة الفوقية.

المبحث الخامس: فى قضية الجسم ومصطلح التجسيم.

المبحث السادس: قضية الحد.

المبحث السابع: قضية الحيز والجهة.

المبحث الثامن: تحت عنوان ما سماه الكاتب(صفة الحياة والقدرة والإرادة والعلم)

المبحث التاسع: ردود متفرقة.

پھر رمضان بن عبدالکریم مصری نے اپنی مذکورہ تالیف میں ''المبحث التاسع'' کے ضمن میں مندرجہ ذیل مسائل کا ذکر کیا ہے:

بخصوص مسألة (حكم الوهم والخيال في ذات الله)

بخصوص مسألة (قياس الغائب على الشاهد)

بخصوص مسألة (الفطرة)

بخصوص مسألة (تفسير قوله تعالىٰ ”الله الصمد“)

پھر آخر میں اپنی تالیف کا ”خاتمہ“ پیش کیا ہے۔

رمضان بن عبدالکریم مصری کی مذکورہ بالا تالیف ان حضرات کے لئے قابلِ ملاحظہ اور مفید ہے، جو ”صفاتِ باری تعالیٰ سے متعلق“ علامہ ابنِ تیمیہ پر وارد کئے جانے والے مختلف شبہات واعتراضات کا شکار، اور اس سلسلہ میں علامہ ابنِ تیمیہ سے بدگمان ہیں۔

اس کے علاوہ بعض حضرات نے ”النصيحة الذهبية“ کے نام سے ایک رسالہ امام ذہبی کی طرف منسوب کیا ہے، جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس رسالہ میں امام ذہبی نے، علامہ ابنِ تیمیہ کے ”صفاتِ باری تعالیٰ“ کے متعلق موقف کی تردید کی ہے۔

لیکن متعدد اہلِ علم حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے، اور اس موضوع پر مستقل رسائل تحریر کئے ہیں، جن میں بعض حضرات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس رسالہ کی امام ذہبی کی طرف نسبت درست نہیں، اور امام ذہبی کی طرف منسوب اس رسالہ کے مضمون میں بھی علامہ ابنِ تیمیہ کا کوئی ذکر نہیں۔

(ملاحظہ ہو: الموسوعة الميسرة في تراجم أئمة التفسير والإقراء والنحو واللغة من القرن الأول إلى المعاصرين مع دراسة لعقائدهم وشيء من طرائفهم، ج ۱ ص ۸۷۷)

شیخ محمد بن ابراہیم شیبانی نے ”**التوضيح الجلي في الرد على النصيحة الذهبية المنحولة على الإمام الذهبي**“ کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا ہے، جس میں انہوں نے اس رسالہ کی امام ذہبی کی طرف نسبت کی تردید کی ہے۔

(التوضيح الجلي في الرد على النصيحة الذهبية المنحولة على الإمام الذهبي، الناشر: منشورات مركز المخطوطات والتراث والوثائق، الكويت، الطبعة الأولىٰ: ۱۴۱۳ھ، ۱۹۹۳م)

نیز ابوالفضل محمد بن عبداللہ القونوی نے بھی ایک رسالہ ”**أضواء على الرسالة المنسوبة**

إلى الحافظ الذهبي النصيحة الذهبية لابن تيمية وتحقيق في صاحبها'' کے نام سے تالیف کیا ہے، جو''**دار المامون للتراث، بیروت، لبنان**'' سے پہلی مرتبہ ۱۴۲۳ھ بمطابق 2002ء کو شائع ہوا۔

اس کے علاوہ''**فتحی عیساوی**'' نے بھی''**التعليقات المنهجية في الردّ على النصيحة الذهبية أو بل هي الفضيحة الذهبية**'' کے نام سے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔20-شعبان-1443ھ

(ماہنامہ''التبلیغ''''جلد19 شمارہ09''مئی2022ء - رمضان المبارک1443ھ)

---

(204)

مولانا اسماعیل شہید کے چند علمی جوابات

حضرت مولانا سید اسماعیل شہید دہلوی رحمہ اللہ سے کچھ طلبہ نے چند سوالات کیے تھے، جن کے حضرت نے جوابات دیئے تھے، ان سوالات وجوابات کا ایک اقتباس، موجودہ دور کے مسلمانوں اور خاص کر علماء وطلباء کے لیے انتہائی مفید ہے، جس کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

طلبہ کا سوال:...... آپ امام ابوحنیفہ کو کیسا سمجھتے ہیں؟

مولانا اسماعیل شہید کا جواب:...... ایک بڑا زبردست فقیہ، فخرِ مسلمین خیال کرتا ہوں۔

طلبہ کا سوال:...... جو فقہی مسائل ان (یعنی امام ابوحنیفہ) کے ہیں، آپ انہیں تسلیم کرتے اور مانتے ہیں؟

مولانا اسماعیل شہید کا جواب:...... اکثر کو تسلیم کرتا ہوں، مگر بعض وہ مسائل، جو حدیث میں موجود ہیں (ان کو تسلیم نہیں کرتا)۔

طلبہ کا سوال:...... آپ میں اتنی سمجھ ہوگئی کہ آپ ان (یعنی امام

ابوحنیفہ) کے بعض فقہی مسائل کو ناپسند، اور اکثر کو پسند کرنے کے مجاز ہیں؟

مولانا اسماعیل شہید کا جواب:...... نہیں، حاشا وکلا! یہ میں نے دعویٰ نہیں کیا، بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ امام اعظم کو جو حدیث نہیں پہنچی، اور وہاں انہوں نے اپنی رائے سے (کوئی دوسرا حکم) بیان کیا، اور اس کے خلاف حدیث موجود ہے، تو ہمارا فرض ہے کہ حدیثِ نبوی کے آگے، امام اعظم کا قول، یا رائے تسلیم نہ کریں۔

طلبہ کا سوال:...... اور جو اس کے خلاف کرلے (یعنی حدیث کے برخلاف امام ابوحنیفہ کے قول کو ہی مانے) اسے آپ کیا کہتے ہیں؟

مولانا اسماعیل شہید کا جواب:...... ابھی تک میں نے اس کی بابت غور نہیں کیا، پھر بھی میں اتنا کہتا ہوں، چاہے میرا خیال درست ہو، چاہے نادرست، کہ وہ اچھا نہیں کرتا، کیونکہ امام صاحب خود فرماتے ہیں کہ ''اگر میرے قول کے خلاف کوئی حدیث ملے، تو اس میرے قول کو نہ مانو''۔

طلبہ کا سوال:...... کیا امام اعظم، حدیث نہیں جانتے تھے؟

مولانا اسماعیل شہید کا جواب:...... جانتے کیوں نہیں تھے، مگر وہ زمانہ احادیث کی اختراعات کا ایسا غضب ناک تھا کہ یکا یک ہر حدیث کو تسلیم کرتے ہوئے ڈرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ نے اکثر مسائل میں اپنی رائے (واجتہاد) سے کام لیا ہے۔ [1]

---

[1] مطلب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کو جو حدیث نہیں پہنچی، یا جس کی سند، یا دلالت پر ان کو اطمینان حاصل نہ ہوا، وہاں اس کے بجائے، قیاس واجتہاد سے کام لیا، اور اس اجتہاد پر وہ ماجور ہیں، اگرچہ وہ قول فی الواقع، یا دوسرے کی نظر میں مرجوح، یا خطاء پر مبنی، اور حدیث کے خلاف کیوں نہ ہو، اور اگرچہ دوسرے مجتہدین ومحدثین کو وہ احادیث، اطمینان بخش سند کے ساتھ پہنچ گئی ہوں، اور ان کا قول، ان احادیث کے موافق ہو، ایسی صورت میں احادیث قابلِ عمل ہوں گی، اور ان کے خلاف عمل درست نہ ہوگا، کیونکہ اگر امام ابوحنیفہ کو اطمینان بخش طریقہ پر وہ احادیث پہنچ جاتیں، تو وہ بھی ان احادیث پر عمل کرتے، اور ان احادیث کی مخالفت ہرگز نہ کرتے، لہٰذا ان کے مقلدین کو بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ محمد رضوان۔

www.idaraghufran.org

طلبہ کا سوال:...... کیا اس سے وہ (یعنی امام ابوحنیفہ) ملزم ٹھہر سکتے ہیں؟

مولانا اسماعیل شہید کا جواب:...... نہیں، ہرگز نہیں! ان کا دامنِ تقدس ہر بے جا الزام سے بالکل پاک ہے، ہاں اگر یہ کہتے کہ ''صحیح حدیث پہنچنے پر بھی تم میرے قول پر عمل کیے جاؤ'' تب تو جائے اعتراض ہوسکتی ہے، اور جب وہ یہ نہیں فرماتے، پھر ان پر کسی طور کا الزام قائم کرنے والا جھوٹا ہے (حیاتِ طیبہ، ص ۵۸، ۵۹، مؤلفہ: مولانا مرزا حیرت دہلوی مرحوم، مطبوعہ: ثنائی برقی پریس، امرتسر، رمضان ۱۳۵۱ھ، جنوری 1933ء)

28-شعبان-1443ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 20 شمارہ 07، فروری 2023ء - رجب المرجب 1444ھ)

---

(205)

متشدد مذہبی طبقہ کا مذموم رویہ

ایک عرصہ سے دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ہماری علمی و مذہبی نسبت جس سلسلہ سے ہے، اس میں ایسے غیر ذمہ دار و غیر دیانت دار اور علمی خیانت کے مرتکب لوگوں کا طبقہ موجود ہے، جس کو دوسرے سے مؤدبانہ طریقہ پر اجتہادی و فروعی نوعیت کے اختلاف کو برداشت کرنے کا بھی حوصلہ و ہمت نہیں۔

اور اب یہ طبقہ اس درجہ انتہاء پسندی پر اتر آیا ہے کہ اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے ساتھ مذکورہ بالا نوعیت کا اختلاف کرنے والے کو فتوے بازی کر کے اپنے مذہب و مسلک سے خارج کرے۔

حالانکہ اس طبقہ کو یہ معلوم نہیں کہ سلف کے سچے متبعین کو خود بھی پہلے سے اپنے آپ کو اس انتہاء پسند طبقہ سے وابستگی کا کوئی شوق نہیں، وہ پہلے ہی اپنے آپ کو اس طبقہ سے الگ تصور کرتے ہیں، اگر یہ طبقہ خود اپنے ہاتھوں سے یہ کام کر دے گا، تو وہ خود ہی اس مقصود کی تکمیل میں ان کا معاون و مددگار شمار ہوگا۔

اہلِ حق کو الحمدللہ تعالیٰ نہ اس طبقہ سے وابستگی کا شوق اور طلب ہے اور نہ ہی اس طبقہ کی فتوے بازی سے کوئی وحشت اور خوف لاحق ہے۔

اس طبقہ کا کام تو یہی ہے، وہ خود اپنی انتہاء پسندی کی وجہ سے جمہور سے کٹا ہوا ہے، اگرچہ وہ اپنے ٹولہ کو اپنے زعم میں جمہور تصور کرتا ہو، یہ بے چارہ کیا دوسروں کو اہلِ حق سے خارج کرے گا۔

اہلِ حق کے متبعین کا دینی و مذہبی مسائل میں جو موقف ہے، الحمدللہ تعالیٰ اس کی سند قرآن و سنت، اجماعِ امت اور قیاسِ شرعی جیسے اصول وقواعد کی روشنی میں موجود ہے، ایسی صورت میں ان کو کسی دوسرے کی طرف سے سند حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ نہ ہی اس سے مندرجہ بالا سند پر کوئی اثر واقع ہوتا، ایسی صورت میں اس طرح کے ملزمانہ فتووں کا محققانہ جواب بھی اہلِ حق کے متبعین کی طرف سے، قرآن وسنت کی روشنی میں دلائل وبراہین کے ساتھ دیا جائے گا، اور دیا جاتا رہا ہے۔

یہ طبقہ اس سے پہلے بھی بڑے بڑے علماء و بزرگوں کے خلاف اس طرح کی مذموم حرکات کر کے ناکامی کا منہ دیکھ چکا ہے، بلکہ ہر دور میں ''سفہاء و جہلاء کا طبقہ'' فقہاء کا مخالف رہا ہے، جن کا آج اچھائی کے ساتھ نام لینے والا بھی کوئی نہیں۔

اور جن اکابر واسلاف اور فقہائے محققین کے خلاف اس طرح کی کوششیں کی گئیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے نام، شان اور کام سب کو آج تک الحمدللہ تعالیٰ رفعت وعزت اور حیات بخشی ہوئی ہے۔ 15- ربیع الآخر- 1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 20 شمارہ 07، فروری 2023ء - رجب المرجب 1444ھ)

---

(206)

اپنے اسلاف ومشائخ کا بدنام کنندہ طبقہ

موجودہ دور کے جامد ومتشدد نام نہاد علماء کے غیر معتدل رویہ سے دل بہت کھٹا ہوتا ہے، جو اہلِ

حق کی طرف اپنی بڑی بڑی نسبتوں کا اظہار کرتے ہیں، رات دن، ان کا نام لیتے ہیں، ان کی نسبت سے عزت، شہرت اور دولت سب کچھ پاتے ہیں، لیکن ان کے کردار میں اہلِ حق کی سچی نسبت نظر نہیں آتی، میں نے پہلے بھی بہت مرتبہ عرض کیا کہ ہم جس سلسلہ اور مکتبِ فکر کی طرف منسوب ہیں، اس کے بانی، مبانی، اور اس سلسلہ کو دوسرے سلسلوں سے ممتاز کرنے والے اکابرو مشائخ کا طرزِ عمل کیا تھا؟ خواہ وہ علم و تحقیق کا پہلو ہو، یا عمل اور تقوے وطہارت کا پہلو ہو، یا روایت اور حکایت کا پہلو ہو، یا اپنے اور پرائے لوگوں سے اختلاف و برتاؤ کا پہلو ہو؟ ان سب میں وہ حضرات نہایت محتاط، اور پاکیزہ سیرت کے مالک تھے، ہر وقت اپنے احتساب، دوسروں سے حسنِ ظن، اپنی زبان، قلب اور نفس کی نگرانی کرنا، ان کی رگ و پے میں سَمایا ہوا تھا، ان اکابرو اسلاف کی حکایات وواقعات کافی حد تک محفوظ ہیں، ان حضرات کے صدق واخلاص کی برکت سے آج ہم اس قابل ہوئے کہ کچھ اچھے برے کی تمیز ہوگئی، اور راہِ حق نظر آنا شروع ہوگئی، ورنہ معلوم نہیں، کیا حالت ہوتی؟

لیکن افسوس کہ ان حضرات کے ایک ایک کر کے چلے جانے اور اوپر سے ان کے تربیت یافتہ حضرات کے رخصت ہو جانے کے بعد اب رفتہ رفتہ اکثر صرف ان کے نام لیوا ہی باقی رہتے جارہے ہیں، عمل اور کردار کی شخصیات عنقاء ہوتی جارہی ہیں، بلکہ اب تو نوبت اور حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ایک طبقہ جو اپنی نسبت ان اسلاف کی طرف کرتا ہے، وہ خود ہی ان حضرات کا بدنام کنندہ بن رہا ہے، چنانچہ جب اس طبقہ کے کردار کو ملاحظہ کیا جاتا ہے، تو گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔

اسی لئے میں بہت مرتبہ اس طبقہ سے برائت ظاہر کر چکا ہوں، اور اب پھر کرتا ہوں کہ اس طبقہ کو اہلِ حق اسلاف کا حقیقی ترجمان ہرگز نہ سمجھا جائے، جس کا قول وفعل، ان حضرات سے مطابقت نہیں رکھتا، اس جعل ساز اور جھوٹی نسبت کے حامل طبقہ کا طرزِ عمل، الزام و بہتان تراشی، علمی خیانت اور جھوٹ وفریب، رات ودن کا مشغلہ ہے، اوپر سے یہ طبقہ ”چور مچائے،

شور'' کا مصداق بن کر اپنے آپ کو تنبیہ کرنے والے کو طرح طرح سے، ڈرانے، دھمکانے، ملامت کرنے، اور اپنے حلقہ سے خارج کرنے کی بھی کوششیں کرتا رہتا ہے، تاکہ اس طبقہ کی جھوٹی نسبت کا پردہ چاق نہ ہوجائے۔

اگر یہ خائن ومتشدد طبقہ ایسے حضرات کو اپنی نسبت سے جدا کرنا چاہتا ہے، تو یہ بات ان حضرات کے لئے اعزاز کا باعث ہوگی، کیونکہ اہلِ حق کو خود بھی اس طبقہ کے ساتھ نسبت زیب نہیں دیتی۔15-ربیع الآخر-1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد20 شمارہ07 فروری2023ء - رجب المرجب1444ھ)

---

(207)

نمازِ عید، یا خطبہ کے بعد دعاء

آج کل اس بات پر لوگوں میں بہت اختلاف اور بحث ومباحثہ، اور انکار ونکیر ہوتا ہے کہ عیدین کی نماز کے بعد دعاء کی جائے، یا خطبہ کے بعد دعاء کی جائے، حالانکہ اس قسم کی چیزوں میں ایک دوسرے کے خلاف بحث ومباحثہ، اور انکار ونکیر کرنا، کوئی کارِ خیر نہیں، اگر کوئی سِرے سے دعاء نہ کرے، اور عید کی نماز کے متصل بعد خطبہ دے کر فراغت حاصل کرلے، تو بھی گناہ کی بات نہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عیدین میں نہ قبل الخطبۃ نہ بعد الخطبۃ دعاء منقول تو ہے نہیں، لیکن اگر کہیں معمول ہو، مگر التزام نہ ہو، تو کلیاتِ شرعیۃ کی بناء پر کوئی حرج بھی نہیں، ایسی چیزوں کی بحث میں نہ پڑنا چاہیے، جس میں شرعاً وسعت ہے، اہتمام کے لائق اور بہت باتیں ہیں، لوگ ان کے چھوڑنے پر آمادہ نہیں، جن پر کھلم کھلا دین کی تحریف کررہے ہیں (''الافاضات الیومیۃ'' مشمولہ: ملفوظاتِ حکیم الامت، ج۵ص۳۰۱، ملفوظ نمبر۳۲۷، بعنوان ''عیدین میں دعاء کے بارے میں شرعاً وسعت ہے'' مطبوعہ: ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان)

www.idaraghufran.org

آج کل اس قسم کے مسائل میں لوگوں کے مختلف گروہ بن گئے ہیں، کوئی عید کی نماز کے بعد خطبہ سے پہلے دعاء کرتا ہے، اور دوسرے طریقوں کو غلط و بدعت ٹھہراتا ہے، کوئی خطبہ کے بعد دعاء کا قائل ہے، اور وہ دوسرے طریقوں کو غلط و بدعت ٹھہراتا ہے، اور کوئی نمازِ عید اور خطبہ دونوں کے بعد ہی دعاء کو غلط و بدعت ٹھہراتا ہے، اور اس طرح آپس میں ایک دوسرے کے خلاف فتوے بازی وفتنہ کا بازار گرم ہوتا ہے، اس قسم کے نا اہل، اور فتنہ پرور لوگوں نے دین کو ایک تماشہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ 10- شعبان المعظم- 1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 20 شمارہ 09، اپریل 2023ء - رمضان المبارک 1444ھ)

---

(208)

بدگمانی وبدزبانی

آج کل بدگمانی اور پھر بدزبانی کا مرض بہت عام ہو گیا ہے، پہلے بدگمانی ہوتی ہے، اور پھر اس کے مطابق بدزبانی کی نوبت آتی ہے، بدگمانی اور بدزبانی دونوں ہی شرعی اعتبار سے خطرناک امراض ہیں، قرآن وسنت میں ان دونوں گناہوں پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اور اس وقت یہ دونوں امراض اتنے عام ہو گئے ہیں کہ ان میں دین داروں، اور علماء وصلحاء کا ایک بڑا طبقہ بھی مبتلا ہو گیا ہے، اور زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ ان گناہوں کا رات دن، اِن دین داروں اور دین کے مقتداء وپیشوا لوگوں کی طرف سے سوشل میڈیا اور مذہبی رسائل و جرائد میں بھی کھلے عام استعمال ہونے لگا ہے، عوام کا تو کہنا ہی کیا!

پھر ان مقتداؤں کی طرف سے بدگمانیوں اور اس پر مرتب ہونے والی بدزبانیوں کی بہت سے عوام الناس، بلاتحقیق تصدیق بھی کر دیتے ہیں، اور تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے، نا اہلوں کی یہ اندھی اور جامد تقلید بھی دنیا وآخرت کے اعتبار سے سخت تباہ کن ہے، جس کی وجہ سے مختلف ادوار میں سادہ لوح مسلمانوں نے دھوکہ کھایا، یہاں تک کہ بعض چیزوں میں وہ

معاندین ومنافقین کی بھی تقلید کربیٹھے۔

ایک صاحب نے مجلّہ میں ایک مضمون میرے خلاف لکھا، اور جیسا کہ ان صاحب کا معمول، بلکہ عادت ہے کہ اصل موضوع اور مدعا کے بجائے، ادھر ادھر کی غیر متعلقہ باتیں کرتے ہیں، اور کوئی نقص وعیب جس طرح بھی ہاتھ آئے، اس کو بہت اچھالتے ہیں، خواہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہ ہو۔

انہوں نے یہ تاثر ظاہر کیا کہ میں ایک فلاں سبائی مولوی کو مدد کے لیے بلاتا ہوں، اور الگ کمرے میں بیٹھ کران مولوی صاحب سے اہلِ سنت کے خلاف دلائل حاصل کرتا ہوں، اور پھر یہ بھی دعویٰ کیا کہ ان کو یہ معلومات ایک اندر کے آدمی نے پورے وثوق کے ساتھ دی ہیں، اور یہ بھی دعویٰ کیا کہ اگران کی یہ معلومات ناقص ہیں، تو آخرت کا مؤاخذہ سامنے رکھ کر اس کی تردید کریں۔

حالانکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم اس الزام واتہام کی تردید، یا اصل تحقیق پیش کربھی دیں، تو ان صاحب نے کونسی ہماری تصدیق کرنی ہے، جبکہ ان صاحب کا حال یہ ہے کہ اس کے بغیر بھی بدگمانیوں اور بدزبانیوں پر مشتمل عظیم لغویات، الزامات و اتہامات قائم کردئے ہیں، اور وہ سنجیدگی ومتانت کے ساتھ علمی گفتگو کی نعمت سے کوسوں دور ہیں، اور شاید یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ محض الزامات واتہامات سے دوسرے کو مرعوب، اور جمہور کے موقف کو مغلوب کردیں گے، جو ان کی غلط فہمی ہے۔

سابق مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جانبین سے سنجیدگی ومتانت ہو، تو مناظرہ کا فائدہ بھی ہے، مگر ہم تو متانت اختیار کریں، اور وہ گالیاں دیں، تو کیا کام بنے، ان کے جواب میں لغویات ہی ہوں، تو کام بنے (ملفوظات فقیہ الامت، جلد دوم، ص۳۳۶، دارالہدیٰ: اردو بازار، کراچی، اشاعت: ۲۰۰۵ء)

اس مفتری ومخرب صاحب کی حالت یہ ہے کہ وہ دوسرے کے پورے موضوع، اور اصل

مقصود کو نظر انداز کر کے صرف کسی ایک جزوی کمزوری کو پکڑ کر اسے خوب اچھالتے ہیں، اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسرے کی تمام باتیں غلط ہیں، لیکن ان شاء اللہ یہ اپنے مقصود میں علمی نکتہ نظر سے کامیاب نہیں ہوسکتے، چند کم علم لوگوں میں مصنوعی وعارضی شہرت حاصل کرلینا کوئی کمال نہیں۔

اور اسی لئے اپنے بزرگوں کی ہدایات کی بناء پر اب ان مفتری ومخرب کی تلبیسات ولغویات، اور الزامات واتہامات پر تفصیلی تبصرہ کو ہم نے اہمیت دینا، اور بکواسات کو منہ لگانا چھوڑ دیا ہے، صرف اہم امور پر ہی کلام پر اکتفاء کیا جانے لگا ہے، اور اپنے وقت کو دوسرے ضروری اور مفید کاموں ، اور سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کے خطاب میں مشغول کرنے کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔

دوسرے ہمارے یہاں کتب وفتاویٰ وغیرہ حاصل کرنے کے لئے کوئی سنی آئے، یا غیر سنی آئے، اس سے فرق نہیں پڑتا، نہ ہی ہمیں کسی کے بارے میں تحقیق وتجسس کی ضرورت لاحق ہوتی۔

تیسرے الحمدللہ تعالیٰ ہمارا مبحوث فیہ مسئلہ کے بارے میں وہی موقف ہے، جس کو ہم بیسیوں سال سے راجح سمجھتے ہیں، اور وہ جمہور اہلُ السنۃ والجماعۃ کا موقف ہے، جن میں جلیلُ القدر مجتہدین، محدثین، فقہائے کرام اور سلفِ صالحین شامل ہیں، جس کے دلائل وبراہین انتہائی مضبوط ومستحکم ہیں، اگرچہ چند اکابر وبزرگوں کا موقف اس کے موافق نہ ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا، نہ ہی علم وتحقیق کے میدان میں ان کا اختلاف جمہور کے موقف، اور ان کے دلائل میں کمزوری کا باعث بنتا۔

چوتھے ہمیں جمہور کے موقف کو ثابت کرنے، اور اس پر قائم رہنے کے لئے آج تک کسی سبائی ، یا رافضی کی مدد حاصل کرنے، یا اس مقصود کے لئے کسی کو اپنے یہاں مدعو کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، کیونکہ یہ موقف، اور اس کے دلائل وبراہین اہل السنۃ والجماعۃ کی ان مستند کتب میں موجود ہیں، جن تک ہمیں الحمدللہ تعالیٰ رسائی حاصل ہے، جس کے دلائل وبراہین ہماری طرف سے فراہم کردئے گئے ہیں، اور ان صاحب کے ہم سایہ جذباتی اور کم علم حضرات، جو

یہ پرزور دعویٰ کرتے ہیں کہ گویا کہ ہمارا موقف، اہلِ تشیع کی ناجائز وکالت اور بے جا دفاع پر مشتمل ہے، اور ہمارا موقف سلف جمہور کے برخلاف ایک زیرِ تعمیر اجتہاد پر مبنی ہے، یہ دعویٰ بدیہیُ البطلان ہے، جمہور سلف محققین کے مستند حوالہ جات وعبارات کی روشنی میں اس طرح کے بے بنیاد دعووں کی حقیقت آشکارا کرنے، اور اس مفتری ومتہم طبقہ کی دلائل وبراہین کے ذریعہ سرکوبی کا مزید علمی وتحقیقی کام جاری ہے، یہ متشدد تکفیری طبقہ جتنا سر اٹھائے گا، اس کا اسی حیثیت سے ان شاء اللہ تعالیٰ، جہاتِ مختلفہ سے علمی وتحقیقی محاسبہ کیا جائے گا، جس سے یہ بات مزید روزِ روشن کی طرح واضح ہوجائے گی کہ مذکورہ طبقہ محض تعصب وضد میں اپنے ہی محققین اسلاف کے خلاف طعن وتشنیع میں مبتلاء ہے۔

پانچویں اگر بالفرض کوئی رافضی کسی حوالہ، یا علمی تبادلہ خیال کے لئے ہمارے یہاں خود سے آئے، تو ہمیں اپنے حق موقف پر قائم رہتے ہوئے، اس سے ملاقات وگفت وشنید سے انکار نہیں، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ’’جمعیۃ العلماء، اور دیگر علمائے اہل السنۃ‘‘ کے شیعوں کے ساتھ سیاسی جلسوں میں شرکت اور شیعہ رئیسوں کی مہمان داری قبول کرنے، اور ان کے ہاں ٹھہرنے اور، شیعہ اکابر کو جلسوں کا صدر بنانے، اور غرض سارا خلا ملا بالکل مسلمانوں کا سا رکھنے کے متعلق فرماتے ہیں:

’’ایسے برتاوے میں تو میں بھی مبتلاء ہوں، میں اگر کہیں نہیں جاتا، سو وہ تو میرے پاس آتے ہیں، میں بھی برتاؤ مسلمانوں جیسا کرتا ہوں‘‘ (حکیم الامت نقوش وتاثرات‘‘ ص ۲۴۴، مقالہ نمبر ۴۸، ۱۹۳۲ء کے مقالات، مطبوعہ: مکتبہ مدنیہ، لاہور)

اس طرح کے حوالہ جات بہت زیادہ ہیں، جو مذکورہ متشدد تکفیری طبقہ کے بزرگوں کے حوالہ سے ہی موجود ہیں، جن کا سلسلہ تا حال جاری ہے، اس لئے ہمیں اپنے دامن کی صفائی کے لئے مفترین ومخربین کو مطمئن کرنے کی ضرورت نہیں۔

چھٹے ہم کس سے ملاقات، یا گفتگو کرتے ہیں، اور کس مقصد کے لئے کرتے ہیں؟ اس کے

لئے اللہ اوراس کے رسول، اوراس کی شریعت کی طرف سے سندِ جواز کافی ہے، اس کے لئے ہمیں مذکورہ متشدد افتراء واتہام سازوں سے اجازت وسند حاصل کرنے کی ہرگز ہرگز ضرورت نہیں، ان کو اس سلسلہ میں اپنے حکم نامہ وسندِ اجازت کو اپنے یہاں تک ہی محدود رکھنا چاہیے، اوراپنی تحکمانہ خیالی پلاؤ خود تیار کر کے استعمال کرنی چاہیے۔

ساتویں اس طرح کے افتراء واتہام پردازوں کا کام ہی دوسروں کے ایمان اوران کی عزت و آبرو سے کھلواڑ کرنا ہے، یہ جب چاہیں، جس پر چاہیں، اس طرح کی تہمتیں لگادیتے ہیں، جو ان کے یہاں معمول کا مشغلہ ہے، اگر اسلامی حدود وتعزیرات نافذ ہوں، تو اسلام میں ایسے اتہام سازوں، وافتراء پردازوں کے لیے سخت تعزیر مقرر کی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس طبقہ کا اصل مشغلہ ہی بدگمانی اور بدزبانی میں مبتلا ہونا ہے، اور وہ اس مقصد کے لیے کسی شرعی حد وانتہاء کا پابند نہیں، وہ جب چاہے، جس طرح چاہے، اور جس پر چاہے، اس طرح کی تہمتیں قائم کر دیتا ہے، اسی لیے ہم اس طبقہ کے غیر معتدل مسلک ومشرب سے علیٰحدگی اختیار کر چکے ہیں، اوراس طبقہ کو ہم اہلِ حق کے سلسلے سے وابستہ تسلیم نہیں کرتے، اگرچہ یہ طبقہ اپنی لاکھ نسبتیں اہلِ حق کی طرف کرے، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ 22- شعبان المعظم-1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 20 شمارہ 09، اپریل 2023ء - رمضان المبارک 1444ھ)

---

(209)

تکفیر بازی، اور متعصبین ومتشددین کے الزامات

اہلُ السنۃ کے علاوہ جتنے فرقے ہیں، ان سب کے بارے میں اصولی طور پر جمہور مجتہدین وفقہائے کرام، اوران کی اتباع میں جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف یہ ہے کہ ان کی علی الاطلاق تکفیر نہ کی جائے، جس کے متعلق ان کی طرف سے انتہائی مستحکم شرعی وفقہی دلائل بھی قائم کئے جاتے رہے، ساتھ ہی تکفیر کرنے والوں کے مستدلات کے جوابات بھی تحریر کئے جاتے رہے۔

مذکورہ موقف کے ثبوت کے دلائل و براہین بہت زیادہ ہیں، جو مستند حوالہ جات وعبارات کی شکل میں موجود ہیں، اور بحمد اللہ تعالیٰ ہم نے اپنے مختلف مضامین میں اس طرح کے متعدد حوالہ جات کو نقل کردیا ہے۔

ابوالحسن شہاب الدین ہارون بن بہاؤالدین مرجانی حنفی (المتوفیٰ:1306ھ) ''حزامۃ الحواشی لازالۃ الغواشی علی التوضیح'' میں فرماتے ہیں:

مذھب جمھور المحققین عدم تکفیر الروافض مع انکارھم خلافۃ ابی بکر وعمر وقد نص علی ذالک ابو حنیفۃ والشافعی رحمھما اللہ وغیرھما، بل فی المحیط وغیرہ انہ مذھب جمھور الفقھاء (حزامۃ الحواشی لإزاحۃ الغواشی علی التوضیح، ج۳،ص۲۰۷، الناشر: المطبعۃ الخیریۃ، القاھرۃ، مصر، تاریخ النشر: 1322ھ، 1904م)

ترجمہ: جمہور محققین کا مذہب ''روافض کی عدمِ تکفیر'' کا ہے، ان کے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کا انکار کرنے کے باوجود، اور اس کی امام ابوحنیفہ، اور امام شافعی رحمہما اللہ وغیرہما نے تصریح کی ہے، بلکہ محیط وغیرہ میں ہے کہ یہی جمہور فقہاء کا مذہب ہے (حزامۃ الحواشی)

البتہ ماضی قریب میں بعض علماء ومشائخ نے شیعہ، یا روافض کی علی الاطلاق تکفیر کی، جس میں علماء ومشائخِ دیوبند کا ایک بڑا طبقہ بھی داخل ہے، اس موضوع پر ان حضرات نے نیک نیتی اور دیانت داری کے طور پر بعض مضامین، کتب ورسائل بھی تحریر وتصنیف کیے۔

لیکن دیگر علماء ومشائخِ دیوبند نے جمہور کے سابق موقف کو ہی برقرار رکھا، اور ان کو جمہور کے بیان کردہ دلائل پر ہی شرح صدر حاصل رہا۔

دوسرے فقہی واجتہادی مسائل کی طرح دونوں طرف کے علماء اپنے اپنے موقف کو نیک نیتی کے ساتھ اختیار کرتے اور ترجیح دیتے رہے، جس میں ایک دوسرے پر نہ گمراہی کا حکم لگایا گیا، نہ دوسرے کو اپنے موقف کے ماننے پر مجبور ومصرور کیا گیا، اور ایک دوسرے کے احترام

کے ساتھ معاملہ چلتا رہا۔

لیکن آج ہمارے دور میں سابق علماء کی طرف اپنی نسبت ظاہر کرنے والا ایسا مخصوص متشدد، ومتعصب تکفیری گروہ پیدا ہوگیا ہے، جو جمہور کی اتباع میں ''شیعہ وروافض کی علی الاطلاق عدمِ تکفیر'' کا قول کرنے والے حضرات پر طرح طرح کی الزام تراشیوں پر اتر آیا ہے۔

حالانکہ اس گروہ کا یہ طرزِ عمل کسی طرح بھی ان اکابر ومشائخ کے موافق نہیں، جس کی طرف یہ گروہ بڑے دھڑلے کے ساتھ اپنی نسبتیں، بیان کرتا ہے، اور رات دن ان اکابر ومشائخ کی شان میں رطبُ اللسان رہتا ہے، بلکہ ان کے نام سے اپنے روزگارِ زندگی کو چلاتا ہے۔

چنانچہ یہ تکفیری متشدد گروہ جمہور کے اختیار کردہ موقف اور ان کے بیان کردہ دلائل کے نقل کرنے پر کبھی ''اہلِ تشیع کی ناجائز وکالت اور بے جا دفاع میں مگن ہونے'' کا الزام عائد کرتا ہے، جو اس گروہ کی ضد وعناد اور کم علمی کی علامت ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ اتنا لاعلم ہے کہ اس کو ناجائز و بے جا وکالت کی حقیقت بھی معلوم نہیں۔ [1]

واقعہ یہ ہے کہ جو موقف قرآن وسنت، جمہور اہلُ السنۃ، ائمہ مجتہدین وفقہائے کرام کی اتباع پر مبنی اور ان کے موقف کے مطابق ہو، وہ درحقیقت ''قرآن وسنت اور جمہور اہل السنۃ اور ائمہ مجتہدین وفقہائے کرام کی وکالت وترجمانی'' پر مبنی شمار ہوتا ہے، اور اس پر مذکورہ الزام دھرنا دراصل ''نفس کی بے جا وکالت وترجمانی'' کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

---

[1] الوكالة :وهى فى اللغة التفويض .وعرفها الفقهاء بأنها إقامة الإنسان غيره مقام نفسه فيما يقبل الإنابة(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج ١ ،ص ١٧٢ ،مادة"إبضاع"حرف الألف)

الوكالة بالفتح والكسر فى اللغة :الحفظ، ومنه الوكيل، فى أسماء الله تعالى بمعنى الحافظ، ومنه التوكل، يقال :على الله توكلنا، أى فوضنا أمورنا.

والتوكيل :تفويض التصرف إلى الغير، وسمى الوكيل وكيلا؛ لأن موكله قد فوض إليه القيام بأمره فهو موكول إليه الأمر .

وفى حديث الدعاء ، "اللهم رحمتك أرجو، فلا تكلنى إلى نفسى طرفة عين.

وفى الاصطلاح :عرفها الفقهاء بتعريفات متعددة .(الموسوعة الفقهية الكويتية، ج٤٥، ص٥، مادة"وكالة" حرف الواو)

اس طرح کے لوگ ’’اپنے نفس کی پیروی اور وکالت‘‘ کو چھپانے کے لئے دوسرے پر اس طرح کے الزامات دھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور یہ طبقہ کبھی یہ الزام عائد کرتا ہے کہ علی الاطلاق تکفیر نہ کرنے کے موقف اور اس کے دلائل سے شیعیت کو فائدہ اور سنیت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

مگر ان کم علم لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ جمہور اہل السنۃ کے موقف اور ان کے دلائل سے تو اہلُ السنۃ کو فائدہ پہنچا کرتا ہے۔

اور اگر ان لوگوں کو اپنے ہی جمہور محققین کی مخالفت کا زیادہ شوق ہے، تو پھر اس سے کس کو فائدہ اور کس کو نقصان پہنچے گا؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔

کبھی یہ تکفیری متشددین لوگ جمہور اہلُ السنۃ کے موقف اور ان کے دلائل کو بالکل غیر سنجیدہ اور انتہائی مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں۔

لیکن ان متشددین کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جمہور محققین اہل السنہ کے بیان کردہ موقف اور اس کے دلائل کو غیر سنجیدہ ومضحکہ خیز کہنے کی نسبت کس کی طرف لوٹتی ہے؟

اور کبھی یہ لوگ اس موقف کو محققین اہل سنت دیوبند کے خلاف قرار دیتے ہیں۔

جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان متشددین لوگوں کی نظر میں محققین اہلِ سنت دیوبند کا موقف، ان سابق جمہور اہلُ السنۃ کے خلاف ہے، جن کے متواتر حوالہ جات اس مسئلہ پر شاہدِ عدل ہیں۔

اور کبھی یہ لوگ جمہور اہل السنۃ کے موقف اور ان کے دلائل کے بیان کرنے کو اس میدان کے محققین اہل سنت دیوبند کی دیانت اور ان کی فہم پر اعتماد نہ ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

لیکن ان لوگوں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ خود ان لوگوں کو جمہور مجتہدین وفقہاء کی دیانت اور ان کی فہم پر کس قدر اعتماد ہے؟ اور اس خود ساختہ اصول کے نتیجہ میں تو امام ابوحنیفہ کے تلامذہ بھی زَد میں آجاتے ہیں، جنھوں نے سینکڑوں مسائل میں امام ابوحنیفہ سے اختلاف کیا، بلکہ ہر دور کے مذکورہ صفت کے حامل علماء واکابر پر یہی الزام عائد کرنا لازم آتا ہے۔

اور کبھی یہ لوگ اس موقف کو شیعہ مذہب کے اصولوں سے ناواقفیت، یا تجاہل پر مبنی قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ یہ لوگ دراصل خود ہی جس طرح اہل السنۃ متکلمین کے تکفیر کے احتیاط پر مبنی اصولوں سے ناواقف اور جاہل ہیں، اسی طرح شیعہ مذہب کے فرقوں اور اصولوں سے بھی ناواقف اور جاہل ہیں، اور الزام دوسرے پر عائد کرتے ہیں۔

اور کبھی یہ لوگ جمہور اہل السنہ کے موقف کے دفاع کو سنجیدگی، شرافت اور اخلاقیات کا اوڑھا ہوالبادہ اتارنے سے تعبیر کرتے ہیں۔

حالانکہ یہ تکفیری متشدد لوگ خود شروع سے ہی سنجیدگی، شرافت اور اخلاقیات سے محروم ہیں، اور جب ان کی غیر سنجیدہ باتوں کا کچھ صاف جواب دیا جاتا ہے، تو ان کو دوسرے میں عیب نظر آتے ہیں، یہ لوگ دراصل چاہتے ہیں کہ خود تو سب کچھ کہتے رہیں، اور دوسرا خاموش تماشائی بنا رہے۔

اور کبھی یہ لوگ اس موقف کے اختیار کرنے پر ''رنگ برنگی تحقیقات'' اور ''زیر تعمیر مجتہد'' کا طعنہ دیتے ہیں۔

جبکہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ ان کو اجتہاد کی حقیقت، اس کی اقسام وانواع، اور اس کے استمرار وانقطاع، اور اس کے حسن وقبح کے ابجد تک کا بھی علم نہیں۔

ان لوگوں نے اپنے متشددانہ تکفیری موقف سے اختلاف کرنے والے کو عار دلانے اور شرمندہ کرنے کی غرض سے، فرصت میں بیٹھ کر اس طرح کے جملے طعن وتشنیع کے طور پر گھڑے ہیں، حالانکہ یہ اہلِ باطل کا طریقہ ہے، اہلِ حق کا یہ طریقہ ہرگز نہیں، جس طرح اہلِ حق کو ''وہابی'' کہا جاتا ہے، اسی طرح سے اس طرح کے طعنوں کا بھی معاملہ ہے۔

جبکہ قیامت تک موجود رہنے والی جماعتِ حقہ کی یہ صفت ہے کہ وہ اس طرح کے ملامت کنندہ لوگوں کے طعنوں سے متاثر نہیں ہوتی، اور وہ طعنوں کے مقابلہ میں دلائل وبراہین سے غالب رہتی ہے۔

اور زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ یہ متشدد تکفیری گروہ جلیل القدر بزرگوں سے بھی نسبت رکھتا ہے، یا پھر ان کی طرف اپنا انتساب کرتا ہے، لیکن اس خارجی ذہنیت کے حامل گروہ کے طرزِ عمل، اور اندازِ کلام کا درحقیقت ان جلیل القدر بزرگوں سے دور کا تعلق نہیں ہوتا، اور محض

ظاہری ونسبی، یا زبانی وکلامی نسبت کا حقیقت سے تعلق نہیں ہوا کرتا۔

ہم یہ بات بار بار واضح کر چکے ہیں کہ اس طرح کے الزامات واتہامات کی بناء پر علمی دنیا میں یہ گروہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا، البتہ اپنے جیسے لوگوں میں اپنی بات کو موثر بنانے کے لئے اس طرح کی باتیں، وقتی ٹھنڈ اور نفس کی تسکین پیدا کرنے کے کام آ سکتی ہیں۔

یہ گروہ جس قدر اس مسئلہ میں شدت اختیار کرے گا، اسی حیثیت سے اس کا دلائل وبراہین سے جواب دیا جائے گا، یہی وجہ ہے کہ اس گروہ کی اس قسم کی حرکات کی وجہ سے کئی علمی وتحقیقی مضامین مجتمع ہوگئے، اور اگر یہ گروہ ایسی حرکات میں مبتلاء نہ ہوتا، تو شاید اس کی نوبت نہ آتی۔

اب یہ گروہ اپنی حرکات وسکنات سے بزبانِ حال یہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس جو بعض بزرگوں کی طرف سے تحریر شدہ مواد ہے، اس پر بھی دوسروں کی طرف سے جمہور محققین کے حوالہ جات وعبارات کی روشنی میں علمی وتحقیقی مواد پیش کیا جائے، تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ ان بزرگوں کا موقف کون کون سے اسلاف کے موافق، یا خلاف ہے، اور ایسی صورت میں کس کا موقف زیادہ راجح کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

اور ہم یہ بات متعدد مرتبہ باحوالہ واضح کر چکے ہیں کہ اس نوعیت کے مسائل میں اپنے چند بزرگوں کے مقابلہ میں اصل مجتہدین واسلاف کے قول کو راجح قرار دینے میں مذکورہ بزرگوں کی شان میں کسی قسم کی بے احترامی وبے ادبی کا عنصر نہیں پایا جاتا، لیکن یہ گروہ اپنی ہٹ دھرمی اور ضد پر بدستور قائم ہے، اگر اس گروہ کو اپنے اختیار کردہ اس مخترع اصول پر زیادہ ہی اصرار ہے، تو پھر دوسرے کو بھی یہ کہنے کا جواز پیدا ہوسکتا ہے کہ اس مخترع اصول کی رو سے تو مذکورہ بزرگ بھی اپنے بزرگوں کی بے احترامی وبے ادبی کے مرتکب ٹھہریں گے، جس کو یہ گروہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔

ہم دلائل کے ساتھ بار بار واضح کر چکے ہیں کہ کسی پر کفر کا حکم لگانے میں، انتہائی احتیاط کا حکم ہے، اور یہ آخری درجہ کا حکم ہے، جس پر دین دار محتاط شخص بآسانی جرأت نہیں کر سکتا۔

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’کفر آخری جرم ہے، اس کا فتویٰ بھی سب سے آخر میں ہے۔......

اگر کوئی مسلمان، کسی کافر کو زندگی بھر کافر نہ کہے، تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں، اور اگر کسی مسلمان کو کافر کہہ دے، تو اس پر شدید مواخذہ ہے‘‘ (ملفوظات فقیہ الامت، ج۱، ص۱۹، قسط سادس، مسائلِ فقہیہ، مکتبہ: دارالایمان سہارن پور، یوپی، انڈیا، سنِ اشاعت ۲۰۰۲ء)

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

’’اگر کسی شخص کے کلام کی ننانوے توجیہ کفر کی ہوسکتی ہوں، اور ایک توجیہ کفر کی نہ ہوسکتی ہو، تو اس کی تکفیر نہ کریں گے‘‘ (ملفوظات فقیہ الامت، ج۱، ص۴۵، مآثر علمیہ، مکتبہ: دارالایمان سہارن پور، یوپی، انڈیا، سنِ اشاعت ۲۰۰۲ء)

اور ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، اس میں سوشل میڈیا کے ذریعہ معلومات کو خوب پھیلایا جاتا ہے، جس سے بعض لوگ یہ گمان کرلیتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں علم خوب پھیل گیا ہے۔

حالانکہ اس قسم کی معلومات کو ’’حقیقی علم‘‘ سمجھ لینا ہی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ’’حقیقی علم‘‘ سے جہالت بہت پھیل گئی ہے، ہر طرف جہالت کے گہرے بادلوں نے سایہ کر رکھا ہے، جو مقامات کسی زمانے میں علم کے مراکز شمار کئے جاتے تھے، وہاں بھی جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے، جو حضرات اپنے زمانہ میں علم کے پہاڑ شمار کئے جاتے تھے، ان کے بہت سے پسِ ماندگان، نسبی وارثان، جانشین، ومریدین، اور خلفائے کرام بھی علم کے نام پر جہالت میں مبتلاء ہیں۔

احادیث میں اس طرح کے حالات کی بہت پہلے پیش گوئی فرمادی گئی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْزِعُ الْعِلْمَ مِنَ النَّاسِ بَعْدَ أَنْ يُّعْطِيَهُمْ إِيَّاهُ، وَلٰكِنْ يَذْهَبُ بِالْعُلَمَاءِ، كُلَّمَا ذَهَبَ

عَـالِـمٌ ذَهَبَ بِمَا مَعَهُ مِنَ الْعِلْمِ، حَتّٰى يَبْقَى مَنْ لَا يَعْلَمُ، فَيَتَّخِذَ النَّاسُ رُؤَسَـاءَ جُهَّـالًا، فَيُسْتَفْتَوْا، فَيُفْتُوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَيَضِلُّوْا، وَيُضِلُّوْا (مسند احمد، رقم الحديث ٦٨٩٦) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ لوگوں کو علم عطاء فرمانے کے بعد ان سے علم کو نہیں چھینتا، مگر علماء کو لے جاتا (یعنی علماء کو وفات دے دیتا) ہے، جب جب بھی کوئی عالم چلا جاتا ہے، تو اس کے ساتھ علم بھی چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ لاعلم لوگ ہی باقی رہ جاتے ہیں، جس کے بعد لوگ ''جاہلوں'' کو ہی رئیس (یعنی اپنا بڑا، استاذ، پیر، شیخ، مفتی وغیرہ) بنا لیتے ہیں، پھر وہ لوگ ان جاہلوں سے فتویٰ حاصل کرتے ہیں، اور وہ جاہل ان کو بغیر علم کے فتویٰ دیتے ہیں، پھر وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں، اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں (مسند احمد)

صحیح بخاری میں بھی اس طرح کی حدیث مروی ہے۔ [2]

28-شعبان المعظم-1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 20 شمارہ 10، مئی 2023ء - شوال المکرّم 1444ھ)

---

(210)

معتدل اہلِ فکر سے، غیر معتدل اہلِ فکر کی شکایت

لاہور کے ایک شمارہ میں بندہ محمد رضوان کے متعلق ایک صاحب کی یک صفحاتی نمایاں تحریر

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: إسناده صحيح على شرط الشيخين (حاشية مسند احمد)

[2] عن عروة قال: حج علينا عبد الله بن عمرو، فسمعته يقول: سمعت النبى صلى الله عليه وسلم يقول: إن الله لا ينزع العلم بعد أن أعطاهموه انتزاعا، ولكن ينتزعه منهم مع قبض العلماء بعلمهم، فيبقى ناس جهال، يستفتون فيفتون برأيهم، فيضلون ويضلون (صحيح البخارى، رقم الحديث ٧٣٠٧، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب ما يذكر من ذم الرأى وتكلف القياس)

شائع ہوئی، جس میں پہلے بھی ایک صفحہ پر بندہ کے متعلق اسی نوعیت کا یک صفحاتی مضمون شائع ہوا تھا، اور اس پر بندہ پہلے کلام کر چکا ہے، اس تازہ شمارہ کے مضمون میں، درجِ ذیل عنوان قائم کیا گیا:

''مولانا مفتی محمد رضوان کی تحریرات میں اعتدال نہیں ہے''

پھر اس عنوان کے ضمن میں عصرِ حاضر کے ایک صاحبِ علم کا یہ قول نقل کیا گیا کہ انہوں نے بندہ کے متعلق صاحبِ تحریر سے ٹیلی فون پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ان میں اعتدال نہیں ہے''

اور اس بے اعتدالی کے شکوہ کی اصل وجہ صاحبِ تحریر کی طرف سے ان الفاظ میں درج کی گئی کہ:

''مفتی رضوان صاحب بڑے زور شور سے اپنی تحریرات کے ذریعہ اہلِ تشیع کو تقویت وفائدہ پہنچا رہے ہیں''

اور اس کے بعد صاحبِ تحریر کی طرف سے مذکورہ مدعا کا نتیجہ ان الفاظ میں تحریر فرمایا گیا کہ:

''بندہ جملہ اہلِ اسلام، خصوصاً برادرانِ اہلِ سنت سے گذارش کرتا ہے کہ جو حضرات چودہ سو سال کے علمائے اہلِ سنت کی تحقیقات کے مطابق مذہبِ اہلِ سنت، مسلکِ احناف اور مشربِ دیوبند سے اپنے آپ کو وابستہ وپیوستہ رکھنا چاہتے ہیں، وہ مفتی محمد رضوان صاحب کی تحریرات وتحقیقات کو ہرگز قابلِ اعتماد نہ سمجھیں''

اور پھر اس تحریر کا اختتام اس دعاء پر کیا گیا کہ:

''اللہ تعالیٰ مفتی رضوان صاحب کی بے اعتدالیوں سمیت ہر قسم کی بے اعتدالیوں سے امتِ مسلمہ کی حفاظت فرمائیں''۔

جو کچھ اس تحریر کے ضمن میں باتیں لکھی گئیں، ان پر مدلل ومفصل کلام کی گنجائش ہے، لیکن سرِ دست صرف اتنا عرض ہے کہ بے اعتدالی تو واقعتاً ہر معاملہ میں قابلِ شکایت چیز ہے، جس میں اہلِ انصاف وذی شعور کی دو رائے ہونا مشکل ہے، لیکن اس قسم کی شکایت تو آج کے غیر

معتدل مزاج زمانہ میں ہر شخص کو اپنے موقف سے مخالفت کرنے والے کو ہے، ہر شخص اپنے پسندیدہ موقف کے مخالف کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہے، اگر وہ زبان سے اس کا اظہار نہ کرے، لیکن کم از کم دل میں تو اس کا شکوہ رکھتا ہی ہے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اعتدال کا معیار بھی ہر شخص کے نزدیک اس کا پسندیدہ موقف ہی ہوگا، پھر اس معیار کے مطابق ہر مخالف موقف کا حامل دوسرے کی نظر وفکر میں ''غیر معتدل'' شمار ہوگا، اور ان میں سے ہر ایک اپنی نظر وفکر کے مطابق اپنے نزدیک ''معتدل'' شمار ہوگا، اور اس طرح اعتدال کا کوئی بھی جامع ومانع معیار طے نہیں ہوسکے گا، جب تک کسی کی طرف سے ایسی مؤثر شرعی دلیل پیش نہ کی جائے، جو دوسروں کی دلیل پر غالب ہو، اور اس کو قبول کرنے میں ضد وعناد اور تعصب وتحزب سے بالاتر ہوکر عدل وانصاف کو بروئے کار نہ لایا جائے، جو آج تعصب وتحزب اور غلو ومبالغہ آرائی کے دور میں ''عنقا'' ہوتا جارہا ہے۔

جہاں تک ''مذہبِ اہلِ سنت'' کا تعلق ہے، تو اس کو اہل السنۃ والجماعۃ محققین نے صدیوں پہلے اپنی تالیفات وتحریرات میں بیان فرمادیا ہے، اور اس سلسلہ میں جو باہمی فرعی نوعیت کے اختلافات ہیں، ان کی نشاندہی بھی فرمادی ہے، اور اہل السنۃ والجماعۃ سے وابستہ لاکھوں کروڑوں افراد مختلف مسالک ومشارب کی شکلوں میں الحمد للہ تعالیٰ دنیا کے کونوں کونوں میں پھیلے ہوئے ہیں، جن میں اہلِ حق کے مختلف مسالک سب ہی داخل ہیں، اور اس سلسلہ میں اہل السنۃ والجماعۃ کے باہمی فروعی نوعیت کے ان اختلافات کو مسلکِ اہلِ سنت سے خارج سمجھنے والا دراصل خود ہی غیر معتدل کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

ترجمانِ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' نامی مفصل کتاب کے مقدمہ میں ''دیوبند'' کے علمی مسلک کی توضیح وتشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> مدرسہ دیوبند کے اس جامع اور معتدل فکر، یا مسلک کا مقصد اور مطمحِ نظر ہندوستان کے تمام مسالکِ حقہ اور اہلِ مسالک کو باہم جوڑنا تھا، جبکہ اس وقت

ملک میں جماعتی تشتّت، جزوِ مسلک بنا ہوا تھا، اور سارے مسالک اور مسالک والے مسلکی تفاوت کی وجہ سے باہم دست وگریبان تھے، الا ماشاء اللّٰہ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص ۲۷، مقدمہ، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، کراچی)

مذکورہ تالیف کے مقدمہ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:

تمام ائمہ کے فقہی مراتب بحیثیتِ مجموعی اس (دیوبندی) مسلک میں آجاتے ہیں، زیادہ سے زیادہ راجح ومرجوح، یا افضل ومفضول، یا اصل وفرع، یا عزیمت و رخصت کا فرق نکل سکتا ہے، البتہ کہیں کہیں جائز وناجائز کا بھی فرق پیدا ہوتا ہے، مگر قلیل، سواس سے فقہ حنفی کی جامعیت اور دوسرے فقہوں کے برحق ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، خواہ دونصوص باہم متعارض ہوں، یا ایک ہی نص کے دو پہلو فقہی طور پر متعارض ہوں، اس لیے اجتہادی فروعات میں اختلاف تو ہوجاتا ہے، مگر خلاف ونزاع کی کوئی شکل پیدا نہیں ہوسکتی کہ کسی فقہی مسلک سے اعراض، یا گریز کی تہمت آئے، اس لیے ائمہ اجتہاد کی حقانیت وعظمت بھی ان کی شان کے مناسب قائم رہتی ہے، اوران کے فقہی مسلک کی صداقت وعظمت اور تعظیم وتوقیر میں بھی فرق نہیں آتا، پھر یہ اختلاف بھی حق وباطل کا نہیں ہوتا کہ باعثِ کش مکش ہو، بلکہ محض (اجتہادی وظنی) خطأ وصواب کا ہوتا ہے، جن میں سے کوئی بھی پہلو اجر سے خالی نہیں، اور ظاہر ہے کہ جب سارے فقہوں اور فقیہوں کے اجتہادات اس طرح ایک مرکز پر جمع ہوکر درجہ بدرجہ اپنے اپنے مقام ومرتبہ کے مناسب قائم رہتے ہیں، تو نہ صرف یہ کہ نزاع وجدال کے رخنے مسدود ہوجاتے ہیں، بلکہ قدرِ مشترک کے طور پر ایک **ما بہ الاتحاد** بھی پیدا ہوجاتا ہے، جس کے تحت یہ سارے فقہ اور فقہی مراتب نہ صرف معتبر ہی ٹھہرتے ہیں، بلکہ ایک مرکز پر سمٹ آتے ہیں، جو اس (دیوبندی) مسلک کی جامعیت کی کھلی دلیل ہے۔ رہے فرَقِ

www.idaraghufran.org

حقۂ اسلامیہ جو اصول و مبانی میں متحد رہ کر فروعی عقائد کے معانی میں بتقضائے قواعدِ شرعیہ کچھ مختلف ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس کا منشاء بھی اجتہادی نظر وفکر ہی ہے، جس سے بتفاوتِ اجتہاد، متفاوت نظریات قائم ہو کر عقیدے کی صورت اختیار کر لیں، اور وہ فرقہ سمجھے جانے لگیں، دراں حالیکہ وہ فرقہ نہیں ہوتے، جبکہ تمام اصول اور مبانیِ اسلام میں متحد ہیں۔لیکن حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحب رحمہ اللہ کا مسلک، جبکہ جامع نص واجتہاد ہے، تو ان فروعی عقائد کا بھی کوئی اجتہادی پہلو جب تک کہ شریعت کے بنیادی اصول اور اساسی قواعد وضوابط سے متصادم نہ ہو، نا قابلِ قبول نہیں رہتا، بجز اس کے کہ اس پہلو کو مسئلہ کا بنیادی مقام دینے کے بجائے، اُسے ضمنی، فرعی مقام پر رکھ دیا جائے، ترک نہیں کیا جاتا، اس طرح سے کوئی بھی حقانی فرقہ اور اس کا کوئی بھی اعتقادی مسئلہ، جبکہ تھوڑی سی توجیہ کے بعد اس مسلک سے باہر نکلنے نہیں پاتا، صرف مقصدی اور غیر مقصدی درجہ کا فرق باقی رہ جاتا ہے، تو اسے بھی کلیۃً متروک کر دینے کی صورت پیدا نہیں ہوتی، جبکہ وہ کسی نص کے محتملات، یا کسی شرعی اصول کی فرعیات کے دائرہ میں ہے، اس لیے اس جامع مسلک میں یہ اسلامی فرقے بھی اصل فرقۂ حقہ سے کلیۃً جدا نہیں ہوتے، بلکہ اس سے قریب تر ہو جاتے ہیں، صرف فرقِ باطلہ ہی باہر رہ جاتے ہیں، جو حق کے دائرہ میں داخل ہی ہونا نہیں چاہتے (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص۲۹و۳۰، مقدمہ)

اور ترجمانِ دارُالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ اپنی تالیف ''علماءِ دیوبند کا دینی رُخ اور مسلکی مزاج'' میں تحریر فرماتے ہیں:

شرعی مذاہب میں مذہبِ اہل سنت و الجماعت، بلحاظِ اساس و بنیاد اعدلُ المذاہب ہے، اور اس کے پیرو خواہ وہ حنفیہ ہوں یا شافعیہ، مالکیہ ہوں، یا حنابلہ، بہ تفاوتِ اصولِ تفقّہ، اہلُ السنّت و الجماعت ہیں (علماء دیوبند کا دینی رُخ و مسلکی مزاج، ص۲۵، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، باراول، ذوالقعدہ 1408ھ، جولائی 1988ء)

حضرت موصوف ہی مندرجہ بالا تالیف میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

ان (علمائے دیوبند) کا جماعتی مزاج معتدل بھی ہے اور متوسط بھی، جس میں نہ غلو ہے نہ مبالغہ، اور اس توسط اور وسعتِ نظری کی بدولت نہ ان کا مشغلہ تکفیر بازی ہے، نہ دشنام طرازی، نہ کسی کے حق میں سبّ وشتم اور تبرّا ہے، نہ بدگوئی، نہ عناد وحسد اور طیش ہے، نہ غلبۂ جاہ و مال سے افراطِ عیش، بلکہ صرف بیانِ مسئلہ اور حقائقِ بیانی، یا احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہے، اور بالفاظِ مختصر اصلاحِ امت اور اتحاد بین المسلمین ہے، جس میں نہ متخالف شخصیات کی تحقیر اور بدگوئی ہے، نہ ان پر مغرورانہ طعن و استہزاء کا، نہ ان کے بیانات وخطابت کا موضوع مخالفِ مسلک طبقات سے خواہ مخواہ الجھنا اور عوام کو ان سے نفرتیں دلاتے رہنا اور ان کے خلاف ہمہ وقت عوامی جذبات کو مشتعل کرتے رہنا ہے، جبکہ ان کی زبانیں بیانِ مسائل ہی سے فارغ نہیں، تو ان خرافات کے لیے وہ فرصت کہاں سے پاتے۔ تکفیر بازی تو بجائے خود ہے، ان کے یہاں سِرے سے ان اشخاص کا ذکر و تذکرہ تک بھی زبانوں پر نہیں ہوتا، جو ہمہ وقت ان کی بدگوئی میں لگے رہتے ہیں، پس انہی اوصاف واحوال کا مجموعہ نام ''دارالعلوم دیوبند'' ہے، اور اسی علمی وعملی اور عقلی و اخلاقی ہمہ گیری سے اس کا دائرۂ اثر دنیا کے تمام ممالک تک پھیلا ہوا ہے (علمائے دیوبند کا دینی رُخ اور مسلکی مزاج، ص ۱۹۲ و ۱۹۳، بعنوان: فقہ اور فقہاء، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، بارِاول، ذوالقعدہ 1408ھ، جولائی 1988ء)

اور مشائخِ دیوبند کے عظیم محدث علامہ انور شاہ کشمیری ''سننُ الترمذی'' کی شرح ''العرفُ الشذی'' میں ''ما انا علیه واصحابی'' کا مصداق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فالحاصل أن الكلية مدخولة وبالجملة الآن مصداق الحديث اتباع المذاهب الأربعة والظاهري، وطريق معرفة ما أنا عليه

www.idaraghufran.org

وأصحابی توارث السلف وتعاملهم وإذا اختلفوا فی شیء فالحق إلی الطرفین. واللہ أعلم (العرف الشذی شرح سنن الترمذی، ج۴، ص ۱۲۶، کتاب الإیمان، باب ما جاء فی افتراق هذه الأمة)

ترجمہ: بہرحال آج کے زمانے میں مذکورہ حدیث (جس میں فرمایا گیا کہ "جس طریقہ پر میں اور میرے صحابہ ہیں") کا مصداق "مذاہبِ اربعہ اور مذہبِ ظاہری" (سب ہی) ہیں، اور "ما انا علیہ واصحابی" کی پہچان کا راستہ سلف کا توارث اور ان کا تعامل ہے، اور جب سلف کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو، تو حق دونوں جانب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم (العرف الشذی)

ہم الحمدللہ تعالیٰ مندرجہ بالا اور ان جیسی تصریحات کے معیار کے مطابق موقف رکھتے ہیں، خواہ وہ اہلِ تشیع کی تکفیر وعدمِ تکفیر کا مسئلہ ہو، یا کوئی دوسرا مسئلہ ہو، جس کے متعلق ہمارے پاس الحمدللہ تعالیٰ جمہور اہلُ السنۃ والجماعۃ سمیت اکابر ومشائخ کی بے شمار دلائل وتصریحات موجود ومطبوع ہیں۔

چنانچہ اہلِ تشیع کے بارے میں ہمارے معتدل موقف کا خلاصہ مفتیِ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے دارالعلوم دیوبند، سے مورخہ ۱۳۶۱/۲/۱۶ھ کے محرر شدہ درجِ ذیل انتہائی معتدل فتوے کے مطابق ہے:

شیعوں میں اس قدر مختلف فرقے ہوئے ہیں اور ہیں کہ ہر ایک کے عقائد و خیالات کا احاطہ دشوار ہے، پھر ہر فرقے کی کتابیں مختلف خیالات واستدلالات سے پُر ہیں، اس لیے ہمارے اکابر نے بنظرِ احتیاط موجودہ شیعوں پر کوئی مستقل حکم کرنے سے اس وقت تک احتراز کیا ہے، جب تک اس کا خاص عقیدہ معلوم نہ ہو جاوے، خواہ تفصیلاً، یا یہ کہ "میں ان تمام عقائد کا پابند ہوں، جو فلاں فرقے کی فلاں کتاب میں مذکور ہیں"۔

بغیر اس کے ہر شیعہ پر پچھلے شیعوں کی خرافات کو لازم کردینا، احتیاط کے خلاف ہے۔ شیعوں کی کتابوں میں تحریفِ قرآن کا عقیدہ بے شک مذکور ہے، مگر موجودہ ہر شیعہ پر بر بناءِ مذکور، یہ از خود لازم نہیں کیا جاسکتا، جب تک وہ اس کی تصریح نہ کرے۔ اور اگر وہ انکار کرتا ہے، خواہ تقیہ ہی سے سہی، تو ہمارے لیے چارہ نہیں کہ ہم اس کے قول وفعل کا اعتبار کریں، تقیہ ونفاق کا تعلق قلب سے ہے، اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔ بناءً علیہ ہم تمام شیعوں پر حکم، کفر کا نہیں کرسکتے (امداد المفتیین جامع، جلد۱، صفحہ نمبر ۵۶۳، کتاب الایمان، بعنوان ''شیعوں کے بارے میں مطلقاً کفر کا حکم لگانا'' ناشر: ادارۃ المعارف، کراچی، طبع جدید: ذوالقعدۃ ۱۴۳۹ھ، اگست ۲۰۱۸ء)

نیز ہمارے اس معتدل موقف کا حاصل وفاقُ المدارس العربیہ، پاکستان کے موجودہ صدر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے درجِ ذیل فتوے کے مطابق ہے:

چودہ سو سال میں علمائے اہلِ سنت کی اکثریت شیعوں کو علی الاطلاق کافر کہنے کے بجائے، یہ کہتی آئی ہے کہ جو شیعہ ایسے کافرانہ عقائد رکھے، کافر ہے۔

اور یہی طریقہ بیشتر اکابر علمائے دیو بند کا رہا ہے۔

اور چونکہ جمہور علماء کے اس طریقے میں کوئی تبدیلی لانے کے لیے کافی دلائل محقق نہیں ہوئے، اس لیے دارالعلوم کراچی، مفتیِ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے وقت سے اکابر کے اسی طریقے کے مطابق فتویٰ دیتا آیا ہے کہ جو شیعہ اِن کافرانہ عقائد کا قائل ہو، وہ کافر ہے، مگر علی الاطلاق ہر شیعہ کو خواہ اس کے عقائد کیسے بھی ہوں، کافر قرار دینے سے جمہور علمائے امت کے مسلک کے مطابق احتیاط کی ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیعوں کی گمراہی میں کوئی شبہ ہے، جن شیعوں کو کافر قرار دینے سے احتیاط کی گئی ہے، بلاشبہ وہ بھی سخت ضلالت وگمراہی میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان گمراہیوں سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائیں۔آمین۔

والسلام۔۱۴/۱/۱۴۱۲ھ

(فتاویٰ عثمانی، ج۱،ص۹۸، کتاب الایمان والعقائد،فصل فی الفرق والاحزاب الاسلامیۃ والباطلۃ والأشخاص المتعلقین بھا، مطبوعہ: مکتبہ معارف القرآن کراچی، سنِ طباعت: جولائی2006ء)

اوراس معتدل موقف کے مقابلہ میں موجودہ دور میں ایک غالی ومتشدد تکفیری طبقہ دنیا بھر میں پائے جانے والے تمام کروڑوں اہلِ تشیع پر کفر کا حکم لگانے میں نہایت غلو ومبالغہ سے کام لیتا ہے،اور ہمارے اختیار کردہ موقف کوکسی طرح معتدل ماننے کے لئے آمادہ نہیں،اوراس کے برعکس نہایت زورشور سے اپنی تحریرات میں مسلسل ”تکفیر بازی، دشنام طرازی، سبّ وشتم، بد گوئی، عناد وحسد اور طیش، مخالف کی تحقیر اور بد گوئی، مغرورانہ طعن واستہزاء، خواہ مخواہ الجھنے اور نفرتیں دلانے اور ہمہ وقت عوامی جذبات کومشتعل کرتے رہنے کے مشغلہ میں مبتلاء ہے۔

اور ہماری طرف سے اس غلو ومبالغہ کا مدلل ومفصل انداز میں علمی وتحقیقی جواب تحریر کیا جارہا ہے،جس پر اس طبقہ کی طرف سے ہم پر بے اعتدالی اور اہلِ تشیع کوتقویت وفائدہ پہنچانے کا الزام عائد کیا جاتا ہے،حالانکہ اگر اس الزام کو حقیقت اور عدل وانصاف پر مبنی قرار دیا جائے،تو پھراس کی نسبت، درِ پردہ ہزاروں سالوں پر مشتمل اہلِ سنت کے ان جمہور ائمہ مجتہدین اوران کے،ان لاتعداد متبعین،اورخود متعدد دیوبند کے اکابر، یہاں تک کہ اپنے ہی مسلک ومشرب کے وفاق المدارس العربیہ کے صدرِ محترم کی طرف کرنا لازم آتا ہے،اس لئے ہم اس طرح کے الزام کوکسی طرح بھی معتدل نہیں سمجھتے، بلکہ ”نہایت غیر معتدل“ سمجھتے ہیں،اور ہم ببانگِ دہل اعلان کرتے ہیں کہ اہلُ السنۃ والجماعۃ کے معتدل ومتوسط موقف کی ترجمانی کرنے سے امتِ مسلمہ ہمہ جہتی دنیا وآخرت کے فوائد وثمرات سے مستفید ہوتی ہے،اوران گنت مضرات ومفاسد سے محفوظ رہتی ہے،اوراس کے برعکس ”تکفیر بازی کے مشغلہ، دشنام طرازی، سبّ وشتم، تبرّا، بدگوئی، عناد وحسد اور طیش، مخالف کی تحقیر اور بدگوئی،

مغرورانہ طعن واستہزاء، مخالف سے خواہ مخواہ الجھنے اور عوام کو نفرتیں دلاتے رہنے اور ہمہ وقت عوامی جذبات کو مشتعل کرتے رہنے، جیسی غیر معتدل خصلتوں سے امتِ مسلمہ دنیا وآخرت کے بڑے بڑے نقصانات سے دوچار ہوتی ہے، اور ہو چکی ہے‘‘۔

باقی عصرِ حاضر کے جن صاحبِ علم کی طرف سے اعتدال نہ ہونے کا شکوہ نقل کیا گیا، وہ ان صاحب کے بقول ٹیلی فون پر نجی گفتگو سے متعلق ہے، خود ان صاحبِ علم کی طرف سے باقاعدہ کوئی تحریر نہیں، لہٰذا فی الحال اس پر متعین اور تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کو مندرجہ بالا عبارات وحوالہ جات کے مطابق وسعتِ نظری کے ساتھ غلو ومبالغہ سے پاک ہو کر معتدل اور متوسط اصولوں پر عمل پیرا ہونے، اور ان پر متحد ہونے، اور بے اعتدالی کی غیر معتدل شکایت سے نجات کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔ 10- شوال المکرّم- 1444ھ

(ماہنامہ ’’التبلیغ‘‘ جلد 20 شمارہ 11، جون 2023ء - ذوالقعدۃ 1444ھ)

---

(211)

ٹوپی اور وتر سے متعلق دو احادیث کی سندی توضیح

ہماری تالیف ’’ٹوپی کی شرعی حیثیت‘‘ طباعت: اپریل 2013ء، کے صفحہ نمبر 18 پر یہ روایت درج کی گئی ہے:

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الشِّتَاءِ فَوَجَدْتُهُمْ يُصَلُّوْنَ فِي الْبَرَانِسِ وَالْأَكْسِيَةِ وَأَيْدِيهِمْ فِيهَا (المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث ٨٦١، ج١٨ ص ٣٣٦، باب الفاء)

ترجمہ: میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سردی کے موسم میں حاضر ہوا،

تو میں نے ان (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام) کو دیکھا کہ وہ لمبی ٹوپیوں اور چادروں میں نماز پڑھتے تھے، اوران کے ہاتھ چادروں کے اندر رہتے تھے (طبرانی)

درجِ بالا حدیث کی سند اس طرح ہے:

حدثنا محمود بن محمد الواسطی، ثنا زکریا بن یحیی زحمویه ثنا شریک، عن عاصم بن کلیب، عن أبیه، عن خاله، قال:أتیت الخ.

اس روایت کی سند میں ''عاصم بن کلیب'' اپنے والد ''کلیب'' سے، جو ''عن خالہٖ'' کے ساتھ روایت کرتے ہیں، اس میں ''خالہٖ'' سے مراد صحابیِ رسول ''فلتان بن عاصم'' ہیں، یعنی یہ روایت ''فلتان بن عاصم رضی اللہ عنہ'' سے مروی ہے، جبکہ ہماری اس تالیف میں تسامح کی بنیاد پر ان صحابی کا نام ''وائل بن حجر'' تحریر کیا گیا ہے، البتہ اس کے بعد والی روایات میں ''عاصم بن کلیب'' نے اپنے والد ''کلیب'' سے، جو روایت کی ہے، وہ دوسرے صحابیِ رسول ''وائل بن حجر'' سے مروی ہے۔

آئندہ ایڈیشن میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کردی جائے گی۔

اسی طرح ہماری تالیف ''نمازِ وتر کے فضائل واحکام'' کے پہلے ایڈیشن میں مندرجہ ذیل عبارت شائع ہوئی ہے:

ابنِ ابی الدنیا، حضرت شجاع بن مخلد سے اور وہ حضرت ہشیم سے اور وہ حضرت یونس بن عبید سے اور وہ حضرت حسن سے اس طرح روایت کرتے ہیں کہ:

كَانُوْا يُصَلُّوْنَ فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً، وَالْوِتْرَ ثَلَاثًا (فضائل رمضان لابنِ ابی الدنیا، حدیث نمبر ۴۸، ص۷۸، دار السلف، الریاض -السعودیة)

ترجمہ: (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں) رمضان کے مہینہ میں لوگ بیس رکعات تراویح اور تین رکعات وتر پڑھا کرتے تھے (ترجمہ ختم)

اس روایت کے تمام راوی انتہائی اعلیٰ درجہ کے معتبر اور ثقہ راوی ہیں (نمازِ وتر کے فضائل واحکام، ص۱۲۰، ۱۲۱، مطبوعہ: ادارہ غفران، راولپنڈی، ستمبر 2011)

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مذکورہ روایت کی سند کے نقل کرنے میں تسامح ہو گیا ہے۔

ابنِ ابی الدنیا کی ''فضائلِ رمضان'' میں دراصل، آگے پیچھے دو روایات موجود ہیں، مذکورہ روایت کا متن، اگلی روایت میں ہے، اور اس کی سند، تسامحاً پچھلی روایت کی شائع ہو گئی ہے۔

ان دونوں روایات کی سند اور متن درج ذیل ہے:

حدثنا شجاع بن مخلد، قال: ثنا هشيم، قال: أنا يونس بن عبيد، عن الحسن: " أن عمر بن الخطاب جمع الناس على أبى بن كعب، فكان يصلى بهم عشرين ليلة من الشهر، ولا يقنت بهم إلا فى النصف الثانى، فإذا كانت العشر الأواخر تخلف يصلى فى بيته، فكانوا يقولون: أبق أبى ".

حدثنا شجاع بن مخلد، قال: ثنا هشيم، قال: أنبا عبد الملك، عن عطاء بن أبى رباح، قال: كانوا يصلون فى شهر رمضان عشرين ركعة، والوتر ثلاثا (فضائل رمضان،لا بن ابى الدنيا، رقم الرواية، ۴۸، ۴۹، ص ۷۸ وص ۷۹،القيام فى شهر رمضان)

ان شاءاللہ تعالیٰ، اگلی مرتبہ اس کی بھی اصلاح کردی جائے گی۔یکم- محرم الحرام-1445ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 21 شمارہ 1، اگست 2023ء - محرم الحرام 1445ھ)

---

(212)

یزید پر لعنت

کسی پر لعنت بھیجنے کا معاملہ بہت احتیاط پر مبنی ہے، اسی بناء پر بہت سے حضرات نے یزید پر لعنت سے اجتناب کیا، حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے فتاویٰ عزیزیہ میں ''امام احمد بن حنبل'' اور ''علامہ کیاہراسی'' سے یزید پر لعنت کا جواز نقل کیا ہے، شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی ''اشعةُ اللمعات'' شرح مشکوۃ میں جگہ جگہ یزید پلید لکھا ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہ کا مسلک سکوت وتوقف ہے، حضرت گنگوہی نے بھی فتاویٰ

رشیدیہ میں لعنت کرنے سے منع کیا ہے، جس کا مبنیٰ توقف ہی ہے۔ امام غزالی نے اپنی تصنیف ''احیاءُ العلوم '' میں لکھا ہے کہ یزید وحجاج، حتیٰ کہ ابلیس پر لعنت کرنے سے کیا فائدہ؟ سبحان اللّٰہ ، الحمد للّٰہ کہا جائے، تو اس میں فائدہ ہے'' (ملفوظات فقیہ الامت ج۱ص۳۴، مسائلِ فقہیہ، مکتبہ: دارالایمان سہارن پور، یوپی، انڈیا، سنِ اشاعت۲۰۰۲ء)

10- محرم الحرام-1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد21 شمارہ02، ستمبر 2023ء - صفر المظفر 1445ھ)

---

(213)

نفل نماز با جماعت

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ، اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں:

حضرت مدنی کے یہاں تہجد کی نماز میں توسع تھا، بڑی جماعت ہوجاتی تھی، اسی طرح تراویح کے بعد، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، اپنے ایک شاگرد کو لے کر کھڑے ہوجاتے تھے، ان کے پیچھے نوافل میں ایک بڑی جماعت ہوجاتی تھی، اُدھر مولانا اسعد صاحب ، اپنے بھائی مولانا ارشد صاحب کو لے کر کھڑے ہوجاتے تھے، ان کے پیچھے ایک بڑی جماعت ہوجاتی تھی، خود مسجدِ نبوی میں امام صاحب تہجد میں سناتے تھے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ اللَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ ''

اس لئے تہجد کا جماعت سے پڑھنا ثابت ہے، جس چیز کو قرآن پاک بیان کررہا ہے، اس کو تو مستقلاً مانا جائے گا (ملفوظات فقیہ الامت، جلد اول، ص۱۱۵، ما یتعلق بالقرآن، ناشر: دارالہدیٰ: اردو بازار، کراچی، تاریخِ اشاعت: ستمبر۲۰۰۵ء)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ اور بعض دیگر اکابر حضرات نفل نماز باجماعت، اور بالخصوص تہجد کی نماز باجماعت اداء کرنے میں توسع کے قائل تھے، اور اس پر عمل کیا کرتے تھے، جبکہ یہ طرزِ عمل مشائخِ حنفیہ کے مشہور قول کے مطابق مکروہ تھا، لیکن اس کے باوجود دیگر علمائے اکابر نے اس طرزِ عمل پر اس طرح نکیر نہیں کی، جس طرح آج کل کے حضرات نکیر کرتے ہیں، کیونکہ ان کا علم وسیع تھا، اور وہ جانتے تھے کہ یہ مسئلہ فقہائے کرام ومجتہدینِ عظام کے نزدیک اختلافی واجتہادی ہے، جس کے بارے میں دوسرے فقہاء ومجتہدین کے پاس بھی شرعی وفقہی دلائل ہیں، اور اس طرح کے مسائل پر نکیر نہیں کی جایا کرتی، اور آج کل جو حضرات نکیر کرتے ہیں، ان کی نظر محض اپنے فقہ پر ہوتی ہے، جس کی بناء پر وہ اس قسم کے مسائل میں دوسرے پر نکیر، یا سختی کرتے ہیں۔

اس موضوع پر بندہ کا ایک رسالہ ''علمی وتحقیقی رسائل'' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

20- محرم الحرام-1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد21 شمارہ02، ستمبر 2023ء - صفر المظفر 1445ھ)

---

(214)

احمد رضا خانصاب کی تکفیر

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت تھانوی نے فرمایا کہ اکابر نے ان (مولوی احمد رضا خان وغیرہ) کی تکفیر نہیں کی، لیکن مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری نے فرمایا کہ میں ان کی تکفیر کرتا ہوں، اس وجہ سے کہ اکابر کے سامنے ان کی وہ چیزیں نہ آئی تھیں، جو موجبِ تکفیر ہیں، اور مولانا موصوف کے سامنے وہ چیزیں آئیں، اس لئے انہوں نے تکفیر کردی'' (ملفوظات فقیہ الامت، جلد دوم، ص ۳۲۹، دارالہدیٰ: اردو بازار، کراچی، تاریخِ اشاعت ۲۰۰۵ء)

معلوم ہوا کہ اگر کسی عالم کی تحقیق کسی کی تکفیر کی ہو، اور اس کو کفر والے احتمال پر ہی اطمینان ہو، اور وہ ممکنہ تاویل کا قائل نہ ہو، اور وہ یہ سمجھے کہ دوسرے علماء، کو اس کے کفریہ قول پر اطلاع نہیں ہوئی، تو وہ اس کا موقف ہوگا، لیکن اس کا قول دوسرے پر حجت نہ ہوگا، جیسا کہ اس بنیاد پر بعض حضرات، بریلوی مکتبِ فکر والوں کی تکفیر کرتے ہیں، لیکن دوسرے حضرات اس پر فتویٰ نہیں دیتے، اس لیے تکفیر کرنے والوں کا قول، عدمِ تکفیر کے قائلین پر حجت نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے خود اور دیگر اکثر اکابرِ دیوبند نے احمد رضا خانصاب کی تکفیر نہیں کی، اگرچہ احمد رضا خانصاب نے اکابرِ دیوبند کی تکفیر کی۔

یہی حکم بعض ایسے دوسرے فرقوں کے بارے میں بھی ہے، جو اہلُ السنۃ والجماعۃ سے خارج ہیں، اور اہلُ الاھواء میں داخل ہیں، اور اُن کی بعض علماء نے تکفیر کردی ہے، لیکن جمہور مجتہدین وفقہاء حضرات نے تکفیر نہیں کی۔

لیکن اس اختلاف کو ان حضرات نے باہمی جنگ وجدل کا ذریعہ نہیں بنایا، نہ ہی ایک دوسرے کو اس اختلاف کی وجہ سے مطعون کیا، کیونکہ یہ جہلاء کا شیوہ ہے۔ 20- ذوالقعدۃ- 1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 21 شمارہ 02، ستمبر 2023ء - صفر المظفر 1445ھ)

---

(215)

ہم عصریت کی وجہ سے اصحابِ کمال سے محرومی

''ہم عصری'' اس زمانہ کے لوگوں کے لیے ایسا فتنہ اور آزمائش ہے کہ جس کی وجہ سے ہر زمانہ میں بہت سے لوگ انبیائے کرام اور ان کے متبعین سے محروم رہے۔

اہلِ علم میں یہ مرض زیادہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے ہم عصر اصحابِ کمال کے فیض سے نہ صرف یہ کہ محروم رہتے ہیں، بلکہ وہ ان سے حسد وتحاسد بھی کرتے ہیں، ہم عصری ان کے کمال پر پردہ ڈال دیتی ہے، اور ان کے عیوب کو مستحضر کرنے کا سبب بنتی ہے، پھر جب وہ اصحابِ

کمال دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں،تو ان کی کمزوریوں کونظر انداز کر کے ان تعریف وتوصیف کے گن گائے جانے لگتے ہیں،لیکن زندگی میں ان کی عقیدت ومحبت کے نتیجہ میں جو ان کی صحبت اورعقیدت سے فیض حاصل کیا جاسکتا تھا،اس سے محرومی لازم آتی ہے،جس کا فوت ہونے کے بعد حاصل کرنا مشکل ہے۔

علامہ عبدالحی لکھنوی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

وكثير من الناس من تحرى هذه البلية الشنعاء ، فتراهم اذا سمعوا شيئا من النكت الحسنة غير معزو الى معين استحسنوه، بناء على انه للمتقدمين، فاذا علموا انه لبعض ابناء عصرهم، نكصوا على الاعقاب واستقبحوه، او ادعوا ان صدور ذلک عن عصرى مستبعد، وما الحامل لذلک الا حسد ذميم ، انتهى.

ويعجبنى فى هذا قول خير الدين الرملى استاذ صاحب "الدرالمختار":

قل لمن ير المعاصر شيئا ويرى للاوائل التقديما
ان ذاک القديم كان حديثا وسيبقى هذا الحديث قديما (النافع الكبير شرح الجامع الصغير"، صفحة ۳۰،مقدمة ،الفصل الاول،مطبوعة:ادارة القرآن والعلوم الاسلامية، كراتشى)

ترجمہ:اور بہت سے لوگ اس قوی ترین بلا میں گرفتار ہیں کہ آپ ان کو دیکھتے ہیں کہ جب وہ کوئی عمدہ بات سنتے ہیں،جس کی کسی متعین ومخصوص شخص کی طرف نسبت نہیں ہوتی،تو وہ اس کو اچھا سمجھتے ہیں، یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ متقدمین کی بات ہے، پھر جب انہیں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ تو ان کے اہلِ عصر کی بات ہے،تو وہ ایڑیوں کے بل پھر جاتے ہیں، اوراس کو برا سمجھتے ہیں، یا یہ دعویٰ کرتے

Idara Ghufran

ہیں کہ اس بات کا ہمارے معاصر سے صادر ہونا مستبعد ہے، اور ان کو اس بات پر ابھارنے والا صرف برا حسد ہی ہوتا ہے، اور مجھے اس سلسلہ میں صاحبِ درِمختار کے استاذ خیرالدین رملی کے یہ اشعار پسند آئے (جن کا ترجمہ یہ ہے):

’’ایسے افراد بہت کم ہیں، جو اپنے معاصر کو کوئی اہمیت دیتے ہیں، اور وہ اس کے مقابلہ میں پہلے لوگوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، حالانکہ وہ قدیم بھی پہلے جدید تھا، اور یہ جدید آئندہ چل کر قدیم ہو جائے گا‘‘ (النافع الکبیر)

اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی فرماتے ہیں:

اپنے زمانہ کی سطح سے بلند ہونا ایک نعمتِ خداداد اور ایک قابلِ رشک کمال ہے، مگر اس کمال کی صاحبِ کمال کو بہت بڑی قیمت اداء کرنی پڑتی ہے، وہ صاحبِ کمال اپنے معاصرین کی طرف سے ایک مسلسل ابتلاء اور آزمائش میں رہتا ہے، اور وہ معاصرین اس صاحبِ کمال کی طرف سے زندگی بھر ایک مصیبت اور زحمت میں مبتلا رہتے ہیں (تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ دوم، ص ۱۴۸، باب پنجم، بعنوان ’’مخالفت کے اسباب اور ان کے ناقدین ومدافعین‘‘، مطبوعہ: مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی)

کفار کی طرف سے، انبیائے کرام صلی اللہ علیہم وسلم کی تکفیر کا ایک سبب بھی یہی ہم عصری تھا، وہ انبیائے کرام کو اپنے درمیان رہنے سہنے اور کھانے پینے اور دوسرے بشری تقاضوں کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ یہ تو ہماری طرح کا انسان ہے، پھر ہم اس کی بات کو کیوں قبول کریں۔

قرآن مجید کی سورہ مومنون میں ایک نبی پر اعتراض کرنے والوں کا اس طرح ذکر کیا گیا کہ:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ . وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (سورة المؤمنون، رقم الآية ۳۳، و ۳۴)

ترجمہ: نہیں ہے یہ مگر بشر تمہارا جیسا، جو کھاتا ہے، ان ہی چیزوں میں سے، جن

www.idaraghufran.org

سے تم کھاتے ہو، اور پیتا ہے ان چیزوں میں سے جن سے تم پیتے ہو، اور اگر اطاعت کروگے تم اپنے جیسے انسان کی، تو بے شک اس صورت میں تم یقینی طور پر خسارہ پانے والے ہوجاؤ گے (سورہ مومنون)

اور سورہ فرقان میں اس ''ہم عصری'' کے فتنہ کے متعلق فرمایا گیا کہ:

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا. اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (سورة الفرقان، رقم الآية ۷، و۸)

ترجمہ: اور کہا انہوں نے کہ کیا ہوا، اس رسول کو کہ کھاتا ہے وہ کھانا، اور چلتا ہے وہ بازاروں میں، کیوں نہیں نازل کیا گیا اس کی طرف فرشتہ کو، جو ہوتا، اس کے ساتھ ڈرانے والا، یا ڈال دیا جاتا، اس کی طرف خزانہ، یا ہوتا، اس کے لئے باغ، جس سے کھاتا وہ، اور کہا ظالموں نے کہ نہیں اتباع کرتے تم، مگر ایسے آدمی کی جو سحر زدہ ہے (سورہ فرقان)

اور سورہ فرقان میں ہی ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے اعتراضوں کے جواب میں فرمایا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً (سورة الفرقان، رقم الآية ۲۰)

ترجمہ: اور نہیں بھیجا ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو، مگر وہ یقیناً کھانا بھی کھاتے تھے، اور چلتے تھے وہ بازاروں میں، اور بنادیا ہم نے تمہارے بعض کو بعض کے لئے ''فتنہ'' (وآزمائش) (سورہ فرقان)

اس طرح ''ہم عصری'' کی آزمائش وفتنہ سے دوچار ہونے والے لوگ انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات وہدایات سے محروم رہے، اور ہر زمانہ کے بہت سے ہم عصر بھی اسی وجہ

سے اپنے ہم عصر اصحابِ کمال کے فیض سے محروم رہے، آج کے دور میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جس کی ایک اہم وجہ اپنے معاصر سے حسد وتحاسد کا ہونا ہے، انسان طبعی طور پر یہ نہیں چاہتا کہ اس کی موجودگی میں اس کے معاصر کو زیادہ قبولیت حاصل ہو، اس لئے وہ اپنے صاحبِ کمال معاصر کی کمزوریوں کی جستجو میں مشغول ہوجاتا ہے، اور زندگی بھر اس کے عظیم ونمایاں کارناموں کو نظر انداز کرتا رہتا ہے۔ 18-ربیع الاول-1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 21 شمارہ 04، نومبر 2023ء - ربیع الآخر 1445ھ)

---

(216)

شیخ الہند کا زندگی کے آخری حصہ میں سیکھا ہوا سبق

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرتے ہیں:

مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد (حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ) ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرماتھے، علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا، اس وقت فرمایا کہ ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں، یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسّی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں، وہ کیا ہیں، فرمایا کہ:

''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہورہے ہیں، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے، ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے، بچوں کے لیے لفظی تعلیم

www.idaraghufran.org

کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں، بڑوں کو عوام میں درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے، اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے‘‘(جواہر الفقہ، جلد اول ص ۴۳۷، مضمون ’’اختلافِ امت پر ایک نظر‘‘ مطبوعہ: مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید: ذی الحجۃ 1431ھ، نومبر 2010ء)

اور حضرت شیخ الہند کے تلمیذِ رشید مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ترجمہ قرآن شریف بہت ضروری اور مفید ہے، مگر وہ بڑی عمر والوں کے لئے کار آمد اور ضروری ہے (مکتوبات شیخ الاسلام، ج۱، ص ۱۰۲، مکتوب نمبر ۳۸، مطبوعہ: معارفِ اعظم گڈھ، تاریخِ طبع: ۱۹۵۲ء)

ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت مدنی رحمہ اللہ کے اس ارشاد میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے اوپر بیان کئے گئے سبق کی ہی وضاحت ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے والے پہلے طالبِ علم تھے، ان کے اساتذہ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمود دیوبندی شامل ہیں، آپ تصوف میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے مجاز تھے۔

آپ نے دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، اور جمعیۃ الانصار اور نظارۃ المعارف جیسی تنظیموں کی بنیاد رکھی، آپ کے اجل تلامذہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ انور شاہ کشمیری، اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا عبید اللہ سندھی شامل ہیں۔

آپ کو دسمبر 1916ء میں گرفتار کیا گیا، اور آپ کو مالٹا قلعہ ورداله میں قید کر دیا گیا، مئی 1920ء میں آپ کو رہا کیا گیا، اور اسی سال نومبر کے آخر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

اسی درمیان آپ نے اردو میں قرآن کا ایک بین سطری ترجمہ لکھا، بعد میں اس ترجمہ کو تفسیری

نوٹوں کے ساتھ لکھنا شروع کیا، ابھی چوتھا پارہ ہی مکمل کیا تھا کہ 30 نومبر 1920ء میں انتقال ہوگیا، جس کے بعد اس تفسیر کو ان کے شاگرد علامہ شبیر احمد عثمانی نے مکمل کیا اور تفسیرِ عثمانی کے نام سے شائع ہوا۔

حضرت شیخ الہند نے تمام تر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف، اور تحریکات کی سرپرستی کے بعد عمر کے آخری حصہ میں جیل میں قید وبند کی تنہائیوں میں پوری دنیا میں مسلمانوں کے دینی اور دنیوی حیثیت سے تباہ ہونے پر غور وفکر کیا، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے، اور اپنی باقی زندگی کو ان ہی دو کاموں میں صرف کرنے کا عزم لے کر واپس آئے۔

ان دونوں میں ایک سبب، قرآن کو چھوڑ دینا، اور دوسرا سبب آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔

پہلے سبب کا حل یہ بتلایا کہ قرآن مجید کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے، بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں، بڑوں کو عوام میں درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے، اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا یہ ارشاد بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

ہمارا تجربہ ومشاہدہ بھی حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی مندرجہ بالا ہدایت سے مختلف نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کے باہمی اتحاد اتفاق کا بھی موثر ترین ذریعہ ہے، جس کی شہادت خود قرآن مجید نے دی ہے۔

چنانچہ قرآن مجید کی سورہ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ. وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ

وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (سورۃ آلِ عمران رقم الآیات ۱۰۳، الیٰ ۱۰۵)

ترجمہ: اور مضبوط پکڑلو تم، اللہ کی رسی کو سب مل کر اور تفرقہ بازی نہ کرو، اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہوئی، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے الفت ڈال دی تمہارے دلوں کے درمیان، پھر ہوگئے تم اس نعمت کی وجہ سے بھائی بھائی، اور تھے تم گڑھے کے کنارے پر آگ کے، پھر بچالیا اس نے تم کو اس سے، اسی طرح سے بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنی نشانیوں کو، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور چاہیے کہ ہو تم میں سے ایک جماعت، دعوت دیں وہ خیر کی طرف، اور حکم کریں وہ معروف کا، اور منع کریں وہ منکر سے، اور یہ لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔ اور مت ہو جاؤ تم ان لوگوں میں سے جنہوں نے تفرقہ بازی کی اور اختلاف کیا، بعد اس کے کہ آ گئے تھے، ان کے پاس واضح دلائل، اور یہی لوگ ہیں کہ جن کے لئے عذابِ عظیم ہے (سورہ آلِ عمران)

مذکورہ آیات سے اتفاق واتحاد کا حکم اور تفرقہ بازی کی ممانعت معلوم ہوئی، اور ساتھ ہی اتحاد واتفاق کا ذریعہ بھی معلوم ہوا، وہ یہ کہ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں، اور کوئی بھی اس سے الگ نہ ہو، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دین میں تفرقہ بازی اور گروہ بندی بری چیز ہے، جس پر عذابِ عظیم کی وعید اور دھمکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

وَأَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (سورۃ الانفال، رقم الآیۃ ۴۶)

ترجمہ: اور اطاعت کرو تم اللہ کی، اور اس کے رسول کی، اور تنازعہ مت کرو تم آپس

میں، ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر کرو تم، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (سورہ انفال)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر متفق وجمع ہونا چاہئے، اور اس سے ہٹ کر آپس میں تنازعہ نہیں کرنا چاہئے، جس کی وجہ سے بزدلی پیدا ہوتی ہے، اور دشمنوں کے مقابلہ میں ہوا اکھڑ جاتی ہے، اور اس کا حل یہ بیان کیا کہ اگر ایک دوسرے کی باتیں ناگوار گزریں، تو ان پر صبر سے کام لو، اور ایک دوسرے پر چڑھائی اور گمراہی کی بیان بازی نہ کرو، کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے، لہٰذا اللہ کی مدد ونصرت بھی انہیں کے ساتھ ہوگی۔

احادیث کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی رسی سے مراد قرآن مجید ہے۔

چنانچہ یزید بن حیان سے روایت ہے کہ:

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ: دَخَلْنَا عَلَيْهِ فَقُلْنَا لَهُ: لَقَدْ رَأَيْتَ خَيْرًا صَحِبْتَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَلَّيْتَ خَلْفَهُ فَقَالَ: نَعَمْ وَإِنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَنَا فَقَالَ: إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ كِتَابَ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ مَنِ اتَّبَعَهُ كَانَ عَلَى الْهُدَى وَمَنْ تَرَكَهُ كَانَ عَلَى الضَّلَالَةِ (صحيح ابن حبان، رقم الحديث ۱۲۳، كتاب العلم، ذكر إثبات الهدى لمن اتبع القرآن والضلال لمن تركه) [1]

ترجمہ: ہم زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے عرض کیا کہ بے شک آپ نے خیر کو دیکھا ہے، آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے، اور آپ نے رسول اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نماز پڑھی ہے، تو حضرت زید بن ارقم نے فرمایا کہ جی ہاں! اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ

[1] قال شعيب الارنؤوط: إسناده صحيح على شرط مسلم (حاشية صحيح ابنِ حبان)

www.idaraghufran.org

دیتے ہوئے فرمایا کہ میں تم میں اللہ کی کتاب کو چھوڑ رہا ہوں، جو کہ اللہ کی رسی ہے، جس نے اس کی اتباع کی، وہ ہدایت پر ہوگا، اور جس نے اس کو ترک کر دیا، تو وہ گمراہی پر ہوگا (صحیح ابنِ حبان)

اور حضرت ابو وائل سے روایت ہے کہ:

قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: إِنَّ هٰذَا الصِّرَاطَ مُحْتَضَرٌ، تَحْضُرُهُ الشَّيَاطِيْنُ يُنَادُوْنَ: يَا عِبَادَ اللّٰهِ، هٰذَا الطَّرِيْقُ فَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ، فَإِنَّ حَبْلَ اللّٰهِ الْقُرْآنُ (سنن الدارمی، رقم الحديث ٣٣٦٠، كتاب فضائل القرآن، باب: فضل من قرأ القرآن) [1]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک یہ (دین کا) راستہ حاضر ہونے والا ہے، جس پر شیاطین حاضر ہو کر پکارتے ہیں کہ اے اللہ کے بندو! یہ راستہ ہے (یعنی وہ غیر دین کے راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں) لہٰذا تم (شیاطین کی گمراہی سے بچنے کے لیے) اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو، پس بے شک اللہ کی رسی قرآن ہے (سنن الدارمی)

جہاں تک قرآن مجید کے لفظاً و معناً عام کرنے کا تعلق ہے، تو اہلِ علم حضرات نے لفظی تعلیم کے مکاتب و مدارس تو بے شک خوب قائم کیے، جو قابلِ ستائش اور لائقِ تحسین امر ہے، اگرچہ اس میں بھی ابھی مزید بہتری لانے، اور اس عمل کو رسمی طور پر جاری رکھنے کے بجائے، حقیقی روح کے ساتھ، تجوید و تلفظ کو درست کرانے پر محنت کی ضرورت باقی ہے۔

لیکن قرآن مجید کے ترجمہ اور معانی کو عام کرنے کی طرف، تا حال کما حقہ، توجہ نہیں کی جا سکی، بلکہ طرح طرح کی کمزور تاویلات کے ذریعے، عوام کو قرآن کے ترجمہ و معانی سے روکنے، اور اس سے ڈرانے اور دور رہنے پر زور دیا گیا، اور جن حضرات نے اس کی ضرورت سمجھی، وہ

[1] قال حسين سليم اسد الدارانی: إسناده صحيح إلى عبد الله (حاشية سنن الدارمی)

بھی درسِ قرآن، اور دورہ تفسیر وغیرہ کے عنوان سے، قرآن مجید کے حقیقی معانی کے بجائے، اپنی اپنی ترجیحات وافکار کو ہی ہدف بناتے رہے، اور ایسی ایسی باتیں قرآن مجید سے ثابت کرنے پر اپنی صلاحیتوں کو خرچ کرتے رہے، جو قرآن مجید کا مطمحِ نظر تو کیا ہوتیں، ان کو فروعی واجتہادی مسائل سے بھی کوئی تعلق نہیں، اور آج علمی دنیا میں فروعی وفقہی اور اجتہادی مسائل پر جس قسم کا ماحول بنادیا گیا ہے، وہ مسلمانوں کی باہمی جنگ وجدل کے لیے کافی ہے، جس کو برداشت نہ کرنے کا شیخ الہند رحمہ اللہ نے آخری عمر میں سبق دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اصلاحِ احوال کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 21 شمارہ 06، جنوری 2024ء - جمادی الاخریٰ 1445ھ)

---

(217)

''سادگی وبے تکلفی'' ایمان کی علامت

شریعت نے کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، بات چیت کرنے، اور ہر عمل میں، سادگی، اور بے تکلفی کی تعلیم دی ہے، اور تکلف وتصنع، بناوٹ، اور زیب وزینت میں غلو کو ناپسند کیا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم سنت بھی سادگی وبے تکلفی ہے، جس کو احادیث میں ایمان کی اہم نشانی بتلایا گیا ہے۔

اس بارے میں سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ حکم فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے بارے میں اس بات سے آگاہ کردیں کہ:

وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ (سورة ص، رقم الآية ٨٦)

ترجمہ: اور نہیں ہوں میں تکلف کرنے والوں میں سے (سورہ ''ص'')

دوسری اہم بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف طریقوں سے اس کا حکم فرمایا ہے۔

چنانچہ امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ:

كُنَّا عِنْدَ عُمَرَ فَقَالَ: نُهِينَا عَنِ التَّكَلُّفِ (صحيح البخاری، رقم الحديث ۷۲۹۳، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب ما يكره من كثرة السؤال وتكلف ما لا يعنيه)

ترجمہ: ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھے، تو انہوں نے فرمایا کہ ہمیں (اللہ اوراس کے رسول کی طرف سے) تکلف اختیار کرنے سے منع کردیا گیا ہے (بخاری)

اورامام ابوداود نے ''سنن ابی داؤد'' میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ التَّرَجُّلِ إِلَّا غِبًّا (سنن ابی داود، رقم الحديث ۴۱۵۹، كتاب الترجل) [1]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنگھا کرنے سے منع فرمایا، سوائے کبھی کبھی کے (سنن ابی داود)

اس کے بعد امام ابوداود نے عبیداللہ بن بریدہ کی اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ:

أَنَّ رَجُلًا مِّنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَحَلَ إِلٰى فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ وَهُوَ بِمِصْرَ، فَقَدِمَ عَلَيْهِ، فَقَالَ: أَمَا إِنِّي لَمْ آتِكَ زَائِرًا، وَلٰكِنِّي سَمِعْتُ أَنَا وَأَنْتَ حَدِيثًا مِّنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجَوْتُ أَنْ يَّكُوْنَ عِنْدَكَ مِنْهُ عِلْمٌ، قَالَ: وَمَا هُوَ؟ قَالَ: كَذَا وَكَذَا، قَالَ: فَمَا لِيْ أَرَاكَ شَعِثًا وَأَنْتَ أَمِيْرُ الْأَرْضِ؟ قَالَ: إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْهَانَا عَنْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْإِرْفَاهِ، قَالَ: فَمَا لِيْ لَا أَرٰى عَلَيْكَ حِذَاءً؟ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُنَا أَنْ نَحْتَفِيَ أَحْيَانًا (سنن ابی داود، رقم الحديث ۴۱۶۰، كتاب الترجل) [2]

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک آدمی، حضرت فضالہ بن عبید

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: صحيح لغيره (حاشية سنن ابی داود)

[2] قال شعيب الارنؤوط: إسناده صحيح (حاشية سنن ابی داود)

www.idaraghufran.org

رضی اللہ عنہ کے پاس گئے جو کہ مصر میں تھے، جب وہ صحابی، حضرت فضالہ کے پاس آئے، تو کہا کہ میں آپ کی زیارت کرنے کے لئے نہیں آیا، لیکن میں نے اور آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کو سنا ہے، مجھے امید ہے کہ تمہارے پاس بھی اس کا علم ہوگا، فضالہ نے کہا کہ وہ کیا ہے، تو ان صحابی نے کہا کہ فلاں فلاں حدیث ہے، پھر ان آنے والے صحابی نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ میں آپ کے بال بکھرے ہوئے دیکھتا ہوں، جبکہ تم اس علاقہ کے امیر ہو، تو حضرت فضالہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زیادہ مانگ پٹی (اور بناؤ سنگھار اور تکلف اختیار) کرنے سے منع فرمایا ہے، پھر ان آنے والے صحابی نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں ننگے پیر دیکھتا ہوں، تو حضرت فضالہ نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کبھی کبھی ننگے پاؤں رہنے کا حکم فرمایا کرتے تھے (سنن ابی داود)

اور اس کے بعد امام ابوداود نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ:

ذَكَرَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا عِنْدَهُ الدُّنْيَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَلَا تَسْمَعُونَ، أَلَا تَسْمَعُونَ، إِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْإِيمَانِ، إِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْإِيمَانِ (سنن ابی داود، رقم الحديث ۴۱۶۱، عن ابی امامة، كتاب الترجل) [1]

ترجمہ: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے آپ کے سامنے دنیا کا ذکر کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم سنتے نہیں ہو کہ بے شک سادگی ایمان سے تعلق رکھتی ہے، بے شک سادگی ایمان سے تعلق رکھتی ہے (ابوداود)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

---

[1] قال شعيب الارنؤوط: حديث حسن (حاشية سنن ابی داود)

www.idaraghufran.org

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : ھَلَکَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ قَالَھَا ثَلَاثًا

(صحیح مسلم، رقم الحدیث ٢٦٧٠ ''٧'' کتاب العلم، باب هلک المتنطعون)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلام میں تکلف وتصنُّع اختیار کرنے والے ہلاک ہوگئے، یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی (مسلم)

قرآن مجید کی مذکورہ آیت، اور یہ چند احادیث سمجھنے والوں کے لئے کافی وافی ہیں۔

سادگی اور ترکِ تکلف وترکِ تصنع سے انسان میں تواضع وعاجزی پیدا ہوتی ہے، تکبر وعجب سے نجات ملتی ہے، اسی کے ساتھ مال اور وقت کے ضیاع سے بھی حفاظت حاصل ہوتی ہے، جبکہ اس کے برعکس تکلفات وتصنعات سے کبر وتکبر اور عجب پیدا ہوتا ہے، اور وقت اور مال کی بربادی مقدر بن جاتی ہے۔ [1]

اور آج جب ہم اپنے معاشرہ پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں اپنے معاشرہ میں سادگی اور بے تکلفی کی کافی حد تک کمی نظر آتی ہے، رفتہ رفتہ معاشرہ سے سادگی وبے تکلفی رخصت ہوکر اس کی جگہ تکلفات وتصنعات اور نمود ونمائش پیدا ہوتی اور بڑھتی جارہی ہے، اور بہت سی چیزوں میں تکلفات وتصنعات اور نمود ونمائش جیسی چیزیں ہمارے معاشرہ کی ایک روایت بن چکی

---

[1] قال :إن رسول الله -صلى الله عليه وسلم -كان ينهانا عن كثير من الإرفاه"، بكسر الهمزة على المصدر معناه :الترجل والتدهين كل يوم، مأخوذ من :رفهت الإبل ترفه رفوها ورفها وردت الماء كل يوم متى شاء ت، ومنه الرفاهية، وهي الخفض والدعة، وفي معناه مظاهرة اللباس على اللباس، والطعام على الطعام، كعادة الأعاجم، فإن كثرة التنعم تجعل النفس متكبرة غافلة، ولأن اعتياد ذلک قد يضر؛ لأنه ربما حدث به فقر وسوء عيش فيشق عليه.

"قال"؛ أي :الرجل لفضالة":ما لي لا أرى عليک حذاء ؟؛ أي :نعلا، وإنما قال عليک؛ لأن النعل لها اشتمال على الرجل ".قال"؛ أي :فضالة" :كان رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم يأمرنا أن نحتفي"؛ أي :نمشي حافيا "أحيانا "تواضعا وكسرا للنفس، وليتمكن ذلک عند الاضطرار إليه(شرح المصابيح ،لابن الملک، ج٥، ص ٦٤، ٦٥، کتاب اللباس، باب الترجيل)

قوله(إن البذاذة) :البذاذة رثاثة الهيئة وترک ما يدخل في باب الزينة .يقال :رجل بذ الهيئة وباذ الهيئة أي رث اللبسة، وفي هيئته بذاذة .والمراد من الحديث أن في اللباس والتوقي عن (التأنق) في الزينة من أخلاق أهل الإيمان، والإيمان هو الباعث عليه(شرح الطيبي على مشكاة المصابيح، ج٩، ص ٢٩٠١، کتاب اللباس)

www.idaraghufran.org

ہیں، جس میں نیک و بد اور امیر وغریب ہر ایک ہی مبتلاء ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ ہمارے زمانہ کے بہت سے علماء وصوفیاء بھی اس وباء سے محفوظ نہیں رہ سکے، ان کی بول چال، ڈھال، رہن سہن وغیرہ میں سادگی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی جھلک دور دور تک نظر نہیں آتی، ان کے اندازِ کلام، حلیہ اور طرزِ عمل کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ اور طرزِ عمل سے تقابل کیا جائے، تو واضح فرق نظر آتا ہے، اور جو کوئی اس سادگی و بے تکلفی کی سنت کو اپنائے، اسے نہ تو بزرگ سمجھا جاتا، نہ ہی اس کو پیر تصور کیا جاتا، اس سے زیادہ بگاڑ اور کیا ہوسکتا ہے۔ [1]

اللہ تعالیٰ حفاظت عطاء فرمائے۔ آمین۔

18- جمادی الاولیٰ-1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 21 شمارہ 06، جنوری 2024ء - جمادی الاخریٰ 1445ھ)

---

(218)

تقلیدِ مطلق ومقید میں فرق

بعض لوگ اجتہادی امور میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کو بہر حال حرام قرار دیتے ہیں، خواہ مطلق ہو، یا مقید، بلکہ بعض غالی تو اس کو شرک بھی کہہ دیتے ہیں، لیکن جمہور کا موقف اس کے مطابق نہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ امورِ اجتہادیہ میں مجتہد کو تو حسبِ صلاحیت اجتہاد کرنے کا حکم ہے، لیکن غیر مجتہد کو تقلید کا حکم ہے، اس تقلید کو نہ تو حرام کہنا جائز ہے، اور نہ ہی اس کو شرک قرار دینا درست ہے۔

---

[1] والتکلف تحمل ما لیس فی الوسع وهو فی کل شیء مذموم فالتکلف فی الملبوس والمرکوب والمنکوح وفی الکلام والتملق الذی صار شان اهل هذا الزمان وذلک لان التکلف تصنع وتملق وتمایل علی النفس لاجل الناس وذلک مباین لحال أهل الکمال وفی بعضة حفی منازعة للاقدار وعدم الرضا بما قسمه الجبار ویقال التصوف ترک التکلف والتکلف تخلف وهو تکلف عن شأن الصادقین(التیسیر بشرح الجامع الصغیر،للمناوی، ج۲،ص ۴۶۵،حرف النون،باب المناهی)

www.idaraghufran.org

اور جمہور کی طرف سے یہ حکم مطلق تقلید کا ہے۔

اب رہا یہ کہ غیر مجتہد پر تمام مسائل میں ایک ہی مذہب، یا ایک امام کی تقلید واجب ہے، یا نہیں؟ تو یہ خود اختلافی واجتہادی اور فروعی مسئلہ ہے، اکثر حضرات اس کو غیر واجب اور بعض حضرات اس کو واجب کہتے ہیں، بہت سے مشائخِ دیوبند نے بعض وجوہ کی بناء پر، اسی قول کو ترجیح دی ہے، جس میں ایک مخصوص مجتہد کی تمام اقوال میں اتباع ہوا کرتی ہے، لیکن بایں ہمہ دوسرے قول پر عمل کرنے والے کو انہوں نے بھی ضالّ اور گمراہ نہیں کہا، جبکہ وہ کسی مسلّمہ فعلِ منکر کا ارتکاب نہ کرے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:

تقلیدِ شخصی اور غیر شخصی دونوں **مامور من اللہ تعالیٰ** ہیں، اور جس پر عمل کرے، عہدہ امتثال سے فارغ ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ مسئلہ درست ہے اور جو (شخصی، یا غیر شخصی تقلید میں سے کسی) ایک فرد پر عمل کرے اور دوسرے پر عمل نہ کرے، اس میں دراصل کوئی عیب نہ تھا اور بوجہ مصلحت ایک پر عمل کرنا درست ہے۔

پس **فی الواقع** اصل یہی ہے۔

لہٰذا جو تقلیدِ شخصی کو شرک کہتے ہیں، وہ بھی گناہ گار ہیں کہ **مامور من اللہ تعالیٰ** کو حرام کہتے ہیں۔ اور جو بدوں حکمِ شرع کے غیر شخصی کو حرام کہتا ہے، وہ بھی گناہ گار ہے کہ مامور کو حرام بتاتا ہے۔ دونوں ایک درجہ کے ہیں، اصل میں (تالیفاتِ رشیدیہ مع فتاویٰ رشیدیہ، مکمل مبوب، ص۲۰۴، باب: تقلید واجتہاد کے مسائل، بعنوان: مطلق تقلید کا ثبوت، مطبوعہ: ادارہ اسلامیات لاہور، سنِ اشاعت بارِ دوم: ۱۴۱۲ ہجری، ۱۹۹۲ عیسوی)

جمہور محققین کا قول یہی ہے کہ اگر کوئی غیر مجتہد اپنی حسبِ سہولت ایک ہی امام کی تقلید مقید کیا کرے، تو یہ جائز عمل ہے، جس طرح تقلیدِ مطلق بھی جائز ہے، یعنی تقلید کا وجوب، دونوں صورتوں میں اداء ہو جاتا ہے، لیکن ان میں سے کوئی ایک صورت بھی متعین طور پر واجب نہیں۔

اس سلسلہ میں ہمارا موقف جمہور محققین کے مطابق ہے کہ اجتہادی امور میں غیر مجتہد کو تقلید کرنا حرام، یا شرک نہیں، حلال، بلکہ واجب ہے، اور جس طرح مطلق تقلید کرنا فی نفسہٖ جائز ہے، اسی طرح مقید و شخصی تقلید بھی فی نفسہٖ جائز ہے۔

لیکن اکثر محققین کے نزدیک تقلیدِ مقید و شخصی تقلید کا واجب ہونا راجح نہیں۔

عبدالغنی بن اسماعیل نابلسی دمشقی حنفی (المتوفی: 1143ھ) اپنے رسالہ ''**خلاصۃُ التحقیق فی بیان حکم التقلید والتلفیق**'' میں اس مسئلہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> **والحاصل: أن العلماء اختلفوا فی لزوم مذهب معين، وصحح كل أحد منهم ما ذهب إليه، وعدم اللزم هو الراجح كما ذكرناه بعد أن لا يخرج عن المذاهب الأربعة، والله ولی التوفيق** (خلاصة التحقيق فی بيان حكم التقليد، لعبدالغنی النابلسی، ص ۹، وأما المقصد الأول فهل على الإنسان التزام مذهب معين أم لا؟ طبعة جديدة بالأوفست مكتبة حقيقة، استانبول، تركيا، ۱۴۳۲ھ، ۲۰۱۱م)

> ترجمہ: اور خلاصہ یہ ہے کہ علماء کا مذہبِ معین کے لزوم میں اختلاف ہے، اور ہر ایک نے اپنے اختیار کردہ قول کی تصحیح کی ہے، لیکن مذہبِ معین کا لازم نہ ہونا راجح ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، بعد اس کے کہ مذاہبِ اربعہ سے خروج نہ کرے، **واللہ ولی التوفیق** (خلاصۃُ التحقیق)

اس طرح کی اور بھی بے شمار عبارات و حوالہ جات ہیں۔

اب بندہ کے موقف کے مذکورہ تمام اجزاء جمہور کے موافق ہیں، اور مشائخِ دیوبند کے بھی موافق ہیں، صرف ایک فرعی جزء میں بندہ کا مشائخِ دیوبند کے مشہور رجحان سے اختلاف ہے، اور وہ اختلاف بھی حرام وحلال کے درجہ کا نہیں، بلکہ وجوب وعدمِ وجوب کا ہے، اور اس مسئلہ میں جمہور فقہاء کا راجح موقف بندہ کے موقف کے مطابق ہے، بلکہ بندہ کا موقف جمہور کے راجح موقف سے ہی ماخوذ ہے، جس کی باحوالہ تفصیل بندہ اپنے مختلف مضامین میں تحریر

کر چکا ہے، جن میں سے بعض طبع ہو چکے ہیں، بعض ابھی تک طبع نہیں ہوئے، وہ ان شاء اللہ جلد ہی طبع ہو جائیں گے۔

لیکن افسوس کہ بعض ایسے حضرات جن کو حقیقتِ حال سے واقفیت نہیں، یا وہ کم ظرفی کا شکار ہیں، وہ بندہ کے موقف کو بلا تحقیق و بلا دلیل غیر مقلد حضرات کے مطابق ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں۔

حالانکہ گزشتہ تفصیل سے معلوم ہو چکا کہ بندہ کو تقلید سے متعلق غیر مقلدوں کے مشہور وغیر معتدل موقف سے اصولی اختلاف ہے، اور بندہ کا موقف اکثر وجمہور فقہاء کے موافق ہے، آج کل دوسرے کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں تحقیق، احتیاط واعتدال اور حسنِ ظن کے اصولوں کا لحاظ ختم ہوتا جا رہا ہے، ذرا ذرا سے فروعی اختلافات کو اصولی اختلافات کا درجہ دیا جاتا ہے۔

گذشتہ دنوں بندہ کے پاس ہمارے سلسلہ کے ایک معروف عالم اور بزرگ تشریف لائے، اورانہوں نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ آپ تقلیدِ شخصی کے قائل نہیں، جبکہ تقلیدِ شخصی کے واجب ہونے پر چوتھی صدی میں اجماع ہو گیا تھا، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے، اس لئے آپ کو اس مسئلہ پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔

میں نے عرض کیا کہ ماشاء اللہ آپ نے بہت اچھی بات فرمائی ہے، اصل بات یہی ہے کہ اگر آپ چوتھی صدی میں تقلیدِ شخصی کے وجوب پر اجماع کو ثابت فرما دیں، اور اس کا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے محقق ومصرح ثبوت پیش فرما دیں، تو میں نہ صرف یہ کہ اپنے قول سے رجوع کرلوں گا، بلکہ اس موقف سے رجوع کا اعلان بھی شائع کردوں گا، اور کسی کی طرف سے اجماع کا صرف دعویٰ کرنا دلیل شمار نہیں ہوگا، کیونکہ اجماع کا دعویٰ کرنے والا دراصل دوسرے تمام مجتہدین وفقہاء اور علماء کے موقف کے اس پر متفق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، جبکہ پے در پے جمہور فقہائے کرام مذہبِ معین وشخصِ معین کی تقلید واجب ہونے کے قول کے مرجوح ہونے کی تصریح فرماتے رہے ہیں، جن میں چوتھی صدی کے بعد نہیں، بلکہ ہزار

صدی کے بعد کے علامہ ابنِ عابدین شامی بھی داخل ہیں، پھر اجماع کا دعویٰ کیسے معتبر ہوسکتا ہے، بلکہ ایسی صورت میں اس دعوے کا مرجوح ہونا خود بخود ثابت ہوجاتا ہے، یعنی جس چیز پر اجماع کا دعویٰ کیا جارہا ہے، اسی کو مذکورہ حضرات قولِ مرجوح قرار دے رہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تصریحات بھی اسی کے موافق ہیں، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی جس عبارت سے بعض حضرات کو تقلیدِ شخصی کے وجوب، اور اس پر اجماع کا شبہ ہوا ہے، ہم اس کی مکمل تصریح وتشریح کرچکے ہیں، اس سلسلہ میں بندہ نے اپنی مطبوعہ تالیف ''عمل بالحدیث کا حکم'' بھی مذکورہ حضرت صاحب کو ملاحظہ کے لئے ہدیہ کی، اور یہ بھی ساتھ ہی عرض کیا کہ اس سلسلہ میں دو جلدوں میں ایک مفصل تالیف ''شاہ ولی اللہ کے فقہی افکار'' بھی ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہی شائع ہونے والی ہے، جس میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل وتحقیق موجود ہے، جس کے ضمن میں الحمد للہ تعالیٰ تلفیق وتیسیر کے مسائل پر بھی سیر حاصل بحث ہے۔

اور یہ بھی عرض کیا کہ اگر آپ اپنے موقف کو ثابت نہیں کرسکے، اور نہ ہی بندہ کے نقل کردہ حوالہ جات کی تردید کرسکے، تو بے شک آپ تقلیدِ شخصی کے راجح ہونے کے موقف پر قائم رہیں، بندہ کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، نہ ہی بندہ اس موقف پر گمراہی کا حکم لگاتا، ایسی گستاخی سے تو بندہ دوسروں کو بھی منع کرتا ہے، لیکن آپ کو یہ حق نہیں ہوگا کہ اس کے وجوب پر اجماع کا دعویٰ کریں، اور بندہ کو اس اجماع کا مخالف قرار دیں، اس طرح کے طرزِ عمل کے نتیجہ میں بندہ کو تفصیلی، تحقیقی اور تصریحی جواب کا استحقاق ہوگا، پھر اس کے نتیجہ میں آپ کے موقف کا جمہور اور خود حنفیہ کے خلاف ہونا ثابت ہوگا، جس سے پھر آپ حضرات کو تشویش و پریشانی اور شکایت لاحق ہوگی۔

اس لئے بندہ ضروری سمجھتا ہے کہ صرف سنی سنائی باتوں کی تصدیق کرنے کے بجائے پہلے دوسرے کے موقف کو باحوالہ ملاحظہ کیا جائے، تب ہی کوئی حکم لگایا جائے، اور اگر پھر بھی کسی کو زیادہ پریشانی لاحق ہو، تو اس کی ذمہ داری ہوگی کہ ہمارے رجحان کی جن دلائل وحوالہ جات

پر بنیاد ہے، اور ہم نے ان کو مکمل ومدلل تحریر کر دیا ہے، تو ان کا ان ہی جیسے مضبوط دلائل وحوالہ جات کی روشنی میں جواب تحریر کیا جائے، اس کے بغیر اس اہم مسئلہ میں محض زبانی کلامی جمع خرچ وطعن وتشنیع کا نہ تو جواز واعتبار ہوسکتا، نہ ہی علم وتحقیق کی دنیا میں اس طرح کی باتوں کی کوئی اہمیت اور وقعت ہوا کرتی۔

اور جو لوگ مجتہدینِ عظام وفقہائے کرام کی تصریحات کے مقابلہ میں اپنے چند متاخرین اکابر ومشائخ کے حوالہ جات پیش کر کے سب کو ان کی اتباع کا مکلّف فرمانا چاہتے ہیں، ہم ان سے مؤدبانہ گذارش کرتے ہیں کہ بلاشبہ وہ حضرات ہمارے بھی اکابر ومشائخ ہیں، لیکن جس طرح بہت سے دوسرے اجتہادی وفروعی مسائل میں بلانکیر ان حضرات، بلکہ ان سے بھی بڑے حضرات سے اپنے اکابر ومشائخ سمجھ کر اختلاف کو گوارا کیا جاتا ہے، یہی طرزِ عمل کسی دوسرے اجتہادی وفرعی مسئلہ میں اپنے دوسرے بھائی کے لئے پسند کرنا چاہیے، کیونکہ احادیث میں مومن کی یہی نشانی بتلائی گئی ہے۔

رہا اصول وقواعد کو نظر انداز کر کے بعض مسائل کو اپنے تئیں اجتہادی وفروعی اور بعض مسائل کو غیر اجتہادی، اجماعی واصولی سمجھ بیٹھنا، تو دراصل یہ علمی کمزوری ہے۔

05-شعبان-1444ھ

(ماہنامہ ''التبلیغ'' جلد 21 شمارہ 08، مارچ 2024ء - شعبان المعظم 1445ھ)

فقط

وَاللّٰہُ سُبۡحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعۡلَمُ وَعِلۡمُہٗ اَتَمُّ وَاَحۡکَمُ.

محمد رضوان خان

09/محرم الحرام/1446ھ 16/جولائی/2024 بروز بدھ

ادارہ غفران، راولپنڈی، پاکستان

ادارۂ غفران

راولپنڈی پاکستان